سوغات

محمود ایاز

سوغات

(۸)

مُدیر

محمود ایاز

معاون مدیران

خلیل مامون

عزیز اللہ بیگ

پتہ:

۸۴۔ تھرڈ مین، ڈیفنس کالونی، اندرا نگر

بنگلور۔ ۵۶۰۰۳۸

فون: ——— ۵۲۸۱۹۸۶

مارچ ۱۹۹۵ء

قیمت: فی شمارہ ایک سو روپے (۱۰۰)

بیرونی ممالک سے [امریکہ، کناڈا، انگلینڈ، سعودی، پاکستان]
(بذریعہ ہوائی ڈاک) بارہ (۱۲) ڈالر (امریکی) سولہ (۱۶) ڈالر (کنیڈین) دس (۱۰) پاؤنڈ (یو۔کے)

کتابت:
حافظ لیاقت احمد قاسمی۔ بنگلور ۲۵
کمپیوٹر کارپوریشن۔ حیدر آباد
طباعت: ماڈرن پبلشنگ ہاؤز۔ ۹ گولہ مارکیٹ، دریا گنج۔ دلی ۲

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: محمود ایاز

فہرست

مضامین

یادیں

مختار صدّیقی

نظمیں

خودنوشت

غزلیں

نظمیں

خصوصی مطالعہ

بلونت سنگھ کے افسانے

آپ بیتی

بلونت سنگھ کے بارے میں

عذابِ دانشِ حاضر

بازگشت

فضیل جعفری

گوندنی والا تکیہ ایک مطالعہ

"اب میں آپ کو ناول کے مقابلے میں مختصر افسانے کی عظمت سے متعلق چند باتیں بتانا چاہوں گا۔ کوئی ناول خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو، اس میں ایسے متعدد صفحات مل جاتے ہیں جنہیں پڑھتے ہوئے قاری بوریت کا شکار ہو جاتا ہے "جنگ اور امن" (War and Peace) بہت عظیم ناول ہے لیکن آپ اسکے ۵۰، ۶۰ صفحات کو بہ آسانی نظر انداز کر سکتے ہیں۔ لیکن مختصر افسانے کا کینوس خاصا محدود ہوتا ہے۔ مختصر افسانے میں آپ محض کسی ایک خیال کو پیش کر رہے ہوتے ہیں۔ آپ کی ساری توجہ محض کسی ایک مخصوص نقطے پر مرکوز ہوتی ہے۔ افسانے میں آپ صورت حال (Situation) اور احساسات کو پوری شدت کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ اگر آپ بعض عظیم افسانوں کا موازنہ عظیم ناولوں کے ساتھ کریں تو پلہ افسانوں کے حق میں ہی جھکتا نظر آئے گا........" (غلام عباس)

(آصف اسلم (فرخی) کو دئے جانے والے انگریزی انٹرویو مطبوعہ "دی ہیرالڈ" فروری ۱۹۸۲ء سے اقتباس)

ناول پر افسانے کی فوقیت کے تعلق سے غلام عباس کے منقولہ بالا خیالات سے یقیناً اختلاف بھی کیا جاسکتا ہے اور خاصی لمبی چوڑی بحث بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ غلام عباس میں وہ تخلیقی صلاحیت ہی نہیں تھی جو مثلاً "امراؤ جان" "گریز" "ٹیڑھی لکیر" اور "آگ کا دریا" جیسے ناول لکھنے کے لئے درکار ہوتی ہے۔ لیکن ایک ایسا فنکار جس نے نصف صدی سے زیادہ عرصے تک اپنی ساری تخلیقی توانائیوں کو محض افسانہ نگاری کے لئے مختص کر دیا ہو اور جس کی فنکارانہ شہرت اور عظمت کا سارا دارومدار ہی افسانہ نگاری پر ہو وہ اگر شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے دفاع میں اس طرح کی باتیں کرے تو ہم سمجھتے ہیں کہ اسے اس کا حق ہے اور اس سے الجھنے کے بجائے اس کو نظر انداز کر کے آگے بڑھ جانا ہی بہتر ہوگا۔

غلام عباس کے پورے افسانوی ادب میں ہمیں تین ایسی تحریریں نظر آتی ہیں جو علاحدہ سے کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں اور جن پر ناول کا نہ سہی لیکن ناولٹ کا اطلاق ضرور ہو سکتا ہے۔ ان کا پہلا ناولٹ "جزیرہ سخنوراں" تھا جو مولانا چراغ حسن حسرت کے ہفت روزہ اخبار "شیرازہ" میں قسط وار شائع ہوا تھا۔ انہوں نے اپنا دوسرا ناولٹ بعنوان "دھنک" غالباً ایوب خاں کے دور اقتدار میں سیاسی مصلحتوں کی بنا پر قلمبند کیا تھا۔ جزیرہ سخنوراں اگر یوٹوپیائی شعری تمثیل ہے تو دھنک سیاسی۔ سائنسی تمثیل کے زمرے میں آتا ہے۔ یہ دونوں ناولٹ خالص ادبی معیار کے اعتبار سے کسی قابل ذکر حیثیت یا اہمیت کے حامل نہیں ہیں۔

"گوندنی والا تکیہ" کو قارئین نے نہ صرف پسند کیا بلکہ غلط یا صحیح اسے کم و بیش ویسی ہی شہرت نصیب ہوئی

جیسی کہ اس سے پہلے ان کے افسانے آنندی کو مل چکی تھی۔ عام کتابی سائز کے ۱۶۷ صفحات پر مشتمل اس ناولٹ کے بارے میں غلام عباس کا کہنا ہے کہ اسے لکھنے کا خیال انہیں اس وقت سوجھا جب انہوں نے ۱۹۵۰ کے آس پاس کچھ بڑے روسی ناولوں کا مطالعہ کیا۔ غلام عباس نے بد قسمتی سے ان روسی ناولوں کے نام نہیں بتائے ورنہ ہم کم از کم اتنا تو سمجھ سکتے تھے کہ وہ ناول کس قسم کے تھے اور ان کے مقابلے میں "گوندنی والا تکیہ" کی کیا حیثیت ہے۔

عباس صاحب نے ہمیں صرف اتنا بتایا ہے کہ وہ اس موضوع پر ایک "بڑا اور بسوط" ناول قلمبند کرنا چاہتے تھے لیکن سرکاری مصروفیتوں نے انہیں اتنی مہلت نہیں دی کہ وہ اپنی اس خواہش کو عملی جامہ پہنا سکتے۔ مجبوراً انہوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے ناولٹ کی شکل میں مکمل کر کے شائع کرا دیا جائے۔

بقول غلام عباس جب وہ ۱۹۵۲ء میں لندن سے واپس کراچی پہنچے تو اس وقت عزیز احمد مرحوم محکمہ اطلاعات ونشریات کے سکریٹری بھی تھے اور سرکاری ماہنامہ "ماہ نو" کی ادارت کی ذمے داری بھی سنبھال رہے تھے۔ چونکہ وہ غلام عباس سے افسانوں کے لئے مسلسل تقاضہ کرتے رہتے تھے اور عباس صاحب وعدہ کرنے کے باوجود نہیں لکھ پاتے تھے اس لئے انہوں نے طے کیا کہ گوندنی والا تکیہ کو ہی "ماہ نو" میں قسط وار شائع کرا دیا جائے اس ناولٹ کی آخری اور بارہویں قسط جنوری ۱۹۵۴ء میں شائع ہوئی لیکن کتابی شکل میں اس کی اشاعت میں پورے تیس برس لگ گئے۔ یہ ناولٹ کچھ ردو بدل کے ساتھ مکتبہ آئینۂ ادب لاہور سے ۱۹۸۳ء میں شائع ہوا۔ تیس برس کوئی معمولی عرصہ نہیں ہوتا۔ اگر غلام عباس چاہتے تو ان تیس برسوں میں وہ یقیناً گوندنی والا تکیہ کو ایک بسوط اور مفصل ناول کی شکل عطا کر سکتے تھے۔ لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وجہ غالباً وہی تھی جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ ناول نگاری سے انہیں فطری رغبت ہی نہیں تھی اسی وجہ تھی کہ انہوں نے گوندنی والے تکیے پر کوئی طویل اور بسوط ناول لکھنے کے بجائے محض ایک ناولٹ پر اکتفا کر لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس ناولٹ کو پڑھتے ہوئے نیز اس کے اختتام پر ہم یہ محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بہت سے واقعات جو مفصل بیان کے متقاضی تھے انہیں یا تو بہت ہی اختصار کے ساتھ بیان کیا گیا ہے یا پھر ناول نگار ان کی طرف محض اشارا کر کے آگے بڑھ گیا ہے۔ کرداروں کے ساتھ بھی یہی سلوک روا رکھا گیا ہے۔ ناولٹ میں بیشتر کرداروں اور خاص طور سے مرکزی کرداروں کا کوئی بھرپور یا باقاعدہ ارتقا نہیں ملتا۔ قاری ناول کے مرکزی خیال یعنی پلاٹ سے آگاہ تو ہو جاتا ہے اور اس پلاٹ میں اسے کشش بھی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کی سیری نہیں ہوتی۔ اسکے باوجود اختتام شدہ مال (Finished Product) کے طور پر "گوندنی والا تکیہ" کرداروں اور واقعات دونوں اعتبار سے اتنا دلچسپ ضرور ہے کہ آپ اسے ایک ہی نشست میں پڑھ ڈالنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ ناول نگار کی حیثیت سے غلام عباس کی یہ کامیابی بھی کچھ کم قابل قدر نہیں ہے۔

اس ناولٹ کے پہلے اور آخری باب کا تعلق زمانۂ حال سے ہے۔ باقی تمام ابواب کا رشتہ حال یا ماضی قریب سے نہ ہو کر ماضی بعید سے ہے۔ ناولٹ کا واقعہ بیس برس پہلے کا ہے جسے فلیش بیک تکنیک کی مدد سے صیغۂ حال میں یوں بیان کیا گیا ہے گویا سب کچھ قاری کی نظروں کے سامنے ہو رہا ہے۔ اس تکنیک کا فائدہ یہ ہے کہ قاری گوندنی والا تکیہ کو کسی داستان پارینہ کے طور پر پڑھنے کے بجائے آخر تک اس میں پوری دلچپی کے ساتھ مصروف رہتا ہے۔ جیسا کہ ابھی ابھی کہا جا چکا ہے ناولٹ میں بیان کردہ واقعہ بیس برس پہلے کا ہے۔ اس طویل عرصے میں بیشتر کردار یا تو اللہ کو پیارے ہو چکے ہوتے ہیں یا پھر اپنی عمر طبیعی کی ڈھلوان پر ہوتے ہیں۔ جسمانی سطح پر اور حقیقی معنی میں ہماری ملاقات صرف دو کرداروں سے ہوتی ہے جن میں سے ایک پہلے اور آخری باب کا راوی ہے۔ اسے کھینچ تان کر مرکزی کردار بھی کہا جا سکتا ہے دوسرا کردار ناول کے صرف آخری باب میں اور وہ بھی صرف چند لمحوں کے لئے سامنے آتا ہے۔ اس کردار کو غلام عباس نے "گوندنی والا تکیہ" کے کلائمکس کے طور پر استعمال کیا ہے۔

ادھیڑ عمر کا پہلا کردار جو آگے چل کر خود کو سلطان کے نام سے متعارف کراتا ہے بچپن میں ہی لیسیر ہو گیا تھا۔

یتیم ہونے کے وقت بھی اس کی عمر بمشکل ۱۵ سال تھی ۔ اس واقعے کے سال بھر کے اندر ہی سلطان نامی یہ نوجوان ، بقول خود سیر و سیاحت کے شوق میں ترک وطن کر کے چلا جاتا ہے اور ملکوں ملکوں گھومنے یعنی آوارہ گردی کرنے کے بعد دور دراز کے کسی ملک میں سکونت پذیر ہو جاتا ہے ۔ وہیں شادی کر لینے کے بعد وطن عزیز سے اس کے بچے کچھے رشتے ناطے بھی ٹوٹ کر رہ جاتے ہیں ۔ ناولٹ کے پہلے باب میں سلطان کی نفسیات کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ۔

"میں ایک طویل عرصے کے بعد اس خطہ زمین پر دوبارہ قدم رکھ رہا تھا جو میرا آبائی وطن تھا ، مگر سفر کی تھکان سردی اور بے خوابی کی وجہ سے دل و دماغ پر کچھ ایسا بوجھ تھا کہ نہ تو حب وطن نے میرے دل میں سوز و گداز کی کوئی کیفیت پیدا کی اور نہ وہ عرفانی مسرت ہی حاصل ہوئی جو وطن واپس آنے پر عموماً لوگوں کو ہوا کرتی ہے ۔ اسکے بر عکس میں یہاں آ کر ایک اجنبیت سی محسوس کرنے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد منزل مقصود پر پہنچ جاؤں ۔"

میں غلام عباس کے کرداروں کی انفرادیت اور عام روش سے ہٹ کر سوچنے والی ان کی عادت سے متعلق کچھ بحث اپنے پچھلے مضمون (مطبوعہ سوغات شمارہ ۔ ۶) میں کر چکا ہوں ۔ مندرجہ بالا پیراگراف سے بھی اسی طرح کا تجربہ ہوتا ہے بلکہ ذہن کو ایک جھٹکا سا لگتا ہے ۔

عام انسانی فطرت کے مطابق ہوتا تو یہ چاہئے تھا کہ پورے بیس برس بعد اپنے وطن لوٹنے والا یہ شخص و فور جذبات سے پاگل ہوا اٹھتا ۔ عمر وقت اور موسم کا لحاظ کئے بغیر وطن عزیز کے گلی کوچوں کی خاک چھاننے کے لئے نکل جاتا ۔ ہر آنے جانے والے شخص کے چہرے پر نظریں گاڑ کر یہ اندازہ لگانے کی کوشش کرتا کہ کہیں اس پر پرانے تعلقات اور شناسائی کا کوئی دبیز پردہ تو پڑا ہوا نہیں ہے ۔ لیکن اس پیراگراف میں جس شخص سے ہماری ملاقات ہوتی ہے وہ اپنے دل کے نہاں خانے میں موجود جذبات کی روشن اور نیم روشن چنگاریوں کے باوجود ، اپنی وطن واپسی کا ذکر نہایت ہی غیر جذباتی بلکہ سرد لہجے میں کرتا ہے ۔ اسکے یہاں فراق صاحب کے اس مشہور شعر ۔

پلٹ رہے ہیں غریب الوطن پلٹنا تھا
وہ کوچہ کوچہ جنت ہو گھر ہے گھر پھر بھی

والی کیفیت کا دور دور تک پتہ نہیں چلتا ۔ سوال یہ ہے کہ جب اسے اپنے قصبے سے کوئی خاص تعلق خاطر یا لگاؤ ہی نہیں تھا تو پھر اتنے طویل عرصے کے بعد اس نے وہاں آنے کا قصد ہی کیوں کیا ۔ دراصل اسکے اس سفر کا تعلق جذباتی ضرورتوں سے نہیں بلکہ مادی ضرورتوں سے تھا ۔ باپ دادا کی چھوڑی ہوئی جائداد و املاک میں چچیرے بھائیوں اور بہنوں کے علاوہ وہ خود بھی ایک حصے دار تھا ۔ آبائی جائداد کی فروخت کے سلسلے میں ہی اسکا وہاں آنا ہوا تھا ۔ اس موڑ پر جو بات بطور خاص کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ سلطان قصبے میں مقیم اپنے چچیرے بھائیوں اور بہنوں کی موجودگی کا ذکر تو کرتا ہے لیکن ناولٹ کے ختم ہونے تک ان میں سے کسی سے بھی قاری کی ملاقات نہیں ہو پاتی ۔

"گوندنی والا تکیہ" کے زیر نظر ابتدائی باب میں غلام عباس نے قصبے کا جو عمرانی نقشہ پیش کیا ہے وہ مشاہداتی عمومیت کی ایک اچھی مثال ہے ۔ بیسویں صدی کی ابتدا سے ہی بر صغیر کی قصباتی زندگی نت نئی تبدیلیوں سے دوچار ہوتی رہی ہے ۔ مادی ترقی اور خوشحالی نہ صرف جغرافیائی حدود اور معاشرتی ماحول پر اثر انداز ہوئی ہیں بلکہ لوگوں کی نفسیات پر بھی ان کے کبھی خوشگوار اور کبھی ناخوشگوار اثرات مرتسم ہوئے ہیں ۔ سلطان کا آبائی قصبہ اسی طرح کا ایک مثالی قصبہ ہے ۔

"اس بیس برس کے طویل عرصے میں جو میں نے باہر گذارا تھا ، قصبے کے اسٹیشن میں تو کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی ، البتہ اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی مجھے ایسا

معلوم ہوا جیسے کسی نئی جگہ پہنچ گیا ہوں۔ قصبہ بہت پھیل گیا تھا۔ جو علاقے میرے ہوش میں، اجاڑ پڑے رہتے تھے، وہاں اب چھوٹے، چھوٹے بازار بن گئے تھے۔ ہر طرف چہل پہل تھی۔ اسٹیشن کے باہر جہاں کبھی اکہ بھی مشکل سے ملا کرتا تھا، وہاں اب تانگوں اور ٹیکسیوں کے الگ الگ اڈے موجود تھے۔

مجھے دیکھتے ہی دو تین تانگے والے شور مچاتے ہوئے لپکے۔ میں نے ایک کوچوان کو چن کر جو مجھے نسبتاً شریف صورت نظر آیا اس ہوٹل کا پتہ بتایا جس میں ٹھہرنے کی مجھے وکیل نے ہدایت کی تھی۔"

اختصار کے ساتھ ہی سہی لیکن اس پیراگراف میں غلام عباس نے ہم عصر قصباتی موڈ کا قابل قدر اور قابل یقین تجزیہ پیش کر دیا ہے۔ بیس برس پہلے کا غیر ترقی یافتہ قصبہ تیزی کے ساتھ ترقی پذیر ہے۔ ایک کوچوان کے لئے انہوں نے "نسبتاً شریف صورت" کی اصطلاح استعمال کر کے بڑی خوبصورتی کے ساتھ یہ بات بھی کہہ دی ہے کہ کس طرح مادی ترقی انسانوں کو ذہنی اور روحانی طور پر کرپٹ کر دیتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے دیہاتوں اور قصبوں کے رہنے والے بھی مادی ترقی کی دوڑ میں شریک ہو کر فطری سادگی اور کردار کی معصومیت جیسی ان اقدار سے محروم ہو جاتے ہیں جو برصغیر کی صدیوں پرانی روایات کی مظہر ہوا کرتی تھیں۔ قصباتی شرافت پر شرارت آمیز فریب کا عنصر غالب آجاتا ہے۔ وغیرہ!

تانگے پر سفر کرتے ہوئے سلطان دیکھتا ہے کہ جابجا چھوٹے بڑے ہوٹل کھل گئے ہیں جبکہ اس کے زمانے میں یہاں صرف ایک سرائے ہوا کرتی تھی۔ سلطان کے لئے اسکے وکیل نے جس ہوٹل کا انتخاب کیا تھا وہ خاصا آرام دہ اور وہاں کا سب سے اچھا ہوٹل تھا۔ کوئی دو گھنٹہ آرام کرنے کے بعد سلطان ازراہ تفریح قصبے کی سیر کے لئے نکل پڑتا ہے۔ گھومتے گھامتے جب وہ اس بوسیدہ حویلی کے سامنے پہنچتا ہے جہاں اس کی نعل گڑی ہوئی تھی تو اچانک اسکے اندر کا وہ نوجوان جاگ اٹھتا ہے جو بیس برس پہلے ایک رات، کسی سے کچھ کہے سنے بغیر قصبے سے فرار ہو گیا تھا۔ گلی میں کھیلتے ہوئے بچوں کو دیکھ کر سلطان کو بے ساختہ اپنا بچپن یاد آجاتا ہے۔ وہی شخص جس کا دل دو گھنٹے پہلے تک، حب وطن کے سوز و گداز سے قطعاً ناآشنا یا کم از کم بے خبر تھا۔ بے خبری اور اجنبیت کے اس طلسم سے اچانک باہر آجاتا ہے، جو دوپہر سے اس پر مسلط تھا۔ اس بوسیدہ حویلی کے سامنے، طویل پر تفنع آرام دہ اور منظم شہری زندگی کا محل چشم زدن میں زمیں بوس ہو جاتا ہے۔

"میرا دل شدت جذبات سے بھر آیا۔ جی چاہتا تھا کہ بار بار اس کوچے کا طواف کروں۔"

مختصر یہ کہ سلطان کا سفر اس سے کہیں زیادہ اہم ثابت ہوتا ہے جتنا کہ اس نے سوچا تھا۔ اس کے تخیل کے دروازے یک بیک کھل جاتے ہیں۔ وہ بیس برس پہلے کے ماحول میں پہنچ جاتا ہے۔ وہ ماحول جو اس کی مجموعی زندگی میں عمیق ترین نفسیاتی حوالے کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دنیا میں پاتا ہے جو بہت کچھ لٹ پٹ جانے کے باوجود اسکے شعور میں زندہ ہے۔ گوندنی والا تکیہ بیس برس پہلے کی اس دنیا کا مرکزی نقطہ ہے۔ اس تکیہ کی زندگی ہی دراصل پورے قصبے کی زندگی ہے۔

غلام عباس نے مختلف کرداروں، مثلاً نگینہ سائیل، علیا، استاد خدا بخش فلک، مولو، مہتاب اور سلطان وغیرہ کے اعمال و اقوال کے توسط سے قصبے کی عمرانی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ اپنے بیشتر افسانوں کی طرح انہوں نے اس ناولٹ میں بھی طبیعی ماحول کو ماضی اہمیت دی ہے۔ کرداروں کی حسیات ان کے احساسات ایک دوسرے کے ساتھ ملنے جلنے کے طور طریقے، دلچسپیاں اور تفریحیں سب کچھ اسی ماحول کے مطابق ہیں جس میں یہ ناولٹ پروان چڑھتا ہے گوندنی والا تکیہ ہی سلطان کے بچپن اور نوجوانی کے زمانے کا مرکز و محور تھا۔ اس تکیے کے نام کی وجہ

تسمیہ گوندنی کے وہ درخت تھے جن پر تکیے کے نگراں بلکہ گاؤں بھر کے اخلاقی سرپرست نگینہ سائیں کی حکمرانی تھی ۔ پورا گاؤں نگینہ سائیں کا بڑا ادب کرتا اور اسے بادشاہو، کے لقب سے پکارتا تھا۔ قصبے میں پہنچتے ہی سلطان کو سب کچھ یاد آنے لگتا ہے ۔ وہ بڑی بیتابی کے ساتھ تکیے کا رخ کرتا ہے لیکن اسے

بہار تھی نہ چمن تھا نہ آشیانہ تھا
چھٹے اسیر تو بدلا ہوا زمانہ تھا

والی صورت حال سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔

"نہ میدان کا پتہ تھا، نہ تکیہ کا ۔ ہر طرف پختہ اینٹوں کے بنے ہوئے مکان نظر آرہے تھے، میں نے خیال کیا کہ شاید راستہ بھول گیا ہوں مگر پھر پھر کر ہر مرتبہ وہیں آنکلتا تھا جس جگہ تکیہ ہوا کرتا تھا وہاں اب ایک چار دیواری کھنچ دی گئی تھی ۔ میں نے اس کے دروازے کے اندر جھانک کر دیکھا تو ایک مدرسے کے آثار دکھائی دئے......"

بہت کچھ پوچھ گچھ کے بعد آخر کار ایک معمر شخص سلطان کو بتاتا ہے کہ اسکے ترک وطن کے دو تین سال کے اندر ہی نگینہ سائیں کا انتقال ہو گیا تھا اور اسکے بعد تکیہ ہر طرح کی اوباشی اور عیاشی کا اڈا بن گیا۔ چرس اور بھنگ کے شائقین کے علاوہ بازاری عورتیں بھی یہاں پوری آزادی کے ساتھ آنے لگیں تھیں ۔ جب گاؤں کے کچھ پڑھے لکھے اور سمجھدار قسم کے لوگوں سے شہری تہذیب کے ہاتھوں صاف شفاف اور معصوم قصباتی روایات کی بے حرمتی نہ دیکھی گئی تو انہوں نے وہاں ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ تکیہ میں موجود مستان شاہ کا مزار تو جوں کا توں رہا لیکن مجاوری کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ گوندنی کے اس ایک درخت کو چھوڑ کر جس کا سایہ مستان شاہ کی قبر پر پڑتا تھا، بقیہ سارے درخت کٹوا دیئے گئے ۔

تکیے کا خاتمہ دراصل اس پورے عہد کا خاتمہ تھا جس سے سلطان کی ابتدائی زندگی جڑی ہوئی تھی ۔ وہ ہوٹل واپس لوٹ جاتا ہے اسکے تخیل کے کینوس پر بیس برس قبل کا زمانہ جیتی جاگتی شکل میں انگڑائیاں لینے لگتا ہے ۔ پورے گاؤں کا چکر کاٹنے کے باوجود اس کی ملاقات کسی پرانے واقف کار یا رشتے دار سے نہیں ہوتی ۔ گوندنی والا تکیہ بے نشان ہو چکا ہے ۔ نئی نسل سے تعلق رکھنے والے اس کے نام تک سے ناآشنا ہیں ۔ لیکن سلطان کی ٹوٹی پھوٹی آبائی حویلی، مدرسے کے ایک کونے میں اب بھی موجود مستان شاہ کا مزار نیز باقیات و صالحات کی علامت کے مماثل گوندنی کا وہ تنہا درخت جو سلطان کے بچپن اور نوعمری کے زمانے کا مشاہد رہ چکا ہے اور جو اب بھی حسب دستور مستان شاہ کے مزار پر سایہ فگن ہے، یہ تمام چیزیں، اس کے ذہن کی گہرائیوں میں پوشیدہ یادوں کے خزانے میں ہلچل مچا دینے کے لئے کافی سے زیادہ ثابت ہوتی ہیں ۔ اس کی آنکھوں کے سامنے وہ سارے مناظر رقص کرنے لگتے ہیں جو وقت کے ایک بعد طویل عرصے کے گرد و غبار کے نیچے دب کر رہ گئے تھے ۔ ان چیزوں میں اب بھی اتنی توانائی ہے کہ وہ سلطان کو اس گذرے ہوئے زمانے کے بارے میں سب کچھ یاد کرنے پر مجبور کر دیں جسے وہ بھلا ہو چکا تھا یا جسے بھول جانے میں ہی، وہ لاشعوری طور پر عافیت محسوس کرتا تھا۔ غلام عباس ناولٹ کے پہلے باب کو ان سطور پر ختم کرتے ہیں ۔

"شام ہو چکی تھی ۔ کمرے میں خاصی خنکی تھی، مگر میں نے بجلی کا بلب روشن نہیں کیا تھا کیونکہ کمرے کی نیم تاریکی سکون بخش تھی ۔ میں کمبل اوڑھ کر آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ گوندنی والا تکیہ اپنی پوری گہما گہمیوں کے ساتھ میری نظروں میں پھرنے لگا....."

ناولٹ کے دوسرے باب سے لے کر بارہویں باب تک ان تمام حالات، حادثات اور واقعات کو بیان کیا

گیا ہے جن کا تعلق بیس سال پہلے کی قصباتی زندگی سے ہے اور سلطان جن کا عینی شاہد رہ چکا ہے۔ پورا بیانیہ صیغۂ حال میں ہے۔ دوسرے باب سے سلطان کی راوی والی حیثیت ختم ہو جاتی ہے اور وہ بھی دوسرے افسانوی کرداروں کی طرح ایک کردار بن جاتا ہے۔ عباس نے گوندنی والا تکیہ میں کرداروں کو بہت کافی اہمیت دی ہے۔ انہوں نے کرداروں کے توسط سے ہی قصباتی زندگی کے مختلف مظاہر مثلاً غربت، آپسی محبت اور مغائرت، انسانی رشتوں کی اہمیت، تہذیبی اقدار کی بالادستی، انفرادی نفسانی خواہشات پر نیکی کے غلبے اور پنچایت کی افادیت وغیرہ کو پیش کیا ہے۔

سارے کردار اپنی اپنی انفرادی خصوصیتوں کے باوجود اس اجتماعی معاشرتی ڈھانچے کا حصہ ہیں جس کا بیان اس ناولٹ کا بنیادی محرک ہے۔ آپ ان کرداروں پر جس زاوئے سے بھی نظر ڈالیں یہ سب کے سب درختوں پر لگنے والے نئے پتوں کی طرح صاف و شفاف دکھائی دیتے ہیں۔ ان سب کا وجود ایک دوسرے کے وجود کے ساتھ منسلک ہے معاشی طور پر غریب ہونے کے باوجود ان کی دل انسانیت، شرافت اور اخوت کی دولت سے مالا مال ہیں۔

غلام عباس نے فنکارانہ چابکدستی سے کام لیتے ہوئے ہمیں ان قصباتی کرداروں کے طبیعی، ذہنی اور نفسیاتی لینڈ سکیپ سے اس حد تک آگاہ کر دیا ہے کہ ہم ان کے ظاہری اعمال اور ان کے جذبات و احساسات کو ہی نہیں بلکہ ان کے بدن میں گردش کرتے ہوئے خون کو بھی بخوبی دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔

اس ناولٹ کا بنیادی تعلق مقامی زندگی اور ماحول کی نیرنگیوں، سکھ دکھ ضابطہ اخلاق اور اجتماعی موڈ سے ہے۔ گوندنی والا تکیہ گاؤں والوں کے لئے سماج، ثقافتی اور تفریحی کلب ہی نہیں بلکہ خود گاؤں کی علامتی شناخت ہے۔ جو کچھ برا بھلا ہوتا ہے یہیں ہوتا ہے۔ شاید اسی لئے ناولٹ میں بیان کردہ افسانوی واقعات کا دائرہ سفر بھی گوندنی والے تکیے تک ہی محدود رہتا ہے۔

غلام عباس کے بیشتر افسانوں کی طرح اس ناولٹ میں بھی کرداروں کے درمیان کوئی ایسی حد فاصل نہیں ہے جس کی بنیاد پر انہیں مرکزی اور ذیلی کرداروں کے خانوں میں تقسیم کیا جا سکے۔ ہر فرد اپنی اپنی جگہ پر قصباتی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو یا قدر کی نمائندگی کرتا نظر آتا ہے۔ دراصل یہ سارے کردار مل کر وہ اجتماعی منظر نامہ ترتیب دیتے ہیں جس کا نام ہے گوندنی والا تکیہ۔ تکیے کا متولی نگینہ سائیں قصباتی اقدار کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ امیر ہو یا غریب نگینہ سائیں سب کے ساتھ محبت اور شرافت کا سلوک کرتا ہے۔ محبت، شرافت اور انسانیت کی طاقت اسے تکیے کی حد تک ہی نہیں بلکہ گاؤں بھر میں محترم ترین حیثیت کا حامل بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ افسانوی واقعے اور بحران کے پس منظر میں وہ نہ صرف اہم بلکہ بےحد اہم کردار ادا کرتا ہے۔ چونکہ نگینہ سائیں ایک ایسا پاک سیرت، شریف النفس اور ایماندار شخص ہے جس کی اپنی کوئی آل اولاد نہیں ہے اس لئے وہ گاؤں کی بھلائی اور گاؤں والوں کی خدمت کو ہی اپنی زندگی کا مقصد اور نصب العین سمجھتا ہے۔

غلام عباس نے گوندنی والا تکیہ کی بجھ... میں ن... تجسس پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ جس طرح بدی کا عنصر کسی نہ کسی سطح پر انسانی تاریخ میں موجود رہتا ہے بالکل اسی طرح وہ انفرادی زندگی پر بھی اثر انداز ہوتا ہے یا اثر انداز ہو سکنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ زیر بحث ناولٹ میں یہی عنصر افسانوی کشمکش یا بحران کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے۔ دوسرے باب میں ہی ہم دیکھتے ہیں کہ جب گاؤں کا بوڑھا غریب بھانڈ علیا نگینہ سائیں سے اپنے نالائق بیٹوں کی شکایت کر رہا ہوتا ہے اور دوسری طرف کچھ لڑکے حسب دستور گوندنیاں توڑ کر درختوں سے نیچے اتر رہے ہوتے ہیں کہ اچانک ایک لڑکا دوسرے سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

"ارے مولوا دیکھ تو وہ کون آ رہا ہے؟"

"کہاں؟"

"وہ ادھر سڑک پر۔ وہ جس نے گیروے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ ایک عورت بھی تو ساتھ ہے اس کے، برقع اوڑھے ہوئے۔"

"ارے یہ تو استاد فلک ہے۔ تو جانتا نہیں۔ ہمارے قصبے کا پنجابی شاعر!"

"وہی نا جس کی بیٹی پٹواری کے گھر میں رہتی ہے؟"

"ہاں، ہاں وہی۔"

گاؤں کے دو نوعمر لڑکوں کے درمیان ہونے والا یہ مختصر سا مکالمہ ہی دراصل "گوندنی والا تکیہ" کے افسانوی بحران اور کشمکش کا مرکز و محور ہے۔

۴۵ سالہ استاد خدا بخش فلک ابتدائے عمر سے ہی لاابالی قسم کا انسان تھا۔ نہ تو وہ باپ کی سو کوششوں کے باوجود اس زمانے کے رواج کے مطابق بغدادی قاعدہ ختم کر پایا اور نہ ہی آڑھت کی آبائی دوکان پر بیٹھنے میں جی لگا سکا۔ باپ نے جب سختی کی تو ایک دن چپ چاپ لاہور بھاگ نکلا۔ اس نے وہاں گھریلو خادم کے طور پر بھی کام کیا اور یتیم خانوں کے لئے کمیشن پر چندہ جمع کرنے کا بھی لیکن درحقیقت وہ ان کاموں کے لئے پیدا ہی نہیں ہوا تھا۔ آخر اسے ایک ایسے شخص کا ساتھ نصیب ہو گیا جو پنجابی کے مقبول عام گانوں کی کتابیں گا گا کر بیچا کرتا تھا۔ خدا بخش کی آواز پہلے سے ہی سریلی تھی۔ پنجابی گانوں کو تواتر سے گاتے رہنے کا نتیجہ نکلا کہ وہ خود بھی مصرعے موزوں کرنے لگے۔ دھیرے دھیرے خدا بخش جس نے اب تک اپنا تخلص فلک رکھ لیا تھا پنجابی زبان کے عوامی شاعر کی حیثیت سے پورے صوبے میں مشہور ہو گیا۔ آخر کار جب قصبے کے کسی شخص نے خدا بخش کا شائع شدہ کلام اس کے بوڑھے اور بیمار باپ کو دکھایا تو اس نے بیٹے کو یہ کہہ کر صدق دل سے معاف کر دیا کہ

"ہمارے خاندان میں آج تک کوئی نالائق پیدا نہیں ہوا تھا، پھر خدا بخش کیسے خاندان کی عزت کو بٹہ لگاتا۔"

اسی دوران خدا بخش کو اپنی ماں کے خط کے ذریعے باپ کی شدید بیماری کی اطلاع ملی اور وہ فوراً روانہ ہو گیا۔ باپ بھی گویا اسے ایک نظر دیکھ لینے کا ہی منتظر تھا۔ ادھر خدا بخش نے گھر میں قدم رکھا اور ادھر باپ کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو گئیں۔ ماں نے کچھ دنوں بعد ایک یتیم لڑکی کے ساتھ اس کی شادی کر دی۔ جلد ہی وہ ایک ننھی منی سی خوبصورت لڑکی کا باپ بن گیا۔ چند سال تک خدا بخش کی زندگی سکون اور خوشحالی کے ساتھ گذری۔ مشاعروں اور دوکان سے ہونے والی آمدنی اس کے گھر کے اخراجات کے لئے کافی تھی۔ لیکن یہ پرسکون متابل زندگی دیرپا ثابت نہ ہو سکی۔ جب اس کی بیوی دوسری بار ماں بننے والی تھی تو اچانک ایک دن سیڑھیوں سے گر پڑی۔ اس حادثے نے بچے کے ساتھ ساتھ ماں کی بھی جان لے لی۔ خدا بخش کے لئے یہ سانحہ ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ مسلسل کئی دنوں تک وہ دیوانہ وار قصبے کی خاک چھانتا پھرا اور پھر بچی کو اپنی ماں کے حوالے کرنے کے بعد لاہور چلا گیا۔ جہاں سے ہر ماہ پابندی سے دادی پوتی کے گذارے کے لئے کچھ روپے بھیج دیتا تھا۔

حالات نے ایک بار پھر ڈرامائی کروٹ بدل۔ ابھی وہ لاہور ہی میں تھا کہ اچانک ایک دن اسے قصبے کے پٹواری کا خط ملا جس میں لکھا تھا کہ:

"تمہاری ماں فوت ہو گئی ہے اور تمہاری بیٹی مہتاب کو جس کا قصبے میں کوئی والی وارث نہ تھا میری بیوی اپنے گھر لے آئی۔ تم آکر اس کی پرورش کا انتظام کرو۔"

خدا بخش فوراً ہی قصبہ پہنچا، ماں کے غم میں رویا دھویا، پٹواری کی منت سماجت کی کہ وہ مہتاب کی پرورش و پرداخت کی ذمے داری قبول کرلے۔ اخراجات کے لئے وہ ماہانہ کچھ رقم بھیجتا رہے گا۔ اس وقت مہتاب کی عمر صرف چار سال تھی۔ دس بارہ سال کے عرصہ میں مہتاب بڑی ہو کر ایک نوجوان خوش شکل لڑکی بن گئی۔ سلطان اور مولو بھی

نوجوانی کی سرحدوں میں قدم رکھ چکے تھے۔ مولو ایک بے حد غریب کسان کا بیٹا تھا جبکہ سلطان کا تعلق قصبے کے ایک معزز اور متمول خاندان سے تھا۔ سلطان کے والد چوہدری حشمت علی کے انتقال کے بعد اس کے چچا رحمت علی اور ان کی اہلیہ نے سلطان کی دلجوئی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن اس کا دل اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت گوندنی والے تکیے میں جاسوسی ناولیں پڑھتے ہوئے گذارتا۔ سماجی مرتبے میں فرق ہونے کے باوجود مولو اس کا واحد اور عزیز ترین دوست تھا۔ مولو مہتاب کے عشق میں بری طرح مبتلا تھا۔ غلام عباس نے اس سلسلے میں تفصیل میں جائے بغیر ایک موقعے پر مولو کے لئے مہتاب کی زبان سے "بھیا" کا لفظ کہلوا کر بات صاف کر دی ہے۔ جہاں تک سلطان کا سوال ہے وہ ناولٹ کے اختتام پر اعتراف کرتا ہے:

"میں نے مہتاب کے عشق کا دم کبھی نہیں بھرا تھا لیکن اس کے باوجود، جب کبھی اس کی نظریں، خواہ میں مجمع میں کہیں بھی کھڑا ہوتا، اور خواہ وہ مجمع کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہوتا، میرا کھوج لگا ہی لیتیں اور پھر جلد ہی جھک جاتیں۔ اس کے ساتھ ہی اس کے پھول جیسے شاداب رخسار تمتما اٹھتے۔ یہ کیفیت دیکھ کر میرے دل میں بھی، خواہ وقتی طور پر ہی سہی، ہلچل سی پیدا ہو جاتی اور مجھے خود پر فخر سا محسوس ہونے لگا۔"

سلطان کے تئیں مہتاب کے معصوم اور گرم جذبات کا دائرہ اگرچہ کہ پھیلنے نہیں پاتا لیکن جیسا کہ آگے چل کر پتہ چلتا ہے مہتاب کے دل میں سلطان کی محبت کا پودا بڑھتے بڑھتے ایک ایسا درخت بن جاتا ہے جس کی جڑیں بےحد مضبوط ہوتی ہیں۔ دوسری طرف مولو اپنے دل سے مہتاب کے عشق کے نقوش کو مٹانے میں ناکام رہتا ہے۔ سلطان کی دوسری دلچسپیاں اسے اپنے اور اپنے سے زیادہ مہتاب کے جذبات کی شدت کو محسوس نہیں کرنے دیتیں۔

ان چیزوں کو غلام عباس نے کسی خاص ڈرامائی شدت سے بیان نہیں کیا لیکن گاؤں میں خدا بخش کے ساتھ کسی انجان شہری عورت کا قدم رکھنا یقیناً ایک اہم ڈرامائی واقعہ ہے۔ پٹواری شمس الدین اور استاد خدا بخش فلک کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ بقول خدا بخش اس عورت کا تعلق لاہور کے ایک معزز اور مالدار گھرانے سے ہے نیز وہ عورت مہتاب کے رشتے کی غرض سے آئی ہے۔ پٹواری مہتاب سے جسے اس نے پال پوس کر بچی سے جوان کیا ہے کسی قیمت پر بھی دستبردار ہونے کو تیار نہیں ہے۔ وہ اس مسئلے پر پنچایت بلانے کی بھی دھمکی دیتا ہے۔

دوسری طرف تکیے میں گہما گہمی اچانک بہت بڑھ جاتی ہے۔ استاد خدا بخش فلک کی آمد کی خوشی نیز اس کے اعزاز میں ایک عظیم الشان مشاعرے کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں۔ اس درمیان فلک کے ساتھ آنے والی برقعہ پوش عورت جو گاؤں کی ٹوٹی پھوٹی سرائے میں مقیم رہتی ہے گاؤں والوں کے نزدیک شہری اخلاقی آلودگی کی علامت بن جاتی ہے۔ پٹواری کے ساتھ مولو کو بھی اس کی آمد کی حقیقی غرض و غایت معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ سلطان سے درخواست کرتا ہے کہ مہتاب کے ساتھ شادی کر کے اسے اس عورت کے چنگل سے بچالے۔ سلطان کے لئے ایسا کرنا بہت آسان تھا۔ اس کا چچا رحمت علی اس کی دلجوئی کے لئے مہتاب جیسی غریب لڑکی کو بھی اپنی بہو بنا سکتا تھا۔ جہاں تک پٹواری کا سوال ہے وہ چوہدری رحمت علی کے سامنے منہ کھولنے کی جرات بھی نہیں کر سکتا تھا لیکن سلطان کے دل میں سیر و سیاحت کا جو شوق تھا وہ اسے شادی کی زنجیر اپنے قدموں میں ڈالنے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔

ایک رات انہیں خیالات کے تانے بانے میں الجھا ہوا سلطان ٹہلتا ٹہلتا اس سنسان علاقے کی طرف نکل جاتا ہے جہاں سرائے واقع تھی۔ وہ ایک صاف ستھری جگہ پر لیٹ گیا اور مہتاب، مولو، اس عورت، فلک اور پٹواری وغیرہ کے رشتوں کی پیچیدگیوں میں گم ہو گیا۔ اچانک اسے سرائے کے باہر کچھ سائے سے نظر آئے۔ یہ وہی پرانی سرائے تھی جس کا ذکر غلام عباس ناولٹ کے آغاز میں کر چکے ہیں۔ دھیرے دھیرے باتوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں، جیسا کہ

اوپر کہا جاچکا ہے سلطان کو شروع سے ہی جاسوسی ناولوں کے مطالعے سے گہرا شغف تھا اور یہ ناول مستقل طور سے اس کے مطالعے میں رہا کرتے تھے ۔ ان ناولوں کے کئی کردار اس کے لاشعور کا حصہ بن چکے تھے ۔ اس رات ان سایوں کو دیکھ کر اور بات چیت کی آواز سن کر اس کے اندر کا جاسوس اچانک بیدار ہو جاتا ہے ۔ وہ چھپ کر ان کی باتیں سننے کا فیصلہ کرلیتا ہے ۔ تھوڑی دیر بعد اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ سائے دراصل استاد فلک اور عورت کے تھے ۔ وہ دونوں بھی کچھ فاصلے پر لیٹ جاتے ہیں ۔ انہیں وہاں کسی تیسرے شخص کی موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوتا ۔ عورت کی باتوں سے اسے استاد کی جانب سے جسمانی پیش قدمی کا اشارا ملتا ہے ۔ عورت فلک سے خود کو ہاتھ نہ لگانے اور پرے ہٹ کر لیٹنے کے لئے کہتی ہے ، اگرچہ یہ اجتناب اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ دونوں اس سے پہلے کبھی بغل گیر ہونے ہی نہیں تھے ۔ بعد ازیں استاد اور عورت کے درمیان کچھ اس طرح گفتگو ہوتی ہے ۔

"تم بڑی ظالم ہو خورشید!"

یہ کہہ کر استاد نے ٹھنڈا سانس لیا ۔ پھر اس سے ذرا ہٹ کے گھاس پر لیٹ گیا ۔

"خدا بخش تم مہتاب کو کب دکھلاؤ گے ؟"

"ابھی ذرا اور صبر کرو خورشید! مہتاب کہیں بھاگی نہیں جاتی ۔ وہ میری بیٹی ہے اور جب تم مجھے اپنی غلامی میں لو گی تو تم شرعاً اس کی ماں ہو گی ۔ تم کو اختیار ہو گا کہ جس طرح چاہو اسے رکھو اور جس قسم کی تعلیم اسے چاہو دلواؤ ۔"

اس گفتگو کو سنتے ہی سلطان پر ساری حقیقت منکشف ہو جاتی ہے ۔ وہ اگر ایک طرف رات کے اندھیرے میں بھی عورت کا حقیقی چہرہ دیکھ لیتا ہے تو دوسری طرف استاد فلک کے جسم پر ہوس کی رینگتی ہوئی چیونٹیوں کو بھی محسوس کر لیتا ہے ۔ استاد فلک اور عورت کے درمیان پائے جانے والے رشتے سے آگہی اس کے معصوم لیکن بالغ ذہن پر گہرے اثرات مرتسم کرتی ہے ۔ وہ غیر شعوری طور پر خود کو مہتاب کے مسیحا کے کردار میں قبول کر لیتا ہے ۔ اس طرح غلام عباس ایک سماجی مسئلے کو پوری شدت کے ساتھ پیش کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں ۔ وہ سلطان کے ذریعہ قاری کو یہ یقین دلا دیتے ہیں کہ قصباتی تقدس کو شہری آلودگیوں سے بچانا ایک اہم انسانی فریضہ ہے ۔ انفرادی سطح پر سلطان کا تعلق بھلے ہی دوسرے طبقے سے ہو لیکن وہ اپنے کو اس مہتاب سے پوری طرح شناخت کئے بغیر نہیں رہ سکتا جس پر قصباتی روایات کے مطابق گاؤں والوں کا اتنا ہی حق ہے جتنا اس کے باپ استاد فلک کا ہے ۔ وہ جب وہاں سے اٹھتا ہے تو ایک ایسا نارائن نوجوان بن کر اٹھتا ہے جس کا مقصد مہتاب کو متوقع استحصال سے بچانا ہے ۔ اس پورے منظر میں عباس نے سلطان کے جذبات کو باقاعدہ یا تفصیل سے بیان نہیں کیا ۔ اس کے جذبات حالات ہی میں مضمر ہیں ۔ اب سلطان ، جو عموماً دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کا عادی تھا اپنے آپ کو مہتاب کے تحفظ کے لئے دو رخی لڑائی لڑنے پر پوری طرح آمادہ کر لیتا ہے ۔ ایک طرف تو وہ عورت ہے جس پر بہ آسانی قحبہ فروش ہونے کا شک کیا جاسکتا ہے اور دوسری طرف شمس الدین پٹواری ہے جو مہتاب کی شادی اپنے لنگڑے بھتیجے کے ساتھ کرنا چاہتا ہے ۔ واقعات کے اس موڑ کو ناولٹ کے ساختیاتی کلائمکس سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے ۔

سلطان مہتاب کو پٹواری اور اس عورت دونوں کے دست ہوس سے نکالنا چاہتا ہے ۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مہتاب اس کی طرف ملتفت ہے سلطان کے اس فیصلے میں اس کی ذاتی غرض یا محبت کا قطعاً کوئی عمل دخل نہیں ہے ۔ وہ خالص انسانی جذبہ ہمدردی کے تحت گاؤں کی ایک معصوم ، یسیر اور بھولی بھالی لڑکی کی مدد کرنے کا خواہاں ہے ۔ وہ سیدھا نگینہ سائیں کے پاس جاتا ہے ۔ رات کے اندھیرے میں اس نے جو کچھ بھی دیکھا اور سنا تھا اسے من و عن بیان کرنے کی نہ تو اس کی اخلاقی حس اجازت دیتی ہے اور نہ ہی ایسے الفاظ اس کے تہذیبی اور معاشرتی لغت میں شامل ہیں ۔ پھر بھی سلطان نگینہ سائیں کے اصرار پر ڈھکے چھپے انداز میں سارا ماجرا بیان کر دیتا ہے ۔

اس درمیان استاد فلک اور پٹواری کے درمیان گفت و شنید کا سلسلہ برابر جاری رہتا ہے۔ دونوں "چڑیا اپنی گھات، بہلیا اپنی گھات" کے مصداق نظر آتے ہیں۔ غلام عباس نے پیشے کے اعتبار سے شمس الدین کے لئے "پٹواری ہونے" کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے۔ روایتی طور سے پٹواریوں کی کمال بہت پہنچی ہوئی رہتی ہے۔ آراضیات کے کھاتوں میں الٹ پھیر کرنا اور کسی ایک شخص کے کھاتے کی زمین کو دوسرے شخص کے کھاتے میں ڈال دینا پٹواریوں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے۔ پٹواری شمس الدین حسب عادت بالکل یہی طریق کار مہتاب کے سلسلے میں بھی اپناتا ہے۔ وہ مہتاب کو اس کے باپ کے کھاتے سے نکال کر ہمیشہ کے لئے اپنے کھاتے میں ڈال لینے کا تہیہ کر چکا ہے۔ خود اس عورت کو پٹواری کی طاقت کا احساس ہے۔ اسی لئے وہ ایک موقع پر فلک سے کہتی ہے کہ "گاؤں میں پٹواری کا بڑا مان ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں تمہارا ساتھ کون دے گا؟"

لیکن استاد فلک کو یقین ہے کہ مشاعرہ کے بعد گاؤں والوں پر اس کا ایسا رنگ جم جائے گا کہ گاؤں والے پٹواری کے مقابلے میں اسی کا ساتھ دیں گے۔ اس درمیان پٹواری مختلف طریقوں سے استاد کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ مہتاب کے لئے جو رشتہ لایا ہے وہ بالکل نامناسب ہے اور یہ کہ جب اس نے مہتاب کو پال پوس کر جوان کیا ہے تو اس کی شادی کی ذمے داری بھی اسی کو سونپ دی جانی چاہیے۔ آخر میں پٹواری دھمکی آمیز لہجے میں کہتا ہے:

> "دیکھو خدا بخش! لڑکی کی بھلائی اور تمہاری عقل مندی اسی میں ہے کہ تم اس معاملے کو یہیں ختم کردو اور ان بی صاحبہ کو لے کر چل دو۔ اگر تمہیں اس رشتے سے کسی اور کسی قسم کا فائدہ اٹھانا مقصود ہے اور تم اس پر اڑے رہے تو یاد رکھو کہ میں اس معاملے کو پنچوں کے سامنے لائے بغیر نہیں چھوڑوں گا۔"

اس درمیان مولو پنگھٹ پر موقع پا کر ایک طرف اگر مہتاب کو ساری صورت حال سے آگاہ کر دیتا ہے تو دوسری طرف سلطان سے درخواست کرتا ہے کہ وہ مہتاب کے ساتھ شادی کر کے اس کی زندگی کو تباہ ہونے سے بچا لے لیکن سلطان یہ طے کر چکا ہے کہ اسے کیا کرنا چاہیے اور کس طرح کرنا چاہیے۔

ساتھ ہی ساتھ باقاعدہ ہدایت سے پہلے ہی پٹواری گوندنی والے تکیے کے ایک درخت کے نیچے سلطان کے چچا چودھری رحمت علی سمیت گاؤں کے کچھ متمول اور معزز لوگوں کو جمع کر کے ان کے سامنے بڑے درد بھرے انداز میں فلک کی "حرکات شنیعہ" کا بیان کرتا ہے اور حاضرین کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرتا ہے کہ اس نے مہتاب کو اپنی بیٹیوں کی طرح پالا ہے۔ بالآخر مشاعرے کی شب آجاتی ہے۔ مشاعرہ کے آغاز سے قبل جب استاد فلک رمز و کنایہ سے بھرپور اپنی وہ تقریر کر رہا ہوتا ہے جس کے غیظ و غضب کا حقیقی مخاطب پٹواری ہوتا ہے اسی وقت سلطان کی رگ شرارت پھڑک اٹھتی ہے۔ وہ مولو کو لے کر سرائے پہنچتا ہے اور خورشید کو بتاتا ہے کہ استاد کے شاگردوں اور پٹواری کے آدمیوں میں زبردست جھڑپ ہو گئی ہے۔ خون خرابے تک کی نوبت آگئی تھی۔ ان حالات میں استاد فلک نے یہ پیغام دیا ہے کہ وہ فوراً ہی لاہور روانہ ہو جائے۔ اس سے پہلے کہ خورشید کچھ سمجھ سکتی، سلطان کے بنائے ہوئے منصوبے کے تحت مولو اس کا سامان اٹھا لیتا ہے۔ تینوں اسٹیشن کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں اور اس طرح سلطان خورشید کو گاؤں سے دفع کر دیتا ہے۔ فکشن رائٹر کی حیثیت سے غلام عباس زبردست حس مزاح کے حامل تھے۔ انہیں المناک ترین لمحوں میں بھی مزاح کی چاشنی بکھیرنے پر پوری قدرت حاصل تھی۔ اگرچہ پورا ناولٹ المیہ نگاری کا مرقع ہے لیکن سلطان مولو کی مدد سے جس طرح اس قطامہ کو گاؤں سے دفع کرتا ہے وہ غلام عباس کی حس مزاح کا بہترین نمونہ ہے۔

مشاعرے کے بعد استاد فلک سیدھا سرائے پہنچتا ہے، جہاں اسے خورشید تو نہیں ملتی لیکن نگینہ سائیں اس کا منتظر رہتا ہے۔ وہ سیدھے اور صاف انداز میں فلک سے دھیان دے کر اپنی باتیں سننے کے لئے کہتا ہے۔

"یہ عورت جسے تم ٹھیکیدارنی ظاہر کر رہے ہو میں جانتا ہوں کس طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور تمہاری بیٹی سے کیا کام لینا چاہتی ہے۔ اپنے مطلب کی خاطر وہ تم سے جھوٹی محبت کا اظہار کر رہی ہے اور تم دنیا کا اتنا تجربہ رکھنے کے باوجود اس کے مکر و فریب کا شکار ہوگئے۔ دیکھو ہوش میں آؤ ہوس کے پتلے نہ بنو۔ یاد رکھو ایک باپ کی حیثیت سے اللہ اور اس کے رسولؐ نے تم پر کچھ فرض عائد کئے ہیں جن کو تم اپنی نفسانی خواہشات کی ہوس میں بھول چکے ہو۔۔۔۔"

اس کے باوجود کہ استاد خدا بخش فلک اپنی نفسانی خواہشات کے دباؤ میں آکر اپنی اکلوتی اور بے ماں کی بیٹی کو بھی قربان کر دینے پر تلا ہوا رہتا ہے، غلام عباس نے اسے بنیادی طور پر ایک شریف اور نیک دل انسان کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شہری ماحول اور ہر طرح کے افکار سے بے نیاز ہو کر آزادی اور آوارگی کی زندگی گذارنے کے بیشمار مواقع نے فلک کو ذہنی اعتبار سے کرپٹ کر دیا ہے لیکن اس کے لاشعور میں ابھی ایک باپ زندہ ہے۔ چنانچہ پدرانہ شفقت اور محبت کا پاکیزہ جذبہ اس کی اپنی بے راہ آلودگیوں پر غالب ہوتا دکھائی دیتا ہے۔

آخر کار وہ نگینہ سائیں کی شفقت آمیز ڈانٹ سننے کے بعد اپنی جسمانی خواہشوں اور قوت ارادی کی کمزوریوں پر قابو پالینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ احساساتی سطح پر وہ اپنی سابقہ زندگی کے طور طریقوں کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہنے پر بھی آمادہ نظر آتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ قصبے میں اس کے لئے کشش کا کوئی سامان ہے اور نہ ہی بود و باش اور کھانے پینے کا کوئی وسیلہ۔ باپ کی آڑھت والی دکان برسوں پہلے فروخت ہو چکی ہوتی ہے۔ ان حالات میں اگر خدا بخش فلک شہر واپس چلا جائے تو یقینی طور سے وہ ایک بار پھر اسی ماحول کا شکار ہو کر رہ جائے گا جس نے اسے جسمانی اور روحانی دونوں اعتبار سے آلودگیوں کا ڈھیر بنا کر رکھ دیا تھا۔ غلام عباس نے اس پیچیدہ کشمکش کا جو افسانوی حل پیش کیا ہے وہ قابل قبول بھی ہے اور ناگزیر بھی۔

یہیں سے ناولٹ میں ایک نیا لوچ اور نیا تحرک پیدا ہو جاتا ہے۔ اسے نگینہ سائیں کی باتیں سن کر زندگی کا ایک ایسا تجربہ ہوتا ہے جس سے وہ اب تک بالکل ہی ناواقف تھا۔ نگینہ سائیں کی شکل میں اسے ایک ایسا فرشتہ دکھائی دیتا ہے جو مشفق بھی ہے اور جس کا کام اس کے اعمال کا احتساب کرنا بھی ہے۔ فلک کو دولت، شہرت اور خورشید کی محبت غرضیکہ ہر چیز مہتاب کے مستقبل کے سامنے ہیچ نظر آنے لگتی ہے۔ اس کے اندر چھپی ہوئی بصیرت بیدار ہو جاتی ہے اور وہ اچانک نیک و بد میں تمیز کرنے کے قابل بن جاتا ہے۔

غلام عباس ایک ہی فنکارانہ جھٹکے میں، فلک جیسے لاابالی شاعر اور ہوس پرست انسان کو ایک شفیق باپ اور دیانتدار انسان میں بدل دیتے ہیں۔ استاد فلک نگینہ سائیں کے سامنے بلک بلک کر رونے لگتا ہے۔ وہ نہ صرف گڑگڑا کر معاف کر دیئے جانے کی درخواست کرنے لگتا ہے بلکہ اسی لمحے یہ بھی طے کر لیتا ہے کہ وہ قصبے کے کسی شریف نوجوان کے ہاتھ میں مہتاب کا ہاتھ دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مکہ مدینہ چلا جائے گا۔

نگینہ سائیں بھی آبدیدہ ہو کر اسے یوں سینے سے لگا لیتا ہے "جیسے کوئی ماں اپنے بچے کی خطاؤں کی چشم پوشی کرکے اپنی آغوش اس کے لئے کھول دے۔" دوسرے دن پنچایت میں استاد فلک جب دوسری بار گاؤں والوں کے سامنے تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے تو ایک بالکل ہی نئی شکل میں نظر آتا ہے۔ وہ دوران تقریر اپنی غلطیوں، خامیوں اور کوتاہیوں کا جس کھلے دل سے اعتراف اور ان پر جس طرح سے شرمساری کا اظہار کرتا ہے اس سے گاؤں والے اچانک ایک خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ گاؤں والوں کو استاد فلک جیسے سیلانی اور آوارہ مزاج شخص سے ہرگز ایسی باتوں کی توقع نہیں تھی۔ فلک پنچایت سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

"بھائیو! پٹواری صاحب کا میں احسان مند ہوں۔ خدا ان کو خوش رکھے۔ مجھے افسوس

ہے کہ ان کو میری طرف سے کچھ بدگمانی پیدا ہو گئی ہے لیکن میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا دل ان کی طرف سے صاف ہے۔

بھائیو! شاید وطن میں یہ میرا آخری پھیرا ہو۔ اس لئے چاہتا ہوں کہ اپنی بیٹی کی طرف سے سبکدوش ہو جاؤں۔ صاحبو مجھے کسی امیر گھر کی بھی تمنا نہیں، میرا داماد چاہے جتنا غریب ہی کیوں نہ ہو لیکن وہ اس کے گھر میں بس جائے اور خوش رہے بس اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں چاہتا۔ میں تو ایک گنہگار انسان ہوں اور اپنے مولا سے بخشش کا امیدوار ہوں۔"

یہ کہتے کہتے اس کی آواز بھرا گئی اور وہ بیٹھ گیا۔

استاد فلک کا اپنے گناہوں کا اعتراف کرنے کے علاوہ یہ کہنا کہ وہ حج کو جانے کا ارادہ رکھتا ہے اور شاید اس کے بعد وہ پھر کبھی گاؤں واپس نہ لوٹ سکے نہ صرف پنچایت میں موجود سبھی افراد کو (پٹواری کے علاوہ) متاثر کرتا ہے بلکہ یہیں سے مہتاب کا معاملہ گاؤں والوں کی اجتماعی ذمے داری بن جاتا ہے۔ اس موڑ پر پہنچ کر افسانوی جمالیات انسانی اخلاقیات سے پوری طرح ہم آہنگ ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں عمومی انسانی اخلاقیات پر بڑی حد تک زور دینے کے باوجود غلام عباس نے اس نکتے کو فراموش نہیں کیا کہ اخلاقیات پر ضرورت سے زیادہ زور فن پارے کو ادعائیت آمیز بنا دیتا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غلام عباس کسی بھی طرح کی ادعائیت کے قائل نہیں تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ ادعائیت پسندی نہ صرف فن پارے کی شدت تاثر کو مجروح کرتی ہے بلکہ حقیقت کو صحیح زاویے سے دیکھنے بھی نہیں دیتی۔ چنانچہ ان کے یہاں فن اور اخلاقیات کے درمیان جو تعلق ملتا ہے وہ گہرا (Subtle) اور مابعد الطبیعاتی قسم کا ہے۔

اسی لئے انہوں نے جان بوجھ کر فلک کی تقریر کو مختصر اور تمام تر اخلاقی نیز فلسفیانہ موشگافیوں سے الگ رکھا ہے۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ قاری دوسرے کرداروں کی طرح استاد فلک کو بھی صحیح تناظر اور سیاق و سباق میں دیکھنے کی کوشش کرے۔

جیسا کہ اوپر اشارا کیا جا چکا ہے سلطان معاملے کا حل نکالنے اور خاص طور سے پٹواری کی سازشوں کو بے اثر بنا دینے کی غرض سے پہلے ہی نگینہ سائیں کو پوری طرح اعتماد میں لے چکا ہوتا ہے۔ نگینہ سائیں ایک معمولی سا ملنگ ہونے کے باوجود گاؤں والوں کے لئے لاشعوری طور پر ایک زبردست اخلاقی قوت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے سلطان سے سب کچھ جان لینے کے بعد اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ پٹواری ماضی میں استاد فلک سے سرزد ہونے والی کوتاہیوں کا فائدہ اٹھا کر مہتاب کا استحصال کرنا چاہتا ہے۔ اسے یہ بات بھی معلوم ہے کہ چونکہ فلک ان وعدوں کو پورا نہیں کر سکا جو اس نے مہتاب کو پٹواری کی تحویل میں دیتے وقت کئے تھے اور یہی پٹواری کا سب سے بڑا ہتھیار ہے اس لئے جب وہ پنچایت کے سامنے تقریر کرنے کھڑا ہوتا ہے **تو اس کا ایک** اہم مقصد پٹواری کے اس ہتھیار کو کند بنانا بھی ہے۔ چنانچہ وہ اپنی تقریر کے اختتام پر یوں گویا ہوتا ہے:

"اب میں معاملے کے ایک اور پہلو کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جس وقت خدا بخش فلک نے اپنی بیٹی کو پٹواری کی سرپرستی میں دیا تھا تو کہا تھا کہ میں ہر مہینے لڑکی کا خرچ شہر سے بھیجتا رہوں گا۔ مگر تنگدستی یا کسی اور وجہ سے وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکا۔ لڑکی آٹھ دس برس تک پٹواری کے گھر میں ہی پلی بڑھی ہے۔ آخر اس عرصے میں اس کے کھانے پینے، کپڑے لتے پر کچھ نہ کچھ خرچ آیا ہی ہوگا۔ اگر پٹواری صاحب پسند فرمائیں تو اس امر کا بھی فیصلہ ہو جانا چاہیے کہ استاد فلک پر ان کی کس قدر رقم نکلتی ہے۔"

پٹواری یہ سن کر فطری طور پر گھبرا جاتا ہے۔ وہ اس معاملے کو ٹالنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ لیکن جب نگمینہ سائیں کے اصرار کے ساتھ ساتھ دوسرے حاضرین کا اصرار بھی بڑھتا ہے تو وہ بادل ناخواستہ یوں مخاطب ہوتا ہے:

"سائیں جی نے خواہ مخواہ یہ ذکر چھیڑ دیا ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ میں نے اس کی پرورش کسی لالچ سے نہیں کی بلکہ میں نے اور میری گھر والی نے اس کو اپنی بیٹیوں کی طرح سمجھا ہے اور ہم دونوں کی خواہش ہے کہ وہ ایسی جگہ بیاہی جائے جہاں وہ آرام سے اور خوش خوش رہے۔ خدا بخش کو ناحق اس کی فکر ہو گئی ہے، بھلا جہاں ہم نے اسے پال پوس کے اتنا بڑا کیا ہے، وہاں اس کی شادی کی فکر نہ کریں گے۔"

اتنا کہہ کر وہ بیٹھ گیا لیکن صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ اپنی اس تقریر سے سخت بے لطف ہوا ہے۔ اس بے لطفی کی واضح وجہ یہ تھی کہ نہ صرف پٹواری بلکہ سارا گاؤں اس حقیقت سے آگاہ تھا کہ "پٹوارن مہتاب بی بی سے نوکرانیوں سے بھی بڑھ کر کام لیا کرتی تھی۔ دونوں وقت کھانا پکانا، کنویں سے پانی بھر کر لانا، گائے بھینسوں کو سانی دینا، پٹوارن کے ہاتھ پاؤں دابنا، یہ سارے کام اس اکیلی جان کے ذمے تھے۔ اس لئے اس کی پرورش کے خرچ کا مطالبہ کرنا ایک نہایت ہی گھٹیا حرکت ہوتی۔"

دوسرے لفظوں میں یہ کہ پٹواری نے مہتاب پر جتنا خرچ کیا تھا اس سے کہیں زیادہ وصول کر چکا تھا۔ اس کا ایک مطلب یہ بھی ہوا کہ اس سلسلے میں فلک یا نگمینہ سائیں یا گاؤں کے دوسرے معتبر افراد کو کسی احساس جرم میں مبتلا ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ دراصل پٹواری اپنی تقریر کے بعد خود ایک طرح کے احساس جرم میں مبتلا ہو جاتا ہے اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نگمینہ سائیں پنچایت کے سامنے تجویز رکھتا ہے کہ مہتاب کی شادی مولو کے ساتھ کر دی جائے۔ سائیں وہاں موجود لوگوں کو یہ بھی بتاتا ہے کہ سلطان کے والد چودھری حشمت علی نے اپنی موت سے پہلے پانچ سو روپے یہ کہہ کر جمع کرائے تھے کہ انہیں کسی نیک کام میں صرف کیا جائے۔ وہ اب اسی رقم سے ایک قطعہ آراضی خرید کر مہتاب کو بطور جہیز دینا چاہتا ہے تاکہ مہتاب اور مولو کی گذر بسر کا سامان ہو سکے۔ ساری پنچایت کو یہ تجویز پسند آتی ہے۔

سلطان اپنے طور پر اپنے دیرینہ دوست مولو کے لئے نہ صرف اس کی پسندیدہ لڑکی کا انتظام کر دیتا ہے بلکہ اس کے گذر بسر کے لئے بنیادی وسیلہ بھی فراہم کر دیتا ہے۔ اسی رات وہ اپنے طویل اور انجان سفر پر روانہ ہو جاتا ہے اس دن کا گیا ہوا سلطان کہیں اب بیس برس کے بعد قصبے میں واپس لوٹتا ہے۔ ناولٹ کا آخری باب زمانے کے اعتبار سے ایک بار پھر حال سے وابستہ ہو جاتا ہے۔ ابھی سلطان اسی طرح کمبل اوڑھے کرسی پر بیٹھا ہوا اپنے خیال میں غرق تھا اور ماضی کے تصورات سے لطف اندوز ہو رہا تھا کہ اچانک دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ کمرے کا بلب روشن کر کے جب وہ دروازہ کھولتا ہے تو ہوٹل کا مینیجر اسے کسی ملاقاتی کی آمد کی اطلاع دیتا ہے۔ سلطان کا خیال اپنے وکیل کی طرف جاتا ہے۔ لیکن ملاقاتی وکیل کے بجائے لمبا تڑنگا زمیندار نما شخص ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو تھوڑی دیر تک غور سے دیکھتے ہیں اور پھر سلطان "مولو" کہہ کر اس سے لپٹ جاتا ہے۔

وہ مولو سے اس کے بال بچوں کی خیریت دریافت کرتا ہے لیکن مولو کا یہ جواب سن کر کہ "جب شادی ہی نہیں کی تو اولاد کیسے ہوجاتی؟" سلطان حیرت میں پڑ جاتا ہے۔ "کیا کہہ رہے ہو تم مولو؟ اور وہ جو مہتاب بی بی سے تمہاری سگائی ہوئی تھی؟ یہ اسی روز کی تو بات ہے جس روز میں یہاں سے بھاگا تھا۔"

اس کے بعد مولو سلطان کو تفصیل کے ساتھ بتاتا ہے کہ کس طرح اس کے گاؤں سے بھاگ جانے کے بعد مہتاب اچانک بیمار رہنے لگی۔ پٹواری نے یکے بعد دیگرے کئی حکیموں کو دکھایا لیکن کسی کے بھی علاج سے اسے کوئی

افاقہ نہیں ہوا۔ بقول مولو اچانک ایک دن اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ مہتاب کہیں سلطان کے غم میں تو مبتلا نہیں ہے ۔ چنانچہ جب اس نے اس کی ایک سہیلی زینب کے ذریعے یہ کہلوایا کہ "مہتاب! غم نہ کر، سلطان بابو کہہ گیا ہے کہ میں شہروں کی سیر کر کے دو مہینے میں لوٹ آؤں گا" تو مہتاب کی پاک اور بے لوث محبت کا کچا گھڑا ٹوٹ جاتا ہے ۔ وہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتی لیکن اس کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلتے ہیں ۔ ادھر مولو پر ساری حقیقت منکشف ہو جاتی ہے ۔ ادھر مہتاب دو مہینے دس دن انتظار کر کے انتقال کر جاتی ہے ۔

اس طرح غلام عباس نے ناول کے آخر میں ایک زبردست آئرانک (Ironic) صورت حال تخلیق کر دی ہے ۔ جس سلطان نے مہتاب کو بچانے کے لئے اپنے طور پر کافی قربانیاں دی تھیں، وہ خود ہی اس کی موت کا سبب بن گیا ۔ صورت حال یقیناً المناک ہے لیکن اسے غیر حقیقی نہیں کہا جا سکتا ۔ غلام عباس غیر معمولی حد تک عقلیت پسند فنکار ہیں زندگی کے تلخ حقائق کے اظہار میں وہ "اے محبت زندہ باد" قسم کے نعروں سے متاثر نہیں ہوتے ۔ مزید یہ کہ انہوں نے بڑی چابکدستی اور فنی مہارت کے ساتھ "گوندنی والا تکیہ" کو اس المناک کلائمکس تک پہنچایا ہے ۔ مہتاب کی ماں کا بچپن میں ہی انتقال کر جانا اور باپ کے لاتعلق ہونے کے علاوہ سلطان کا یتیم و یسیر ہو جانا بھی ناولٹ کے مجموعی تناظر میں خاصے اہم واقعات ہیں ۔ ماں کی غیر موجودگی میں مہتاب نہ صرف پٹواری کے گھر نوکرانیوں سے بدتر زندگی گذارنے پر مجبور ہوتی ہے بلکہ دنیا میں اس کے احساسات و جذبات کو سمجھنے والا بھی کوئی نہیں رہ جاتا ۔ اسی طرح اگر سلطان کے ماں باپ زندہ ہوتے تو وہ غالباً اتنی آسانی سے وطن سے راہ فرار اختیار نہیں کر سکتا تھا ۔ مولو کا المیہ یہ ہے کہ وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ مہتاب اسے بھیا کہہ کر پکار چکی ہے، اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے لیکن بالآخر مہتاب کو حاصل کرنے میں ناکام رہتا ہے ۔ ویسے مہتاب کی موت کے بعد مولو کا شادی نہ کرنا اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اسے مہتاب سے حقیقی عشق تھا، صورت حال کی یہ "آئرنی" قاری کے دل میں مولو کے لئے ہمدردی کا جذبہ پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکتی ۔

غلام عباس اپنی کسی بھی تحریر میں غیر ضروری ساختیاتی تبدیلی کر کے حالات کے دھارے کو موڑنے اور انجام کو جبراً خوشگوار بنانے کی کوشش نہیں کرتے ۔ گوندنی والا تکیہ میں بھی انہوں نے ایسا نہیں کیا ۔ اسی لئے ہمیں اس ناولٹ میں بچپن کے معصوم زمانے سے لے کر ادھیڑ عمر کے مایوس کن تجربات تک کا معروضی بیان ملتا ہے ۔ انہوں نے دراصل یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کا کاروبار یونہی چلتا ہے ۔ ہر فرد کو اپنے حصے کی مشکلوں، محرومیوں اور بدبختیوں کو برداشت کرنا پڑتا ہے ۔

مجموعی حیثیت سے "تکیہ گوندنی والا" غلام عباس کے عمومی افسانوی ادب سے آگے کی چیز نہ سہی لیکن لگا ضرور کھاتا ہے ۔ ناولٹ نگاری کے میدان میں اسے ان کی ایک نمایاں کامیابی سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ۔ غلام عباس نے اس ناولٹ میں بیسویں صدی کی ابتدا میں پائی جانے والی قصباتی زندگی کے سبھی اچھے، برے، کمزور اور طاقتور، خوبصورت اور کریہہ پہلوؤں کو پیش کر دیا ہے ۔ گوندنی والا تکیہ میں ڈرامائیت کی یقیناً کمی ہے لیکن اس سے قاری کا ذہنی تاثر اور تحرک، مجروح نہیں ہوتا۔

کافکا
ترجمہ: خالد سہیل

والد کے نام خط

(فرانز کافکا کے اپنے والد کے نام ایک طویل خط کے چند اقتباسات کا ترجمہ)

پیارے ابّو جان!

کچھ عرصہ پیشتر آپ نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں آپ سے اتنا خوفزدہ کیوں رہتا ہوں اور میں اپنی عادت سے مجبور آپ کے سوال کا جواب نہ دے سکا تھا۔ اس کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ میں آپ سے خوفزدہ تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ ایسے سوال کا جواب دینے کے لئے جن تفاصیل کا بیان کرنا ضروری تھا وہ میں گفتگو کے دوران یاد نہیں رکھ سکتا تھا۔ اب جبکہ میں اس سوال کا جواب لکھنے بیٹھا ہوں، مجھے اندازہ ہے کہ یہ تحریری جواب بھی نامکمل ہوگا کیونکہ لکھنے کے دوران بھی خوف میرے قلم کی زنجیر بن جائے گا اور وہ حقائق اور واقعات بیان نہ کر پاؤں گا جو میرے حافظے اور دلائل کے احاطے سے باہر ہوں گے۔

آپ کی نگاہ میں ہمارا یہ مسئلہ بہت سادہ اور آسان ہے۔ آپ نے کئی دفعہ میرے اور دوسرے لوگوں کے سامنے اپنا نقطۂ نظر بیان کیا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ آپ نے ساری عمر محنت کی، بچوں کے لئے اپنی ہر خوشی کو قربان کیا، خاص کر میرے لئے، جس کے نتیجے میں میں کامیاب ہوا۔ آپ کے خیال میں مجھے کسی قسم کی تکلیف کا سامنا نہیں کرنا پڑا اور مجھے ہر طرح کی آزادی دی گئی کہ میں اپنی زندگی جس طرح چاہے گزاروں۔ آپ نے کبھی بچوں سے "شکریے" کی امید نہیں رکھی کیونکہ آپ کی نگاہ میں بچوں کا اپنے والدین کا شکریہ ادا کرنا اُن کے جذبۂ ہمدردی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ آپ کا خیال ہے کہ میں ہمیشہ آپ سے چھپتا رہا ہوں کبھی اپنے کمرے میں، کبھی کتابوں میں، کبھی دیوانے دوستوں میں اور کبھی پاگل پن کے خیالات میں۔ میں نے کبھی آپ سے بے تکلفی سے بات نہیں کی، نہ ہی کبھی کاروبار یا عبادات میں دلچسپی کا اظہار کیا۔ میں نے کبھی آپ کا ہاتھ نہیں بٹایا، نہ ہی کبھی آپ کے لئے کوئی تحفہ خریدا (تھیٹر کا ٹکٹ تک نہیں) جب کہ میں اپنے دوستوں کے لئے بہت سے تحفے خریدتا ہوں۔ اگرچہ آپ نے کبھی مجھ پر مکاری یا دھوکہ بازی کا الزام نہیں لگایا (سوائے شادی کے معاملے میں) لیکن آپ ہمیشہ یہ سمجھتے رہے کہ میں احسان فراموش ہوں اور آپ سے نہایت سرد مہری سے پیش آتا رہا ہوں۔ ہمارے رشتے میں جو مسائل ہیں اس کے لئے آپ نے ہمیشہ مجھے ہی موردِ الزام

ٹھہرایا ہے۔ آپ خود اس سلسلے میں کوئی ذمہ داری لینے کے لئے تیار نہیں، سوائے اس کے کہ آپ مجھ سے کچھ زیادہ ہی مہربانی سے پیش آتے رہے ہیں۔

آپ ہمارے رشتے کے بارے میں کئی دفعہ اس قسم کے خیالات اور جذبات کا اظہار کر چکے ہیں۔ مجھے اس حد تک تو آپ سے اتفاق ہے کہ ہمارے رشتے کے تشنج میں آپ قصوروار نہیں ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ میں بھی خطاوار نہیں ہوں۔ اگر میں آپ کو اس بات کا قائل کر سکوں کہ ہم دونوں بے قصور ہیں، تو عین ممکن ہے کہ ہم اپنے رشتے کو ایک نیا موڑ دے سکیں۔ ایک نئی زندگی کا آغاز تو شاید اس عمر میں ممکن نہ ہو لیکن کم از کم بقیہ زندگی سکون و آشتی سے گزار سکیں اور دلوں میں چھپے غصے اور تلخی کے جذبات سے چھٹکارا حاصل کر سکیں۔

میرا خیال ہے کہ آپ ایک حد تک میری قلبی کیفیت سے واقف ہیں۔ کیوں کہ ایک دفعہ آپ نے مجھ سے کہا تھا "میں نے ہمیشہ تمہیں بہت عزیز رکھا ہے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ میں دوسرے باپوں کی طرح اپنے جذبات کا کھل کر اظہار نہیں کرتا کیونکہ میں اُن کی طرح ڈھونگ رچانا پسند نہیں کرتا۔"

ابو جان! مجموعی طور پر میں نے آپ کی نیک نیتی پر کبھی شک نہیں کیا لیکن میرا خیال ہے کہ آپ کا یہ جملہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے۔ یہ تو درست ہے کہ آپ نے کبھی ڈھونگ نہیں رچایا لیکن یہ کہنا کہ باقی والدین اپنے بچوں کے ساتھ مخلص نہیں ہوتے اور ڈھونگ رچاتے ہیں، ایک طرح سے آپ کے احساسِ برتری اور غرور کا اور ہمارے رشتے میں کسی چیز کی کمی کا اظہار کرتا ہے، ایسی کمی جس کے آپ شعوری طور پر ذمہ دار نہیں ہیں۔ اگر ہم دونوں اس بات پر متفق ہو جائیں کہ ہمارا رشتہ صحت مند نہیں ہے تو یہ ہمارے رشتے کی پہلی کامیابی ہو گی۔

میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ میں جو کچھ ہوں وہ سراپا آپ کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ وہ مبالغہ آمیزی ہو گی (اگرچہ میں مبالغہ آمیزی پر مائل رہتا ہوں) عین ممکن ہے کہ میں آپ کے زیرِ اثر زندگی نہ گزارتا تب بھی ایک کمزور، نحیف اور ریےمیں جوان بن کر اُبھرتا لیکن اُس سے بہت مختلف ہوتا جو کہ میں ہوں۔ اگر آپ میرے والد کی بجائے چچا، دادا، دوست، رفیقِ کار حتیٰ کہ سسر بھی ہوتے تو شاید میں اس رشتے کو احسن طریقے سے نباہ لیتا لیکن ایک باپ کی حیثیت سے آپ کے رشتے کا بوجھ میری شخصیت برداشت نہ کر سکی، خاص کر جب کہ میرے بھائی فوت ہو گئے اور بہنیں بعد میں پیدا ہوئیں۔ اس لئے رشتے کا سارا بوجھ اٹھانے کے لئے میں تنہا ہی تھا اور میرے کمزور شانے وہ بوجھ نہ اٹھا سکے۔

میں بچپن میں بہت سے بچوں کی طرح شرمیلا ہوا کرتا تھا۔ میری والدہ مجھ سے بہت پیار کرتی تھیں۔ میں اگرچہ ہٹ دھرم تھا پھر بھی اتنا مشکل بچہ نہیں تھا۔ جب بھی کوئی مجھ سے پیار سے، محبت سے، خلوص سے اور ہمدردی سے پیش آتا میں اُس کی

بات مان لیتا لیکن آپ ایک جلالی شخصیت کے مالک تھے (اگرچہ آپ کا دل مہربان تھا) اور میری ایسی تربیت کرنا چاہتے تھے کہ میں ایک بہادر اور نڈر شخص بن سکوں لیکن میں آپ کے جلال سے خوفزدہ رہتا تھا کیونکہ آپ بچوں کی تربیت میں سختی کرنے کو احسن سمجھتے تھے۔ آپ کے جلال کے درپردہ جمال بھی چھپا ہوتا تھا لیکن اس جمال تک میری رسائی نہ تھی۔
ویسے تو بچپن کے بیسیوں واقعات ایسے تھے جو آپ کے جلال کے آئینہ دار تھے لیکن اُن میں سے ایک واقعہ مجھے آج بھی یاد ہے۔ عین ممکن ہے وہ واقعہ آپ کو بھی یاد ہو۔ ایک رات میں بار بار پانی مانگتا رہا۔ اس لئے نہیں کہ میں پیاسا تھا بلکہ اس لئے کہ میں شیطانی کے موڈ میں تھا۔ پہلے آپ نے مجھے بہت ڈرایا دھمکایا لیکن جب اس کا مجھ پر کوئی اثر نہ ہوا تو آپ نے مجھے بستر سے اٹھایا، برآمدے میں لا پٹخا اور دروازہ بند کر دیا۔ اس وقت میں نے صرف شب خوابی کا لباس پہن رکھا تھا۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ آپ نے جو کچھ کیا غلط کیا، کیونکہ شاید آپ کے لئے رات کو آرام کی نیند سونے کا وہ واحد طریقہ تھا لیکن میں یہ واقعہ اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ آپ کی بچوں کی تربیت کے انداز اور اپنے احساسات پر اظہارِ خیال کر سکوں۔
اگرچہ اس واقعہ کے بعد میں بڑا تابعِ فرمان ہو گیا تھا لیکن اس واقعہ سے مجھے ایک نفسیاتی دھچکا لگا تھا اور اس نے مجھے جذباتی نقصان پہنچایا تھا۔ میں کبھی بھی یہ نہ سمجھ سکا کہ میرے بار بار پانی مانگنے اور آپ کے مجھے کمرے سے باہر نکال دینے کا کیا تعلق تھا۔ اس واقعہ کے کئی برس بعد تک میں اس خوف سے کانپتا رہتا کہ میرے باپ کی طرح کوئی دیوقامت شخص مجھے میرے چھوٹے سے بستر سے رات کو اٹھائے گا اور مجھے ایک بے معنی حقیر شے کی طرح باہر برآمدے میں پھینک دے گا۔
میری نگاہ میں میرا ایک حقیر اور بے معنی ہونے کا احساس جس کا میں اکثر شکار رہتا ہوں (جو ایک حوالے سے کسرِ نفسی جیسے معزز جذبے کا بھی آئینہ دار ہو سکتا ہے) کافی حد تک آپ کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اگر بچپن میں آپ نے میری حوصلہ افزائی کی ہوتی اور میری ہمت بندھائی ہوتی تو شاید مجھ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی ہوتی اور میں اتنا احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوتا۔
اگرچہ بعض چیزوں میں آپ میری حوصلہ افزائی بھی فرماتے تھے مثلاً جب میں فوجیوں کی طرح چلتا اور آپ کو سلوٹ کرتا یا بے مقصد قسم کے گانے زبانی یاد کر کے سناتا، لیکن ان چیزوں کا میرے مستقبل سے کم اور آپ کی اپنی پسند سے تعلق زیادہ تھا۔ آج بھی آپ صرف اُن چیزوں میں حوصلہ افزائی کرتے ہیں جنھیں آپ صحیح سمجھتے ہیں یا جن کا آپ کو شوق ہے۔ آپ میرے جذبے، شوق اور صلاحیت کو کبھی اہمیت نہیں دیتے۔ آپ میرے مستقبل کو ہمیشہ نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔ لیکن اب تو میں زندگی کے اس دور میں پہنچ گیا ہوں جہاں آپ کی تعریف اور حوصلہ افزائی اتنی اہم نہیں ہے جتنی کہ بچپن میں تھی۔
بچپن میں میں آپ سے بہت متاثر رہتا تھا اور آپ کی طرح بننا چاہتا تھا۔ آپ خوب رو، دراز قد اور وجیہہ انسان تھے جبکہ میں ایک دُبلا پتلا منحنی سا بچہ تھا۔ جب آپ مجھے تیرنا سکھاتے تھے اور میں تیر نہ سکتا تھا تو میں احساس

احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتا تھا۔ آپ کی جسمانی شان کے سامنے میں اپنے آپ کو حقیر محسوس کرتا تھا، اور آج بھی کرتا ہوں۔

آپ میں اور مجھ میں اتنا زیادہ فرق جسمانی ہی نہیں، ذہنی بھی تھا۔ آپ نے اپنی صلاحیتوں کی وجہ سے معاشرے میں اہم مقام حاصل کر لیا تھا جس پر آپ بجا طور پر فخر کر سکتے تھے۔ آپ ایک صاحب الرائے مشخص شخص تھے، لوگ آپ کا احترام کرتے تھے۔ آپ میں اتنی خود اعتمادی تھی کہ کبھی آپ چیکز (CZECHS) کا، کبھی جرمنز (JERMANS) کا اور کبھی یہودیوں (JEWS) کا مذاق اڑاتے تھے۔ میں نے تو آپ کو اپنی ذات کے علاوہ ہر شخص، ہر گروہ اور ہر قوم کا مذاق اڑاتے سنا ہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا آپ کی تنقید اصولوں کی بنا پر نہیں ذاتی پسند یا ناپسند کی بنا پر ہوتی تھی۔ آپ کی خود اعتمادی کے بوجھ تلے، جو غرور کی حدوں کو چھوتی تھی، میں دبا جاتا تھا۔ اسی لئے میں آپ سے جب بھی تبادلۂ خیال کرتا، جو کبھی کبھار ہی ہوتا تھا، آپ ہر موضوع کے بارے میں مجھے غلط ثابت کرتے اور میں آپ سے بہت مرعوب ہوتا۔ آپ کی دیو قامت شخصیت تلے میری کمزور سی شخصیت کچلی جاتی تھی۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کئی دفعہ جب میں سکول سے گھر آتا اور آپ سے کسی پریشانی یا مسئلے کا ذکر کرتا تو آپ بے نیازی سے میز پر اپنی انگلیوں سے ساز بجاتے ہوئے ہتک آمیز لہجے میں کہتے:

"تم نے اتنی سی بات کا بتنگڑ کیوں بنا دیا ہے۔"

"تم اتنی چھوٹی چھوٹی باتوں سے پریشان ہو جاتے ہو۔"

"بعض لوگ رائی کا پہاڑ بنا دیتے ہیں۔"

اور میرے ماتھے پر ندامت کے قطرے نمودار ہو جاتے۔ آپ میری مدد کرنے یا ہمت بندھانے کے بجائے مجھے احساسِ کمتری کا شکار کر دیتے اور میں مایوس و مغموم اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ میری ہمت، میرا حوصلہ، میرا جذبہ اور میری قوتِ ارادی آپ کے جلال کے سامنے جھاگ کی طرح بیٹھ جاتے۔

آپ کا یہ رویہ صرف اُن خیالات تک ہی محدود نہ تھا جو مجھے عزیز تھے بلکہ اُن لوگوں کے بارے میں بھی تھا جو مجھے پسند تھے۔ آپ اُن کی ایسے الفاظ میں ہتک کرتے کہ میں خاموش ہو جاتا۔ آپ نے ایک دفعہ میرے یدش (YIDDISH) ایکٹر دوست کو کتا کہہ کر پکارا تھا۔ آپ کے بارے میں جو چیز مجھے سب سے زیادہ پریشان کرتی تھی وہ یہ تھی کہ آپ کو بالکل احساس نہ تھا کہ آپ دوسرے شخص کو کس حد تک ذلیل اور شرمندہ کر سکتے ہیں۔ یوں لگتا تھا جیسے آپ کو اپنی طاقت اور جبر کا بالکل اندازہ نہ تھا۔ کئی دفعہ میں نے آپ کی باتوں کا جواب بھی دینا چاہا اور غصے کا اظہار بھی کرنا چاہا لیکن ایسی گفتگو کے بعد میں احساسِ گناہ کا شکار ہو جاتا لیکن آپ نے اپنے ظلم اور جبر پر کبھی افسوس یا ندامت کا اظہار نہیں کیا۔

آپ کا بچوں کی تربیت کا انداز بالکل نرالا تھا۔ میں آپ سے اتنا مرعوب اور خوفزدہ رہتا کہ آپ کی ہر خواہش میرے لئے حکم کا درجہ رکھتی اور میں آپ کی ہر جائز و ناجائز خواہش کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیتا۔ کھانے کی میز پر آپ ہمیشہ مجھ سے سختی اور درشتی سے پیش آتے اور تحکمانہ انداز میں کہتے:

"کھانا پہلے کھاؤ۔ باتیں بعد میں کرنا۔"

"کھانا جلدی ختم کرو۔"

"میں نے کھانا ختم کر لیا ہے اور تم ابھی تک لگے ہوئے ہو۔"

مسئلہ یہ تھا کہ جن چیزوں سے آپ مجھے منع کرتے تھے، جن میں ہڈیوں کو دانتوں سے چبانا، کھانے کے دوران گفتگو کرنا یا کھانے کا زمین پر گرنا شامل تھے، آپ خود وہی کام کرتے رہتے تھے بلکہ کھانے کی میز پر ناخن تک کاٹتے تھے۔ آپ کے اس دوہرے معیار سے مجھے یوں محسوس ہوتا جیسے میرے سامنے تین دنیائیں ہوں۔

پہلی دنیا میری اپنی تھی جس میں میری حیثیت غلام کی تھی۔

دوسری دنیا آپ کی تھی جہاں آپ اُن تمام اصولوں کو توڑتے رہتے تھے جن پر مجھے عمل کرنے کی تلقین کرتے تھے۔

اور تیسری دنیا باقی لوگوں کی تھی جہاں وہ آزادی و خود مختاری کی زندگی گزارتے تھے۔

میں عجب تضاد کا شکار رہتا۔ اگر میں آپ کا کہا مانتا تو غلام محسوس کرتا اور اگر نہ مانتا تو ناخلف اولاد سمجھا جاتا، میرے لئے فرار اور رہائی کا کوئی راستہ نہ تھا۔ میں ہر حال میں مقہور و معتوب ٹھہرتا۔ میری انا کو کچوکے لگتے رہتے۔ پچھلے چند برسوں سے اگرچہ آپ اپنے رویّے کا یہ جواز پیش کرتے رہتے ہیں کہ آپ دل کے مریض ہیں لیکن آپ کی سختی اور تندی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ جب آپ کسی سے اختلافُ الرائے رکھتے ہیں تو آپ اس شخص کے خلاف ہو جاتے ہیں اور اُسے ذلیل کرنے پر اتر آتے ہیں۔ اب جب کہ میں جوان ہو گیا ہوں میں اتنا دل برداشتہ نہیں ہوتا لیکن بچپن میں تو میں بالکل مجبور و بے بس محسوس کرتا تھا اور مدّتوں اپنے زخم چاٹتا رہتا تھا۔

آپ کے اس رویّے کا میری ذات کو ایک نقصان یہ ہوا کہ میں دوسرے لوگوں سے بات چیت کرنے کے قابل نہ رہا۔ مجھ میں خود اعتمادی کا اتنا فقدان ہو گیا کہ میں اپنے جذبات اور خیالات کے اظہار کے قابل نہ رہا اور محفلوں میں خاموش رہنے لگا۔ چونکہ میں آپ کی کسی رائے سے اختلاف نہ کر سکتا تھا اس لئے میں اپنی رائے کا اظہار بھی نہ کر پاتا تھا۔ میں اندر ہی اندر کڑھتا رہتا اور گفتگو میں یا تو تُتلاتا یا خاموش رہتا اور میری یہ کمزوری آج بھی میری شخصیت کا حصّہ ہے۔ میں جذباتی طور پر مفلوج ہو چکا ہوں۔ اگر میں شروع ہی سے آپ کی رائے سے اختلاف کا حوصلہ رکھتا اور اپنے جذبات کا اظہار

کرتا تو شاید آج میری نفسیاتی حالت اتنی دِگرگوں نہ ہوتی اور آپ بھی شاید مجھ پر فخر کر سکتے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اب میں اپنی نگاہوں میں بھی ناکام ہوں اور آپ بھی مجھ پر نادم ہیں۔ آپ کو شاید کبھی یہ اندازہ نہیں ہوا کہ میرے احساسِ کمتری کا آپ کے جابرانہ اور حاکمانہ رویّے سے کتنا قریبی تعلق ہے۔ آپ نے غیر ارادی طور پر میری شخصیت کو دبا کر رکھا اور آپ کی توانا شخصیت نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں اپنی توانائی کھو بیٹھا۔ میری خواہش یہی رہی کہ آپ سے دور ہٹ جاؤں، جسمانی طور پر بھی اور نفسیاتی طور پر بھی، تاکہ آپ کی شخصیت کے مضر اثرات سے بچ سکوں اور میری اپنی شخصیت نکھر سکے۔ میں ذہنی اور جذباتی طور پر بلوغت کی منزلیں طے کرنا چاہتا تھا۔ آپ کے طنز، آپ کے غصّے اور آپ کے جبر نے میری شخصیت کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔

آپ نے مجھے کبھی مارا پیٹا نہیں، شاید اس کی ضرورت ہی نہ تھی، کیونکہ آپ کے لفظوں کی مار جسمانی مار سے زیادہ نقصان دہ تھی۔ آپ کے جملے، گالیاں اور کوسنے خنجر بن کر میرے سینے کے پار ہو جاتے تھے اور میں مدّتوں تڑپتا رہتا تھا۔ میری حسّاس طبیعت اس صورتِ حال کو اور بھی بدتر کر دیتی تھی۔

آپ اپنے غصّے کا اظہار دھمکیوں سے بھی کرتے تھے۔ اگر میں کوئی ایسا کام کرتا جو آپ کو ناپسند ہوتا تو آپ میرے پیچھے یہ کہتے ہوئے بھاگتے:

"میں تمہاری ہڈی پسلی ایک کر دوں گا۔"

"میں تمہیں کچّا چبا ڈالوں گا۔"

اور میں خوفزدہ ہو کر بھاگتا۔ بعض دفعہ آپ شاید مذاق کر رہے ہوتے تھے لیکن میرا خون خشک ہو جاتا تھا اور پھر والدہ مجھے اپنی آغوش میں لے کر آپ سے بچا لیتی تھیں۔ لیکن میں کافی دیر تک کانپتا رہتا تھا۔ اگر میں کسی ایسے کام کا ارادہ کرتا جس کے آپ حق میں نہ ہوتے تو آپ میری حوصلہ شکنی کرتے اور کہتے کہ میں کبھی اس میں کامیاب نہ ہوں گا۔ آپ کے اس رویّے سے میرا دل ٹوٹ جاتا۔

آپ بچوں کی تربیت میں طنزیہ جملوں کا بھی وافر استعمال کرتے تھے۔ اور پھر زور زور سے قہقہے لگاتے تھے۔ آپ میری ہتک کرتے ہوئے بھی بالکل نہ جھجکتے تھے۔ آپ میرے سامنے میری امّاں سے کہتے کہ تمہارے بیٹے سے کسی اچھے کام کی امید نہیں رکھی جا سکتی۔ آپ ایسے جملوں سے یہ ثابت کرنا چاہتے تھے کہ آپ مجھ سے کتنے بددل ہو چکے ہیں۔ چونکہ آپ مجھ سے مخاطب بھی نہ ہوتے تھے اس لئے میں آپ کے طنز کا جواب بھی نہ دے پاتا۔ ایسے واقعات اتنی بار وقوع پذیر ہوئے کہ میں دل برداشتہ ہو گیا اور میں نے ہمّت ہار دی۔ آپ کے مٹّھیاں بھینچ بھینچ کر اور دانت کچکچا کچکچا کر غصّہ دکھانے کے

آگے میری ہمّت اور جرأت ریت کی دیوار بن گئی اور میں اندر سے چکنا چور ہو گیا۔

خوش قسمتی سے کبھی کبھار آپ مجھ سے مہربانی سے پیش آتے اور مجھے ایک گونہ خوشی ہوتی۔ مجھے وہ وقت یاد ہے جب آپ کام سے تھک ہار کر ہمارے ساتھ چھٹیاں گزارنے آئے تھے اور سب بچوں پر اپنی شفقت نچھاور کی تھی۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہے جب میں بیمار تھا اور آپ میرے کمرے میں میری تیمارداری کرنے آئے تھے، اس دن میں خوشی سے رو دیا تھا اور آج بھی اس واقعے کو لکھتے ہوئے میری آنکھیں آبدیدہ ہو گئی ہیں۔ کبھی کبھار آپ اس شفقت سے مسکراتے کہ میرا دل باغ باغ ہو جاتا۔ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ آپ کی محبّت بھی میرے احساسِ گناہ کی شدّت میں اضافہ کر دیتی تھی۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ امّی جان مجھ سے نہایت ہمدردی اور مہربانی سے پیش آتی تھیں لیکن اس کا نقصان یہ ہوا کہ اُن کی وجہ سے میں آپ کی تنبیہیں زیادہ دیر رہا۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو میں اپنے پنجرے کی سلاخیں توڑ کر بھاگ چکا ہوتا۔ امّی جان کی محبّت میرے پاؤں کی زنجیر بن گئی تھی۔ وہ بھی میرے دل میں احساسِ گناہ کی شدّت کو زیادہ کرتی رہتی۔

اگرچہ آپ نے کبھی مجھے مارا پیٹا نہیں، لیکن آپ کی دھمکیاں میرا خون خشک کرنے کے لئے کافی ہوتیں۔ آپ کی کرسی پر لٹکے ہوئے پتلون کے سسپنڈرز (SUSPENDERS) میرے لئے تختۂ دار کی رسّیاں نظر آتے اور میں خود کو اُس مجرم کی طرح محسوس کرتا جسے پھانسی کی سزا سنادی گئی ہو لیکن وہ دیر تک پھانسی کا انتظار کر رہا ہو۔ میں کبھی کبھار سوچتا کہ اگر آپ مجھے پیٹ بھی دیتے تو شاید اچھا ہوتا لیکن اس مار کے انتظار کا خوف مجھے پاگل کر دیتا اور میں اپنے آپ کو گنہگار محسوس کرتا رہتا۔

آپ اکیلے میں بھی اور دوسروں کے سامنے بھی مجھے ذلیل کرتے۔ آپ میری سستی اور کاہلی کا مذاق اڑاتے اور طنز آمیز لہجے میں کہتے:

"میں تو بچپن ہی سے محنت کیا کرتا تھا۔"

"جب میں سات سال کا تھا تو گاڑی دھکیلا کرتا تھا۔"

"ہم اتنی غربت میں زندگی گزارتے تھے کہ سب لوگ ایک ہی کمرے میں سوتے تھے۔"

"میری ٹانگیں اس لئے زخمی ہو گئی تھیں کہ میرے پاس گرم کپڑے نہ تھے۔"

"مجھے گھر والوں سے کچھ حاصل نہ ہوا لیکن میں متواتر گھر والوں کو پیسے بھیجتا رہا۔"

"ہم نے اتنی تکلیفیں برداشت کیں لیکن آج کے بچّوں کو ان قربانیوں کا کوئی احساس نہیں۔"

اگرچہ آپ چاہتے تھے کہ بچّوں کی تعلیم و تربیت صحیح خطوط پر ہو لیکن آپ میری اتنی تذلیل کرتے کہ میں شرم سے پانی پانی ہو جاتا اور میری اَنا کو چرکے لگتے۔

آپ کی تربیت کا مجھ پر یہ اثر ہوا کہ میں آپ سے دور بہت دور چلا جانا چاہتا تھا اور ہر اُس کام سے جذباتی بُعد

رکھنا چاہتا تھا جو کسی بھی صورت میں آپ سے مشابہت رکھتا ہو۔ اس لئے میں نے زندگی کے اُن تمام پہلوؤں سے کنارہ کشی اختیار کرلی جو آپ کو پسند تھے۔ اُن سب میں سرِفہرست کاروبار تھا۔ بچپن میں مجھے آپ کا کاروبار بہت پسند تھا۔ آپ کی دوکان اگرچہ چھوٹی سی اور سادہ تھی لیکن میرے لئے بہت دلچسپ تھی۔ اس کی رونقیاں، اس میں چہل پہل اور آپ کا لوگوں کو لطیفے سُنانا مجھے بہت پسند تھا لیکن آہستہ آہستہ آپ کے مزاج میں شدّت اور سختی پیدا ہوتی گئی۔ آخر میں تو آپ کی طبیعت اتنی بگڑ گئی تھی کہ آپ غصّے میں چیزیں اِدھر اُدھر پھینکنے لگے تھے اور اپنے کارندوں کا مذاق اُڑانے لگے تھے۔ ایک ملازم کے بارے میں تو آپ کہا کرتے تھے "وہ کتّا جتنی جلد مرجائے بہتر ہے۔" جب آپ مجھ سے بھی کرختگی سے پیش آنے لگے تو میں دل برداشتہ ہو گیا اور کاروبار سے متنفر ہو گیا۔ میری ہمدردی ان ملازموں کے ساتھ تھی جو آپ کے ظالمانہ رویّوں کا نشانہ بنتے تھے۔

اس لئے جب مجھے موقع ملا تو میں تعلیم کا بہانہ بنا کر گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ بدقسمتی کی بات یہ تھی کہ آپ سے دور رہنے کے لئے مجھے پورے خاندان سے دور رہنا پڑا حتّیٰ کہ اپنی مہربان ماں سے بھی۔ ویسے تو ہماری ماں فطرتاً نہایت شفیق تھیں لیکن وہ بھی آپ کے مضر اثرات سے متاثر ہوتی رہیں اور آہستہ آہستہ انھوں نے بھی جذباتی طور پر (ذہنی طور پر نہیں) آپ کی تربیت کے طریقے اپنا لئے۔ اس تجربے نے والدہ کی اپنی شخصیت اور تربیت کے انداز کو مسخ کر دیا اور وہ بھی آپ کے ظلم سے فرار نہ حاصل کر سکیں۔ ہماری والدہ آپ کے اور بچوں کے درمیان چکّی کے دو پاٹوں کی طرح پستی رہیں۔ چونکہ وہ ایک محبت کرنے والی شخصیت تھیں اس لئے اُس دباؤ، زیادتی اور قربانی کو برداشت کرتی رہیں۔

آپ کی تربیت نے نہ صرف میری خاندانی زندگی کو بلکہ پوری زندگی کو متاثر کیا۔ آپ کو یہ غلط فہمی ہے کہ میں دوستوں سے تو گرمجوشی سے پیش آتا ہوں لیکن رشتہ داروں اور اہلِ خاندان سے سرد مہری کا مظاہرہ کرتا ہوں۔ میں اپنی حسّاس طبیعت کی وجہ سے اپنی زندگی جس کرب سے گزارتا ہوں اس کا شاید آپ کو اندازہ نہیں۔ بعض چیزوں کے بارے میں تو میرا احساسِ گناہ اتنا شدید ہے کہ میں اُن کا اظہار بھی نہیں کر سکتا۔ بعض دفعہ تو میرا دوسرے لوگوں سے نیکی اور فراخدلی کا سلوک میری محبت کا کم، اور میرے احساسِ گناہ کا زیادہ آئینہ دار ہوتا ہے۔

چونکہ آپ نہ تو اپنے رفقائے کار پر اور نہ ہی اہلِ خاندان پر اعتبار کرتے تھے اس لئے میں نے بھی اعتبار کرنا نہ سیکھا۔ دوسروں کی بات تو کیا میں تو اپنی ذات پر بھی کبھی اعتبار نہ کرسکا اور عمر بھر عدمِ تحفّظ، اور خود اعتمادی کے فقدان کا شکار رہا۔

جس طرح آپ نے مجھے کاروبار سے بددل کیا ہے اسی طرح آپ نے مذہب سے بھی میرا دل کھٹّا کر دیا اور میں یہودیت سے بہت دور ہٹ گیا۔ مجھے بچپن کا وہ دور یاد ہے جب میں اگر عبادت کرنے سناگاگ (SYNAGOGUE) نہ جاتا، روزے نہ رکھتا یا دیگر مذہبی فرائض ادا نہ کرتا تو احساسِ گناہ کا شکار ہو جاتا اور یوں محسوس کرتا جیسے میں اپنے ساتھ نہیں بلکہ آپ کے

ساتھ زیادتی کر رہا ہوں۔

جب میں بلوغت کے زینے تک پہنچا تو مجھے احساس ہوا کہ آپ کا مذہب سے رشتہ ایک ڈھونگ سے زیادہ کچھ نہ تھا۔ آپ سال میں چار دفعہ عبادت خانے جاتے اور بڑی بے دلی سے عبادت کرتے۔ میں آپ کی بے حسی دیکھ کر اتنا بور ہوتا کہ جمائیاں لینے لگتا اور بعض دفعہ غنودگی کا شکار ہو جاتا۔ جب مجھے آسمانی کتابوں کی آیات زبانی یاد کرنے کو کہا جاتا، جو میرے لئے نہایت ہی فضول عمل تھا، تو مجھے یوں لگتا جیسے میں امتحان پاس کرنے کے لئے کسی نصابی کتاب کے ابواب یاد کر رہا ہوں۔ ان واقعات کی وجہ سے میرے لئے مذہبی تجربہ زیادہ سودمند ثابت نہ ہوا۔

آخر جب میں نے مذہب سے رُخ پھیرا تو آپ کو یوں لگا جیسے میں نے آپ سے بھی رُخ پھیر لیا ہو۔ آپ یہودی مذہب، اعتقادات اور روایات پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لے آئے تھے اور مجھ سے بھی یہی امید رکھتے تھے کہ میں بھی ایسا ہی کروں۔ اور جب میں نے آپ کے نقشِ قدم پر چلنے سے انکار کیا تو آپ مایوس ہو گئے۔ آپ نے جو روایات مجھے وراثت میں دینے کی کوشش کی وہ آپ کی شخصیت کا حصّہ نہ تھیں بلکہ وہ ایسی روایتی چیزیں تھیں جو آپ نے بچپن میں اپنے والدین اور ماحول سے سیکھی تھیں۔ چونکہ وہ روایات آپ کی زندگی کا حصّہ نہ بن سکیں اس لئے وہ اگلی نسل تک نہ منتقل ہو سکیں اور میرے لئے مشعلِ راہ ثابت نہ ہوئیں۔ میں نے جب بھی آپ کے ایمان کے سطحی پن کی طرف اشارہ کیا آپ بہت ناراض ہوئے۔ شاید آپ میں حقیقت کا سامنا کرنے کی ہمّت نہ تھی۔

مذہب کے بارے میں آپ کا رویّہ اُن یہودی خاندانوں کے رویّے سے مختلف نہ تھا جو مذہبی علاقوں سے ہجرت کر کے آئے تھے، وہ مذہب کے ظاہر سے تو واقف تھے لیکن روح سے ناواقف۔ انھوں نے نماز، روزے، مذہبی عبادات اور سماجی رسومات کو تو اپنا لیا تھا لیکن مذہب کے جوہر کو کھو دیا تھا۔

آپ جن اصولوں پر ایمان رکھتے تھے آپ کا کردار اُن کا آئینہ دار نہ تھا۔ آپ کی زندگی کا دامن اُن عظمتوں سے تہی تھا جس کا آپ پرچار کرتے تھے۔ اس لئے میں اِس تضاد کا شکار رہتا کہ آپ کی باتوں کی طرف دھیان دوں یا آپ کے عمل کو دیکھوں۔ ہو سکتا ہے کہ اگر آپ کا طرزِ حیات مختلف ہوتا تو شاید میرا مذہب کے بارے میں رویّہ بھی مختلف ہوتا۔ میں نے آپ کو چند ایسی کتابیں بھی پڑھنے کو دیں جن سے میرا نقطۂ نظر ظاہر ہوتا تھا لیکن آپ نے انھیں درخورِ اعتنا نہ سمجھا۔ میں یہاں اُن کی تفصیل میں جانا نہیں چاہتا۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ جب میں نے مختلف وجوہ کی بنا پر خود یہودیت میں دلچسپی لینی شروع کی (وہی یہودیت جس کی آپ برسوں مجھے تبلیغ کرتے رہے تھے) تو آپ نے ان کتابوں پر طنز کرنا شروع کیا جو میں پڑھنے لگا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ

یہ تھی کہ آپ چاہتے تھے کہ میں یہودیت کے صرف اُن پہلوؤں کو اپناؤں جو آپ نے میرے لئے چُنے تھے۔ آپ مجھے آزادانہ طور پر یہودیت کی صداقتوں کو تلاش کرنے کی اجازت نہ دینا چاہتے تھے۔ شاید آپ اپنے یہودیت کے علم اور تجربے کے بارے میں احساسِ کمتری کا شکار تھے۔ آپ میری آزادانہ سوچ سے گھبرائے رہتے تھے اور اس کا اظہار غصّے کی صورت میں کرتے تھے۔

آپ کی ناپسندیدگی اپنی انتہا کو اس وقت پہنچی جب میں نے اپنے نظریات اور تجربات کا اظہار اپنی تخلیقات میں کرنا شروع کیا۔ شاید آپ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ در پردہ میری ادبی کاوشوں کا رشتہ یہودیت کی تعلیمات سے جُڑا ہوا تھا۔ بطور ادیب میں اُس کینچوے کی طرح تھا جس کے جسم پر کسی کا جوتا پڑے تو وہ دو حصّوں میں بٹ جائے، ایک حصّہ جوتے کے نیچے رہ جائے اور دوسرا حصّہ آگے بڑھ جائے۔ میں ادیب کے طور پر کینچوے کا دوسرا حصّہ تھا جو آپ کے اثرات سے آزاد ہو گیا تھا اور ایک حد تک خود مختار ہو گیا تھا۔ آپ کی میری تخلیقات سے ناپسندیدگی مجھے پسند آئی کیونکہ اس طرح میں ادیب کے طور پر آپ کے اثرات سے محفوظ رہ سکتا تھا۔ جب بھی میں نے آپ کو اپنی نئی کتاب پیش کی آپ نے بڑی بے دلی سے کہا "اسے میری میز پر رکھ دو" (اکثر اوقات جب میری کتاب آتی تو آپ دوستوں کے ساتھ تاش کھیل رہے ہوتے) لیکن میں خوش ہوتا کہ آپ کو میری کتاب پڑھنے کا نہ تو وقت تھا اور نہ ہی دلچسپی۔ میں یہ صورتِ حال دیکھ کر اپنے آپ سے کہتا "اب تم آزاد ہو"۔ میں جانتا تھا کہ وہ آزادی کا احساس خود فریبی سے زیادہ کچھ نہ تھا کیونکہ میری تمام تخلیقات کا مقصد اور منتہیٰ آپ کے اثر سے آزادی حاصل کرنا تھا۔ جو آزادی میں جذباتی اور خاندانی طور پر حاصل نہ کر سکا تھا وہ میں تخلیقی اور ادبی طور پر حاصل کرنا چاہتا تھا لیکن میں اس میں بھی پوری طرح کامیاب نہ ہو سکا۔ آپ کے اثرات سے آزاد ہونے کا خواب کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

زندگی کے ایک شعبے میں جہاں آپ نے مجھے کچھ حد تک آزادی دی تھی وہ میرا پیشے کا انتخاب تھا۔

بچپن میں آپ کا خیال تھا کہ میں صرف کتابیں پڑھنے اور لکھنے کے قابل تھا اور باقی سب کاموں کے لئے بیکار تھا لیکن پھر بھی آپ نے مجھے اجازت دی تھی کہ میں اپنا پیشہ اپنی مرضی سے چُنوں۔ میں خود بھی اپنے بارے میں کوئی اچھی رائے نہ رکھتا تھا۔ میں دُبلا پتلا، کمزور اور منحنی سا لڑکا تھا جو بھاری کاموں سے کتراتا تھا۔ میں ہمیشہ آپ کی نگاہوں سے اپنے آپ کو دیکھنے کی کوشش کرتا اور خوفزدہ رہتا۔ میں جانتا تھا کہ چاہے میں کتنی بھی محنت کیوں نہ کر دوں میں آپ کی توقعات پر پورا نہ اُتر سکوں گا۔

جب میں گریمر اسکول میں داخل ہوا تو عجب تضاد کا شکار رہا۔ مجھے ڈر تھا کہ میں گریمر اسکول کے پہلے سال میں فیل ہو جاؤں گا لیکن جب پاس ہو گیا اور وظیفہ بھی حاصل کر لیا تو ڈر تھا کہ جمنیزیم (JYMNASIUM) میں داخلہ نہ ہو گا۔ جب وہ داخلہ بھی ہو گیا تو خوف تھا کہ اس کے امتحان میں ناکام رہوں گا لیکن میں اُس میں بھی کامیاب رہا۔ ان کامیابیوں سے مجھ میں خود اعتمادی آنے کی بجائے ذہنی پریشانی بڑھتی رہی۔ میرے لئے یہ خیال سوہانِ روح تھا کہ میں جتنی بلندی پر پہنچ رہا ہوں ایک دن

اتنی ہی بلندی سے گروں گا اور میرے اساتذہ مجھے نالائق، نااہل اور کند ذہن سمجھ کر کلاس سے باہر پھینک دیں گے اور میں اپنا سا منہ لے کر رہ جاؤں گا۔ مجھے یقین ہو چکا تھا کہ میری ساری کامیابیوں کی داستان ایک ڈراؤنے خواب سے بڑھ کر کچھ نہ ہو گی۔ جب میں نے زندگی کا آخری امتحان دیا اور اُسے کچھ قابلیت اور کچھ نقل کر کے پاس کیا تو میرے سر سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا اور میں اس قابل ہو سکا کہ کسی دفتر میں کلرک کے کام پر مامور ہو سکوں۔ وہ میری آزاد زندگی کی طرف پہلا قدم تھا۔ میں نے اس وقت سوچا تھا کہ میری طبیعت سے ایک ہی پیشہ لگا کھاتا ہے اور وہ وکالت کا پیشہ تھا۔ وہ واحد پیشہ ایسا تھا جس میں مجھے اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔

مجھے اپنی ملازمت کو حاصل کرنے اور قائم رکھنے میں جتنی کامیابی ہوئی، شادی کے معاملے میں اتنی ہی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا میرا خیال تھا کہ شادی کر کے میں آپ کے اثر و رسوخ سے کامل طور پر آزاد ہو جاؤں گا۔ مجھے شادی سے جتنی امیدیں وابستہ تھیں اس کی ناکامی سے اتنی ہی مایوسی ہوئی۔ چونکہ میں شادی میں کامیاب نہ ہو سکا اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ میں اس کی ناکامی کی وجوہات بیان کر کے آپ کو قائل کرنے میں بھی اتنا ہی ناکام رہوں گا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس خط کی کامیابی کا دارومدار اسی بات پر ہے۔

مجھے یوں لگتا ہے جیسے میری زندگی کی ناکامیوں میں وہ سب سے بڑی ناکامی ہے۔ مجھ میں اور میری شادی میں میری کمزوری، خود اعتمادی کا فقدان اور احساسِ گناہ جیسے وہ سبھی عوامل حائل ہیں جو آپ کی تربیت کا ماحصل ہیں۔ اس معاملے میں آپ کی میرے نفسیاتی مسائل کو سمجھنے میں بے حسی مستزاد ہے۔

آپ کی نگاہ میں میری شادی میں ناکامی میری ناکامیوں کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ آپ نے ہمیشہ مجھے ایک ناکارہ اور ناکام انسان سمجھا اور شادی کے مسئلے کو بطور ثبوت پیش کیا۔ آپ نے کبھی میری شادی کے معاملے میں ہمدردانہ رویہ اختیار نہیں کیا۔

کسی شخص کا شادی کرنا، بچے پیدا کرنا، بیوی سے اچھا سلوک کرنا اور بچوں کی نگہداشت کرنا اس کی بلوغت اور کامیابی کی دلیل ہے۔ ویسے تو میں نے بہت کم ایسے لوگ دیکھے ہیں جو ان فرائض کو خوش اسلوبی سے نبھاتے ہوں۔ یہ الگ بات ہے کہ بہت سے لوگ اپنی حتی الامکان کوشش کرتے ہیں کہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو سکیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میں بچپن اور نوجوانی میں ان ذمہ داریوں کا بار اُٹھانے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ انسان یہ باتیں اپنے والدین اور خاندان کے بزرگوں کو دیکھ کر سیکھتا ہے لیکن میں جس ماحول میں پلا بڑھا اس نے مجھے اس قابل بنایا ہی نہیں کہ میں ایک صحتمند اور بالغ زندگی گزار سکتا اور خاندانی ذمہ داریوں کو نبھا سکتا۔ میں ہمیشہ احساسِ گناہ اور عدمِ تحفظ کے احساسات تلے اتنا دبا رہا کہ زندگی میں کوئی کام بھی خوش اسلوبی سے نہ کر سکا۔

مجھے یاد ہے کہ نوجوانی میں ایک دفعہ جب میں آپ کے اور امی جان کے ساتھ سیر کے لئے گیا تھا (اس وقت شاید میری عمر سولہ برس کے لگ بھگ تھی) اور ہنستے کھیلتے آپ کو بڑی معصومیت سے بتایا تھا کہ میں شادی کے بارے میں اسکول کے باقی بچوں سے زیادہ جانتا ہوں اور مجھے کسی قسم کی نصیحت کی ضرورت نہیں تو بجائے اس کے کہ آپ میری معصوم خوشیوں میں شریک ہوتے اور میری حوصلہ افزائی کرتے آپ نے مجھے سخت تنبیہ کی اور مجھے کوسا کہ میں مغرور ہو گیا ہوں۔ آپ کی ان باتوں سے میرا دل ٹوٹ گیا اور میں خاموش ہو گیا۔ آپ کے اس رویے نے میرے جذبات اور مستقبل میں میرے شادی کے بارے میں تصورات کو بہت مجروح کیا۔

اس واقعے کے تقریباً بیس برس بعد جب میری عمر تقریباً چھتیس برس تھی ہمارے درمیان ایک اور گفتگو وقوع پذیر ہوئی۔ جب میں نے آپ سے اپنی منگیتر کا ذکر کیا اور شادی کا ارادہ ظاہر کیا تو بجائے اس کے کہ آپ میری باتیں توجہ سے سنتے اور کوئی ہمدردانہ مشورہ دیتے آپ نے کہا:

"مجھے تمہاری باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ تم نے ایک جوان عورت کو خوبصورت کپڑے پہنے کیا دیکھا کہ اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے اور شادی کا ارادہ کر لیا۔ تم تو اب شہر میں رہتے ہو کیا تم اتنے کم عقل ہو کہ تمہیں جو پہلی لڑکی ملی تم نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا۔ اگر تم عورتوں سے اتنے ہی خوفزدہ ہو تو میں تمہاری مدد کروں گا۔"

شاید آپ نے اور بھی بہت سی باتیں کہی تھیں جو مجھے اب یاد نہیں۔ آپ کی باتیں سن کر امی جان اتنی دل برداشتہ ہوئی تھیں کہ کمرہ چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اس دن آپ نے اپنی باتوں سے مجھے جتنا ذلیل کیا تھا وہ اپنی مثال آپ تھا۔ سولہ سال کی عمر کا واقعہ تو میں یہ سوچ کر نظر انداز کر سکتا ہوں کہ آپ نے مجھے کم عقل سمجھا تھا لیکن چھتیس سال کے جوان بیٹے سے اس طرح گفتگو کرنا مجھے سمجھ میں نہیں آتا۔ آپ نے میری شادی کے فیصلے کا احترام نہیں کیا۔ آپ کی نگاہ میں میری منگیتر کی کوئی عزت نہیں تھی۔ آپ نے ہمیشہ (لاشعوری طور پر) میری خود اعتمادی کو مجروح کیا ہے اور ہمیشہ (لاشعوری طور پر) یہ سمجھا ہے کہ آپ میرے بارے میں اور میرے مستقبل کے بارے میں مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ اگرچہ آپ نے کبھی میرے خیالات، جذبات اور تجربات کو سنجیدگی سے جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی لیکن پھر بھی آپ کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ آپ میرے اچھے برے کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

آپ کا خیال تھا کہ اس عورت سے شادی کرنے سے آپ کے نام پر حرف آئے گا لیکن آپ نے مجھے جس طرح ذلیل کیا تھا اس کا شاید آپ کو اندازہ نہ تھا۔

اس واقعے کے بعد میں نے دو دفعہ شادی کا ارادہ کیا۔ مِن سے دو دفعہ منگنی ہوئی۔ ایک دفعہ تو میں آپ کو اور راحتی جان کو منگنی کی رسم میں شریک ہونے کے لئے لے بھی گیا لیکن دونوں دفعہ منگنی ٹوٹ گئی۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں کر ہوا؟ شادی کرنے کے پیچھے یہ خیال اور امید کارفرما تھے کہ گھر بنایا جائے اور آزادی و خود مختاری کی زندگی گزاری جائے۔ جہاں تک شادی کے خیال کا تعلق ہے وہ تو آپ کو بھی پسند تھا لیکن جب اس نے حقیقت کا روپ اختیار کرنا شروع کیا تو آپ نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اس سے میں اتنا بددل ہوا کہ میرا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

میری نگاہ میں میرے دونوں فیصلے سوچ سمجھ کر کئے گئے تھے اور اگر ان میں سے کوئی بھی شادی ہو جاتی تو کامیاب رہتی لیکن آپ نے ہمیشہ یہ سمجھا کہ میرے شادی کے فیصلے ہنگامی اور جذباتی فیصلے تھے۔ آپ نے کبھی میری رائے اور فیصلے کا دل سے احترام نہیں کیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان دونوں خواتین نے مجھے ناامید نہیں کیا بلکہ میں نے انہیں ناامید کیا اور ان کے معیار پر پورا نہیں اترا۔ میرے دل میں آج بھی ان کا اتنا ہی احترام ہے جتنا کہ پہلے تھا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان کوششوں کے باوجود میں کیوں شادی نہ کر سکا؟ ویسے تو ان دونوں شادیوں میں کافی دشواریاں پیش آئیں لیکن دشواریاں تو زندگی کا حصہ ہیں اور ہم سب ان سے زندگی کے ہر موڑ پر نبرد آزما ہوتے رہتے ہیں میرا خیال ہے کہ شادی نہ ہونے کی بنیادی وجہ وہ دشواریاں نہ تھیں بلکہ یہ تھی کہ میں ذہنی طور پر اتنا مفلوج تھا کہ شادی کے قابل نہ تھا۔

میں جب بھی شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچتا ہوں

میری نیند اڑ جاتی ہے۔

سر میں درد شروع ہو جاتا ہے۔

میں مایوسی اور ناامیدی کی اتھاہ گہرائیوں میں کھو جاتا ہوں اور آہستہ آہستہ میری پریشانی اتنی بڑھ جاتی ہے کہ میں کسی کام کے قابل نہیں رہتا۔

میری نگاہ میں شادی کا فیصلہ انسان کی زندگی کا سب سے اہم فیصلہ ہوتا ہے کیونکہ وہ فیصلہ انسان کی آزادی اور خود مختاری کا امتحان ہوتا ہے۔ اگر میں شادی کر لیتا اور ایک نئے خاندان کی تشکیل کرتا تو ایک لحاظ سے آپ کے برابر ہو جاتا اور ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا۔ ایسی زندگی جو آپ کے آسیب سے آزاد ہوتی۔ چونکہ میں ذہنی طور پر آزاد نہیں تھا اس لئے یہ قدم نہ اٹھا سکا۔ میں اس قیدی کی طرح تھا جس سے یہ کہا جائے کہ تم اپنے قید خانے کے صحن میں محل تعمیر کرو۔ وہ قیدی اگر قید خانہ چھوڑ دے تو محل تعمیر نہیں کر سکتا اور اگر وہاں محل تعمیر کرنے کی کوشش کرتا ہے تو قید خانے سے باہر نہیں جا سکتا۔ اس لئے میرے لئے کوئی خود مختاری کا کام کرنے کے لئے ضروری ہے کہ میں آپ کے اثرات سے دور رہوں لیکن چونکہ میں اس قابل نہیں

اس لئے میں آپ کے سحر کی جیل میں محصور رہوں۔ بعض دفعہ تو اس بے بسی کا احساس اتنا شدید ہو جاتا ہے کہ میں پاگل پن کے بہت قریب آجاتا ہوں۔

میرے ذہن میں آپ سے رشتہ اور میری شادی کا فیصلہ باہم مربوط ہیں۔ آپ سے دور ہٹنے کے لئے شادی ضروری ہے اور چونکہ میں اس قابل نہیں اس لئے آپ کے اثر سے فرار حاصل نہیں کر سکتا۔ اگرچہ آپ کی خواہش ہے کہ میں ایک صحتمند اور خوشحال زندگی گزاروں، شادی کروں اور اپنے خاندان کی ذمہ داری قبول کروں لیکن آپ نہیں سمجھتے کہ اس مقصد کے حصول کے راستے میں آپ ہی سب سے بڑا پتھر اور رکاوٹ ہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ آپ کو اس کا احساس نہیں کیونکہ یہ آپ کی کوئی شعوری کوشش نہیں ہے۔

مجھے کبھی کبھار یوں لگتا ہے جیسے میری زندگی ایک ایسا نقشہ ہے جو زمین پر پھیلا ہوا ہے اور اس نقشے پر آپ لیٹے ہوئے ہیں، میں صرف نقشے کے ان حصّوں پر زندگی گزار سکتا ہوں جو آپ سے باقی بچ گئے ہیں اور شادی ان حصّوں میں سے ایک نہیں ہے۔ میں اس تشبیہ سے یہ بھی واضح کرنا چاہتا ہوں کہ آپ نے شادی سے مجھے اس طرح بد دل نہیں کیا جس طرح کاروبار سے کیا تھا۔ اس کے برخلاف شادی اور خاندانی زندگی میں تو آپ نے میرے سامنے بہت اچھی مثال پیش کی تھی۔ آپ نے اپنی بیوی کا خیال رکھا، بچّوں کی تربیت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی لیکن پھر بھی میں آپ کے نقشِ قدم پر نہ چل سکا۔ شادی کا پتھّر اتنا بھاری تھا کہ میں نہ اٹھا سکا۔

شادی نہ کرنے کا ایک لاشعوری خوف یہ ہو سکتا ہے کہ انسان اس بات سے خوفزدہ رہتا ہے کہ اس کے بچّے اس کے ساتھ وہی سلوک نہ کریں جو اس نے اپنے والدین سے کیا تھا۔ میرا خیال ہے کہ میرے معاملے میں یہ خوف کارفرما نہیں ہے۔ اگر میرا بیٹا میری طرح ہوتا تو میں اسے چھوڑ کر بہت دور چلا جاتا اور اسے اس کے حال پر چھوڑ دیتا۔ آپ نے بھی ایک دفعہ کہا تھا کہ اگر میں نے شادی کر لی تو آپ مجھ سے قطعِ تعلق کر لیں گے، شاید میری شادی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو۔

میری زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ میری ادبی تخلیقات ہیں اور ان کا مقصد آپ کے اثر کو کم کرنا اور اپنی آزادی وخود مختاری کو بڑھانا ہے لیکن میں نے اپنے فن میں ہی زیادہ کامیابی حاصل نہیں کی اور مجھے یہ بھی خطرہ لاحق رہا ہے کہ شادی کرنے کے بعد میری تخلیقی زندگی بری طرح متاثر نہ ہو۔

میں اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہوں کہ اگر آپ میرے شادی نہ کرنے کا یہ جواز پڑھیں گے تو کہیں گے:

"تم اپنی ناکامیوں کا الزام مجھ پر لگاتے ہو لیکن خود مسائل کی ذمہ داری نہیں لیتے۔ شاید ہم دونوں میں چند خصوصیات مشترک ہیں۔ میں نے مانا کہ تم بہت ہوشیار اور قابل ہو لیکن زندگی کے مسائل سلجھانے میں ناتجربہ کار ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ

تمہاری محرومیاں اور ناکامیاں نہ تو تمہاری غلطی کا نتیجہ ہیں نہ میری ۔ میں نے حتی الامکان تمہاری مدد کرنے کی کوشش کی لیکن تم نے اس مدد سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا ۔ میں نے تمہاری شادی میں بھی تمہارا ساتھ دینا چاہا لیکن تم نے خود ہی اس سلسلے کو ختم کر دیا اور یہ یقین کر لیا کہ اس سے میرے نام کو دھبہ لگے گا ۔ میں نے ایسی بات کبھی نہیں کی ، یہ تمہارے اپنے ذہن کی اختراع ہے ۔ تم خود ہی فیصلے کرتے ہو اور پھر اس کا الزام میرے سر لگاتے ہو ۔ تمہارا رویّہ نہایت بچکانہ ہے ۔ تم ہمیشہ جونک کی طرح میرا خون چوستے رہے ہو اور یہ خط لکھ کر بھی ایسا ہی کر رہے ہو ۔"

جب میں آپ کا اس قسم کا جواب سنوں گا تو خود اپنے آپ کو تمام مسائل ، محرومیوں اور ناکامیوں کا ذمّہ دار ٹھہراؤں گا اور اس طرح میری خود اعتمادی کی عمارت میں کچھ اور شگاف پڑ جائیں گے ۔

میرا خیال ہے کہ بجائے اس کے کہ ہم ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرائیں ، کیا ہی اچھا ہو کہ ہم اس تلخ حقیقت کو قبول کر لیں کہ ہمارا رشتہ صحتمند نہیں ہے اور نہ ہی کبھی ہوگا ، اس کے بہتر ہونے کا نہ تو کوئی امکان ہے نہ امید ۔ اس حقیقت کو قبول کرنے سے ہمارا رشتہ تو نہ سنورے گا لیکن ہماری زندگی اور موت قدرے آسان ہو جائیں گی ۔

آپ کا ۔ فرائڈ

اسلم فرخی

ایک خط ــــ ضمیر کے نام

ضمیرِ منیر دوست

بیس دسمبر کی شام کو تمہارا فون آیا۔ "اب وقت بہت کم رہ گیا ہے، جو کچھ کہنا سننا ہو کہہ سن لو" مگر میں صدمے میں تھا نہ کچھ کہہ سکا نہ سن سکا پو بیس کو تم چلے گئے۔ ایسی بھی کیا جلدی تھی۔ تم ایسے گھرے کب تھے بھلا داد و ستد کے مگر وہ جو تم میں دوسروں کو چونکانے کا ایک جذبہ بیکڑوی اور طبیعت میں بے چینی تھی اس نے تمہیں دم نہ لینے دیا۔ کچھ دن اور صبر کیا ہوتا نہ جانے کیا ہو جاتا میں اس خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ ہماری رفاقت اور ہم سفری جاری رہے گی مگر تم نے سارا کھیل بگاڑ دیا ہے اکیلے ہی چل دیے۔

اگر میں یہ کہوں کہ تمہارے اس طرح چلے جانے سے مجھے بڑا صدمہ ہوا تو یہ ایک رسمی اور فضول بات ہوگی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۹۰ء تک ہمارا ساتھ رہا۔ چوں برس ہوئے ایک دو دن نہیں پورے چون برس اتنی طویل رفاقت کے بعد بچھڑنے پر صدمہ نہیں ہوتا، دل و دماغ میں سناٹا آجاتا ہے۔ ہاں میں یہ ضرور سوچ رہا ہوں کہ تمہارے چلے جانے سے میرا لڑکپن اور جوانی دونوں رخصت ہوگئے۔ میری عمر میں انسان یادوں کا پلندا بن جاتا ہے مگر اب وہ ساری یادیں جو تم سے وابستہ تھیں بے معنی ہوگئیں بڑا خلا ہوگیا، اب خلا کے سوا اور رہ ہی کیا گیا ہے۔ افسوس کہ یہ خلا تسخیر ہونے والا نہیں۔

تمہیں یاد ہوگا ہمارا اولین تعارف ۳۶ء میں ہوا تھا۔ ۳۶ء میں میں اسکول پہنچا تھا۔ تم سال بھر پہلے سے وہاں موجود تھے۔ اگرچہ روزانہ دور سے تمہیں دیکھتا تھا مگر تفصیلی ملاقات اسکول ہی میں ہوئی تھی۔ ضمیر، یہ گورنمنٹ اسکول بھی کیا اسکول تھا۔ ایسا اسکول دیکھنے میں نہیں آیا۔ آج کل کالج بھی اتنے بڑے اور شاندار نہیں ہوتے۔ کیا ماحول اور فضا تھی سامنے سڑک کے پار آہستہ آہستہ بہتی ہوئی پروقار اور پر عظمت گنگا، سڑک کے دوسری طرف ضلع کچہری کی رونق، دائیں طرف کمپنی باغ، شاداب پھولوں سے ڈھکا ہوا، خوشبو سے مہکتا ہوا، بائیں ہاتھ پر لڑکیوں کا اسکول، ہر طرف اونچے اونچے سایہ دار گھاس کے تختے، آموں کے کنج ادھر ادھر بڑے بڑے بنگلے،

پیچھے قدیم پولیس لائن کے کمرے اور میدان، اسکول کے سامنے دری بچھائے رمالی کی کتابیں پھیلائے۔ قسمت کا حال بتانے والے گوال ٹولی کے پروفیسر الہ بخش جو کسی زمانے میں ہیرے یا خاں ساماں تھے، ہم لوگ انہیں دیکھ کر کوئی نہ کوئی فقرہ ضرور چست کرتے تھے۔ ایک آدھ دفعہ انھوں نے ہماری شکایت بھی کی شاید ہم پر ڈانٹ بھی پڑی تھی۔

ان دنوں جماعت میں لڑکے قد کے حساب سے بٹھائے جاتے تھے۔ چھوٹے لڑکے آگے لمبے لڑکے پیچھے، قطار لگوائی گئی میرا نمبر تیسرا تھا تمہارا چوتھا۔ ہم دونوں کے ڈیسک ماسٹر صاحب کی میز کے بالکل مقابل درمیانی قطار میں سب سے آگے تھے، ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ روز ہی دیکھتے تھے، ہم دونوں نے اپنے اپنے نام بتائیے دوستی ہو گئی۔

۳۶ء سے ۹۰ء تک تمہارے چہرے مہرے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ ۸۹ء میں آخری بار تمہیں دیکھا تھا۔ وہی بھرا ہوا گول چہرا، گندمی رنگ، عقابی آنکھیں، گھونگھر والے بال، پیشانی کے درمیان ایک بہت ہلکی سی لکیر جیسے اللہ کا الف ہو، پتلے ہونٹ، مضبوط ہاتھ پاؤں، لہجے میں اعتماد اور کسی قدر اکثر ہم دونوں ساتھ بیٹھتے برسوں ساتھ بیٹھے رہتے خاموشی سے شرارتیں کرتے رہے ماسٹروں کی آنکھ بچا کر کلاس روم کے فرش پر جگنو اور پتاخے پھینکتے رہے، کاٹم کوٹ کھیلتے رہے۔ ماسٹر کنجن لال مجھے کمزور سمجھ کر چھوڑ دیتے تھے مگر یہ کہتے ہوئے کہ میاں تمہیں نہیں چھوڑوں گا، تمہارے ایک گھونسا ضرور لگاتے تھے۔ کتنا پیار ہوتا تھا ان کے اس گھونسے میں، ایک دفعہ مولوی علی شیر خان نے مضمون لکھوایا۔ میں نے ہوائی جہاز کے بارے میں ایک بڑا مضمون لکھا۔ مولوی صاحب بہت خوش ہوئے وہ مضمون کلاس میں پڑھوا کر سنایا۔ اگلی دفعہ تم نے "میری پسندیدہ کتاب" کے موضوع پر ایک لمبا مضمون لکھا، مولوی صاحب نے یہ مضمون بھی کلاس میں سنوا کر حساب برابر کر دیا تھا۔ ہم دونوں پڑھنے کے شوقین تھے۔ کھیل کود سے نہ تمہیں دلچسپی تھی نہ مجھے وہ یاد ہے گرمیوں میں ہم دونوں آخری گھنٹے سے کھسک کر پاس والی بنگلیا میں آم توڑنے جاتے تھے، ماسٹر دواج کو شک ہو گیا کہ ہم دونوں بھاگ جاتے ہیں۔ انھوں نے گھر پر ہماری شکایت کر دی تھی اور ہماری بہت ٹھکائی ہوئی تھی۔ ایک دفعہ بھولے بابو نے بھی شکایت کر کے ہمیں پٹوایا تھا۔

کبھی کبھی ہم لوگ کتابیں اسمٰعیل کے گھر رکھ کر کھیتوں سے آلو چرانے جاتے تھے۔ آلو کھودنے کے بعد آلاؤ لگاتے۔ انہیں بھونتے۔ نمک مرچ لگا کر کھاتے کیا مزا آتا تھا۔ ساتھی اور دوست بہت تھے، سلمان خان، حسن رضا، چھوٹے مولانا دلدار، عبدالجمیل خان، علی اختر سہیل، پریم کمار، سریش، کیشو مگر اس مہم میں صرف مجتبیٰ شبیر اور دو ایک لڑکے اور ساتھ ہوتے تھے۔ پھر گنوں کی گاڑیوں سے گنے بھی پار کر لیتے تھے۔ اس کام میں رشید آگے آگے ہوتا تھا۔ سارا کام وہی کرتا تھا۔ ہم لوگ محض لہو لگا کر شہیدوں میں شامل ہونے والے تھے۔ مجتبیٰ کے گھر تاش بھی خوب

ہوتے تھے مجتبیٰ کے گھر سے آگے پولیس لائن کے قریب۔ہم لوگ غلیل سے کبوتر مارنے بھی جاتے تھے ۔ کبوتر تو ساتھ نہیں آتے تھے ہاں بھاگ ڈور خوب ہو جاتی تھی ۔

یاد ہے ایک دفعہ زاہد کے یہاں وعظ ہوا ۔ وعظ کہنے والے کون ، وہ صاحبزادے جو ہم سے ایک جماعت آگے تھے ۔ اور پڑھائی چھوڑ کر مولوی ہو لئے تھے ۔ جیسے ہی وہ تخت پر بیٹھے تم نے دوڑ کر ان کی ایک طرف کی مونچھ مروڑ دی میں نے بھی تمہاری دیکھا دیکھی ان کی دوسری مونچھ مروڑ دی بڑا غل ہوا تھا ۔ زاہد کے باپ مارنے دوڑے تھے ہم دونوں خود بھاگ لیے تھے ۔ یاد ہے ! ایک دفعہ ہم دونوں جامع مسجد میں بھی ٹھکتے ٹھکتے بچے تھے ۔ یاد آیا ! ہم تم جمعہ بڑی باقاعدگی سے جامع مسجد میں پڑھتے تھے ۔ اظہار کے والد امام تھے ۔ تکبیر حکیم اخلاق کہتے تھے ۔ اظہار کے والد پہلی رکعت میں سورہ جمعہ اور دوسری میں " القارعۃ " پڑھتے تھے ۔ مرتے مرگئے مگر اس معمول میں کوئی فرق نہیں آیا ہاں تو ایک دفعہ نماز ختم ہوئی ۔ دعا کا آغاز ہوا ۔ کڑ بڑی ڈاڑھی والے ایک بڑے میاں بیٹھے تھے جو فتح گڑھ کی حد تک ہمارے لیے اجنبی تھے ۔ انھوں نے ہاتھ اٹھائے اور اتنی زور سے کہ اردگرد کے لوگ بھی مستفیض ہو سکیں ۔ لہٰذا شروع کیا ۔ یا اللہ ۔ ننھی کے بیٹا ہو ، یا اللہ ننھی کے بیٹا ہو " تم نے خاموشی سے مجھے ٹہو کا دیا اور ہم دونوں نے اسی آواز سے کورس میں دعا شروع کر دی " یا اللہ ننھی کے بیٹا ہو ۔ یا اللہ ننھی کے بیٹا ہو " اس پاس والے ہنسی ضبط کر رہے تھے اور وہ بڑے میاں ۰۰۰۰ ان کے بس نہیں تھا کہ ہمیں کچا چبا جائیں ۔ اتنے میں دعا ختم ہوئی اور ہم دونوں صفوں کو چیرتے پھاڑتے سر پر پیر رکھ کر بھاگے ورنہ وہ بڑے میاں ایک آدھ ہاتھ ضرور جڑ دیتے زاہد کے یہاں لڑکوں کے مشاعرے میں بھی ہم نے بڑا غل غپاڑا کیا تھا مگر ان سب باتوں کے باوجود شہر کے مسلمان لڑکوں میں ہمارا بڑا نام تھا ۔ مثالیں دی جاتی تھیں یہ کسے معلوم تھا کہ ہم لوگ ساتھ پڑھنے کا بہانہ کر کے بڑے آرام سے مجتبیٰ کے گھر تاش کھیل رہے ہیں ۔ سنا ہے مجتبیٰ بھی مرگیا عمر میں وہ ہم سے سینئر تھا فیل ہو ہو کے ہمارے ساتھ آگیا تھا ۔ اس زمانے میں بھی تمہاری طبیعت میں ایک بے چینی اور مزاج میں سیماب وشی تھی ۔

اسکول کے زمانے میں ایک دفعہ تم نے مجھے بڑا تنگ کیا تھا ۔ تمہارے پاس رینالڈس کی ایک ناول کا ترجمہ تھا " اسرار حرم " نام تھا ۔ تمہاری واحد ملکیت ۔ وہ کم بخت ناول مجھ سے کھو گیا کھویا کیا گیا ۔ ایک ملازم نے پار کر دیا تھا ۔ اب کیا تھا تم فوراً اکڑ گئے ۔ ایسا نادر ناول تھا اب کہاں سے ملے گا ۔ حالانکہ میری نہ جانے کتنی کتابیں تم کھائے بیٹھے تھے مگر وہ ایک ناول میرے لیے جھاڑ کا کانٹا بن گیا ۔ تم نے مجھ سے اس کے بدلے میں پورے آٹھ آنے وصول کیے ۔ بڑے کھرے تھے یہ آٹھ آنے میں نے یہ حساب یوں چکایا کہ تمہاری سوان انگ کی بوتل پار کر دی (اللہ تعالیٰ مجھے معاف فرمائیے) تم بہت پٹ پٹائے ۔ بہت ڈھونڈا ۔ مگر وہ روشنائی روشنی دیدہ اغیار بن چکی تھی تمہیں پتہ ہی نہ چل سکا ۔ اس زمانے میں ناول پڑھنے کا کیسا شوق تھا ۔ منشی ندیم صہبائی فیروز پوری

اور اللہ جانے کون کون سے ناول نگار تھے۔ ہر دوسرے دن فرخ آباد جاتے۔ شیدا ایک ڈپو سے ۰۳ کا ایک ناول لاتے پھر باری باری سب اسے پڑھتے اور ندیم صہبائی فیروز پوری کی دھجیاں بکھیرتے ہم دونوں کو انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کا بڑا شوق تھا۔ کبھی کبھی خالص اسی مقصد سے دلی کے سفر کا منصوبہ بھی بنا مگر اس زمانے میں دلی ہمیشہ دور رہی۔ رفتہ رفتہ یہ ناول خوانی ختم ہوئی، ہم لوگ ادبی کتابیں پڑھنے لگے کچھ تو ہمارے گھروں کا ماحول کچھ پنڈت کنجن لال کی مہربانی، وہ زبردستی انگریزی کی عمدہ کتابیں پڑھواتے تھے۔ سوال کرتے تھے خلاصے لکھواتے تھے کئی برس تک انھوں نے بڑی محنت سے ہمارے ادبی ذوق کی تربیت کی تھی۔ مولوی علی شیر خان اسکول کی لائبریری کے انچارج تھے وہ بھی ہمیں اچھی کتابیں پڑھنے کو دیتے رہتے تھے۔

میٹرک کے بعد تم کچھ دن علی گڑھ میں رہے پھر گورکھپور چلے گئے گورکھپور میں مجنوں صاحب نے تمہیں بہت متاثر کیا۔ اس زمانے میں تمہارے موضوع گفتگو دو ہی تھے مجنوں صاحب یا گورکھپور کا اردو بازار۔ گورکھپور کے بعد تم نے بی اے کے لیے الہ آباد کا رخ کیا۔ اب میور ہوسٹل، بھا، دمڑی اوجھا، فراق صاحب اور اعجاز صاحب تمہاری گفتگو کا مرکز بنتے تمہارے بقول مجاز نے اپنی وہ نظم ؎

الہ آباد میں ہر سو ہیں چرچے
کہ دلی کا شرابی آگیا ہے

میور ہوسٹل میں تمہارے کمرے میں لکھی تھی۔ اس زمانے میں کاردار نے اپنی مشہور فلم شاہ جہاں بنائی تھی۔ تمہارا کوئی جاننے والا اربھاکر اس فلم میں کاردار کا معاون تھا۔ مجھے یاد ہے تم الہ آباد سے آئے تو سارے وقت اسی فلم کی تکنیک اور خوبیوں پر گفتگو کرتے رہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایک چمک پیدا ہو جاتی تھی۔ ہر نکتہ تفصیل سے بیان کرتے تھے میں نے جب یہ فلم دیکھی تو مجھے اتنی اچھی نہیں لگی جتنی تمہاری گفتگو سے ظاہر ہوتی تھی۔ تم میری رائے سن کر بہت ناراض ہوئے تھے مگر لڑائی کی نوبت نہیں آئی کیوں کہ تمہاری ہیکڑی کے جواب میں میں چپ ہو جاتا تھا شاید میں ہی وہ واحد آدمی ہوں جس سے تمہاری لڑائی نہیں ہوئی ورنہ لڑنے میں تم پکے فرخ آبادی تھے۔ کیا مجال کوئی ٹیڑھی آنکھ سے جو دیکھ لے۔

یہ ہماری زندگیوں کا بڑا پر آشوب دور تھا۔ دوسری جنگ عظیم کا دور کیسے کیسے نئے اور انوکھے تجربے ہوئے۔ راتوں کو بلیک آوٹ، ریل گاڑیوں میں رات کو بتیاں نہیں جلتی تھیں، شکر عنقا، مٹی کا تیل غائب، ماچس غائب، گیہوں غائب، ریزگاری غائب، ہم دونوں جب سینما دیکھنے کو فرخ آباد جاتے تو یکے والا یکے پر بٹھانے سے پہلے پوچھتا تھا "ریزگاری ہے" جب اطمینان کر لیتا پھر بٹھاتا یاد ہے ایک دفعہ تم میں اور جواں مرگ مولانا مقبول مصطفیٰ رحمانی سینما دیکھنے فرخ آباد گئے۔ گھسنا والے اس سینما میں اندر گھسو تو دو روپیہ دکانیں تھیں، آگے بڑھ کر کسی قدر

بلندی پر سیدھی طرف سینما کا ہال لئے ہاتھ پر انجن پر انجن مشین اور اس کے پہلو میں مٹھائی کی ایک دکان ، رنگ برنگے تھال سجے رہتے تھے ۔ پروگرام یہ بنا کہ انٹرول میں مقبول تھوڑی سی مٹھائی خریدیں گے اور ہم دونوں خاموشی سے تھال میں رکھی ہوئی گلاب جامنیں کھاتے رہیں گے انٹرول ہوا ۔ ہم لوگ دکان پر گئے ۔ مولانا نے ڈپٹ کر پاؤ بھر قلاقند مانگی حلوائی قلاقند تولنے لگا ہم نے خاموشی سے اپنا کام شروع کر دیا ۔ اچانک اس مردود کی نظر پڑ گئی ۔ بس پھر کیا تھا لگا ڈانٹنے "میاں کیا کر رہے ہو رام رام رام ساری مٹھائی بھرشٹ کر دی" ۔ تم نے "اس سے زیادہ زوردار آواز حلق سے نکالی ۔ کیا بکتا ہے بے ہم کوئی چور ہیں" "مقبول جو مٹھائی تلوا رہے تھے فوراً اینٹھ گئے ڈانٹ کر کہنے لگے ۔ "تو تو بڑا چھوما ہے جھوٹا الزام لگاتا ہے" "اتنی دیر میں ہم تم غائب ہو چکے تھے ۔ مولانا بھی بکتے جھکتے مٹھائی چھوڑ کر آ گئے خریدنا ہی کسے تھی ۔ کھیل ختم ہونے پر ہم تینوں الگ الگ باہر نکلے تھے کہ حلوائی کہیں تاک میں نہ بیٹھا ہو مگر ہمارے اندیشے بے بنیاد تھے ۔

اسی زمانے میں ربانی صاحب اور علیم سے تعلقات بڑھے ۔ ربانی صاحب کی سیر، اللہ کی پناہ ۔ نکلے تو بس چلا چل چلا چل ۔ چلے جا رہے ہیں ، ۔ ربانی صاحب کی وجہ سے ترقی پسند تحریک سے دل چسپی ہوئی ۔ انجمن ترقی پسند مصنفین قائم کی ہر ہفتے ادبی نشست ہوتی تھی مسعود الرحمن مرحوم فرخ آباد سے آتا تھا کیسی دل چسپ باتیں کرتا تھا ۔ کیسی بحثیں ہوتی تھیں نئی کتابوں اور رسالوں پر کیسے کیسے تبصرے ہوتے تھے ۔ یہ تحریک پاکستان کا دور عروج تھا ۔ ہم سب کٹر مسلم لیگی تھے بلکہ میں تو فتح گڑھ مسلم لیگ کا سیکریٹری بھی تھا ۔ یہ سب ربانی صاحب اور مرزا اشرف علی بیگ کا کیا دھرا تھا ۔ مرزا سے بھی اسی زمانے میں دوستانہ تعلقات ہوئے تھے وہ ہم دونوں سے عمر میں بہت بڑا تھا ۔ کچہری میں پیش کار تھا ۔ ہم لوگوں کو یا تو علیم صاحب چائے پلواتے تھے یا پھر مرزا ڈانٹ ڈپٹ میں آ کر چائے بھی پلواتا اور سینما کا انتظام بھی کرتا تھا ۔ اس زمانے میں ہم فلیش کھیلنے کی لت میں مبتلا ہو گئے تھے ایک بار بڑی بے ایمانی بھی کی تھی ۔ ایک لڑکا تھا "مجیب ، عجیب شکل تھی چہرا لکڑی کے تختے کی طرح سپاٹ جسم بالکل سوٹ کیس مگر پیسے بہت تھے ۔ شاید کسی دفتر میں نوکر تھا اپنے آپ کو سمجھتا بھی بہت تھا ۔ فلیش کھیلنے کا بھی شوقین تھا ۔ ہمارے ساتھ کھیلتا تھا اور ہمیشہ دون کی لیتا تھا ۔ ایک دن ہم نے طے کیا کہ آج مجیب کے چھکے چھڑا دیے جائیں تم اور مسعود نیر (افسوس یہ ہمارا ساتھی بحری جہازوں کی آمد و رفت کے انتظام میں غرق ہو گیا ہے بڑی مشکل سے ہاتھ آتا ہے) بڑی ہوشیاری سے پتے لگائے یہ بھی اتفاق اسی وقت مجیب بھی آ دھمکا بس پھر کیا تھا پتے بٹ گئے ۔ میں نے پہلے ہی ہاتھ میں پتے پھینک دیے ۔ مسعود بھی دو تین ہاتھ کے بعد گڈی میں گئے تم اور مجیب مقابلہ کرتے رہے ۔ اس غریب کو کیا خبر کہ وہ جن پتوں پر اکڑ رہا ہے ان سے بڑے پتے تم لیے بیٹھے ہو ۔ وہ تو بڑا مطمئن تھا مگر جن پر تکیہ تھا وہی پتے ہوا دینے لگے آخر میں مجیب چیں بول گیا ۔ ہم لوگوں نے بڑا جشن منایا تھا مگر بعد میں اس بے ایمانی پر افسوس بھی کیا تھا

یہ ہماری شاعری اور افسانہ نگاری کا ابتدائی دور تھا۔ فتح گڑھ میں ادیبوں اور شاعروں کا اچھا خاصہ حلقہ تھا۔ ربانی صاحب تھے، جلیل وکیل تھے۔ کیسی اچھی نظم کہتے تھے۔ گنگا اشنان ان کی بڑی دلکش نظم تھی۔ مرزا تھا، ہوش تھے، مرزا اشرف علی بیگ، جوہر رحمانی تھے، موج تھے، ہم سے عمر میں بڑے اور معزز۔ ان کے یہاں مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ بابو دوار کا ناتھ تھے۔ مشاعروں کے بنے بنائے صدر، مسعود کے یہاں جو طرحی مشاعرہ کیا تھا صدارت انھوں نے کی تھی، شفیق علی خان تھے دن رات پڑھنے میں غرق رہتے تھے۔ کیا شاندار کتب خانہ تھا۔ ایسا مرتب ذاتی کتب خانہ دیکھنے میں نہیں آیا بھائی جان کے دوست بابو امتیاز احمد تھے۔ جلیل وکیل انہیں کے کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ امتیاز صاحب کے یہاں بھی مشاعرے ہوتے رہتے تھے۔ ۴۷ء میں یوم اقبال والا مشاعرہ انہیں کے یہاں ہوا تھا۔ ربانی صاحب نے نظم پڑھی تھی تمہاری کتنی منت کی تھی اقبال پر مضمون پڑھو، تم پر شاعری کا بھوت سوار تھا۔ تیار ہی نہیں ہوئے علیم نے مضمون پڑھا تھا۔ آخر بلگرامی تھے عجیب گھونچو آدمی تھے۔ گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والے کبھی تہہ بند باندھے بنیان پہنے ٹہل رہے ہیں، کبھی سوٹ ڈلنٹے ہیں۔ سب کو رعب دیتے رہتے تھے۔ مگر جب مشاعرہ ہوتا تو کیسی مسکین صورت بنائے آتے تھے۔ آگے پیچھے پھرتے تھے۔ جب مجھ سے غزل لکھوا لیتے تو پیچھا چھوڑتے تھے۔ یاد ہے یاقوت گنج کے مشاعرہ میں سلطان دمیل نے ان کا مطلع سنتے ہی نعرہ لگایا تھا "واہ صاحب بلگرامی واہ بیٹے ...." مار پیٹ ہوتے ہوتے رہ گئی تھی۔ فقیر محمد خان نے صلح صفائی کرائی تھی۔ یہ آفاق صدیقی کا دور طفلی تھا بچہ تھا مگر اچھے شعر کہنے لگا تھا۔ فرخ آباد میں مشاعروں کے گورد گھنٹال حفیظ مجیبی تھے شاعر کیا تھے بہتے دریا تھے۔ ادھر کسی نے مصرع دیا ادھر انھوں نے غزل لکھوانا شروع کی۔ مجیب ان کا ہفت روزہ اخبار تھا مگر ایک آدھ مہینے بعد شائع ہوتا تھا۔ حفیظ صاحب مسلم لیگ کے لیڈر تھے، ضلع مسلم لیگ کے سیکریٹری تھے، ہم لوگوں کا بڑا ملنا جلنا رہتا تھا ان کا دفتر مسلم لیگی لیڈروں اور شاعروں کا اڈہ تھا۔ اس زمانے میں تم بھی شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے، مزاحیہ کہتے کبھی سنجیدہ مشاعروں میں بالعموم ہزل پڑھتے تھے مگر سچی بات یہ ہے کہ شاعری تمہارے بس کی نہیں تھی۔ غل زیادہ مچاتے تھے شعر کم کہتے تھے نثر کی طرف توجہ نہیں تھی عجیب بات یہ ہے کہ میں اس زمانے میں افسانے زیادہ لکھتا تھا اور تم شاعری کی طرف متوجہ رہتے تھے۔

واقعات گڈمڈ ہو رہے ہیں تمہیں خیال ہوگا۔ اتوار کی دوپہر کو بارہ سے ایک تک ولی کے ہوٹل میں فرمائشی پروگرام سننے کی خصوصی نشست ہوتی تھی۔ لکھنؤ سے پروگرام آتا تھا تم، میں علیم کبھی کبھی مسعود اور قمر شاید اس زمانے میں فرمائشی پروگرام میں نغمگی کچھ زیادہ ہی محسوس ہوتی تھی۔ پروگرام کے آخر میں ساز کا ایک ریکارڈ بجتا تھا۔ اسے ہم سب بڑے انہماک سے سنتے تھے۔ ولی کا ہوٹل ہماری بیٹھک تھا ولی بھی کیسا ہوشیار تاجر تھا۔ بکری کے دودھ کی چائے پلاتا۔ بکری کے دودھ کی کھیر کھلواتا مگر وہ چائے اور کھیر کیسی لذیز معلوم ہوتی تھی دراصل چائے تو

مقصود کی عمدہ ہوتی تھی مگر وہاں بیٹھنے کا ٹھکانا نہیں تھا۔ سارے افیمی بھرے رہتے تھے، ہم اگر وہاں چائے پیتے بھی تو فوراً ہی بھاگ لیتے تھے۔

یاد ہے جب ہم سب کانپور گئے تھے قمر کی شادی کے موقع پر برات کے ساتھ تمہاری شرارت کا تذکرہ آج بھی ہوتا ہے۔ انور گنج کے اسٹیشن پر ریل سے اترے تانگوں میں بیٹھے۔ قمر دولہا بنے سہرا باندھے ساتھ میں تم اور میں۔ تانگے چلے قمر کے والد نے پوچھا "تم لوگوں کو جگہ معلوم ہے۔" تم نے کہا "ہاں معلوم ہے" تانگے روانہ ہوگئے۔ پہلے ساتھ ساتھ رہے پھر ایک دوسرے سے الگ ہوگئے۔ تمہیں پتہ قطعی نہیں معلوم تھا، فقط رعب گانٹھنے کے لیے ہاں کہہ دی تھی۔ صرف یہ معلوم تھا کہ کرنیل گنج جانا ہے۔ اب کرنیل گنج کوئی سوئی کا ناکا تو تھا نہیں بڑا پھیلا ہوا محلہ تھا کہاں ڈھونڈیں، کدھر جائیں، مکھڑے پہ سہرا ڈالے دولہا ہمارے ساتھ حق حیران براتی ہمیں ڈھونڈ رہے ہیں ہم براتیوں کو ؎

اب انہیں ڈھونڈ چراغ رخ زیبا لے کر

ایک جگہ شامیانہ اور چہل پہل دیکھی۔ تم نے خوش ہو کر کہا، "بلا وجہ پریشان ہو رہے تھے، آخر آ تو پہنچے"۔ قریب گئے تو وہاں نکاح ہو رہا تھا، خطبے کی آواز آ رہی تھی۔ نوک دم بھاگے کہیں لوگ یہ نہ سمجھ لیں کہ متوازی برات آگئی ہے ٹھکائی نہ کر دیں۔ قمر بیچارہ الگ پریشان۔ آخر کار قمر کے والد نے ہم لوگوں کو ڈھونڈ نکالا۔ کیسی ڈانٹ پڑی تھی۔ یاد ہے پھر نکاح میں ہم لوگوں نے شرارت کی پوپلے منہ والے قاضی جی، بی بی اینڈ سی آئی ریلوے کے ایک پرانے رجسٹر پر اندراج کر رہے تھے تم نے ہاتھ بڑھا کر رجسٹر چھین لیا "یہ سرکاری رجسٹر پر اندراج ہو رہا ہے پولیس میں دے دیے جاؤ گے"۔ بڑی مشکل سے ان غریب کا پیچھا چھوڑا تھا۔ بڑا یادگار سفر تھا۔

کانپور کا دوسرا سفر خالص تفریحی تھا اسٹیشن کے پیچھے ایک نیا سینما تعمیر ہوا تھا، شالیمار نام تھا۔ شہرہ سنا تو ہم لوگ بھی گئے فلم "کناری" سے اس کا افتتاح ہوا تھا تم تھے علیم تھے میں تھا۔ سب نے پکچر دیکھی مول گنج کے چوراہے پر ایک نیا ہوٹل کھلا تھا۔ پہلی منزل پر کھانا وہاں کھایا تھا۔ اگلے دن واپس آگئے تھے۔

سب سے دلچسپ سفر قنوج کا تھا۔ ۳۱ دسمبر ۴۶ء کو قنوج میں مسلم لیگ کا ایک جلسہ اور مشاعرہ قرار پایا ربانی صاحب نے کہا "سب چلیں گے" کیا اہتمام ہوئے تھے ربانی صاحب، علیم مرزا ہوش جیسے ہم سب پیار میں Hoosh اور زیادہ لاڈ میں موش کہتے تھے۔ ہوش جلدی میں دفتر سے نکلے گھبرائے ہوئے تو تھے۔ دیکھا نہ بھالا یکے سے ٹکرا گئے گیا۔ بموں سے لٹک گئے۔ وہ تو بڑی خیر ہوئی کہ زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ مرزا بھی کچہری سے جلدی کھسک آیا تھا۔ شام کے چار بجنے والی ٹرین سے روانگی ہوئی۔ ٹکٹ صرف ربانی صاحب نے خریدا تھا ہم سب "ڈبلوٹی" تھے کہ یہ طالب علمانہ شعار تھا اکتیس میل کا یہ سفر کیسا دلچسپ تھا۔ خدا گنج میں پیڑے کھائے۔ گورسہائے گنج

میں گرما گرم پوریاں اور چائے ۔ قنوج کے اسٹیشن سرائے میراں پر ہمارے استقبال کے لیے سارا قصبہ امنڈ آیا تھا ۔ کیسے تزک و احتشام سے سرائے میراں سے قنوج گئے قنوج خوشبوؤں کا شہر، در و دیوار، ماحول اور فضا خوشبو میں ڈوبی ہوئی گرد اگرد پھولوں کے کھیت مکرند نگر کی سڑک پر صندل کا برادہ پھیلا ہوا تھا ہر طرف خوشبو ہی خوشبو شمامۃ العنبر کی دھیمی خوشبو، روح گلاب کا تند و تیز لخلخہ ۔ پہلے جلسہ ہوا تم نے بھی تقریر کی ربانی صاحب بھی بولے تھے ۔ فتح گڑھ مسلم لیگ کے سکریٹری کی حیثیت سے میں نے بھی تقریر جھاڑی تھی ۔ یہ سیشن ختم ہوا مشاعرہ ہوا میں نے اس موقع کے لیے خصوصی نظم لکھی تھی "۴۶ء کی رخصت" یاد نہیں کیا لکھا تھا مگر تھی صورت حال کے مطابق بڑی واہ واہ ہوئی تھی ۔ ربانی صاحب سے میں نے پوچھا تھا "آپ کیا پڑھیں گے" ۔ "کوئی بڑی چلتی ہوئی چیز" پھر انھوں نے وہ نظم پڑھی جس کا مقطع یہ ہے ۔ ؎

سحر کی خوبیاں برحق مگر تاباں یہ ڈرتا ہوں
کہ پچھلی نیند سے وہ ماہ طلعت جاگ اٹھے گی

صبح چار بجے قنوج سے سرائے میراں واپسی ہوئی ۔ اسٹیشن پر ہو کا عالم ۔ نہ آدم نہ آدم زاد ۔ ریل صبح چھ بجے آئی تھی ۔ علیم اور ربانی صاحب چائے کے لیے ہڑک رہے تھے ۔ تم نے مرزا کو ڈانٹنا شروع کیا "بڑا بیشکار بنا پھرتا ہے، ایک پیالی چائے نہیں پلوا سکتا" ۔ مرزا بھی تاؤ کھا گئے بولے "سامنے کانجی ہوس ہے وہاں چلتے ہیں" تم نے پھر ڈانٹا "کانجی ہوس میں تمہیں بند نہیں کرنا ہے، نہ ہمیں بند ہونا ہے" اس وقت مرزا صاحب منہ سے بکرے کی سی آواز نکالی کہ منشی میرا دوست ہے اس کو جگا کر چائے بنوالیں گے دو چار بکریاں بھی کاجی ہوس میں ضرور ہوں گی ان کا دودھ بھی مل جائے گا" پھر ہم سب کانجی ہوس پہنچے ۔ تم نے کیسا اودھم مچایا تھا ۔ منشی گھبرا کر آنکھیں ملتا ہوا اٹھ بیٹھا مرزا کو دیکھا ۔ پوچھا خیریت پھر چائے بنی واقعی بکریاں موجود تھیں ۔ انہیں کے دودھ کی چائے پی گئی مگر تم نے چائے پی کر بھی مرزا کو جھاڑا ۔ وہاں سے نکلے تو اندھیرے میں ٹھوکر لگنے سے علیم گر پڑے ۔ پیر میں چوٹ آئی اس پر بھی تم نے مرزا کو ڈانٹا تھا کہ یہ سب تمہاری بیہودگی ہے ۔

اس زمانے میں روزانہ شام کو گنگا کی سیر ہوتی تھی تم، مسعود، مرزا اور میں مولانا اکرام الٰہی کی دکان پر ٹھکی لیتے، پھر روانہ ہو جاتے مرزا سگریٹ نہیں پیتا تھا آنے جانے میں تین تین سگریٹ ہم تین آدمی پیتے تھے ۔ ڈبیا میں ایک سگریٹ بچتا تھا وہ تم کبھی چپکے سے کبھی دھاندلی سے پی جاتے تھے پھر وہ تمہارا حق تسلیم کر لیا گیا طے ہو گیا کہ یہ چو تھڑ ہے واپسی میں چائے مرزا کے ذمہ ہوتی تھی ۔ دلی کے ہوٹل میں جا کر بیٹھ جاتے تھے ۔ چائے کے بعد نشست میرے یہاں ہوتی ۔ ربانی صاحب اپنی لمبی ٹہل سے واپس آتے ۔ علیم بھی وہیں پہنچتے دنیا جہاں کے مسائل وہیں چھڑتے کوٹھی کا صحن کیسا لق و دق تھا ۔ کوئی دو سو چارپائیاں آسانی سے بچھ سکتی تھیں اس وسیع و عریض صحن کے ایک گوشے میں ایک بڑی لالٹین کے نیچے باتیں ہوتی تھیں ۔ ہوش کی باتیں کم جوش کی

زیادہ ۔ اکثر رات کا کھانا میرے یہاں ہوتا ۔ کیا دن تھے نہ کوئی تکلف نہ کوئی اہتمام ۔ اندر سے کھانا آگیا ۔ وہیں پلنگوں پر بیٹھے بیٹھے کھالیا ۔ کھانے میں تمہارا کوئی نخرا نہیں تھا ۔ جو سامنے آیا کان دبا کر کھالیا ۔ اس زمانے میں تمہیں چسکی کی برف کھانے کا خبط ہو گیا تھا ۔ برف کو رندے پر چھیلا جاتا تھا پھر اسے ایک چھوٹے گلاس میں گول کر کے شربت چھڑکا جاتا تھا • ایک پیسے میں ایک گلاس ملتا تھا کبھی کبھی رُوپے دھیلی کے گلاس اڑتے تھے ۔ پھر ملائی کی برف کا شوق ہوا ۔ وہ بھی کیا چیز تھی ۔ برف کیا للالین کی پٹی میں لپٹا ہوا بڑا سا ڈلا برف والے نے لکڑی کی صندوقچی کھولی ۔ ڈلا نکالا چھری سے تھوڑی سی برف کاٹی ۔ پتے پر رکھ کر دے دی ، ہم تم ہیں کہ خوش خوش بیٹھے برف کھا رہے تھے ٹھنڈے ہو رہے ہیں ۔ مرزا ان مشغلوں سے ہمیشہ دور رہتا تھا ۔ شہر میں اس کا بڑا رعب تھا ۔ لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے ۔ پیشکار صاحب سلام ، آداب عرض ہے پیشکار صاحب بس ہم لوگ تھے جو اس کے رعب میں نہیں تھے خاص طور پر تم جو اس کی مرزائیت کی نفی کرتے رہتے تھے ۔ کھانے کے بعد پھر باتیں چھڑ جاتیں جیسے جیسے رات بھیگتی ایک خوابناک دنیا کے دروازے کھلتے جاتے تھے ۔

جیسے جیسے رات ڈھلتی اور ڈھلتی تھی شراب

ہر لمحے ایک نیا منظر ہر سو سبزہ ، ہر سو شادابی ۔ پھول ہی پھول سکل بن پھول رہی سرسوں رنگ ، خوشبو ، روشنی ، اجالا ہی اجالا ہر چیز نکھری نکھری شفاف اور روشن نہ ظلمت نہ استحصال نہ جبر نہ محکومی نہ غلامی ، آزادی ، مساوات اور اخوت ہماری جد و جہد کی تعمیر ۔ منظر بدلتے جاتے جیسے کوئی کتاب کے صفحے پلٹ رہا ہو ، ہر صفحہ نئے اور دلکش مضامین سے بھرپور ۔ ہر سطر اجلی ، ہر حرف روشن ہر لفظ منور اور معطر جیسے اپنے پورے وجود کو انتہائی جوش و خروش سے ظاہر کر رہا ہو ۔ اپنے آپ کو منوا رہا ہو ہماری شناخت اور حوالے اپنا اظہار کرتے نظر آتے ۔ تم ایئر فورس کے افسر کے روپ میں ہنستے مسکراتے ، نیلی چست وردی ، کندھوں پر پھول ، سینے پر تمغوں کی قطار (تم نے یو او ٹی سی میں ایئر فورس کا ایک کورس کیا تھا) علیم ہمیشہ کی طرح کالی شیروانی اور پیجامے میں سر جھکائے ۔ انہماک سے کچھ لکھنے میں مصروف میں اخبار کے دفتر میں بیٹھا ادارت کے فرائض انجام دینے میں محو ۔ کیا کیا خواب تھے کیسے کیسے خواب تھے مرزا ہنستا ہوا عدالت عالیہ کے دفتر میں تمکنت اور وقار سے بیٹھا ہوا ۔ وہیں رہ گیا (سنا ہے بہت بیمار رہنے لگا ہے اللہ تعالیٰ تال گرام کے اس حقیقی نمائندے کو زندہ سلامت رکھے دوستی کی ، آبرو اور بھرم اسی سے قائم ہے) علیم تمہاری طرح شہر خموشاں میں جا سویا کیا آدمی تھا ۔ Gentleman of the Romantic Revival ، ہم لوگوں کا سیاسی اور ادبی رہنما ، میں نے کئی بار کوشش کی لیکن اس مضطرب روح کو الفاظ کی گرفت میں نہ لا سکا بس ایک تعزیتی نظم لکھ کر چپکا ہو رہا ۔ تمہیں یاد ہے ایسے موقعوں پر کوٹھی کا صحن نور میں ڈوبا ہوا محسوس ہوتا ۔ یہ معلوم ہوتا کہ جیسے برسوں بعد کا کوئی

سن ہے ۔ ۷۰ ،ہم سب بوڑھے ہو چکے ہیں ۔ دور دور سے فتح گڑھ آئے ہیں ۔ کوئی دلی سے آیا ہے ، کوئی لکھنؤ سے ، کوئی بمبئی سے کوئی کلکتہ سے کوٹھی کے صحن میں جمع ہیں ۔ اپنا اپنا حال سنا رہے ہیں پاکستان کا تذکرہ ہوتا کوئی کہتا ہے اللہ تعالیٰ کا "شکر ہے پاکستان کے حالات بڑے اچھے ہیں ۔ میں کہہ رہا ہوں ۔ میں پچھلے دنوں لاہور گیا تھا ایک اخباری کانفرنس تھی ۔ تم کہتے ہو ۔ میں کراچی گیا تھا بڑی رونق اور چہل پہل ہے ۔ ان کی ایئر فورس بڑی چوکس اور جدید جہازوں سے لیس ہے ہماری باتوں سے صحن کے اجالے میں کچھ اور اضافہ ہو جاتا مگر ضمیر تم نے کیا سوچا تھا اور میں نے کیا چاہا تھا۔ صحافت تمہارے حصے میں آئی اور میں جو دلدادہ صحافت تھا معلم بن گیا ؎

"اس حرص و ہوا کی دنیا میں ہم کیا چاہیں ہم کیا مانگیں"

فتح گڑھ کے واحد اردو ہفت روزہ "سلطان" کے مالک مدیر مرزا اشرف علی بیگ ہم سے گھبراتے تھے مگر وہ خوب سمجھتے تھے کہ شیطانوں کے اس ٹولے کو ساتھ رکھنا ضروری ہے ہماری زیادتیوں کو برداشت کرلیتے تھے ۔ وہ جو بڑوں کی ٹولی تھی ہم سے کچھ سینئر وہ تمہارے برادر بزرگ بنے بھائی کے دوست ہونے کی وجہ سے ہمارا خیال کرتے تھے ۔ گرجا نندن ، رام پرتاب بہادر جیسے اس کے باپ کی وجہ سے سب ڈاکٹر کہتے تھے گانے بجانے کا کیسا دھتی تھا ۔ بس یہی کہتا تھا تم دیکھنا ایک دن آئیڈیل فلم کمپنی کا تالا کھولوں گا مگر اس تالے کو کھولنے کی آرزو میں خود اس کا تالا بند ہو گیا ۔ فضیل بھائی عمران صاحب ، طاہر صاحب ہم سے دوستانہ طریقے سے پیش آتے تھے ۔

۴۶ ء کے الیکشن یاد ہیں ۔ وہ ہماری کتنی بڑی آزمائش تھے ۔ کیسی کیسی تقریریں کی تھیں کیسے کیسے دور دراز دیہاتوں میں جانا پڑا تھا ۔ جھنڈا اٹھائے ۔ نعرے لگاتے پیدل دوڑ رہے ہیں چھپرا مٹو ، تالگرام ، ترو ا ، سترکھ ، روداین ، کیسی کیسی فضول جگہوں پر جانے کا اتفاق ہوا ۔ کتنا پیدل چلتے رات کو جلسہ کیا ۔ تقریریں کیں پھر وہیں کسی مسلمان کے یہاں لوٹ ماری ۔ صبح ہوئی اور دوسرے گاؤں کا سفر کیا کیسا پڑھنا کیسا لکھنا ۔ سر پیر کا ہوش نہیں تھا ۔ سر گاڑی پیر پہیا ۔ بس دوڑے جا رہے ہیں ۔ وہ یاد ہے شام کو ایک گاؤں پہنچے نماز کا وقت تھا مسجد لے جائے گئے ۔ ربانی صاحب سربراہ تھے وہ ہمیں الگ لے گئے گئے پوچھنے لگے وضو کیسے کرتے ہیں ۔ میں نے کہا دیکھتے جائیے پھر ہم دونوں نے وضو کیا ۔ ربانی صاحب ہماری تقلید کرتے رہے ۔ لوگوں نے ان سے اصرار کیا ۔ نماز آپ پڑھائیں مگر ربانی صاحب مسکرا کر ٹال گئے ۔ ہاں چار و ناچار نماز میں شامل ہو گئے تھے بعد میں ہم لوگ کتنا ہنسے تھے ۔

یوں تو ہر مقابلہ اہم تھا مگر کانٹے کا مقابلہ شہید ملت کا تھا سارے نتائج کا اعلان ہو چکا تھا میرٹھ کی ایک نشست کا نتیجہ ہی نہیں آچکتا تھا ہم سب کو بڑی تشویش تھی ۔ دن بھر اسی فکر میں دوڑتے پھرتے تھے ۔ پھر ایک رات نو بجے کی خبروں میں شہید ملت کی کامیابی کا اعلان ہوا ساری چوکڑی دلی کے ہوٹل میں جمع تھی سنتے ہی تم نے کیسا زبردست نعرہ مارا تھا ۔ سب کو خبر ہو گئی اس

وقت، ہم سب کتنے Excited تھے ساری تشویش ختم ہو گئی۔

پھر ایک انٹیرم گورنمنٹ مسلم لیگ علحدہ رہی۔ ان دنوں ہم لوگ کتنے چپ رہتے تھے تمہارے مزاج میں بڑی جھنجھلاہٹ آگئی تھی ہر بات پر کاٹنے کو دوڑتے تھے۔ جیسے برطانوی وائسرائے نے صرف تمہیں ذاتی طور پر زک پہنچانے کے لیے مسلم لیگ کو انٹیرم گورنمنٹ سے علحدہ کیا تھا۔ یہ بڑی اداسی کا دور تھا۔ دن بھر مارے مارے پھرتے تھے۔ کسی چیز میں دل نہیں لگتا تھا۔ بڑے مضمحل شب و روز تھے پھر ایک شام اچانک خبر ملی مسلم لیگ انٹیرم گورنمنٹ میں شامل ہو گئی ہے، شہید ملت وزیر خزانہ ہو گئے ہم لوگوں نے آناً فاناً ہر مسلمان گھر پر چراغاں کر دیا جگہ جگہ چراغ روشن ہو گئے" سارے شہر میں "چراغ ہی چراغ" جگمگاہٹ سے ہوا تھا رات کا دامن چراغ" دلی کے ہوٹل کے سامنے خدا بخش کے کرائے میں ایک طوائف رہتی تھی اللہ جانے کیا نام تھا ہم لوگ از راہ تفنن دگی کہتے تھے۔ مسعود نے یہ نام تجویز کیا تھا جو ہم میں رائج ہو گیا تھا۔ ہم دونوں چپ چاپ بے جھجک اس کے کوٹھے پر چڑھ گئے۔ چراغ جلا کر الٹے پیروں لوٹ آئے تھے۔ سارا فتح گڑھ جگ مگ جگ مگ کر رہا تھا۔ ہم لوگ حسب معمول خبریں سننے دلی کے ہوٹل میں بیٹھے پھر سارے شہر کا ایک گشت لگایا۔ ہماری طرح سارے مسلمان بوڑھے بچے جوان عورتیں سب گھوم رہے تھے ایک آدھ نے ہماری طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا" یہ ان نوجوانوں کی ہمت ہے۔ روشنی انہیں کے دم سے ہے" اس رات خوابناک دنیا کے دریچے صبح تک کھلے رہے تھے، صبح ہوتے میں نے اقبال کا یہ بند ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہوجائے گی

بڑے اونچے سروں میں گایا تھا۔ پھر صبح کے موضوع پر کتنے ہی اشعار پڑھے گئے تھے۔

بہار ریلیف فنڈ کے لے ہم نے کتنا چندہ جمع کیا تھا۔ پلٹن والوں سے بھی پولیس والوں سے بھی، جیل کے عملے سے بھی کہاں کہاں نہیں گئے کس کس کے آگے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ فتح گڑھ میں ایک نئے مسلمان وکیل آئے تھے۔ ڈاکٹر یوسف کے مطب کے پاس رہتے تھے۔ ایک دن ان کے یہاں جا دھمکے نہ جان نہ پہچان پھر وہ ہمارے دوست بن گئے۔ چوکڑی میں شامل ہو گئے تھے۔ ۴۶ء کے آخر میں جا بجا فسادات ہو رہے تھے، ہم لوگ کتنے پریشان رہتے تھے۔ کبھی کبھی ساری رات باتیں کرتے۔ تم کوٹھی ہی میں سو جاتے تھے بابو گرجا نندن سامنے رہتے تھے وہ اخباری نامہ نگار بھی تھے اکثر مچھٹا ہوتا تھا عمر میں وہ ہم سے بہت سینئر تھے مگر ہم ابھی تک انہیں تنگ کرتے تھے عجیب آدمی تھے کسی بات کا برا ہی نہیں مانتے تھے۔

سیاسی تحریکیں اور شورشیں اپنی جگہ مگر یہ ہماری کڑکی کا بھی دور تھا بیکار بیٹھے تھے نوکری کے نام سے بھاگتے تھے اکثر پیسوں کی کھینچ رہتی۔ علیم اور مرزا چائے پلوا دیتے تھے مگر

ہماری شاہ خرچیاں کہاں سے پوری ہوتیں۔ بس یہی صورت تھی گھر سے کچھ مل گیا تو کام چل گیا مل گئی تو روزی ورنہ روزہ حقے اور طلسم ہوشربا کا دور اسی زمانے میں چلتا تھا۔ اس زمانے میں ہم سب مجاز کی نظم "آوارہ" کے ہیرو بنے ہوئے تھے۔

ان ہی دنوں تمہاری نانی نے گورکھپور جانے کا ارادہ کیا۔ ببنے بھائی وہیں تھے۔ اب تو ببنے بھائی پہچانے بھی نہیں جاتے۔ لمبی ڈاڑھی، معمولی کرتا پیجامہ، ایک زمانہ تھا کہ ان کی خوش لباسی کے چرچے تھے۔ اعلیٰ درجے کا سوٹ پہنتے تھے اور گاتے تو ایسا تھے کہ بس سنتے ہی جاؤ کالج میں انہیں "اے بیٹر سیگل" A better Saigal" کہا جاتا تھا۔ ایک رات ہم سب حسب معمول کوٹھی میں بیٹھے تھے دور سے گانے کی آواز آرہی تھی "کروں کیا اس نواس بھئی" سب نے کہا سیگل کا ریکارڈ بج رہا ہے، کسی نے ٹوکا کیسا ریکارڈ ہے ساز تو ہے ہی نہیں جاکر دیکھا تو ببنے بھائی گارہے ہیں، ہاں تو نانی گورکھپور جانا چاہتی تھیں تم ٹال گئے کہ کڑکی کا زمانہ تھا۔ پیسے نہیں تھے۔ پھر تم نے حسب معمول داؤں مارا۔ بیمار بن گئے۔ نانی سے کہا اسلم کے ساتھ چلی جائیے۔ وہ بے چاری سیدھی سادھی مجھ سے کہنے لگیں" بیٹا یہ شارے تو بیمار ہو گیا ہے۔ تم مجھے گورکھپور چھوڑ آؤ" سنگ آمد و سخت آمد دبے لفظوں میں مصروفیت کا عذر کیا۔ بولیں" دن رات ٹانگیں مارتے پھرتے ہو چلے نہیں چلتے" مجبوراً جانا پڑا۔ مشکل یہ تھی کہ شہر نگار لکھنو راستے میں تھا خالی ہاتھ وہاں کیا جاتے ؎

تہی دست رفتن سوئے دوستاں

اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا سینے پر صبر کی سل رکھ لی کہ صرف گذر جائیں گے۔ ٹھہریں گے نہیں۔ کسی سے نہیں ملیں گے۔ گورکھپور گئے لکھنو نہیں رکے اس سفر کی یادگار وہ نظم ہے جو شہر نگاراں کی یاد میں گورکھپور میں لکھی گئی تھی ؎

تیری آغوش ہے گہوارہ امید حیات

تم نے سنی تھی تو بے اختیار کہا تھا" کاش یہ نظم میں لکھتا" پھر ایک شام کوٹھی میں سب نے یہ نظم سنی تھی۔ پرانے کاغذوں میں شاید اب بھی محفوظ ہو میں اسے تمہاری یادگار سمجھتا ہوں۔

پھر وہ تاریخی تصویر کھنچی۔ تمہاری، میری، علیم اور مسعود کی تصویر۔ سادی بھابی کہتی ہیں تمہارے پاس بھی محفوظ تھی۔ تم لندن میں اکثر اسے دیکھتے تھے۔ ہم سب سیاہ شیروانیاں پہنے ہیں۔ شیروانی کے کالر پر پی کا حرف لگا ہوا ہے۔ پاکستان کا نشان کوٹھی کے صحن، میں بڑے اہتمام سے کھنچی تھی۔ یہ تصویر میرے پاس بھی ہے۔ میں جب بھی اسے دیکھتا ہوں تو خوابناک دنیا کے دریچے کھل جاتے ہیں اور مجھے ماضی کی جنت میں لے جاتے ہیں یہ تصویر ہماری محبتوں کا آئینہ ہے اس تصویر میں ہماری جوانی دفن ہے وہ جوانی جو دیوانی ہوتی ہے مگر فتح گڑھ سے نکلنے کے بعد اس سرشور اور دیوانی جوانی سے ہماری کبھی کوئی ملاقات نہیں ہوئی کیوں کہ ؎

آنکھ جھپکی بدل گئے حالات

تین جون کا اعلان بھی ہم نے دلی ہی کے یہاں سنا تھا۔ ہم سب خوشی سے پاگل ہو گئے تھے مگر ہماری خوشی کو فسادات کے سلسلوں نے گہنا دیا تھا۔ کیسے ہولناک فسادات تھے۔ فتح گڑھ میں بھی خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ قریب کے بعض دیہاتوں میں ہندو مسلم معرکہ آرائی کی نوبت بھی آگئی تھی۔ یاد ہے ایک سید صاحب سارا دیہاتی شاہ جہاں دو معرکہ آرا گروہوں کے درمیان صلح صفائی کرتے ہوئے شہید ہو گیا تھا۔ میت فتح گڑھ آئی تھی۔ موتی نے تجہیز و تکفین کے لیے روپے دیے تھے۔ ہم لوگوں نے دفن کرایا تھا شہر میں بڑی دہشت پھیل گئی تھی ہم نے یہ طے کیا کہ تم دلی جاکر قائد اعظم سے ملو اور بتاؤ کہ فساد کا اندیشہ ہے کیا سادگی تھی۔ یہ نہیں سوچا کہ قائد اعظم کتنے مصروف ہیں۔ چھوٹے چھوٹے مقامی مسئلوں کا جائزہ نہیں لے سکتے تم دلی گئے اور چپ چاپ لوٹ آئے وہاں یہ کہا گیا کہ صوبائی لیڈروں سے رابطہ کیجیے مگر سب اپنی اپنی پریشانیوں میں مبتلا تھے اور فتح گڑھ میں فساد بھی نہیں ہوا۔

چودہ اگست کسی رات شب قدر تھی۔ ساری رات جاگے تھے لاہور سے پروگرام سنا تھا فتح گڑھ میں کل آٹھ نو ریڈیو سیٹ تھے۔ جن میں سے ایک ولی کے یہاں تھا۔ وہیں سارا پروگرام سنا گیا تھا۔ پندرہ اگست کو ہونا بزازے میں بہت بڑا جلسہ ہوا تھا۔ میں نے ایک خصوصی نظم لکھی تھی جو اب ذہن سے بالکل محو ہو چکی تھی۔ ربانی صاحب نے اپنی تقریر میں ہم دونوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا، "یہ ضمیر ہیں جشن آزادی کی خوشی میں تین دن سے جاگ رہے ہیں بڑے ہوش مند اور مستعد نوجوان ہیں، اسلم سے ابھی آپ ان کی نئی نظم سن چکے ہیں یہ جشن میں شامل ہونے کے لیے بمبئی سے خاص طور پر آئے ہیں (میں کچھ دن پہلے بمبئی چلا گیا تھا) جشن آزادی کے دو تین دن بعد میں بمبئی واپس چلا گیا وہاں سے کراچی آگیا۔ بھائی جان مرحوم بڑے ناراض ہوئے تھے۔ لکھا "تم لندن بھی چلے جاؤ تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، مگر اطلاع دے کر جاؤ" تم نے خط میں لکھا "فتح گڑھ کی فضا بدل گئی ہے۔ اکیلے پن کا احساس شدید سے شدید تر ہوتا جارہا ہے۔ ہمیں بلانے کا انتظام کرو۔ فتح گڑھ اب ہمارے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہے" آنا جانا بڑا مشکل تھا مگر میں دسمبر کے آخر میں پھر فتح گڑھ جا پہنچا۔ واقعی فضا بدل گئی تھی۔ کوئی سوگ میں ڈوبی ہوئی معلوم ہوتی تھی جاننے والوں کی نگاہیں بدلی ہوئی تھیں زمین اور آسمان بدلے ہوئے تھے تم اور علیم جان سے بے زار تھے بس "ہمہ عمر باتو قدح زدیم و نرفت رنج خمار ما" پڑھتے ہوئے نکل کھڑے ہوئے تم اور علیم کچھ دن الہ آباد میں ٹھہرے میں جبل پور میں رک کر تم لوگوں کا استقبال کرنے کراچی پہنچ گیا۔ یاد ہے الہ آباد کے اسٹیشن پر پولیس والوں نے کتنا تنگ کیا تھا۔ سارا سامان کھکھوڑ ڈالا تھا۔ ایک ایک چیز الٹ پلٹ کر دیکھی تمہارے پاس قائد اعظم کی ایک تصویر تھی۔ ایک پولیس والا کہنے لگا "یہ آپ نہیں لے جا سکتے" تم نے اسے منہ کی کھلائی ہاں آپ رکھ لیجیے کام

آجائے گی۔ ہم انہیں روز ہی دیکھتے رہیں گے۔"

ان دنوں میرے پاس رنچھوڑ لائن میں ایک کمرہ تھا۔ تم اور علیم وہیں ٹھہرے میں نے ایک بھاری مسہری خرید رکھی تھی وہ ہم نے علیم کے حوالے کر دی تھی تم فرش پر لوٹ لگاتے تھے بقول خواجہ حیدر علی آتش ؎

فرش گل بستر تھا یا اب خاک پر سوتے ہیں ہم
خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوئے دوست

دن بھر مارے مارے پھرتے تھے پھر تم اے پی پی میں ملازم ہوگئے۔ ایک دن تم نے مجھے بتایا کہ تمہارا ایک اخباری مضمون بہت پسند کیا گیا تم نے اماں اور بھائی بہنوں کو بھی بلوا لیا۔ پیر کالونی میں آباد ہوگئے یہ بڑی بھاگ دوڑ کا دور تھا۔ مگر اکثر شام کو اکٹھے ہوتے تھے۔ روح میں ایک بے تابی تھی۔ ہر جلسے جلوس میں دوڑے جاتے تھے۔ ہمیشہ آگے آگے رہتے پہلے جشن استقلال پر پرانی نمائش کے سامنے جو ہنگامہ ہوا تھا ہندوستانی سفارت کاروں نے اپنا جھنڈا لگایا تھا آناً فاناً بڑا مجمع ہوگیا تھا۔ سب عمارت کو آگ لگانے کے درپے تھے۔ سفارت کار بندوقیں تانے چھت پر کھڑے تھے حسب معمول ہم تم آگے تھے کیسے زور زور سے نعرے لگا رہے تھے۔ جانے کون کون مجمع کو سمجھانے آیا مگر کوئی سننے پر تیار نہیں تھا پھر شہید ملت آئے کیا تقریر تھی۔ جادو تھا۔ لوگ جس تیزی سے جمع ہوئے تھے ویسی ہی تیزی سے ہوا بھی ہوگئے۔ یہ عوامی لیڈری کا کمال تھا ایسا کمال پھر کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اگر اس عوامی لیڈری کے کمال کا مظاہرہ نہ ہوتا تو ہم لوگ عمارت پھونکے بغیر نہ رہتے۔

ضمیر۔ تمہیں قائد اعظم کی رحلت یاد ہے۔ ہم سکتے میں رہ گئے تھے۔ جیسے ہمارے باپ مر گئے ہوں گورنر جنرل ہاؤس پر آخری دیدار کے لیے جو لائن لگی تھی اس میں ہم دونوں ساتھ کھڑے تھے۔ آنکھوں سے آنسو جاری، چہروں پر وحشت مجھے بھائی جان کی وفات پر بڑا صدمہ ہوا تھا مگر اتنا نہیں جتنا قائد اعظم کی وفات پر ہوا تھا۔ تمہارا بھی یہی حال تھا۔ اس دن ہم دونوں بہت دیر تک ساتھ رہے تھے چپ چاپ اور اداس، جیسے ہمارے پاس کچھ کہنے کے لیے باقی نہ رہا ہو۔

ضمیر، پھر ہمارا ایک نیا جنم شروع ہوا۔ پرانا جنم تو وہ تھا جس میں فتح گڑھ میں، ہم دونوں نے زندہ رہنا اور زندگی سے نبرد آزما ہونا سیکھا تھا۔ اس جنم میں ذہنی آسودگی اور فراغت تھی۔ محبتیں زیادہ اور نفرتیں کم تھیں۔ ادب اور احترام تھا ہرچند کہ زندگی کا تجربہ بہت سطحی اور مشاہدہ محدود تھا مگر مدہوشی اور بے فکری تھی بے نام محبت لگاؤ، اور وابستگیاں تھیں۔ نئے جنم میں ہمیں اپنی شناخت کے لیے کیسے کیسے پاپڑ بیلنا پڑے۔ کیسی جد و جہد اور محنت کرنا پڑی۔ میں اپنی روداد تمہیں سناؤں گا۔ اس وقت تمہاری داستان نظر کے سامنے ہے۔ تم اے پی پی میں رہے۔

پھر ڈان میں پہنچے۔ تمہارا فرخ آبادی حرارہ برقرار رہا۔ یاد ہے بندر روڈ پر نیا براڈ کاسٹنگ ہاؤس تعمیر ہوا تھا۔ نئے اسٹوڈیوز کے افتتاح کا دن تھا شہید ملت افتتاح کے لیے تشریف لائے تھے۔ بڑی چہل پہل اور رونق تھی یہ پاکستان کا پہلا نیا براڈ کاسٹنگ ہاؤس تھا۔ تم بھی اپنے صحافی رفیقوں کے ساتھ احوال قلم بند کرنے کے لئے موجود تھے۔ اتنے میں ریڈیو کے کسی بڑے افسر نے بڑے تحکمانہ اور درشت انداز میں تم سے بات کی یہاں سے ہٹ جائیے یا اسی قسم کی کوئی بے ہودہ بات تھی۔ اس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اپنی حماقت سے اس نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔ تمہارا فرخ آبادی حرارہ عود کر آیا۔ تم نے غصے میں کانپتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا "میری بے عزتی کی گئی ہے میں یہاں نہیں ٹھہروں گا سارے اخبار نویس تمہارے ساتھ ہوگئے سب نے ایک زبان ہو کر کہا" یہ ہم سب کی بے عزتی ہے، ہم یہاں ایک منٹ بھی نہیں ٹھہریں گے" سب جانے لگے کسی نے دوڑ کر بخاری صاحب کو خبر کی وہ مردم شناس، معاملہ فہم، گفتگو کے ماہر، دوڑے آئے تمہیں گلے لگا لیا" ناراض ہوگئے ہم سے بگڑ گئے"۔ مگر تمہارا رنگ اور انداز دیکھ کر وہ بھی کچھ خاموش ہوئے پھر کسی لجاجت سے تم سے معذرت کی، آواز کی دنیا کے بادشاہ کی آواز بھرا گئی تھی۔ اس دن وہ شگفتہ مزاج اور صاحب سخن تقریباً روہانسا ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے تمہارا غصہ فرو ہوا اسے بخاری صاحب کا کمال سمجھنا چاہیے کہ جن کو بوتل میں بند کر لیا۔ بات نہ بگڑنے دی۔ میں ان دنوں ریڈیو میں تھا اس موقع پر سامنے سے ٹل گیا تھا یہ سوچ کر ہٹ گیا تھا کہ کوئی مجھ سے تمہیں روکنے کو نہ کہے۔ مجھے اندیشہ تھا کہ تم میرے روکے سے بھی نہیں رکو گے۔ مفت میں بے عزتی ہوگی مگر اگلے دن جب میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا تو تم نے بڑے خلوص سے کہا" اگر یہ نوبت آجاتی کہ تم مجھے روکتے تو پھر رکنا ہی پڑتا"۔

پھر تم دلی چلے گئے سب کچھ خواب سا معلوم ہوتا ہے۔ شادی ہوئی تم نے مجھے۔ سادی بھابی کے، بارے میں بڑی محبت سے بتایا تھا۔ تم نے کہا تھا" تین باتیں ہیں۔ کشمیری ہیں، سوشل ورکر ہیں، اور تم دیکھو گے تو دیکھتے ہی رہ جاؤ گے" واقعی میں دیکھتا ہی رہ گیا تھا اس عہد میں تم نے اپنے آپ کو پالیا تھا۔ شاعری تو تمہارے بس کی تھی نہیں مگر اب نثر میں تمہارا قلم رواں رواں ہو گیا افسانے پر افسانہ۔ تمہارا فن بلند سے بلند تر ہوتا گیا مجھے یاد ہے ایک افسانہ "ساقی" میں شائع ہوا تھا، "ڈیراولڈ فتح گڑھ" اور ہمارے بارے میں تھا۔ تم نے کہا تھا I have my debt to Fatehgarh میں نے جواب میں چٹکی لی تھی۔ یہ وہ قرض ہے جو کبھی ادا نہیں ہو سکتا وقت کے ساتھ ساتھ سود بڑھتا جائے گا"تشنۂ فریاد" پڑھ کر میرا یہ یقین پختہ ہو گیا کہ قرض برقرار ہے اور سود زر درد شور سے ادا ہو رہا ہے۔

دلی سے واپسی ہوئی پھر وہی ڈان پھر، وہی ناظم آباد، وہی مصروفیت تم خوب لکھ رہے تھے تخلیقی اعتبار سے یہ تمہارا عہد زریں تھا۔ کوئی رسالہ اٹھاؤ ساقی، نقوش، نیا دور تمہارا افسانہ ضرور

ہوتا تھا۔ ادیبوں میں تمہارا بڑا شہرہ تھا۔ ایک حیثیت تھی ۱۴۔ دسمبر ۱۹۵۸ء کو کراچی کے جن آٹھ مقتدر ادیبوں نے رائٹرس گلڈ کا اعلان نامہ جاری کیا تھا ان میں سے ایک تم بھی تھے۔ یہ سارے نام بڑے معتبر تھے۔ قرۃ العین حیدر، قدرت اللہ شہاب، غلام عباس، جمیل الدین عالی، ابن الحسن، ابن سعید، عباس احمد عباسی اور تم۔ گلڈ کو وجود بخشنے والوں میں تم شامل ضرور تھے مگر کسی اجلاس میں نظر نہیں آئے۔ وہی فرخ آبادی حرارے والی بات ہوگی جو الگ تھلک ہو گئے میں نے کریدا بھی تھا مگر تم پہلو بچا گئے ؎

صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں

والی بات تھی بگڑ کر کرنے لگے "ہر بات کا کھوج مت لگایا کرو" پھر تم نے شام کے انگریزی اخباروں میں ادیبوں کے بارے میں بعض بڑے تند و تیز تعمیری مضامین لکھ مارے ایک دن ایک نامور ادیب نے مجھ سے شکایتاً کہا" یہ ضمیر الدین احمد نہ جانے کیوں مسلسل میرے خلاف لکھتا رہتا ہے "میں نے تم سے پوچھا تو تم نے اکڑ کر کہا" کیوں نہ لکھوں کوئی غلط بات تھوڑی لکھتا ہوں "یاد ہے میں نے اس موقع پر اخلاقیات کے بارے میں ایک لیکچر پلایا تھا۔ تم نے بڑی سعادت مندی سے بزا خفش کی طرح سر ہلایا اور کہا" شکر کرو کہ میں تمہاری یہ ساری فضولیات سن لیتا ہوں، کروں گا وہی جو میرے جی میں آئے گا"

ساری بھابی مقامی سیاست میں حصہ لے رہی تھیں۔ کونسلر اور خدا معلوم کیا کیا بن گئیں تمہارا گھر" تحریک استقلال" کا مسافر خانہ بن گیا۔ تمہاری صحافیانہ مصروفیات عروج پر تھیں۔ ایوب خان کے ساتھ دورے کرتے پھر رہے تھے۔ ضمیر تم کیسے خوش نصیب تھے ایوب خان کے ساتھ سعودی عرب گئے، خانہ کعبہ کے اندر جانے کی سعادت حاصل ہوئی۔ مدینہ منورہ میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و سلم کے روضے میں پہنچ کیا نصیب تھے مجھے کیسا رشک آیا ؎

حسرت آتی ہے یہ پہنچا میں رہا جاتا ہوں

ادب اور صحافت میں تمہارا حوالہ معتبر ہو گیا تھا۔ شناخت مکمل ہو گئی تھی۔ مگر وہ جو سیماب وشی تمہارے مزاج اور طبیعت میں تھی ؎

> جذبہ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے

سب کچھ چھوڑ چھاڑ بی بی سی پہنچ گئے۔ بی بی سی کی پیشکش تو تھی مگر" تم کسی قدر ڈانوا ڈول تھے۔ اونٹ کی پیٹھ کا آخری تنکا یہ ہوا کہ تم نے نئی موٹر لا کر گھر پر کھڑی کی کہیں جانے کے لیے نکالی تو پیٹرول کی ٹنکی کا ڈھکنا غائب تھا۔ گھر آتے ہوئے تم نے پیٹرول ڈلوایا تھا۔ پمپ والے نے یا ڈھکنا خود رکھ لیا یا پوری طرح کسا نہیں اور وہ راستے میں گر گیا۔ بس وہی فرخ آبادی حرارہ" سادی چلو بس بہت ہو گیا اب یہاں نہیں رہ سکتے "ہر چیز سے بے نیاز ہو کر لندن آباد کر لیا، قلم رکھ دیا افسانہ نگاری چھوڑ دی، ماتم یک شہر آرزو تمام ہوا۔ اس کے بعد طویل خاموشی، نہ کوئی نامہ نہ پیغام۔

ملاقات کا کیا سوال ۔ کبھی اطہر بھائی سے خیریت معلوم ہوئی کبھی کسی اور سے مگر میرا خیال ہے لندن میں تم کچھ خوش نہیں رہے ۔ ایک بار باتوں باتوں میں تم نے تذکرۃً کہا تھا" میں کسی سے ملتا جلتا نہیں ۔ ادیبوں کے جلسے جلوس میں شامل نہیں ہوتا" ۔ حالانکہ تم بڑے ملنسار آدمی تھے نجانے یہ تبدیلی کیسے آگئی پھر بی بی سی کی بھی ترکی تمام ہو گئی تم وائس آف امریکہ سے وابستہ ہو کر امریکہ چلے گئے "لیے پھرتی ہے نہیں ایک توقع غالب" وہاں بھی دل نہ لگا پھر لندن آگئے افسانہ نگاری پھر شروع ہو گئی تم نے سب کچھ کھو کر خود کو پھر پالیا ۔

۸۹ء میں تم آخری مرتبہ کراچی آئے تو تمہیں دیکھ کر ایک دھچکا سا لگا وہ اگلی سی بات نہیں تھی ۔ تمہیں تو کپڑوں اور جوتوں کا خبط تھا مگر اس دفعہ بڑی بے پروائی نظر آئی ۔ بڑی سادگی تھی ۔ جیسے تمہیں عمدہ لباس کا کوئی شوق نہ رہا ہو گفتگو میں بھی تیزی اور طراری کے بجائے دھیما پن تھا ۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ تم نے مجھے کسی قسم کی ڈانٹ نہیں پلائی تھی ۔ خلاف عادت میری بات بغیر بگڑے سنبھلے سن لیتے تھے ۔ اس زمانے میں خاطر معصوم کا منصوبہ ذہن میں تھا ۔ اسی پر گفتگو ہوتی رہتی تھی کیا کیا نزاکتیں تھیں کتابت ایسی ہو، خط ایسا ہو، کاغذ ایسا ہو، سرورق یوں ہو، میں تمہاری نزاکت خیال سے زچ ہو تا تو تم فوراً سپرڈال دیتے تھے "اچھا بھئی جو تمہاری مرضی ہو کر دو کرنا تو سب کچھ تمہیں کو ہے ۔ میں اپنا کام کر چکا" ضمیر یہ ہماری ہم آہنگی کا آخری دور تھا، اسی زمانہ میں تمہارے افسانوی مجموعے کی اشاعت کا منصوبہ تیار ہوا تھا ۔ تمہیں اس کی اشاعت کا کتنا اشتیاق تھا افسوس کہ تم اس کی اشاعت نہ دیکھ سکے ۔

وہ رات یاد ہے تاریخی تھی ۔ تین جون سن تھا ۱۹۸۹ء تین جون ۴۷ء کے بعد پورے بیالیس سال بعد ہم ایک بار پھر اپنے جائزے کے لیے جمع ہوئے تھے ۔ میں نے کہا تھا تین جون ۴۷ء کو دلی کے ہوٹل میں جمع ہوئے تھے ۔ آج میرے گھر کو یہ سعادت حاصل ہوئی ہے ۔ تم تھے علی اختر ہمیل تھے (فتح گڑھ کا وہ دبلا پتلا شیروانی پوش لڑکا اب بڑی بڑی اور شاندار سفید مونچھوں والا پر رعب بوڑھا ہے ۔ تم بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئے تھے) میں تھا ۔ ہم اپنی اپنی خوابناک دنیا کے دھندلکوں میں گم تھے کمرے کی ہلکی روشنی میں ہمارے چہروں پر وہ چمک تھی جس سے فضا اور ماحول میں اجالا سا پھیل گیا تھا ۔ باتوں کا ایک نہ رکنے والا سیلاب تھا جو ہمیں بہائے لیے جا رہا تھا اندر سے کھانے کے لیے بار بار اطلاع آتی "کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے" مگر ہم لوگ محو تھے پھر بادل نخواستہ کھانا کھایا گیا اور گفتگو کا دھارا پھر بہنے لگا آخر کار علی اختر نے کہا" رات بہت ہو گئی ہے چلو ضمیر کو چھوڑ آئیں ۔ ہم دونوں تمہیں چھوڑنے نکلے اور ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئے یہ آخری رات تھی جس میں ہم تم ساتھ رہے ۔ ہنستے بولتے دکھ سکھ بیان کیے ۔ ایک دوسرے کے دل میں جھانکنے کی کوشش کی بیالیس برس پہلے کے وہی کھلنڈرے بن گئے جو زندگی کی صعوبتوں سے ناآشنا تھے جنہیں کچھ کر گزرنے کا شوق تھا جو اپنی شناخت کی تلاش میں سرگرداں تھے ۔

اس رات کے بعد تم سے ملاقات نہیں ہوئی۔ خطوں کا تبادلہ ہوتا رہا۔ فون آتے رہے خاطر معصوم شائع ہو گئی۔ حسب معمول تم کچھ خوش کچھ ناخوش رہے۔ کتابت کی غلطیاں تھیں۔ ان پر کڑھے یاد ہے میں نے لکھا تھا اردو کی کوئی کتاب اغلاط سے پاک نہیں رہ سکتی۔ شکر کرو غلطیاں برائے نام ہیں۔ خاطر معصوم کی اشاعت کے فوراً بعد سوکھے ساون کی اشاعت کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میری رائے میں اس مجموعے کا افسانہ تشنہ فریاد تمہارا شاہکار ہے۔ اس افسانے میں تم فتح گڑھ کے ماحول اور فضا کی بازیافت میں پوری طرح کامیاب ہوئے ہو تم نے مجھے لکھا کہ "اس افسانے کے اصل قاری تم ہی ہو۔ ربانی صاحب بھی ہو سکتے ہیں مگر وہ شاعر ہیں" تشنہ فریاد میں ہماری نوجوانی کے مسلمان متوسط گھرانوں کی زندگی کو تم نے جس انداز سے پیش کیا ہے اس سے مجھے یہ محسوس ہوا کہ جیسے میری عمر کے چالیس پینتالیس برس یک لخت کم ہو گئے ہیں اور میں اس ماحول میں واپس پہنچ گیا ہوں جس نے میرے احساسات اور جذبات کو پروان چڑھایا۔ خود تمہیں بھی اپنے اس افسانے کی معنویت کا پورا احساس ہو گیا۔ شاید تم نے دوبارہ افسانہ نگاری اسی افسانے کو لکھنے کے لیے شروع کی تھی مگر میں یہ کیا ذکر لے بیٹھا۔ تمہاری افسانہ نگاری پر تبصرہ میرا کام نہیں کیوں کہ سخن فہمی کی تہمت میں مبتلا ہونے کے باوجود غالب کا طرف دار ہوں۔

اور پھر اچانک تمہاری بیماری کا علم ہوا۔ دل کٹ کر رہ گیا تم نے خود کوئی تذکرہ نہیں کیا تھا۔ سرطان جیسی مہلک بیماری اور وہ بھی پھیپھڑوں میں۔ اندر ہی اندر پل رہی تھی۔ جب پانی سرسے گزر گیا تو خبر ہوئی خبر کیا ہوئی موج خوں سر سے گزر گئی۔ میرے استفسار حال پر تم نے کس محبت سے فراق کا شعر لکھا بھیجا تھا ؎

اس پرسش کرم پہ تو آنسو نکل پڑے
کیا تو وہی خلوص سراپا ہے آج بھی

پھر ریڈیو تقریبی ہوئی۔ تم نے مجھے لکھا اب شاید تم مجھے پہچان بھی نہ سکو ضمیر یہ تم نے کیسے فرض کر لیا کہ میں تمہیں پہچان نہیں سکوں گا تمہارے اس جملے سے میرا دل بہت دکھا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو نہ پہچانیں کیا یہ ممکن ہے۔ مجھے تمہاری بیماری کا صحیح حال نہیں معلوم۔ خط اور فون سے اس اذیت کرب اور دکھ کا اندازہ کہاں ہو سکتا ہے جس سے تمہیں گذرنا پڑا مگر میں نے یہ ضرور سنا ہے کہ آخری لمحے تک تم نے بیماری کو اپنے اوپر غالب نہیں ہونے دیا۔ اپنی قوت ارادی کے بل بوتے پر بڑی بہادری سے لڑتے رہے۔ قوت ارادی تم میں ہمیشہ سے بہت تھی جو ٹھان لی وہ ٹھان لی اور کر گزرے۔ اس عالم میں بھی تم نے سوکھے کی کتابت پڑھی۔ یہ تمہارا حوصلہ تھا ایک طرف جگر خون ہو رہا ہے جسم گھل رہا ہے۔ اذیت انتہا کو پہنچی ہوئی ہے انجام سامنے ہے مگر تم ہو کہ سب کو ڈھارس بھی دے رہے ہو آنے جانے والوں سے مل بھی رہے ہو سادی بھابی کو

تسلی بھی دے رہے ہو تم تو غضب کے حوصلہ مند نکلے۔

مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹروں نے تمھیں سب کچھ بتادیا تھا کہ چھ سے نو مہینے تک کا وقت ہے کوئی اور ہوتا تو سنتے ہی ڈھیر ہو جاتا آفریں ہے تم پر کہ سن کر بولے تو یہ بولے "بہت ہنسے۔ بہت وقت ہے" زندگی کے آخری لمحے تک کسی کو احساس نہ ہونے دیا کہ تم بیمار ہو آخری دن تک معمولات میں فرق نہیں آیا۔

سادی بھابی نے مجھے بتایا کہ آخری دنوں میں تم نے ان سے کہا تھا کہ "کوئی اچھا سا قبرستان پسند کر آؤ۔ صاف ستھرا ہو کشادہ ہو۔ پیڑ پودے ہوں" تمھارے اس کہنے سے ان پر کیا گزری ہوگی بیچاری گئیں جگہ پسند کی۔ تمھں بتائی غالباً تم نے خود بھی دیکھ کر پسند کرلی کیا یہ بھی رعب دینے کی بات تھی۔ باتیں ہماری یاد رہیں ------ فتح گڑھ کی خاک زمین لندن کا پیوند ہو گئی ------ علیم کے مرنے پر میں نے جو نظم لکھی بے اختیار اس کا ایک شعر یاد آگیا۔

آج اپنے ہی ہاتھوں تجھے مٹی میں دبا آئے
کل تک ترے جینے کی دعا مانگ رہے تھے

فتح گڑھ کی خاک لندن کا پیوند ہو گئی۔ مٹی تو کسی شخص کو بھی رد نہیں کرتی۔ مٹی کا کام قبول کرنا ہے، رد کرنا نہیں۔ رد کے سلسلے ہم انسانوں سے وابستہ ہیں۔ تمھارے یہاں بھی رد کا سلسلہ بہت تھا مثلاً زبان کے سلسلے میں تمھاری بر ہمنیت ادھر کسی کی زبان سے غلط لفظ نکلا اور تمھارا پارہ چڑھا۔ مجال ہے بے ٹوکے رہ جاؤ۔ بعض اوقات تم سے تیکھا چہرہ ملانا مشکل ہو جاتا تھا۔ بہت سے لوگ تم سے صاف اس وجہ سے چڑ جاتے تھے کہ تم زبان کی غلطی گوارا نہیں کرتے تھے۔ لباس میں بھی یہی کیفیت تھی۔ نیویارک میں تم نے ایک رات پتلون پہنے پہنے سونا گوارا کیا مگر میزبان کا نائٹ سوٹ نہیں پہنا بڑے ضدی تھے اپنی بات پر اڑ جاتے تھے۔ یہ تمہاری خوبی بھی تھی اور کمزوری بھی جو تمہیں سمجھ گئے تھے وہ تم سے کبھی نہیں الجھے تھے۔ جانتے تھے کہ تم اپنی سی کرو گے۔ جو نہیں سمجھتے تھے ناراض ہو جاتے تھے، بگڑ جاتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے تم نے ملنا جلنا بھی کم کر دیا تھا۔ آخری دفعہ کراچی میں بہت کم لوگوں سے ملے۔ کہیں جاتے ہی نہیں تھے۔ انجمن میں میرے پاس بیٹھے رہتے تھے۔ چھٹی کا دن ہوتا تو میرے گھر آجاتے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ تمہارے ہیکڑی اور سیماب وشی بھی بہت کم ہو گئی تھی جیسے آخر کار قرار آگیا ہو۔ شاید یہ قرار عمر بھر کے قراری کا اختتامیہ تھا۔

اب مجھے تمہاری محبت اور خلوص یاد آتا ہے۔ فتح گڑھ سے کراچی آکر تم نے اماں بھائی میاں اور سب بھائی بہنوں کو بلایا۔ بھائی میاں کچھ دن بعد واپس چلے گئے۔ وہ بزرگوں کی ہڈیوں کو چھوڑنے پر تیار نہیں تھے۔ بھائی بہنوں کی تعـ تمہارے ہی ذمہ رہی ماشاءاللہ آج سب اپنے گھر بار کے ہیں تم نے انھیں بھرپور محبت دی، ہم لوگوں کے برخلاف پابندی سے فتح گڑھ جاتے رہے۔

لندن اور واشنگٹن میں رہنے کے باوجود دل سے دیسی آدمی ہی رہے ۔ صاحب بہادر نہیں بنے ۔
ضمیر مجھے بڑا افسوس اور شرمندگی ہے کہ سوکھے ساون تمہاری زندگی میں شائع نہیں ہو سکی کتابت میں خاصی دیر ہوئی پھر تمہارا اخرا " کاپیاں میں خود پڑھوں گا " دو مرتبہ کاپیاں پڑھیں ۔ سرورق کا مسئلہ التوا میں پڑا رہا ۔ تم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے ۔ مشکل پسندی مانع رہی ۔ کاش یہ تمہاری زندگی میں شائع ہو جاتی تمہیں کتنا شوق تھا کس اہتمام سے ایک ایک لفظ پر غور کیا تھا کتاب شائع ہو گئی مگر تم اسے دیکھ لیتے تو کچھ اور ہی بات ہوتی ۔

تم سدا کے جلد باز تھے ۔ اپنی نانی کے بقول " بے چین ہوئی " آخر آخر میں بھی تم نے وہی بے چینی دکھائی گھبرا کر چل دیے ، زنجیریں تڑا کر بھاگ کھڑے ہوئے ، کیا انسان تھے ، جلد باز ، اکڑو باز ، نخرے باز ، مگر تمہارے ہر روپ میں موہنی تھی کیسے من موہن تھے ۔ تمہارے اور ہمارے مشترک دوست ہوش فرخ آبادی کا ایک شعر یاد آرہا ہے ۔ ؎

روداد زندگی ہی خود جان زندگی ہے
بڑھتا گیا فسانہ کہتے گئے جہاں تک

کہنے کو بہت کچھ باقی ہے ۔ ہمیشہ باقی رہے گا مگر خط بہت طویل ہو گیا کچھ نہ کچھ عند الملاقات بھی ہونا چاہیے ۔ اس لیے اللہ حافظ اور والسلام ۔ ۔

۲۳ / مارچ ۱۹۹۱ء

ہمیشہ کی طرح تمہارا
اسلم فرخی

صلاح الدین محمود

شاکر علی — چند یادیں

میری اور شاکر علی کی پہلی ملاقات تو کسی پچھلے جنم میں ہوئی تھی کہ جب غالباً ہم دونوں پرندے تھے۔ اس جنم میں، کہ جواب میرے واسطے بھی مکمل ہونے کو ہے، ہم پہلی بار 1955ء کے لاہور میں ملے۔ اس ملاقات کے پیچھے ایک چھوٹا سا واقعہ ہے۔

میرا لہو لاتعداد موسموں سے ایک آسمان کے تلے قائم تھا۔ پھر کچھ خاک نشینوں نے کہیں منصوبہ کیا کہ آسمان کو بدل دیا جائے۔ اور آسمان بدل گیا۔ مگر پھر ہوا یوں کہ آسمان کے سروں کے اوپر گھومتے ہی زمین بھی قدموں تلے سے کھسک گئی۔ اور میں اُدھر میں لٹکا رہ گیا، اسی اُدھر کی کیفیت میں، میں لاہور آن لگا۔ جولائی کا مہینہ تھا اور بارش ہو رہی تھی۔ جس تیزی اور ثابت قدمی کے ساتھ بارش ہو رہی تھی اس کا اندازہ شاید نئی نسلیں نہ کر سکیں، بہرحال بارش ہو رہی تھی اور حدامکان تک اور کوئی آواز یا شور نہیں تھا۔

میں جس شہر سے آیا تھا وہ میرے واسطے، دنیا کے خوبصورت ترین شہروں میں سے تھا۔ بڑے بڑے شہروں سے دور ایک بے حد میدان تھا کہ جس میں ہر ساخت، ہر قدوقامت، ہر عمر اور ہر رنگ اور رکھ رکھاؤ کے لاتعداد درخت ہمیشہ سے اُگے ہوئے تھے۔ ان درختوں کے درمیان، اور ان درختوں کی اجازت سے، دھیمے گلابی رنگ کے پتھر کی چوکور اور مستطیل سلوں سے بنی ہوئی، نازک اور مضبوط عمارتیں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں، آبادی جنگل کے درمیان تھی اور جنگل کی ازلی خاموشی، آبادی پاکیزگی اور گھنی جنبش ہمارے لہو کے درمیان۔ بارش وہاں بھی ہوتی تھی، بالکل ویسی ہی بے ساختہ اور بے تکان جیسی کہ قدیم جولائی کے اس دن لاہور میں ہو رہی تھی کہ جس دن میں نے یہاں اپنا پہلا قدم دھرا تھا۔ بارش تھمنے کے بعد مجھ کو ایک بے حد وسیع، دھلے دھلائے اور گھنے باغ میں لے جایا گیا تھا کہ جو انسانوں کی بجائے خوشبو اور خوف سے بھرا ہوا تھا۔ پھر اس باغ کے ساتھ ساتھ ایک پتلی،

خاموش اور صابر سی سڑک تھی کہ جو ایک چھیز تک چلی گئی تھی۔ میرے نہر تک پہونچتے پہونچتے بارش پھر شروع ہو گئی تھی۔ بوندوں کی جگہ پانی کی لہریں برستی تھیں، اور نہر اپنے کچے کناروں سے ابھر ابھر کر نہایت انہماک کے ساتھ کہیں کو برابر ڈھلک رہی تھی، اس لمحے میں نے ایک گہرا سانس لیا تھا اور اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ اب میں ہمیشہ یہیں رہوں گا، آج تک میں یہیں ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ میرے بیشتر خوابوں کی طرح وہ لاہور بھی تقریباً مٹ چکا ہے۔

میرے لاہور کی جانب سفر کی خبر سن کر میرے والد مرحوم کے ایک دوست "ڈاکٹر حسین خان نے مجھ کو الوداعی ملاقات کے واسطے بلوا بھیجا تھا۔ "میرے یہ ایک پرانے شاگرد لاہور میں ہی رہتے ہیں۔ ان سے ضرور ملیں" لفافے پر ڈاکٹر صاحب کے بے حد باریک نستعلیق خط میں ایک نام لکھا ہوا تھا، شاکر علی۔ اس سے پہلے میں اس نام سے بالکل ناواقف تھا۔

برسات کے ختم ہوتے ہی میں شاکر علی نام کے ذی روح کی بابت پوچھ گچھ کی تھی۔ پتہ چلا تھا کہ موصوف ایک مصور ہیں اور لاہور کے ایک مشہور زمانہ اسکول میں مصوری سکھلاتے ہیں۔ یہ بھی پتہ چلا تھا کہ مال روڈ پر واقع ایک چائے خانے میں شام کو اکثر موجود ہوتے ہیں۔ جس رواداری، مروت، شفقت اور فراخ دلی سے شاکر علی نے میرا خیر مقدم کیا تھا، اس کو یاد کر کے آج کوئی چالیس سال کے بعد بھی میری ہستی کو جلا سی مل جاتی ہے پھر اگلے ماہ و سال میں اسی چائے خانے کی چوکور میزوں کے گرد جو بھی تخلیق کے ہنرمند، عالم و فاضل، اعلیٰ و ادنیٰ، دوست اور دشمن ملے تھے، وہ سب کے سب اب میرے نقش اول کا حصہ ہیں۔ شاکر صاحب نے روز اول جو شفقت برتی تھی، اسکو انہوں نے ساری زندگی قائم رکھا، ان کے کردار کی بڑی خوبی یہ تھی کہ دوست خواہ کیسا ہی ہو۔ چھوٹا یا بڑا، عالم یا جاہل بے اعتنا یا ہوشمند۔ وہ ہمیشہ اپنے شعار میں اس کے واسطے ایک بے ساختہ سی عزت قائم رکھنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔

پھر دن گذرتے گئے اور میں شاکر علی کی شخصیت کے ساتھ ساتھ ان کے فن سے بھی روشناس ہوتا گیا، شاکر علی کو میں نے ایک شرمیلا، کم گو، دکھی اور تنہا انسان پایا۔ دکھ اور بے اطمینانی کا ایک بیج تھا، جو کسی پچھلے جنم میں ان کے لہو میں گہرا بویا گیا تھا، اس جنم میں تو وہ محض اس بیج کا پھل چکھ رہے تھے، اور اس ذائقے کو نہایت خاموشی اور بردباری سے برداشت کر رہے تھے۔

تخلیق کے ہر انوکھے ہنرمند کی طرح تمام اشیاء کی ظاہری ساخت ان کو قبول نہیں تھی، ہر شئی ان کے واسطے

غیب کی مالک تھی۔ سوان کے واسطے رنگ اور خط کا وہ لمحہ کہ جس کے دوران وہ اندر والے اور باہر والے کو ایک کر سکیں، سچائی اور حسن کا خالص لمحہ ہوتا تھا۔ سچائی ان کے واسطے اس ہی وا حد کی کیفیت تھی، اور حسن لطف بہم پہونچانے کے ساتھ ساتھ سحر زدہ بھی کرتا تھا۔ یہ ظاہر اور باطن کو اپنے لحن ہی میں نہیں بلکہ ہر شئی کے لحن میں بے تکان ایک کر سکنے کا ہنر ہر عظیم فن کار کی بنت کا لازمی وصف ہوتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے ایک عنقا اور پوشیدہ، مقدس اور معصوم حکمت کے وہ امین ہوں، کہ جیسے ایک دور افتادہ روشنی ان کی مٹھی میں بچپن سے قائم ہو کہ جس مٹھی کو کبھی کبھی اپنی تنہائی منور کرنے کے واسطے، وہ کھولتے ہوں۔

ان میں ایک بہت بڑی خوبی اور بھی تھی اور وہ یہ کہ وہ قدرت کی ہر لمحہ بدلتی، مگر پھر بھی یک جان کیفیت کو محض پہچانتے ہی نہیں تھے، بلکہ اس کو انسانی دانش اور تخیل کا جواز بھی گردانتے تھے۔ اس کے باوجود وہ انسان اور انسانیت کے مستقبل سے غالباً مایوس تھے۔ انہوں نے ایک بار مجھ سے کہا تھا" یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ ہم بے بس ہیں"۔

یہاں ایک واقعہ یاد آتا ہے۔

میری ہمیشہ سے عادت ہے کہ میں جب بھی کوئی نظم لکھتا ہوں، چند دوستوں کو فوراً سناتا ہوں، اور چند کو کاپیاں کروا کر ڈاک سے بھیج دیتا ہوں، اور سرخرو ہوتا ہوں۔ شاکر علی کا نام سرفہرست ہی تھا۔ سو کوئی 25 برس کی بات ہے کہ میں نے ایک نظم لکھی کہ جس کا عنوان تھا" شبنم کا شجر" اس نظم میں پہلی بار میری اندھی چڑیا میری کسی نظم میں نمودار ہوتی ہے۔ اندھی چڑیا کے ضمن میں یہ عرض کرتا چلوں کہ میرے بچپن میں ایک چڑیا اپنی بینائی کھو کر میرے کاندھے پر آن بیٹھی تھی، اور آج تک وہیں بیٹھی ہے، اور میرے لحن اور اشعار کا اتنا ہی حصہ ہے جتنا کہ میرے لہو کا انگ یا میری آنکھوں کی رنگت، سو یہ نظم، حسب دستور میں نے شاکر علی کو سنائی تھی۔ نظم سنتے ہی ان پر ایک عجیب کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ پریشانی، حیرت، گھبراہٹ، اور بے چینی کی ایک شدید کیفیت تھی۔ ان کے ماتھے پر پسینہ عود کر آیا تھا۔ وہ بے چینی کے ساتھ ادھر ادھر ٹہلنے لگے تھے، ٹہلتے جاتے تھے اور کہتے جاتے تھے" نہیں نہیں، اندھی چڑیا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، کتنا خوف ناک اور ناممکن خیال ہے میں یہ تصور کیسے برداشت کروں گا۔ آپ نے یہ کیا کیا"۔ وغیرہ، وغیرہ۔

میں ان کی پریشانی اور بے چینی کی شدت دیکھ کر خود پریشان ہو گیا تھا اور کہنا چاہتا تھا کہ شاکر صاحب ہم نابینا ہی آئے اور نابینا ہی تو گذر جاتے ہیں، اگر نابینا نہ ہوتے تو رنگوں سے بھری ہوئی وہ تصویریں کیوں بناتے،

مخفی جہانوں کو وا کرنے والی وہ نظمیں کیوں لکھتے، وہ موسیقی کیوں کر تخلیق دیتے، خوبصورت چہروں کی تپش کو ہر لمحہ کیوں تلاش کرتے، بچپن کے بیتے والانوں کو کیوں یاد رکھتے، آنے والی بارش کا انتظار کیوں کرتے، مگر میں خاموش رہا تھا، کیونکہ ان کو غالباً ان تمام باتوں کا علم تھا، وہ اپنی بے بسی کا دکھ تو نہایت خاموشی اور بردباری سے برداشت کر چکے تھے، مگر جب کسی دوسرے میں یہ دیکھتے تھے کہ اس کا اس جہاں کی ساخت پر سے اعتماد اٹھنے کو ہے تو تڑپ اٹھتے تھے، بھلا ایک انسان ایک دوسرے انسان کے مٹتے ہوئے خوابوں کی اس سے زیادہ قدر اور کیا کر سکتا ہے۔

لاہور، ۱۹۹۴ء

[شاکر علی کی برسی پر شاکر علی میوزیم میں منعقد ہونے والی تقریب میں پڑھا گیا]

خصوصی مُطالعہ

نظمیں

غزلیں

مظفر علی سید

"مختار صدیقی کی نظمیں"

شاعری کے جس دور کو کبھی جدید، کبھی، نئی، کبھی غیر مقفٰے شاعری کا دور کہا جاتا ہے اس کے بارے میں غالباً سب سے دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ قریب قریب ہر قابل ذکر شاعر نے نئے مقاصد اور نئے اسالیب کو اپنے اپنے طور پر آزادانہ دریافت کیا۔ ایک لحاظ سے یہ فطری اظہار طبعیت ایک روح عصر کی طرح پورے اردو ادب کی روح میں سرایت کرتا چلا گیا اور نثر میں بھی اپنے تاثرات چھوڑے بغیر نہ رہ سکا۔ اگر کسی مصنوعی طریقے سے یہ دور شروع ہوا ہوتا تو کسی نہ کسی مرکزی اور بنیادی شخصیت کو سرمشق بناکر یہ دور شروع ہوتا اور اس کے رنگ سخن اور زاویہ نظر کی تقلید ہر شاعر کے یہاں پائی جاتی۔ کسی شاعر نے براہ راست انگریزی ادب پر توجہ کرنے سے اپنے آپ کو اس نئے اسلوب میں ڈھالنے کی کوشش کی، کوئی آزاد، حالی اور اقبال کے مطالعے کے بعد اس منطقی نشو و نمائے طبیعت کی طرف راغب ہوا۔ کوئی عبدالحلیم شرر اور اسمٰعیل میرٹھی کے حوالے سے ادھر آیا اور کسی نے عظمت اللہ کے انداز نظر کو آگے چلانے کا تہیہ کیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو اقبال کی نئی پود (حفیظ جالندھری۔ جوش ملیح آبادی۔ اختر شیرانی۔ احسان دانش) کے ساتھ چلتے چلتے تھوڑی دیر کو رک گئے اور اپنا جائزہ لینے کے بعد اس سمت کو مڑ گئے جسے آج کل جدید شاعری کے بدنام لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

مختار صدیقی یوں تو ایک لحاظ سے خاصے پرانے ہیں اگر چہ نئے شاعروں کی صف اول میں شمار نہیں کئے جاتے (میرا مطلب ہے تاریخی اعتبار سے، اس لیے کہ وہ راشد۔ میراجی۔ خالد کے ہم عصر نہ تھے اور ان کی بدنامی کے بعد ان کا نام رسالوں میں دیکھا جانے لگا) انھوں نے اپنے پیش روؤں کی اہمیت کو بہت جلد محسوس نہیں کر لیا۔ اسی میں ان کی طبیعت کا ایک بنیادی پہلو مضمر ہے۔ ضبط اور ٹھہراؤ ان کے مزاج کا ایک لازمی جزو ہے۔ اگرچہ ان کے زیر طبع مجموعے میں ان کا بہت ہی ابتدائی کلام شامل نہیں ہے مگر بعد کے کلام سے بھی اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ کبھی وہ جوش کبھی حفیظ اور کبھی اختر شیرانی کے رنگوں پر فریفتہ ضرور رہے ہیں۔ جوش سے انہیں اتنا ضرور ملا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی میلانات سے بے اعتنائی برتتے نظر نہیں آتے۔ حفیظ کے گیتوں اور مترنم بحروں کے استعمال سے بھی انہیں ابتدا اچھی خاصی آگاہی رہی ہوگی۔ اور اختر کی رومانیت، تلذذ اور شرنگاری کی فضا کا سراغ تو ان کی اپنی بعد کی شاعری میں بھی دور تک جاتا ہوا

نظر آتا ہے۔

مگر اس کے ساتھ ساتھ ایک اور حقیقت کو فراموش کرنا بھی غلط ہوگا جو اگرچہ ایک نئے شاعر کے سلسلے میں عجیب و غریب ضرور لگے گی مگر ایسی حقیقتوں کو بالائے طاق رکھنے سے ہی غالباً نئی شاعری کے بارے میں غلط اور نامکمل تاثرات رواج پاگئے ہیں (بلکہ ایک لحاظ سے تو خود نئے شاعروں نے ان پہلوؤں کو چھپانا بہتر سمجھا ہے) بات کی ڈور الجھائے بغیر کہوں تو واقعہ یہ ہے کہ مختار اپنے بعض اور ہم عصروں کی طرح شروع شروع میں سیماب اکبرآبادی کی طرف بھی مائل رہے ہیں اور خدا جانے یہ کس حد تک درست ہے کہ وہ ایک وقت میں باقاعدہ سیمابی تک رہے ہیں۔ یہ ارتقائے اسلوب میں کیسے مددگار ہوا؟ یہاں سے انہیں کیا ملا؟ یہ جاننا غالباً بے سود نہیں ہوگا۔ خود سیماب اپنی واضح مجبوریوں اور حدوں کے باعث تو شاعروں کی نظر سے اوجھل ہوگئے۔ مگر ان کی ایک خصوصیت کو اگر کسی نے شاعرانہ مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے تو وہ مختار ہیں۔ مصرعوں کو نوک پلک سے درست کرنا، حشو و زوائد سے پاک صاف کرنا، معنی و مفہوم کو گردش و تدویر سے بچائے رکھنا سیماب اسکول کے تربیتی پہلوؤں میں سے ہے۔ اگرچہ سیمابیوں کے گروہ میں ان خوبیوں کا استعمال قائم بالذات خوبیوں کے طور پر کیا جاتا ہے۔ چنانچہ سیمابی مختار جب معریٰ نظم کے تقاضوں سے آشنا ہوا تو۔

گورے جسموں کو جواں رکھتے ہیں بندر کے غدود

مجھ کو ترکے میں ملی ہائے جوانی کی پکار

والی نظم وجود میں آئی جس کا آغاز ہی نئی نظم کی نمائندہ چیزوں کے طور پر اکثر پیش کیا گیا ہے چاہے گالیاں دینے کی غرض سے ہی کیوں نہ کیا گیا ہو۔ سیماب کا فطری رد عمل یہ ہوا کہ انہیں اپنے ایک ذہین و شاگرد، کا بگڑنا گوارانہ ہوسکا اور انھوں نے اس نظم کو مقفیٰ صورت میں منتقل کرکے یہ جتانا چاہا کہ ابھی نئے شاعروں کو قادر الکلامی کی بہت سی منازل سے گزرنا ہے۔ مختار کی نظم پر سیماب کی اصلاح دیکھ کر ہی یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ نئی شاعری کی ضرورت تھی بھی یا نہیں۔

اگر کسی شاعر کا کلام نظری حقیقت کا ثبوت بن سکتا ہے تو مختار کی شاعری کے بارے میں یہ کہنا غلط نہیں ہوگا کہ اس سے آزاد شاعری کی باطنی اور غیر واضح مشکلات کا اندازہ ہوتا ہے۔ یوں قافیہ اور تعداد ارکان کے سلسلے میں آزادیاں برتنے والوں کی کثیر تعداد اس حقیقت سے واقف نہیں۔ مختار محض اپنے فوری پیش روؤں کی شاعری پر ہی حصر نہیں کرتے رہے اردو زبان میں قدرت اظہار کے نمونے اسی نظم سے شروع ہوجاتے ہیں۔

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے

قدیم اردو غزل کا سرمایہ الفاظ، بھاشا کی شاعری، گیتوں کی موسیقی یہاں وضعی شعور میں گھل مل کر ایک نمایاں قالب اختیار کرتے ہیں۔ حسرت، ریاض، داغ سے جو کچھ سیکھا جاسکتا ہے

اس کی تربیتی حیثیت سے انکار نہیں مگر مختار ان سے آگے ان کے ماخذ تک گئے ہیں ۔ میر کا دور شاعری ان کا محبوب مطالعہ ہے ۔ سودا کی میرزایانہ گفتار سے بھی فیض اٹھایا ہے ۔ مہارانی میرا بائی کے لب و لہجے اور ہندوستانی سنگیت کاروں کے لکھے ہوئے بولوں کا لب و لہجہ بھی کئی جگہ اپنے لوازمات کے ساتھ جلوہ پیرا ہوا ہے ۔ غالباً جدید شعراء میں مختار کی شاعری اردو ہندی کی پرانی شاعری کی روایت میں سب سے زیادہ رچی ہوئی ہے ۔

کسی شاعر کے مزاج اور انداز نظر سے گہری آشنائی کے لیے ماسوائے شاعری قسم کی تحریریں بھی جو اس کے قلم سے نکلی ہوں ضروری ہو جاتی ہیں خواہ ان تحریروں کے وجود کے بے الگ جواز ملے نہ ملے ۔ مختار فلسفہ اور موسیقی میں غالباً شروع سے ہی دلچسپی لیتے رہے ہیں ۔ بہت سے ادیبوں کی طرح انھوں نے بھی ریڈیو کی ملازمت کی ہے ۔ (اس نوکری نے اناؤنسر، جیسی نظم بھی دی ہے حالت نشر میں ذہن کے اندر جو حشر برپا ہوتا ہے اور ایک خاص اناؤنسر جس طرح اپنے ان دیکھے سامعین کے تعلق کو دیکھتا ہے اسے یہاں ایک شاعرانہ اظہار ملا ہے ۔ شاعری محض جسمانی حدود و قیود سے وجود میں نہیں آتی ۔ دیکھنا یہ ہے کہ ان حدود و قیود کا اثر ذہن پر کیا ہے ۔ اناؤنسر کا احساس تنہائی اور نشریائی عمل کے ساتھ رسوائی کا تصور جسمانی سے زیادہ ایک ذہنی حقیقت ہے) ریڈیو کی ملازمت کے دوران میں ڈراما بھی ان کی ذہنی حدود سے باہر نہیں رہا ۔ جنگ میں پراپگنڈائی نشریات فیچر اور ڈرامے کے ذریعے موثر تر ثابت ہوئیں ۔ آپٹن سنکلئیر کے ناول نشری ڈرامے کی صورت میں منتقل ہونے لگے ۔ حتیٰ کہ یوری پیڈیز کا میڈیا بھی منثور صورت میں پیش کیا گیا ۔ ڈرامے سے مختار کی یہ دلچسپی بندگی، بیچارگی بھی کہی جا سکتی ہے ۔ اگرچہ اشک کے مجموعے چرواہے کا دیباچہ اس رائے کا ساتھ نہیں دے سکتا ۔ اہمیت اس بات کی ہے کہ کوئی صاحب ذہن جب مارے باندھے بھی کوئی کام کرتا ہے تو ایک تو اس جبری ذمہ داری کا عمومی معیار بلند کرنے میں مدد دیتا ہے اور پھر خواہ اس کی آزادانہ ادبی حیثیت برقرار نہ رہ سکے تو بھی اس کا یہ کام کسی گوشے سے اس کی طبیعت میں دخیل ہو کر اس کے لازمی مشاغل میں اثر انداز ہو ہی جاتا ہے ۔ اس زمانے کے تجربات کا اثر ان کی شاعری پر ہلکا نہیں ہے ۔ ایک تو زمانہ جنگ میں نشریات سے ان کا تعلق انہیں اس فراریت سے بچا گیا ہے ۔ جس کا شکار ہونے سے بعض نظم گو بچ نہیں سکے ۔ دوسرے ریڈیو میں ہندوستانی سنگیت سے ان کی وابستگی کو کسی کے بہانے ہی سہی مزید نشوونما ضرور ملی ہے ۔ راگ راگنیوں سے متعلق ان کی نظمیں اسی زمانے کی یادگار ہیں جن میں ان کی شخصیت کے بیشتر پہلو کار فرما ہیں حتیٰ کہ ان کی ڈرامائی مسرو فیات بھی ۔ یہ نظمیں موسیقی سے پیدا شدہ ڈرامائی تاثرات کا نتیجہ ہیں ۔ ڈرامے کا عنصر یہاں ایک ادبی جزو بن کر آیا ہے ۔

○○○○

تاثریت اور جمالیت کی ادبی اور فنی تحریکیں کوئی چالیس پچاس سال قبل ایک ادبی رواج

بنی رہی ہیں اور اب بھی ان کے باقیات الصالحات ادیبوں یا ادب پاروں کی صورت میں موجود ہیں۔ اسے ٹیگور کے زیر اثر کہہ لیجے یا اسکر وائلڈ کو الزام دیجئے، جمالیوں کیے یہاں ایک مخصوص و محدود انداز نظر کبھی کبھی بڑے رچاؤ کے ساتھ نظر آتا ہے۔ وہ نقطہ نظریہ ہے کہ انسانی جذبات و احساسات میں سے شہوانی اور لذیذ پہلوؤں کا انتخاب کر کے ان کو بڑھت اور پھیلاؤ کے ساتھ پیش کیا جائے۔ فراق کی رباعیوں میں یہی پہلو کبھی کبھی یکتائی اور زیادہ تر یکسانیت کے ساتھ نمایاں طور پر موجود ہے۔ اس سلسلے میں اطالوی مفکر کروچے کا جمالیاتی نظام بہت سے اذہان کے لیے ایک واضح اپیل کا حامل رہا ہے۔ اگرچہ کروچے اسے اپنی مابعد الطبیعات سے جدا نہیں کرتا۔ جمالیوں کے نزدیک ہر جذبہ۔ ظاہری مسرت یا ظاہری غم۔ اپنی خالص اور معطر صورت میں ایک احساس جمال پیدا کرتا ہے جس سے معلوم نہیں اظہار جذبات کا جواز کہاں سے نکلتا ہے۔ یہ پیچ آتشہ "سرور مخصوص اور کیف لطیف" ایک مذہب اور مکتب خیال کی طرح بہت سی زبانوں کے جدید ادب میں موجود ہے۔ اس بدیسی تحریک کو دیش بھگتی آب و رنگ دینے کا رجحان فراق کے یہاں موجود ہے کیونکہ ان کے نزدیک اس سے متشابہ نقطہ نظر سنسکرت بوطیقا میں بھی نظر آتا ہے۔ سنسکرت ناٹک ہندوستانی ناچ اور سنگیت میں جس کیفیت کو رس کہا جاتا ہے اس کی تعریف اس زمانے میں آکے جمالیاتی احساس ہو جاتی ہے۔ اپنشد کا "رسو ویس" (رس تو وہی ہے) یہاں ایک سیکولر قالب اختیار کر لیتا ہے "سب کچھ رس ہی رس ہے" کے زمانے میں اس کا مفہوم کبھی نین رس ہے، کبھی جوبن رس کبھی شعر و شراب۔ جمالیاتی احساس کی باطنی حیثیت موجودہ زمانے میں اس حیثیت کا مقام غالباً مد نظر نہیں رہتا۔ یہ بھلا دیا جاتا ہے کہ "قلب ہی نرالی لذت، انبساط، مسرت یا رس کا منبع ہے۔" اس کی ایک علیحدہ اور اسی زمانے کی تعریف یہ ہے کہ "ڈراما اور شاعری میں کمال محویت کی وجہ سے جب قلب انسانی جسم و اسم کے ان مادی و دنیاوی خیالات سے معرا ہو جاتا ہے جو حجاب بن کر قلبی مسرت کو پوشیدہ کر رہے تھے تو وہی قلبی اور اندرونی مسرت جلوہ فرما ہو کر رس کہلاتی ہے وبقول۔ پنڈت حبیب الرحمن رس یا فلسفہ انبساط مادی دنیا کے جذبات جب تک اس غیر محدود نرالی لذت کے روپ میں نہ ڈھل جائیں اس وقت تک وہ جمالیاتی یا تخلیقی احساسات کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتے۔ مادی جذبات کے ارتقائی پانے یا ارتقاعی حالت تک پہنچنے میں جو ایک روحانی لذت نصیب ہوتی ہے سنسکرت میں اس کا مذہب سے گہرا رابطہ ہے۔ ہمارے جمالی جہاں اس رابطے کو چھوڑ گئے ہیں وہاں ان پر یہ الزام بھی آتا ہے کہ انھوں نے اپنی مادی دنیا کو معطر اور کشید شدہ صورت میں ڈھالنے کے لیے نہ تو کوئی ارتقائی مذہبیت اختیار کی ہے اور نہ ہی مادیت سے کوئی انصاف کیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ لذتیت اور شہوانیت بطور ایک فراری رجحان طبیعت کے جمالیوں کے یہاں موجود ہے۔

مختار نے اپنی راگ وادی نظموں کو "ہماری کلاسیکی موسیقی (راگ اور بول) کی منظوم

تشریح" کہا ہے۔ "فنی اور جمالیاتی خط" کے لیے راگ راگنیوں کو "صوتی تاثرات اور لفظی نقش گری" کے ذریعے پیش کیا ہے۔ مگر اس اقرار کے باوجود مختار کی نظمیں محض رس کا رواجی مفہوم پیش نہیں کرتیں۔ اس سے تو انکار نہیں کہ موسیقی سننا ایک جذباتی تجربہ ہے اور اس کا کوئی تخلیقی یا جمالیاتی احساس ایک نئی ہیئت اختیار کر سکتا ہے مگر یہی کافی نہیں۔ اس کے تو یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے شاعر کے شعر کو چھوڑ کے اس کی گفتار مابعد کو مرکز توجہ بنالیا ہے۔ خیال درباری (بلمپت) ایمن کا ایک اور روپ اور خیال چھایا اگر خالص و محض تاثرات ہی ہوتے تو ایک تو صاحب تاثر کی انسانی صورت اور اس کے خد و خال ہمیں نظر نہ آتے دوسرے وہ "ایک پوری کہانی راحت و رنج کا ایک پورا ڈراما" لفظوں کی صورت اختیار نہ کرتا۔ تین سو برس کی طنابیں کھنچتی ہیں تو انسان دربار اکبری میں جا پہنچتا ہے اور ہم مغلیہ عمارات کے پس منظر میں (جو موسیقی میں تیسری وسعت پیدا کرتا ہے) "جرأت اکبرآبو" کا ڈراما راوی کی زبان سے سنتے ہیں مگر یہ راوی محض نشریات کا راوی نہیں ہے۔ اس کی اپنی ایک شخصیت اور اس کے اپنے مسائل بار بار دربار اکبری کی فضا سے ٹکراتے ہیں۔ یہ لذت پرستی کا کھیل نہیں، مبادلہ و موازنہ کا ڈراما ہے۔ رلکے نے ایک نظم میں سنگیت کو بتوں اور مجسموں سے ٹکرایا ہے۔ مختار انہیں مغلیہ عمارات کے وسیع و عریض بلند و بالا پس منظر لے لیا گیا ہے۔ یہ "نغمے سے آگے" کی فضا ہے۔ مختار کے نثری جوازات جو ان نظموں کے ساتھ لکھے گئے ہیں ایک نظمیہ تعارف کے ساتھ وہ حیثیت رکھتے ہیں جو ایک شاعر کا کلام اس کی روزمرہ گفتار سے رکھتا ہے۔

○○○○○

"سنگیت سہاروں" کی حیثیت اسی لیے محض تاثراتی نہیں ہے (اگر ہم تاثر کے معنی امپریشن سمجھیں) کہیں ایسی نظموں کا راوی اپنی Anima کو کلاسیکی سنگیت کے ادوار میں لے جاتا ہے اور مغلیہ عہد میں ایک ناچنے گانے والی فن کار کے طور پر پیش کرتا ہے۔ اس فضا میں طبیعت شاعر کا دبا ہوا حزنیہ اور ہم جنسوں سے گریزاں عنصر تشفی تو ضرور پاتا ہے۔ مگر اسے محض آدمی کی زنانہ شخصیت کہنا زیادتی ہوگا۔ ایک نرتکی کا روپ اختیار کرنا محض ایک اپنی انفعالیت کی تسکین کے لیے نہیں ہے۔ اس کی ڈرامائی اور فنی وجوہات بھی اک تو عشق میں محبوبیت کا وہ خاص تصور ہے جو آج کل ہندی شاعری سے مخصوص سمجھا جاتا ہے اور جو اس میں شکست خوردہ شاعری کے سوا ہر طرح کی اور ہر زبان کی شاعری میں پایا جاتا ہے۔ شخصیت کا یہ پہلو تخلیق فن کے لیے کس قدر کارآمد ہے، اس کے لیے ژنگ کی نفسیات سے بھی زیادہ خود شاعری کا عہد بہ عہد مطالعہ شاہد ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ بات نہیں بھولنی چاہیئے کہ مختار یہاں ریختی نہیں لکھ رہے اپنی فنی ضروریات کے لیے ایک فنی قالب اختیار کر رہے ہیں۔ پھر یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس قالب کو آپ صحیح سالم مختار صدیقی کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ وحید قریشی نے لکھا ہے کہ مختار ایک زمانے میں

قاری کہے جاتے تھے اور اس دور میں انھوں نے اپنی تحریروں میں واقعی انفعالی رجحان کے مظاہرے کئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ایک ڈرامائی قالب اختیار کرنے کے لیے تیاری اور ری ہرسل کے دوران کبھی کبھی اپنے رول سے اپنے آپ کو منطبق بھی کرنا پڑتا ہے۔ مختار کے ابتدائے پختگی کی نظموں ہی سے رسوائی اور رات کی بات میں بھی شخصیت کا انفعالی روپ اظہار نہیں پاتا بلکہ ایک ڈرامائی کردار بڑے رچاؤ اور وابستگی کے لیے تیار ہو رہا ہے۔ پھر یہ کیوں بھولیے کہ رات کی بات میں ایک مخانہ بھی ہے جس میں اس Anima کو لایا جا رہا ہے اور غالباً جہاں اس کی کرداریت ابھی نمایاں نہیں ہو سکی۔ ایمن کے دوسرے روپ میں انترہ:

گر میں ہوتی وہ جواں بخت پرانا برگد جس سے تم باندھتے دریا کے کنارے نیا
یا نہیں ہوتے تجن میرے گلے کی کنٹھی میری بندی مری آنکھوں کا رسیلا گجرا

شام کی راہ پہ ہر آہ نہ کہتی پھرتی
رازداں تیرگی ہوتی ہے نثار دریا
نیا باندھو رے کنار دریا
باندھو کنار دریا

نیا بندھوانے کی خواہش کے ساتھ یہ احساس بھی شدت کیے ساتھ موجود ہے کہ شخصیت کے فاعلی اور انفعالی پہلو مل تو سکتے ہیں مگر ایک نہیں ہو سکتے۔ اور پھر رات کے ساتھ اس ملاپ کا تعلق بھی سطحی نہیں ہے۔ دن کا غماز، (سورج) ڈر اور کھٹکا پیدا کرتا ہے۔ زیست کے روز بنیہ ہنگامے کھٹ راگ کھڑا کئے رکھتے ہیں۔ دن کے دوران میں صرف فاعلی عنصر نمایاں رہتا ہے۔ اس لیے کہ جدوجہد کا میدان اپنے سے باہر وجود رکھتا ہے مگر جب یہ کشمکش باطنی ہو جاتی ہے تو اس انفعالی روپ میں فاعلی روپ مدغم نہیں ہو جاتا۔ ان نظموں کا خاص کمال یہ ہے کہ مختار نے اپنے آپ کو روائتی فراریت کا شکار نہیں ہونے دیا۔ درباری میں:

بے کراں رات سے خراب کی رفعت دونی اور میں سایہ محراب میں ہوں افتادہ
خشک خندق سے ادھر کوہ گراں دیواریں اب کہاں جاؤں کہ رہبر نہ نشان جادہ
کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئی درباری

آخر اول کا راوی۔ درباری نقیب۔ اور خوش آمدید گانے والیاں ایک دوسرے میں گھلتے جاتے ہیں مگر آخر میں اصلی راوی (شاعر) کا روپ اور اس کی بے چارگی نمایاں ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ خیال چھایا، تک پہنچتے پہنچتے یہ انفعالی عنصر، ہجر، کا مرحلہ لے آیا ہے اور دونوں عناصر میں جدائی ہو گئی ہے۔ یہاں انفعالی قالب چاہتا ہے کہ دوسرا روپ اسے کہے: "میری رادھا آؤ بھی"۔ پھر اس کے ساتھ خوف بھی ہے، کوئی اس نیور کی جھن جھن سن نہ لے، اب کوئی اس دل کی دھڑکن سن نہ لے،۔ غالباً یہ واپسی کا مرحلہ ہے جہاں سے آغاز ہوا تھا اسی کی طرف ایک نفسیاتی

بازگشت ہے ۔ نئی نظم کدارا بھی اسی کا ایک ثبوت ہے کہ ر . ائی یا ایمن کے پہلے روپ کے ساتھ پھر سے انطباق طبیعت ہو رہا ہے ۔ یہ ایک ڈرامائی المیہ ہے کہ اداکار ایک رول کامیابی سے ادا کرنے کے بعد اسی رول کو زندگی میں بھی اختیار کر لیتا ہے اور نئی جولانی فن سے بھاگ کر پرانی شانتی اور بھرپور ترنگوں رمیں جینا چاہتا ہے ۔ انفعالیت کی طرف طبیعت کی واپسی ایک دور کا انجام ہے جس میں ماضی کی اہمیت بے حد نمایاں ہو جاتی ہے بلکہ حال کی تمام ناگواریاں طبیعت کے ماضی میں پناہ لینے کے بعد ماضی مطلق میں جانے پر مجبور کر رہی ہیں ۔

○○○○

آخر ریڈیو ہی کے بہانے ماضی بعید میں جانے اور اسے دیکھنے بھالنے کا موقع بھی ملتا ہے ۔ آثار قدیمہ پر مختار کے منظوم فیچر اسی طرح ایک نفسیاتی اور فنی اہمیت رکھتے ہیں جس طرح خارج کے واقعات ، حوادث نے پہلے طبیعت میں دخل دیا تھا ۔ وطن کی پرانی عظمت کے ان اجڑے ہوئے مدائن میں حال سے دور جانے کی خواہش کو بھی قرار ملتا ہے اور پھر اسی بہانے اس دوری کا رابطہ پھر سے زمانہ حال سے استوار ہوتا ہے ۔ ڈی ۔ ایچ لارنس نے بھی طرد یائی تہذیب کے کھنڈرات کو ایک ماہر آثار قدیمہ کی نظر سے نہیں دیکھا تھا ۔ بیسویں صدی کا ایک فن کار ایک عہد ماضی سے محبت رکھنے کے باوجود حال کو نہیں بھول سکتا چاہے وہ حال کتنا ہی ناگوار کیوں نہ ہو ۔ موہن جوڈرو کی ماقبلیاتی تہذیب اور ٹھٹھ کی اسلامی عمارات ۔ و محلات جواب بے حد شکستہ حالت میں ہیں ۔ بیسویں صدی کے تماشبینوں اور زائرین کے پس منظر میں ایک تضاد یہ روپ پیش کرتے ہیں ۔ یہاں مختار عتیقیات کے نقطہ نظر سے ایک نشری پروگرام نہیں لکھ رہے بلکہ اپنے مسائل اور نئی پرانی زندگی کے مبادلے اور موازنے کو موضوع بحث بنا کر ایک شعری انداز نظر اختیار کر رہے ہیں ۔

ضرورت میں بھی پر تو ہے ہنر کی دلنوازی کا

مختار کا سرمایہ شعری ایک لحاظ سے مختصر اور اپنے معاصرین سے مختلف بھی ہے ۔ اس کی آواز میں صدیوں کی گونج کے باوجود ایک منفرد و مخصوص سرتال کا احساس ہوتا ہے ۔ ترقی پسند تحریک کے لیے اس کا کلام محض فراریت کا ترجمان بھی نہیں فاشزم اور بازیافتہ ، جیسی نظمیں اور اکثر نظموں کے معاصرانہ خیالات انہیں اس گروہ سے ممتاز کرتے ہیں جو محض علائم اور استعارات میں باتیں کرنا چاہتا ہے اگرچہ ان کی معنوی حیثیتوں پر غور و خوض اور شاعری کے موضوعی پہلو پر ان کی توجہ یوں ہی ذرا اچھلتی ہوئی سی پڑتی ہے ۔ وہ ان " راست اقدام " کرنے والے شعرا سے بھی مختلف ہیں جو شعر کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں سے بے اعتنائی برتتے ہیں اگرچہ اس صورت میں بھی جس قسم کی شاعری ان کا منتہائے مقصود ہے ۔ بنفسہٖ قابل تحقیر نہیں ۔ مختار کے یہاں نغمہ و خیال کی ایک ایسی آمیزش ہے جس میں ایک کو دوسرے سے جدا کر کے دیکھنا بے حد دشوار ہو جاتا

ہے۔ اپنی آواز میں ڈوب کر بات کہنے کا مفہوم یہ نہیں کہ کہنے والا اسی میں کھو کر رہ جائے بلکہ ترنم و تغزل کی کیفیات تو ایک قسم کا غلاف بھی بن جاتی ہیں۔ جو خیالوں اور جذبوں پر دبیزتہ داریاں کرتا ہے۔ اسی لیے مختار کا مافی الضمیر بھی نغمے کی خارجی حدود سے نکلنے اور مجرد خیال بننے کی آرزو بھی کرتا ہے جس کے نتائج کا حسن ان کی مختصر اور پر معنی شاعری میں ہے۔

(بشکریہ "سویرا" لاہور)

"جب ۴۸ - ۱۹۴۷ء میں، میں نے ہندی کے مشہور شاعر شمشیر بہادر سنگھ کے زور دینے پر اُن کے دو افسانوی مجموعے "جگّا" اور "تار دلو" پڑھے تو ان دونوں میں کچھ ایسی نفیس اور اعلیٰ کہانیاں ملیں جو مجھے بے حد پسند آئیں اور میں ہمیشہ کے لئے بلونت سنگھ کے فن کا قائل ہوگیا۔ مجھے لگا کہ اپنے ہمعصروں میں وہ سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔

مجھے بلونت سنگھ کی کہانیوں میں "گرنتھی"، "پنجاب کا البیلا"، "سمجھوتا"، "دیمک"، "خوددار"، "تین باتیں"، "جگّا"، "پہلا پتھر"، "دیوتا کا جنم"، "کاکو کے پریمی"، "کالی تتری"، "سورما سنگھ"، "بیر لمحے" اور "گمراہ" ـــــ اعلیٰ درجے کی لگی ہیں۔ ان میں بھی "گرنتھی" "تین باتیں" "خوددار" "جگّا" "پہلا پتھر" اور "گمراہ" ایسی ہیں جنھیں بار بار پڑھنے پر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی۔

میں نے کئی بار لکھا ہے کہ اگر افادیت اچھی کہانی کی شرط نہ ہو تو بلونت سنگھ اپنے ہمعصروں میں سب سے بڑے افسانہ نگار ہیں۔ لیکن آج اتنی عمر کو پہنچ کر جب میں ان کی کچھ اعلیٰ پائے کی کہانیاں پڑھتا ہوں تو مجھے لگتا ہے کہ میں نے اگر مکیسر نہیں تو کسی حد تک غلط بیانی سے کام لیا ہے۔ میں اُن کی کہانیوں کو محض لطف کے لئے پڑھتا رہا ہوں۔ اور میں نے ان کی تخلیق کار کے داخلی سروکاروں کو گہرائی سے جاننے کی کوشش نہیں کی لیکن اب میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ فرد ہو یا سماج ـــــ بلونت سنگھ کی اعلیٰ کہانیوں میں دونوں کے لئے سروکار ہے۔ یہ بات دیگر ہے کہ اپنے سروکار کا وہ کھل کر اظہار نہیں کرتے۔ اُسے نہایت کاریگری سے کہانی میں چھپا دیتے ہیں۔ ذرا گہرائی سے دیکھنے پر اُن کی اچھی کہانیوں میں سماج کی بہتری کے لئے ادیب کی خواہش بھی دکھائی دے جاتی ہے اور اپنے کرداروں کے لئے اس کی ہمدردی اور دردمندی بھی یہ بلونت سنگھ اور ہندی اردو ادب کی بدقسمتی ہے کہ کسی ذمّہ دار ادیب یا نقّاد نے ان کی کہانیوں کو اس گہرائی سے نہیں پڑھا جس کا وہ تقاضا کرتی ہیں۔"

(اوپیندر ناتھ اشک - اقتباس بشکریہ "آجکل" دلّی۔ جنوری ۹۵ء)

ن ۔ م ۔ راشد

مختار صدیقی کی سی حرفی

بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے شعر کو محض بہانہ بناکر چند رسمی موضوعات پر گویا "جواب مضمون" لکھ ڈالے ہوں ۔ لیکن مختار صدیقی کی سی حرفی "حرف و سخن محض" "جواب مضمونوں" کا مجموعہ نہیں جنہیں حروف تہجی کے لیے اور کمزور تار میں پرو دیا گیا ہو ۔ بلکہ یہ نظم • زندگی اور زندگی کے ماوراء کے حقائق اور تصورات پر غور و فکر کا حاصل ہے ۔

مختار صدیقی یوں بھی جدید شاعروں میں سخت قدیم شاعر ہے ۔ اپنے نئے تجربات اور اپنی ان ڈرامائی نظموں کے باوجود جو اس کے مجموعے "منزل شب" میں شامل ہیں اور اپنی ان نظموں کے باوجود جن میں وہ اپنے عہد کے سیاسی یا بین الاقوامی واقعات کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ سخت قدیم شاعر ہے ۔ وہ ایک طرح سے "درسی" شاعر ہے ۔ درسی سے میری مراد "کتابی" یا "مدرسی" شاعر نہیں بلکہ وہ شاعر جس کی ذہنی پختگی ، جس کا انداز نظر اور اظہار خیال کا طریقہ استادانہ یا معتبرانہ ہو ۔ موضوع عشق ہو یا سیاست ہو یا تصوف ، اس کے بیان کے لیے الفاظ کا انتخاب اور ان کا دروبست ایسا ہو کہ انسان اس میں نوعمری کی نارسائی کا کوئی سراغ نہ پا سکے ۔ خیالات میں وہ بزرگانہ عفت ہو کہ ہوا و ہوس کا شائبہ تک نہ ہو ۔

پنجابی کی سی حرفیوں کی طرح اس طویل نظم کی تقسیم بھی حروف تہجی کے اعتبار سے کی گئی ہے ۔ اسی رسمی طریقے سے نظم کی ابتدا حمد ، نعت اور منقبت سے ہوتی ہے ۔ اور انھی کے انداز پر نظم کے موضوعات تصوف کے رنگ میں رچے ہوئے ہیں ۔ مختار صدیقی کی سی حرفی میں تصوف تو ہے ۔ لیکن اس کے دل کی لگن فارسی کے صوفی شاعر کے دل کی لگن نہیں ۔ بلکہ پنجابی ہی کے صوفی شاعر کے دل کی تڑپ ہے ۔ یوں تو مختار ، فارسی کے صوفی شاعر کی طرح طبعاً شہری شاعر ہے ۔ ان معنوں میں کہ شعروں کی تراش خراش اور زیبائش ، شہریت کا انداز لیے ہوئے ہے ۔ اس کا فلسفہ ایک حد تک شہری شاعر کے فلسفے کی طرح مرکب اور پیچیدہ ہے ۔ دیہاتی شاعر کی سادہ حکمت کی مانند مفرد نہیں ۔ لیکن اس کا جذبہ غالب پنجابی شاعر کا ہے ۔ اسے فارسی کے صوفی شاعر کی طرح زندگی کی بے مائگی اور لاحاصلی کا رونا نہیں بلکہ پنجابی شاعر کی طرح زندگی کی گہری آرزو مندی ہے گویا زندگی اس لیے عزیز ہے کہ وہ خود "سرسے تابقدم آرزوئے یار ہے" فارسی شاعر نے زندگی کی بے ثباتی اور بے مرائی کو دلچسپ بہانہ بناکر جس دریادلانہ خورد و نوش اور جس رندانہ بے باکی کی تعلیم دی ہے ۔ اس سے پنجابی کا صوفی شاعر قطعی طور پر ناآشنا ہے ۔ فارسی شاعر زندگی کی تمام بے

مانگی کے باوجود اس سے لڑتا جھگڑتا اس پر بپھرتا اور بپھر کر بانپتا دکھائی دیتا ہے ۔ اس کے مقابلے میں پنجابی کا شاعر زندگی کے ایک پرسکون کنارے پر کھڑا ہو کر جہاں اور لوگ بھی موجود ہیں دنیا کے رنگین میلے کو اپنی نگاہوں کے سامنے سے ہنستا کھیلتا گزرتے دیکھتا ہے ۔ اور اس کے چہرے پر کبھی طفل کمسن کی حیرت کی تابناکی ہوتی ہے اور کبھی پیر جہاں دیدہ کی زیر لب مسکراہٹ ۔

رومی اور بیدل اور فارسی کے چند اور صاحب فکر شاعروں کو چھوڑ کر جن کا ذوق و شوق، علم و ادراک کے نور سے روشن تھا ۔ اکثر فارسی شاعر نو عمری کے عشق میں مبتلا نظر آتے ہیں ۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے شعر میں تصوف کا نیا بعد شامل کر کے محض اپنا قامت بڑھانا چاہتے ہوں ۔ لیکن محض الوہی کنایوں اور استعاروں کی آمیزش سے تصوف کا سوز و گداز بلکہ رنگ و روغن تک کیوں کر پیدا ہو سکتا ہے ۔ ان کے برعکس پنجابی کے صوفی شاعر کا عشق پختہ عمری کا وہ عشق ہے جس میں جسمانی لذت اور جنسی طلب دور دور تک دکھائی نہیں دیتی بلکہ رفاقت کی وہ خواہش ہے جس میں ہلکی ہلکی آگ سلگتی رہتی ہے ۔ کبھی شعلہ نہیں بنتی ۔ جس میں وصال اس دوئی کو کم کرنے یا مٹانے کی تمنا ہے ۔ جو وہ انسانوں یا انسان اور قدرت بلکہ انسان کے اپنے ہی جسم و جان کے درمیان ازل سے حجاب اکبر بن کر چلی آتی ہے ۔ اور سب سے بڑا مقصود انسان کو اس کی ازلی گرفتاری سے نجات دلانا ہوتا ہے!

مختار صدیقی کی شاعری میں تصوف ضرور ہے ۔ تصوف کا علم اور فلسفہ اور ذوق و شوق سبھی کچھ ہے ۔ حتیٰ کہ کہیں کہیں تصوف یا مذہب کی اصطلاحات کا تانا بانا بھی ہے ۔ لیکن اس کا عشق پنجاب کے صوفی شاعر کے عشق کی طرح توانا اور پختہ کار ہے ۔ وہ عشق نہیں جو محض اپنی ذات یا اپنی ہی صفات میں گم ہو بلکہ وہ عشق ہے جو انسان کی ذات و صفات سب کو ہر وقت پر کھتا رہتا ہے بلکہ جو اس دوئی کو راہ سے ہٹانے کے لیے زور آزما رہتا ہے جس نے ذات و صفات کو ایک دوسرے سے الگ بلکہ ایک دوسرے کی ضد بنا دیا ہے ۔ اس سی حرفی میں جس تصور کی بار بار لیکن نئے سے نئے انداز میں تکرار ملتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ ذات و صفات جو بظاہر ایک دوسرے کی ضد دکھائی دیتی ہیں یا جو بیک وقت کئی مظاہر اختیار کر لیتی ہیں ۔ ان کا اصل سر چشمہ ایک ہی ہے ۔ جس سے ہم کم فہم انسان آشنا نہیں ۔ حتیٰ کہ جب وہ اضداد ایک دوسرے میں مدغم ہو کر بھی دکھائی دیتی ہیں تو ہم گویا اعتبار نہیں لا سکتے ۔ خدا کے وجود سے لے کر آگ، خاک، لفظ اور انسانی دل تک سب منقسم ہیں، اپنی صفات کی وجہ سے حصوں بخروں میں بٹے ہوئے ہیں ۔ لیکن دراصل سب ایک ہیں ۔ پھر حسن اور حسن نظر، خوب و زشت، ہجر و وصال، شہر اور ویرانے صورت و معنی، ظاہر و باطن، ہست و عدم محض تصورات ہیں یا محض نام، حالاں کہ ان کا وجود ایک دوسرے کی ضد نہیں اور ان کی اصل سب کی ایک ہے ۔ یہ تصویر کے دو رخ بھی نہیں ۔ بلکہ سب ایک ہیں ایک دوسرے سے یوں پیوست ہیں کہ ان کو الگ کرنا مشکل ہے ۔ مختار

فاصلوں کی اس دنیا کا قائل نہیں جو اشیا اور حقائق ہی کو نہیں بلکہ اسما کو تک ایک دوسرے سے جدا رکھتی ہے۔جہاں کہیں وہ یہ فرق یا جدائی دیکھتا ہے تڑپ اٹھتا ہے۔

فاصلوں کی اس وحشت گاہ میں رسم فراق کا راج رہا
ہم نے جانا سب کا جینا اک پیرایہ ہجراں ہے
صورت و معنی کا یہ تفاوت دیکھ کے ہم کو جنون ہوا
تیری محبت تیری وفا اور تیرے دل کی سنگینی
فردا کے ہر بھید میں کیا کیا تہہ در تہہ پیچاک نہاں
اور میں اس طوفان میں تنکا جس نے اپنی سدھ بسرائی

سی حرفی میں ایک پارہ ہے جس کا عنوان ہے کوزہ نامہ۔اس میں مختار نے حرف "خ" کے بہانے سے خاک کے بارے میں چند بند لکھے ہیں۔اور گویا خاک کے بہانے سے یا اس کے سہارے سے عالم انسانی اور اس کے رشتوں کے بارے میں نئے اسرار وا کیے ہیں۔

خاک میں خاک ہوے تو ہم نے کل اسرار کو وا دیکھا
خاک زر گل، خاک گل تر، خاک ہی باغ، بہاراں بھی
خاک میں مل کر پاک ہوے تو خاک کو راہ نما دیکھا
خاک مآل دل زدگاں بھی غازہ شہر نگاراں بھی
خاک کا خاصہ عام یہ دیکھا جیسا اثر ہو ویسی بنے
آگ میں آگ اور برف میں یخ ہو گرد و غبار ہواؤں میں
برق جمال کی چھوٹ پڑے تو خاک کا تو وہ طور بنے
خاک کا ذرہ ایک کرن سے مہر لقا ہو فضاؤں میں
خاک مثال دوئی وپستی، خاک عیار بلندی ہے
خاک کے بطن میں خاک سے لے کر زمرم، آگ اور ہیرے بھی
خاک ہی مامن، خاک ہی مسکن، خاک ہی مادر گیتی ہے
خاکی خاک میں ملنے ہی کو خاک کا سینہ چیرے بھی
خاک کا سینہ ایسا دفینہ جس کا اور نہ چھور کوئی
خاک کا سینہ جو بھی چیرے خاک اسی کو نہال کرے
خاکی اس مخلوق کے سینے یا رب اتنے تنگ ہیں کیوں
خاک جسے بھی نہال کرے یہ ضرور اسی کا ملال کرے

پھر براہ راست خاک کے موضوع سے ذرا ہٹ کر انسانوں کے بارے میں مختار نے خیال آرائی کی ہے۔خاک یا خاک تنوں کے بارے میں اس کے بعض خیالات ایک حد تک رسمی ضرور

ہیں۔ لیکن ان کی بعض جہتیں ایسی ہیں کہ قدما کے افکار میں ان کا نشان کم ملتا ہے۔ نسبتاً رسمی خیالات کی مثال یہ بند ہے جس میں انسان کی ازلی مجبوری کا ذکر ہے۔

خاک تنوں کی بساط ہی کیا ہے دم اور غم کے بندے ہیں
دم اور غم کے قیدی ہوں زندانی شام و سحر بھی رہیں
آس کریں اور آسرے ڈھونڈیں کھائیں فریب اور پھر کھائیں
مرمر کر بھی زندہ رہیں بن آئی کسی پہ مر بھی رہیں

لیکن جہاں وہ انسانوں کے دل کی باتیں کرتا ہے وہاں اس کی سوچ میں بے مثال جدت اور گہرائی آجاتی ہے۔

خاک تنوں کے دل بھی دیکھے شہر ہزار افسانہ تھے
جانے کے کئی رستے جن میں کوئی نہ تھا لوٹ آنے کا
اور طلسم زدہ یہ باسی بیکل تھے کہ شکیبا تھے
آپ ہی عنواں آپ ہی مضمون ہر کوئی اپنے فسانے کا

دل کے بارے میں کئی اور بند بھی ملتے ہیں حرف دال کے تحت ان اشعار میں بھی انسانی ہستی کی بوقلمونی اور ہزار مجبوریوں کے باوجود انسان کی رسائی اور پہنائی کا احساس بہت شدید ہے۔ اور یہ کہ انسان اپنے تمام ازلی اضداد کے باوجود ایک ہی اکائی ہے۔

دل ویرانہ شہر نگاراں قابل دید مقام بھی دل
دل میخانہ ریزہ مینا ایسا شکست انجام بھی دل
دل دیوانہ گرد خرد زندانی صبح و شام بھی دل
دل افسانہ عین حقیقت تیری چاہ کا نام بھی دل
دل برباد آفاق بداماں بوقلموں ہیں عالم دل
دل کا سواد ہیں تیرے جلوے کوثر نور ہے زمزم دل
دل کی نہاد اس خاک شفا سے جو ہے دوائے اعظم دل
دل تنویر نژاد ہے پیاری طاہر و پاک ہے مریم دل
دل دریا اور ایسے دریا خود ہی جن کے شناور دل
دل صحرا اور ایسے صحرا جن میں خاک برابر دل
دل دانا اور کیسے دانا خود کشکول و گداگر دل
دل دانا اور نام کے دانا ٹھوکر کھائیں در در دل

بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے مختار، صوفیہ کے "خود کوزہ و خود کوزہ گر و خود گل کوزہ" کے تصور ہی کی کھینچ تان میں مبتلا ہے۔ لیکن ایک تو مختار کے خیالات میں جو وسعت ہے وہ

اپنی تکرار سے کم نہیں ہوتی بلکہ زیادہ پھیل جاتی ہے اور اس کا اثر زیادہ گہرا ہو جاتا ہے۔ دوسرے اگر صوفیہ کے خیالات کی کھینچ تان بھی ہو تو یہ محض کسی اور کی صدا کی گونج نہیں بلکہ خود مختار کے اپنے شعور اور احساس کی ترجمانی اس میں کہیں زیادہ ہے۔

صوفیہ ہی کے خیالات کے مطابق اکثر جگہ مختار، دنیا کو یاد نیاداری کو پردہ حائل جانتا ہے جسے انسان کی اصلی برتری تک پہنچنے کے لیے راستے سے ہٹانا ضروری ہے۔ اسی طرح وہ دنیا کو بیشتر حرص و ہوا کے بندوں کی دنیا گردانتا ہے، جن کے دل پیار اور اخلاص سے بے بہرہ ہیں۔ جن میں وفا اور بناہ کا ذکر تک نہیں۔ جن کا اپنا حال برا ہے لیکن ساتھ ہی وہ دور زماں کے شاکی بھی رہتے ہیں۔ یہ ایسی دنیا ہے جس میں غم کی چبھن سے کوئی آزاد نہیں۔ لیکن ساتھ ہی وہ انسان کی عظمت کا بھی قائل ہے۔ لیکن اس انسان کی عظمت کا جس کے دل میں محبت کا نور ہو۔ جس کی خاک عشق کا تجلی سے چمک اٹھی ہو۔

یہ بھی تیرا اعجاز نظر ہے ورنہ کیا تھا تجھ بن دل
مطلع طور ہے بستی جب سے آپ نے میرا گھر دیکھا

یا ذرہ خاک اور مہر کرم کا ایسا پیارا ملاپ ہوا
زیست ہوئی عنوان تجلی روشنی پھیلی سائے گئے

مختار "سی حرفی" میں اپنے عشق کے مخاطب کے لیے کبھی صیغہ تانیث اور کبھی صیغہ تذکیر استعمال کرتا ہے۔ لیکن عشق کا لفظ بہت کم استعمال کرتا ہے۔ اس کا عشق ان دونوں ہستیوں کے لیے محض پیار ہے ایک طرح ہستیوں کو دو کہنا بھی درست نہیں کیوں کہ جس کی طرف سے یہ خطاب ہے وہ خود ایک ہی بندھن میں گرفتار ہے۔ دونوں مختار کے لیے ایک ہی طرح کی پیاس کا سرچشمہ ہیں۔ دونوں یکساں حیلہ ہیں اس بات کا کہ پیار کرنے والے کی اپنی ذات ان کے نور یا ان کی آگ کی ضو سے منور ہو۔ اور چاہنے والا اس آگ میں جل کر خود کندن بن جائے

مختار کی "سی حرفی" اس کی "منزل شب" سے بے حد مختلف ہے۔ اسلوب میں کم لیکن اپنے خیالات اور احساسات کے جوہر میں زیادہ یہاں اس کی تڑپ اور طلب ارضی زندگی کی عام تمناؤں سے بہت بالا ہے۔ اس میں فلسفے کا وہ تار و پود بھی ہے جو اس کی پہلی نظموں میں کم ملتا ہے یا اتنا واضح طور پر نہیں ملتا اس میں معانی کی کئی نئی تہیں ہیں۔ اس میں انسان کے اپنی ذات اور صفات کے ساتھ ربط اور انسانی تعلقات کے رابطوں اور جسم و جان کے بندھن کا احساس بہت گہرا ہے۔ پھر اس طویل نظم کی نسبتاً پیچیدہ اور یک آہنگ بحر کے باوجود ترنم میں کمی نہیں آئی۔ اس نظم میں ذوق و شوق کی سرمستی اپنے اندر بے پناہ قوت رکھتی ہے۔

(بہ شکریہ: شعر و حکمت۔ راشد نمبر)

اخلاق احمد دہلوی

رفیع پیر

کتنے لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگی کہ مختار صدیقی کی معرکہ آرا نظم "درباری" پیر صاحب کے ایما اور ترغیب پر تخلیق ہوئی اور اس ایک نظم کے کہنے پر مختار صدیقی صاحب کو ایک برس جانفشانی کرنی پڑی اور پاپڑ بیلنے پڑے، جس میں پیر صاحب برابر کے شریک رہے۔

۱۹۴۰ء - ۱۹۴۷ء کے دور کا ذکر ہے جب شاعروں کی تین مثلثیں بہت مشہور تھیں۔ پہلی مثلث تھی اسرار الحق مجاز، جاں نثار اختر، اور معین احسن جذبی کی۔ دوسری فیض احمد فیض، میراجی اور ن م راشد کی اور تیسری قیوم نظر، یوسف ظفر اور مختار صدیقی کی۔ اور یہ قصہ ہے جب کا کہ یہ سب جوان تھے، مع پیر صاحب کے۔ - پیر صاحب اس زمانے کے ان نورتنوں میں سے سب سے زیادہ تیسری مثلث کی طرف مائل تھے اور ان تین میں سے بھی وہ مختار صدیقی کو زیادہ پسند کرتے تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ مختار صدیقی بھی اس زمانے میں آل انڈیا ریڈیو دلی میں اسی طرح کے سٹاف آرٹسٹ تھے جیسے پیر صاحب تھے۔

زیادہ یگانگت پیر صاحب اور مختار صدیقی صاحب میں یہاں سے شروع ہوئی کہ ایک دفعہ کسی ریڈیو ڈرامے کی پروڈکشن کے ضمن میں اس دور کے دلی ریڈیو اسٹیشن کے اسٹیشن ڈائرکٹر سید رشید احمد اور پیرزادہ رفیع پیر۔ جس کا تلفظ سید احمد شاہ بخاری پطرس نے شیکسپیر کے وزن پر رفیع پیئر کر دیا تھا اور پیر صاحب کو ان کے نام کو بگاڑ نے کا تفنن پسند نہیں آیا تھا۔ کے درمیان کچھ اختلاف رائے ہوگیا جس پر رشید صاحب نے بھرے میٹنگ میں پیر صاحب کی موجودگی میں ڈرامے پر انگریزی میں ایک لکچر دیا اور بتایا کہ ڈراما ہوتا کیا ہے۔ رشید صاحب چونکہ پطرس صاحب کے شاگرد رشید بھی رہ چکے تھے اور انگریزی کے لکچرار بھی، اس لیے عموماً سب اراکین ریڈیو ان کی انگریزی سے بہت مرعوب تھے۔ جب ڈرامے پر یہ لکچر ختم ہوا اور سب نے یہ محسوس کیا کہ ان پر مغز اور دانش ورانہ لکچر کا ہدف اصل میں پیر صاحب تھے تو مختار صدیقی صاحب کھڑے ہوئے اور رشید صاحب کو مخاطب کر کے کہا "جناب والا! میں آپ کے حافظے کی داد دیتا ہوں۔ Best Plays of The World کا یہ پیش لفظ پڑھا ہم نے بھی ہے لیکن آپ کو زبانی یاد ہے"۔ اس پر پیر صاحب نے مختار صدیقی صاحب کو سب کے سامنے گلے لگا لیا اور کنٹین میں لے جاکر "لحے" کے مصنف محمد خلیل الرحمن اور میراجی کی موجودگی میں مختار صدیقی سے کہا کہ آپ ڈرامے کیوں نہیں لکھتے؟ میراجی نے کہا کہ "مگر یہ تو شاعر ہیں"۔ پیر صاحب بولے "کوئی

مضائقہ نہیں۔ نظم میں ہی لکھیں۔ مگر ڈراما نظم کے کھیل میں زیادہ نغمگی اور موسیقیت ہوگی۔"
یہ دور تھا دلی میں ریڈیو کے نثر کے ڈراموں میں سید انصار ناصری، فضل حق قریشی، اور ظفر قریشی کا چنانچہ طے پایا کہ کسی راگ پر نظم میں ڈراما لکھا جائے۔ جس پر میراجی بولے "بج بج دنتی کو ہاتھ نہ لگایا جائے یہ میرا مضمون ہے" تو یوں مختار صدیقی نے درباری راگ پر نظم تخلیق کی اور وہ اس طرح کہ آگرے کی گائیکی کے استاد اسد علی خاں جب بھی دلی آتے اور استاد فیاض خاں اپنے نامی گرامی ماموں جان کے رنگ میں درباری گاتے، مختار صدیقی، پیر صاحب کے ساتھ روشن لعل ناگرت کی ہمراہی میں گانے کے اسٹوڈیو میں جابیٹھتے۔ روشن لعل کو ساتھ اس لیے لیا جاتا کہ وہ تنہا اس زمانے میں دلی ریڈیو اسٹیشن میں "نوٹیشن" کے ماہر تھے۔ اور دیسی راگ راگنیوں کی نوٹیشن مغربی موسیقی کی طرز پر کر لیتے تھے۔

یہ روشن لعل وہ ہیں جو بعد میں ہندوستانی فلموں کے میوزک ڈائریکٹر بنے اور بڑا نام پایا۔ تو روشن لعل کے "نوٹیشن" کی مدد سے مختار صدیقی صاحب نے راگ درباری پر یہ نظم تخلیق کی۔ سال بھر میں یہ نظم مکمل ہو گئی۔ اس کا آخری مصرع "کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئی درباری" اس زمانے کے دلی ریڈیو اسٹیشن میں محاورے کے طور استعمال ہونے لگا تو پیر صاحب نے کہا کہ اب رشید صاحب اور ان کے استاد سید شاہ بخاری صاحب کو جاکر بتاؤ کہ ڈراما اسے کہتے ہیں۔ اس پر ایس ایس ایس ٹھاکر (شیو شنکر سنگھ ٹھاکر) یا "تھری ایس" ٹھاکر جنھوں نے روشن لعل ناگرت کے نوٹیشن کے ساتھ مستقل اور مسلسل طبلے پر سنگت کی تھی اور ریڈیو ڈرامے کی ایکٹنگ میں خود ڈراما ڈائریکٹر رفیع صاحب کے حریف گردانے جاتے تھے اور سید ذوالفقار علی بخاری کے بہت ہی پسندیدہ فن کار تھے، ان ٹھاکر صاحب نے کہا کہ یہ ڈراما نہیں ہے۔ نظم ہے۔ راگ درباری پر ڈرامائی نظم۔ جس کی وجہ سے پیر صاحب اور ٹھاکر صاحب میں ایسی اب بن ہوئی کہ بول چال بند ہو گئی مگر اپنے ہر ریڈیو کے ڈرامے میں پیر صاحب ٹھاکر صاحب کو ضرور رکھتے تھے اور ایس ایس ایس ٹھاکر بھی دل و جان سے پیر صاحب کی ڈائرکشن کو سراہتے تھے۔ ویسے بات چیت بند تھی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب شاہد و ساقی کا عروج تھا اور بھائی شاہد کے ماہ نامے "ساقی" میں ممتاز مفتی صاحب نفسیاتی افسانے رقم کرتے تھے اور مختار صاحب جو اس زمانے میں انور مختار صدیقی تھے نفسیات پر مضامین لکھتے تھے۔ "انور" مختار صدیقی کے دوست تھے اور ایک عرصے تک، ان کے نام کا ویسا ہی جزو ہے جیسے حضرت حسین شاہ صاحب کا مادھو لال جزو ہیں۔ انور مختار صدیقی کے نام سے بہت سی اردو کی نئی ترکیبوں کے حوالے اردو کی اس عظیم لغت میں بھی ہمیں ملتے اگر وہ لغت چھپ گئی ہوتی جو محبی شان الحق حقی کے والد مولوی احتشام الدین حقی نے بیس سال تک دیدہ ریزی کے بعد ترتیب دی تھی۔ نفسیات کی وہ ترکیبیں جو انور مختار صدیقی کی دین ہیں تحلیل

نفسی، لاشعور، تحت الشعور، داخلیت، داخلی خارجیت، خارجی داخلیت وغیرہ ہیں جن کا بعد میں بہت زیادہ استعمال محمد حسن عسکری نے کیا اور ان تراکیب میں کچھ اضافے بھی کیے۔

مختار صدیقی صاحب نے "انور" اپنے نام سے شاید اسی زمانے سے الگ کیا جس دور میں احسان بن دانش نے "بن دانش" کا "بن" ہٹایا، جب ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری نے احسان بن دانش کا انگریزی میں ترجمہ Gratitude Without Wisdom کیا تھا۔

مختار صدیقی معروف شاعری نہیں تھے انھوں نے رفیع پیر صاحب کی فرمائش پر ریڈیو کے لیے نظم و نثر میں ڈرامے بھی تحریر کیے۔ اپنی مشہور نظم "درباری" کے بعد۔ پیرزادہ رفیع پیر ڈرامے ہی کے آدمی نہیں تھے۔ انھیں موسیقی سے بھی لگاؤ تھا، اتنا کہ وہ اپنی عمر کے آخری حصے میں میاں: یم اسلم کے دولت کدے تک جانے کو تیار تھے جن کے پاس گراموفون ریکارڈ کی شروعات سے لے کر اب تک کے ہر قسم کی موسیقی کے ریکارڈ ہیں۔ مختار صدیقی اکثر یہ شعر پڑھتے تھے:

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

اور ہم اب کہتے ہیں:

کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئی درباری

(اقتباسات: بہ شکریہ تخلیقی ادب۔ کراچی)

مختار صدیقی

بشنواز نے

شعر کے متعلق ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر کو اپنے دل کے کسی پُراسرار کرب کو آسودہ کرنے کے لئے لکھنا پڑتا ہے۔ مشرقیوں کی زندگی میں غم جان اور غم جاناں نے ہمیشہ سے بڑا اہم حصّہ لیا ہے۔ ملال کے دنوں یا خوشی کی گھڑیوں کی یادیں یہاں حال کا اثاثہ بن جاتی ہیں۔ اس کے علاوہ اپنے گرد پھیلی ہوئی متنوع زندگی کا مشاہدہ اور تجربہ ہے جس سے رفتہ رفتہ تاثرات بنتے ہیں اور یہ تاثرات بھی وقت گزرنے پر یادیں بن جایا کرتے ہیں۔ آج کل زندگی کرنا بڑا مشکل کام بن چکا ہے۔ اس کے لئے ہمیں انہی یادوں (تجربات اور تاثرات) کو شکست دینا یا انہیں پوری طرح کچلنا پڑتا ہے۔ یہی عمل ایسے موہوم اور معلوم کرب کا پیش خیمہ بن جاتا ہے کہ اس کی آسودگی کے لئے زبان کھلتی ہے اور پھر کچھ دیر کے لئے اطمینان ہوتا ہے کہ دل کی ستمگاری سے ہمیں لفظوں نے آزاد کرا دیا۔ یہ اظہار اگر بالکل ذاتی سا ہو تو شاید پڑھنے والا دیپی نہ لے۔ وہ یہی سمجھے گا کہ کہنے والے نے کمزوری کے لمحوں میں اپنی کسی پنہاں خلش کو منظرِ عام پر لانے کی جرأت کر لی۔ یہ ایک "اعتراف" ہے اور بس۔ اور چونکہ ہماری مہذّب دنیا میں "اعترافات" (سننے والوں کے لئے) بڑے پریشان کن سمجھے جاتے ہیں لہٰذا اس "اعتراف" یا "اظہار" سے قطع نظر مناسب ہوتا ہے۔ لیکن دل کا کرب لفظوں میں لانے کے لئے بصیرت اور خلوص، دو اہم شرطیں ہوا کرتی ہیں۔ ان کی بدولت ہی ہر ذاتی تاثر یا انفرادی مشاہدہ، فرد اور تخصیص کی تنگنائے سے نکل کر آفاقیت کی بیکرانی میں سماتا ہے۔ یہیں سے "تقریر" (اظہار و ابلاغ) میں وہ لذّت پیدا ہوتی ہے جسے ہر سننے والا اپنے دل کی بات سمجھتا ہے یہیں سے ہر غم، غمِ یاراں بنتا ہے۔ ایک کا درد سب کا درد اور ایک کی کہانی سب کی کہانی بنتی ہے۔ اسی مرحلے پر پہنچ کر یہی بات محض (لفظوں میں کسی چیز کا) اظہار نہیں رہتی بلکہ اس میں دوسروں تک پہنچنے کی اور ان کے دل کی بات بننے کی صلاحیت آتی ہے۔ یوں کہئے کہ فن و ادب یہاں پہنچ کر ہی اظہار اور ابلاغ دونوں کا امتزاج بنتے ہیں۔

لیکن اس "عمومیت" کے عمل میں بھی فن کار کا ذاتی خلوص اور اس کی انفرادی بصیرت کارفرما رہتی ہے۔ خلوص اور بصیرت

کی اسی چھاپ کو کبھی لطف کلام کہا جاتا تھا، اب اسے اسلوب اور اندازِ بیان سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔

اور اسی لطفِ کلام، اسی اسلوب اور انداز کی بدولت یہ ممکن ہونا چاہئے کہ ہم کتاب چھوئیں تو لکھنے والے کو بھی چھو سکیں۔

اس ساری بحث کا مدعا صرف یہ ہے کہ فن وادب کے بارے میں آج کل ہر فن کار سے ایک نظریے، ایک مقصد یا ایک لائحہ عمل کی ضرور توقع کی جاتی ہے۔ یہ زمانہ وضاحت اور تشریح کا ہے، رمز وایما کا نہیں۔ کنایات اب ذرا اس لئے بھی خطرناک ہو گئے ہیں کہ (وضاحتوں کے رسیا زمانے میں) ان کی گوناگوں تعبیریں اور تاویلیں کی جاتی ہیں۔ اب ہر چیز "سخن" ہے۔ جو بات "ماورائے سخن" کبھی سمجھی اور مانی جاتی تھی اب مشتبہ قرار پاتی ہے۔ اسی کے پیشِ نظر میں نے چاہا ہے کہ جن باتوں نے یہ نظمیں اور غزلیں مجھ سے لکھوائیں، انھیں ایک مبحث کی صورت میں لکھ دوں۔ یہ نظمیں اور غزلیں میری زندگی کے ایک بڑے زمانے یعنی (۱۹۳۸ء سے ۱۹۵۵ء) سے متعلق ہیں۔ موجودہ عہد کی تاریخ میں یہ زمانہ، عالمگیر جنگوں اور انقلابات کا زمانہ ہونے کی وجہ سے منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ نظری اور علمی تاریخ میں یہ زمانہ اپنی بوقلمونی، اپنے تجربات، اپنے اکتشافات و انکشافات کی بدولت شاید اب تک بے نظیر ہے۔ مجھے یہ کہنا ہے کہ اس سارے دور میں، معاشرے میں میری حیثیت ایک بہت ہی عام اور غیر اہم فرد کی رہی ہے۔ اس دور کے نظری اور عملی انقلابات اور ہنگاموں میں مجھے "تماشائی" ہونے کا منصب بھی نہیں ملا۔ کیونکہ اب عہد آفرین علمی یا عملی تبدیلیوں کا تماشائی بننا بھی اونچا کام ہے۔ اس لئے یہ منظومات اس دور کی اسی حد تک عکاس ہیں کہ میں اتفاقاً اس دور میں زندہ رہا اور اپنے تاثرات، مطالعہ اور تجربات (یعنی اپنے دل کی ستمگاری) کو لفظوں میں آسودہ کرتا رہا۔ غالباً اسی لئے ان منظومات کا انداز مخصوص ہے، ان کے الفاظ میرے انفرادی انتخاب نے ایک خاص انداز میں ڈھالے ہیں، اور ان کی ہیئت میری ذاتی پسند پر مبنی ہے۔

اس مجموعے کا ایک حصّہ (سدا رنگ) ہماری کلاسیکی موسیقی کے چند راگوں سے متعلق ہے۔ ان نظموں کے بارے میں مجھے خاص طور پر چند گزارشات کرنی ہیں۔

۱۔ ان نظموں کی تخلیق ایک مخصوص پس منظر سے متعلق ہے۔ بنیادی طور پر یہ پس منظر اُس خاص شغف سے عبارت ہے جو مجھے اپنی زندگی کے ایک دور میں کلاسیکی موسیقی سے رہا ہے۔ اس شغف کا منطقی نتیجہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ میں دلی تحریک سے مجبور ہو کر خود ٹھاٹھ، راگ، تال اور لے کا علم عملی طور پر حاصل کرتا اور گاتا ــ اس میں کئی باتیں حائل تھیں ــ ایک تو وہ تربیت ہی تھی جس کی رو سے گانا بجانا ڈوم ڈھاڑیوں کا پیشہ سمجھا جاتا ہے اور اس سے حظ اٹھانا شرفا کا دستور قرار دیا گیا ہے۔ دوسری اور اہم تر بات غالباً یہ تھی کہ کلاسیکی موسیقی سے حظ اٹھانے کے لئے جب ابتدائی معلومات حاصل ہوئیں

تو پتہ چلا کہ کلاسیکی موسیقی کو عملی طور پر حاصل کرنے سے مجھے فائدہ نہیں ہوگا۔ اور فن کو برائے فن حاصل کرنے کا نہ وقت تھا، نہ اتنا دماغ تھا۔ چنانچہ اپنے مرحوم دوست مشتاق احمد شیخ اور دوسرے ان گنت کرم فرماؤں کی بدولت میں نے کلاسیکی موسیقی کی تھیوری کو تھوڑا بہت سمجھ لیا۔ اور پھر فنی اور جمالیاتی حظ کی وہ منزلیں آئیں جن میں ہر منزل کی نیرنگیاں اور رعنائیاں ہر آن بدلتی رہتی تھیں۔ اور یہ سدابہار رعنائیاں جب تاثرات اور محسوسات کی بوقلمونی میں آمیز ہوتی تھیں تو اپنے لئے اظہار کا راستہ ڈھونڈتی تھیں۔ گویا صوت کے زیر و بم (موسیقی) کا یہ تقاضا میرے لئے ہر وقت موجود تھا کہ میں اسے لفظوں کی نقش گری (شعر) میں کسی طرح اجاگر کر دوں۔

صوت کے زیر و بم کو لفظوں میں اجاگر کرنے کے سلسلے میں چند بنیادی باتوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ وہ یہ ہیں:

اوّلاً کلاسیکی موسیقی دن رات کی مختلف گھڑیوں میں مختلف بندشوں اور مختلف تاثر (یعنی راگ) کی قائل ہے۔ اس نظریے کے مطابق ہر راگ راگنی اپنے مناسب وقت پر ہی وہ تاثر پیدا کر سکتی ہے جس کے لئے اسے ترتیب دیا گیا ہے۔ یہ تاثر، رس کہلاتا ہے۔ اسے اس مخصوص راگ کا بنیادی جذبہ یا خیال سمجھئے۔ یہ صبح کی سہانی گھڑیوں میں عبودیت کا تاثر ہو یا چڑھتے سورج کے ساتھ دن کے ہنگاموں کا پیش آہنگ ہو، آمدِ شام پر ایک ناقابلِ بیان اداسی ہو یا رات کی سونی گھڑیوں میں غمِ ہجراں ــــ ہر تاثر سروں کی ایک مخصوص ترکیب و ترتیب اور ان کی بروقت ادائیگی میں مضمر سمجھا جاتا ہے۔

اسی بات کو میں نے اپنی نظم "سرگم" یا "نغمے سے آگے" میں بیان کیا ہے۔ راگوں پر باقی نظموں میں، ان راگوں کے بنیادی جذبے یا تاثر (رس) کو ہی نظموں کا اصل موضوع رکھا ہے۔ مثلاً "ایمن" کا بنیادی تاثر ایک غیر مختتم فراق کا ہے۔ "درباری" میں کسی صاحبِ اقتدار کا شکوہ اور اپنی بندگی و وفاداری ـــ اور ان دونوں باتوں کی گہرائی و گیرائی کا رس ہے۔ "چھایا" ہجر و وصال کے عجیب و غریب آمیزوں سے مزیّن ہوتا ہے۔

۲۔ کسی راگ کو پیش کرنے میں عام طور پر چند لفظوں کا سہارا لیا جاتا ہے۔ یہ بول (استھائی) عام طور پر اس راگ کے بنیادی تاثر کے مظہر ہوتے ہیں۔ پرانے موسیقاروں کے لکھے ہوئے بولوں میں راگ کے "ماحول" اور اس کی لطافت کا پورا عکس نظر آتا ہے۔ بعض بڑے موسیقار (مثلاً نعمت خان سدا رنگ، شہنشاہ محمد شاہ رنگیلے پیا، جانِ عالم واجد علی شاہ اختر، عنایت حسین خان، فتح علی خان وغیرہ) حقیقی معنوں میں شاعر بھی تھے۔ ان کے تصنیف کردہ بولوں میں ایک راگ کا بنیادی تاثر (رس) اس جذباتی خلوص اور فنی حسن کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی رنج و راحت کی ایک پوری کہانی چند لفظوں سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ یہ کہانی بندگی اور عقیدت کی ہو یا کسی کے سفّاک حسن کی داستان، اپنی مجبوری کا بیان ہو یا گزری راحتوں کا تاسف ـــ اس کا تاثر راگ کے بنیادی تاثر (رس) میں پورے فنی خلوص سے اجاگر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کلاسیکی موسیقی کی پیش کش میں یعنی خیال

ٹھمری وغیرہ گانے کے لئے یہ بول ناگزیر سے ہو گئے ہیں۔ ان بولوں سے راگ کی فضا کا نقشہ کھنچ جاتا ہے۔ ان کی خالص شعریت راگ کی فنی لطافتوں کا اظہار بن جاتی ہے اور ان کی ڈرامائی کیفیت اس راگ کے حزن یا اس کی نشاط اندوزی کی ضامن بن گئی ہے۔

مختلف راگوں نے میرے دل و دماغ پر جو اثر کیا ہے اس میں ان بولوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ ایک ایک راگ کے بیسیوں بول رائج ہیں اور ہر ایک کی بندش جداگانہ حسن رکھتی ہے، اور ان کا پھیلاؤ اسی مخصوص بندش کے تحت جداگانہ لطافت کا حامل ہے۔ میں نے اپنی نظموں کے لئے ان بولوں کا سہارا لیا جو راگ کے بنیادی تاثر (رس) اور راس کی ہیئت، دونوں کے بدرجۂ اولیٰ ترجمان ہوں تاکہ ان بولوں سے اس راگ کی ساری فضا، اس کا بنیادی تاثر (رس) اور راس کا فنی حُسن نظموں میں ڈھالا جا سکے۔

اس اعتبار سے راگوں پر میری چند نظمیں، راگ اور بول (صوتِ محض اور الفاظ) کی منظوم تشریح ہیں، ایک ایسی وضاحت ہیں جو آواز اور صوتی فضا کو لفظوں میں بیان کرنا چاہتی ہے۔

مختصراً ان نظموں کی اصل یہ قرار پائی کہ پہلے میرے شعور نے کسی راگ کے فنی تقاضوں کو سمجھا، بولوں نے اس کی فضا اور اس کے بنیادی تاثر کو مجھ پر واضح کیا۔ اس سے جو کیفیت میرے دل و دماغ پر چھائی، اس کی کہانی میں نے بیان کی ۔ یہ وہی فضا، وہی تاثر اور وہی کہانی ہے جو اس راگ کی کہانی تھی۔

۳۔ اب ان نظموں کی ظاہری ہیئت کے بارے میں چند باتیں عرض کرتی ہیں:

کلاسیکی موسیقی کی سب سے اہم مروّج صنف "خیال" ہے۔ اس کی پیش کش کا عام قاعدہ یہ ہے کہ پہلے پیرایۂ آغاز (الاپ) سامنے آتا ہے جو اس راگ کی مخصوص سروں اور ان سروں کی باہمی ترکیب و ترتیب کو واضح کرتا ہے۔

پھر مقدمہ (استہائی) ہے جو انہی سروں کی ایک خوش آہنگ بندش ہے اور اس بندش کا خوبصورت لفظوں (بول) میں اظہار کا نام ہے۔ یہ اس خاص راگ کی داستان کا ڈرامائی آغاز ہے ۔ اور اس آغاز میں اُس راگ کا سارا ماحول، اس کا بنیادی تاثر (رس) اور اس کی نغماتی فضا ایک خاص سانچے میں ڈھلی ڈھلائی سامنے آتی ہے ۔ کچھ دیر تک یہ بول، مخصوص سروں کے مختلف تغیرات کے ساتھ جھلائے جاتے ہیں۔ یہ "استہائی" کا پھیلاؤ ہے ۔ اگلا مرحلہ عروج (انترہ) کا ہے۔ یہاں راگ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچتا ہے۔ بولوں کی کہانی کا نقطۂ اوج بھی عام طور پر یہی ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس راگ کی ساری پہنائی کی سیر شروع ہوتی ہے۔ یعنی اس راگ کی مخصوص سروں کی ساری امکانی بندشیں پیش کی جاتی ہیں۔ جو جوالٹ پھیر، دروبست، اور لف و نشر ممکن ہے وہ اس راگ کی ترکیبی سروں کے ساتھ روا رکھا جاتا ہے تاکہ اس کی ساری وسعتیں سامنے آجائیں ۔

نصابی اعتبار سے بھی واپسی (ابھوگ) کا مرحلہ ہے کہ جس نقطے (استھائی) سے نغمے کا سفر شروع ہوا تھا اس کے گرد ہر نوع کی آئینہ بندی ہو چکی، اور اسی نقطے کو واپس ہو جائیں۔

راگ پر اپنی نظموں میں، میں نے یہی ترتیبِ مضمون رکھی ہے۔ راگ جیسے شروع ہوا، جس طرح سروں کی بڑھت کے ساتھ بولوں کی کہانی آگے بڑھی، عروج کو پہنچی اور پھر تکمیل تک آئی، اسی طرح یہ نظمیں بھی یہی تکنیکی التزام رکھتی ہیں۔ ہماری موسیقی کا قاعدہ ہے کہ راگ کی چال طبلے کی لے کے ساتھ وابستہ رہتی ہے۔ گویا کہانی بڑے دھیرے پن (بلمپت لے) سے شروع ہوتی ہے۔ عروج تک پہنچتے پہنچتے اس میں گرم رفتاری در آتی ہے۔ رفتہ رفتہ دل کی دھڑکنیں اور نبضوں کی چال، بیان کا لہجہ تیز تر کر دیتی ہیں ـــ راگ کی چال کو اصل سے دگنا تگنا یا چوگنا کرنے کا یہی مرحلہ ہے۔ یہی تیز روی (درت) ہے جو تکمیل کا آخری باب ہے یعنی:

دھڑکنیں اب تیز تر ہیں، لے بڑھے سنگت کرے
وجد میں ہے راگنی سے جھومتی نبضوں کی چال!

مندرجہ بالا التزامات کی روشنی میں، راگ سے متعلق میری نظموں کو تشریحاتی اور تاثراتی منظومات قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن میں یہ عرض کروں گا کہ ان نظموں کی بنیاد، نغمے سے وہ گہرا لگن ہے جسے میری عمر کے بہترین حصّے میں ایک جامع کمالات شخصیت مرحوم مشتاق احمد شیخ نے میرے دل میں پیدا کیا۔ ان نظموں کا دوسرا اہم بنیادی عنصر وہ کیفیت ہے جو ہماری موسیقی کی طلسماتی نیرنگیاں ہی پیدا کر سکتی ہیں۔ اس نوع سے یہ نظمیں خود ایسے "نغمات" ہیں جو سروں کی کسی ایک مخصوص بندش کو لفظوں میں لائے ہیں۔ سر، آوازِ محض ہے اور لفظ، زیادہ سے زیادہ کسی چیز کی لغوی علامت ہیں ـــ اس طرح آوازِ محض کے ایک مجموعے (راگ)، اس کے تلازمات، اس کے ماحول اور اس کے تاثر کو لفظی کہانی میں ڈھالنے پر جو چیز بنے گی، وہ بذاتِ خود ایک نغمہ یعنی پروگرام میوزک ہوگا ـــ یہ نظمیں بھی چند راگوں کا پروگرام میوزک ہیں۔ اگر ان راگ راگنیوں اور ان کے بولوں کا کیف، حسبِ حال ذہنی تحریک پیدا نہ کرتا تو یہ لفظی نغمات وجود میں نہ آتے۔

اسی لئے میں نے ان نظموں کے عنوانات بھی وہی رکھے ہیں جو ہماری موسیقی میں ان خاص راگ راگنیوں کے نام ہیں۔ کوئی اور عنوانات، نظم کے بنیادی خیال یا متعلقہ راگ کے تاثر کا سراغ تو شاید دے سکتے مگر یہ ظاہر نہ ہوتا کہ یہ نظمیں ایسے "راگ" ہیں جن میں فنِ موسیقی کو فنِ شعر کی قیود میں لا کر لفظوں میں لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔

("منزلِ شب" کے دیباچے سے مقتبس)

مختار صدیقی

رات کی بات

چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے

فرطِ بیتابی سے اٹھ اٹھ کے نظر بیٹھ گئی
تھام کر آس ہر آہٹ پہ جگر، بیٹھ گئی
میرا غم خانہ عبارت رہا تاریکی سے
موجِ مہتاب کہاں خاک بسر بیٹھ گئی
شبنم آلود ہوا جاتا ہے شب کا داماں
تارے جھکے ہیں کہ اب گردِ سفر بیٹھ گئی

بھیگتی رات ، نہا کر مرے اشکِ خوں میں
جانے کو اٹھی ہی تھی ، اٹھ کے مگر ، بیٹھ گئی

اس نے دیکھا کہ مری رانی لجاتی آئی
آنکھیں ملتی ہوئی منّوں کو جگاتی آئی

سر سے ڈھلکا ہوا آنچل ، شکن آلود لباس
چڑھی آنکھوں میں مچلتی ہوئی نیندوں کی جھلک
سو گئی تھی ذرا خود ، سب کو سُلاتے شاید
نیند کچی تھی کہ دی وعدے نے دل پر دستک
چونک کر اٹھی تو دیکھا کہ ستارے بن کر
اوجِ افلاک پہ ہے مانگ کی افشاں کی دمک
شیشۂ مہہ سے چھلک کر مئے تُند و بے دُرد
اُس کے ماتھے سے چُرا لیتی ہے سونے کی ڈلک
"زلفیں یوں چہرے پہ بکھری ہوئی مانگیں تھیں دل
جس طرح ایک کھلونے پہ پٹیں دو بالک"
چوڑیاں ہاتھوں میں تھامیں ، چلی ہولے ہولے
کر دے غمّازی مبادا کہیں چھاگل کی چھنک
میرے غم خانے میں پہنچی ، تو کچھ آیا جو خیال
چوڑیاں چھوڑ دیں ، چھاگل بھی ہنسی چھانا چھنک

شکر ہے آئی تو ہے نیند کی گو ماتی ہے
چوڑیاں بجتی ہیں چھاگل کی صدا آتی ہے

مختار صدّیقی

رُسوائی

(۱)

ٹیکا لگاؤں، مانگ بھی صندل سے بھر چکوں
دُلہن بنوں تو چاہیئے جوڑا سُہاگ کا
مہندی رچے گی پوروں کہیں جا کے دیر میں
کنگھی کروں تو چڑھتی ہے کالوں کی اور لہر
افشاں ہے بخت بھی کر رہا ان کے پھیر میں
کہتی ہے سانجھ بھور کے اب گھاٹ اتر چکوں
تم بیٹھو میں تو آئی یہ جی سے گزر چکوں

اتنے دنوں تو دل کی لگی نے خدائی کی
پایل بجے، تو ہنسی کی دُھن ناچ ناچ اُٹھے
بدنامیاں کرشمے مرے دیوتا کے ہیں
دیدے گھما گھما کے کہیں کیوں نہ گوپیاں
ان کے چلن تو بگڑے ہوئے ابتدا کے ہیں

بِتیا نہ ہو گی کل سے لگائی بجھائی کی
دیکھے شفق، تو دیکھے چِتا جگ ہنسائی کی

(۳)

چیخیں سُن سُن کے سبھی نیند کے ماتے جاگے

سامنے دہکی ہوئی آگ کا پیکر دیکھا
چل کے دو چار قدم، پھر سے پلٹ کر جولاں
چیخیں شعلوں کے دہکنے پہ لپک اٹھتی تھیں
دُود کے حلقے، رواں سوئے فلک چرخ زناں
سب یہ سمجھے کہ کوئی غولِ بیابانی ہے
یونہی لُو کا جو لگانے کو نکل آیا یہاں
یاد پا آگ تھی، یا لال رسیلی، ساڑی
چھایا کالوں کی تھی شعلوں کی زبانوں کا دُھواں
یک بیک کندنی باہیں بھی اٹھیں چیخ کے ساتھ
کانپتے آئے نظر، پھول سے مہندی بھرے ہاتھ

ایک نے بڑھ کے وہیں آگ پہ ڈالا پانی
آگ یوں پانی کی شہ پائے، تو دوزخ نہ بنے؟
جیتے جی اشکوں سے کیا دل کی لگی بجھتی تھی
آگ پانی میں لڑائی جو چتا پر بھی ٹھنے؟
خاک ڈالی، تو ہوئیں پھر کہیں مدھم آنچیں
بخت رسوا ہو تو رسوائی بِنا کیسے منے
پوچھو جلنے کی تو جانے وہی جس تن لاگے
چیخیں سُن سُن کے ______

ہرجائی

اُتنی آنکھیں جن میں غلطاں مَدبھری گہرائیاں!
یہ —— بھرے جوبن کی سرمستی سے چُور
کم سِنی ہے —— نیم خام اِن کا سرور!
اور یہ اُٹھتی جوانی کی تڑپ سے ناصبور!

اَن گنت ہونٹوں کی بے پایاں شفق دہکی ہوئی
دیکھئے کتنے شُبک، کتنے سجل
کتنے چغتائی کی جاں کاہی کا پھل
جن کا البیلا تناؤ پھول کی پتّی کا بَل
لعل گوں پاروں کی پھلواری سدا مہکی ہوئی

اور یہ کاکل، یہ تاباں سانپ لہرائے ہوئے
کُندنی رُخ، چاندنی راتوں کے راگ
شبنمی سونے میں یہ شعلوں کی لاگ
رنگ کا رس رُوپ کی صد رنگ آگ
جاگ اے، آفاق کی چاہت کے بیٹھے روگ جاگ
دیکھ! یہ جلوے پذیرائی کو ہیں آئے ہوئے!!

مختار صدیقی

اناؤنسر

سُرخ بتی نے اشارے سے کہا ہے — بولو!
کھوج نظروں سے مِٹا، بات کے بندھن ٹوٹے
میرے الفاظ کو لہروں کا کوئی پیمانہ
چھین لے جائے گا، دوری کے بہانے جھوٹے

منہ سے جو نکلے، اسی بات سے ناطہ چھوٹے
دل میں باقی رہے موہوم سا احساسِ زیاں
میں یہ سوچوں کہ ہر اک دشت بھی، آبادی بھی
میرے الفاظ کی تشہیر کا دیکھے گی سماں

اور بے نام و نشاں، دیکھی نہ بھالی لہریں
ایک عالم میری باتوں کا ڈھنڈورا پیٹیں!

مختار صدیقی

ایک تمثیل

"حجلۂ گور میں سامانِ عروسی ہوگا
لاش آرام سے سوئے گی سہاگن بن کر!"

(۱)

رخصتی ہوتی ہے، جاتی ہے دُلہن کی ڈولی

باری باری یہ اعزّہ ابھی کاندھا دیں گے
دھن پرایا تھا — مگر آج پرایا ہوگا
فرطِ رقّت سے ہوئی جاتی ہیں پُرنم آنکھیں
کون ایسا ہے جو اس وقت نہ رویا ہوگا
روتی آنکھوں میں چھلکتے ہیں لہو کے قطرے
پھول ہنستے ہیں، مگر خون ٹپکتا ہوگا

گل بداماں ہے کہ اک خرمنِ دل ہے ڈولی
دوش پر پھول نہیں، باغِ مصلّیٰ ہوگا
کوئی دم ہے کہ اسی خرمنِ گل کے صدقے
حجلۂ خلد نشاں اور مہکتا ہوگا
ہے جو خلوت میں، یہ وارفتہ لپٹ بیلے کی
دل میں نوشہ کے مگر حشرِ تمنّا ہوگا!

سمٹی سمٹائی، لجاتی ہوئی، آئی ہے دُلہن!
داخلِ گلشنِ جنّت ہوئی، جانِ گلشن!!

(۲)

لئے آتے ہیں سبھی داغِ جگر کے مالے
خیر سے آج، دُلہن کے ہوئے چوتھی چالے
زیبِ تن ہوگا نیا آج عروسی جوڑا
گردِ مہتاب پڑیں گے نئے سیمیں ہالے
پھر نئے سر سے اعزّہ کی ضیافت ہوگی
پھر سے رِقّت میں لہو روئیں گے رونے والے
ڈھیر یوں پھول مہکتے ہیں پڑے خلوت میں
اور خوشبو سے ہوئے جاتے ہیں دل متوالے
منہ چھپائے ہوئے گھونگھٹ میں ہے رادھارانی
گرچہ خلوت میں نہیں سانوری صورت والے!

لاشِ آرام سے سوتی ہے سہاگن بن کر
گو ہرِ اشک سے آنکھوں کی بھری ہے جھولی
رخصتی ہوتی ہے، جاتی ہے دُلہن کی ڈولی!!

مختار صدیقی

بازیافتہ

اچھا خاصا سُبک سا نقشہ
چہرہ پیلا ، لباس سادہ
ماحول سے جیسے تھک چکی ہو
تنہا ، تنہا ، بِلا ارادہ !

آنکھیں جو کبھی رسیلی ہوں گی !
اب اُن کی اداسیوں کی تہ میں
کیا کیا نہ تھے جاں گُسِل فسانے
ہم آپ تو بے سُنے ہی سمجھیں

طوفاں میں جو ناؤ کھو گئی تھی
پھر آن لگی ہے اِس کنارے
یوں تو ہے خُدا کا شکر واجب
لیکن کِسے ناخُدا پکارے ؟

مختار صدیقی

کیسے کیسے لوگ

شام ہی سے دل میں ایسی بے کلی جاگی تھی آج
چاندنی بھرتی رہی تھی، جس میں یادوں کی جلن!
نرم جھونکے لائے تھے، اُس بوئے رفتہ کا سُراغ
جس سے در آئی تھی، دل میں پہلی چاہت کی دُکھن
سامنے آئے تھے اپنی زندگی کے اونچ نیچ
یعنی جی سکنے کے سارے کردہ ناکردہ جتن
ٹوٹتے تاروں سے اُن لوگوں کا آیا تھا خیال
مرگِ ارزاں جن کی گمنامی کا ہے اندھا گہن

موت اسی انبوہ کی شاید نہ تھی جشنِ طرب
جیسے ہم سب کے جیئے جانے کے ضامن تھے وہی
اور اُنھیں حالات کی گردش نے پیسا اس طرح
کارکُن دنیا میں بے مصرف رہے جیسے وہی
دیدۂ قدرت میں یوں محبوب تھی اپنی بقا
جیسے انسانوں سے مخلوقِ فروتر تھے وہی

یہ بقائے بہتریں کی مصلحت تھی بھی، تو کیا؟
کیوں فنائے کمتریں کا اک بہانہ تھے وہ لوگ؟

ان میں کیا باتیں نہ تھیں جن سے ہمیں ہیں بہرہ ور؟
اب کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کیا کیا تھے وہ لوگ
اور ان لمحاتِ خونیں ہی سے پہلے ایک عُمر
اس اٹل قانون کو کیوں کر گوارا تھے وہ لوگ؟

شب کی تاریکی مٹا دیتی ہے کیا کیا امتیاز
ہر خرابے کا، ہر آبادی کا ما من ـــــ خامشی!
ان کے بے نام ونشاں مدفن پہ بھی ہوگی یہ رات
ان کی ویراں بستیوں پر چھٹکی ہوگی چاندنی

پُرسکوں نیندوں میں گُم ہے جینے والوں کا جہاں
وہ ـــ جنھیں اَوروں کے مرنے سے ملی ہے زندگی
وہ ـــ جنھیں بہتر سمجھ کر دی ہے قدرت نے بقا
ان میں کتنے ہیں جنھیں ہے زندگی کی آگہی؟
ہر کوئی ماحول کی بے اعتنائی کا اسیر
ہر کسی کے دل میں سوتی ہوگی کیسی بے کلی!
کیسی خاموشی سے رات اپنے سفر پر ہے رواں
نرم جھونکوں میں رچی ہے، اوس کی ہلکی نمی

پُرسکوں نیندوں میں گم ہے جینے والوں کا جہاں
وہ ـــ جنھیں اوروں کے مرنے سے ملی ہے زندگی
وہ ـــ جنھیں اوروں کے مرنے سے ملی ہے زندگی

مختار صدیقی

منزلِ شب

پھر بھڑک اٹھی ہے ان دلدوز فریادوں کی آگ
نیند کے چڑھتے نشے میں جو ڈبوئی تھیں ابھی
دل کو برمانے لگی ہیں بے صدا سرگوشیاں
نیم بیداری کے رس میں جو سموئی تھیں ابھی
اب کہاں ہے راحتِ قربت کی مخموری کا رنگ
اور تم — میرے خمِ بازو میں سوئی تھیں ابھی

اور یہ سرگوشیاں کہتی ہیں — نکہت تھے وہ لوگ
کس جہنم کی خدائی، جن کی جنت میں ہیں اب
کتنے نستعلیق، کتنے خوبصورت تھے وہ لوگ
کن درندوں کی غلامی جن کی قسمت میں ہے اب
ان کی ہستی ان تمناؤں کی حِدّت میں ہے اب:
کاش وہ دن آئیں جب، انسان سمجھے جائیں ہم
یہ بہشتی سرزمیں جس دستِ قدرت میں ہے اب
کاش وہ دن آئیں جب اس کو فنا کر پائیں ہم
اپنی وادی کا اپنے کہساروں کو ہم اپنا ہیں ہم!

گہرے سنّاٹے لرزتے ہیں کہیں جھونکا کوئی
دم بخود پتّوں کو چونکاتا پھرا ہے ڈال ڈال
ہر رگ دوپے میں ہے ساری ، ایسا انجانا گداز
ڈوبتے دل کو ہوئی تاروں کی چشمک بھی وبال

اور یہ سرگوشیاں کہتی ہیں —— پہچانو انھیں
بے سبک سر ہیں، انھی روحوں کے بھٹکے قافلے
جن کو تم، منزل کے متوالوں نے چھوڑا راہ میں!
آ گئی منزل —— تو غیرت مندیوں کے حوصلے
تم میں اطمینان کی ہر سانس نے پیدا کئے ،
ورنہ جو بے بس ، تمہاری جان کا صدقہ بنیں
ان کی خاطر کیوں یہ تدبیروں کے لمبے سلسلے ؟
چاہتیں اُن کی ، یہاں آ کر ہی ، کیوں دعوئی بنیں؟
غیرتیں ، منزل نشیں ہو کر ہی کیوں سودا بنیں؟

بھیگی بھیگی رات میں ، تاروں کی نیچی ہے نگاہ
چاند چھپ جائے گا شاید ، روشنی کم کم ہوئی
اشک آنکھوں میں چھلکتے آ رہے ہیں اس طرح
میرے شانوں پر ترے بالوں کی ہر لٹ ، نم ہوئی!

اور یہ سرگوشیاں کہتی ہیں —— وہ باتیں گئیں!
شہر و صحرا ، خونِ ناحق سے رہیں گے لالہ گوں
زندگی بے مایہ ہے جتنیں گئیں ، مائیں گئیں !
آج اک عالم کو پاگل کر چکی ہے بوئے خوں
سروری کرنا ہے بے مقصد تباہی کا جنوں
نسلِ انسانی کی جیسے حسرتِ دل ہو یہی

علم و حکمت اس طرح ہیں اس کے آگے سرنگوں
جیسے ان صدیوں کی جانکاہی کا حاصل ہو یہی
آدمی کے ارتقار کی جیسے منزل ہو یہی !

ماند پڑ جائے گا تاروں کا یہ اُجلا پن ابھی
ہو چلی ہے خستہ ساماں ہلکی ہلکی چاندنی
شبنمی خنکی سے بوجھل ہوتی جاتی ہے صبا
دیکھتے ہی دیکھتے ، ہر شے سے ڈھلکی چاندنی

اور اب دل کی تڑپ کہتی ہے — یہ دنیا بھی کیا
کیسی بے نظمی سے ہوتی ہے یہاں جینے کی بات
ساز و ساماں چاہتا ہے موت کا سودا ہی کیا؟
بے گل و بے شمع کٹتی ہے یہاں ہستی کی رات
یہ سسکتی زندگی جیسے فنا کی ہو زکات
جس کے چھن جانے سے ہم جب تک جئیں ڈرتے رہیں
اس پہ یہ خطرہ کہ جب تک دن کے بعد آئے گی رات
ہم ہی آپس میں کہیں ماریں ، کہیں مرتے رہیں
جیتے جی یوں موت ہی کی چاکری کرتے رہیں

اب افق پر ہو چلا ، سہمی سپیدی کا ظہور
اور افق کے اس طرف ، اک دوسری دنیا کی شام
ڈوبتے تاروں کو بلوانے لگی اپنے حضور —

اور تم میرے خمِ بازو میں سوتی ہو ابھی
اور تم میرے خمِ بازو میں سوتی ہو ابھی

مختار صدیقی

برف باری کی ایک رات

(۱)

شام ہوتے ہی، بپھرنے لگا، یخ بستہ ہوا کا طوفان
اور پھر برف کی زرہوں میں چھپی وادیوں کہساروں پر
چھا گیا ہونکتی، غرّاتی ہواؤں کا جنوں

سربرآوردہ اٹل چوٹیاں مضبوط تناور دیودار
کانپ کانپ اٹھے ــ گرجتا ہواؤں کا یہ اندھا لشکر
اب کی یلغار میں کس کس کو کرے خوار و زبوں

(۲)

جانبِ غرب سے پھر اٹھی وہ مٹیالی غضبناک اکیلی بدلی
حاشیے پر کی چمکتی ہوئی جدول میں عجب شان کی وحشت خیزی

خوف سے ابر بھی طوفانی ہوا بھی سہمی
خوف سے ساری فضا گُنگ ہوئی!

چار سو چھا گیا بے پایاں خموشی کا فسوں
ہانپتی سرد ہواؤں میں گُھلے سناٹے
وادیاں، دامنِ کہسار، تناور دیودار
دم بخود ہو گئے، لہرا کے جو کوندے لپکے

(۳)

اور پھر کُہرے امنڈنے لگے اور برق ہوئی نعرہ زناں
آن کی آن میں چاندی کی سُبک تیلیاں سیماب کے نازک پارے
وادیوں چوٹیوں جھیلوں پہ گرے۔ گرتے رہے!
پھر ہر اک سمت یہی بانکی پھواریں، یہ جھیلی یہ روپہلی بارش
کُہرے سناٹوں کی مخموری گرمی میں یہ مرمرے تراشے تارے
ہانپتے جھونکوں کے شانوں سے اتر کر برسے
وادیوں چوٹیوں جھیلوں پہ گرے۔ گرتے رہے!

(۴)

صبح ہونے پہ تھی آن دیکھی تجلی کی ہر اک سمت منزّہ تابش
بے اماں عصمت و تقدیس میں انگڑائیاں لیتا ہوا حسن!

حکمراں چار سُو، بے پایاں جنوں خیز جمال!
خیرہ کُن، نورِ سماوات سے لبریز، جمال!!

مختار صدیقی

خیال درباری

اِن کے گانے میں ہے پر کاش ذرا دیکھو تو
ایک اک تان سے ہیں نور کے سوتے جاری
تین صدیوں کے شب و روز جلو میں لے کر
سیکری لائی ہے گمبھیر، سجل درباری:

بر در و بام ہیں ساونت مُغل کا پَرتو
ہے ستونوں کی نفاست سے عیاں سنگینی
اونچی محرابوں کے گھیرے میں کشادہ ایواں
جس نے بے باک ارادوں سے بلندی چھینی!

اسی ایوان میں ہے اکبرِ اعظم کا جلوس
سونے چاندی کے ستاروں سے چھنیں ہیں آکاس
اَن گنت جھاڑ، دہکتی ہوئی لاکھوں شمعیں
خلعتیں جن کی ہیں بلّور کے شفاف لباس

اہلِ دربار! خبردار نگاہیں نیچی!
ان صداؤں میں وہ ہیبت ہے کہ دل تھرّائے
ہاتھ باندھے ہیں حضوری میں امیرانِ کبیر
آئی آواز — کہ تشریف شہنشہ لائے
حضرتِ گیتی پنہ اکبرِ اعظم آئے!
کوئی نظریں نہ اٹھانے پائے!
اکبرِ اعظم آئے!!

استھائی :—

تُرکاں حجرتِ اکبر آیو!
آپ بلی، تپ بلی، دُنیا میں خدا کا سایہ
جن کا دم بھرتا ہے انسان، ملک، چوپایہ
ان کے ہم آپ نہ بل بل جیئے؟
مرنے جینے کا اگر ان سے بندھنوا باندھو
پار بیڑا ہو کہ ہے بیر ہمارا سانچو!
تُرکاں حجرتِ اکبر آیو! — حجرتِ اکبر آیو!!

انترہ :—

آلِ تیمور کے سورج کی تجلّی پھیلی
دُکھ دلدّر کے گھٹا ٹوپ اندھیرے بھاگے
وہ اجالا ہے کہ جگ جگ کے نصیبے جاگے
اے ری جگ جگ کے نصیبے جاگے!
دو جہاں مطلعِ انوار ہوئے ہیں — دیکھو
ترکاں حجرتِ اکبر آیو — حجرتِ اکبر آیو!!

پھیلاؤ :—

روشنی تیز ہوئی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی، فانوسوں کی
روشنی تیز ہوئی شمعوں کی، فانوسوں کی اور شب
کی دُلہن
روشنی تیز ہوئی، شمعوں کی، فانوسوں کی اور شب
کی دُلہن شرمائی
روشنی تیز ہوئی، شمعوں کی، فانوسوں کی، اور شب
کی دُلہن شرمائی، لجاکر سمٹی
روشنی تیز ہوئی، شمعوں کی، فانوسوں کی اور شب
کی دلہن شرمائی، لجاکر سمٹی، سمٹ کر بیٹھی
انہی شمعوں نے دیا چاند کا جھومر اس کو
دوجہاں مطلعِ انوار ہوئے، دیکھو تو
ترکماں حجرتِ اکبر آیو — حجرتِ اکبر آیو!!

جوت گانے کی بجھی، بیتے زمانے بھاگے
کھینچ لیں تین سو برسوں نے طنابیں اپنی
قصرِ ویراں میں کہیں بُوم کا نوحہ گونجا
سونپ دیں راگ نے اس نوحے کو خوابیں اپنی!

بیکراں رات سے محراب کی رفعت دُونی
اور میں سایۂ محراب میں ہوں افتادہ
خشک خندق سے اُدھر کوہِ گراں دیواریں
اب کہاں جاؤں کہ رہبر نہ نشانِ جادہ
کس خرابے میں مجھے چھوڑ گئی درباری؟!

مختار صدیقی

ایمن کا ایک اور روپ

اب تو بجھ جانے کو ہے شام کی جلتی کایا
بڑھتا آتا ہے دھندلکوں کا گداز بحور!
پھیلتے سایوں سے ٹکرا کے نگاہیں پلٹیں
اب کسے دیکھیں سیاہی ہیں کوئی پاس نہ دور
نیلے سُرمے کی اُمنڈ آئی ہے گہری چھایا
مٹتی لالی کو دھواں چھوڑ کے آہیں پلٹیں!

سر پہ رات آئی تو یوں گُنگ ہوئی مہتابی
دن ہی اس زیست کے نغموں کا خدا ہو گویا
اب وہ کھڑاگ فنا ہو گیا سناٹے میں
یوں مٹا ہے، کبھی پیدا نہ ہُوا ہو گویا!
اب کوئی ڈر، کوئی کھٹکا نہ رہے گا باقی
دن کا غماز، کہیں کھو گیا سناٹے ہیں

اب ہے کیا دیر؟ کوئی سوچ قدم کیوں روکے؟
کوئی بجرا کوئی کشتی نہیں پارِ دریا
ہم بے ہوش ہوئیں دن کی تھکن سے لہریں
سو چلا رات کی گودی میں فشارِ دریا
نیّا باندھو رے کنارِ دریا!
باندھو کنارِ دریا!

بہلاوہ:—

دیر کیا آؤ بھی نیّا باندھو
رات خود اوٹ ہے اب آؤ بھی نیّا باندھو
دیر کیا رات ہی خود اوٹ ہے اب آؤ بھی نیّا باندھو

دیر کیا آؤ بھی نیّا باندھو!

نیّا باندھو رے کنارِ دریا ـــــ باندھو کنارِ دریا!!

انترہ:ـــ

گر ہیں ہوتی وہ جواں بخت پرانا برگد

جس سے تم باندھتے دریا کے کنارے نیّا

یا تمہیں ہوتے سجن میرے گلے کی کنٹھی

میری بندی، میری آنکھوں کا رسیلا کجرا

شام کی راہ پہ ہر آہ نہ کہتی پھرتی۔

رازداں تیرگی ہوتی ہے کنارِ دریا

نیّا باندھو رے کنارِ دریا!

باندھو کنارِ دریا!

پھیلاؤ:ـــ

پیا آنے کو ہیں شمعیں کرو روشن، سکھی اٹھو میرے گہنے لاؤ

موتیوں سے مرے جوڑے کو سجاؤ، نئی راتیں ہیں نرالا چاؤ

بادصبا ان بیلے کی زرتار سکھی ساتھ مرے گندھواؤ

مانگ صندل سے بھرو، آؤ پہناؤ گجرے

اے سکھی آؤ پہناؤ گجرے

نیّا باندھو رے سجن اب تو کنارِ دریا!

باندھو کنارِ دریا!

دونوں وقت آن ملا کرتے ہیں دم بھر کے لئے

ورنہ دنیا کی یہی ریت ہے بچھڑے نہ ملیں

رات تو راگ کے بیراگ میں کٹ جائے گی

جاگ اُجالوں کے مگر اِن سے تو شاید نہ ملیں؟

نیّا جیون کی نہ آجائے کنارِ دریا؟!

مختار صدّیقی

غزل

جو جو صدمے ہم پر گزرے، کیسے ان کا بیان کریں
کون سا داغ نکال کے دل سے ثبت، سرِ دیوان کریں

ہم پر تہمت رکھیں، ان کے باب میں کوئی گمان کریں
یاں پہ فرشتے دخیل نہیں ہیں جو بھی کریں انسان کریں

آٹھ پہر آشفتہ خیالی کس کو بھلا خوش آتی ہے
جی مانے تو ہم بھی کچھ دل جمعی کا سامان کریں

ہم مجبور سدا سے رہے ہیں اپنے مزاج کی وحشت سے
کر پائیں تو دنیا داری ہم بھی ہر عنوان کریں

جب سے قفس کا گوشہ چھوٹا ایک ہی دُگدا رہتی ہے
جینا مشکل، مرنا مشکل، کیا مشکل آسان کریں

یار احباب نہ جانے کیوں ان روزوں ہم سے گریزاں ہیں
دشمن ہی اب حال پہ اپنے شاید کچھ احسان کریں

مختار صدیقی

غزل

رات کے بعد وہ صبح کہاں ہے دن کے بعد وہ شام کہاں
جو آشفتہ سری ہے مقدّر اس میں قیدِ مقام کہاں

بھیگی رات ہے، سونی گھڑیاں اب وہ جلوۂ عام کہاں
بندھن توڑ کے جاؤں لیکن اے دل، اے ناکام کہاں

اب وہ حسرتِ رسوا بن کر جزوِ حیات ہے برسوں سے
جس سے وحشت کرتے تھے تم، اب وہ خیالِ خام کہاں

دل زدگاں کے دور سے پہلے دنیا رستی بستی تھی
پھر کچھ چرچے ایسے پھیلے چین کیسے، آرام کہاں

کرنی کرتے راہیں تکتے ہم نے عمر گنوائی ہے
خوبیٔ قسمت ڈھونڈ کے ہاری ہم ایسے ناکام کہاں

اپنے حال کو جان کے ہم نے فقر کا دامن تھاما ہے
جن داموں یہ دنیا ملتی، اتنے ہمارے دام کہاں

خودنوشت

اخترالایمان

"..... اس آباد خرابے میں"

تیرھواں باب

میں زیؔویرولا سے منتقل ہوکر ہل ویو میں آگیا۔ یہ جگہ زیؔویرولا سے بہت دور نہیں تھی۔ اس لئے زیؔویرولا چھوڑا نہیں اُسے اپنی لائبریری بنالیا۔ مقصد یہ کہ سب لکھنے پڑھنے کا کام وہاں کرنے لگا۔ زندگی کی اس تگ و دو میں وقت کا اندازہ ہی نہیں رہا۔ ڈائری کھول کر دیکھی۔ پہلے صفحہ پر ۳ر نومبر ۴۹ء کی رات لکھی تھی۔ اور آج یکم جنوری ۶۶ء کی رات تھی۔ سترہ سال کی اس مدت میں جو اب ایک ثانیہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی تھی میرے حالات میں بہت سی تبدیلیاں اور آئی تھیں۔ اس وقت جب پچھلی ڈائری لکھی تھی میرے یہاں صرف ایک اولاد تھی، شہلا۔ اور آج میں تین لڑکیوں اور ایک لڑکے کا باپ ہوں۔ یہ بچے بھی اب بڑے ہورہے ہیں۔ شہلا سترھویں سال میں ہے۔ اس سے ایک برس چھوٹی اسمامہ ہے رامش اسمامہ سے چھ سال چھوٹا ہے اور رخشندہ رامش سے ڈیڑھ سال چھوٹی۔

میرے مالی اور معاشی حالات بھی پہلے کے مقابلے میں اطمینان بخش ہیں۔ اس سترہ سال کی مدت میں اس ملک میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں، اس کی تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ بس ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کلچر اور ثقافت کی وہ عظیم عمارت جس کے نیچے ہم بیٹھے تھے ایکدم ڈھے گئی۔

۱ر جنوری ۶۶ء

دن تمام ہوگیا۔ یوں بھی عام طور پر روز کوئی قابلِ ذکر بات نہیں ہوتی۔ میں آجکل اپنے حالات سے بہت غیر مطمئن ہوں اس کا سبب مالی پریشانی نہیں، اپنے ادبی کام سے غیر مطمئن ہوں۔ کبھی کبھی اپنے اوپر غصّہ اور جھنجھلاہٹ ہوتی ہے۔ آخر مجھ میں اتنی قناعت کیوں نہیں آئی۔ غربت اور فقیری میں دن گزار کر کوئی بڑا ادبی کام کرتا۔ پھر سوچتا ہوں اگر قناعت ہوتی تو شاید یہ شاعری بھی نہ ہو پاتی، جو اب تک میں نے کی ہے۔ حالانکہ میری نظر میں اس کی بھی کوئی بڑی اہمیت نہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے صحت بھی ناہموار رہتی ہے۔ ایک اضمحلال سا طاری رہتا ہے۔ یا شاید یہ اضمحلال اور بے دلی

ہے یہی اس سبب کہ زندگی کے رائیگاں اور عبث ہونے کا احساس طاری رہتا ہے۔ غرض کہ ذہن ایک جگہ نہیں ٹکتا۔ بڑا ادبی کام کیا ہے، یہ بھی تو نہیں معلوم۔ نہ اس کا کوئی واضح تصوّر ذہن میں ہے۔ اپنی کلاسیکی شاعری سے دور نہیں جانا چاہتا اور آج کی قدریں، تقاضے اور زندگی کا ہیولا ہی بدل گیا ہے۔ ۲ر جنوری ۶۷ء

آج ڈائری لکھنے کو بالکل جی نہیں چاہ رہا تھا مگر تہیّہ کر لیا تھا ۶۷ء میں باقاعدہ ڈائری لکھوں گا۔ اس لئے چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ شام کو بازار سے واپس آنے کے بعد ذہن پراگندہ ہو گیا۔ ایسے ہی موقعے ہیں، جب ازدواجی زندگی سے جی خواہ مخواہ اُچاٹ ہو جاتا ہے۔ سلطانہ بیڈمنٹن کھیلنے کے لئے واپس نیچے جانا چاہتی تھیں۔ میں "پتھر کے صنم" کے کچھ مناظر لکھنا چاہتا تھا۔ روپیہ کی ضرورت تھی۔ اس کھنچاؤ میں نہ کھیلنے جا سکے نہ کچھ لکھا گیا۔ مجھے حیرت ہے بیویاں اپنے شوہروں کی مشکلات کا اندازہ کیوں نہیں لگا سکتیں۔ اگر کبھی اس قسم کی بات زبان پر لاؤ تو وہ اپنا رونا لے بیٹھتی ہیں۔

صبح میں بہت صحت مند محسوس کر رہا تھا۔ لائبریری میں جا کر دوپہر تک کام کرتا رہا۔ اور "آدمی اور انسان" کے کچھ سین لکھے۔ ڈیڑھ بجے آ کر کھانا کھایا۔ کچھ دیر کے لئے لیٹ گیا اور آنکھ لگ گئی۔ چار بجے کے قریب اٹھا، نہایا، چائے پی اور سلطانہ کو لے کر بازار گیا۔ انھیں شہلا اور راسمار کے لئے کچھ دوپٹوں اور پاجاموں کا کپڑا خریدنا تھا۔ عید قریب آ رہی ہے۔ ۳ر جنوری ۶۷ء

وہ اضمحلال جس کا میں نے پچھلے صفحوں میں ذکر کیا ہے، میری ذات کا ایک حصّہ بنا ہوا ہے۔ اس طرح کی تھکن کا مجھے پہلے کبھی کوئی تجربہ نہیں ہوا تھا۔ جب لکھنے بیٹھتا ہوں کمر تختہ ہو جاتی ہے۔ ذہن پر ہر وقت ایک چڑچڑا پن سوار رہتا ہے۔ میں اس احساس کو اپنانا نہیں چاہتا مگر نہ جانے کیوں یہ بات ہر وقت دماغ پر سوار رہتی ہے کہ بیوی بچے بے حس ہیں۔ انھیں میری تنگ و دو کا ذرا بھی اندازہ نہیں۔ سوچتا ہوں مہاتما بدھ کی طرح دنیا چھوڑ کر چلا جاؤں۔ مگر مہاتما بدھ کے سامنے تو ایک آدرش تھا۔ کوئی الجھا ہوا مسئلہ یا کوئی لگن انسان اور انسان کی زندگی سے متعلق۔ میرے سامنے کیا ہے؟ کنواں کھودنا اور پانی پینا؟

میں ایک مدّت سے اس نتیجہ پر پہنچا ہوا ہوں مسائل جوں کے توں رہتے ہیں، آدمی مرتا کھپتا رہتا ہے۔ وقتی طور پر ان مسائل کا کوئی حل نکل آتا ہے مگر اس حل سے کچھ اور نئے مسائل پیدا ہو جاتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بڑا مقصد نہیں۔ یہ زمین محض اتفاقی اور حادثاتی ہے۔ اس زمین پر خیالات کا اور تصوّرات کا جو بھی ملغوبہ ہے وہ انسان کا پیدا کردہ ہے۔ وہ اپنی زندگی کو ایک مقصد دینا چاہتا ہے۔ اس لئے مسلسل اُدھیڑ بُن میں مصروف رہتا ہے۔ روٹی کی تلاش اور جنس کی لذّت کے حصول کے بعد اس کے پاس اور کچھ نہیں بچتا۔ اس لئے وہ روز نئے مسائل

اٹھاتا رہتا ہے اور خوش ہے کہ اپنی زندگی کا مقصد پورا کر رہا ہے۔

"سنتا ہوں بڑے شوق سے افسانۂ ہستی   کچھ خواب ہے کچھ اصل ہے کچھ طرزِ ادا ہے"

اصغر گونڈوی کا یہ شعر اچھا ہے بات کو سمجھانے کے لئے۔   ۴ر جنوری ۷۶ء

آج مجھ پر بڑی جھنجھلاہٹ اور غصّہ سوار رہا۔ جب اسٹوڈیو سے روانہ ہوا اپنی موٹر پر غصّہ آتا رہا۔ اس کے بعد موٹر کے کاریگر سجّاد پر غصّہ آتا رہا۔ جب گاڑی لے جاتا ہے پٹرول نکال لیتا ہے۔ گھر پہنچا تو گڈّو پر غصّہ آتا رہا۔ مٹھائی کھائے جاتا ہے اور ڈاڑھ کے درد کی شکایت کرتا رہتا ہے۔ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نہیں ملا۔ واپسی میں اُسے درزی کے یہاں لے گیا مگر اُس نے حسبِ وعدہ پتلون نہیں بنائی تھی۔ اسی خفگی میں گھر پہنچا تو پتہ چلا ٹیلی فون خراب ہے۔ شہلا نے کہا کسی کا فون تھا" بل نہیں دیا، تمہارا فون کٹ جائے گا۔" ٹیلی فون پر غصّہ آتا رہا۔ سونے جا رہا تھا کہ اپنے کتّے پونچی پر غصّہ آتا رہا۔ جنگلی کتّوں کی سی عادتیں اس کے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ آخر میں جب جائزہ لیا تو محسوس ہوا کہ یہ غصّہ مجھے اپنے اوپر تھا۔ کوئی بھی چیز میرے قبضے میں نہیں۔   ۶ر جنوری ۷۶ء

رات تین بجے آنکھ کھل گئی تھی۔ دن بھر طبیعت مکدّر رہی۔ ٹیلیفون کے سلسلے میں بھی پریشان تھا۔ آخر میں پڑوس کے لڑکے نیتی کو اس کام کے لئے بھیجا اور شام تک فون چلنے لگا۔ چھوٹی چھوٹی چیزیں مجھے کتنا پریشان کرتی ہیں کبھی کبھی۔ شام کو علی سردار جعفری آگئے تھے۔ اس کے بعد باقر مہدی، قاضی سلیم اور ندا فاضلی آگئے۔ اِدھر اُدھر کی باتوں اور شاعروں ادیبوں کے لطیفے سننے میں تھوڑا وقت گزر گیا۔ ندا ہمیشہ ایسے قصّے بنا کر لاتا ہے۔

۷ر جنوری ۷۶ء

میں اس وقت بہت غمگین ہوں۔ ڈاکٹر ژواگو کا وہ حصّہ پڑھ رہا ہوں جہاں حرکتِ قلب بند ہو جانے سے اچانک اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اور اُسے اٹھا کر کمرے سے باہر لایا جاتا ہے۔ وہاں اچانک لارا آتی ہے اور اُن لمحات کے بارے میں سوچ کر روتی ہے جو اُس نے ژواگو کے ساتھ گزارے تھے۔ مُجھ یادوں اور حسرتوں کے انسان کے پاس رہ کیا جاتا ہے۔ ماضی جہاں تسکین بخش ہے، وہاں خوفناک بھی ہے۔ ایک عفریت کی طرح زمین آسمان کے بیچ کھڑا ہنستا رہتا ہے۔ اس لئے کہ وہ زندگی اور موت دونوں کی حدود سے باہر ہے۔

آج بھی روز کی طرح صبح ٹہلنے گیا اور روزمرّہ کے معمولات پورے کئے۔ چائے پی، داڑھی بنائی اور کام میں لگ گیا۔   ۲۶ر جنوری ۷۶ء

اس وقت رات کا ایک بج رہا ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے بیٹے نریندر سنگھ کا ولیمہ تھا۔ میں آج کل پیتا نہیں

اس لئے بہت دیر کسی پارٹی میں نہیں ٹھہرتا۔ مگر بیدی کی وجہ سے بیٹھا رہا۔ پرتھوی راج میرے پاس ہی بیٹھے تھے۔ فلمی زندگی کے پرانے قصّے سناتے رہے۔ کجّن بائی کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ سن اینڈ سینڈ ہوٹل میں دعوت تھی۔ پینے کے بعد کچھ لوگوں میں جھگڑا ہوگیا۔ میں اٹھ کر چلا آیا۔

۲۸ر جنوری ۶۷ء

کل رات دیر سے سویا تھا۔ صبح سیر کو نہیں جا سکا۔ اُتّم کمار کے یہاں جانا تھا۔ پرکاش اور مجید خان انھیں لے کر ایک فلم بنانا چاہتے ہیں۔ واپسی پر احمد عبّاس سے ملنے چلنے گیا۔ چند روز پہلے جس ٹیکسی میں وہ جا رہے تھے اُس کا حادثہ ہوگیا تھا۔ ڈرائیور مر گیا تھا اور عبّاس کی کئی پسلیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ ابھی تک بستر سے لگے ہوئے ہیں۔

آج کی سیاست اور ملک کی حالت کو دیکھتے ہوئے مجھے ہیچ سن کی کتاب "ایمپائر آف نابز"[1] کا خیال آگیا۔ ہیچ سن نے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کا تجزیہ کرتے ہوئے اس کتاب میں لکھا ہے کہ وہ بچولئے اور دلال جن کے ہاتھوں ہندوستان کا کچّا مال انگریزوں کے کارخانوں کو زندہ رکھنے کے لئے جاتا تھا اور وہاں سے تیّار مال کی شکل میں واپس آتا تھا، انھیں اُس منافع کا اندازہ ہوگیا تھا جو برطانوی سرمایہ دار اور کارخانہ دار کماتے تھے۔ انھیں خیال آیا یہ منافع انگریزوں کیوں ملے، ہمارے پاس کیوں نہ آئے۔ اور انھوں نے "ہوم رول" کی تحریک شروع کر دی۔ اور جب تحریک کامیاب ہوئی اور ہندوستان آزاد ہوا تو سب کچھ ان ہی دلالوں کو ملا۔ عوام جیسے تھے ویسے ہی رہ گئے۔

۲۹ر جنوری ۶۷ء

کل رات دیر سے سویا تھا مگر صبح وقت پر اُٹھ گیا۔ ٹہلنے گیا۔ چائے پی اور ضروریات سے فارغ ہو کر نیچے ناصر حسین کے دفتر میں گیا۔ اس لئے کہ نو بجے ناصر حسین کے دفتر میں راجندر سنگھ بیدی، ناصر حسین، سردار جعفری، آرزو اور صدّیقی آنے والے تھے۔ سلسلہ یہ تھا کہ بہار کی اردو اکادمی نے الیکشن میں اردو کے نام پر کچھ نمائندے کھڑے کئے تھے۔ اس کے لئے فلم انڈسٹری کے لوگوں سے چندہ اکٹھا کرنا تھا۔ میں نیچے پہنچا تو بیدی کے علاوہ سب آچکے تھے۔ میں نے اوپر شہلا کو فون کیا چائے بنالے اور سب اُٹھ کر میرے یہاں آگئے۔ ابھی چائے سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ راجندر سنگھ بیدی آگئے اور سب مل کر چندے کے لئے نکلے۔ پہلے دلیپ کمار کے یہاں گئے۔ وہ کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ نسیم بانو نے دو سو روپے دئے۔ پھر آر۔ کے۔ نیّر اور سادھنا کے یہاں گئے۔ انھوں نے روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ وہاں سے سنیل دت کے مکان پر گئے۔ وہ مدراس شوٹنگ کے لئے گئے ہوئے تھے۔ نرگس ملیں۔ انھوں نے بھی وعدہ کیا۔ وہاں سے ایس۔ مکرجی کے یہاں گئے۔ وہ تھے نہیں۔ پھر گوتم

---

[1] "EMPIRE OF NABABS"

کے یہاں گئے۔ انھوں نے روپیہ دینے کے بجائے بحث شروع کردی۔ کہنے لگے وہ اس کے قائل نہیں۔ اردو سے زیادہ اہم مسائل ملک کے سامنے ہیں۔ میں نے کہا یہ تصوّر کہ سارے ملک کی ایک ہی زبان ہو، مہاجنی روتہ ہے۔ اس ملک میں جتنی زبانیں بولی جاتی ہیں وہ سب ہندوستان کی زبانیں ہیں۔ کسی کو اس بات کا حق نہیں پہنچتا کہ ایک زبان کو دوسری زبان پر فوقیت دے۔ گوئل تھوڑے ٹھنڈے پڑے مگر روپیہ نہیں دیا۔ وہاں سے ہم اوم پرکاش کے یہاں گئے۔ وہ شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ پھر ستود مکرجی کے یہاں گئے۔ انھوں نے سو روپے دئے۔ اس کے بعد بی۔ آر۔ چوپڑہ کے یہاں گئے۔ وہ پوجا میں مصروف تھے۔ فارغ ہو کر آئے تو روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ کتنا؟ یہ کل معلوم ہوگا۔ وہاں سے میں نے میوزک ڈائرکٹر روی کو فون کیا۔ انھوں نے پانچسو روپے دینے کا وعدہ کیا۔ وہاں سے نکل کر میں نے سردار، آرزو اور صدّیق کو کرشن چندر کے مکان پر چھوڑا اور میں گھر آگیا۔ شہلا کو ڈرامہ دیکھنے کے لئے نیشنل کالج جانا تھا۔ اُسے وہاں چھوڑا۔ اس کے بعد رضیہ اور تصدیق آگئے۔ وہ آٹھ بجے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد کالج سے شہلا کو واپس لایا۔ اب کھانا کھا کر تھوڑی دیر ڈاکٹر رفیق زکریا کی لکھی ہوئی کتاب "رضیہ بیگم" ختم کی اور سو گیا۔

۵ر فروری ۶۷ء

پونے بارہ بج رہے ہیں۔ پچھلے کچھ دنوں سے شام لال بمبئی آئے ہوئے ہیں۔ وہ ابھی تک "ٹائمز آف انڈیا" کے ساتھ ہیں۔ ایڈیٹر ہیں۔ میں مصروفیت کے سبب مل نہیں سکا تھا۔ آج انھیں، باقر مہدی اور راجندر سنگھ بیدی کو مل بیٹھنے کے لئے بلایا تھا۔ ابھی ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔

آج دن میں بھی مصروفیت اس فلم "آدمی اور انسان" کے جو مکالمے لکھے تھے آج ان پر ردو قدح ہوئی۔ کل پھر نشست ہے۔

۶ر فروری ۶۷ء

آج حسبِ معمول اٹھا۔ چائے پی اور اپنے کتے پوّمی کو نیچے ٹہلانے لے گیا۔ اور واپس آکر کام پر چلا گیا۔ آج کل شام کو شراب پینی چھوڑ دی ہے۔ اس کی جگہ پڑھتا ہوں۔ پچھلے دنوں لوئی آراگاں کی کتاب "جادۂ تقدیر کے مناظر" لے کر آیا تھا، وہ پڑھ رہا ہوں۔ پلازا سینما میں کوئی تصویر لگی ہوئی ہے۔ سلطانہ بیدی کی لڑکی کے ساتھ دیکھنے گئی تھیں۔ انھیں چھوڑ کر آیا تھا، اب لے کر آیا ہوں۔ آجکل رات کو اکثر کھانا ہی نہیں کھاتا۔ چائے پی کر سو جاتا ہوں۔

۸ر فروری ۶۷ء

صبح حسبِ معمول اٹھا۔ سیر سے واپس آکر پوّمی کو نیچے لے گیا۔ واپس آیا تو چائے تیار تھی۔ پی کر داڑھی بنائی اور گڈّو، رخشندہ اور اسامہ کو اسکول چھوڑا۔ آج شہلا نہیں گئی۔ ساڑھے نو بجے نکل گیا۔ خانصاحب کی طرف

گیا۔ اِنکم ٹیکس کے سلسلے میں کچھ رقموں کا حساب نہیں مل رہا تھا۔ وہاں سے بی۔ آر۔ چوپڑہ کے یہاں گیا اور کہانی پر کام کیا۔ اور "آدمی اور انسان" کے مکالمے پڑھے۔ آج اختر مرزا نہیں آئے تھے۔ ایک بجے کام ختم ہوگیا۔ وہیں کھانا کھایا اور دفتر چلا گیا۔ آج ۱۰ر تاریخ تھی۔ تنخواہ نہیں تھی۔ مجھے بارہ سو روپے مہینہ ملتا تھا۔ اس مہینے چوپڑہ صاحب نے دو ہزار روپے مہینہ کر دینے کا وعدہ کیا تھا۔ میں نے انھیں گاڑی میں یاد دلایا۔ انھوں نے ہچر مچر کی۔ میں بددل ہوگیا اور دفتر آکر بیشتر وقت خاموش رہا۔ فلم ایڈیٹر پران آیا اس کے ساتھ جاکر ایڈیٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد چوپڑہ آئے اور کہنے لگے انھوں نے میری تنخواہ بڑھا دی ہے۔ شاستری کو ہدایت دیدی گئی ہے۔ روپیہ میں نے لے لیا مگر جی خوش نہیں ہوا۔ جس کام میں نفاست کو ملحوظ خاطر رکھا جائے گراں گزرتا ہے۔ واپس گھر آیا۔ سلطانہ کو مہینہ کا سامان خریدنا تھا۔ انھیں لے کر بازار گیا۔ واپس آیا تو یونیورسٹی کے ایک صاحبزادے بھیشم کمار آئے ہوئے تھے۔ وہ مجھے اپنی ایک نشست کا صدر بنانا چاہتے تھے۔ میں نے اُن سے پوچھا اپنے جلسے میں انھوں نے اور کسی کو بُلایا ہے۔ انھوں نے کہا قمر جلال آبادی اور شکیلہ بانو بھوپالی۔ مجھے احساس ہوا اِس جلسے کا کوئی ادبی مقصد نہیں۔ میں نے معذرت کی اور انھیں ٹال دیا۔ ۱۰ر فروری ۶۷ء

اوپر میں نے اپنی ڈائری کے کچھ صفحات اس لئے نقل کر دئے کہ میری نجی اور کاروباری زندگی کی ایک جھلک مل جائے۔ اس زمانے میں فلم کا کام بھی میں نے بہت کیا اور ادبی کام بھی۔ میرے ان دو مشغلوں میں ٹکراؤ بھی پیدا نہیں ہوا۔ عام طور پر جو شاعر فلم کی زندگی اختیار کرتے ہیں وہ گانے لکھتے ہیں۔ میں نے بہت آغاز میں طے کر لیا تھا کہ میں فلموں کے لئے گانے نہیں لکھوں گا۔ جوشؔ کہا کرتے تھے اگر شاعر فلم کے لئے گانے لکھنے لگے تو اس کی شاعری کا معیار پچاس فی صد گر جاتا ہے۔ میرے ذہن میں ایسا کوئی تصور نہیں تھا۔ میں شاعری کو شاعری کی جگہ رکھنا چاہتا تھا اور مکالمہ نگاری کو پیشہ بنانا چاہتا تھا۔ اور میں نے وہی کیا۔ فلم کی زندگی کو گرم رکھنے کے لئے میں نے باہر کی فلمیں بھی لکھیں اور مستقل طور پر بی۔ آر۔ فلمز سے بھی متعلق ہوگیا۔ ایسا ہی کوئی سلسلہ میں ادبی کام کے لئے بھی کرنا چاہتا تھا۔ میراؔجی بھی میرے ذہن میں تھے۔ اس لئے کہ بمبئی آنے کے بعد سے وہ مستقل میری ذمہ داری بن گئے تھے۔ میرے ایک دوست تھے شام کشن نگم۔ میں انھیں دلّی سے جانتا تھا۔ جن دنوں میں بارہ دری شیر افگن خاں میں رہتا تھا وہ پڑوس کی گلی میں رہتے تھے۔ انھوں نے بمبئی میں آکر پریس کا کام شروع کیا۔ میری اُن سے یہاں بھی ملاقات ہوتی تھی۔ میراؔجی کو مصروف رکھنے کے لئے میں ان کے تعاون اور شرکت میں "خیال" نام کا ایک ماہنامہ نکالا۔ اور میراؔجی کو اس کا مدیر بنا دیا۔ مشاورتی کمیٹی میں ظ۔ انصاری اور مدھوسودن بھی تھے۔

وہ پرچہ غالباً ترقی پسند حلقے کو خطرے کی گھنٹی محسوس ہوا۔ حیدرآباد کانفرنس میں ترقی پسند میرآجی کو رجعت پسند کے خطاب سے نواز چکے تھے اور ان کے ساتھ ہر ادبی تعاون سے بچتے تھے۔ بمبئی آنے سے پہلے حلقۂ ارباب ذوق کے نام سے میرآجی ایک کامیاب ادبی مہم چلا چکے تھے۔ ایک طرح سے حلقۂ اربابِ ذوق اور ترقی پسند ایک دوسرے کے مدّمقابل تھے۔ ادب کی طرف حلقہ کے لوگوں کا رویّہ کیا تھا اور ترقی پسندوں کا کیا، یہ میں مختصراً پچھلے صفحات میں بتا چکا ہوں۔ مگر دراصل ایسا تھا نہیں۔ یہ صرف ترقی پسند حلقے والوں کا خیال بلکہ وہم تھا۔ "خیال" کے مشکل سے چھ پرچے نکلے ہوں گے کہ انھوں نے اس کے خلاف ایک محاذ بنا لیا اور رضا بوصدّیق انسٹی ٹیوٹ میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا جس میں مجھے بطور مجرم کے بلایا۔ میں جانے سے انکار بھی کر سکتا تھا مگر نہیں کیا۔ اس میں سردار جعفری پیش پیش تھے۔ انھوں نے بڑی دبنگ آواز میں پوچھا میں نے میرآجی کو "خیال" کا ایڈیٹر کیوں بنایا۔ میں نے اُن سے بالکل سیدھے سادے لفظوں میں پوچھا آپ صاحبان کون ہیں؟ پرچہ میرا، روپیہ میرا، ادارہ میرا، نظم و نسق میرا۔ آپ یہ سوال کس حیثیت سے کر رہے ہیں؟ مقصد یہ کہ وہ مہم ٹیں ٹیں فش ہو کر رہ گئی۔ چھ پرچے نکالنے کے بعد میرآجی کا انتقال ہو گیا۔ اور اپنی فلمی زندگی کے سبب میں بھی "خیال" کو زندہ نہیں رکھ سکا۔ میرے ساتھ بڑا مسئلہ یہ تھا کہ جہاں میں ترقی پسندی کے خلاف نہیں تھا اُس نعرے سے بھی بچنا چاہتا تھا جو اُس وقت کے بیشتر لکھنے والے ادب کے نام پر لگا رہے تھے۔ میرے خیال کے مطابق وہ اپنی بات کہنے کا بہتر طریقہ نہیں تھا۔ مثبت اور ترقی پسند دونوں زاویوں کو ذہن میں رکھ کر میں نے شاعری کرنے کی کوشش کی اور اُس پر آج تک قائم ہوں۔ اچھی بات کہنے کا ایک ہی طریقہ نہیں ہوتا، یہ میرا ایمان ہے اور لٹھ مار وبات دھماکا تو پیدا کر سکتی ہے مؤثر نہیں ہوتی۔ بیشتر ترقی پسند جاگیردار اور بورژوا طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ اور اپنے ادب میں وہی قدریں لے کر آئے جنھیں وہ آگے بڑھانا چاہتے تھے۔ مگر اُن قدروں کے اور اُن جذبات کے پاؤں نہیں تھے۔ ان لکھنے والوں نے مقبول ہونے کے لئے سب کچھ کیا مگر اپنے آپ کو ڈی۔ کلاس نہیں کیا۔ میرے اُن کے اس رویّے نے کبھی جھگڑے کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ بس اپنی تنقیدوں اور تحریروں میں یہ میرا ذکر نہیں کرتے تھے۔ مگر سب کے ساتھ میرے مراسم اُسی طرح قائم تھے۔ ایک روز سردار جعفری کا ٹیلیفون آیا بیروت میں افریقی ایشیائی ممالک کے نمائندوں کی کانفرنس ہو رہی ہے، تم بھی جا رہے ہو۔ دعوت نامہ ایک دو روز میں مل جائے گا، تیاری کر لو۔ تیاری کیا کرنی تھی۔ جلدی جلدی ایک دو بند گلے کے کوٹ سلوائے۔ ایک دو پتلونیں بنائیں۔ سفر کے کاغذات کا جائزہ لیا۔ اس سلسلے میں ایک دو بار دلّی بھی جانا پڑا۔ جن ملکوں کے ویزا مل سکے وہ حاصل کئے اور بیروت کے لئے روانہ ہو گیا۔

۲۴ مارچ ۱۹۶۷ء

رات کے نو بج رہے ہیں۔ صبح بمبئی سے ۷ بجے کے قریب بیروت کے لئے روانہ ہوا تھا۔ ڈھائی بجے بیروت پہنچا۔ کھانا جہاز میں کھایا۔ آتے ہی کانفرنس میں چلے گئے۔ ابھی ابھی واپس آئے ہیں۔ اب نیند آرہی ہے۔

۲۵ مارچ ۱۹۶۷ء

رات اتنی دیر سے پلٹ کر آتے ہی سو گئے۔ آج کا سارا دن بس میں بیٹھے بیٹھے گزر گیا۔ یہاں رومیوں کی بنائی ہوئی کوئی جگہ ہے جسے "بال بیک" کہتے ہیں۔ صبح وہاں جانے کا پروگرام تھا مگر برف پڑنے لگی اور راستہ بند ہو گیا۔ دوپہر کا کھانا کمال جملات کے مکان پر مختارا میں تھا۔ یہ دروز قبیلے کے پیشوا ہیں۔ یہ سوشلزم کے بہت حامی ہیں اور یہاں کے رہنما اور جنرل سکریٹری ہیں۔ دیر حمر تک پہنچے تھے کہ برف پڑنے لگی۔ راستہ میں ایک پرانا قلعہ تھا وہ بھی نہیں دیکھ سکے۔ مختارا پہنچتے پہنچتے ساڑھے تین بج گئے۔ کمال جملات نے معافی چاہی۔ موسم خراب ہونے کی وجہ سے ہم وہاں کا پورا لطف نہیں اٹھا سکے۔ سجاد ظہیر نے ہندوستان کے ایک اچھے شاعر کی حیثیت سے جملات سے میرا تعارف کرایا اور ہم دونوں نے ان کے ساتھ تصویریں کھنچوائیں۔ جملات نے معذرت کی اگر موسم اچھا ہوتا تو وہ ہمیں وہاں کے لوک گیت سنواتے۔

کانٹی نینٹل ہوٹل سے مختارا کو جو راستہ جاتا ہے بہت خوبصورت ہے۔ راستہ سمندر کے ساتھ ساتھ بنا ہوا ہے۔ بیروت اور گرد و نواح کی تعریف میں یہ کہانی کافی ہے۔ جب حضرت عمرؓ کی فوجوں نے لبنان پر حملہ کیا تو فتح کے بعد بہت سے فوجی وہیں ٹِک گئے۔ کہنے لگے رسولؐ نے ہم سے جنّت کا وعدہ کیا تھا جہاں حسین عورتیں ہوں گی اور نہریں ہوں گی۔ ہمیں وہ جنّت یہیں مل گئی۔ اب کہیں نہیں جائیں گے۔ بیبلوس ایک پرانا شہر ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے یہ دنیا کا سب سے پرانا آباد شہر ہے۔ وہاں ایک کتبہ ملا ہے جسے میں نے ابھی دیکھا نہیں یہاں کے عجائب گھر میں رکھا ہے۔ اس کے بارے میں خیال ہے کہ اس پر جو حروف کندہ ہیں ان سے موجودہ ابجد اور حروفِ تہجی کا آغاز ہوا ہے۔ بائبل کا لفظ بھی اسی کا مرہونِ منّت ہے۔ یہاں ایک طرح کا کاغذ بنا کرتا تھا جس پر پہلی بار بائبل لکھی گئی تھی۔ بستی کے نام کی مناسبت سے کتاب کا نام بائبل پڑ گیا۔

واپس آنے کے بعد کچھ دیر اپنے کو گرم کرتے رہے۔ ساڑھے نو بجے روسی نمائندوں سے ملنے گئے۔ عظیم زناف اس کے پیشوا ہیں۔ ترسون زادہ درست راست۔

۲۷ مارچ ۱۹۶۷ء

کل کا دن ٹھیک سے شروع نہیں ہوا۔ جب سے یہاں آیا ہوں صبح کی سیر نہیں ہو رہی۔ ساڑھے نو بجے کے قریب انٹرنیشنل ہوٹل گئے۔ جلسہ وہیں ہوتا ہے۔ دوپہر کا کھانا کھا کر پھر جلسہ میں چلے گئے۔ رات کو کیسنو کا

پروگرام تھا۔ سب کھانا کھانے کی تیاری کر رہے تھے کہ کلیم اللہ اور ڈاکٹر ملک راج آنند میں جھڑپ ہوگئی کلیم اللہ افریقی ایشیائی انجمن کے یہاں مستقل نمائندہ تھے۔ انھوں نے کہیں کہہ دیا کہ کام ہم کرتے ہیں، نام دوسروں کا ہوتا ہے۔ ملک راج اس بات پر خفا ہو گئے اور دونوں میں کافی دیر تکرار ہوئی۔ دن کا پروگرام یہ تھا کہ ہر ملک کا نمائندہ اپنے ملک کے مسائل کی ایک رپورٹ تیار کر کے لایا تھا۔ ہندوستان کی طرف سے یہ کام ڈاکٹر آنند اور سجاد ظہیر نے بچن کے سپرد کر دیا تھا۔ اس رپورٹ میں وہاں کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی کاموں کی پوری تفصیل ہوتی تھی۔ بچن نے جو رپورٹ کے طور پر لکھا اس نے کسی پر کوئی اثر نہیں چھوڑا۔ اس میں ہندوستان کے سیاسی، معاشی اور ثقافتی مسائل کا بھی کوئی ذکر نہیں تھا۔ دوسرے جن ملکوں کی مذمت اور افریقی ایشیائی لوگوں کے کاموں اور جدوجہد کی جو تعریف کرنی چاہیئے تھی اس کا کہیں دور دور پتہ نہیں تھا۔ ویت نام کی لڑائی کا جن لفظوں میں ذکر کرنا چاہیئے تھا وہ سرے سے غائب تھا۔ شاید انگریزوں کے خیال سے۔ مزید براں تقریر ہندی میں تھی جس کا ترجمہ ملک راج نے انگریزی میں کیا تھا اور وہ ترجمہ اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔ جب بچن نے اپنی تقریر پڑھی وہ بھی پاس آکر کھڑے ہو گئے اور ہندی کے ساتھ انگریزی میں پڑھنے لگے اور بڑا خلط مبحث ہوا۔

رات کو کیسنو گئے۔ وہاں اسکرین اور اسٹیج کو اس خوبصورتی سے ملایا ہوا تھا کہ بیک وقت اسکرین اور اسٹیج کا لطف آتا تھا۔ منظر اس بدلتے تھے جیسے اسکرین پر بدلتے ہیں۔ غرض جس طرح بھی جو پیش کیا جا رہا تھا بہت ہی قابلِ تعریف تھا۔ مناظر اور ان کی پیش کش کے علاوہ ایک چھ گھوڑوں کی بگھی بھی تھی جو اسٹیج پر اسی رفتار سے دوڑائی گئی تھی جس طرح اسکرین پر دکھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ اور بہت آئیٹم تھے۔ خاص طور پر ننگی اور نیم برہنہ لڑکیاں جن کے جسم بہت خوبصورت تھے مگر کراہت کا کہیں احساس نہیں ہوتا تھا۔

کیسنو سے بیروت شہر کا منظر بہت اچھا ہے۔ بڑا لبھانے والا۔ ۲۹ مارچ ۱۹۶۷ء (صبح)

کل کا سارا دن انتظامیہ کمیٹی کی نذر ہوگیا۔ جتنے نمائندے آئے تھے وہ تین کمیٹیوں میں تقسیم ہوگئے تھے۔ ایک وہ جو ایشیائی افریقی انجمن کو چلانے کے لئے جو قرارداد پیش ہوں گی انھیں عمل میں لانے کے لئے لائحہ عمل پیش کرے گی۔ دوسری اس کے نکلنے والے جریدے اور کتب خانہ کے قیام پر کام کرے گی۔ اس کتب خانے اور جریدے کا یہ کام ہوگا کہ بچھڑی ہوئی اقوام جیسے گھانا اور کینیا اور اس کے آس پاس کے دوسرے علاقوں کے لوگوں کے ادب کو منظرِ عام پر لائے گی اور ان کی اشاعت کرے گی۔ تیسری کمیٹی اس کے ثقافتی پہلوؤں اور ان کی افزائش و ترقی میں ہاتھ بٹائے گی۔ میں اس تیسری کمیٹی میں تھا۔ آٹھ بجے افتتاحی کو

اپنی نظمیں سنانے والے تھے۔ وہاں چلا گیا۔ اَفتوکشنیکو سے ملا بھی اور نظمیں بھی سنیں۔ نظموں کے ترجمے عربی میں تھے۔ نظمیں انھوں نے اپنی زبان میں پڑھیں۔ میرے لئے دونوں کا سمجھنا مشکل تھا۔ بیچ سے اُٹھ کر چلا آیا اور سو گیا۔ صبح براگ سِجی نے بتایا رات ہندوستانی سفارت خانے کے کچھ لوگ آئے تھے۔ انھوں نے کوئی مشاعرہ منعقد کیا تھا۔ پہلے بجّن کو ڈھونڈتے رہے۔ بجّن نہیں ملے تو مجھے تلاش کرنے لگے۔ میں سو گیا تھا۔ پھر معلوم نہیں کیا ہوا۔ ۲۹ مارچ ۶۷ء (صبح)

اس وقت رات کے ساڑھے دس بج رہے ہیں۔ ابھی ابھی روسی سفارت خانے سے واپس آئے ہیں۔ کاک ٹیل پارٹی تھی۔ میں نے بھی دو گلاس شربت کے پئے۔ صبح ہندوستانی سفارت خانے میں جاکر پاسپورٹ میں روس، شام انگلینڈ، روم، فرانس اور جرمنی وغیرہ کا اندراج اور اضافہ کرایا۔ ایک مہینہ کی مدت اور بڑھوائی۔ بڑا اسکون ملا۔ ایک ہفتہ ماسکو اور لینن گراڈ کی سیر کرنے کے بعد لندن جاؤں گا۔ میں کاک ٹیل پارٹی میں دوسرے نمائندوں سے اِس موضوع پر باتیں کرتا رہا کہ سیاست اپنی جگہ، اس ادیبوں اور شاعروں کی کانفرنس میں کوئی دوسری بات کیوں نہیں ہوتی۔ کسی بھی ملک کے ادیب نے نہ اپنی کہانی سنائی نہ نظمیں سنائی گئیں۔ یہ کوئی ادیبوں کا اجتماع نہیں کہلایا جاسکتا افریقی ایشیائی مسائل پر تو پہلی دو نشستوں میں کافی کچھ کہہ سُن لیا گیا تھا۔ پھر اس اجتماع کا مقصد کیا تھا۔ کچھ نمائندوں نے میری بات سے اتفاق کیا۔ ۲۹ مارچ ۱۹۶۷ء (رات)

صبح دمشق چلا گیا تھا۔ اب واپس آیا ہوں۔ وہاں ایک دعوت کھائی۔ دُنبے کے شکم میں چاول اور میوہ بھر کے اسے دم پخت کیا ہوا تھا۔ تیار ہونے کے بعد دُنبے کو لٹکا دیا گیا تھا اور کھانے والے اسی میں سے نکال نکال کر کھا رہے تھے۔ اس کے بعد شہر کی سیر کو چلے گئے۔ کچھ تاریخی عمارتیں دیکھیں۔ اب تفصیل یاد نہیں رہی۔ دمشق کے بازار پر مجھے دلّی کے چوک کا دھوکہ ہوا۔ ماحول اور فضا کم و بیش ویسی ہی تھی۔ لوگ پانی کے مشکیزے کاندھوں پر لٹکائے کٹورے بجا بجا کر شربت بیچ رہے تھے۔ میرا خیال ہے ہندوستان والوں نے کٹورے بجانے کی یہ رسم عربوں سے لی ہے۔ دلّی تو ایک زمانے میں عربوں، ترکوں اور مغلوں کا بڑا گڑھ رہا ہے۔ بعد میں اُن پناہ گزینوں کا کیمپ دیکھنے گئے جنھیں فلسطین سے نکال دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے بہت بُری حالت میں ہیں۔ کیمپ کیچڑ میں لگے ہوئے ہیں۔ مگر مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر تعجب یوں نہیں ہوا کہ بمبئی اور دوسرے بڑے بڑے شہروں میں ہندوستان کے غریب لوگ اپنی مرضی سے ایسی گندی جگہوں میں رہتے ہیں۔

ملک راج بڑے زندہ دل آدمی ہیں۔ ہر نئی لڑکی سے اپنا تعارف کرانے کے بعد فوراً اپنی تخلیقات کا ذکر کرنے لگتے ہیں۔ سجّاد ظہیر کہہ رہے تھے دنیا کے ہر بڑے شہر میں ان کی ایک محبوبہ ہے اور ایک ناشر بھی۔ ۳۰ مارچ ۱۹۶۷ء

کل بیروت سے دمشق جاتے ہوئے جو چاروں طرف کے پہاڑ، برف سے ڈھکے ہوئے، راستہ میں دیکھے وہ ابھی تک آنکھوں میں پھر رہے ہیں۔ ایسا لگتا تھا بے برگ وگیاہ پہاڑوں کے اوپر برف منڈھ دی گئی ہو۔ بیروت سے نکلنے کے چند میل بعد، شام تک پوری وادی برف کی بنی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ یہاں کے لوگ کہہ رہے تھے اس سال یہاں معمول سے زیادہ برف پڑی ہے۔

آج کا دن تھوڑا سست رفتاری کے ساتھ گزرا۔ دوپہر کا کھانا ہندوستانی سفیر خوب چند کے یہاں تھا۔ وہاں سے پلٹا تو ابراہیم بلوچ آ گئے۔ کانفرنس میں آئے ہیں۔ ہندوستان پاکستان اور دوسرے ایشیائی افریقی ادب سے بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ مجھ سے ترجمہ کرنے کے لئے نظمیں مانگ رہے تھے۔ وہ عربی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں۔

۳۱ مارچ ۶۷ء

آج ہم بیروت کے بازاروں کی سیر کرتے رہے۔ پورا شہر بہت صاف ستھرا ہے اور لوگ خوش حال نظر آتے ہیں۔ وہ چھوٹے چھوٹے بچے بھی جو سڑکوں پر چیونگ گم اور دوسری چیزیں بیچتے ہیں، بہت خوش حال اور صاف ستھرے نظر آتے ہیں۔ سمندر کے کنارے کنارے جس طرح شہر آباد ہے بہت اچھا لگتا ہے۔ دوپہر کا کھانا ہم نے ایک ہندوستانی ریسٹوراں میں کھایا۔ کھانا اچھا تھا مگر مرچیں ضرورت سے زیادہ تھیں۔ واپس آ کر میں لیٹ گیا۔ ابراہیم میرے ساتھ تھے۔ شام کو ہندوستانی ایسوسی ایشن نے چائے پر مدعو کیا تھا۔ وہاں چلے گئے۔ وہاں سے شری نورسن کی کاک ٹیل پارٹی میں چلے گئے۔ جب سے پینا چھوڑا ہے میرا وزن پچیس تیس پونڈ گر گیا۔ کاک ٹیل سے واپس آیا تو ابراہیم آ گئے۔ ابھی ابھی اٹھ کر گئے ہیں۔ اب میں سوتا ہوں۔ یکم اپریل ۶۷ء

آج کا دن کسی خاص مصروفیت میں نہیں گزرا۔ ساڑھے نو بجے کے قریب نزار اور ان کی بہن ہدا آ گئے۔ میں اور بالو پوریا خرید و فروخت کی نیت سے نکلے۔ انھیں اپنے بچوں کے لئے کپڑے خریدنے تھے۔ میں نے پوری خریداری لندن پر اٹھا رکھی ہے۔ ایک بجے کے قریب واپس آئے۔ نزار چلے گئے۔ میں نے کھانا کھایا اور سو گیا۔ پانچ بجے اٹھا۔ منہ دھویا، کپڑے بدلے اور نیچے چلا گیا۔ نزار کے یہاں جانا تھا۔ وہ چھ بجے کے قریب آئے۔ میں، سجاد ظہیر اور بالو پوریا نزار کے یہاں گئے۔ نزار کے والد حسن مروہ یہاں کے معروف ادیبوں میں ہیں۔ وہاں سے ہم آٹھ بجے کے قریب واپس آئے۔ نزار کے یہاں ایک فلسطین کے شاعر معین بسیسو سے ملاقات ہوئی۔ دیر تک افتوشنیکو کی شاعری پر بات ہوتی رہی۔ واپسی میں ساتھ آئے۔ میں، وہ، اور ابراہیم ہوٹل تک پیدل آئے۔ مجھے ہوٹل پہونچا کر دونوں واپس چلے گئے۔ اب سوتا ہوں۔ صبح ماسکو کے لئے روانہ ہونا ہے۔

۲ اپریل ۶۷ء

بیروت سے ۲ ربجے روانہ ہوکر ہم ۶ ربجے ماسکو پہنچے۔ یہاں کی گھڑی میں اُس وقت ۷ ربج رہے تھے معلوم ہوا ماسکو ایک گھنٹہ آگے ہے۔ بڑی سخت دُھند تھی اور چاروں طرف جمی ہوئی تھی۔ بڑی سخت سردی تھی اور کمرہ بھی ٹھنڈا تھا۔ کہتے ہیں یہاں ان دنوں برف پگھل جایا کرتی ہے مگر اس سال دیر ہوگئی۔ ہماری ترجمان ایک لڑکی ہے، ایلینا۔ اسے مشرقی زبانوں کا بہت شوق ہے۔ مزید تعلیم کے لئے دلّی جانے والی ہے۔ ابھی ہم سب نیچے ہال میں بیٹھے تھے۔ میں نے تھوڑا شوربا پیا اور چائے پی۔ ہال میں ناچ ہو رہا تھا۔ ایلینا نے بتایا یہ دراصل یہودی ناچ ہے۔ ماسکو میں جانے کیوں مقبول ہے۔ میں نے کہا شاید اس لئے کہ اس میں ایک جنگلی پن ہے۔ آج کا انسان ساری پابندیاں توڑ دینا چاہتا ہے۔

۳ راپریل ۱۹۶۷ء

ملک راج اسی جہاز سے واپس جا رہے ہیں۔ ایلینا انھیں چھوڑنے جا رہی ہے۔

اس وقت ۱۲ ربج چکے ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے بالشویک تھیٹر سے آیا ہوں۔ یہاں پس منظر اور مناظر کی تبدیلی سے اس کے ساتھ ہی روشنی کے استعمال سے ایک معمولی سی کہانی کو کس حسن کے ساتھ پیش کیا تھا۔ اس طرح اہلِ روس نے اپنے بیلے کی روایت کو بھی باقی رکھا اور کام کرنے والے لوگوں کے زندہ رہنے کے امکانات بھی پیدا کر دیئے۔

صبح روسی ادیبوں کی کانفرنس میں بیروت کانفرنس پر بیانات ہوتے رہے۔ میں جہاز میں جنوبی افریقہ کے ادیب لاگوما اور چینگ کے بعد جاپان کے ادیب ہتّا سے باتیں کرتا رہا مگر امید افزا بات کوئی نہیں ہوئی۔ میری کوشش تھی ایک چھوٹا سا حلقہ بنا کر ہر ملک کے نمائندہ ادب پر کام کیا جائے۔ مریم نے کہا یہ ممکن ہی نہیں۔ ہر ملک کا نمائندہ ادب کیا ہے اس کا فیصلہ کون کرے گا؟ روس کی طرف سے مریم ہر جگہ پیش پیش ہوتی ہے۔

۴ راپریل ۱۹۶۷ء

معلوم ہوتا ہے اس کانفرنس کا بھی کوئی نتیجہ نہیں نکلنے والا۔

ہندوستانی سفارت خانے میں پارٹی تھی۔ ابھی آیا ہوں۔ وہاں مختلف لوگوں سے ملاقات ہوئی جن میں علی یاور جنگ اور فاروقی بھی تھے۔ فاروقی آجکل دلّی یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر ہیں۔ علی یاور جنگ علیگڑھ یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر ہیں۔

آج میں لینن گراڈ جا رہا ہوں۔ میرا ترجمان ساشا دس بجے آئے گا۔ آج صبح ہم ریڈیو اسٹیشن بھی گئے تھے میں نے وہاں ایک چھوٹی سی تقریر کی اور ایک نظم "سبزۂ بیگانہ" ریکارڈ کرائی۔ روسی ادیبوں کی انجمن نے کھانے پر بلایا تھا۔ ۲ ربجے وہاں گئے۔ روسیوں کا یہ دستور کہ کھانے کی میز پر، وقفہ وقفہ سے مہمان کے بارے میں تعریفی

جملے کہتے جاتے ہیں اور اس کا جامِ صحت پیتے جاتے ہیں، اچھا لگتا ہے۔ پارٹی میں مرزا ترسون زادہ، رسول حمزہ، ابراہیم آف، مرزا چنگیزی اور بہت سے ادیب تھے۔ تعریف، جامِ صحت اور کھانا، سب مل کر تین چار گھنٹے کا پروگرام ہوگیا تھا۔ ۶ بجے ہندوستانی سفارت خانے جانا تھا۔ ابھی آکر اپنا پاسپورٹ لیا ہے اور ساشا کا انتظار کر رہا ہوں۔

۶ اپریل ۱۹۷۶ء

میں آج ہی لینن گراڈ سے واپس آیا ہوں۔ ۶ اپریل کی رات کو گیا تھا۔ بہت خوبصورت شہر ہے۔ اس قدر عمدگی اور ترتیب کے ساتھ بسا ہوا شہر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ عمارتیں اور سڑکیں بہت عمدہ اور وسیع ہیں۔ مصوّری کے فن کا لینن گراڈ میں بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ سامنے ہرمیٹج، پیٹروگراڈ کا محل، ایک پرانا گرجا سب نہایت ہی قابلِ دید جگہیں ہیں۔ ان میں بڑے بڑے مصوّروں کی تصویریں اور اُن کے کام کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ سامنے ایک پرانا اسکول ہے، لینن یہیں رہا کرتے تھے۔ وہاں ایک ہال ہے، جس میں جلسے ہوا کرتے تھے اور لینن تقریریں کیا کرتے تھے۔ جس کمرے میں لینن رہا کرتے تھے وہاں اُن کا پلنگ اور صوفہ ابھی تک پڑا ہے۔ وہاں اُن کے ہاتھ کی تحریریں اور فرمان بھی ہیں۔ ٹیپ ریکارڈ کی ہوئی آواز بھی ہے۔ میں نے سنی۔ وہاں وہ کمرہ اور ہال بھی ہے جہاں بہت سے ہنگامے ہو چکے تھے۔ زارِ روس کا وہ محل بھی دیکھا جہاں ۱۹۰۵ء میں کسانوں پر گولی چلی تھی۔ اس لئے کہ انھوں نے روٹی مانگی تھی۔

رات کو وہاں ایک ناچ تھا۔ وہ پروگرام دیکھا۔ جس رات واپس آرہا تھا ایک ڈرامہ بھی دیکھا۔ تیسرے ایکٹ سے اٹھ کر آگیا۔

۹ اپریل ۱۹۷۶ء

اس وقت رات کے ۱۰ بج رہے ہیں۔ کٹھ پتلی کا تماشا دیکھ کر ابھی ابھی واپس آیا ہوں۔ جس طرح ہندوستان میں ہوتا ہے یہاں یہ تماشا اس طرح نہیں ہوتا۔ اس کی باقاعدہ ایک فن اور ڈرامہ کی حیثیت ہے۔ جو تماشا آج تھا وہ آدم، حوّا اور گندم کے دانے سے متعلق تھا۔ انسان اور پتلے دونوں کو ملا کر ڈرامہ کا کردار بنایا گیا تھا۔ آدم اور حوّا پتلیاں تھیں اور شیطان اور انسان، آدمی۔ علامتی کردار بنا کر پیش کیا گیا تھا اور اچھا دلچسپ تھا۔ روسی زبان میں تھا اس لئے بات چیت سمجھ میں نہیں آئی مگر جو پیش ہوا وہ سب کچھ سمجھ میں آگیا۔

میرا ترجمان میرے ساتھ تھیٹر نہیں جا سکا۔ اُسے سجاد ظہیر اور رسجا شں مکھو پادھیا کو چھوڑنے ہوائی اڈے پر جانا تھا۔ میں نے اپنے ترجمان سے کہا مجھے تھیٹر میں کسی آدمی سے ملوا دینا جو انگریزی یا اردو جانتا ہو۔ وہاں گئے تو اُس کی پہچان کی ایک لڑکی مل گئی۔ اُس نے مجھے اُس لڑکی سے ملوا دیا۔ وہ روسی کے علاوہ کوئی دوسری زبان

نہیں جانتی تھی۔ لطیفہ یہ ہوا کہ اُس نے مجھے ایک اور لڑکی سے ملوایا۔ وہ بھی روسی کے علاوہ دوسری زبان نہیں جانتی تھی۔ اور ڈرامہ دیکھتے وقت میری زبان نہ جاننے کے باوجود مجھے مطلب سمجھانے کی کوشش کرتی رہیں۔ ایک لڑکی کے پاس ایک دوربین تھی۔ جب اُس کی اپنی سمجھ میں کچھ نہیں آتا دوربین میری آنکھوں سے لگا دیتی تھی۔ دوسری لڑکی کے ساتھ ایک صاحب اور تھے جو چُپ چاپ یہ سب دیکھتے رہے اور میں اس صورت حال پر دل ہی دل میں ہنستا رہا۔ کھیل ختم ہونے کے بعد پہلی لڑکی مجھے میرے ہوٹل چھوڑنے آئی۔ راستے میں اپنا نام بتایا۔ شاید سآگا تھا۔ اب ٹھیک سے یاد نہیں رہا۔ ۱۰ر اپریل ۶۷ء

اگلا دن اس طرح گزرا۔ ریڈیو سے روبل ملے تھے۔ آرما محمد علی اور اس کے بچّوں کے لئے کچھ خریدا۔ رخشندہ کے لئے ایک گھڑی خریدی۔ اس کے بعد لینن کا مزار دیکھنے گیا۔ وہاں جس چیز نے بہت متاثر کیا وہ لینن کے مزار پر پہرہ بدلنے کا سماں تھا۔ لینن کے مزار پر ہر وقت دو باوردی سپاہی مستعد کھڑے رہتے ہیں، بندوقوں پر ہاتھ رکھے ہوئے۔ یہ پہرہ ایک ایک گھنٹے بعد بدلتا ہے۔ چار فوجی ایک ساتھ آتے ہیں۔ ان میں سے دو بڑھ کر پہلے پہرہ داروں کی جگہ لے لیتے ہیں اور جو پہلے سپاہی پہرہ پر ہوتے ہیں آنے والے فوجیوں کے ساتھ مل جاتے ہیں۔ اور پھر چاروں مل کر واپس چلے جاتے ہیں۔ شام کو یوتھ پیلس دیکھنے گیا۔ وہ بند تھا۔ ۱۱ر اپریل ۶۷ء

میں کل ۱۲ بجے کے قریب ماسکو سے لندن پہنچا۔ یہاں میرے بڑے سالے محمد علی منصوری رہتے ہیں۔ وہ ایک زمانے سے لندن میں ہیں۔ ایک جرمن لڑکی آرما سے شادی کرلی ہے۔ اس سے دو بیٹیاں ہیں۔ میں جب لندن پہنچا وہ ہوائی اڈّے پر نہیں تھے۔ تھوڑی دیر بعد آرما کا ٹیلیفون آیا۔ اس نے بتایا وہ میرا انتظار ٹرمینل پر کر رہے ہیں۔ میں بس لے کر ٹرمینل پہنچا، وہ وہاں تھے۔ ہم نے وہاں سے ایک ٹیکسی کی۔ اس کے بعد ٹرین لی۔ اس کے بعد دوسری ٹرین لی۔ پھر وہاں سے کچھ دور پیدل چلے اور اُن کے مکان پر بائرن روڈ پہنچے۔

آرما اچھی ہے مگر ہر وقت اپنی ناداری کا رونا روتی رہتی ہے۔ لندن میں میرے کالج کے ایک ساتھی عبّاس احمد عبّاسی بھی رہتے تھے۔ میں نے انھیں ٹیلیفون کیا وہ فوراً آگئے۔ شام کو اُن کے گھر چلا گیا۔ آج بھی تمام دن عبّاسی ہی کے ساتھ رہا۔ بی۔ بی۔ سی پر کچھ ریکارڈنگ کرائی۔ اور انٹرویو دیا۔ اس کے بعد عبّاسی مجھے ایک خاتون سے ملانے لے گئے، جن کے شوہر دلّی میں ایک مشہور دل کے ڈاکٹر تھے۔ لطیف نام تھا۔ اب حیات نہیں۔ بیگم لطیف اب کوئی کاروبار کرتی ہیں۔ ان کا ایک لڑکا ہے مومن۔ تھوڑی دیر میں ایک اور صاحب اپنی بیوی کے ساتھ آگئے اور مومن کو لے کر کسی جلسے میں چلے گئے جہاں اغلام اور امرد پرستی پر بحث تھی۔ لندن میں امرد پرستی جرم نہیں۔

آمنہ لطیف کوئی فلم بنا رہی ہیں جس میں میری مدد لینا چاہتی ہیں۔ کہانی عباس احمد عباسی کی ہے۔ آج صرف اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں کہانی کل سنوں گا۔ آمنہ لطیف سے مل کر مجھے پروتما داس گپتا کا خیال آیا۔ ویسی ہی بے تکلف اور زندہ دل سی ہیں۔ سر کے بال سفید ہیں نہیں، رنگتی ہیں اور ہر وقت چہرے پر ڈالے رکھتی ہیں۔ چہرہ بالکل جوان ہے۔ کہانی سننے کے بعد معلوم ہوگا وہ مجھ سے کیا مدد لینا چاہتی ہیں۔ اس بہانے کچھ روپیہ مل گیا تو بچوں کے لئے کچھ خرید لوں گا۔ ۱۲ راپریل ۶۶ء

آج کا دن لندن کے مشہور مقامات دیکھنے میں گذرا۔ محمد علی کی چھٹی تھی۔ وہ یہاں ایک ادارے میں کام کرتے ہیں جو اپاہج اور ذہنی مفلوج بچوں کے لئے ہے۔ میں اور محمد علی پہلے عباسی کے یہاں گئے۔ ان کے ساتھ اگلا پروگرام بنا کر عجائب گھر چلے گئے اور مصری ممیاں اور دوسرے نوادر دیکھتے رہے۔ اس کے بعد آکسفورڈ اسٹریٹ چلے گئے۔ میں نے شہلا، اسماء اور گڈو کے لئے ایک ایک قلم خریدا، سلطانہ کے لئے بھی۔ گڈو کے لئے ٹکٹوں کی البم بھی۔ پھر اِدھر اُدھر گھومنے کے بعد ایک جگہ چائے پی۔ اس کے بعد ایک فلم دیکھی جس کا نام تھا "WHO IS AFRAID OF VIRGINIA WOLF" وہاں سے نکلنے کے بعد سیدھے گھر آئے۔ پھر وہ البم دیکھتے رہے جو ایک زمانہ پہلے سلطانہ نے محمد علی کو بھیجی تھی۔ اس میں ہماری اور بچوں کی پرانی تصویریں تھیں۔ محمد علی اکثر ہندوستان جانے کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ اثر ما باتوں میں ہر وقت یہاں کے قحط کا ذکر کرتی ہیں۔ جیسے ہندوستان رہنے کی جگہ نہیں۔ غالباً وہ ہندوستان جانا نہیں چاہتیں۔ اس کے ذہن میں شاید ہندوستان کے متعلق کوئی خوف بھی ہوگا۔ آج لندن سے پیرس اور وہاں سے آگے کے ٹکٹ کا بندوبست کرنے کے بعد ایر انڈیا کے دفتر جانے کا ارادہ تھا۔ اب کل پر ملتوی کر دیا۔ ۱۳ راپریل ۶۶ء

کل جو گیلری دیکھی تھی اس کا نام "میڈم تسوڈ یا تساڈ کی گیلری" ہے۔ اس میں بڑے بڑے لوگوں کے موم کے پتلے بنا کر رکھے گئے ہیں۔ بڑے لوگوں کے ساتھ جرائم پیشہ لوگوں کے بھی پتلے ہیں۔ شاید میڈم تساڈ ان پتلوں کی زبان میں یہ کہنا چاہتی ہیں کہ انسان کے اندر جرم کا شائبہ نہ ہو تو وہ بڑا بن ہی نہیں سکتا۔

صبح عباس کے یہاں گیا۔ وہیں دوپہر کا کھانا کھایا اور آمنہ لطیف کے یہاں چلا گیا۔ شام کو میں، آمنہ اور عباس کی بیوی ڈاکٹر ژواگو دیکھنے چلے گئے اور اس طرح دن تمام ہوگیا۔ ۱۴ راپریل ۶۶ء

آج ۱۲ بجے ایک صاحب جن کا نام برنی ہے پیڈنگٹن اسٹیشن کے باہر ملنے والے تھے۔ وہ یہاں لندن میں کوئی فلم بنا رہے ہیں اور اس پر میرا مشورہ چاہتے تھے۔

۲ بجے ہم نے ایک ہندوستانی ہوٹل میں کھانا کھایا۔ اس کے بعد پیرس اور وہاں سے قاہرہ کے لئے اپنا ٹکٹ کرایا۔ میرا جنیوا جانے کا بھی خیال تھا مگر ملتوی کر دیا۔ قاہرہ میں کلیم اللہ ہیں۔ ان سے بیروت میں ہی طے ہو گیا تھا میں واپس قاہرہ ہوتا ہوا جاؤں گا اور اُن کے پاس قیام کروں گا۔ مجھے اہرام دیکھنے کا بہت شوق تھا۔

ہوٹل سے نکل کر ہم آرٹ گیلری گئے۔ میں اور محمد علی چھ بجے تک آرٹ گیلری میں رہے۔ اساتذہ کی نایاب تصویریں دیکھیں۔ آرٹ گیلری سے نکل کر ٹریفالگر اسکوائر گئے۔ وہاں ایک کیفے میں چائے پی۔ پھر پیدل ویسٹ منسٹر ایبے اور ڈاؤننگ اسٹریٹ ہوتے ہوئے ٹیمز دریا پر گئے۔ یہ دریا لندن کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ پھر ٹیمز کے کنارے ایک کیفے میں چائے پی۔ وہاں سے زیرِ زمین ریل میں بیٹھ کر محمد علی کے گھر نارتھ ویمبلے آگئے۔ اور تھوڑی دیر ٹی۔ وی دیکھ کر سو گیا۔

۱۵ اپریل ۶۷ء

آج کا آدھا دن گھر میں گزرا۔ ہم دوپہر کے کھانے کے بعد گھر سے نکلے۔ آدھے راستے میں ایک باغ میں رک گئیں۔ دونوں لڑکیوں کو ساتھ لے کر گئی تھیں۔ محمد علی کے ایک انگریز دوست ہیں۔ انھوں نے چائے پر بلایا تھا ہم وہاں چلے گئے۔ ان کے یہاں سے شام کے چھ بجے نکلے اور اِدھر اُدھر ٹہلتے ہوئے آٹھ بجے گھر پہنچے۔ لندن کے دیہات اور مضافات جیسے خوبصورت ہیں ایسے ہندوستان کے مضافات بھی ہو جائیں تو لوگ گاؤں چھوڑ کر شہروں میں منتقل ہونا چھوڑ دیں۔ جیسے ہی ہم گھر پہنچے عباس بیوی بچوں کے ساتھ آگئے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے اُٹھ کر گئے ہیں۔ مُصر تھے کہ میں ساتھ چلوں۔ میں نے کہا کہ صبح آؤں گا۔

۱۶ اپریل ۶۷ء

آج کا سارا دن ضائع ہو گیا۔ نہ کوئی جگہ دیکھ پائے نہ کوئی دوسرا خاص کام ہوا۔ آمنہ لطیف کے یہاں تجارتی باتوں میں خراب ہو گیا، جو کوئی خاص تجارتی بھی نہیں تھیں۔ مجھے اپنے اوپر بہت غصّہ آیا۔ خیال تھا کہ اس کام میں ڈھائی سو پونڈ پیشگی مل جائیں گے۔ اب صرف سو پونڈ مل رہے ہیں۔ اگر اُن صاحب سے بیروت میں روپیہ مل جاتا جنھوں نے بمبئی میں وعدہ کیا تھا تو یہاں کیوں زحمت ہوتی۔ سوا سات بجے ہم آمنہ لطیف کے یہاں سے نکلے اور عباس اور میں تھیٹر دیکھنے چلے گئے۔ ڈرامہ کا نام "OLD COUPLE" تھا۔ ڈرامہ امرد پرستی سے متعلق تھا۔ ان دنوں لندن میں یہ بحث بہت عام ہے۔

واپس آیا تو سلطانہ کا خط ملا۔ وہ بہت پریشان ہیں۔ بوا کی طبیعت خراب ہے۔ سلطانہ اپنی

والدہ کو بُوا کہتی ہیں۔

۱۷ اپریل ۶۷ء

آج میں صبح سویرے ہی نکل گیا۔ عبّاس کے یہاں گیا۔ انھیں ساتھ لے کر نکلا تو گھر میں ایک طرح کی بدمزگی پیدا ہو گئی۔ میاں بیوی میں بنتی نہیں۔ ایک نے غصہ لڑکے پر نکالا دوسرے نے لڑکی پر۔ ان کے دو بچے ہیں جو بہت ضدی ہیں۔ لڑکا کپڑے بدلتے بدلتے وہیں کھڑے کھڑے پیشاب کر دیتا ہے۔ لڑکی بھی بات بات میں ہٹ کرتی ہے۔ دونوں بچوں سے اگر کوئی پیار جتائے تو بہت خوش ہوتے ہیں بلکہ چپٹنے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے دونوں کو ماں باپ کی محبت اور شفقت نہیں ملی۔

وہاں سے آمنہ لطیف کے یہاں گئے۔ کچھ دیر اُن کی کہانی پر کام کیا اور اُسے ایک شکل دی۔ وہاں سے نکل کر میں اور عبّاس ایک فلم دیکھنے چلے گئے۔ فلم کا نام "مارا ساد" تھا۔ مارا وہ شخص ہے جس نے انقلابِ فرانس میں نمایاں حصّہ لیا تھا اور ساد وہ شخص ہے جس کے نام پر نفسیات کی اصطلاح "سادیت" بنی ہوئی ہے۔ فلم ایک آرٹ تھیٹر میں چل رہی تھی۔

فلم کے اندر بڑے مزاحیہ انداز میں کچھ باتیں کہی گئی تھیں۔ جن لوگوں کو گلوٹین کیا جاتا تھا اُن کا خون ایک بالٹی میں بھر دیا جاتا تھا۔ اس میں بادشاہ کا خون نیلا تھا، سیاست داں کا خون سفید اور ایک عام آدمی کا خون سرخ تھا۔

۱۸ اپریل ۶۷ء

آج صبح آمنہ لطیف کے یہاں بیٹھ کر معاہدہ ٹائپ کرایا۔ اور کچھ روپیہ لیا۔ طے یہ پایا جب ہم کہانی پر بات کرنا چاہیں گے وہ مجھے ٹیلیفون کریں گی۔ میں مکالمہ لکھ کر ڈاک سے بھجواؤں گا۔ وہاں سے نکل کر ساوانی کے یہاں گئے۔ وہ لندن میں بی۔ آر۔ فلمز کے ڈسٹری بیوٹر ہیں۔ سوچا تھا ان سب کو "وقت" دکھا دوں مگر انتظام نہیں ہو سکا۔ اس کے بعد ہم ایک فلم دیکھنے چلے گئے۔ نام تھا — "MAN FOR ALL SEASONS" — یہ جارج کرام ویل اور اوٹوپیا کے مصنف تھامس کا قصّہ ہے۔ مور کا کردار بہت اچھا دکھایا گیا تھا۔ وہاں سے نکل کر ایک جگہ آکر کافی پی اور میں سب سے رخصت ہو کر گھر آگیا۔

۱۹ اپریل ۶۷ء

میں آج صبح ۹ بجے کے جہاز سے پیرس آگیا۔ جہاز میں میرے برابر ایک انگریز لڑکی بیٹھی تھی۔ اس سے باتیں ہوتی رہیں۔ کو نکنی انگریزی بولتی تھی۔ خاصی بے تکلف سی تھی۔ کہہ رہی تھی پیرس کی سیر ساتھ مل کر کریں گے۔ مگر اتا پتا اُس کا بھی کچھ نہیں تھا میرا بھی۔ پھر ملاقات نہیں ہوئی۔ پیرس میں کہاں ٹھہرنا تھا

اس کا انتظام محمد علی نے لندن ہی میں کر دیا تھا۔ یہ ایک نیم سرکاری ہوٹل تھا۔ پیرس پہنچتے ہی میں نے شہر دیکھنے کا پلان بنایا۔ ہر نیم سرکاری اور سرکاری ہوٹل کی بسیں ہوتی ہیں جو ہوٹل سے لے جاتی ہیں اور واپس چھوڑ جاتی ہیں۔ میں نے ایسی ہی ایک بس میں اپنا انتظام کیا اور چلا گیا۔ ہوٹل میں کمرہ لیتے وقت آپ کو بتانا پڑتا ہے غسل خانے والا کمرہ چاہیئے یا بغیر غسل خانے کے۔ غسل خانے والے کمرے کے دام زیادہ ہوتے ہیں۔

شہر کے گلی کوچوں کے سب نام تو یاد نہیں رہے البتہ نانزڈم کا گرجا اور لووَرے ضرور یاد ہیں۔ لووَرے بڑے بڑے مصوّروں کی تصویروں کا خزانہ ہے۔ یہاں بہت سے نایاب مجسّمے بھی ہیں۔ جو مختلف مقامات پر ملے ہیں اور یونانیوں اور رومیوں کے عہد سے متعلّق ہیں۔ لووَرے میں اور تصویروں کے علاوہ لیونارڈو ڈو ینچی کی مشہور زمانہ تصویر مونالیزا بھی دیکھی۔ اس کے علاوہ ریفل، ڈیوڈ اور اُن کے ساتھ سب ہی دنیا کے بڑے بڑے مصوّروں کے فن کا کمال نظر سے گزرا۔ تقریباً آدھا دن لووَرے میں گزر گیا جو بہت کم تھا۔ مگر چھوٹے سے سفر میں انسان کیا اپنے شوق کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔ واپس آکر سوچا کچھ کھا لوں۔ ایک ہوٹل میں گیا اُس نے کہا کھانا شام کو ۷ بجے۔ میں نے ایک سینڈوچ لیا۔ اُس میں آدھ کچرا گوشت بھرا ہوا تھا۔ وہ میں نے پھینک دیا۔ اس کے بعد دو پیالی کافی پی اور ایک پنیر کا سینڈوچ کھایا۔ ۸ بجے کیسنو دیکھنے چلا گیا۔ یہ بیروت کے کیسنو سے اچھا نہیں لگا مجھے۔

۲۱، ۲۲ اپریل ۷۶ء

آج کا دن بھی پیرس دیکھنے میں گیا۔ صبح ہم مختلف بازاروں سے ہوتے ہوئے پہلے REVOLUTION SQUARE ـــــــــ گئے۔ اس کا یہ نام انقلابِ فرانس کے بعد پڑا تھا۔ شاہِ فرانس اور میری اینٹے نٹ کو یہیں گلوٹین کیا گیا تھا۔ اس کے بعد نپولین کی قبر پر گئے۔ وہاں سے "آئفل ٹاور"، "آرک آف ٹرائمف" اور مختلف بازاروں سے گزرتے ہوئے "ماؤنٹ مارٹر" پر آگئے۔ یہاں ایک گرجا ہے۔ وہاں سے سارا پیرس دکھائی دیتا ہے۔ پیرس بہت خوبصورت شہر ہے۔ لینن گراڈ کے بعد یہ دوسرا خوبصورت شہر ہے۔

دوپہر بعد ورسیلز گئے۔ یہ شاہانِ فرانس کا قلعہ ہے۔ پیرس سے دو ڈھائی میل باہر۔ محل دکھاتے وقت ایک جگہ گائیڈ لڑکی نے کہا "یہاں کھڑے ہو کر میری اینٹی نیٹ نے کہا تھا "تمہارے پاس روٹی نہیں تو کیک کیوں نہیں کھاتے"۔ میرا خیال ہے وہ غلط بتا رہی تھی۔ یہ بات روس کی ملکہ زارینہ نے کہی تھی۔ تھوڑی دیر کھڑا اس بالکونی کو دیکھتا رہا جہاں میری اینٹے نیٹ کے اس جملے پر تاریخ نے فیصلہ دیا تھا۔ "اس کی گردن مار دی جائے"۔

محل کے نیچے حوض اور شہر کا منظر بہت خوبصورت ہے ۔ اور محل کی چھتوں اور دیواروں کو کہیں مصوری کے اعلیٰ نمونوں سے مزین کیا گیا ہے اور کچھ قالینوں اور خاص طور پر بنائے ہوئے مخمل سے۔ اکثر جگہ تصویروں میں عورتوں کے سینے کھلے ہیں ۔ غالباً یہ بات اُس وقت کے فرانس کے کلچر کا حصّہ تھی۔ واپسی میں شانز لیزا ایبر گاڑی رُکی ۔ میں نہیں اترا۔

شہر کے بیچ سے دریائے سین گزرتا ہے ۔ ورسیلز جاتے وقت گاڑی دور تک دریائے سین کے ساتھ ساتھ جاتی ہے ۔ پیرس کے گرد و نواح میں جنگل خاص طور پر اُگایا گیا ہے اور بہت اچھا لگتا ہے ۔ اب سوتا ہوں ۔ صبح قاہرہ کے لئے روانہ ہونا ہے ۔

۲۳ اپریل ۶۷ء

۱۱ بجے کے قریب پیرس سے روانہ ہو کر جہاز ، لگ بھگ ایک گھنٹہ کے قریب ، یونان کے ہوائی اڈے ایتھنز پر رُکا ۔ اُتر کر ہم وہاں کی دوکانوں پر گئے ۔ میں یونان سے کوئی یادگار چیز خریدنا چاہتا تھا ۔ ایک دکان پر ایک چھوٹے سے لکڑی کے ٹکڑے پر گدھا بنا ہوا دکھائی دیا ۔ مجھے اچھا لگا مگر خریدا نہیں ۔ سقراط اور افلاطون کے وطن سے میں گدھا نہیں خریدنا چاہتا تھا ۔ جدھر نظر جاتی تھی گلیاں سنسان اور بازار بند نظر آتے تھے ۔ وہاں نئی حکومت آئی تھی اور اُس نے کسی مصلحت کی بنا پر بازاروں اور گلیوں میں کھلے بندوں پھرنے پر پابندی لگا رکھی تھی ۔

ایتھنز بالکل سمندر کے کنارے آباد ہے ۔ سمندر بھی بہت گہرا ، نیلا تھا اور بہت خوبصورت اور خوفناک نظر آ رہا تھا ۔ میں نے بند گلے کا کوٹ اور پتلون پہن رکھی تھی ۔ جب ہم ہوائی اڈے پر چیزیں خریدتے پھر رہے تھے ، کچھ بچے ، لڑکے اور لڑکیاں ، مجھے دیکھ کر ایک دوسرے کو ہاتھ جوڑ جوڑ کر نمستے کر کے یہ بتا رہے تھے کہ میں اُس ملک کا رہنے والا ہوں جہاں اس طرح ہاتھ جوڑ کر ایک دوسرے کو آداب کورنش کرتے ہیں ۔

ایتھنز سے روانہ ہو کر ڈیڑھ پونے دو گھنٹے میں ہم قاہرہ پہونچ گئے ۔ مقامی وقت ۶ بجے کا تھا ۔ مجھے راستہ بھر افسوس رہا میں جنیوا کیوں نہیں گیا ۔ میرے پاس ٹکٹ تھا وہ ضائع ہو گیا ۔ قاہرہ پہنچ کر جی بہت خوش نہیں ہوا ۔ پیرس کے مقابلے میں یہ جگہ اتنی خوبصورت نہیں تھی ۔ کلیم اللہ مجھے لینے ہوائی اڈے پر آ گئے تھے ۔ ان کے ساتھ پروگرام یہ بنا کہ کل صبح یہاں کا عجائب گھر دیکھوں گا ۔ اور دو پہر اہرام اور دوسری تاریخی عمارتیں ۔ اگلے روز رات کے جہاز میں جگہ مل گئی تو واپس چلا جاؤں گا ۔

۲۴ اپریل ۶۷ء

آج ۱ بجے تک قاہرہ کا عجائب گھر دیکھتا رہا ۔ کتنی صدیوں کی تہذیب ایک جگہ اکٹھی کر دی گئی ہے ۔

اتنا بڑا تہذیبی ذخیرہ ایک دن میں توجّہ سے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے یہ کہہ کر دل کو تسلّی دے لی کہ میں کوئی تحقیق کا طالب علم تو نہیں ہوں جو ہر چیز کو باریک بینی سے دیکھوں اور ایک طرف سے جو سامنے آیا دیکھتا چلا گیا۔ پھر بھی چار گھنٹے لگے۔ پتھّر کے پورے پورے سالم مجسّمے اور ایسے حسین کہ بیان ممکن نہیں۔ سب سے بڑا ذخیرہ توتؔ عنخ آمون کا تھا۔ یہ بادشاہ شہزادگی ہی کے زمانے میں مرگیا تھا، کوئی سولہ سترہ سال کی عمر میں۔ اس لئے جو ضرورت کی چیزیں تھیں سب اس کے ساتھ دفن کر دی گئی تھیں۔ زیورات، سونے کے برتن، لباس، کنیزوں، غلاموں سمیت اور جو بھی لوازماتِ شاہی تھے سب اس کے ساتھ دفن تھے۔

دوپہر کو واپس آکر کلیم اللّٰہ کا انتظار کرتا رہا۔ پھر ہم دونوں نے ایک ہوٹل میں جاکر کھانا کھایا۔ اُس دن قاہرہ میں گوشت نہیں ہوتا تھا۔ کھانا بھی میرے مزاج اور ذائقہ کا نہیں تھا۔ ۲ بجے نکل کر ہم ہوٹل سے اہرام پہنچے۔ کلیم اللّٰہ ساتھ تھے۔ اہرام سے متعلّق ایک عجیب سا رومانی تصوّر میرے ذہن میں تھا۔ وہاں جاکر معلوم ہوا وہ تو بڑے بڑے پتھروں سے بنا ہوا ایک مخروط ڈھانچہ ہے جنھیں ایک کے اوپر ایک رکھ کر چن دیا گیا ہے۔ اہرام کی چوٹی پر ایک گڑھا ہوتا تھا جن میں فراعنہ دفن کئے جاتے تھے۔ اہرام کے اوپر جو پتھّر تھے وہ بہت قیمتی تھے۔ غالباً اس پتھّر کا نام کہربا مر تھا۔ سلطان محمد علی نے وہ پتھر توڑ کر نکلوائے تھے اور ان سے مسجد کے ستون بنوائے تھے۔ ابوالہول اور اہرام کو اچھی طرح دیکھنے کے بعد اور اندر وہ جگہیں دیکھنے کے بعد جو فراعنہ کی قبریں تھیں سب سے بلند اہرام پر چڑھ کر اندر گیا۔ وہ ایک بادشاہ کی دفن گاہ تھی۔

دراصل فراعنہ کے عقیدے کے مطابق زندگی کی ضرورتیں مرنے کے بعد بھی ویسی ہی رہتی تھیں جیسی اُن کی زندگی میں ہوتی تھیں۔ اس لئے ان بادشاہوں کی ضرورت کا سارا سامان اُن کے ساتھ ہی دفن کر دیا جاتا تھا۔ جنھیں ان کے مزاروں اور قبروں کے متولّی ایک مدّت گزرنے کے بعد نکال لیتے تھے۔ اہرام سے واپسی میں سلطان صلاح الدّین کا قلعہ اور سلطان محمد علی کی مسجد بھی دیکھی۔ اور ان پتھروں کا ستون بھی، جنھیں وہ اہرام سے نکال کر لایا تھا۔ اس کے بعد سلطان حسن کی مسجد دیکھی جسے کلیم اللّٰہ غلطی سے حضرت امام حسنؓ سمجھتے رہے تھے۔ پھر گاڑی میں دور تک فصیلِ شہر کے ساتھ چلتے رہے۔ یہ رومیوں کی حکومت کا نشان اور اُن کے قلعے کی بنیاد تھی جو رُو بہ زوال ہے۔ صرف ایک دیوار کھڑی ہے جس میں کہیں کہیں رخنے پڑ گئے ہیں۔ اس دیوار اور ان آثار کو دیکھ کر ہم قلو پطرہ اور انطونی کی محبّت کا ذکر کرتے رہے اور رومیوں کی فتوحات اور ان کے عشق کی داستانیں دہراتے رہے جو اَب صرف لفظوں میں باقی رہ گئی تھیں۔ قاہرہ کی زمین پر اُس کا کوئی

نشان سوا چند پتھروں کے نہیں رہ گیا تھا۔ ہوٹل میں واپس آنے کے بعد بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر ایک ہندوستانی کیفے میں جا کر چائے پی۔ میں نے سموسے بھی کھائے۔ اس کے بعد ساڑھے نو بجے ایک عربی فلم "عقد لولو" دیکھی جو بہت معمولی تھی۔ واپس آیا تو معلوم ہوا میرے برابر ایک نائٹ کلب ہے جہاں ایک یونانی رقاصہ ناچتی ہے۔ مگر پیرس اور بیروت کے کلب دیکھ چکا تھا۔ میں نہیں گیا۔

۲۵ اپریل ۶۷ء

قاہرہ میں آخری دن میمفس اور آسورہ کے اہرام یا قبریں دیکھنے میں گزرا۔ میرے ساتھ ایک انگریز اور امریکی جوڑا بھی تھا۔ گاڑی نے پہلے مجھے میرے ہوٹل سے لیا پھر امریکی جوڑے کو پھر انگریز جوڑے کو۔ امریکی نے گاڑی میں داخل ہوتے ہی اپنا تعارف کرایا اور بے تکلف ہو گیا مگر انگریز جوڑا بہت دیر تک بے تعلق رہا پھر وہ بھی دوست بن گیا۔ اور ہم سب نے مل کر قاہرہ کی سیر کی۔ میمفس میں ریمیسس دوئم کا مجسمہ دیکھا۔ اس کے بعد آسورہ آگئے اور ابو الہول کے بعد ایک مصری رئیس کا مقبرہ دیکھا جس کا نام مرآر کا تھا۔ مرآر کا اپنے وقت میں ایک بت تراش اور مصور تھا اور جگہ جگہ اس نے دیواروں پر اُس وقت کی زندگی نقش کی تھی۔ کہیں لوگ دریا میں مچھلیاں پکڑ رہے ہیں، کہیں بازار میں خرید و فروخت ہو رہی ہے، کہیں مرآر کا اُن لوگوں کو سزائیں دے رہا ہے جنھوں نے لگان نہیں دیا تھا اور کہیں عام لوگ روزمرّہ کے کام کرتے نظر آتے ہیں۔ اس سے پہلے روز ہم نے جن فراعنہ کے مقبرے دیکھے تھے اُن کا نام چیتپ یا فوفو تھا اور دوسرا مقبرہ خفری یا جیزی کا تھا۔ واپس آکر میں نے کلیم اللہ کے ساتھ ایک ہندوستانی کیفے میں کھانا کھایا۔ یہ ہندوستانی سرکار کا ہوٹل ہے جسے چائے کو مقبول کرنے کے لئے بنایا گیا ہے۔ یہاں سبزی، ترکاری، دال روٹی، پوری بھاجی بھی ملتی ہے۔ کھانے کے بعد میں نے تھوڑی دیر آرام کیا۔ پھر اُٹھ کر اور اپنا ہندوستانی لباس (کرتہ پائجامہ) پہن کر ہوائی اڈے کے لئے روانہ ہو گیا۔

قاہرہ کے بارے میں جو رائے پہلے دن قائم کی تھی اُسے بدلنا پڑا۔ یہ بھی خوبصورت شہر ہے اور جس طرح فرانس اور لندن کے بیچ سے دریائے سین اور ٹیمز بہتا ہے، قاہرہ کے بیچوں بیچ دریائے نیل بہتا ہے اور اُسے دو حصّوں میں تقسیم کرتا ہے۔

۲۶ اپریل ۶۷ء

صبح ساڑھے چار بجے ہندوستان پہنچا اور ایک مہینے کی تگ و دو کے بعد بیروت، دمشق، ماسکو، لندن، فرانس اور قاہرہ کا سفر ختم ہو گیا۔ اور میری روزمرّہ کی زندگی شروع ہو گئی۔ ۹ بجے بی۔ آر۔ چوپڑہ کو فون کیا، اس کے بعد پریم جی اور غفار نادیاڈوالا کو ٹیلیفون کیا۔ دفتر میں جا کر ایک فلم کا سین لکھا۔ واپسی میں راستے سے کچھ خربوزے خریدے اور گھر آگیا۔

۲۷ اپریل ۶۷ء

عرفان صدّیقی

غزل

عشق میاں، اس آگ میں میرا ظاہر ہی چمکا دینا
میرے بدن کی مٹی کو ذرا کندن رنگ بنا دینا

آؤ تمہاری نذر کریں ہم ایک چراغ حکایت کا
جب تک جاگو روشن رکھنا، نیند آئے تو بجھا دینا

بیس اکیس برس پیچھے ہمیں کب تک چلتے رہنا ہے
دیکھو، اب کی بار ملو تو دل کی بات بتا دینا

سینے کے ویرانے میں یہ خوشبو ایک کرامت ہے
ورنہ اتنا سہل نہیں تھا راکھ میں پھول کھلا دینا

مولا، پھر مرے صحرا سے بن برسے بادل لوٹ گئے
خیر، شکایت کوئی نہیں ہے، اگلے برس برسا دینا

دل کی زمیں تک روشنیاں تھیں، چہرے تھے، ہریالی تھی
اب تو جہاں بھی ساحل پانا، کشتی کو ٹھہرا دینا

خواجہ خضر سنو، ہم کب سے اس بستی میں بھٹکتے ہیں
تم کو اگر تکلیف نہ ہو تو جنگل تک پہنچا دینا

عرفان صدیقی

غزل

شہر کیوں رات میں بیدار ہے میں کیا جانوں
جشن ہے صبح کہ پیکار ہے میں کیا جانوں

ایک قطرہ بھی مرے کوزۂ خالی میں نہیں
ہر طرف ابر گہربار ہے میں کیا جانوں

صید کرتا ہے کسی اور کی مرضی سے مجھے
خود بھی صیاد گرفتار ہے میں کیا جانوں

عاشقوں کے سرِ تسلیم کو تسلیم سے کام
اب یہ ابرو ہے کہ تلوار ہے میں کیا جانوں

میں تو اک درد کا سرمایہ لئے بیٹھا ہوں
یہ مری جان کا آزار ہے میں کیا جانوں

تجھ کو سیلاب کے آنے کی خبر دے دی ہے
تیرا در ہے تری دیوار ہے، میں کیا جانوں

میں تو اک بکھری ہوئی صف کا پیادہ ٹھہرا
کون اس فوج کا سردار ہے میں کیا جانوں

تو فرستادۂ سرکار نہیں ہے، نہ سہی
ہاتھ میں محضرِ سرکار ہے میں کیا جانوں

شحنۂ شہر کی خدمت میں لگے ہیں سب لوگ
کون غالب کا طرفدار ہے میں کیا جانوں

اک نیا رنگ ہویدا ہے مری آنکھوں میں
آج کیا سرخیٔ اخبار ہے میں کیا جانوں

میں نمو کرنے پہ راضی نہیں بے موجِ بہار
موسمِ درہم و دینار ہے میں کیا جانوں

سرِ پندار تو مجھ کو بھی نظر آتا ہے
اور کیا کیا تہِ دستار ہے میں کیا جانوں

قحط میں خود ہی دُکاں میری پڑی ہے خالی
عشق سے گرمیٔ بازار ہے میں کیا جانوں

ہو کہیں صبحِ خوش آثار بھی لیکن سرِ دست
میرے آگے تو شبِ تار ہے میں کیا جانوں

مجھ کو آتی ہے ترے حرف سے احساس کی آنچ
سب تری گرمیٔ گفتار ہے میں کیا جانوں

احمد جاوید

غزل

رنگینیِ گُل کا ایک منظر
شبنم نے دکھا دیا ڈھلک کر

یوں دل سے اُلجھ نہ دیدۂ تر
ہے قطرہ فروش یہ سمندر

سینے میں وہ آگ ہے کہ جس کا
ہر شعلہ ہے آفتاب پرور

چتون کو دیا تھا یا نگہ کو
جھگڑا یہ نیا اُٹھا ہے دل پر

اُس گُل کی سمائی کس طرح ہو
دامانِ بہار ہے چمن بھر

جاتی نہیں کوئی راہ اُس تک
رنگینیِ خال و خط سے ہو کر

دنیا سے قدم بچا کے رکھنا
چُبھ جائے گا پاؤں میں یہ کنکر

ذرّہ ذرّہ تری گلی کا
آغوش کشا ہے اندر اندر

جوں دل میں درد، آنکھ میں اشک
رہتا ہوں گھر ہی میں برابر

جنباں مژۂ دراز اُس کی
اک سایہ سا پڑ رہا ہے دل پر

احمد جاوید

غزل

بچا رکھی ہے چشمِ یار نے سارے علوم ایسی
یہ دو ورقی ہے اہلِ دل کو احیاء العلوم ایسی

زمینِ دل پہ خوباں کے قدم جس طرح پڑتے ہیں
فضائے آسماں میں کب ہے رفتارِ نجوم ایسی

جو دل کو چشم کی بدعت سے یکسر پاک کر ڈالے
چلائے کوئی تو تحریکِ اصلاح الرّسوم ایسی

زمین و آسماں تک جس نظر سے ڈول جاتے ہیں
کبھی پڑتی ہے اس دل پر تو آجاتی ہے جھوم ایسی

مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن مفاعیلن

دل اندر دل کوئی شے ہے سبو اندر سبو ہے سی

تمناؤں کا شور آباد ہے سینہ مرا کیا ہے
اُسے کب راس آسکتی ہے جائے پُرہجوم ایسی

ہوائے زندگی ہے مانعِ نشو و نمائے دل
نہالِ عشق کو ہر سانس ہے موجِ سموم ایسی

تمھی کو آتا ہے آنکھوں سے چھپ کر دل پہ کھل جانا
نہیں دیکھی خصوصیت کسی میں بالعموم ایسی

خداوندا کبھی جاوید کے دل پر بھی نازل ہو
غزل اک عارفِ شیراز یا مولائے روم ایسی

احمد جاوید

غزل

لفظ و معنی کے لئے ہیں نقطۂ تکمیل ہم
قالبِ مریم بدار یم و دمِ جبریل ہم

بسکہ سر کٹوا کے دستارِ فضیلت پائی ہے
از ہرِ عشاق سے ہیں فارغ التحصیل ہم

گردِ بادِ دشت اور گردابِ دریا بن کے اب
کرتے ہیں شاہِ جنوں کے امر کی تعمیل ہم

اے نگاہِ دور گرد ان تیری ہر گردش کے ساتھ
دور جا پڑتے ہیں خود سے بھی ہزاروں میل ہم

دستِ چاک انداز جیسے رگ چلا ہے ان دنوں
سوچتے ہیں کر ہی ڈالیں پیرہن تبدیل ہم

اے صبا سعیِ شگفتِ دل نہ جائے رائگاں
دے رہے ہیں اس شگوفے سے چمن تشکیل ہم

یہ جو اگلوں نے کہا ہے، وصلِ دلبر ہے محال
جانتے ہیں اس سخن کو واجب التاویل ہم

دیکھنے لگتی ہے ہر صورت میں حسنِ روئے یار
جب کبھی دیتے ہیں چشمِ جلوہ جُو کو ڈھیل ہم

بے سلیقہ ہو کے سر دینا ہے ننگِ عاشقاں
ٹھہر جا پیارے کہ اتنے باندھ لیں مندیل ہم

واعظا مجمل مفصل رٹ کے جو بھولا ہے تو
تجھ کو دیکھیں گے مع الاجمال و التفصیل ہم

احمد جاوید

غزل

عارف کا ہر کلام ہے اعجازِ خامشی
ہے حرف حرف پیکرِ آوازِ خامشی

باقی ترے سکوت سے ہے حرمتِ سخن
قائم ترے خطاب سے اعزازِ خامشی

پایانِ کار نوکِ زباں دل کو ہو گیا
وہ حرف جو ہے نقطۂ آغازِ خامشی

اے بادِ صبح سینۂ پُر شور کے لئے
بس اک نفس کہ ہو سکے دمسازِ خامشی

دل میں کہ ایک دانۂ سخن کی جگہ نہ تھی
بالیدہ ہے تخیلِ سرافرازِ خامشی

غارتگرِ متاعِ سخن ہے جنوں مرا
اور ساتھ ساتھ خانہ براندازِ خامشی

ہر خامشی نہیں ہے ہم آہنگِ گفتگو
ہر گفتگو نہیں ہے ہم آوازِ خامشی

اُس چشمِ سرمگیں کی زباں جیسے بوجھی ہے
اک شور سا ہے دل میں باندازِ خامشی

مرگ ست پر کشادنِ سیمرغِ زندگی
یا نغمہ ئی برآمدن از سازِ خامشی

آنسوی ہست و نیست ورای شہود و غیب
پرّان ہمای معنی و شہبازِ خامشی

مارا ز ہر شنیدنی و ناشنیدنی
بیروں کشید زمزمہ پردازِ خامشی

آں روحِ صد حکایت و آں جانِ صد سخن
آمد بخانہ ام ز درِ بازِ خامشی

جاوید چوں مشائخِ من امر دادہ اند
موجے ز نطق گیرم و دریا زِ خامشی

احمد جاوید

غزل

محفوظ اس دل کی ہمدمی سے — گزرے دو دن امی جمی سے
بیزار ہوں میں جنابِ والا — اس محترمی، مکرّمی سے

آیا ہے چمن میں جیسے کوئی — اقلیمِ بہارِ دائمی سے
شمشاد از بسکہ خیز خیزاں — اک جذبۂ خیر مقدمی سے
ہر نخل غرض کہ ایستادہ — ہے پورے قدِّ خرّمی سے

دے آئے پری رُخوں کو دل ہم — ہو جاتی ہے بھول آدمی سے
دنیا جو نہیں رہی ہے اس میں — معمور ہے دل اسی کمی سے
جُز وصل و فراقِ یار مجھ کو — کچھ کام نہیں خوشی غمی سے
آتش کدۂ جہاں ہے ٹھنڈا — اک شعلے کی نافراہمی سے
دل لے کے کہاں رکھا تھا میں نے — وہ پوچھ رہا ہے اب ہمی سے
ناقص ہے رسالۂ خموشی — اک حرف کی مستقل کمی سے

اک بوند نہیں ہے دل میں باقی
آنکھوں کی ہمیشہ پُرنمی سے

احمد جاوید

غزل

ہرگو نہ مختلف جو گل و نسترن سے ہے
وہ غنچہ اے نسیمِ سحر کس چمن سے ہے

نسبت جو خامشی کو ہمارے سخن سے ہے
احمد کو احمد اور حَسَن کو حُسن سے ہے

سلوانے لے چلا ہے مرے چاکِ جیب کو
ناصح کا جو بھی کام ہے بیہودہ پن سے ہے

مانا کہ شیخ جی جبلِ علم ہوں گے آپ
ہم کو فراغ مدرسۂ کوہ کن سے ہے

ہم پر نہ چل سکے گی اساغوجی آپ کی
نسبت ہماری بارگہِ پنجتن سے ہے

کچھ درک ہم بھی رکھتے ہیں میاں صرف و نحو میں
ہر فعل دل کا مصدرِ نایافتن سے ہے

دیکھا ہے صیغۂ متکلّم کی بحث میں
اک حرف، مختلف جو بہت مَا و مَن سے ہے

بے ڈھب سا ہے یہ حالیۂ ناتمامِ دل
گاہے گریستن سے گہے سوختن سے ہے

پہلی نظر پہ دیتے ہیں دل، دوسری پہ سر
معمول عاشقوں کا یہ عہدِ کہن سے ہے

احمد جاوید

غزل

چشم کو دل کے بغیر اُس کا تماشائی نہ کر
اندریں حال اسے آمادۂ بینائی نہ کر

یہ نہیں ہے کہ دلا انجمن آرائی نہ کر
ہاں مگر سرد ابھی شعلۂ تنہائی نہ کر

تیرے بیمار سے کہتے ہیں یہ عیسیٰ نفساں
خلق کو منکرِ اعجازِ مسیحائی نہ کر

اے صبا لائی ہے اُس گل کی خبر تو لے آ
ہم سے اب تو یہ ابھی لائی، ابھی لائی نہ کر

دل تو ہے حجرۂ مہمانیِ دلبر اس میں
غیر تو غیر ہے اپنی بھی پذیرائی نہ کر

آنکھ پر اتنا بھروسا بھی مرے بھائی نہ کر

یہ جو اک چیز ترے دل میں ہوئی ہے پیدا
اس کو شرمندۂ خاموشی و گویائی نہ کر

اے نسیمِ سحری کس نے کہا ہے تجھ کو
باغ میں پرورشِ غنچۂ تنہائی نہ کر

انیسؔ اشفاق

غزلیں

کون کہتا ہے کہ تیری چشمِ حیرانی میں ہے
وسعتِ صحرا تو میری چاک دامانی میں ہے

تو نہیں ملتا نہ مل، اس کا نہیں شکوہ مجھے
جو خرابی ہے وہ تیری زود پیمانی میں ہے

ساری جاگیریں یہیں سے بانٹتا رہتا ہوں میں
بادشاہی کا مزہ تو دل کی سلطانی میں ہے

ہے جو پرواز تو شب بھر شعلۂ روشن میں وہ
زندگی تیری اسی شمعِ شبستانی میں ہے

آنکھ کیا سیکھے گی اس کے سامنے آئے بغیر
حرفِ حیرت کا سبق تو آئینہ خوانی میں ہے

بیٹھ جانے دے اُسے تو میں نظر آؤں مجھے
میرا پیکر بھی اُسی گردِ بیابانی میں ہے

ذکر بس میرا حکایت نامۂ وحشت میں ہے
موج بس میری یمِ صحرا کی طغیانی میں ہے

لطف جو پیرایۂ رنگ و چمن میں ہے انیسؔ
رنگِ چیں میں ہے نہ وہ سبکِ خراسانی میں ہے

سواری مہر کی وادیِ ہوئے رفتگاں میں ہے
عجب اک روشنی سی دیکھ کوئے رفتگاں میں ہے

معطّر کر گئی میرے چمن کے سارے پھولوں کو
نہ جانے کون سی تاثیر بوئے رفتگاں میں ہے

پتہ لکھا نہ لوحِ جستجو پر اپنی منزل کا
خودی کیسی فنا آموز خوئے رفتگاں میں ہے

میں اس کو ڈھونڈتا ہوں اور وہ موجِ ستارہ جو
شعاعِ مہر سی رخشندہ جوئے رفتگاں میں ہے

انھیں کے حرف میں ہیں نیستی کی ساری تعبیریں
عدم کا رمز روشن گفتگوئے رفتگاں میں ہے

آگے یہ گریباں نہ کبھی چاک کروں گا
وحشت سے ترے دشت کو اب پاک کرونگا

جس دن بھی ہوا تیز مرا شعلۂ ظلمت
اس دن ورقِ مہر تجھے خاک کروں گا

شب اس کے لئے مسندِ مہتاب بچھا کر
تاروں کا تماشہ تہِ افلاک کروں گا

دیکھوں گا ابھی اور بھی خنجر کی روانی
قاتل کو ابھی اور بھی سفّاک کروں گا

اُس کو بھی بناؤں گا خورشس آموزِ تلاطم
اور خود کو بھی خار و خس و خاشاک کرونگا

بل کھاتے ہوئے جسم پہ اک زخم لگا کر
اِس مارِ محبّت کو غضب ناک کروں گا

دوڑائے گا وہ آہوئے چالاک کہاں تک
اِک دن تو اُسے بستۂ فتراک کروں گا

انیس اشفاق

غزلیں

میں دل کو اِک نئی دنیا دکھانے والا ہوں
سُوئے ستارۂ و مہتاب جانے والا ہوں

کوئی فرشتہ مرے گھر میں آنے والا ہے
میں فرشِ راہ پہ آنکھیں بچھانے والا ہوں

کھڑا ہوں در پہ ترے دولتِ زیاں کو لئے
نکل کے دیکھ، خزانے لٹانے والا ہوں

تری بھی آنکھ میں دیکھوں گا موجِ اشکِ رواں
تجھے بھی شہر کا نوحہ سنانے والا ہوں

اگر تو ٹالنے والا ہے اپنے وعدے کو
تو وعدہ کر کے بھلا میں کب آنے والا ہوں

لہو میں ڈوبنے والے ہیں بام و در میرے
میں تیغ و سر کی روایت اٹھانے والا ہوں

بعید کیا ہے کہ ہو جائے یہ چمن سیراب
قریبِ خیمۂ گل نہر لانے والا ہوں

انیسؔ اشفاق

غزلیں

جب بھی گھر سے نکلوں سب کے ہاتھ میں خنجر دیکھوں
کب تک اپنی آنکھوں سے میں لہو کے منظر دیکھوں

کتنے دن سے چیخ رہا ہے قلعۂ دل میں کوئی
کتنے دن سے سوچ رہا ہوں اندر جا کر دیکھوں

ایک پرندہ کالی آنکھوں والا میرے اوپر
میں جس کے پنجوں کی زد میں اپنے شہپر دیکھوں

پیلی شام نے زرد شجر کی شاخ کو چھو کر دیکھا
ڈھل جانے سے پہلے تجھ کو میں بھی دم بھر دیکھوں

ایک علم آئینہ میرا اور میں ایک اکیلا
آنکھ اٹھاؤں چاروں طرف دشمن کے [illegible]
[illegible] دور میں روشن کر کے تعبیریں [illegible]
روز مکانِ چشم میں اپنے خواب منوّر دیکھوں

جس موسم میں اُس کے بدن کا باغ ہرا ہو جائے
اُس موسم میں اپنے بدن کا باغ معطّر دیکھوں

ساعتِ شب میں ایک ستارہ بن کر میں بھی چمکوں
اڑتی ہوئی کچھ نور کی پریاں تیرے فلک پر دیکھوں

فرارِ خوفِ عدو سے قبیلے والے ہوئے
اکیلا میں ہی کھڑا ہوں علَم سنبھالے ہوئے

گلی میں اُس کی بھی ہو آنا چاہیے مجھ کو
بہت دنوں سے ہوں میں دل کی بات ٹالے ہوئے

کھڑے ہیں دونوں کسی فیصلے کے ہونے تک
[illegible] نکالے ہوئے

مگر کسی کو نہ سیراب کر سکا اب تک
اگرچہ مشک ہوں دریا میں کب سے ڈالے ہوئے

کوئی ستارہ بُلاتا ہے مجھ کو اپنی طرف
قبائے نور سے چہرہ ذرا نکالے ہوئے

ہو تیری شمع، کہ اُس کا دیا، کہ میرا چراغ
کسی کا نور سہی، راہ میں اُجالے ہوئے

ذکاء صدیقی

غزلیں

ہر اک جانب سے پتھر آ رہے ہیں
دلوں کے چور باہر آ رہے ہیں
تجھے کب تک بچاؤں اے مرے دل
پھر اُن یادوں کے لشکر آ رہے ہیں
اُداسی کا سبب کچھ بھی نہیں ہے
مگر آنسو برابر آ رہے ہیں
اسی امّید پر جیتا رہا ہوں
کہ اب حالات بہتر آ رہے ہیں
وہ فرطِ نا امیدی ہے کہ شکوے
دعا بن کر لبوں پر آ رہے ہیں
فضائیں منتظر ہیں سانس روکے
پرندوں کے نئے پر آ رہے ہیں

ذکاء، بچوں کو پھر لکھا ہے میں نے
بس اب کچھ دن میں ہم گھر آ رہے ہیں

کل شب وہ سنسان فضا ــــ پھر خاموشی
ایک تو میں خود تنہا تھا ــــ پھر خاموشی
تھوڑی تھوڑی دیر میں میری کھڑکی پر
گھٹ گھٹ کر روتی تھی ہوا ــــ پھر خاموشی
ریل کی سیٹی جیسے کسی برہن کا بین
درد سے بوجھل ایک صدا ــــ پھر خاموشی
تیز ہوا نے دستک دی دروازے پر
سارا کمرہ چونک اٹھا ــــ پھر خاموشی
تنہائی سے دل نے کیا سرگوشی کی
شور ہوا کچھ یادوں کا ــــ پھر خاموشی
میرؔ کے دو اِک دل زدگی کے شعر پڑھے
تھوڑی دیر کا ہنگاما ــــ پھر خاموشی

کل کی شب تو خیر کسی صورت گذری
آج کی شب پھر سنّاٹا، پھر خاموشی

ذکاء صدیقی

غزلیں

اندھیرے میں کوئی روشن ستارا سوچتے رہنا!
یونہی ہوتا ہے ذہنوں میں اجالا سوچتے رہنا!

اندھیرا ذہن میں ہوتا ہے، راہوں میں نہیں ہوتا
سفر میں روشنی کا استعارا سوچتے رہنا!

بشارت دی ہے مجھ کو میرے دل نے رُت بدلنے کی
مگر یہ بھی کہا ہے: دُکھ خزاں کا سوچتے رہنا

میں جب کچھ سوچنا چاہوں وہ آنکھیں یاد آتی ہیں
کہ مجھ سے بات کرتے میں بھی گویا سوچتے رہنا

کڑی دوپہر کی تنہائی کا اک یہ بھی مصرف ہے
اندھیرا کرکے اس کا چاند چہرا سوچتے رہنا

ذکاء، پاگل نہ ہو جاؤ کہیں، یہ کیا طریقہ ہے!
کسی سے اپنے دل کا دُکھ نہ کہنا — سوچتے رہنا

جہاں اڑایا تھا ہوا نے گوشہ اک نقاب کا
وہیں سے آج نور رے گا چہرہ ماہتاب کا

نظر جواں ہو، اور تھوڑے فاصلے سے دیکھئے
تو آئینے میں اپنا عکس اُبھرتا ہے شباب کا

جہاں جہاں حقیقتوں سے دل نے مات کھائی ہے
نکھر نکھر گیا ہے رنگ ایک ایک خواب کا

سوال کرنا یوں بھی اپنی وضع کے خلاف ہے
دماغ بھی نہیں ہمیں نوازشِ جواب کا

خود اپنا دشتِ جاں ہے جسمیں اپنی پیاس دفن ہے،
وہیں کہیں سے پھوٹتا ہے چشمہ ہر سراب کا

ذکاء اگر میں اپنے ذوقِ حسن کا قتیل ہوں
اُسے بھی ہے غرور میرے حسنِ انتخاب کا

صلاح الدّین محمود

اسماء نور کے نام

پہلی بار جب
تم نے مجھ کو دیکھا تھا
تو تمہاری آنکھیں، مجھ میں
دور اور قریب
ایک ساتھ دیکھتی تھیں،
میری ہتھیلیوں سے
ابھی پچھلی بارش کا پانی
خشک نہ ہوا تھا
اور نہ تم
دن کے بہتے دریا پر
اڑتے ہوئے لاتعداد پرندوں کا
مسلسل عکس تھیں،
پھر آہستہ آہستہ
ہتھیلیاں خشک ہو گئیں
دریا
خاک کی سہار میں رہتا رہتا

سمندر تک جا پہنچا
اور دونوں کناروں پر
شام چھا گئی

جھٹ پٹے ہیں
چاند اور سورج ایک ہوتے ہیں
اور وقت کی کوکھ میں
ایک چڑیا کی آواز جیسی ٹیس
بار بار اٹھتی ہے،
کہتی ہے،
سمندر کے حافظے سے
دریا کو واپس کھینچ لائیں
میدانوں کو، بھولتی ہوئی باتوں کی یاد سے
بھر دیں
درختوں کو پھر سے
پرانے پانیوں سے سیراب کریں
پہاڑوں کا دامن
پھر سے دھو کر
پاک کر دیں

مگر
نہ تو اب تم ہو
اور نہ ہی میں

ڈاکٹر خالد علوی

رُوحانی بے وفائی کا نوحہ

عین اس ساعتِ کمیاب میں بھی
جب کہ لب بوسوں کی زد میں ہوں
بدن،
دستِ ہوسناک میں قید
روح پر اُس کی،
تصرّف نہیں ہونے پاتا
وہ کسی اور کے بستر میں چھپی رہتی ہے

عشرت ظفر

عذابِ ہجر

اکیلا میں ہی نہیں ہوں عذابِ ہجر میں قید
یہ کائنات کا صحرائے بے کنار و بسیط
سلگ رہا ہے مرے ساتھ، اور فضاؤں میں
برس رہی ہے مرے آنسوؤں کی آتشِ نم
سیاہ رات کے دامن پہ ایک نقشِ قدم
ہزاروں لمحوں کا بیدار و جاوداں منشور
ہوا کی زد میں ہے لرزیدہ میرا برگِ وجود
لہو لہان ہے میری طرح مرا ـــــ معبود
افق کی شاخ سے ہر لمحہ چاند کی کرنیں
لپکتی رہتی ہیں خونخوار ناگنوں کی طرح
مرے بدن کے سراب آفریں جزیروں میں
ستارے رینگتے رہتے ہیں بچھوؤں کی طرح

کتاب

رفعت سروش

وہ اک کتاب کہ جس کو نہ پڑھ سکا کوئی
جنونِ شوق میں پھاڑے گئے ورق کتنے
جگہ جگہ سے تو بوسیدہ ہو گئی، لیکن
تمام حرف اچھوتے ہیں،
اور معانی تک،
پہونچ نہ پایا ہے شاید کسی کا ذہنِ رسا
ورق ورق یہ کتاب،
تمہارے ریک میں رکھی تھی،
میں اٹھا لایا

شکستِ خواب

اِک چھناکا ہوا،
کیا یہ چھت سے گرا؟
آنکھ مل کر جو دیکھا،
تو کرچیں تھیں پلکوں سے اُلجھی ہوئی
یہ کوئی خواب تھا،
جانے کب سے تھا آنکھوں میں سویا ہوا
یک بہ یک ٹوٹ کر گر پڑا

آسمان میں کھڑکی

اندھکار کی دیواروں میں
اک دن ہاتھ لگی کھڑکی
بہت پرانی سی کھڑکی
پل بھر میں
آسمان کی اور کھلی
روشنیوں کا ایک سمندر
سانسوں میں لہرایا
آنکھوں کے آنگن میں رچی
اندر دھنش کی رنگولی

کالی چڑیا

بھورے بھورے
آسمان پر
اڑتی اک کالی چڑیا
دھیرے سے نیچے اتری
کسی چور دروازے سے
میرے بستر تک آئی
اور میری چھاتی پر بیٹھی
لیکن میرے دل کی دھڑکن سنتے ہی
آسمان پر لوٹ گئی!

جینت پرمار

مرینا بیچ

شام ڈھلے
اتار کر اپنے کاندھے سے
جلتے سورج کا پتھر
سارے دن کا تھکا ہوا
رنگ برنگے بلّون آسمانوں میں اڑاتا
سیٹی بجاتا
مرینا بیچ پہ گھومنے نکلا
ننگے پاؤں
نیلا سمندر

شملہ میں ایک شام

جینت پرمار

دور دور تک
کھیت، پہاڑ
پہاڑ کے تن ڈھانپ رہی ہے
برف کی چادر
دیودار کے
لمبے لمبے پیڑ کھڑے ہیں
اوورکوٹ پہن کر
پیڑوں کے ہاتھوں میں بوتل کہرے کی
سفید بادل بے مقصد
اِدھر اُدھر اڑتے ہیں
ابر کا اک چوکور ٹکڑا
کھڑکی کھلتے ہی
کمرے میں گھستا ہے
[illegible]
مال روڈ پر
بار میں
سامنے رکھ کر
وہسکی کا اک آدھا پیگ
ہنس کر کہتا ہے:
لوچیرس!!

اوٹی میں ایک رات

سرد ہواؤں کی ندی پر
بہتے پیڑ
اور پیڑوں سے رِستا شور
زمیں روشن جگنو سے
جگمگ کرتے تاروں کی
تصویر لگی تھی کھڑکی میں
نیل گری کے پیڑوں نے
کالی ہواؤں کے اوراق پہ
لکھیں خوشبو کی نظمیں
صبح ہوئی تو ـــــ
پہاڑ کے [illegible]
سورج کا اک پھول
پیڑ کھڑے تھے کیسے ساکت
سبز گھاس کی چادر پہ
پیوند لگے تھے بادل کے
جھیل کا آئینہ ٹوٹا تھا!
ایک ستارہ ڈوب رہا تھا

سازینہ

فرض کرو

فرض کرو
ہم کسی چھوٹے سے بانس کے گھر میں رہتے ہوں
اس کی چھوٹی موٹی کھڑکیوں سے تھوڑی سی دھوپ
پتلی پتلی بانس کی سینکیوں سے چھن کر آتی ہو
دروازے کی جافری سے دور بکریوں کا جھنڈ نظر آتا ہو
آس پاس مرغیوں کے چھوٹے چھوٹے چوزے
کٹر کٹر کرتے ہوں

فرض کرو
یہ چھوٹا سا، پیارا سا بانس کا گھر
کسی اونچے ٹیلے پر بسا ہو
ہم ڈوبتے سورج کو سامنے کی پہاڑی کے پیچھے
منہ چھپاتے دیکھتے ہوں
مچھلیوں کو اونچی چھلانگ لگاتے
اور پھر سے جھرنے کی سطح پر تھرکتے دیکھتے ہوں
جب کوئی ہمارا تعارف چاہے
تو ایک دوسرے کو دیکھ مسکرا دیتے ہوں

فرض کرو
ہم ہم نہ ہوں
دھن دولت، عیش و آرام کے سارے قفس توڑ کر
بھاگے ہوئے نادان نوجوان عاشق ہوں
جو گھاس کے بھی پیر سے کچلے جانے سے ڈرتے ہوں
اور ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ
دوڑ دوڑ کر پسینے سے لت پت
ننگے پیر ——— پتھر کے ٹیلے پر بیٹھ کر
ہانپتے جاتے ہوں ——— ہانپتے جاتے ہوں
ہنستے جاتے ہوں ——— ہنستے جاتے ہوں
ہتھ کلف اور رجبن کی طرح
ایک دوسرے کے لئے جھوٹ بولتے ہوں
ماں باپ سے پٹ جاتے ہوں
اور ایک دوسرے دن پھر
ایک ساتھ کھیتوں میں
کھیلنے کے لئے بھاگ جاتے ہوں

فرض کرو
یہ سب سچ ہو جائے

حبیب حق

امّید

آفتاب نیچے اُتر آیا تھا
جملہ اشیاء جل چکی تھیں
میں سر ڈھانپے سوختہ پڑا تھا
آفتاب نے میرے برابر لیٹنے کی سعی کی
حدّت نے اُسے ایسا کرنے نہ دیا

رات، مجھے امّید تھی،
بارش آن کر مجھے تر و تازہ کر جائے گی

بے بسی

اُس نے مجھے آوازیں دیں
میں نزدیک گیا
اُس کی دونوں آنکھیں ناپید تھیں
ہاتھوں میں ایک شمع
ہونٹوں پر ایک صدا

میں شمع روشن نہیں کر سکتا تھا
میرے ہاتھ مونڈھوں سے غائب تھے
محض آنکھیں روشن تھیں
اور وہ بھی بدمست

کاوش عبّاسی

اکارت

آج بھی میں وہی خام جنونی
جو یہ سمجھتا ہے
برسوں کے چھوڑے کام کو
ایک رات کی برق تپاں سی، جست میں پورا کر سکتا ہے

میں نہیں جانتا
اِس کو جتنی اِکائیوں میں بھی ناپ کے دیکھو
ایک رات تو ایک رات ہے
ایک رات جتنی بھی پھیلے، جتنی چمکے
سالوں کو کیا پاٹ سکے گی
دل کو اِک مدّت سے کاٹتے، کھاتے
زیاں کے زنگ کو کیسے چاٹ سکے گی

میں نہیں جانتا
لیکن جب یہ رات کٹے گی
اور اپنا دامن جھٹکے گی
تب جانوں گا
خام جنوں کی روشن کردہ رات کا دامن
میرے اکارت سالوں ہی کی طرح خالی ہے

خالد سعید

ایک یوں ہی سی نظم

ہر بڑے شہر میں ایک ایم۔جی روڈ ضرور ہوتی ہے
ہر بڑے شہر میں کہیں اک دل بھی ضرور ہوتا ہے،
جو کسی صدا، کسی آہٹ، کسی دستک کا منتظر ہوتا ہے۔
لیکن اس کا مطلب یہ نہیں
کہ کوئی بھی آہٹ، کوئی بھی دستک اُسے کھلنے پہ مجبور کرتی ہے۔
یہ تو صرف اُسی وقت ممکن ہے،
جب کواڑ خوابوں سے بھر جائیں،
جب پپوٹے یادوں سے بوجھل ہو جائیں،
اور شاخوں پہ شگوفوں کی جگہ اپنی آنکھیں پھوٹتی ہوئی دیکھیں۔

یا پھر
جب سانسیں اکتائی اکتائی ہوئی چلتی رہیں،
جب انگلیاں لمس سے خالی ہو جائیں،

اور آنکھیں نیند کی لذّت سے ۔
ایسے میں کوئی یوں ہی مل جائے
اور یوں ہی ملتے رہیں
یوں ہی بات بے بات پہ ہنستے رہیں،
اور ہنستے ہنستے آنکھوں میں نمی سی تیر جائے ۔

یا کسی بازار میں، بھیڑ سے گزرتے ہوئے
سامنے سے، تیزی سے آنے والے مرد کے ارادے کو بھانپ کر
اُس کی ٹکّر سے اُسے بچانے کے لئے
یوں ہی ذرا سی ڈھال بن جائے ۔

یا پھر کسی بھیگے ہوئے موسم میں
جھٹپٹے کے سَمے، کسی پُلیا پہ بیٹھے ہوئے،
یوں ہی کچھ سنتے سناتے رہیں
اور آسمان بہت نیچے جُھک آئے،
اتنا نیچے کہ اُس کے بالوں کو چھونے لگے
اور اندر کہیں چنگاریاں سی اڑنے لگیں ۔

یا بس میں بٹھاتے ہوئے،
ہنستے ہنساتے ہوئے، بے تعلّق سا ٹھہرے رہیں ۔
ڈرائیور کو ہوٹل گئے بہت دیر ہو چکی ہو،
سفر اور وقت کاٹنے کے لئے، اُس کے لئے
رسالہ خریدنے بُک اسٹال جائیں،

اور لوٹیں تو بس جا چکی ہو،
ٹھہری ہوئی دوسری بسوں کو کچھ دیر یوں ہی دیکھا کریں،
پھر یوں ہی ہنس پڑیں اور سر جھکائے ہوئے واپس چلیں۔

یا پھر خط لکھا کریں
کبھی موسم، کبھی اجودھیا اور کبھی کسی فلم،
یا کبھی کسی انجان ساحل کے بارے میں
اور بہت سا، یوں ہی کچھ لکھتے رہیں۔
یوں ہی سے خط
جنھیں پڑھ کے بعد میں خود ہی ہنس پڑیں،
مگر کالج کو جاتے ہوئے لیٹر بکس یا دریچے ہی میں اپنی آنکھیں چھوڑ جائیں۔

یا دیوان خانے میں بیٹھے،
کافی کے پیالے کو تھامے ہوئے،
چونک کر جو دیکھیں، تو دیکھیں:
دور بہت دور تک دروازے ہی دروازے کھلتے گئے ہیں،
دور بہت دور تک راستے ہی راستے بچھتے گئے ہیں۔
اور پلٹ کر جو دیکھیں
دور بہت دور تک کھلے ہوئے دروازوں کا سلسلہ ہے،
دور بہت دور تک اپنے ہی قدموں کے نشاں بکھرے پڑے ہیں۔

اور سوچا کریں...
کہ کب میں نے دی تھی صدا؟
اور کب میں نے دستک دی تھی؟؟

آشا پربھات

گاؤں کا المیہ

جب تم لوٹو گے
تو دیکھنا
شہر کی ویرانیاں
ابابیل کی طرح
یہاں کبھی اپنا ڈیرہ ڈال چکی ہیں
اب کسی بھی آنکھ میں
پہچان کی خوشبو نہیں ہے
چوباروں کے دیے
کب کے بجھ چکے ہیں
بہت ہی جان لیوا سناٹا
وہاں لیٹا رہتا ہے
جب تم لوٹو گے
تب امرائیوں میں
کھڑے پیڑوں کی
بے حد اُداس
سرگوشی سُنو گے
بچے گھاٹوں والی
ندی کا تٹ
مولسری کا پیڑ

تھیر جل دھارا
اور
چوپالوں میں بجھے ہوئے
گھوروں کی راکھ
تمھیں پل بھر
ٹھہرنے کی دعوت
نہیں دیں گی
جب تم لوٹو گے
تو دیکھنا

آشا پربھات

میری اُداس آنکھیں

ہر سو
دُھند کا پہرہ ہے
رات خاموش ہے
مٹ میلی چاندنی
اُتر آئی ہے میرے آنگن میں
ہاتھوں میں
یادوں کے چراغ لیے،
کھولتی ہوں کھڑکیوں دروازوں کو...
آج
خوبصورت لگ رہی ہیں
میری اداس آنکھیں
دُکھ کے آئینے میں
آج
میں نے دیکھا ہے اپنا چہرہ
آج میں کوئی گیت
گنگنانا چاہتی ہوں

تمھارے جانے کے بعد

اکثر تمھارے جانے کے بعد
دریچے کھلتے ہیں
بند ہوتے ہیں
شوخ لہریں
سرکشی کرتی ہیں
کناروں سے
سانپ کے کینچل کی طرح
سمندر کی لہریں
سمٹتی ہیں سکڑتی ہیں
اور اپنی ہی گہرائی میں ڈوب جاتی ہیں
کچھ لمحے
ناؤ کی مانند
سطح پر ابھرتے ہیں
اور اوجھل ہو جاتے ہیں... !

خصوصی مطالعہ

پیش لفظ ——————— بلونت سنگھ

افسانے

پیپرویٹ، کٹھن ڈگریا، رشتہ، مٹی کی موت
بابو مانک لعل جی، پنجاب کا البیلا، پہلا پتھر، مہمان
دیمک، گرہستی، خلا، دیش بھگت، جگا

آپ بیتی

عہدِ نو میں ملازمت کے تیئس مہینے ——— بلونت سنگھ

بلونت سنگھ کے بارے میں: ممتاز شیریں، حمیدہ عثمانی، شاہدہ پروین، عابدہ حسن منٹو، فائز فلیط، انور سدید

مضمون

صاحبِ نظر بلونت سنگھ ——————— شمس الحق عثمانی

بلونت سنگھ

پیش لفظ

ہمارے ہاں (پنجاب میں) چند شریف عورتوں کی ایک کہانی مشہور ہے۔ وہ سفر کر رہی تھیں۔ گرمیوں کے دن، دوپہر کا وقت، دھوپ کی تمازت — رواں رواں کرتے ہوئے ایک رہٹ کے قریب بڑ کی گھنی چھاؤں دیکھ کر انھوں نے آرام کرنے کی ٹھانی۔ کھانا نکالا۔ جس میں لچیاں اور حلوہ بھی شامل تھا۔ لچی کو میدے سے بنی ہوئی لجلجی سی سفید سفید پوری یا چپاتی سمجھ لیجئے۔ بڑی لذیذ ہوتی ہے۔ پرے ایک تھکا ماندہ ان گھڑ جاٹ بھی سستانے کے لئے آبیٹھا۔ اس نے بھی تنور کی پکی ہوئی بھاری بھرکم روٹیاں نکالیں اور ایک بڑی سی پیاز توڑنے ہی کو تھا کہ اس نے سنا "آؤ بہنو! پہلے لچیاں کھائیں"۔ اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے اپنی روٹیوں کی طرف دیکھا، جو اُس کی نیت کے فتور کو بھانپ کر اس کو یوں گھور رہی تھیں جیسے اُسے کھا ہی جائیں گی۔ مگر اس نے پروا نہ کی اور روٹیوں کو لچیوں میں پھینکتے ہوئے بولا "لو بہنو! یہ دو لچ (بصیغۂ تذکیر) میرے بھی شامل کر لو"۔ کہتے ہیں اس پر عورتوں کی لچیاں بھرشٹ ہو گئیں اور انھوں نے سب کچھ جاٹ کے حوالے کر دیا.... یہ کہانی راجندر سنگھ بیدی کو سنانے کے بعد میں کہتا ہوں "سو میاں! ہم نے تمہاری ادبی لچیوں میں اپنے بے ادب لچے زبردستی ٹھونس رکھے ہیں"۔ یہ سُن کر بیدی اپنی داڑھی کو (جو روز بروز کم سے کم تر ہوتی جا رہی ہے) کھجانے لگتا ہے "ارے بھئی یہ بات نہیں۔ تو لکھا کر (کچھ پس و پیش کے بعد) فلاں! (واللہ) خوب لکھتا ہے تُو... وا (واہ!)"۔ اس کے بعد وہ آنکھیں جھپکا جھپکا کر مجھ کو بڑے غور سے دیکھتا ہے جیسے سوچ رہا ہو کہ کہیں کمبخت نے میری دلی کیفیت بھانپ تو نہیں لی۔ اُس وقت میں تہمد باندھے چماروں کے پیر طریقت کی طرح چارپائی پر بیٹھا ہوتا ہوں۔ اور بڑی آسانی سے اس کی دلی کیفیت کا اندازہ لگا لیتا ہوں۔ یعنی "میاں! تم کہاں آن پھنسے۔ اس سے بہتر تو محلّے کے راجہ بھوج کے کولھو کے آگے صبح شام جُت لیا کرو"۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی۔ چند دن ہوئے کرشن چندر کی چٹھی موصول ہوئی۔ فرماتے ہیں "آپ سے ملے ایک مدت ہو گئی ہے لیکن آپ کی مجرمانہ ذہنیت اب بھی یاد آتی ہے۔ لاہور نے آپ کو "متمدن" تو نہیں بنا دیا....." یہ ہے میری عظمت۔ یعنی اگر کرشن چندر میرے پاس بیٹھے ہوں تو ایک ادیب کی قربت کا احساس کرنے کے بجائے اُن کا سارا وقت اپنی جیبوں کی خبر گیری میں ہی گزر جائے اور اگر میری بد قسمتی سے ان کی جیبیں خالی ہوں تو وہ ایک ہاتھ سے اپنی پتلون اور دوسرے سے کوٹ یا ہیٹ مضبوطی سے پکڑے رہیں گے۔

ایسے زبردست ادیب کی شہادت کے بعد اگر ایک بات اور سنا دوں تو امید ہے اسے دروغ گوئی نہ سمجھا جائے گا۔ میرے ایک

بڑوسی رازدارانہ لہجہ میں مجھ سے کہنے لگے "بھئی دیکھو بُرا نہ ماننا معاف کرنا ... تم صورت سے جرائم پیشہ معلوم ہوتے ہو... بھئی معاف کرنا۔"
بھئی! میں نے تم کو معاف کیا، تمہارے بیٹوں پوتوں بلکہ نوعِ انسانی کو معاف کیا۔ اس کے بعد میں کیا لکھوں۔ اگر لکھوں بھی تو اعتبار کون کریگا۔
زمانہ کی روش یہ ہے کہ نہ صرف لکھتے ہیں بلکہ یہ بھی ثابت کر دیتے ہیں کہ جو کچھ لکھا گیا وہ دنیا کے کسی شاہکار سے کم نہیں۔ یہ زمانہ کی ضرورت ہے۔
قصور اس میں کسی کا بھی نہیں۔ یہاں تک کہ اگر آپ کچھ بھی نہ لکھیں اور پھر ثابت کر دیں کہ اگر آپ لکھتے تو چوٹی کے ادیب ہوتے تو یہ تسلیم کر لیا جائیگا کہ آپ چوٹی کے ادیب ہیں۔ المختصر، یہ پراپیگنڈا کا زمانہ ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ میں کچھ لکھوں۔ اور میرا وقت کچھ نہ لکھنے میں گزر رہا ہے کیونکہ میں لکھ ہی نہیں سکتا۔

ممکن ہے کوئی صاحب رائے دیں کہ کسی اور سے لکھوا لو۔ معقول۔ لیکن ایمانداری سے سوچتا ہوں کہ مجھ کو اپنے دوستوں میں سے کسی سے بغض تو ہے نہیں کہ اُسے آزمائش میں ڈالوں۔ کچھ عرصہ پیشتر چوہدری نذیر احمد نے میری ہی کتاب کے اشتہار کے لئے مجھ ہی سے اس کا مضمون مانگا۔ میں دم بخود۔ ہے کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ — بیچارا بیدی قریب تھا۔ پھانس لیا میں نے۔ میں جانتا ہوں اس مضمون سازی میں اس کو کس روحانی اذیت کا سامنا کرنا پڑا۔ بالآخر جو کچھ لکھا وہ مفہوم کے اعتبار سے فلم بنسری میں چارلی کے اس گیت سے ملتا جلتا تھا:

میری ہاں کو ہاں نہ سمجھو   میری نہ کو نہ، نہ سمجھو
میری ہاں کو نہ، نہ سمجھو   میری نہ کو ہاں نہ سمجھو

اس میں بیدی کا قصور نہیں۔ سو فیصدی اگر دن زدنی تو میں ہی قرار دیا جا سکتا ہوں۔ بیدی تو نکلے مانند اصیل مرغ کی طرح ڈٹا رہا یعنی وہ میدان چھوڑ کر بھاگا نہیں — علاوہ ازیں کسی عزیز دوست کو اس آزمائش میں نہ ڈال کر مجھ سے ایک آدھ نیکی سرزد ہو جائے تو حرج ہی کیا ہے۔

اب تک جو افسانے میں نے لکھے ہیں ان پر نہ تو مجھے فخر ہے اور نہ شرمندگی۔ جب میں اوّل سے آخر تک ان کا جائزہ لیتا ہوں تو مجھ کو اپنا پہلا قدم بھی دلچسپی سے خالی معلوم نہیں ہوتا۔ اسی لئے میں نے اپنا پہلا افسانہ بھی پیش کر دیا ہے (حوّا کی بیٹی...) انسان آگے بڑھنے سے اسی صورت میں رہ جاتا ہے جب وہ اپنی حالت سے یا تو مطمئن ہو یا مایوس۔ یہاں اِن دونوں میں ایک بھی نہیں۔

ایک چیز پڑھنے والے کے دل میں شاید اور بھی زیادہ کھٹکے۔ میری کہانیوں میں تضاد۔ نہ صرف موضوع کے لحاظ سے بلکہ طرزِ بیان کے اعتبار سے بھی۔ زندگی کے کسی خاص شعبے یا مسئلے پر اپنی تمام تر توجہ مرکوز کر دینا (میں تو یہ نہ کہوں گا کہ بُرا ہے یا بھلا — بلکہ یہ کہ) میرے بس کا روگ نہیں۔ میری ذہنی آوارگی مجھ کو ہر جگہ لے جاتی ہے۔ اب رہا طرزِ تحریر، اب تک میری یہ حالت رہی ہے کہ موضوع کے مطابق الفاظ یا لہجہ اختیار کر لیتا ہوں۔ ممکن ہے بالآخر کوئی خاص رنگ پیدا ہو جائے۔

اِس وقت میری حالت بڑی غیر یقینی سی ہے۔ سرِدست میں کچھ بھی نہیں۔ البتّہ "کچھ بن جانے" کی جانب مزے مزے میں بڑھ رہا ہوں۔ دراصل اس وقت میری پوزیشن ایسی نہیں کہ میں ادب پر، یا کسی ادیب کے بارے میں، یا خود اپنی بابت کوئی حکم لگا سکوں۔

(مشمولہ "جگا"۔ لاہور، ۱۸ اپریل ۱۹۴۴ء)

بلونت سنگھ

پیپر ویٹ

وہ کتنا خوش تھا۔ آخر چھبیس برس کی عمر بھی کیا ہوتی ہے۔ اسے ترقی دے کر اب بنک کا مینیجر بنا دیا گیا تھا۔ آہا! اس کی مسرت کا بھلا کیا ٹھکانہ تھا۔ وہ دفتر سے گھر اڑ کر پہنچا جب وہ مدن منیشنز کے صحن میں داخل ہوا تو دفعتاً اس کے لبوں کی مسرت معدوم ہو گئی اس کی بیوی آج پھر ڈرائینگ روم کی کھڑکی کھولے عین اس کے سامنے کاؤچ پر بیٹھی تھی.......

اس نے فرحت کو بار بار منع کیا تھا کہ اس طرح کھڑکی کھول کر نہ بیٹھا کرے۔ سامنے کے فلیٹ پر غالباً کالج کے چند طلبا رہتے تھے۔ جو اکثر تاک جھانک کرتے رہتے تھے۔ فرحت کی عمر بمشکل بیس برس ہوگی۔ کاشمیری ماں کی بیٹی تھی۔ کون تھا۔ جو اسے بے پردہ اپنے سامنے پائے اور پھر دل مسوس کر نہ رہ جائے۔ اور طلبا بظاہر بڑے شریف بنتے تھے۔ کبھی کوئی بدتمیزی نہ کرتے تھے۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ ضرور تاک جھانک کرتے ہیں۔ اگر وہ صحن میں گوالے سے بھی باتیں کرتے تو اسے یہی شبہ ہوتا کہ فرحت کی طرف دزدیدہ نگاہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور اگر فرحت کو سمجھاتا تو وہ کہتی۔ دیکھ لینگے تو میرا کیا بگاڑ لیں گے۔ کیا میں اندر دم گھونٹ کر مرجاؤں اور جب بہت خفا ہوتا تو کہتی اچھا آئندہ نہیں بیٹھوں گی... لیکن وعدوں کے باوجود وہ آج پھر وہاں بیٹھی تھی۔

وہ بھاری قدموں سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔ اس کا فلیٹ دوسری منزل پر تھا راستے میں وہ سوچتا جا رہا تھا کہ آخر اس کا کیا علاج ہو۔ "دروازہ کھلا ہے۔"

اس کے کانوں میں بیوی کی شیریں آواز گونج رہی تھی وہ اس مٹھاس سے زبردستی لطف اندوز ہو گیا۔ چنانچہ جب اس نے اندر قدم رکھا۔ تو بیوی پر ایک دم برس پڑنے کا خیال بھی کمزور پڑ گیا... لیکن اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ بیوی کی اس حرکت کو اور زیادہ عرصے تک برداشت کرنے پر رضامند تھا۔ آج دوٹوک فیصلہ کر دینا چاہتا تھا۔

اس نے ہیٹ اتارا۔ اور بے پروائی سے گھما کر کرسی پر پھینک دیا۔ پھر ٹائی کی گرہ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے خشمگیں نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ ڈبل روٹی کے ٹکڑے کاٹنے میں مشغول تھی۔ اس وقت فضا ایسی تھی کہ اگر وہ پینترا بدل کر ہنسنے کھیلنے لگتا تو بھی کچھ ہرج نہ تھا۔ آج خوشی کا موقع بھی تھا۔ لیکن وہ اس بات پر تلا ہوا تھا۔ اب اس معاملے میں زیادہ ڈھیل نہ دے گا۔

وہ منہ پھیر کر دوسری کھڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور پتلون کے دونوں سروں کو پکڑ کر

اوپر کی طرف کھینچا۔ اس کی کمر پتلی تھی اور چوتڑوں کا ابھار بھی برائے نام ہی تھا۔ نیچے کو ڈھلک ڈھلک جاتی تھی۔ پھر وہ الٹ پلٹ کر اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے ہاتھ بھی چھوٹے چھوٹے ہلکے پھلکے سے تھے۔ انگلیاں پتلی اور نازک۔ ایک تو اس میں یہ بڑی کمی تھی کہ اس کے تیور مردانہ نہیں تھے۔ نہ اس کی آواز بھاری اور بارعب تھی چنانچہ خواہ وہ کس قدر بھی غضب کی حالت میں ہو دیکھنے والے پر خاک رعب نہ پڑتا تھا۔

کھڑکی کے سامنے کھڑا کھڑا وہ انگلیاں چٹخاتا رہا۔ ایک مرتبہ پھر اس نے ابرو پر بل ڈال کر بیوی کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ بچوں کے سے انہماک کے ساتھ اپنے کام میں مصروف تھی یہ بھی ایک بھاری دقت تھی۔ بس اس کے مزاج میں بچوں کی سی سادگی تھی۔ اگر کوئی بات کہو تو وہ نہایت بھول پن سے کوئی سوال پوچھتی۔ اس کا جواب دو تو پھر کوئی اور سیدھا سادا سوال پوچھ بیٹھتی۔ اب وہ محض لڑکی نہ تھی۔ شادی ہوئے لگ بھگ ایک سال ہو چکا تھا۔ لیکن اسے اس بات کی بھی کچھ خبر نہ تھی کہ مرد کن بھوکی نظروں سے خوبصورت عورتوں کو دیکھتے ہیں اگر اسے یہ بات سمجھائیے تو بس ایک ہی جواب دیتی دیکھتے ہیں تو دیکھنے دیجئے..."

اس نے جب دیکھا۔ کہ فرحت کا دھیان اس کی طرف نہیں ہے تو اس نے منہ پھیر لیا۔ اور سوچنے لگا۔ کہ اب گفتگو کا آغاز کیونکر کرے اگر وہ اس کی طرف دیکھ لیتی تو اسے معلوم ہو جاتا کہ وہ خفا ہے۔ اب وہ سمجھ رہی ہے کہ شوہر کپڑے بدل رہا ہے۔ جوں جوں وقت گذرتا جا رہا تھا۔ توں توں خفا ہونے کا امکان کم ہوتا جا رہا تھا۔ دراصل جھگڑا فوراً شروع ہو جانا چاہیئے تھا۔ اس طرح سوچ سوچ کر خفا ہونے میں کوئی اثر پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس نے مزید تاخیر کو مناسب نہ سمجھتے ہوئے بیوی کی طرف پیٹھ پھیر لی اور کہا۔ "فرحت!......."

پھر وہ اپنی آواز کی نوعیت پر غور کرنے لگا کہ واقعی اس سے اس کی دلی ناراضگی کا اظہار ہوتا ہے یا نہیں۔ لیکن وہ کچھ فیصلہ نہ کر سکا۔

"جی"۔ فرحت کی آواز سے یہ ظاہر نہیں ہوتا تھا کہ اسے کسی غیر معمولی بات کا احساس ہوا ہے۔

اب اس نے فیصلہ کیا کہ اسے نہایت ڈرامیٹک انداز میں گھوم کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دینی چاہئیں۔ اور اسے دیر ہرگز نہیں کرنی چاہیئے۔ لیکن جلدی کے یہ معنی بھی نہیں کہ اس کے چہرے سے غیظ و غضب کے آثار ہی مفقود ہوں۔ اس سوچ بچار میں کچھ دیر بھی ہو گئی وہ گھوما تو چہرے سے جذبات کا اظہار تو بالکل صحیح طور پر ہو رہا تھا لیکن افراتفری میں اسے وہ تیکھے الفاظ بھول گئے جو اسے اس موقع پر کہنے چاہئیں تھے دو چار لمحوں تک وہ چپ چاپ بیوی کی آنکھوں میں آنکھیں ملائے رہا۔ لیکن الفاظ نہ ملنے کے سبب وہ چہرے کے جذبات کی شدت کو قائم نہ رکھ سکا۔ وہ جانتا تھا۔ کہ اب اسے کچھ نہ کچھ کہنا چاہیئے۔ "فرحت! آج تم پھر کھڑکی میں بیٹھی ہو

"؟

یہ سن کر فرحت نے بڑے طفلانہ انداز سے دانتوں تلے زبان کو دبایا۔ اور کھڑکی سے ذرا ہٹ کر دوسری کرسی پر جا بیٹھی۔ وہ سوچنے لگا کہ فرحت کہیں موٹی تو نہیں ہو رہی۔ اسے پتلی عورت پسند نہیں تھی وہ ذرا گدرائے ہوئے جسم والی عورت کو زیادہ پسند کرتا تھا۔ اس وقت فرحت کا جسم آئیڈیل جسم تھا۔ لیکن اب اسے اور زیادہ موٹا ہونے کی ضرورت نہیں۔ آج اس کے ہاتھ اور پاؤں مہندی سے رنگے ہوئے تھے۔ صبح اس نے اس بات پر دھیان نہیں دیا اس کے جسم کی رنگت پر مہندی کا رنگ خوب کھلتا تھا.......

خاوند کو چپ چاپ گھورتے دیکھ کر فرحت نے کہا "اب تو میں کھڑکی سے ہٹ گئی ہوں"

اسے دفعتاً یاد آیا کہ اسے خفا ہونا چاہئے۔ اور اس جھگڑے کا ہمیشہ کے لیے فیصلہ کر دینا چاہئے۔ لیکن کس قدر مشکل آن پڑی تھی۔ فرحت کو غلطی کا احساس تک نہیں تو پھر اسے اس حرکت سے باز کیوں کر رکھا جائے۔ آج کل کی لڑکیاں ساتوں آسمانوں کی خبر رکھتی ہیں۔ ایک فرحت تھی کہ بس لڑکپن گیا بچپن چھوڑتی ہی نہ تھی۔ صورت دیکھو باتیں سنو، حرکات سکنات کا مطالعہ کرو کیا مجال جو گہرے سوچ بچار کی ہوا تک لگی ہو۔ ابھی تک جیلی اور کریم کھانے کی شوقین ہے۔ بندر بندریا کا تماشہ دیکھتی ہے۔ اگر کہیں کوئی بدھو شوہر مل گیا ہوتا۔ تو اس آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جاتا۔

پھر اس نے سوچا یہ نئی روشنی کا زمانہ ہے۔ مجھے اپنی بیوی کی نفسیات کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے۔ تبھی اسے سیدھے رستے پر لایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ ایک گہری بحث کیلئے مستعد ہو کر اس نے کہنا شروع کیا۔ "دیکھو فرحت! اب میرے کہنے سے تم ہٹ گئی ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ تم وہاں بیٹھتی ہی کیوں ہو؟" فرحت نے اپنے ناخنوں کی سرخی کو دیکھتے ہوئے کہا یں تو یونہی بیٹھ جاتی ہوں اندر روشنی کم ہوتی ہے، ادھر روشنی بھی خوب ہے کھڑکی کھول دینے سے ہوا بھی آتی رہتی ہے۔

"تم ہوا کا بہانہ گھڑتی ہو ہمیشہ ••••" پھر اس نے سوچا کہ یہ لفظ بہانہ درست نہیں یہاں پر تو یہ معنی ہوئے کہ مجھے فرحت کے چال چلن پر شبہ ہے۔ حالانکہ خواہ کچھ بھی ہو۔ فرحت کے کیریکٹر پر شک نہیں کیا جا سکتا •••• میرا مطلب یہ ہے کہ بار بار اس بات کو دہراتی ہو میں کہتا ہوں کہ غیروں کو دیکھنے کا بہانہ مل جاتا ہے اور وہ تمہیں دیکھتے رہتے ہیں" ••••• پھر اس نے سوچا کہ فرحت کہے گی کہ اگر دیکھتے ہیں تو میرا کیا بگاڑ لیں گے •••• دیکھو نا! دنیا کی زبان نہیں پکڑی جا سکتی •••• اب یہ ناخنوں کا دیکھنا بند کرو •••• جو میں کہتا ہوں وہ بھی تو سن لیا کرو غور سے •••••"

"میں سن تو چکی اتنی بار...."
اس پر اسے بڑا طیش آیا" اگر سنا ہوتا تو عمل نہ کرتیں..."
"میں تو ہمیشہ غور سے سنتی ہوں"
"تو کیا کہہ رہا تھا میں؟"
فرحت نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے لاڈ سے منہ پھلا پھلا کر کہا۔ "آپ کہہ رہے تھے کہ دنیا کی زبان پکڑی نہیں جا سکتی۔"
"ہاں تو میں..."
فرحت اٹھ کر اس کے قریب آگئی اور انگلیاں بڑھا کر بولی "لایئے میں آپ کی زبان پکڑ لوں...."
"خدا کی قسم میں مار بیٹھوں گا... اتنا بھی تو سمجھو کہ جب تم کھڑکی کھول کر سامنے جا بیٹھتی ہو تو دوسرے کیا سمجھیں گے؟
"تو اب وہاں کون بیٹھا ہے...."
گڑ کھلا پڑا ہو تو کیا مکھیوں کو آتے دیر لگتی ہے؟"
"آتی ہیں مکھیاں تو آیا کریں۔ ہمیں ڈر ہے کسی کا؟"
"ہاں تم تو یہی کہو گی.... لوگ اس طرح بات کو نہیں ٹالتے۔
"تو وہ کیا کہتے ہیں....."
کہتے کیا ہیں۔ یہی کہ عورت کی اپنی خواہش ہے کہ لوگ اسے دیکھیں۔ ورنہ خواہ مخواہ کھڑکی میں کیوں آن کر بیٹھے....."
"تو گویا آپ کا مطلب ہے کہ میرا دل چاہتا ہے کہ لوگ مجھے دیکھا کریں..."
"توبہ میری.... بھئی میں نہیں کہتا لوگ کہتے ہیں...."
"آپ نے کسی کو کہتے سنا؟...."
"پھر وہی بات.... بھئی مجھے کہنے کی کسی کی مجال بھی ہے۔ لیکن میں تمہیں سمجھانا چاہتا ہوں کہ آخر شریف عورت....!"
وہ چپ ہو گیا۔ فرحت ایک پھول بالوں میں اڑس کر کھڑکی کے شیشے میں اچک اچک کر دیکھ رہی تھی۔ کہ کیسا معلوم ہوتا ہے۔ اس طرح دیکھتے دیکھتے منہ پھیر کر اس سے مخاطب ہو کر بولی۔
"آپ چائے نہیں پئیں گے۔ آج سلائیس نمکین انڈوں میں تلے جائیں گے...."
"اور میں جو بات کر رہا تھا۔ تم نے بیچ ہی میں کاٹ دی...."
"میں نے کب کاٹی بات آپ خود ہی چپ ہو گئے میں سمجھی بات ختم ہو گئی۔"

وہ تھک کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ انگلیوں سے کنپٹیاں دبانے لگا۔
"کیا سر میں درد ہے؟" فرحت نے پریشان ہو کر پوچھا۔
اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"تو چائے منگواؤں"۔
"نہیں میں چائے نہیں پیوں گا"۔
واہ کیسے نہیں پئیں گے"۔ یہ کہہ کر دونوں ہاتھ پیٹھ پیچھے کئے وہ مٹک مٹک کر آگے بڑھی۔ اس کی آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔"

اب بڑا نازک وقت آرہا تھا۔ عنقریب فرحت اس کو گدگدائے گی۔ گلے میں باہیں ڈال کر لٹک جائے گی۔ لیکن وہ اپنی سنجیدگی قائم رکھنا چاہتا تھا۔ وہ جلدی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور اس انداز سے جیسے اس نے کی طرف دیکھا ہی نہ ہو۔ رکھائی سے بولا "اچھا جلدی سے منگوا لو۔ مجھے بہت ضروری کام سے باہر جانا ہے۔"

نوکر چائے لے آیا۔ چائے پیتے وقت اس نے سنجیدگی کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا۔ دل ہی دل میں وہ سوچتا رہا کہ فرحت کو کیونکر سمجھائے۔ چائے کے خاتمے پر اس نے تولیے سے منہہ پونچھتے ہوئے فرحت کی طرف گہری نظروں سے دیکھا۔ "فرحت حقیقت یہ ہے کہ تم اپنی حرکتوں سے مجھے بہت دکھ پہنچاتی ہو میں نے تمہیں پیار سے سمجھایا خفا ہوا۔ لعنت ملامت بھی کی لیکن نہ معلوم تم کس مٹی کی بنی ہوئی ہو ..."

اتنے میں نوکر نے اطلاع دی کہ رشیدہ کی باجی ملنے آئی ہیں .... یہ سنکر فرحت کے چہرے پر مسرت کی لہر سی دوڑ گئی۔ اس کی صورت سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ وہ دل میں خدا کی از حد شکر گذار تھی ....اس سے پیچھا چھڑا کر وہ زنانے میں چلی گئی۔

فرحت کا اس انداز سے رخصت ہونا اسے بالکل پسند نہ آیا۔ وہ فلسفیانہ انداز میں غور کرنے لگا۔ کہ شادی شدہ انسان کی مسرت کا دارو مدار زیادہ تر اس کی بیوی پر ہوتا تھا۔ وہ بھی کیسے سنہرے دن تھے۔ جب وہ کنوارا تھا۔ اسی فلیٹ میں وہ اکیلا رہتا تھا۔ یار دوست جمع ہوتے تھے۔ فرصت کا ہر لمحہ عیش و نشاط میں گذرتا تھا۔ رنج و فکر کو قریب پھٹکنے نہ دیتے تھے۔ اس وقت خوش رہنا قطعاً اپنے بس میں تھا۔ اب بیوی سے پالا پڑا تھا۔ وہ البیلے دوست بھی رخصت ہوئے اور بیوی گھر کی رانی بن بیٹھیں۔ رات کو گھر آنے میں ذرا دیر ہو جائے تو جواب طلب کرتیں۔ روٹھ جاتیں۔ بلکہ ٹھنکنے لگتیں .....اب اس کا خوش رہنا بیوی کے ہاتھ میں تھا۔ اور بیوی کو اس بات کا احساس تک نہ تھا۔ وہ بیوی سے مار پیٹ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ جب کبھی انتہائی غصے کی حالت میں اسے مارنے پر تل بھی جاتا۔ تو پھر سوچنے لگتا۔ کہ بیوی کے جسم کے کس حصے پر چپت مارے .....اور وہ کوئی فیصلہ نہ کر پاتا...

اس کی کتنی خواہش تھی ۔ کہ فرحت سے اس کے تعلقات اچھے رہیں ۔ لیکن اس نے تو گویا اسے نہ سمجھنے کی قسم کھار کھی ۔ اف کس بے اعتنائی سے اٹھ کر چلی گئی حرامزادی •••• رشیدہ کی آپاجی کو ملنے کے لیے ۔

اسے اپنے آپ پر رحم آنے لگا ۔ وہ کس قدر بے بس تھا ۔ آج کی شام بیکار جانے پر اس کا دل بالکل ہی ٹوٹ گیا ۔ اس کا خیال تھا ۔ کہ مینجر بن جانے کی خوشی میں فرحت کو جیکب والوں کے ہاں کی جیلی اور کریم کھلاؤں اور وہ کس قدر خوش ہوگی ۔ اور چٹوری بلی کی طرح انگلیاں تک چاٹنے سے باز نہ رہے گی •••• لیکن کمبخت نے خود ہی کام بگاڑ دیا ۔ آپس میں محبت اور اشتراک سے رہنے کا جس قدر شدید جذبہ اس کے اپنے دل میں تھا ۔ اگر فرحت کے دل میں جذبے کی شدت اس کی نسبت دسواں حصہ بھی ہو تو بھی آپس میں تعلقات بہت مضبوط ہو سکتے ہیں •••• لیکن وہ یوں سمجھنے والی نہیں! اگر کل کو وہ مرجائے تو کمبخت کو اس کی قدر معلوم ہو ۔

اپنے مرنے کے خیال سے اسے کچھ سکون محسوس ہوا ۔ وہ تصور میں فرحت کے خوبصورت چہرے پر پھیلے ہوئے بالوں اس کی سرخ ناک اور دلدوز چیخوں کے تصور سے اس کے دل کی ڈھارس بندھی ••••اور پھر اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ••••

وہ میز پر ٹائم پیس کے قریب کھڑے ہوئے تانبے کے بارہ سنگھے کو ہاتھ میں اٹھا کر دیکھنے لگا•••••

فرحت رشیدہ کی آپا سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی ۔ اپنے شوہر کی دلی کیفیت سے بے خبر کیسے مزے مزے سے گپ اڑانے میں مصروف تھی •••• پھر دفعتاً ایک خیال اس کے ذہن میں بجلی کی چمک کی طرح کوند گیا •••• موت کی نسبت یہ خیال اچھا تھا ۔ مرنا مشکل تھا ۔ اور یہ آسان بھی تھا ۔ اور نتائج تقریباً موت کے برابر ہی حاصل ہو سکتے تھے ۔ اس نے سوچا کہ کل صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے •••• بلکہ ساڑھے چار بجے والی گاڑی پر وہ سوار ہو جائے گا ۔ اور کبھی واپس نہیں آئیگا ۔ صبح کے وقت جب وہ جاگے گی تو ادھر ادھر بھاگی بھاگی پھرے گی نوکر سے پوچھے گی ۔ تار دلوائے گی ۔ پاگلوں کی مانند حرکتیں کرے گی ۔ اس وقت وہ خود نہ معلوم کس جگہ پہنچا ہوگا ۔

یہ خیال صحیح تھا ۔ رشیدہ کی آپا بھی رات کے ساڑھے نو بجے تک بیٹھی رہی ۔ بلکہ فرحت نے جان بوجھ کر بٹھائے رکھا ہوگا ••••• یہ سوچ کر اسے اور بھی غصہ آیا اس کے چلے جانے کے بعد فرحت نے کھانے کے لیے کہلوا بھیجا ۔ اس نے انکار کر دیا ۔ پھر معلوم ہوا کہ اس نے اکیلے ہی کھانا کھالیا ہے ۔ اس پر اسے غصہ تو بہت آیا ۔ لیکن خیر کوئی ہرج نہیں ۔ اب وہ اس سے سب باتوں کا انتقام لیگا ۔ پھر نوکر کی زبانی معلوم ہوا کہ فرحت سونے کی تیاری کر رہی ہے ۔ اور اسے کہلوا بھیجا ہے ۔ اس نے کہدیا کہ کام کر رہا ہوں ۔

اب اس نے سوچا کہ جانے کی تیاری ابھی سے کر لینی چاہیئے ۔ اس نے نوکر بھیجکر اندر

سے اپنا سوٹ کیس منگوایا ••••• نوکر سوٹ کیس لے آیا۔ تو اس نے پوچھا کہ بی بی نے کچھ کہا تو نہیں۔ نوکر بولا کچھ نہیں کہا۔

اس نے سوٹ کیس تیار کر لیا۔ بستر باندھ دیا۔ اور نوکر کو ہدایت کر دی کہ صبح جلدی ہی اٹھنا ہو گا۔ اور تانگہ لانا ہو گا۔

اس کے بعد اس نے تین بجے کا الارم لگا دیا۔

نوکر چلا گیا۔ سب طرف سکون ہو گیا۔ چھوٹے فریم میں اس کی بیوی کی تصویر رکھی تھی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے الوداعی چٹھی لکھنے کی ٹھانی کاغذ اور قلم لے کر بیٹھ گیا۔

"جان سے پیاری فرحت ••••" یہ ٹھیک نہیں صرف "ڈیر فرحت" کافی ہو گا۔ بلکہ محض فرحت لکھ دیا جائے تو اور اچھا ہو گا۔

پھر اس نے ایک دردناک سا مضمون بنایا۔ میں تم سے تنگ آکر جا رہا ہوں اور ہمیشہ کے لیے جا رہا ہوں مجھے تلاش کرنے کی کوشش نہ کرنا، اب میں نہیں مل سکتا دیکھو شوہر کو خوش نہ رکھنے کا یہی نتیجہ نکلتا ہے •••• وغیرہ

چٹھی لکھ کر اس نے میز پر اس انداز سے رکھ دی کہ اس پر فوراً نظر پڑ سکے۔ رات اسی طرح صوفے پر سوتے جاگتے کاٹی۔ گھڑی کا الارم بجتے ہی اس نے نوکر کو جگایا۔ خود منہ دھو کر کپڑے پہننے لگا۔ نوکر سے کہا۔ کہ تانگہ لے آؤ اور سامان رکھ دو۔

پھر اس نے کمرے پر الوداعی نظر ڈالی •••• چند لمحوں تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ پھر سونے کے کمرے کے قریب سے گذرا تو اس نے دروازے کو یونہی تھوڑا سا دھکا دیا، کہ دیکھیں دروازہ کھلا ہے یا نہیں۔ دروازہ کھلا تھا۔ اس کے معنی ہیں کہ اس کی بیوی اس کا انتظار کرتی رہی تھی۔

اس نے اندر کی طرف جھانکا بڑی کھڑکی کے قریب اس کی بیوی سوئی پڑی تھی۔ اس نے سوچا کہ آخری بار بیوی کو دیکھ لیا جائے۔

اس کی بیوی بس بچہ ہی تھی۔ سوتے میں رضائی ادھر ادھر کھسک جاتی لیکن اس کی نیند ایسی گہری تھی کہ اسے کچھ خبر تک نہ ہوتی۔ چنانچہ اب پھر رضائی کھسک گئی تھی۔

وہ قریب پہنچا تو کھڑکی کے شیشوں میں سے آنیوالی چاندنی میں اس کی بیوی بہت حسین نظر آ رہی تھی۔ شاعروں کے قول کے مطابق اس کے ہونٹ کھلے تھے۔ ان میں سے دانت موتیوں کی لڑی کی طرح دکھائی دے رہے تھے۔ بند آنکھیں جیسے دو سیپیوں سے ڈھکی ہوئی ہوں۔ گریباں کے بٹن بھی کھلے تھے۔ اور قمیض بھی ادھر ادھر کھنچ گئی تھی اور ••••

اس نے رضائی کے دونوں کونے پکڑ کر اوپر کو کھینچے۔ ہر رات اسے اس طرح کرنا پڑتا تھا •••• ایسا نہ ہو بیچاری صبح سردی سے اکڑ جائے۔ رضائی اوپر کھینچکر اس نے اس کے سرے

فرحت کے پہلوؤں میں دبائے تاکہ جسم ہر طرف سے ڈھکا رہے •••• پھر وہ جانے کے لیے مڑا •••• میں جارہا ہوں پیاری فرحت میری جان سے عزیز ••••اس نے سوچا کہ جانے سے پہلے اس کی پیشانی کا ہلکا سا بوسہ لے لے۔ اسے اس بات کی خبر تک نہ ہوگی •••••

•••• اور وہ اوورکوٹ کو سمیٹ کر آہستہ سے نیچے کو جھکا •••• فرحت کی نیند کی ماتی آنکھیں نیم وا ہوئیں۔ اس نے خاوند کو دیکھا تو ہونٹوں پر موہوم سا تبسم کھل اٹھا۔ شوہر ٹھٹکا۔ فرحت نے نیند ہی میں انگڑائی کیلئے بازو اٹھائے اور ملائمت سے لپٹ کر لطافت سے اپنی طرف کھینچا •••••• اور وہ باوجود انکار کے کھینچ لیا •••• فرحت نے اسے جوتوں سمیت رضائی میں چھپالیا۔

نوکر کی آواز آئی "جی سامان تانگے میں رکھ دیا ہے ••••"

فرحت نے نیند میں ڈوبی ہوئی آواز میں کہدیا "سامان اتار کر اوپر لے آؤ •••اور وہ کچھ نہیں بولا"۔

(مشمولہ "سنہرا دیس)

"بلونت سنگھ کے افسانوں میں سکھوں کی مذہبی زندگی کی جیسی ترجمانی ملتی ہے وہ تو بیدی کے یہاں بھی نظر نہیں آتی۔ بیدی کے یہاں ہندو اساطیر کا التزام زیادہ ہے اور پھر اُن کا افسانہ محض تہذیبی فضا بندی سے بہت آگے جاتا ہے ـــــ ایک ایسے نقطے پر جہاں زندگی کے گہرے رموز بے نقاب ہوتے ہیں، جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے، بلونت سنگھ کا افسانہ اس نقطے کو شاذ ہی چھوتا ہے۔ یہ اُن کی حد ہے، لیکن ان حدود میں وہ بے مثال ہیں۔ مثلاً اُن کا افسانہ "گرنتی" بھلے کسی غیر معمولی نفسیاتی یا اخلاقی نکتے کو سامنے نہ لاتا ہو، لیکن اس میں سکھوں کی دیہاتی زندگی، مذہبی زندگی کی ایک ایسی ضروری عکاسی ملتی ہے کہ اس کا مطالعہ کسی تہذیبی اکائی کی شناخت کی جمالیاتی قدر پیدا کرتا ہے۔" (وارث علوی۔ اقتباس بشکریہ "آجکل" دلی۔ جنوری ۱۹۸۸ء)

بلونت سنگھ

کٹھن ڈگریا

رکھی چند کان سے واپس آرہا تھا۔ صورت سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اس وقت کوئی مزے دار بات سوچ رہا ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی ۔۔۔۔۔۔ چلتے چلتے جب اسے سگرٹ سلگانے کی خواہش ہوئی تو اسے خیال آیا۔ کہ ماچس تو دکان پر ہی رہ گئی ہے۔ خیر کوئی مضائقہ نہیں اب وہ گھر کے قریب پہنچ چکا ہے ۔۔۔۔۔۔ وہ اپنی دھن میں اس قدر مگن تھا کہ اسے سگرٹ منہ سے نکالنے کا خیال تک نہ آیا۔ کسی رہگیر کی نظر اس کے ڈھیلے ڈھالے ہونٹوں میں پھنسے ہوئے سگرٹ پر جا پڑتی تو وہ بے اختیار مسکرا دیتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ خود بخود مسکرائے جا رہا تھا۔ کبھی سر کو حرکت دینے لگتا۔ کبھی زیر لب کچھ کہنے لگتا ۔۔۔۔۔۔۔ وہ بالکل پاگلوں کی سی حرکتیں کر رہا تھا۔ لیکن وہ پاگل نہیں تھا۔ چونتیس پینتیس برس کے قریب عمر۔ صورت بھی بری نہیں تھی۔ صحت بھی کافی اچھی تھی۔ تین بچوں کا باپ تھا۔ اعلیٰ پیمانے پر ریڈیو کی ایک دکان چلا رہا تھا۔ بڑے ضابطے سے کام کرنے والا شخص تھا۔ گیارہ بجے دکان پر جاتا۔ اس کا معاون وہاں پہلے ہی سے موجود ہوتا تھا۔ ایک سے دو بجے تک لنچ کے لئے دکان بند کر دی جاتی۔ شام کے پانچ بجے کے قریب وہ گھر چلا آتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ البتہ دکان سات بجے تک کھلی رہتی۔ آج کاروبار کے سلسلے میں ایک شخص کو ملنے کے لئے اسے دہلی جانا تھا۔ اس نے اپنی بیوی شانتا کو سامان تیار کرنے کے لئے بھی کہہ دیا تھا۔ لیکن اچانک دکان پر اسے تار ملا کہ کل وہ شخص خود لاہور پہنچ رہا ہے ۔۔۔۔۔۔۔ چلو سفر کی مصیبت سے جان چھوٹی ۔۔۔۔۔۔۔ لیکن آج شام کا پروگرام کیا ہوا؟ یہ سوال خواہ مخواہ اس کے ذہن پر ابھر آیا۔ اور وہ چند لمحوں تک بلا سبب اس فکر میں غلطاں رہا اور پھر دل کی پکار خود بخود ہی واضح ہو گئی۔ کہ یہ شام اپنے دوست بیج ناتھ کے ہاں گذاری جائے۔ بلکہ رات کا کھانا بھی وہیں کھایا جائے۔

کچھ روز سے بیج ناتھ کی بیوی کامنی اس کے لئے خاص کشش کا باعث بنی ہوئی تھی ۔۔۔۔۔۔ یہ بات اخلاق سے گری ہوئی ضرور تھی لیکن وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ جوانی کے زمانے میں وہ حد سے زیادہ شرمیلا بنا رہا۔ زندگی کا سنہرا زمانہ کسی سے محبت کی پینگیں بڑھائے بغیر گذر گیا۔ جب شادی ہوئی تو چند سال تک وہ بیوی کا دیوانہ سا بنا رہا۔ مگر رفتہ رفتہ بیوی میں کوئی کشش باقی نہ رہی۔ جب کبھی بیوی آنکھوں کو بھلی معلوم ہوتی تو بس ہاتھ بڑھانے کی دیر تھی وہاں انکار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ اپنی بیوی بے رس معلوم ہونے لگی اور اس نے

بازار حسن کا رخ کیا۔ وہاں پر دلال بھی کہتا کہ بس صاحب ہفتے بھری سے بازار میں بیٹھنے لگی ہے پہلے پہل تو یہ خیال ہی کچھ کم لذت انگیز نہیں تھا۔ لیکن جب دلالوں کے ہتھکنڈوں کا علم ہوا۔ تو طبیعت بجھ گئی۔ دنیا کا دھندہ تو چلتا رہا۔ لیکن محبت کی پیاس کے مارے دل میں ہردم کانٹا سا کھٹکنے لگا۔

گذشتہ دنوں اتوار کے روز وہ اپنے مکان کے سامنے چبوترے پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا کہ اس نے بج ناتھ کو کامنی کے ہمراہ اپنے قریب آتے دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں چار ہونے پر بج ناتھ نے کہا۔ "ہم اجنبی ہیں۔ مکان تلاش کر رہے ہیں۔ کیا آپ ہماری مدد کر سکیں گے؟"

یہ ان کی پہلی ملاقات تھی۔ اس نے بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اسے مکان دلوا دیا۔ اگر چہ ان کے مکانوں کے درمیان میل بھر سے کم فاصلہ نہیں تھا۔ لیکن اس کے باوجود دونوں گھرانوں کے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ ایک دوسرے کے ہاں آنا جانا۔ دکھ سکھ میں شرکت کرنا۔ کبھی کبھار تفریح کی غرض سے شہر سے باہر چلے جانا۔ انکے معمول میں داخل ہو گیا تھا۔

ایسے موقعوں پر کامنی اس کی طرف نگاہ غلط انداز سے دیکھ لیتی .... پہلی مرتبہ تو اس کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا۔ وہ سمجھا کہ اس کی آنکھوں نے دھوکا کھایا ہے۔ لیکن پھر جب دبی دبی مسکراہٹوں کا تبادلہ بھی ہونے لگا تو اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ ایک دوسرے سے محبت کر سکیں گے۔ کبھی کبھی اس کا دل لعن طعن کرتا۔ لیکن پھر وہ اپنے دل کو یہ کہہ کر ڈھارس دے لیتا۔ کہ کامنی کی طرف سے تو آغاز ہوا ہے .... کبھی سوچتا۔ معمولی دل لگی ہی تو ہے۔ ذرا کی ذرا چہل ہو جاتی ہے۔ دل بہلا رہتا ہے۔ اس میں قباحت کی تو کوئی بات ہی نہیں .... لیکن یہ سب ظاہر داریاں تھیں۔ کیونکہ دل کی گہرائیوں میں وہ اچھی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔ کہ اسے کامنی سے محبت ہو گئی ہے۔

راستہ چلتے چلتے وہ کامنی کی بابت سوچتا رہا۔ ابھی تک اس نے چھوا تک نہیں تھا۔ شاید آج کوئی اہم واقعہ پیش آئے۔ ممکن ہے کہ وہ اس پہلی محبوبہ کے بہت قریب پہنچ جائے۔

اب وہ اپنی گلی میں پہنچ چکا تھا۔ جیا پنواڑی کی دکان اسکے مکان کے قریب ہی تھی .... دکان کے قریب سے ہو کر گذرتے وقت سلگتی ہوئی رسی دیکھ کر اسے سگرٹ سلگانے کا خیال آیا۔ اگر کوئی دوست اسے ملنے کے لئے آتا۔ تو گھر والوں کو خبر ہو یا نہ ہو لیکن جیا ضرور اس بات کا خیال رکھتا تھا۔ چنانچہ سگرٹ سلگا کر اس نے جیا سے پوچھا۔ "کیوں بے جئے! مجھے کوئی شخص ملنے کے لئے تو نہیں آیا تھا؟ اس وقت جیا نسوار سونگھ رہا تھا۔ چھینک آنے کو ہی تھی۔ اس لئے منہ سے جواب نہ دے سکا۔ کبھی اثبات میں سر ہلاتا کبھی نفی میں۔ آخر معلوم ہوا کہ کوئی شخص نہیں آیا تھا۔

رکھی نے سگرٹ کا کش کھینچا اور گھر کی طرف بڑھا۔ دروازے کے آگے جو تین

سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ ان کی دو اینٹیں اکھڑ گئی تھیں۔ ہر دم ان پر سے پھسلنے کا اندیشہ لاحق رہتا تھا۔ اسے کئی مرتبہ خیال آیا۔ کہ ان کی مرمت کروا دی جائے۔ لیکن لاپروائی میں یہ کام پورا نہ ہو سکا۔

گھر کے اندر داخل ہوا۔ تو دیکھا کہ شانتا بڑے آئینے کے سامنے بیٹھی بال بنا رہی ہے۔ معلوم ہوتا تھا۔ ابھی ابھی نہا کر آئی ہے۔ اس وقت خاصی پیاری دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے دوست کہا کرتے۔ "یار تمہاری عورت تو بہت حسین ہے۔ پھر بازاروں میں ادھر ادھر دھکے کیوں کھاتے پھرتے ہو؟"

شانتا نے بالوں کو ایک ہاتھ سے گھما کر آگے لاتے اور ان پر کنگھی کرتے ہوئے کہا۔ "جی میں نے آپ کا سامان تیار کر دیا ہے۔

"بھئی آج تو میں نہیں جاؤں گا"۔

"کیوں۔" شانتا نے تعجب سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا۔

"جس شخص سے ملنا تھا۔ وہ خود کل یہاں آ رہا ہے .... نل بند تو نہیں ہوا؟ ذرا نہا لوں ...."

وہ غسل خانے میں چلا گیا۔ اور وہاں "کا کروں تو سے الفت ہو گئی ..... ہو گئی" گاتا رہا

جب کپڑے پہن چکا۔ تو بیوی نے پوچھا۔ "اب کھانا کھا کر ہی جائیے گا باہر؟"

"نہیں بھئی مجھے دیر ہو رہی ہے۔ ایک شخص سے ملنا ہے۔ کھانا باہر ہی کھاؤں گا انتظار میں مت بیٹھی رہنا"۔

حالانکہ اس کی بیوی کو اس پر کسی قسم کا شک نہیں تھا۔ لیکن اس نے بیجناتھ کے گھر کا نام جان بوجھ کر نہ لیا۔ آخر کیا فائدہ؟ عورتیں وہمی تو ہوتی ہی ہیں۔

آئینے کے سامنے کھڑے اس نے اپنی صورت کا جائزہ لیا۔ اور اس نے خود ہی فیصلہ کیا۔ کہ اس کی صورت بیجناتھ سے کہیں بہتر ہے۔ اور اگر کامنی اسے اپنے شوہر پر ترجیح دیتی ہے۔ تو اسے اس کی خوش ذوقی کا ثبوت سمجھنا چاہئے۔

خوب بن ٹھن کر اس نے اپنے آپ پر آخری نگاہ ڈالی۔ کوٹ کی اوپر والی جیب میں رنگین رومال ٹھکانے سے رکھا۔ رخساروں پر ہاتھ پھیر کر ان کی ہمواری کا جائزہ لیا۔ ٹائی کی گرہ درست کی پتلون کی کریز پہلو بدل بدل کر دیکھی۔ ہیٹ پر جمی ہوئی گرد کی باریک تہ کو چٹکی بجا بجا کر صاف کیا۔ چاندی کا سگرٹ کیس جیب میں ڈالتے ہوئے اس نے ایک نظر بیوی کی طرف دیکھا۔ آج وہ واقعی حسین دکھائی دے رہی تھی۔ دونوں لڑکے ناناکے ہاں گئے ہوئے تھے۔ ان کی غیر موجودگی میں بیوی کو پیار کرنے میں بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ لیکن وہ جلدی میں تھا۔ اس لئے چھڑی گھماتا

ہوا گھر سے باہر نکل آیا۔ ایک لمحہ کے لئے اسے خیال آیا کہ وہ سگرٹ کیس میں "عبداللہ" کے سگرٹ رکھ لیتا تو بہتر ہوتا۔ وہ "عبداللہ" سگرٹوں کا بڑا مداح تھا اور انہیں خصوصاً اس وقت پیتا تھا۔ جب وہ خوش ہو .... اب سگرٹ لینے کے لئے واپس جانے میں اس نے بدشگونی سمجھی۔ اس لئے کوئے یار کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

اس کا دل مسرور تھا۔ قدم بڑے بانکپن سے اٹھ رہے تھے۔ ارد گرد چیزیں اجلی اور نئی نئی سی دکھائی دے رہی تھیں۔ جیسے ہر چیز نے نیا جنم لیا ہو۔ اس میں چمک تھی اور حرکات سے چلبلا پن عیاں تھا۔ اپنی بیوی اور گھر سے دور وہ اپنے آپ کو آزاد پرندے کی طرح ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ وہ اس کالج کے چھوکرے کی مانند دکھائی دے رہا تھا۔ جو گھر سے تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجا گیا ہو۔ اور اب والدین کے روپے سے عشق لڑا رہا ہو۔ محض عورت کی حیثیت اس کے سامنے کچھ بھی نہیں تھی۔ وہ محبت کا بھوکا تھا۔ درد عشق کا خواہاں تھا۔ اصل چیز تو وہ جذبہ یگانگی تھا جو وہ "کمو" کے لئے محسوس کر رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں کامنی کو پیار سے کمو کہا کرتا تھا۔ اس کی یہی ایک تمنا تھی کہ اگر ان کی محبت پروان چڑھے اور دونوں کے دھڑکتے ہوئے سینے کسی روز مل جائیں۔ تو وہ اسے "پیاری کمو" کہہ کر بلائے۔ کبھی کبھی جب وہ تصورات کے طلسم میں سے نکلتا تو سوچتا کیا معلوم اس کے نصیب میں حسین کامنی کی محض مسکراہٹ ہی لکھی ہو۔

آخر کار شام کے دھندلکے میں جب بیج ناتھ کا بلا پلستر کی اینٹوں کا بنا ہوا مکان نظر آنے لگا۔ تو اس کے قدم ڈگمگانے لگے۔ یہاں تک تو وہ ایک مبہم لیکن مسحور کن جذبے کے ماتحت چلا آیا تھا ...... لیکن اب وہ سوچنے لگا کہ اسے ان کے گھر میں کس انداز سے داخل ہونا چاہیئے۔ اس مسئلہ کے کئی پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا۔ کہ ان معاملات پر زیادہ تجویزیں سوچنے کی ضرورت نہیں۔ ہر حرکت بے تکلفانہ ہونی چاہیئے۔ چنانچہ وہ بڑی بے تکلفی سے ان کے گھر کے اندر داخل ہو گیا۔

بڑے کمرے سے میاں بیوی کے ہنسنے اور باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ رکھی دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ بیجناتھ پاؤں پھیلائے کرسی کے بازو پر بیٹھا تھا۔ اس نے نئے کپڑے پہن رکھے تھے۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا۔ کہ شاید وہ باہر جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ کامنی اس کی قمیص میں بٹن ...... ٹانک رہی تھی۔ اور وہ گا رہا تھا۔ بیوی بگڑ رہی تھی۔ "اب ذرا گانا بند کر دیجئے نا۔ سوئی چھاتی میں اتر جائے گی۔ تو پھر نہ کہئے گا"۔

شوہر مسخرے پن سے بولا۔ "تم سے نہیں کہیں گے تو اس کس سے کہیں گے مائی ڈارلنگ اور ہمارا کون ہے"۔ اور پھر وہ نہایت بھونڈے انداز میں نتھنے پھلا پھلا کر شکستہ بانس کی سی آواز میں ایک فرسودہ سا فلمی گانا گانے لگا۔

"تیرا کون ہے

کسے کرتا تو پیار پیار پیار
تیرا کون ہے ...... کون ہے ......ہاں تیرا کون ہے "۔
ادھر میاں بیوی میں یہ چہلیں ہو رہی تھیں ۔ ادھر چھ ماہ کا بچہ پالنے میں پڑا رو رہا تھا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ بج ناتھ اس وقت بڑے خوشگوار موڈ میں تھا ۔ جوں جوں بیوی اس کی حرکات سے چڑتی توں توں وہ اسے اور زیادہ پریشان کئے جاتا ۔ وہ جھنجلا کر کہتی ۔ " اب مٹکنا بند کیجئے ....منا رو رہا ہے ...."
رکھی رام دو قدم آگے بڑھا ۔ اور اس نے کھانس کر انہیں اپنی آمد سے مطلع کر دیا ۔
بیجناتھ نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پہلے تو حیران رہ گیا ۔ پھر چلایا ۔ ہلو ہلو ! یار میرا خیال تھا ۔ اب تک تم گاڑی میں بیٹھے ہو گے "۔
رکھی نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے جواب دیا ۔ " نہیں بھئی دہلی جانے کا پروگرام منسوخ ہو گیا ہے ....کرپا رام سے ملنا تھا ۔ اس کا تار آیا ہے ۔ کہ کل وہ خود لاہور پہنچ رہا ہے ...."
اتنے میں کامنی نے بھی دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے کر دی ۔
"جی نمستے ۔ " اس نے بڑی معصومیت اور اخلاق سے جواب دیا ۔
منا رو رہا تھا ۔ کامنی اسے پیار سے پالنے میں سے اٹھا کر چپ کرانے کی کوشش کرنے گی ۔
" منا کیوں رو رہا ہے ....ہمارا منا کیوں رو رہا ہے .....نا.....نا......... کیوں جی آپ کی منی بھی رو رہی تھی "۔
"جی نہیں " رکھی نے جواب دیا ۔ " ہماری منی تو سوئی پڑی تھی ۔ آج کل ہمارے گھر میں بچوں کا شور بہت کم ہوتا ہے ۔ گوشی اور جیو دونوں نانا کے ہاں گئے ہوئے ہیں ۔ بچے ہیں نا ۔ نئی جگہ پر ان کا دل بھی بہلا ہوا ہے ۔ گھر میں منی بچاری بے سوچ چاپ پڑی رہتی ہے "۔
" ناجی نا ہمارا منا بھی تو نہیں روتا " ۔ کامنی نے بچے کو پچکارتے ہوئے کہا ......"آج تو اس کے بابو جی نے اسے رلا رلا کر ہلکان کر دیا ہے ......میں ان کے بٹن ٹانک رہی تھی ۔ اور یہ بل بل کر گاتے جاتے تھے ۔ منا جاگ اٹھا اور رونے لگا.......
جب وہ باتیں کر رہی تھی ۔ تو رکھی اس کے لچکیلے جسم اور تیزی سے ہلتے ہوئے ہونٹوں کی طرف دیکھتا رہا ۔ اس وقت سج دھج کا تو کوئی سوال ہی نہیں تھا ۔ لیکن معمولی گھریلو کپڑوں میں بھی وہ کس قدر حسین دکھائی دے رہی تھی ۔ اور پھر دفعتاً جو اسے کچھ خیال آیا تو بیجناتھ سے مخاطب ہو کر بولا ۔ " یار معلوم ہوتا ہے کہ تم باہر جانے کی تیاری کر رہے تھے ....میں تو یونہی ادھر چلا آیا ۔ اگر تم کسی کام سے جا رہے ہو ۔ تو چلو ۔ " نہیں یار بیٹھو.......... باتیں کریں "۔
" نہیں بھئی ، مجھ سے یہ نہ ہو گا "۔

کامنی نے بچے کو گود میں جھلاتے ہوئے کہا۔ "آج ان کی دعوت ہے کہیں"۔

"واقعی؟••••••• بھئی واہ•••••••• اب تو میں تمہارا راستہ نہیں روکنا چاہتا ضرور جاؤ تکلف کی ضرورت ہی کیا ہے•••••••"

"نہیں••••••• اب میں نہ جاؤں گا۔ تم اتنی دور سے آئے ہو اب تو مل کر باتیں کریں گے••••••••• اور ہاں جیلانی کے ہاں برج کھیلنے کے لئے کیوں نہ چلیں؟"

لیکن رکھی کو اپنی حرکت بہت نامناسب معلوم ہو رہی تھی۔ "بج بھائی اپنا پروگرام خراب مت کرو۔ میں تو یونہی چلا آیا تھا۔ بس اب سیر کرتے ہوئے گھر چلا جاؤں گا•••••• یہ ذرا بد تمیزی کی بات ہے کہ میری وجہ سے تمہارا میزبان پریشان ہو۔ اور پھر ہم دونوں میں تکلف بھی تو نہیں ہونا چاہیئے"۔

بج ناتھ چند لمحوں تک چپ رہا۔ پھر بولا۔ "اتنی دور سے آئے ہو۔ ہم دونوں کا وقت خوب کٹ سکتا تھا--------- ہاں یار ایک اور بات سوجھی ہے مجھے۔ تم یہیں بیٹھو اور میں ذرا کھانا کھا کر زیادہ سے زیادہ ایک گھنٹے کے اندر واپس آجاؤنگا میری واپسی تک تم کھانا بھی یہیں کھالو گے۔ اور پھر ہم جیلانی کے ہاں چلیں گے۔ بڑا مزے کا شخص ہے۔ گپ بھی اڑے گی۔ اور برج بھی کھیلے گی"۔

رکھی کا دل اچھل کر جیسے حلق میں آرہا۔ ایک گھنٹہ کے لئے وہ اور کامنی تنہا رہ جائیں گے۔ گودی کامنا تو سو ہی جائے گا۔ اس سے بڑا چار سالہ لڑکا بھی سلایا جاسکے گا••••••• اس نے تیزی سے اچٹتی ہوئی نگاہ کامنی پر ڈالی۔ گونا گوں جذبات کے ہجوم میں وہ کچھ نہ بول سکا"۔

بج ناتھ کہتا چلا گیا۔ "کہو یار کیسی رہی---------- بھئی کہیں جانا نہیں۔ تمہیں میرے سر کی قسم!---------- میں بہت دور نہیں جارہا ہوں۔ یہیں اپنے ڈاکٹر شرما ہی کے ہاں تو دعوت ہے۔ تم شاید نہیں جانتے انہیں۔ تمہارے راستے ہی میں تو مکان پڑتا ہے۔ اچھا تو وعدہ کرو تم نہیں جاؤ گے۔ یہ نہ ہو کہ میں بھاگم بھاگ واپس پہنچوں اور تم غائب ہو جاؤ••••••• بس آج شاندار پروگرام رہے گا"۔

رکھی چپ چاپ کھڑا رہا۔ بھلا وہ کہاں جاسکتا تھا۔ اسے یقین نہیں آتا تھا کہ اس کی تقدیر بھی اس قدر اچھی ہو سکتی ہے۔ وہ ایک موہوم سی امید پر یہاں آیا تھا۔ ادھر بھگوان نے بھگت کی پرارتھنا قبول کر کے خود اپنے ہاتھ سے اس کے راستے کا کانٹا صاف کر دیا۔

"لو یہ رہے سگرٹ•••••••• اور یہ رہا وسکی••••• کمو! انہیں روٹی کھلا دینا•••••••• ذرا خیال رکھنا بھاگ نہ جائیں کہیں•••••••• میں چٹکی بجاتے میں آیا•••••••"

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی پتلون کے بٹن لگانے لگا۔ برش سے بالوں کو ہموار کیا ٹائی کی گرہ ڈھیلی کر کے اگلے پلو کو نیچے اوپر کیا۔ پھر تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر والے دروازے کی طرف

بڑھا ۔ کامنی پکار کر بولی ۔ "ہائے کیسے بھاگے جا رہے ہیں ۔ گھر سے باہر جانا ہو تو پاؤں زمین پر ہی نہیں لگتے ۔ اب جلدی لوٹ آیئے گا" ۔

ہاں بھئی لوٹ آؤں گا ۔ لوگ ہمارا اینڈ حسن اٹھا اٹھا کر لے جاتے ہیں ۔ اس کی فکر کیا کرو ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر لو ۔۔۔۔۔۔اچھا یار میں چلا ۔۔۔۔۔۔۔۔"

ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے ا کامنی بیٹھک کی کھڑکی کے قریب آکھڑی ہوئی ۔ ایک مرتبہ پھر شوہر سے آنکھیں چار ہوئیں ۔ شوہر نے ہوا میں ہاتھ بلند کر کے ہلا دیا ۔

وہ وہاں چپ چاپ کھڑی گلی کی نکڑ پر سے غائب ہوتے ہوئے دیکھتی رہی ۔ اس اثنا میں رکھی بھی چپکے سے دیوار سے لگ کر اس کے قریب کھڑا ہو گیا تھا ۔ کچھ دیر تک کامنی سنسان گلی کی جانب دیکھتی رہی ۔ اور پھر اس کا ہاتھ اوپر اٹھ کر بجلی کے بٹن کی طرف بڑھا ۔ اور دوسرے لمحے میں بجلی کا بلب بجھ گیا ۔ اور فرش پر بچھی ہوئی دری پر کھڑکی میں سے آتی ہوئی چاندنی پھیل گئی ۔

رکھی نے بازو بڑھایا ۔ جو کامنی کے پیٹ پر سے ہوتا ہوا اس کے گوشت سے بھرپور کولھے پر جا کر ٹک گیا ۔ کامنی کی کمر ہلکی سی لرزش کے بعد ساکن ہو گئی ۔۔۔۔۔۔۔وہ اور قریب ہو کر اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا ۔ ان دونوں کی آنکھیں چار نہیں ہوئیں ۔ لیکن کامنی کی کمر نے ایک لرزش کے بعد سکون اختیار کر کے گویا اس کے سوال کا جواب اثبات میں دے دیا تھا ۔

وہ خاموش کھڑے تھے ۔ دو ایک مرتبہ رکھی کے لبوں سے نکلتی ہوئی درد محبت میں ڈوبی ہوئی نہایت مدھم سی آواز سنائی دی ۔۔۔۔۔۔۔" کمو! کمو!!"

"بی بی جی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بی ۔ بی ۔ جی!!" بڑے لڑکے کی پکار سنائی دی ۔

وہ بلند آواز میں بولی ۔ "آئی بیٹا ۔۔۔۔۔۔۔آئی ۔۔۔۔۔۔۔بیٹھے رہو وہیں پر" ۔

رکھی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی ۔ اور وہ ذرا پرے سرک گئی ۔

"سنو ۔۔۔۔۔۔ کمو ۔۔۔۔۔۔ سنو" ۔ اس کی آواز بری طرح لرز رہی تھی ۔

کامنی دو قدم پرے دیوار سے پیٹھ لگائے دونوں ہتھیلیاں دیوار پر ٹکائے سر نیہوڑائے کھڑی تھی ۔ کمرے کی فضا خوابناک تھی ۔ ہر طرف سرمئی غبار سا چھایا ہوا تھا ۔ کامنی کی مدھم شبیہہ حسین مجسمے کی مانند دکھائی دے رہی تھی ۔ صرف اس کی چھاتیوں کے زیر و بم سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بے جان مورت نہیں ہے ۔

"کمو! سنو ۔۔۔۔۔۔۔۔میں تم سے محبت کرتا ہوں" ۔

میں تم سے محبت کرتا ہوں ۔۔۔۔۔۔۔۔ کیسے فرسودہ الفاظ تھے ۔ جنہیں اس نے بیسیوں مرتبہ کتابوں میں پڑھا تھا ۔ فلم کے پردے پر سنا تھا ۔ لیکن آج وہ اس فقرے کو اس طرح ادا کر رہا تھا ۔ جیسے یہ اسی کی اختراع ہو ۔

جواب میں کامنی نے پلکیں اوپر اٹھائیں ۔ اور ایک مرتبہ بھرپور نظروں سے اس کی

طرف دیکھا۔ اور پھر خود سپردگی کے انداز میں پلکیں جھکا کر رہ گئی۔
بجلی کے کوندے کی طرح آگے بڑھا۔ اس کی کمر کو بازؤں میں لیکر اسے اپنی طرف کھینچا۔ تو اسے محسوس ہوا جیسے اس نے پھولوں کی نازک ڈالی کو پکڑ جھنجھنا دیا ہو۔ اس کا جسم سر سے پاؤں تک کامنی کے نرم اور لچکیلے جسم کے لمس سے محفوظ ہونے لگا۔ ایک شدید اور فوری جذبے کے تحت اس نے نہ معلوم کس کس طرح اسے بھینچا، چوما .... اور پھر لڑکے کی پکار کی آوازیں۔ ہتھوڑوں کی دھمکوں کی طرح سنائی دینے لگیں۔
اور پھر کامنی اڑتی ہوئی خوشبو کی طرح اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔
وہ کمرے میں تن تنہا کھڑا رہ گیا۔ کھڑکیوں میں داخل ہونے والی چاند کی روشنی میں کرسیاں، پتائیاں، تصویریں پردے، اور کتابیں، غرض ہر شئے خوابناک اور ساکن دکھائی دے رہی تھی۔ غیرارادی طور پر اس کے لبوں سے چند غیر مبہم سی آوازیں نکل گئیں۔ کچھ دیر تک وہ خلا میں گھور گھور کر دیکھتا رہا۔ ایک مرتبہ احساس گناہ کی شدت سے کانپ بھی اٹھا ------- لیکن صرف ایک لمحہ کے لئے۔ پھر اس نے رومال سے منہ اور پیشانی صاف کی۔ کپڑوں کی سلوٹیں اور کوٹ کی جھول کھائی ہوئی آستینوں کو کھینچ کر ہموار کیا پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں .... باورچی خانے کی جانب بڑھا کامنی چولھے کے قریب بیٹھی دیگچی میں چمچ ہلا رہی تھی۔ اس کا بڑا لڑکا اس کے گھٹنے کے ساتھ لگا ہوا اونگھ رہا تھا۔ چولھے میں لپلپاتے ہوئے شعلوں کی روشنی میں کامنی کے دمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ باہمی کش مکش میں کامنی کے بال پریشان ہوگئے۔ گال سرخ ہو رہے تھے۔ قمیض دو تین مقامات سے مسک گئی تھی .... یہ سب اسی کی دست درازیوں کے نتائج ہی تھے۔ اس خیال سے وہ ایک نئی لذت کے احساس میں گم ہو گیا۔
بظاہر کامنی اس کی آمد سے بے خبر دکھائی دیتی تھی۔ وہ اپنے کام میں مصروف رہی۔ بچے کو اونگتا دیکھ کر اس نے کہا۔ "چلو تمہیں سلادوں" ------- اور وہ اسے سلانے کے لئے اندر چلی گئی تھی۔
رکھی چولھے کے قریب ایک اسٹول پر بیٹھ گیا۔ وہ دل ہی دل میں حالات کا جائزہ لینے لگا

کامنی پھر چولھے کے قریب آ بیٹھی۔ اس کی حرکات سے کسی غیر معمولی واقعے کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ دیگچی کو چولھے سے اتار کر اس نے توا رکھ دیا۔ اور آٹا توڑ کر پیڑا بنانے لگی۔ اور اس سے آنکھیں ملائے بغیر بولی۔ "آپ کو سردی لگ رہی ہوگی ----- چولھے کے قریب آجائیے نا"۔
واقعی سردی بہت سخت پڑ رہی ہے"۔ یہ کہہ کر اس نے اسٹول کھسکایا اور چولھے کے قریب آگیا۔

رکھی کی نظریں اس کے رخساروں ۔ آنکھوں تیزی سے جنبش کرتے ہوئے ہونٹوں اور ہاتھوں کی حرکات پر جمی ہوئی تھیں ۔ وہ دل میں اس بے چین تشنگی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا ۔

جو پیار سے ہونٹوں سے شربت کا گلاس پرے ہٹ جانے سے محسوس ہونے لگتی ہے ۔
کامنی نے روٹی الٹتے ہوئے کہا ۔ "آپ کو بھوک لگ رہی ہوگی" ۔
اس نے اٹھ کر کامنی کے رخسار پر ہونٹ رکھ دیئے ۔ "نہیں کموا مجھے بھوک نہیں لگ رہی" ۔ یہ کہہ کر وہ اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹنے کی کوشش کرنے لگا ۔
کامنی نے اپنے آپ کو اس کی مرضی پر چھوڑتے ہوئے کہا ۔ "مجھے روٹی تو پکا لینے دیجئے ۔"
"نہیں جان سے پیاری کموا"
روٹیاں پھر پکا لینا .... یہ کہہ کر اس نے ہاتھ مار کر توا چولھے سے گرا دیا ۔

.... وہ خوش تھا ۔ اور سرتاپا نشے میں ڈوبے ہوا تھا ۔ اب وہ بیٹھک میں دری پر لیٹا ہوا تھا ۔ ٹانگیں اٹھا کر قریب بچھی ہوئی کرسی پر پاؤں ٹکا رکھے تھے اور بجلی کی جگمگاتی ہوئی روشنی میں ویکلی کا پرچہ پیٹ پر دھرے اس کی ورق گردانی کر رہا تھا ۔
ایک مرتبہ پھر کامنی چولھے کے آگے بیٹھی اس کے لئے پراٹھے پکا رہی تھی ۔ اس روز سے پہلے زندگی کے جو دن گذر چکے تھے ۔ وہ بالکل بے کیف نظر آنے لگے ۔ یہ مسرت یہ لذت اس نے پہلے کبھی محسوس نہ کی تھی ۔ دل مطمئن تھا ۔ جسم ہلکا پھلکا اور چست ہو رہا تھا ۔ روح پر ناقابل بیان کیف طاری تھا ۔ آج کامنی اور وہ ایک ہو گئے تھے ۔
کھانا تیار ہو گیا ۔ تو انہوں نے ایک ساتھ مل کر کھایا ۔ ایک دوسرے کے منہ سے منہ ملا کر نوالے چھینتے رہے ۔ ہنسی مذاق اور چہل میں وقت گذر گیا ......اور آخر دروازے پر دستک کی آواز سنائی دی ۔
کامنی نے دروازہ کھولا ۔ بیجناتھ کا معصوم چہرہ دیکھ کر رکھی کے دل میں فتور پیدا ہو گیا لیکن کامنی آڑے آئی ۔ "آپ کے دوست تو اٹھ اٹھ کر بھاگ رہے تھے ۔ بڑی مشکل سے بٹھائے رکھا میں نے ......"
بیجناتھ نے بے تکلفانہ اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا ۔ "یار کمال کرتے ہو ۔ آخر گھبرانے کی کیا بات تھی ۔
دوست کی سادگی اور اخلاص دیکھ کر رکھی کو شرم سی محسوس ہونے لگی ۔ اور وہ کچھ بھی نہ

کہہ سکا۔

"کہو کھانا کھالیا"۔

"ہاں"۔

"آؤ تو چلو جیلانی کے ہاں"۔

راستے میں بیجناتھ دعوت کی باتیں کرتا رہا۔ کہنے لگا۔ ڈاکٹر شرما میرے بہت گہرے دوستوں میں سے ہیں۔ بڑے پریم سے کھانا کھلایا۔ واپس نہیں آنے دیتے تھے۔ ہزار حیلوں سے جان چھڑا کر آیا ہوں"۔

جب وہ جیلانی کے ہاں پہنچے۔ تو معلوم ہوا کہ ان کے ہاں کوئی فوجی رشتہ دار باہر سے آئے ہوئے ہیں۔ اس لئے وہ برج نہ کھیل سکیں گے۔

ان کا پروگرام درہم برہم ہو گیا۔ خیر وہ کچھ دیر تک ادھر ادھر ٹہلتے رہے۔ پھر بیجناتھ نے کہا۔ "آؤ گھر پر بیٹھیں۔ سردی بہت زیادہ ہے"۔

"بھئی اب اجازت دو۔ اب میں گھر واپس جاتا ہوں۔ پھر ملاقات ہو گی"۔

چنانچہ مصافحہ کر کے وہ ایک دوسرے سے رخصت ہو گئے۔

آج کے مسرت انگیز واقعہ سے اس کا دل اگرچہ مسرور تھا لیکن دوست سے اس پاجی پن کے باعث ضمیر ملامت بھی کر تا تھا۔ اور جب وہ اپنے گھر کے قریب پہنچا تو اپنی نیک اور معصوم بیوی کے تصور سے اس کا دل اور بوجھل ہو گیا۔ بچاری سردی میں ٹھٹھری ہوئی آگ کے قریب بیٹھی اس کا انتظار کر رہی ہو گی•••••••

جب وہ جیا کی دکان کے قریب پہنچا۔ تو حسب معمول اس سے پوچھا"۔ کیوں بے جئے کوئی آیا تو نہیں تھا۔ ہمیں ملنے کے لئے•••••••"

جیا نے سر اوپر اٹھایا۔ "جی بابو بیج ناتھ آئے تھے۔ سیدھے بھیتر چلے گئے۔ مجھ سے تو کچھ بولے نہیں۔ جب آپ نہیں آئے تو بچارے انتجار کر کے چلے گئے"۔

"بیج ناتھ!" اس کے حلق میں سے ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا

"ہاں جی•••••بیج ناتھ بابو"۔

دکان سے مکان تک چند قدم کا فاصلہ اس نے بہت آہستہ آہستہ طے کیا۔ جب وہ سیڑھیوں پر قدم رکھنے لگا۔ تو اس نے دیکھا کہ اکھڑی ہوئی دو اینٹیں پھر اپنی جگہ سے ہٹ گئی ہیں۔ اس نے احتیاط سے انہیں ٹکا کر رکھ دیا•••••••••اور پھر ایک لمحہ بھر کے سکوت کے بعد اس کے منہ سے مدھم سی ہنسی نکل گئی۔۔۔۔۔۔اور جب وہ ڈرائینگ روم میں داخل ہوا تو وہاں پر ہر چیز جانی پہچانی تھی۔ ماحول پر سکون اور آرام دہ محسوس ہو رہا تھا۔

اس کی بیوی اندر والے دروازے میں کھڑی دکھائی دی۔ وہ اس وقت نو شگفتہ پھول کی

مانند تر و تازہ اور اجلی دکھائی دے رہی تھی ۔ وہ پھول جس کا منہ شبنم نے بڑی احتیاط سے دھو ڈالا ہو ۔ جس پر جمی ہوئی گرد کی نامعلوم تہ کو کسی نے چوم چوم لیا ہو ۔

وہ بڑے کوچ پر بیٹھ گیا ۔

شانتا شاخ گل کی طرح لچکتی ہوئی نزدیک آئی اور اس کے قریب کوچ میں دھنس گئی ۔

اس نے سر سے پاؤں تک بیوی کا جائزہ لیا اور مسکرا کر بولا ۔ "شنو! آج تو تم بہت خوش دکھائی دیتی ہو" ۔

اپنے مخصوص انداز میں بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ لجا کر مسکرا دی ۔ اس کے تر و تازہ ہونٹوں میں سے سپید سپید دانت کسی حد تک نمایاں ہوئے اور اس نے بلا کچھ کہے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اس کے کندھے پر رخسار ٹکا دیا ۔

شنو کی نیند کی ماتی پلکیں بوجھل ہو کر جھکنے لگیں ۔

وہ چند لمحوں تک شنو کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا ۔ پھر اس کی پیٹھ پر ہلکی سی تھپکی دے کر بولا ۔ "میں بھی بہت خوش ہوں شنو! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ذرا ادھر لاؤ تو عبداللہ سگرٹوں کا ڈبہ ۔"

(مشمولہ: سنہرا دیس، سن اشاعت درج نہیں)

"اگر مجھے بلونت سنگھ کی صرف ایک کہانی منتخب کرنی پڑے تو میں بے ساختہ "کرتھی" کا انتخاب کروں گا ۔

بلونت سنگھ کی یادگار کہانیوں میں (یعنی کہ جو میں نے پڑھی ہیں اور جو میرے نزدیک یادگار ہیں) کون سی ایسی چار کہانیاں ہیں ، جو اُن کے آرٹ کی پوری عکاسی کرتی ہیں ۔ یہ سوچنے پر میں نے بھی چار چار کہانیوں کی چار لسٹیں بنائی تھیں ۔

۱ ۔ کرتھی ، پنجاب کا البیلا ، کالی تیتری اور گمراہ ۔

۲ ۔ کرتھی ، خوددار ، تین باتیں ، جگا ۔

۳ ۔ کرتھی ، دیمک ، سمجھوتہ ، پہلا پتھر ۔

۴ ۔ کرتھی ، یہ لمحے ، سورما سنگھ ، دیوتا کا جنم ۔

"کرتھی" ان سب میں سرِفہرست ہے ۔ اور میں اُسے بلونت سنگھ کے فن کی نمائندہ کہانی مانتا ہوں"

(اوپندر ناتھ اشک ۔ اقتباس بشکریہ "آجکل" دلّی جنوری ۱۹۹۵ء)

بلونت سنگھ

رشتہ

سکھ جاٹ کی دو چیزوں میں جان ہوتی ہے ۔۔۔۔۔ اس کی لاٹھی اور اس کی سواری کی گھوڑی ۔ (یا گھوڑا) اگر یہ چیزیں چوری ہو جائیں تو انھیں تلاش کرنے میں وہ زمین اور آسمان ایک کر دیتا ہے ۔ اگر کوئی جاٹ سے اس کی یہ چیزیں چھین لینے کی کوشش کرے تو وہ مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتا ہے ۔ اگر دشمن بھاری پڑے اور اس کی یہ چیزیں چھن جائیں تو وہ چلو بھر پانی میں ڈوب مرتا ہے ۔

کرنیل سنگھ کے ساتھ پہلی قسم کا حادثہ پیش آیا تھا ۔ اس کی خوبصورت تیز خرام گھوڑی چوری چلی گئی تھی ۔

وہ لمبا چوڑا بارعب غصہ ور زمیندار تھا ۔ کسی کی کیا مجال کہ اس سے مقابلہ کر کے گھوڑی چھین لے جاتا ۔ گھوڑی کے چوری چلے جانے پر بھی اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا ۔ لیکن لاچار تھا

چار پانچ دن گزر گئے اس نے مجھ سے اس حادثہ کے بارے میں کچھ نہیں کہا ۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ایک دن وہ مجھ سے ضرور رائے لے گا ۔ اگر چہ میں اس کا نوکر تھا اور وہ مجھ سے بڑی بری طرح پیش آتا تھا ۔ پھر بھی وہ اہم معاملوں میں اکثر میری صلاح لیتا تھا ۔

وہی بات ہوئی ۔ صبح کا وقت تھا ۔ میں گاؤں سے آدھ کوس دور طویلے کے قریب لگے ہوئے کولھو میں سرسوں پیل رہا تھا ۔ کہ پھتے کھانستا ہوا میرے پاس آکر بولا ۔۔۔۔۔ " تبیلے میں سردار تجھے بلا رہا ہے " ۔

میں اصل معاملہ بھانپ گیا ۔ میں ابھی تک سوچ نہیں پایا تھا کہ اگر وہ گھوڑی کے بارے میں پوچھے تو میرا مشورہ کیا ہونا چاہئے ۔ یوں بھی میں اس کے سامنے جانے سے کتراتا تھا ۔ کیونکہ وہ بنا گالی گلوچ کے بات نہیں کرتا تھا ۔ کبھی مجھے بہت تاؤ بھی آتا تو خون کا گھونٹ پیئے بغیر کوئی اور چارہ نظر نہ آتا ۔ اس کا مقابلہ کرنا بے کار تھا ۔ آخر شیر اور بکری کا مقابلہ بھی کیا ۔ اگر نوکری چھوڑ دیتا تو میرا لائل پوریا اس کے گرد و نواح میں ٹکنا ناممکن ہو جاتا ۔ اور اگر اپنے گاؤں ضلع لدھیانہ میں جا بسوں تو روزی کا سوال حل نہیں ہو سکتا تھا ۔

پھتے کی بات سن کر بھی جی نہیں چاہا کیونکہ اس وقت صبح کی مدھی دھوپ میں دل کو بڑا

آنند محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن اٹھنا ہی پڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سردار کے منہ کون آئے۔

میں نے پھتے سے کہا کہ وہ میری جگہ بیٹھ کر ذرا بیل کو ہانکتا رہے، مگر پھتا بولا کہ وہ اس وقت کھیتوں کو جا رہا ہے۔ میں نے زور دے کر کہا۔

"۔۔۔ تھوڑی دیر تو بیٹھو، میں طویلے سے لڑکے کو بھیج دوں گا پھر چلے جانا"۔

وہ بیٹھ گیا اور پگڑی اتار کر سر کے پٹوں پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اور پھر پگڑی جھاڑ کر اسے از سرِ نو سر پر لپیٹنے لگا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جب میں طویلے کے لمبے چوڑے صحن میں داخل ہوا تو دیکھا کہ کرنیل بڑے چھکڑے کی مرمت کروا رہا تھا۔ دوسرے دن گھر کی عورتیں میلے کو جانے والی تھیں اسی کے سلسلے میں یہ تیاری ہو رہی تھی مستری بسولے کی الٹی طرف سے تیے کی ٹھکائی کر رہا تھا اور سردار اسے بڑے دھیان سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے قریب پہنچ کر دونوں ہاتھ جوڑ کر کہا۔۔۔ "ست سری اکال سردار جی!"

اس نے مجھے کچھ جواب نہیں دیا اور نہ میری طرف دیکھا ہی۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے اسے میری موجودگی کا احساس تک نہ ہو۔

کافی دیر تک میں ہاتھ پیٹھ پیچھے باندھے کھڑا رہا اور سردار کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ پینتالیس (۴۵) برس سے اوپر کا ہو چکا تھا۔ کچھ بال ضرور پک گئے تھے لیکن اس کے جسم میں ذرہ برابر کمزوری دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چوڑے نتھنوں والی مردانہ ناک، ہونٹ بھرپور، ڈاڑھی اور سر کے بال گھنے، رنگ تپے ہوئے تانبے کی مانند۔ میں اس کے بڑے بڑے ہاتھوں اور چوڑی کلائیوں کو دیکھتے ہوئے دل میں سوچنے لگا کہ کاش میں اس سے بھی دگنے ڈیل ڈول کا مالک ہوتا تو اسے گیند کی طرح اچھال کر پرے پھینک دیتا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پاتا کہ میں اپنا بھاری بھرکم بازو اٹھا کر وہ ہاتھ دیتا کہ گردن مڑ جاتی، پگڑی پرے جا گرتی اور اس کا سر کیچڑ میں دھنس جاتا، اگلے چاروں دانت ٹوٹ جاتے اور نتھنوں سے خون بہنے لگتا۔ میں نے یہیں تک نقشہ کھینچا تھا کہ سردار اپنے مٹکے نما حلق سے بھاری آواز نکال کر بولا۔۔۔۔ "اوئے بھوتیا"۔

"جی سردار جی!۔۔۔۔" میں نے ہاتھ جوڑ کر جواب دیا۔

وہ مجھے ہمیشہ اسی نام سے پکارتا تھا۔ میرے سر کے بال جوڑے کے قابو میں نہیں آتے اور داڑھی اور مونچھوں کے بال بھی اڑے اڑے سے رہتے تھے۔ میری اسی حالت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس نے ایک روز کہا۔۔۔۔ "اوئے تیرا نام تو بھوت سنگھ ہونا چاہئے"۔

اب آپ ہی سوچئے بھوت سنگھ اور بھوتیا میں کتنا بڑا فرق ہے۔

"بھوتیا! گھوڑی کا پتہ نہیں چلا؟"

مجھے کوئی مناسب جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ اب تک میرے ذہن میں کوئی ترکیب نہیں آئی تھی۔

مجھے چپ دیکھ کر سردار بولا۔ "اوئے بولتا کیوں نہیں بھوتنیا!"

اب بھوتیا سے بھوتنیا بنادیا گیا۔

میں نے ہڑبڑا کر سوال کیا۔ "آپ نے تھانے میں رپٹ نہیں لکھائی؟"

"بھوتنی دا" ۔ وہ میری طرف دیکھے بغیر ہنسا۔ "پلس کیا کرلے گی ۔۔۔ اگر میں کسی کی گھوڑی لاکر اپنے تبیلے میں باندھ لوں تو بتا پلس کیا کرلے گی••••••• اور پھر پلس کو کھبر کرنا کیا مردوں کا کام ہے ••••••••••ہیں؟"

بھوتیا، بھوتنیا اور بھوتنی دا!! ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ سچ مچ گالی دینے میں سردار کو ید طولیٰ حاصل تھا۔

جیسے کہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ سردار اکثر معاملوں میں مجھ سے صلاح و مشورہ کرتا تھا۔ لیکن مجھے ایسا ٹیڑھا مسئلہ پہلے کبھی حل نہیں کرنا پڑا تھا۔ لائل پور کے علاقے میں ان دنوں چور ڈاکوؤں کی کمی نہیں تھی۔ اس زمانہ میں مسلمان خانہ بدوش بھی پائے جاتے تھے جن کے مرد بڑے وجیہہ اور عورتیں بڑی حسین ہوتی تھیں۔ ان کا داؤ لگے تو ہاتھ مار جاتے تھے۔ اور پھر بار کا علاقہ بھی قریب ہی تھا۔ جہاں کے سکھ بھی ان سے بڑھ چڑھے تھے اور جہاں ایک سے ایک دھاکڑ موجود تھا۔ کون جانے اس کام میں کس کا ہاتھ تھا؟ دو باتیں صاف ظاہر تھیں، اول یہ کہ گھوڑی کا چور شوقین مزاج تھا ورنہ گھوڑی کے علاوہ اور جانور بھی ہانک کر لے جاتا۔ دوسری بات یہ کہ چور کوئی معمولی آدمی نہیں تھا۔ کرنیل سنگھ کی علاقہ بھر میں شہرت تھی اور ہر شخص پر اس کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی چنانچہ اس کی گھوڑی چرانے کا کام کسی معمولی انسان کا کارنامہ ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

کچھ دیر تک خاموشی طاری رہی۔ مستری کے بسولے کی ٹھکا ٹھک کی آواز گونجتی رہی، لیکن جب چھکڑے کی مرمت ہو چکی تو سردار نے دھیرے سے میری گردن کو پنجے میں دبوچا، اور ایک گوشے میں لے جاکر بولا۔ "یہ کام کسی بڑے حرام زادے کا ہے"۔

"ہاں جی، آپ ٹھیک کہتے ہیں" ۔ میں نے گلے میں پھنسی ہوئی آواز کو بمشکل باہر نکالتے ہوئے کہا۔

سردار کچھ دیر تک میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رہا۔ اور پھر بولا۔ "مالہ میڑھا ہے۔ اس لئے کسی میڑھے آدمی کی مدد سے یہ گتھی سلجھ سکتی ہے۔ سمجھے؟"

میرا گلا بالکل خشک ہو رہا تھا۔ چنانچہ میں نے کچھ کہے بغیر اثبات میں سر ہلا دیا۔

سردار کی بھاری آواز گونجی "کل میلے میں جاکر آنکھیں کھلی رکھو گے تو کوئی نہ کوئی اصلی

حرامزادہ تمھیں نظر آہی جائے گا جو کانٹے پر پورا اترے تو اس سے سودا ہو سکتا ہے۔ ایسے آدمی کو جو گھوڑی لے کر آئے میں پانچ (۵۰۰) روپیہ انعام دینے کو تیار ہوں۔ اور اگر حرام زادے چور کا پتہ مل سکے تو پانچ سو (۵۰۰) سو اور انعام دے سکتا ہوں .... بس ایک بار چور میرے جنگل میں آجائے تو سالے کی گردن مروڑ دوں تاکہ آگے کو سب کو کان ہو جائیں .... سمجھے؟"

اب کے میں نے بڑی مشکل سے جواب دیا۔ "جی سمجھا"۔

میں جانتا تھا کہ اب کے بھی میں نے نرا سر ہلا دیا تو گالیوں کی بوچھاڑ سہنی پڑے گی۔

سردار نے آخری بار اپنی انگلیوں کو میری گردن پر اور کس کر کہا۔ "بھوتیا۔ یہ کام جیسے بھی ہو کرنا ہو گا........."

دوسرے دن گھر کی عورتیں اور کچھ برادری کی عورتیں۔ لڑکیاں اور بچے چھکڑوں پر لد گئے اور میں ایک گھوڑی پر سوار ہو گیا۔ اس شان سے ہمارا قافلہ میلے کو روانہ ہوا۔

آہا! پنجاب کے میلے بھی کیسے پیارے ہوتے ہیں۔ جنگل میں منگل کا سماں بندھ جاتا ہے۔ دور دور تک خیمے اور قناتیں لگ جاتی ہیں۔ گرد آلود راہوں پر خوب چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ ناچ، رنگ گانا بجانا، بولی ٹھولی غرضیکہ ہر قسم کی رونق نظر آنے لگی ہے۔ رات کو سیکڑوں گیسوں کی روشنی میں دکانیں اپنی بہار الگ دکھاتی ہیں۔ ان دکانوں میں دیہاتیوں کے ذوق اور ضرورت کی اشیاء بکتی ہیں۔

یہ میلہ جس کا میں ذکر کر رہا ہوں متواتر چھ سات دن تک لگتا تھا۔ ہمارا پروگرام بھی چار چھ دن تک رہنے کا تھا اس لئے ہم اپنا خیمہ، آٹا، دال، گھی اور ایندھن وغیرہ، سب کچھ اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ چونکہ سردار کے گھرانے کے کئی لوگ ہمراہ تھے اس لئے ہمارے خیمے میں خاصی چہل پہل رہتی تھی۔ سب سے زیادہ رونق سردار کی بڑی لڑکی لال کور کی وجہ سے تھی۔ اسے سب اکثر لالی کے نام سے پکارتے تھے۔ اپنی جوانی اور حسن کے باعث وہ اپنے باپ سے کم شہرت نہیں رکھتی تھی۔

میلہ کیا تھا جنگل میں ایک چھوٹا سا نگر بس گیا تھا۔ پنگوڑے، مٹی کے برتن، مسالے دار چاٹ اور مٹھائیوں کی دکانیں تو قدم قدم پر موجود تھیں۔ دیگر کئی قسم کی دکانوں کے علاوہ تفریح کے کئی سامان بھی موجود تھے۔ کہیں پر بجے پور اور بھرت پور کی نٹنیاں تماشائیوں کے حلقہ میں اپنے کمالات کا مظاہرہ کرتیں۔ کہیں ہیر رانجھے کا قصہ سوز بھری آواز میں گایا جاتا کہیں قوالیوں پر لوگ سر دھنتے۔ کہیں بولیاں ٹھولیاں۔

اب کے میلے میں جو نئی چیز دیکھنے میں آئی وہ تھا بولتا، چلتا پھرتا بائیسکوپ۔ میں نے شہر کے کئی بائیسکوپ دیکھے تھے جن کے مقابلے میں یہ بالکل ہیچ تھا۔ پھر بھی ان دیہاتیوں کے لئے جنھیں شہر جانے کا موقع کم ہی ملتا تھا۔ یہ ایک حیرت انگیز چیز تھی۔ تاروں بھرا آسمان، اس

بائیسکوپ کی چھت، چاروں طرف قناتیں۔ پردہ یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے کئی دھوتیوں کو سی کر بنایا گیا ہو۔ ایک جھونپڑی میں مشین رکھی تھی۔ باہر ٹکٹ نہیں بکتے تھے۔ فقط چار آنے نقد دینے پر آدمی کو زمین پر بیٹھنے کی اجازت ہوتی تھی، اور آٹھ آنے دے کر آدمی بغیر بازو کے لوہے کی کرسی پر بیٹھ سکتا تھا۔ کھیل شروع ہونے کا کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔ جب کافی لوگ جمع ہو جاتے تو کھیل شروع کر دیا جاتا۔ مشین ایک تھی اس لئے ہر دس بارہ منٹ کے بعد کچھ منٹ کا وقفہ ہو جاتا

ایک شام گھر کے سب لوگوں نے بائیسکوپ دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔ چنانچہ رات کے کھانے سے فرصت پاکر ہم لوگ روانہ ہو گئے۔ ہم سب آٹھ آٹھ آنے کی کرسیوں پر جا بیٹھے۔
کافی دیر انتظار کے بعد کھیل شروع ہوا۔ دو ریلیں (Roels) ہو چکیں تو میں نے دیکھا کہ تین چار جوان بڑے دھڑلے سے اندر داخل ہوئے اور کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ یہ معلوم ہونے پر کہ دو ریلیں چل چکی ہیں انھوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر آوازے کسنے شروع کئے۔ مالک آیا تو اس سے کھیل پھر سے شروع کرنے کے لئے کہا۔۔۔۔ چنانچہ کھیل از سر نو شروع کر دیا گیا۔۔۔۔ باقی لوگ بھی خوش تھے کہ ان کے دام پھر سے وصول ہو رہے ہیں۔
یہ ماجرا دیکھ کر میں ذرا چوکنا ہو گیا۔ کچھ تو نووارد دور بیٹھے تھے اور کچھ تاریکی کی وجہ سے میں ان کی صورتیں اچھی طرح دیکھ نہیں سکا۔ لیکن ایک بات صاف عیاں تھی کہ وہ دھاکڑ لوگ تھے۔ کیونکہ ہرایرے غیرے کے کہنے پر کھیل پھر سے شروع نہیں کیا جاتا تھا۔
میں پچھلے تین روز سے اپنے مالک کے کہنے کے مطابق ایسے آدمی کی جستجو کر تا رہا جو ہمارے کام آسکے۔ لیکن ابھی تک مجھے اس میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی۔ چنانچہ اب میں نے طے کیا کہ ان جوانوں کا پیچھا ضرور کروں گا، ممکن ہے ان میں سے کام کا آدمی مل جائے۔
شو ختم ہونے کے بعد باہر میں نے گیس کی تیز روشنی میں دیکھا تب مجھے یقین ہوا کہ وہ اصلی حرام دھاکڑ جوان ہیں۔ یوں تو وہ سب کے سب نوجوان، لمبے تڑنگے مضبوط اور اکھڑ تھے لیکن ان میں سے ایک خاص طور پر میری نظر میں جچ گیا۔ وہ اپنے ساتھیوں میں نہ صرف سب سے طاقتور اور وجیہہ نظر آتا تھا۔ بلکہ بات چیت کرنے کے ڈھنگ سے بھی ہوشیار معلوم ہوتا تھا۔ میں موقع پاکر باتوں ہی باتوں میں اسے ٹٹولنا چاہتا تھا۔
کچھ دور جانے کے بعد ان کا گروہ ایک دکان پر رک گیا۔ اس وقت یک بہ یک نوجوان نے ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ دور سے پیڑ کی اوٹ سے ایک عورت کی جھلک دکائی دی اور وہ اپنے ساتھیوں سے رخصت ہو کر ادھر کو چل دیا۔۔۔ میں بھی کچھ فاصلہ دے کر پیچھے پیچھے ہو لیا۔
وہ دونوں کھیتوں میں بنے ہوئے ایک لوہے کے رہٹ کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ میں پودوں کی اوٹ میں لمبا چکر کاٹ کر ان کے قریب پہنچا تاکہ ان کی باتیں سن سکوں۔ لیکن وہ اتنی

دھیمی آواز میں بول رہے تھے کہ کچھ سمجھنا ناممکن تھا۔

میں دھندلی روشنی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔ عورت یا لڑکی میری طرف پیٹھ کئے کھڑی تھی۔ کچھ دیر کے بعد جب اس نے منہ پھیرا تو میرے حلق سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی ۔۔۔۔۔۔۔ وہ لالی تھی!

عجیب بات تھی۔ آخر ان کی محبت کب شروع ہوئی تھی۔ یہ ضرور نیا نیا پریم تھا کیونکہ اگر پرانی کھچڑی پک رہی ہوتی تو اب تک یہ بات مشہور ہو گئی ہوتی۔ کیونکہ اگر اس نوجوان کی ہمارے گاؤں میں آمد و رفت رہی ہوتی تو مجھے ضرور پتہ چل جاتا، بلکہ سبھی اسے جاننے لگتے۔

کچھ دیر تک ان میں گھٹ گھٹ کر باتیں ہوتی رہیں۔ پھر جب لالی جانے لگی تو نوجوان نے بڑھ کر اس کا بوسہ لے لیا ۔۔۔۔۔۔ اس پر وہ یک لخت ہاتھ چھڑا کر پرے بھاگ گئی اور دور سے مسکرا مسکرا کر اسے انگوٹھا دکھانے لگی۔

نوجوان بھی مسکراتا ہوا دوسری جانب چل نکلا۔ میں بدستور اس کے پیچھے ہو لیا۔

چلتے چلتے میلے میں داخل ہونے سے پہلے وہ ایک دم رکا اور گھوم کر میری طرف دیکھنے لگا

میرے لئے بھاگ نکلنا یا چھپ جانا ناممکن تھا اس لئے میں نے فیصلہ کیا کہ اسکی طرف دھیان دئے بغیر پاس سے گذر جاؤں گا۔ جب اس کے سامنے پہنچا تو اس نے اپنی لمبی لاٹھی آگے بڑھا کر میرا راستہ روک دیا۔

میں نے جھکی ہوئی آنکھیں دھیرے دھیرے اوپر اٹھائیں۔ کچھ دیر تک سکوت طاری رہا پھر وہ بولا۔ "کہو استاد یہ ہمارے پیچھے ہاتھ دھو کر کیوں پڑے ہو؟ جاؤ اپنا کام کرو نا۔ یا اگر اپنی زندگی ہی سے تنگ آچکے ہو تو بتاؤ دوں ایک ہاتھ؟"

میں نے بات بنا کر جواب دیا۔ "دیکھو سردار بہادر، بھلا مجھے تمھارا پیچھا کرنے کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ لیکن میں محض اس لڑکی کی وجہ سے تمھارے پیچھے لگا رہا"۔

اس کے کان کھڑے ہو گئے۔ "کیوں اس لڑکی سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"

"کیا تم جانتے ہو وہ کس کی بیٹی ہے؟"

"نہیں"۔

"واہ جس کے ساتھ پریم کے جھولے جھولتے ہو اس کے بارے میں اتنا بھی نہیں جانتے"

"دو تین دن کی ملاقات ہے ابھی اس قسم کی کوئی بات ہی نہیں ہوئی ۔۔۔۔۔۔ لیکن تم کون ہو؟"

"وہ سردار کرنیل سنگھ کی بیٹی ہے۔ اور میں ان کا پرانا نوکر ہوں"۔

یہ سن کر وہ لمحہ بھر چپ رہا پھر کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ "اچھا تو یہ بات ہے۔ ہاں کرنیل سنگھ کا نام تو میں بھی سنا ہے"۔

"ضرور سنا ہوگا۔ علاقے بھر میں ان کی دھاک ہے"۔ اس نے تنی ہوئی موچھوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔ "بھئی! تم تو بڑے کام کے نکلے۔ آؤ ذرا اونٹنیوں کا دودھ پلائیں تھیں۔ وہیں پر دل کھول کر باتیں ہوں گی"۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ چل دئے۔ ہمارا راستہ شرینہہ کے قدآور درختوں میں سے ہوکر جاتا تھا۔ میں ایسے لمبے چوڑے اکھڑ آدمی کے ساتھ قدم بقدم چلتے ہوئے ڈر محسوس کر رہا تھا۔ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ایک ہاتھ دے اور میں یہیں پیڑ کے تنے کے قریب ڈھیر ہو جاؤں مگر وہ ایسا کمینہ نظر نہیں آتا تھا۔ وہ چاہتا تو مجھے دن دھاڑے ٹھکانے لگا سکتا تھا۔

میلے کے ایک سرے پر پیڑوں کے نیچے کچھ اونٹنیاں بلبلا رہی تھیں۔ ادھر ادھر کچھ کچھ چارپائیاں بچھی تھیں۔ ہم ایک چارپائی پر بیٹھ گئے۔

دودھ پی کر اس نے موچھیں چوستے ہوئے کہا۔ "بھئی سچی بات یہ ہے کہ لالی نے تو مجھ پر جادو کر دیا ہے"۔

میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے جواب دیا۔ "پر میں صاف کہہ دوں کہ تم آگ سے کھیل رہے ہو"۔

وہ بے پروائی سے ہنسا۔ "یہ آگ واگ کی دھمکیاں مت دو۔ سیدھی بات یہ ہے کہ اس لونڈیا کو اپنی جورو بنانے کا ارادہ ہے میرا۔۔۔۔۔ اب چاہے سیدھی انگلیوں سے گھی نکلے یا ٹیڑھی سے"۔

میں نے ایک بار پھر اس کو سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس میں گھبرو جوانوں والی سبھی خوبیاں موجود تھیں۔ میں نے دھیرے سے کہا! "دیکھو سردار بہادر! ہم تو بس اتنا جانتے ہیں کہ کام یوں کرے کہ سانپ مرجائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے"۔ "چلو یوں ہی سہی ۔۔۔۔" وہ مسکرا دیا۔ میں کچھ دیر تک چپ چاپ سوچتا رہا۔ پھر پینترا بدل کر بولا۔ "اگر تم ہمارے سردار جی کا ایک کام کردو تو آم کے آم اور گٹھلیوں کے دام والی بات ہو جائے"۔

"وہ کیسے؟"

"بات یہ ہے کہ ہمارے سردار جی کی گھوڑی چوری ہو گئی ہے۔ اس کا اب تک کچھ سراغ نہیں ملا۔ اگر کہیں تم اسے ڈھونڈ نکالو تو پانسو روپیہ نقد انعام پاؤ۔ اور اگر چور کو بھی پکڑوا دو تو پانسو روپیہ اور ملے گا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ وہ اتنے خوش ہونگے کہ انھیں تم سے حسین جوان سے لالی کا رشتہ کرنے سے بھی انکار نہ ہوگا"۔

"یہ بات ہے۔۔۔۔۔۔۔ اچھا۔۔۔۔۔۔۔" یہ کہہ کر وہ سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر بولا۔ "یہ

ہے ذرا ٹیڑھی کھیر ...."

"ٹیڑھی کو سیدھی کرنا تمھارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہونا چاہئے"۔

"یہ تو ٹھیک ہے لیکن ...."

"لیکن کیا میں تمھیں گھوڑی کا حلیہ بتائے دیتا ہوں ....آخر تم کس چکر میں پڑے ہو۔ کام مشکل ہے تو انعام بھی تو بڑا ہے۔ اگر تمھیں روپئے کی پروا نہیں تو لالی کی پروا تو ہے ...."

وہ میری طرف دیکھ کر ہنسا۔" بات یہ ہے کہ مجھے اور سب کام چھوڑ کر یہ کام کرنا ہوگا ....اچھا حلیہ بتاؤ گھوڑی کا"۔

اس پر میں نے گھوڑی کا حلیہ بتایا اور مالک کا پورا پتہ دیا۔ سب کچھ سن کر وہ بولا۔ "یار یوں لگتا ہے کہ یہ گھوڑی میں نے کہیں دیکھی ہے ...." پھر وہ انگلیوں سے ماتھے کو دبانے لگا، پھر دفعتاً بولا۔ "اچھا استاد ہاتھ ملاؤ ....مجھے امید ہے کہ کام بن جائے گا"۔

میں نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔" کیوں کچھ یاد آیا؟"

"ہاں ....آیا تو"۔

"تو پھر کب تک امید رکھی جائے؟"

"دیکھو استاد علاقے میں ایک سے ایک دھاکڑ پڑے ہیں۔ پر ہم شیر کی موچھ کے بال اکھاڑ لانے والے آدمی ہیں ....بس اب تہیہ کر لیا ہے کہ یہ کام کر کے لالی کو حاصل کروں گا۔ لیکن یاد رکھو اگر لالی کا معاملہ کھٹائی میں پڑ گیا تو تمھاری خیر نہیں ...."

"ہاں ہاں، بیشک ------۔ لیکن میں مالک سے کیا بتاؤں کہ تم کتنے دن کے اندر یہ کام کر سکو گے؟"

اس نے پھر کچھ دیر غور کیا اور پھر بولا۔ "اچھا صرف دس دن کی مہلت رہے گی"۔

یہ طے ہو جانے پر ادھر ادھر کی گفتگو کے بعد ہم رخصت ہوئے۔ میں بیحد خوش تھا۔

میلے سے واپس آکر میں نے سردار کو بتایا کہ گھوڑی کا پتہ لگانے کے لئے ایک بڑے سے دھاکڑ کو گانٹھ آیا ہوں۔ یہ سن کر سردار کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ وہ اس جوان کی شکل و صورت اور ڈیل ڈول کے بارے میں سوالات پوچھنے لگا۔

میں نے اس کی خوب تعریف کی اور یہ بھی کہہ دیا کہ اگر کہیں لالی سے اس کا رشتہ ہو جائے تو جوڑی خوب رہے۔ لیکن میں نے ان کے عشق کا راز نہیں کھولا۔

یہ سن کر سردار نے مجھے گھور کر دیکھا۔ اور گالی دیتے دیتے رک گیا ....ظاہر تھا کہ وہ نیم رضامند ہی تھا۔ ورنہ اس کے منھ میں لگام کون ڈال سکتا تھا۔

دن گذرتے گئے۔ ایک دو تین۔ یہاں تک کہ نو دن گذر گئے اور دسواں دن آن پہنچا۔

اس وقت تک ہم خاصے ناامید ہو چکے تھے ۔ سردار نے صبح کے وقت ہی مجھے دو چار گالیاں سنائیں لیکن زیادہ کراری گالیاں رات تک کے لئے محفوظ رکھیں ۔

میرے دل میں اب بھی امید کی ہلکی سی کرن باقی تھی ۔ آخر کام بھی تو جان جوکھوں کا تھا ۔ نہ جانے بچارے کو کیا کیا مصیبتیں اٹھانی پڑیں .... لیکن مجھے وہ آہنی ارادے والا جوان معلوم ہوا تھا ۔ یہ ناممکن تھا کہ وہ تہیہ کر لے اور پھر ناکام رہے ۔

سردار اس ہیرو کو دیکھنے اور گھوڑی واپس پانے کے لئے بے قرار تھا ۔ اس خیال سے کہ شاید چور کا بھی سراغ مل جائے ۔ کچھ لٹھ بازوں کا بھی انتظام کو رکھا تھا تاکہ موقع پر کام آئیں ۔

وقت گذرتا گیا ۔ دھوپ ڈھلنے لگی .... لیکن اس جوان کا کہیں پتہ نہ تھا ۔ اب میرے مالک کا دماغ سچ مچ بگڑنے لگا اور میں اس ڈر سے کہ کہیں اس کے قہر کی زد میں نہ آجاؤں طویلے کے باہر رہٹ کے قریب جاکر کھڑا ہو گیا ۔ میں دور دور تک نظر دوڑا رہا تھا ۔ ہر راہگیر پر اسی کا دھوکا ہوتا ۔

اسی اثناء میں طویلے سے سردار کی آواز آئی ۔ "اوئے بھوتیا" ۔

آواز کے انداز سے ظاہر تھا کہ اب میری خیر نہیں ۔ لیکن اندر جانے کے سوا چارہ کار نہیں تھا ۔ جاتے جاتے میں ٹھٹھکا ۔ ۔ ۔ ۔ دور بہت دور سے ایک سوار دکھائی دیا ۔ یوں تو اس قسم کے کئی سوار آتے جاتے دکھائی دیتے ہی رہتے تھے اور پھر اس قدر دور سے یوں بھی اسے پہچاننا مشکل تھا ۔ لیکن اس سوار کے ہاتھ میں ایک اور گھوڑے کی لگام تھی جسے وہ تیزی سے بھگائے لے آرہا تھا ۔ چند لمحوں کے بعد میں نے اپنی گھوڑی کو پہچان لیا ۔ اور پھر مجھے یقین ہو گیا کہ وہ سوار بھی وہی نوجوان تھا ۔

اس پر میں وہیں سے چلا اٹھا ۔ "سردار جی گھوڑی مل گئی" ۔

سردار باہر نکل آیا اس وقت تک نوجوان اور قریب آچکا تھا ۔ ہم نے آگے بڑھ کر اس کا سواگت کیا ۔ سردار گھوڑی دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے بڑی گرمجوشی سے اس سوار سے ہاتھ ملایا ۔ اور اپنی گھوڑی کو پچکارتا ہوا طویلے کے اندر لے گیا ۔

گھوڑی صحن میں باندھ کر سردار نوجوان کا ہاتھ تھامے اس دو کمروں میں سے بڑے والے میں لے گیا ۔ اس کمرے کے ایک کونے میں ٹوٹا پھوٹا سامان پڑا رہتا تھا ۔ اور چھوٹا کمرہ صرف موسم سرما میں مویشیوں کے باندھنے کے کام آتا ۔ بڑے کمرے میں لوہے کی چند کرسیاں اور ایک بڑی سی میز پڑی تھی ۔ یہ سردار کی امارت کی نشانیاں تھیں ۔ اکثر مہمانوں کی مہمانداری یہیں پر ہوتی تھی ۔

اس وقت نووارد نوجوان کی شکل وصورت قابل دید تھی ۔ وہ ایک لمبا سلک کا کرتہ پہنے تھا ۔ اس پر متعدد سیپ کے بٹنوں والی واسکٹ نیچے مونگیا رنگ کا تہبند ۔ پاؤں میں تیل سے چپڑے ہوئے بھاری بھرکم دیسی جوتے ۔ سر پر کلف لگی طرہ دار پگڑی جس کی وجہ سے وہ لمبا جوان

اور بھی لمباد کھائی دیتا تھا۔

سردار اسے دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اور پانچ سو روپے کے نوٹوں کی گڈی میز پر رکھ کر کہا۔ "نوجوان یہ پانسو روپیہ ہے ....ہاں بھوتیان ذرا لسی شربت کا انتظام تو کرو"

نوجوان نے کہا۔ "دیکھئے لسی شربت کی تکلیف نہ کیجئے کیونکہ مجھے فوراً واپس جانا ہے۔ ....البتہ مجھے آپ سے پانسو روپیہ اور بھی لینا ہے"۔

سردار بولا۔ "وہ تو چور کو میرے سامنے لے آتے یا مجھے اس کے پاس لے جاتے تو ...."

"میں اس کے لئے بھی تیار ہوں"۔

سردار نے ذرا تامل کیا۔ پھر بھاری آواز میں بولا۔ "اچھا تو یہ بات ہے ....میں سمجھا کہ شاید چور تمھاری جان پہچان کا ہے اور تم اس کا پتہ نہیں بتانا چاہتے ......"

نوجوان نے چمکدار آنکھیں اوپر اٹھائیں۔ "یہ ٹھیک ہے، لیکن ایسے معاملے میں میں کسی کا لحاظ نہیں کرتا"۔

"تو ٹھیک ہے ......گویا تم ہمیں چور کے پاس لے چلو گے"۔

"ہاں ......آپ کے آدمی تیار ہیں کیا؟"

"ہاں ہمارے آدمی تیار ہیں"۔

"تو بس ٹھیک ہے ....میں چور سے آپ کا سامنا کرادوں گا اور اپنی راہ لگوں گا...اس کے بعد آپ جانیں اور وہ چور"۔

"منظور ہے"۔

"برا نہ مانیے تو وہ روپیہ میرے حوالے کر دیجئے کیونکہ میں روپیہ لینے کے لئے واپس نہیں آؤں گا"۔

سردار نے نوٹوں کی دوسری گڈی نکالی اور میز پر رکھ دی۔ اور مجھ سے کہا۔ "سب آدمیوں سے کہو گھوڑیاں کس لیں"۔

میں نے دروازے میں سے باہر جھانک کر صحن میں کھڑے آدمیوں سے پکار کر کہا۔ "سردار جی کہتے ہیں گھوڑیاں کس لو سب لوگ۔

نوجوان نے ایک گڈی تہبند کے دائیں پلو اور دوسری بائیں پلو میں لپیٹی اور کس کر انھیں تہبند کے اندر مضبوطی سے اڑس لیا۔ پھر اس نے اپنی لمبی مضبوط لاٹھی پر چمکیلی چھوی چڑھائی اور دیوار کی طرف پیٹھ کر کے سیدھا سپاہیانہ انداز سے کھڑا ہو گیا۔ مونچھوں کو انگلیوں سے چھو کر بھرپور آواز میں بولا۔ "آپ کی گھوڑی کا چور آپ کے سامنے کھڑا ہے"۔

اس کی یہ بات مجھے یوں لگی جیسے بم کا گولا پھٹ گیا ہو ....مجھے تعجب ہوا۔ کیا

واقعی ؟ ------ لیکن سچ مچ ہمارے سردار کی گھوڑی چرانا معمولی آدمی کا کام نہیں ہو سکتا تھا
.... دوسرے ہی لمحہ میں مجھے خوشی کا احساس ہوا ۔ دیکھنا یہ تھا اب سردار کیا کرتا ہے ۔
کیونکہ اتنے برسوں میں میں نے کسی کو اس قدر جرات کے ساتھ سردار کو للکارتے نہیں دیکھا تھا

ادھر سردار بت بنا کھڑا تھا ۔ یوں دکھائی دیتا تھا جیسے اس کے سارے بدن کا لہو اس کی آنکھوں میں دمک رہا ہو ۔ مارے غصے کے اس کے ہونٹ لرز رہے تھے لیکن بات منہ سے نہیں نکلتی تھی ۔

غالباً سردار دوسرے آدمیوں کو بلانے کے لئے دروازے کی طرف بڑھا ۔ ادھر وہ نوجوان دلجمعی سے پانی کے گھڑے کی طرف بڑھا ۔ قریب پڑے ہوئے کانسے کے کٹورے کو اٹھا کر اسمیں پانی بھرا اور اطمینان سے گھونٹ در گھونٹ پینے لگا ۔

سردار دروازے کے قریب کھڑا اس کی یہ حرکت دیکھ رہا تھا .... لیکن کچھ بولا نہیں .... نوجوان نے پانی پی کر انگوچھے سے مونچھیں پونچھیں اور چھوی والی لاٹھی کو ہاتھ میں تول کر دروازے کی طرف بڑھا ، جدھر سردار کھڑا تھا ، کیونکہ اس دروازے کے سوا باہر جانے کا اور کوئی راستہ نہیں تھا ۔

سردار کی مٹھیاں بند ہو ہو کر کھل رہی تھیں ۔ نوجوان اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دھیرے دھیرے ، قدم بہ قدم اس کے پاس پہنچا ۔ ٹھٹک کر رکا ۔ لمحہ بھر کو دونوں کی آنکھیں ملیں ۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب وار ہوا کہ ہوا ۔ لیکن سردار نے ہاتھ اوپر نہیں اٹھایا ۔
نوجوان آگے بڑھا اور طویلے کے صحن کے بڑے دروازے پر جاکر رک گیا
....

ہمارے لٹھ باز سردار کے حکم کے منتظر تھے ۔ وہ نوجوان بے اعتنائی سے چلتا ہوا اپنے گھوڑے کے پاس پہنچا اور سوار ہونے سے پہلے اس نے گھوم کر میری طرف دیکھا مجھے یوں لگا جیسے اس کے ہونٹوں پر مبہم سی مسکراہٹ پھوٹ رہی ہو ۔ جیسے وہ مجھے میرا وعدہ یاد دلا رہا ہو ۔ اس کے بعد وہ ایک ہی جست میں گھوڑے پر سوار ہو گیا ۔
سردار نے لٹھ بازوں سے اب بھی کچھ نہیں کہا ۔ یہاں تک کہ گھوڑا سوار مدھم دھوپ میں کھیتوں میں سے ہوتا ہوا بہت دور نکل گیا ۔
میں سردار کے پیچھے کھڑا تھا جب کہ وہ ایک کندھا بڑے دروازے کی چوکھٹ سے ٹیکے چپ چاپ کھڑا تھا ۔ مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا ۔ اس لئے یہ جاننا محال تھا کہ اسکے چہرے کے جذبات کیا ہیں ....
تھوڑی دیر بعد اس نے میری جانب دیکھے بغیر بے کیف اور بھاری آواز میں سوال کیا ۔

"تم اسی نوجوان کا رشتہ لالی کے ساتھ کرنے کو کہہ رہے تھے؟"

میرے ہونٹ، زبان اور حلق چشم زدن میں خشک ہوگئے۔ اور میں ڈر کے مارے کچھ جواب نہیں دے سکا.......... اس پر سردار نے گھوم کر میری طرف دیکھا۔

.... اس کے موٹے ہونٹوں پر گھنی مونچھوں کی ٹھنڈی چھاؤں تلے .... ایک موہوم سی مسکراہٹ جنم لے رہی تھی۔

"بلونت سنگھ ہمارے سب سے زیادہ READABLE افسانہ نگار ہیں۔ یہ اُن کا ایک وصف ہے، کوئی فن کارانہ قدر نہیں۔ ان کے افسانوں میں کوئی اشکال، ابہام، الجھاؤ اور پیچیدگی نہیں ہوتی۔ گو تکنیک اور بیانیہ کے وہ ہر نوع کے ہتھکنڈوں سے واقف ہیں۔ اور اُن سے ندرتیں پیدا کرنے کا کام بھی لیتے ہیں۔ لیکن ہر چیز اس انداز سے ہوتی ہے کہ ہمیں ان کی ندرتوں اور اختراعات کا احساس تک نہیں ہو پاتا۔ اس معاملے میں بھی وہ منٹو سے گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ سیدھی سادی کہانی کہہ رہے ہیں، کسی بھی تام جھام اور رنگ آمیزی کے بغیر، لیکن غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ کہانی کے ہر جزو، ہر واقعہ، کردار کے ہر پہلو کے بنیادی لوازمات اور ضروری تفصیلات کا کیسا خیال رکھا گیا ہے۔ کہیں بھی تو تشنگی، تعجیل، سطحیت اور بے پروائی کا احساس نہیں ہوتا۔

بلونت سنگھ کی کہانی فوراً قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور آغاز سے انجام تک اپنی دلچسپی قائم رکھتی ہے۔ منٹو ہی کی طرح انہیں تجسس پیدا کرنے کا غیر معمولی ملکہ حاصل ہے۔ ان کے یہاں تجسس شعوری کاوش کا نتیجہ نہیں بلکہ افسانہ کی بنت کا جزو ہوتا ہے۔ ان کی اچھی کہانیوں کا راوی عموماً کوئی سیدھا سادا کردار ہوتا ہے جو دوسرے انوکھے کرداروں کے قریب آتا ہے۔ فطری طور پر اُس میں یہ جاننے کی خواہش ہوتی ہے کہ یہ انوکھا کردار کون ہے، کیا کر رہا ہے، کیا کرتا رہا ہے اور کیا کرے گا۔ کردار میں راوی کی یہ دلچسپ پُرسکون پانی کی وہ خاموش لہر ہے جو سطحِ آب پر سوکھے پتّوں کو بہالے جاتی ہے۔ افسانے کی سطروں پر ہماری پُرشوق نظریں بھی اسی طرح سبک خرام رہتی ہیں۔ منٹو کا بھی یہی طریقۂ کار ہے۔ ظاہر ہے بیدی اور عصمت کا نہیں۔ منٹو کے یہاں ایسے افسانوں کا انجام قدرتی طور پر غیر متوقع اور تحیّر خیز ہوتا ہے۔ کیوں کہ ان کا سروکار فطرتِ انسانی کی بوالعجبیوں کو نمایاں کرنا ہوتا ہے۔ نفسیات بلونت سنگھ کی جولانگاہ نہیں۔ اسی لئے تحیّر ان کے یہاں کردار کا نہیں پلاٹ کا جزو بن جاتا ہے۔"

(وارث علوی۔ اقتباس بشکریہ "آجکل" دلّی۔ جنوری ۱۹۹۵ء)

بلونت سنگھ

منی کی موت

میرے دوست گوکل داس ددھوا کی بچی مر گئی۔

دسمبر کا مہینہ تھا۔ دوپہر کا وقت۔ صبح سے آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ دن بھر گھومنے کے بعد تھکاماندہ میں اپنے کمرے میں واپس آیا۔ ان دنوں میں کنوارا تھا، بے کار اور بے گھر تھا۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں گزارا کرتا تھا۔ آتے ہی بستر پر لیٹ گیا۔ رضائی اوڑھی اور پنگوئین سیریز کی ایک کتاب How the japa nese Fight کھول کر لیٹے لیٹے پڑھنے لگا۔

کتاب دلچسپ تھی۔ جب میں لفٹنٹ کرنل ہیرلڈ داؤد کے بیان کے اس حصہ پر پہنچا کہ ----- "ہم نے صبح پانچ بجے مارچ شروع کیا اور اگلے روز کے دس بجے تک مسلسل چلتے رہے۔ اس عرصے میں ہم نے چھپن میل کا فاصلہ طے کیا۔" ---- تو کسی نے دروازے پر دستک دی ---- کرنل صاحب جاپانی فوج میں اپنے تجربات بیان کر رہے تھے مجھے تعجب ہو رہا تھا کہ جاپانی اس قدر سخت جان ہوتے ہیں ------ اور پھر میرا ذہن فلسفیانہ قلا بازیاں لگانے ہی کو تھا ----- ایسے موقع پر دروازے پر کھٹ کھٹ کی آواز سن کر دل آزردہ سا ہو گیا۔ نظر اٹھا کر دیکھا دراڑ میں سے میرے چچیرے بھائی منجیت کا گول مول چہرہ دکھائی دیا۔ مقامی اسکول میں پڑھتا تھا۔ چھٹی کے بعد انگریزی پڑھنے کے لئے میرے پاس چلا آتا تھا۔

منجیت کے ساتھ ایک اور چھوکرا کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "بابو گوکل داس کی منی مر گئی" ۔ وہ انکے مکان تلے آلو گوبھی کے پکوڑے بیچا کرتا تھا۔

یہ بات سن کر مجھے بے حد تعجب ہوا بلکہ مجھے یقین ہی نہیں آیا۔ کیونکہ اسی روز میں بابو گوکل داس کو دو مرتبہ مل چکا تھا۔ مجھ سے تو انہوں نے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا تھا ---- کم از کم وہ یہ تو کہتے کہ بچی بیمار ہے۔ "مر گئی؟" --- کونسی، منی؟"

یہ میری بہت ہی بری عادت ہے کہ میں اپنے دوستوں کے بھائیوں، بہنوں اور بچوں کی تعداد سے ہمیشہ لاعلم ہی رہتا ہوں۔ کئی ایسے ملنے والے بھی ہیں۔ جو مجھے اپنا اچھا خاصہ دوست سمجھتے ہیں۔ لیکن میں ان کے نام تک سے واقف نہیں میرے دوست بابو گوکل داس کے کئی بچے تھے۔ لیکن میں ان کی تعداد سے واقف نہیں تھا۔ میں عموماً ان کے گھر جاتا رہتا تھا۔ کبھی کسی تاریک گوشے میں سے الجھے ہوئے بالوں والی کوئی چھوٹی سی بچی شرماتی ہوئی نکل آتی۔ میں پوچھتا "بابو گوکل

داس! یہ بچی کون ہے؟"

"آپ نہیں جانتے؟ ۔۔۔۔ یہ ہے میری لڑکی سرلا ۔۔۔"

مجھے شرمندہ ہونا پڑتا تھا۔ واقعی کس قدر بری بات تھی۔ لیکن مجھے ہمیشہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ ہر تیسرے روز ایک نئی صورت دکھائی دیتی ہے۔ جسے گوکل داس اپنی بچی بتاتے ہیں۔

پکوڑے بیچنے والے لڑکے نے مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ "جی ان کی سب سے چھوٹی منی ۔۔۔۔ گود والی منی۔"

یہ سن کر مجھے بہت افسوس ہوا۔ ان دنوں گوکل داس ہی میرے سب سے عزیز اور ہمدرد دوست تھے۔ وہ دنیا کے کئی اور جھگڑوں میں پھنسے ہوئے تھے ۔۔۔۔۔ ایسے موقع پر منی کی وفات کس قدر دکھ کی بات تھی۔ میں حیران بھی تھا کہ ہمارا رات دن کا اٹھنا بیٹھنا تھا اور انہوں نے بچی کی علالت کا ذکر تک نہ کیا۔ اس خبر سے ایک ہی گھنٹہ پہلے جب میں بازار سے آ رہا تھا تو چوک میں ان کے چھوٹے بھائی نے دکان سے اتر کر کہا کہ اگر آپ گھر جا رہے ہوں تو بھائی صاحب کو دکان پر بھیج دیں۔ چنانچہ میں نے یہ پیغام بابو گوکل داس تک پہنچا دیا تھا۔ اس وقت بھی انہوں نے بچی کے بارے میں کچھ نہ کہا۔ پھر میں نے سوچا کہ شاید کوئی حادثہ پیش آیا ہو۔ میں نے لڑکے سے دریافت کیا تو اس نے جواب دیا۔ "وہ بیمار تھی جی"۔

تعجب۔

اچھا جی نمستے۔ میں جاتا ہوں بابو جی نے کہا تھا کہ میں آپ کو اس بات کی خبر کر دوں۔" وہ چلا گیا۔

کھڑکی میں سے ابر آلود آسمان دکھائی دے رہا تھا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ نیچے بازار میں سے خوانچے والوں کی صدائیں آ رہی تھیں۔

ہم دونوں چپ تھے۔

پھر میں کپڑے پہننے لگا۔ جب پہن چکا تو میں نے من جیت سے کہا۔ تم بیٹھو، میں ابھی آیا"

سیڑھیاں اترنے کے بعد میں بارش سے بچتا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا پچھواڑے کی گلی میں پہنچا۔

بابو گوکل داس کرائے کے مکان میں رہتے تھے۔ ان کا مکان دراصل ایک ہی کمرے پر مشتمل تھا۔ کمرے کے ساتھ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی جس میں ان کا سامان رکھا تھا۔ چھوٹی کوٹھڑی میں تو خیر سارا دن تاریکی چھائی رہتی تھی۔ البتہ بڑے کمرے میں اگرچہ دھوپ کا گزر نہیں تھا۔ لیکن روشنی داخل ہو سکتی تھی۔ بڑے کمرے کے دروازے کے قریب چھوٹا سا باورچی خانہ تھا

اس وقت باورچی خانے کے اندر بہت سی عورتیں بیٹھی تھیں ۔ باہر جوتے بکھرے ہوئے تھے ۔ جب میں بڑے کمرے میں داخل ہوا تو اور بھی چند لوگ جمع تھے ۔ فرش پر دری بچھی تھی ۔ سامنے بابو گوکل داس نواڑی پلنگ سے ٹیک لگائے فرش پر بیٹھے تھے ۔ ان کے قریب ان کی بیوی پیٹھ موڑے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھیں ۔ بیوی کے نزدیک ان کی اماں بازوؤں میں منہ چھپائے بیٹھی تھیں ۔ ادھر ادھر ان کے چند رشتہ دار اور دوست دکھائی دے رہے تھے ۔

میں نے بیٹھتے ہی پوچھا ۔ "آخر یہ واقعہ کیونکر پیش آیا ۔ مجھے تو بچی کی بیماری تک کی خبر نہیں ملی" ۔

انہوں نے سرد آہ بھر کر جواب دیا ۔ "منی ہفتہ بھر سے کچھ بیمار تھی ۔ بچے بیمار ہو ہی جاتے ہیں ۔ اس لئے میں نے ذکر نہیں کیا ۔ اور کوئی خاص بیماری بھی نہیں تھی ۔ اس کا منہ پھول گیا تھا ۔ میں اسے پرسوں ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا ۔ دوا دارو کر ہی رہے تھے ۔ بلکہ آج صبح ہم اسے بارلکس پلاتے رہے ۔۔۔۔ ڈیڑھ گھنٹہ پہلے جب آپ مجھے بلانے کے لئے آئے تھے ۔ اس وقت وہ آرام سے سو رہی تھی ۔ آپ کا پیغام سنکر میں دکان تک گیا واپس لوٹا تو رستے میں چھو کرا ملا کہنے لگا منی بولتی نہیں ۔۔۔۔ نہ سانس لیتی ہے یہ سنکر میں بھاگا بھاگا گھر آیا ۔ دیکھا تو ۔۔۔۔"

انہوں نے یہ باتیں رقت انگیز لہجہ میں رک رک کر بیان کیں ۔

جونہی محلے والوں کو اس موت کی خبر ملی ۔ وہ اوپر تلے آنے شروع ہو گئے ۔

ہر نووارد بچی کی غیر متوقع موت پر اظہار تعجب کرتا ۔ اور جواب میں بابو گوکل داس کو وہی بات دہرانی پڑتی ۔ "جی منی ہفتہ بھر سے بیمار تھی ۔ اور کوئی خاص بیماری بھی نہ تھی ۔۔۔۔۔"

موت کے بعد عموماً مرحوم کے خصائل وغیرہ چھیڑ کر افسوس کا اظہار کیا جاتا ہے ۔ لیکن منی بہت ہی چھوٹی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گئی تھی ۔ بہت کم لوگوں نے اس کی صورت دیکھی تھی ۔ دوسروں کا تو ذکر ہی کیا ۔ خود مجھے ننھی کی صورت یاد نہیں تھی ۔ اس لئے اس موقع پر سوائے اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ سب لوگ خاموش رہ کر سوگ منائیں ۔ لیکن اتنے انسانوں کی مکمل خاموشی غیر شعوری طور پر ہر ایک کے لئے پریشان کن تھی ۔

کچھ دیر بعد حکم چند آگئے ۔ یہ بھی بابو گوکل داس کے خاص دوستوں میں سے تھے ۔ حکم چند دنیا کا سرد و گرم دیکھے ہوئے تھے ۔ ان کے چہرے کے گہرے خطوط اور مجموعی تاثر سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا تھا ۔۔۔۔ وہ سر پر کلاہ والی طرہ دار پگڑی باندھتے تھے ۔ ان کی مونچھیں ایسی تھیں جیسے دانت صاف کرنے کا برش ۔ مضبوط جبڑا منہ کے دہانے کی بناوٹ سے ان کی قوت ارادی کا پتہ چلتا تھا ۔ چنانچہ جب وہ آئے تو باوجود یہ کہ ان کا چہرہ دوسروں کی بہ نسبت کم افسردہ نہ تھا ۔ انہوں نے ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد فوراً عملی پہلو کی طرف دھیان دیا ۔۔۔۔ طے

پایا کہ تانگوں کا انتظام کیا جائے۔ اور ہی کو لے جا کر دریا برد کر دیا جائے۔
بابو صاحب کے بڑے بھائی صاحب بھی وہاں بیٹھے تھے۔ انہوں نے دکان کے ملازم نتھو رام کو بلایا اور اسے ہدایت کی کہ وہ قصابوں کے محلے کی نکڑ سے ایک مٹکا خرید کر دریا پر پہنچ جائے۔

نتھو رام کچھ ایسا ذہین بھی نہیں تھا۔ اس لئے یہ بات سمجھنے میں اسے اچھی خاصی دقت پیش آئی۔ کئی ایک سوالات کر ڈالے۔ بالآخر جب بات سمجھ میں آگئی تو پیسے لے کر رخصت ہوا۔
اب لوگ اٹھنے کے لئے پر تول رہے تھے۔ بابو گوکل داس کسی کام سے نیچے چلے گئے تھے گلی میں کسی شخص کے سوال کے جواب میں کہہ رہے تھے۔ "جی منی ہفتہ بھر سے بیمار تھی۔ اور کوئی خاص بیماری بھی نہیں تھی۔ اس کا منہ بہت زیادہ پھول گیا تھا۔۔۔۔۔۔" ان کے لہجے میں تاثر کی وہ شدت نہ رہی تھی۔۔۔۔۔۔ شاید بار بار وہی بات دہرا کر آخر میں ان الفاظ کے درد اور کسک میں کمی پیدا ہو گئی تھی۔

جب لوگ اٹھنے لگے تو میں لپک ہی چلا آیا تاکہ مخیت کو رخصت کر کے اپنا کمرا مقفل کر دوں۔

جب تالہ لگانے لگا تو مخیت نے اداس نظروں سے میری طرف دیکھا۔۔۔۔۔ "آج ہم لوگ سینما دیکھنے کے لئے جانے والے تھے۔۔۔۔ کل آپ نے کہا تھا۔۔۔۔۔"
اس کے خشک ہونٹوں میں سے اس کے سفید سفید دانت دکھائی دیئے۔ اس نے جھجکتے ہوئے یہ الفاظ کہے جیسے وہ اس بات سے بخوبی واقف ہو کہ اس بے محل گفتگو کی دراصل کوئی ضرورت نہ تھی۔

جب میں نیچے آیا تو معلوم ہوا کہ وہ لوگ چلے گئے ہیں۔ پکوڑے بیچنے والے چھوکرے نے کہا کہ وہ چوک سے آگے نہ گئے ہوں گے۔ میں بھاگم بھاگ چوک میں پہنچا۔ لیکن وہاں ان میں سے کوئی بھی نہ دکھائی دیا۔ میں سٹ پٹا کر رہ گیا۔
پچھلے برس بابو گوکل داس کے بچے کے مونڈن پر بھی میں نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس بات کی انہوں نے بہت سخت شکایت کی تھی۔ لیکن خیر وہ خوشی کا موقعہ تھا۔ اس مرتبہ میرا وہاں پہنچنا بہت لازمی تھا۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ میں سائیکل پر بھی جا سکتا ہوں۔ حالانکہ میری سائیکل بھی بہت بری حالت میں تھی۔ میل بھر جانے میں دو تین مرتبہ تو اس کی چین ہی اتر جاتی تھی۔ اب اس کے سوائے چارہ بھی کیا تھا۔ چنانچہ سائیکل اٹھائی اور چل دیا۔
بارش بند ہو چکی تھی۔ بادل چھائے ہوئے تھے۔ سردی کی شدت میں اضافہ ہو گیا تھا۔ سائیکل کی چین حسب توقع تین چار مرتبہ اتری میرے دل میں ایک ہی لگن تھی کہ کسی نہ کسی

طرح وقت پر پہنچ جاؤں، اگر کہیں دیر ہو گئی تو مفت میں ان سے شرمسار ہونا پڑے گا۔۔۔۔۔
میرے ذہن میں اس قسم کے خیالات کا ہجوم تھا کہ سامنے تانگے میں بابو حکم چند کی پگڑی کا لہراتا ہوا شملہ دکھائی دیا۔ میری جان میں جان آئی۔ ان کے ساتھ ایک اور بابو صاحب بھی بیٹھے تھے۔
جب قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ گوکل داس جی کو واپس گھر بھیج دیا گیا تھا۔ اور گنتی کے چند لوگ آگے نکل گئے تھے۔

عام طور پر شہر سے باہر نکلنے کا بہت کم اتفاق ہوتا تھا۔ نہ جانے کتنے عرصے کے بعد شہر سے باہر گیا تھا۔ وہ جگہ نئی نئی سی دکھائی دینے لگی۔

پکی سڑک چھوڑ کر ہم کچی سڑک پر ہولئے۔ آگے دریا تھا۔ گیلی ریت ارد گرد دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ایک بہت بڑے چوبی پھاٹک میں سے گذرنے کے بعد دریا کا پانی دکھائی دینے لگا۔ پانی اترا ہوا تھا۔ اس لئے ہم لوگ اس جگہ پہنچے جہاں پانی کافی گہرا تھا تاکہ مٹکا ڈبویا جا سکے پرلے کنارے پر پرانے زمانے کی کوئی ٹوٹی پھوٹی عمارت نظر آ رہی تھی۔ اس کے قریب سے اونچے اونچے کانٹے دار درختوں کا ایک سلسلہ دور تک چلا گیا تھا۔ اگر چہ اس وقت ہوا بڑے زور کے ساتھ چل رہی تھی۔ لیکن وہ درخت بالکل ساکن اور جامد کھڑے تھے۔ نہ وہ ہوا سے متاثر آتے تھے نہ سردی سے۔

ہمارے قریب ریت پر سرکنڈوں کو کھڑا کر کے ایک اوٹ سی بنالی گئی۔ اوٹ کے قریب ایک چارپائی پڑی تھی۔ اور اس پر بیٹھے ہوئے دو تین مسلمان ۔۔۔۔ غالباً ملاح خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان کے پاؤں کے قریب زمین پر لکڑی کے چند چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اوپر تلے دھرے تھے۔ ان میں سے آگ کے شعلے لپک لپک کر نکلتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے۔ جب کبھی ہوا کا کوئی نہایت تیز جھونکا آتا تو آگ غرا کر بھڑک اٹھتی اور وہ جٹادھاری سادھو جو نیچے بیٹھا آگ تاپ رہا تھا اچک کر پیچھے ہٹ جاتا۔

ابھی تک نتھو رام مٹکا لے کر وہاں نہ پہنچا تھا۔ حکم چند اور میں باتیں کرتے ہوئے ذرا پرلے چلے گئے۔ وہ کہنے لگے۔ اب تو مٹکے کا رواج بھی نہیں رہا۔۔۔۔۔ آپ مجھے تا سولہ برس سے اس شہر میں ہوں۔۔۔۔۔۔ چھوٹے بچوں کو بڑی سی ہانڈی میں رکھ کر ڈبو دیا جاتا ہے۔
ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی تھیں کہ دور سے نتھو رام مٹکا کندھے پر دھرے آتا دکھائی دیا

مٹکا پہنچ جانے پر پھر ہنگامہ شروع ہوا۔ بابو گوکل داس کے بڑے بھائی نے سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی بچی کو اٹھایا۔ حکم چند نے رائے دی کہ بچی کو دریا میں ایک غوطہ دے کر مٹکے میں رکھا جائے۔ جب اسے غوطہ دیا گیا تو کپڑا گیلا ہو کر اس کے بدن سے چپک گیا اور منی گوشت کا ایک لوتھڑا دکھائی دینے لگی۔ اسے مٹکے میں ڈال دیا گیا اور آخر میں چاولوں کی کھیلیں مٹھیاں بھر بھر کر

مٹکے میں بکھیر دی گئیں۔

اس سرد اور بوجھل شام کو جب تھیرا پنی کا مٹکا کشتی پر رکھ کر گہرے پانی کی طرف چلا تو میرا دل موت کے خیال سے مغموم ہو گیا۔

ہم دور کھڑے کھڑے کارروائی دیکھتے رہے۔ مٹکا بہت بھاری ہو گیا تھا۔ ان لوگوں نے بڑی مشکل سے اسے سرکا کر پانی میں ڈالا۔ مٹکے کے منہ پر ایک موٹا سا کپڑا بندھا تھا۔ اس لئے پانی ------- اندر داخل نہ ہو سکا۔ چنانچہ کپڑا پھاڑ دیا گیا۔ اور جب مٹکے میں پانی بھر گیا تو وہ آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا۔ یہاں تک کہ نظروں سے اوجھل ہو گیا اور چند بلبلے پانی کی سطح پر تیرتے رہ گئے۔

جب وہاں سے واپس لوٹے تو ایک رجسٹر پر مرحوم بچی کا نام درج کیا گیا۔ اور پھر سب لوگ جلدی جلدی تانگوں پر بیٹھ کر گھر کو چل دئے۔

حکم چند اور میں آخری تانگے پر سوار ہو گئے۔ میری سائیکل خراب تھی۔ اس لئے تانگے پر بیٹھ گیا۔ حکم چند میرا سائیکل تھامے پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے اور ---- وزن برابر رکھنے کے لئے میں اگلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گھوڑا نیا تھا پہلے تو اس نے کچھ ہٹ کی اور پھر چل کھڑا ہوا۔

جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو پھر بوندا باندی ہونے لگی۔ ہمارے تانگے پر چھت نہیں تھی۔ بابو حکم چند کے پاس چھتری تھی۔ وہ تان لی گئی۔

ہم دونوں خاموش تھے۔ ایسے موقعوں پر سوائے خاموشی کے اور کچھ نہیں سوجھتا۔ شہر کی گہما گہمی سے دور وہ جگہ کچھ تو ویسے ہی سنسان تھی اور کچھ ہمارے دل بوجھل ہو رہے تھے۔ میں نے بات چھیڑنے کی غرض سے کہا۔ "بابو حکم چندجی! آج تو غضب ہی ہو گیا۔ بچی کی موت اس قدر خلاف توقع تھی۔ میں نے جب یہ خبر سنی تو دل کو یقین ہی نہ آیا ------"

حکم چند اپنی ٹوتھ برش کی مانند سخت مونچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ "بالکل یہی قصہ میرے ساتھ پیش آیا۔ آج میں بابو گوکل داس کے لئے ایک مکان کا پتہ لگانے کے لئے گیا تھا۔ جب واپس آیا تو نوکر نے یہ خبر سنائی اور میں دم بخود رہ گیا۔"

مکانوں کا ذکر چھڑا تو میں نے کہا۔ "آج کل مکانوں کی بھی بہت سخت قلت ہے"

"جی ہاں ------ اور پھر آپ سمجھئے کہ بعض موقعوں پر اگر مکان نہ ملے تو بڑی دقت پیش آتی ہے۔ آپ ہی کہئے بھلا بابو گوکل کا اس مکان میں گزارا کیونکر ہو سکے گا۔ ان کو تو بہر حال بڑا مکان ملنا ہی چاہیئے"۔

میں ان کی بات نہ سمجھ پایا ------- نظر اٹھا کر ان کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ انہوں نے میری لاعلمی بھانپ کر سرگوشی میں کہا۔ "بابو گوکل داس کے گھر میں ---- امید سے ہیں نا! ------ بس ایک ڈیڑھ ماہ ہی کی بات تو ہے۔"

یہ کہہ کر ان کے لبوں پر امید و مسرت کی ایک موہوم سی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

(مشمولہ: سنہرا دیس)

بلونت سنگھ

بابو مانک لعل جی

مانک لعل عرصہ سات سال سے لکشمی کیمیکل ورکس میں بحیثیت کلرک ملازم تھا۔
وہ موٹا اور بے ڈول سا شخص تھا۔ اس کا جسم پلپلا، رنگ مٹیالا، آنکھیں زیادہ لکھنے پڑھنے کی وجہ سے چندھیائی ہوئی، کمر قدرے جھکی ہوئی۔ اور چھوٹی چھوٹی موچھیں نیچے کی طرف گھوم کر اس کی باچھوں میں گھسی ہوئی تھیں۔ خشخاشی بالوں والے سر پر گاندھی ٹوپی، آنکھوں پر موٹے موٹے شیشوں والا چشمہ، گاڑھے کا کرتا ململ کی دھوتی، اور پاؤں میں عموماً سیاہ رنگ کا پمپ شو پہنتا تھا۔ گھر سے باہر نکلتا تو اس کے ہاتھ میں لکڑی کے دستے والی چھتری ضرور ہوتی۔ وہ ناک کی سیدھ میں گردن آگے کو بڑھائے لپکتا ہوا چلتا تھا۔ اس کتے کی طرح جو کسی جانور کی بو پاکر سیدھا اس کی کمین گاہ کی طرف بڑھتا چلا جائے۔

سورج نکلتے ہی وہ صدر بازار کی طرف چل کھڑا ہوتا۔ اور پہر رات ہو جانے پر لوٹتا تھا۔ جس رفتار اور انداز میں وہ جاتا اسی طرح واپس چلا آتا۔

دکان میں اس کے علاوہ سات ملازم اور تھے۔ ایک اکاونٹنٹ، باقی چھ ملازم ادھر ادھر کے کاموں کے لئے۔

بڑے لالہ اپنی میز کے قریب کرسی بچھائے پان چبایا کرتے۔ ان کا سر خوب بڑا آنکھیں روشن، کنپٹیاں چکنی، نتھنے پھولے ہوئے، موچھیں الہ دین کے چراغ کے جن کی طرح خوب بڑی بڑی اور پھیلی ہوئی۔ ان کی گدی کے نیچے گوشت پر تین چار بل پڑے رہتے تھے۔ وہ کرسی پر پاؤں سمیٹے اس طرح بیٹھتے تھے جیسے چارپائی پر بیٹھے ہوں۔ خوب گرجدار آواز میں بولتے اور نت نئی گالیاں سناتے۔

ان کے قریب چھوٹی میز پر اکاونٹنٹ بڑی تمکنت اور خاموشی سے بیٹھا کام میں مصروف رہتا۔ لالہ اس سے کسی قسم کی باز پرس نہ کرتے تھے۔ شاید اس کا کام ہی کچھ ایسا تھا کہ کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔

باقی نوکر ادھر ادھر کے کاموں میں لگے رہتے۔ کوئی بوتلوں پر کارک لگا رہا ہے کوئی لیبل چپکا رہا ہے۔ کوئی پٹیاں بند کر رہا ہے۔ کوئی دوائیاں گھوٹ رہا ہے۔ کوئی گولیاں بنانے والی مشین کا دستہ گھما رہا ہے۔

ان سب میں مانک لعل ہی کی زیادہ شامت آتی تھی۔ مانک لعل بڑے لالہ کی عین سیدھ میں دکان کے پرلے کونے میں تخت پوش پر آلتی پالتی مارے بیٹھا رہتا تھا۔ اس کے سامنے تخت

پوش پر ایک چھوٹی سی ڈسک دھری ہوتی۔ ڈسک پر کاغذات کا انبار اور ادھر ادھر بکھرے ہوئے بہی کھاتے۔

بڑے لالہ کو اگر کوئی بات بھی دریافت کرنی ہوتی۔ تو مانک لعل ہی کو للکارتے۔

"کیوں بے منکے! وہ بلٹی واپس کیوں آئی؟ ---- کوہاٹ کو تین وی۔پی روانہ کردیئے ----- میں جو ڈھائی اِنچ کیلوں کا بکس لایا تھا وہ کیا ہوا؟ ------ ابے میری کھڑاؤں کدھر ہیں؟ ------ تو مہر والوں کے ہاں گیا تھا؟ ------- ٹھیلے والوں کو تاکید کردی تھی" ۔ غرض دنیا بھر کی کوئی بات ایسی نہ تھی۔ جس کی جواب طلبی مانک لعل سے نہ کی جاتی۔ شاید لالہ، مانک لعل کو انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سمجھتے تھے۔ کہ دنیا بھر کی جو بات چاہو دریافت کرلو۔ اور پھر ستم ظریفی یہ تھی کہ لالہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مانک لعل کے پاس ہر بات کا معقول جواب ہونا چاہیئے۔

مانک لعل سب سے پہلے دکان پر پہنچتا۔ اس وقت نوکر جھاڑو دے رہا ہوتا۔ وہ صفائی سے فارغ ہوتا تو مانک لعل اپنی ڈسک کے قریب بیٹھے بیٹھے سوچتا کہ گرد اڑ کر لالہ کی میز پر جا پڑی ہے۔ نوکر کس قدر بے وقوف ہے۔ اسے اتنی تمیز نہیں کہ فرش پر جھاڑو دینے کے بعد کم از کم بڑے لالہ جی کی میز ہی صاف کردیا کرے چنانچہ یہ سوچ کر وہ ڈرتے ڈرتے بڑے لالہ کی میز کے قریب جاتا اور دیکھتا کہ واقعی میز کی ہر چیز پر گرد کی باریک سی تہ جم گئی ہے۔ وہ دزدیدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتا جیسے وہ چوری کرنے جارہا ہو۔ پھر جھاڑن لیکر بڑی احتیاط سے میز کی ہر شئے صاف کردیتا۔

رفتہ رفتہ دکان میں چہل پہل بڑھ جاتی۔ باقی نوکر بھی پہنچ جاتے۔ دس بجے کے قریب لالہ بھینسے کی طرح گردن ہلاتے ہوئے آتے۔ اکاؤنٹنٹ ان کے ہمراہ ہوتا۔ لالہ اکاؤنٹنٹ کے ساتھ بڑی کھل مل کر باتیں کرتے تھے۔ اہم کاموں میں اسی کا مشورہ طلب کرتے۔ ویسے عام گفتگو میں ابھی اسے تم یا تو کہہ کر مخاطب نہ کرتے تھے۔ آتے ہی بڑے لالہ پہلے تو دکان کے اندر والے کمروں کا مختصر سا چکر لگاتے۔ پھر نوکروں کو مختلف ہدایتیں دینے کے بعد واپس اپنی کرسی پر آبیٹھے۔

انگوچھے سے گردن اور پیشانی پونچھتے ہوئے وہ میز پر پڑی ہوئی چیزوں کا جائزہ لیتے۔ یکایک انہیں کل کی ڈاک کا خیال آجاتا۔ جو اکثر وہ گھری پر بھول آتے تھے۔ لیکن سمجھتے یہ کہ وہ خطوط میز پر پڑے تھے۔ وہ للکار کر کہتے "منکے"

مانک لعل دسویں پاس کرنے کے فوراً ہی بعد بڑی سفارش سے لالہ کے ہاں ملازم ہوا تھا اس وقت سے اب تک لالہ اسے "منکا" کہہ کر ہی پکارتے تھے۔ مانک لعل اپنی ڈسک پر جھکا ہوا کام میں مصروف ہوتا تھا۔ لالہ کی آواز سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ کر کھڑا ہوتا۔ "جی! لالہ جی! جی ••••••"

بڑے لالہ بڑا سا منہ پھیلا کر کہتے "کیوں بے! آج صبح میری میز کس نے صاف کی تھی؟"

وہ ہکلا کر کہتا۔ "لالہ جی! جی لالہ جی!"

لالہ جی اس پر کڑی نظریں گاڑ کر کہتے "ابے جی لالہ جی" کے بچے! میری میز کو کس نے چھوا تھا۔"

جی لالہ جی ۔۔۔۔۔۔ میں نے ذرا گرد جھاڑی تھی۔"

"میں پہلے ہی جانتا تھا۔ تو نہ گرد جھاڑے گا تو اور کون جھاڑے گا؟۔۔ابے گرد جھاڑی یا سب چیزیں ہی جھاڑ ڈالیں؟"

مانک لعل کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ لالہ حلق سے آواز نکال کر کہتے "ابے گدھے! تجھ سے کس نے کہا تھا کہ میری میز کی گرد جھاڑا کر۔"

اس طرح مانک لعل کو سیوا کا میوہ ملتا۔ اس کے سپرد ایک قسم کا کام بھی تو نہ تھا۔ بلکہ اس سے دنیا بھر کے کام لئے جاتے تھے لالہ کہتے "منگے! ابے ٹھیلے والوں کو کیا ہو گیا؟ پیٹیاں پڑی سڑتی ہیں۔"

مانک لعل کے ہاتھ اٹھ کر جڑ جاتے۔ "جی لالہ جی ۔۔۔۔ میں ۔۔۔۔۔ میں۔"

"ابے میں میں کیا کرتا ہے۔ جا پتہ لگا جا کر ۔۔۔ میں میں ۔۔۔ میں میں۔"

مانک لعل اسی وقت شو پہن کر ہاتھ میں چھتری لیتا اور گردن آگے بڑھائے ٹھیلے والوں کی طرف روانہ ہو جاتا۔ جب وہ ٹھیلے والوں کے قریب پہنچتا تو دور ہی سے ہی اس کے پاؤں لڑکھڑانے لگتے۔

ٹھیلے والے سب کے سب مسلمان تھے۔ وہ لوگ بہت مضبوط اور اکھڑ تھے۔ سر استروں سے منڈوائے ہوئے میلے تہبند باندھے ایک دوسرے کی رانوں پر ہاتھ مار مار کر ہنستے۔ ان کے منہ کے دہانے خونخوار درندوں سے مشابہہ تھے۔ مانک لعل ان کے ہاں جانے سے بہت کتراتا تھا۔ وہ عموماً ان کے اڈے سے ادھر ہی پٹواری کی دکان پر رک جاتا۔ پسینہ پونچھتا۔ اپنے جوتوں پر سے گرد جھاڑتا۔ پان کی گلوری کلے میں دبا کر بتیسی نکالتے ہوئے پٹواری سے پوچھتا۔ "کہو بھائی! کوئی دنگہ فساد تو نہیں ہوا نا! ۔۔۔۔ بھئی یہ ٹھیلے والے تم جانتے ہی ہو ۔۔۔"

جب پٹواری سے اسے تسلی بخش جواب ملتا تو وہ ایک لمبی اور گہری سانس لیتا اور سپاری کے پانچ سات ٹکڑے ۔۔۔۔۔ چباتے ہوئے آگے روانہ ہو جاتا۔ جب ٹھیلے والوں کی وحشی صورتیں دکھائی دیتیں تو دور ہی سے قدم لڑکھڑانے لگتے۔ چھتری کے پیچھے چھپا ہوا اس انداز سے آگے بڑھتا جیسے خطرے کی بو پاتے ہی بگٹٹ بھاگ نکلے گا۔

لیکن وہ بچارا اس قدر بے ضرر طبعیت کا مالک تھا کہ کسی شخص کو اسے ایذا پہنچانے کا خیال تک نہ آسکتا تھا۔ جب وہ ٹھیلے والوں کے چودھری عبداللہ کو دیکھتا تو خوب کھکھیا کر ہنستا اور اپنی چندھی آنکھوں سے بڑے غور سے اس کی طرف دیکھتا کہ جواب میں وہ بھی ہنستا ہے یا نہیں ۔۔۔۔۔ عموماً چودھری اس سے بڑی اچھی طرح پیش آتا تھا۔ وہ بلند آواز میں پکار کر کہتا "آئیے بابو جی

۔۔۔۔ ارے بھائی بابو جی کے لئے کرسی لاؤ۔"

مانک لعل "بابو جی" کے الفاظ سن کر بہت خوش ہوتا۔ چھتری بند کرتے ہوئے بکری کی طرح ممیا کر کہتا۔ "ارے بھائی کرسی کی کیا ضرورت ہ میں یہیں بیٹھ جاؤنگا۔"

لیکن جب تک ایک بازو والی ٹوٹی پھوٹی کرسی نہ آجاتی وہ کھڑا رہتا۔

ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ کہتا۔ "اجی چودھری جی کہاں رہتے ہو۔ کبھی دکھائی نہیں دیتے۔"

اسکے بعد مانک لعل اصل مدعا بیان کرتا۔ تو ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ٹھیلے والے کہتے۔ "بابو تمہارے لالہ کا مجاج ٹھکانے نہیں رہا۔ جب جاؤ گالیاں بکنے لگتا ہے۔۔۔"

مانک لعل سہم جاتا۔ گھبرا کر ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ وہ سمجھتا تھا۔ کہ ان لوگوں سے یہ بھی بعید نہیں کہ چپکے سے چاقو نکال کر پیٹ میں بھونک دیں۔ جب وہ تصور میں اپنی لاش دیکھتا تو اس کا دل ڈوبنے لگتا۔

پھر وہ بڑے لالہ کی حمایت میں کچھ نہ کچھ کہتا۔ "لالہ دل کے برے نہیں۔ ہاں زبان پر قابو نہیں۔۔۔۔۔ اس کے بعد وہ نتھنے پھلا کر اپنی طرف اشارہ کر کے کہتا۔ "اور تو اور وہ مجھی کو سرد گرم کہنے سے نہیں چوکتے۔" اور پھر آنکھیں نکال کر سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہتا" ۔۔۔۔۔ میں بھی اکڑ جاتا ہوں بعض دفعے

" ٹھیلے والوں میں کوئی کھانس کر تھوکتے ہوئے کہتا۔ "بابو جی! بڑے لالہ کا مجاج تو ہم ایک ہی دن میں ٹھکانے لگا دیں! اجی بس تمہارے لحاج سے آنکھ نہیں اٹھتی۔"

اس پر مانک لعل ریشہ خطمی ہو جاتا۔

اگر کبھی دکان میں بیٹھے بیٹھے بڑے لالہ کو کوئی بات یاد آجاتی مثلاً آج بچے روٹی کھائے بغیر ہی اسکول چلے گئے ہیں تو وہ پھر مانک لعل کو آواز دیتے

"منکے۔"

ان کی آواز کے ساتھ ہی مانک لعل بدک جاتا۔ جس ہاتھ میں قلم ہوتا اس کی انگلیاں ڈھیلی پڑ جاتیں۔ فوراً اٹھ کر دھوتی سنبھالتا ہوا لالہ کے قریب جا کھڑا ہوتا۔۔۔۔۔ ادھر لالہ آواز دے کر بھول جاتے کہ انہوں نے ہی اسے بلایا تھا۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہو جاتے۔ اور مانک لعل ان کی میز کے قریب چپ چاپ کھڑا رہتا۔ کہ لالہ کام ختم کر کے خود ہی کچھ کہیں گے۔ چند لمحوں کے بعد لالہ سر اٹھاتے اور تعجب سے پوچھتے۔ "کہو کیسے کھڑے ہو۔"

مانک لعل دل کڑا کر کے کہتا۔ "جی لالہ جی۔ آپ ہی نے تو آواز دی تھی مجھے۔"

پیشتر اس کے کہ ان کے منہ سے کوئی مضرح گالی نکلے انہیں اصل بات یاد آجاتی۔ "ارے ہاں! کاشی اور میںنو روٹی کھائے بغیر ہی اسکول چلے گئے ہیں۔ تم گھر سے روٹی لے جاؤ اور انہیں کھلا

کر فوراً واپس آجاؤ۔"

مانک لعل حسب عادت لپک کر جاتا اور ان کے گھر کی کنڈی کھٹکھٹاتا۔ پہلے تو گھر کی نوکرانی کالی کلوٹی بارہ سالہ لڑکی آن صورت دکھاتی۔ مانک لعل کو دیکھ کر نہ معلوم اس کی باچھیں چر کیوں جاتیں۔ وہ اس چھوکری کے سامنے بڑی سنجیدگی اور وقار سے گفتگو کرتا اور اسے مرعوب کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتا۔ لیکن وہ مردود دیدے چمکائے ہی جاتی۔ کالے بھجنگ چہرے میں بے طرح پھٹے ہوئے منہ کے دہانے میں سپید سپید دانت دکھائی دیتے۔ ایک تو کمبخت بات ہی نا سمجھ پاتی۔ اور دوسرے اس کا دھیان بھی اور ہی کسی طرف ہوتا تھا۔ کبھی دروازہ پکڑ کر ادھر ادھر جھول رہی ہے۔ بڑی مشکل سے کہیں اندر جاکر اس کے آنے کی خبر دیتی پلپلے ٹماٹر کی سی لالائین دروازے کے قریب آن کھڑی ہوتی۔

مانک لعل زیادہ سے زیادہ لالائین کے پھولے ہوئے گورے گورے ہاتھ یا کہنیوں تک بازو ہی دیکھ پاتا۔ لالائین پوچھتی۔ "اجی روٹی لے جانے کیلئے آپ کو بھیجا ہے انہوں نے۔"

مانک لعل اس میں اپنی تضحیک کا پہلو سمجھ جاتا۔۔ اور کھانس کر کہتا۔ "آخ۰۰۰۰آخ ۰۰۰۰خ خود ہی چلا آیا۔ میں میں نے لالہ سے کہا۔ میں ہی بچوں کو روٹی دے آتا ہوں اور پھر انہیں دیکھ بھی آوں گا۔ دھوپ میں نہ کھیلتے ہوں۔ آج کل دھوپ تیز ہے موسم بھی اچھا نہیں۔

لالائین، کالی چھوکری کو آواز دے کر کہتی۔ "اری منیب جی کو مونڈھا لادے۔"

مانک لعل دھوپ ہی میں چھتری تان کر مونڈھے پر بیٹھ جاتا۔ "کبھی کبھی لالائین بڑے اصرار سے اپنی دانست میں میٹھے سوڈے کا ادھیا بھی پلا دیتیں۔ لیکن وہ بیشتر کھاری ہوتا۔ غالباً چھوکری دو پیسے میں سے ایک پیسہ بچاکر ایک پیسہ کا کھاری سوڈا لے آتی۔ یہی نہیں مانک لعل اپنے سے کم درجے کے نوکروں کی خوشنودی کا بھی خیال رکھتا تھا۔ نوکر اس کی ذرہ بھر بھی عزت نہ کرتے تھے۔ کبھی لالہ چلاکر کہتے۔ "ابے حرامزادو! ابھی تک پیٹی میں کیل بھی نہیں جڑے۔"

اور سب تو کان دبا کر ادھر ادھر سرک جاتے۔ البتہ مانک لعل جھٹ اٹھکر پیٹیوں میں کیل جڑنے لگتا۔ اور جس وقت وہ بچارا کیل جڑ رہا ہوتا تو دبی دبی نظروں سے دوسرے نوکروں کی طرف بھی دیکھے جاتا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں التجا کرتا کہ وہ لوگ بھی اس کی مدد کریں۔ لیکن وہ سب ایسے منہ پھیر لیتے جیسے کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔ پھر اگر لالہ کی اس پر نظر پڑ جاتی تو اپنی گرجدار آواز میں کہتے۔ "منک! کیل جڑ رہے ہو کیا؟"

وہ مسکین آواز میں جواب دیتا۔ "جی لالہ جی"

پھر وہ تھوڑی دیر تک منتظر رہتا کہ شاید لالہ دوسرے نوکروں پر خفا ہوں کہ وہ اسکی مدد کیوں نہیں کرتے۔ لیکن لالہ بس اتنی سی بات پوچھ کر اپنے کام میں منہمک ہو جاتے۔

لیکن جب کبھی نوکروں کا اپنا کام آن پڑتا تو وہ ذرا سا خوشامدانہ لہجہ اختیار کر لیتے۔ ادھر

مانک لعل فوراً ہتھیار ڈال دیتا۔ اپنے فرصت کے گھنٹے انہی کاموں میں صرف کر دیتا کسی کی انجن مار کہ گھڑی مرمت طلب ہے۔ کسی کو نیا جوتا لے کر دینا ہے۔ کسی کی دھوتی پھٹ گئی ہے۔
تہوار کا دن ہوتا تو سب ملازم مانک لعل کو آگھیرتے۔ مشورہ کرتے کہ دوسرے دن کی چھٹی منائی جائے۔ دوسری دکانوں پر بھی کام بند رہے گا۔ بڑا شاندار میلہ لگے گا۔ وہاں عورتیں خوب بن ٹھن کر آئیں گی۔ خوب مزے سے گذرے گی۔
اب سب میں خوب کھچڑی پکتی۔ مانک لعل کی تھوڑی بہت خوشامد کی جاتی۔
"اجی بابوجی! ۔۔۔ لالہ آپ کا کہنا کہاں موڑیں گے۔ ہماری طرف سے کہدو ناکہ ڈولی مولی کا میلہ ہے اور دکانیں بند رہیں گی۔ آپ بھی چھٹی کر دیجئیے نا!"
ادھر نوکروں کے خوشامدانہ کلمے۔ ادھر بڑے لالہ کا خوف۔۔ مانک لعل عجب مخمصے میں گرفتار ہو جاتا۔ بالآخر وہ کہتا۔ "بھئی دیکھو اصل طریقہ یہ ہے کہ ایک عرضی اس مطلب کے لئے لکھ دی جائے۔ اس پر سب لوگ دستخط کریں گے۔ اور میں وہ عرضی لالہ جی کے سامنے پیش کر دوں گا۔"
چنانچہ عرضی لکھی جاتی ہے۔ سب لوگ دستخط کر دیتے ہیں یا انگوٹھے لگا دیتے۔ لیکن مانک لعل کبھی دستخط نہ کرتا۔ وہ ڈرتا تھا مباد بڑے لالہ سمجھیں کہ وہی سب نوکروں کو بہکاتا ہے۔
جب بڑے لالہ دوپہر کا کھانا کھا کر واپس آتے تو میز پر عرضی پڑی دیکھکر پکارتے۔ "منکے"

مانک لعل بھاگ کر ان کے قریب جاتا اور ہاتھ سہلاتے ہوئے نوکروں کا مطالبہ بیان کرتا۔ چنانچہ چھٹی منظور ہو جاتی۔
دوسرے روز سب لوگ تو مزے میں چھٹی مناتے۔ لیکن مانک لعل حسب معمول کپڑے پہنتا اور لالہ کے گھر پہنچ کر آواز دیتا۔
لالہ جی صحن میں بیٹھے بیٹھے پکارتے "منکے!"
مانک لعل باہر ہی زمین پر بچھا جاتا۔ "جی لالہ جی۔"
لالہ جی فوراً کالی چھوکری کے ہاتھ دکان کی چابیاں باہر بھیج دیتے۔ اور آواز دے کر کہتے۔
"جھاڑو واڑو لگا دو۔ میں بس ابھی آتا ہوں۔"
اس دن بجائے نوکر کے دکان میں مانک لعل ہی جھاڑو دیتا۔ پھر لالہ آتے۔
"بھئی ان پیٹیوں میں سارسپریلا کی شیشیاں بند کر دو۔" یا چٹھیوں کے انبار کی طرف دیکھ کر کہتے۔ "منکے یہ دوچار چٹھیاں پڑی ہیں۔ ان کے جواب ہی لکھ ڈالو۔" اسکے بعد وی۔ پی کرانے کے لئے ڈاکخانے بھیج دیتے۔ یہ کام ختم ہوتا تو بنک سے بلٹیاں لانے کے لئے روانہ کر دیتے اس ہیرا پھیری میں چار بجنے کو ہوتے۔ یعنی مکمل چھٹی سے تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ پہلے دفعتاً چونک کر

آواز دیتے۔ "بابو مانک لعل جی۔"

کبھی کبھی بڑے لالہ اسے مانک لعل جی کہہ کر بھی پکارتے تھے۔ مانک لعل کو ان کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ بڑے لالہ اس کو اس قدر احترام سے بلاتے تو وہ نہال ہو جاتا۔ اس کے دل کی ساری کدورت اور جسم کی تکان دور ہو جاتی۔ وہ ادھر ادھر جھانک کر دیکھتا کہ کسی اور نے بھی سنا ہے یا نہیں۔ چنانچہ ایسے موقعوں پر وہ خاص طور میٹھی آواز میں جواب دیتا "جی لالہ جی!"

یہ کہہ کر وہ لالہ جی کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ اس وقت اس کی ناک پر خون کی سرخی جھلکتی ہوتی۔ بڑے لالہ فراخدلی سے کہتے۔ "بھئی بابو مانک لعل جی! جاؤ تم بھی چھٹی مناؤ۔ ارے بھئی کام دام تو ہوتا ہی رہے گا۔ جاؤ موج کرو۔"

یوں تو مانک لعل میرے پڑوسی ہی تھے۔ لیکن ہمارے تعلقات استوار اس وقت ہوئے تھے۔ جب مجھے اپنی بچی کے لیے اوولٹین کی ضرورت پڑی۔ جنگ کی وجہ سے کہیں دستیاب نہ ہو سکی۔ تو میں نے مانک لعل سے کہا اور اس نے بڑے لالہ سے کہہ کر مجھے ایک ڈبہ دلوا دیا۔

اس کے بعد ہمارے تعلقات گہرے ہوتے گئے۔ عموماً وہ کسی شخص سے راہ رسم نہ رکھتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام رکھتا۔ البتہ مجھے اپنی بعض باتوں میں رازدان بنانے میں چنداں ہرج نہ سمجھتا تھا۔

اس کے گھر میں اس کی بیوی، دو بچے، بوڑھا باپ اور ایک بیوہ بہن تھی۔ باپ کی بینائی بہت کمزور تھی۔ بیٹھا رام نام جپتا اور ناریل کے دم لگاتا۔ بیوی غلیظ نتھنوں والی ایک باتونی عورت تھی۔ بچے چھچھوندروں کی طرح مارے مارے پھرتے۔ بہن کا کسی غیر مرد سے یارانہ تھا۔ وہ بڑی ہنسوڑ اور باذوق عورت تھی۔ شکل و صورت تو خیر غنیمت ہی تھی۔ البتہ ناز و ادا کی کمی نہ تھی۔ خوب چکنی چپڑی بنی ٹھنی رہتی۔ دن بھر مٹک مٹک کر ادھر ادھر گھوما کرتی۔ جب چلتی تو اس کی ایڑیاں زمین کو نہ چھوتی تھیں۔ اسے لذیذ کھانے پکانے میں بڑی مہارت تھی۔

مانک لعل بہن کے عشق سے ناواقف نہ تھا۔ لیکن کہہ کچھ نہ سکتا تھا۔ وہ سب سے ڈرتا تھا بیوی سے، باپ سے، بہن سے، بچوں سے غرض ہر ایک سے دب کر رہتا۔

جب وہ شام کے وقت تھکا ماندہ گھر واپس آتا تو جوتے اتار کر چارپائی پر بیٹھا پاؤں سہلایا کرتا۔ بچے ٹین بجاتے ہوئے باپ کی چارپائی کے چکر کاٹتے۔ جب نہا دھو کر وہ کھانا کھانے بیٹھتا تو اس کی بیوی اس کی بہن کی لگائی بجھائی کرتی۔ اور وہ ہوں ہاں کرتا ہوا جلدی جلدی کھانا ختم کر کے صحن میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹ جاتا۔

اس کی بہن اس کی برملا تعریف کرتی۔ کہتی "میرا بھیا تو ہیرا ہے ہیرا"۔ بھاوج ناک سکوڑ کر کہتی۔ "ہاں ہاں ہیرا نہ ہوتا تو اس طرح بغلیں بجاتی ہوئی محلہ بھر کا کونا کھدرا نہ سونگھتی پھرتی۔"

اس پر نند بگڑ جاتی ۔ وہ بھی بڑی لڑاکا تھی ۔ طعنہ زنی اور جلی کٹی سنانے میں وہ بھی بھاوج سے کم نہ تھی بلکہ دو جوتے آگے ہی تھی ۔ اس نے بھاوج کا جھوٹ موٹ کا عاشق گھڑ لیا تھا ۔ جب بھاوج اسے زیادہ دق کرتی تو وہ اسے اس کے فرضی عاشق کے طعنے دینے لگتی ۔

اس بات پر وہ جل بھن کر کباب ہو جاتی ۔ آخر اس دیدہ دلیری کی کوئی حد بھی تو ہونی چاہیئے ۔ جب نند کی زبان کتر کتر چلنے لگتی تو بھاوج سے کچھ جواب ہی نہ بن پڑتا ۔ یہاں تک کہ وہ رونے لگتی ۔ پیشانی پر ہاتھ مار کر کہتی ہائے میرے تو بھاگ ہی پھوٹ گئے ۔ جو اس کے پلے بندھی ۔ اس سے بہتر تھا ماں باپ نے افیون ہی کھلا دی ہوتی ۔

یقیناً یہ بڑی دکھ کی بات تھی کہ پتی برتا عورت پر غیر مرد سے راہ و رسم کا الزام لگایا جائے ۔ بھاوج میں ہزار عیب سہی لیکن تھی وہ پاکباز جب اس کا خاوند گھر آتا تو وہ رو رو کر اسے اپنا دکھڑا سناتی ۔ مانک لعل بے توجہی سے سنا کرتا ۔ لیکن نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات ۔ وہ اپنی بہن سے خوف کھاتا تھا ۔ بہن سے زیادہ اسے اس کے عاشق سے ڈر لگتا تھا ۔ اگر وہ آنکھوں میں کاجل لگائے گلے میں سونے کا تعویذ لٹکائے کہیں اینڈ اینڈ کر گھومتا ہوا نظر آ جائے تو بجائے اس کے کہ اس کی رگ حمیت پھڑکے وہ خود ہی نظر بچا کر ادھر ادھر کھسک جاتا ۔ ساتھ والی ویران باغیچی کے اس گوشے سے بھی وہ واقف تھا ۔ جہاں اس نے عاشق و معشوق کو بے تکلفی سے ہنسی مذاق کرتے دیکھا تھا ۔ لیکن وہ کان لپیٹ کر چپکے سے اس طرح گذر جاتا جیسے اس نے کچھ دیکھا ہی نہ ہو ۔

اسی پر بس نہ تھی بلکہ وہ اپنی بیوی کی نظر بچا کر بہن کو جیب خرچ کے لیے روپیہ بھی دے دیا کرتا تھا ۔ اگرچہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی بہن اپنے آشنا سے تعلق نہ رکھے ۔ لیکن وہ کچھ کہہ نہ سکتا تھا جیب خرچ دینے میں بھی یہی مصلحت تھی کہ اس کی بہن خوش رہے اور اپنے عاشق سے تعلق توڑ لے ۔

چاندنی راتوں کو میں اپنی چھت پر سے جھانک کر دیکھتا تو مانک لعل چارپائی پر لیٹا نظر آتا اس کا کدو کی طرح گول سر اور بالشت بھر کی ٹانگیں قینچی کی طرح پھیلی ہوئی دکھائی دیتیں ۔ وہ مجھے دیکھتے ہی باریک آواز میں چلا کر کہتا ۔ "کہیئے" ۔

وہ زیادہ باتیں نہ کرتا تھا ۔ کبھی کہتا ۔ "اجی کھڑادیں بڑی مہنگی ہو گئی ہیں" "یا" ارے صاحب کہیں سے تلسی جی کا پودا لا دیجئے نا! " ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر کہیں اس کی بیوی یہ بتانے کے لیے کہ ان کا پودا بالکل خشک ہو گیا ہے کچھ کہنے لگتی تو وہ اسے کم از کم اس بات پر سرزنش کرنے سے ہرگز نہ چوکتا ۔ " للے کی ماتا! تجھے میں نے اتی دفع منع کیا ہے کہ تو مردوں کی بیچ میں متی بولا کر " ۔

ایک مرتبہ میں صدر بازار سے گذر رہا تھا ۔ دو تین روز سے مانک لعل سے ملاقات نہیں ہوئی تھی ۔ سوچا چلو ملتا جاؤں ۔ دوکان پر پہنچا تو دیکھا مانک لعل حسب معمول اپنے ڈسک پر جھکا ہوا ہے ۔ چہرہ بھی کچھ اترا ہوا ہے ۔ مجھ سے بڑے تپاک سے ملا ۔ بیٹھنے کا اشارہ کیا ۔ اور جھکے جھکے

سرگوشی میں بولا۔ "آپ بیٹھے رہیئے۔ لالہ روٹی کھانے کے لیے جانے والے ہیں۔ پھر ہم باتیں کریں گے"۔

لالہ کے چلے جانے کے بعد اس نے کہا کہ اس ملازمت سے بیزار ہو چکا ہوں۔ جلد از جلد خلاصی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے تجویز پیش کی سول سپلائیز کے محکمے میں میرا کچھ رسوخ ہے۔ کیا تعجب اسے کوئی اچھی ملازمت مل جائے۔ وہ اس پر رضامند ہو گیا۔ میں نے مزید تسلی دی۔ اور جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو اس نے بار بار تاکید کی کہ میں اسی دن ملازمت کی بابت پتہ لگاؤں میں نے وعدہ کیا اور چلا آیا۔

لیکن اس دن میں اس قدر مصروف رہا کہ مانک لعل کا کام نہ کر سکا۔ سوچا دوسرے دن چلا جاوں گا۔ شام کے وقت بازار سے گذر رہا تھا۔ کہ مانک لعل ایک دوکان کے سامنے کھڑا نظر آیا۔ میں نے نظر بچا کر نکل جانا چاہا۔ لیکن اس نے مجھے دیکھ لیا۔ اور آواز دے کر بلا لیا۔ بڑا خوش و خرم نظر آ رہا تھا۔

چہک کر بولا "یہ ہمارے بڑے لالہ جی کے بچے ہیں۔ یہ کاشی اور یہ مینو۔ انہیں بنیائنیں خرید کر دے رہا ہوں"۔

بچے چیزیں خرید کر ہنستے کھیلتے ہوئے گھر کی جانب چل دیئے۔ ہم دونو باتیں کرتے رہے میں دل ہی دل میں ڈر رہا تھا۔ کہ کہیں ملازمت کی بات نہ پوچھ بیٹھے۔ لیکن اس نے کہا۔ "اگر آپ کسی کام جا رہے ہیں تو چلئے۔ مجھے ابھی کچھ دیر لگے گی۔ میں ان بچوں کو گھر تک چھوڑ آؤں"۔

جب میں رخصت ہونے لگا۔ تو بولا۔ "اور ہاں وہ ملازمت ...." میں گھبرایا عذر کرنے ہی لگا تھا کہ اس نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ابھی رہنے دیجئے میں نے موجودہ ملازمت چھوڑنے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔" پھر میری جانب دیکھ کر بولا۔

" بڑے لالہ دل کے اتنے برے نہیں ....آج میری ان سے جھڑپ ہو گئی تھی .... میں نے کہا لالہ جی آپ مجھے بہت دق کرتے ہیں۔

یہ کہہ کر مانک لعل نے میری طرف داد طلب نظروں سے دیکھا۔ بتیسی نکلی پڑتی تھی۔ جیسے کوئی بڑی ہی مسرت انگیز بات اس کے سینے میں کروٹیں لے رہی ہو۔

بڑی محبت سے مانک لعل نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "شام کے وقت جب میں کاشی کی سائیکل میں ہوا بھر رہا تھا۔ تو لالہ نے مجھے آواز دی۔ " بابو مانک لعل جی!" جب میں ان کے قریب پہنچا تو بولے "آج بچوں کو جوتے اور بنیائنیں خرید دیجئے۔ میں اور کسی کو اس قابل نہیں سمجھتا بابو مانک لعل جی!"

(مشمولہ: سنہرا دیس)

بلونت سنگھ

پنجاب کا البیلا

یوں تو اس وقت میری عمر چودہ برس کی تھی۔ لیکن میں اس قدر دبلا پتلا اور مخنی سا لڑکا تھا کہ بہ مشکل گیارہ بارہ برس کا دکھائی دیتا تھا۔

ان دنوں میں شہر کے ایک اسکول میں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ اور بورڈنگ میں رہتا تھا۔ یہ بورڈنگ تو برائے نام ہی تھا۔ اسے گھوڑوں کا اصطبل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ شہر سے باہر ایک پکی سڑک کے کنارے ایک بڑی سی عمارت تھی جس کے ارد گرد کچھ جگہ چھوڑ دی گئی تھی۔ عمارت چوکور تھی۔ اندر گھاس کا ایک بہت بڑا قطعہ تھا۔ جس کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک برآمدہ تھا۔ فرش کی اینٹیں جگہ جگہ سے اکھڑ چکی تھیں اور ان میں سے گرد نکل نکل کر چلنے والوں کے قدموں کے ساتھ اڑا کرتی تھی۔ کمرے بہت بڑے بڑے تھے اور ایک ایک میں کئی کئی لڑکے رہتے تھے۔ ہر لڑکے کے لیے ایک الماری، ایک چارپائی، ایک کرسی اور آدھی میز مخصوص تھی۔

باورچی خانے کا کل انتظام لڑکوں کے سپرد تھا۔ رسوئی میں تین نوکر تھے۔ ایک باورچی اور دو نوکر کھانا کھلانے اور دوسرے کاموں کے لیے۔

باورچی خانے میں کوئی شے مول تھوڑے آتی تھی۔ سب کے سب جاٹوں کے لڑکے تھے۔ گھی اور گیہوں گھروں سے آجاتے تھے۔ اور ضروریات کی باقی چیزیں مثلاً ایندھن، سبزی ترکاری مار دھاڑ سے حاصل کی جاتی تھی۔ ہوسٹل کے پیچھے ایک "ارائیں" کے کھیت تھے اس ارائیں کی ایک طرح دار لڑکی اور دو چھیلے بیٹے تھے دن بھر لڑکے ہوسٹل کی چھت پر بیٹھے لڑکی کو آنکھیں مار مار کر اشارے کرتے اور راتوں کو کھیتوں سے تازہ سبزیاں اڑا لاتے۔ بچارے ارائیں نے ہوسٹل کے سپرنٹنڈنٹ سے اپنی شکایتیں کیں۔ لیکن بچارا سوجے ہوئے چہرے والا سپرنٹنڈنٹ اپنی داڑھی کھجلا کر رہ جاتا۔ وہ خود ناچار تھا۔ ارائیں کو تشفی دے کر واپس بھیج دیتا اور لڑکوں سے محض زبانی باز پرس کرتا۔۔۔ لیکن لڑکوں کے معمول میں کبھی فرق نہ آیا

سپرنٹنڈنٹ پکا سکھ تھا۔ خوب لمبی لہراتی ہوئی داڑھی چھوٹی پیلے رنگ کی پگڑی پر اس کا یہ بڑا نیلے رنگ کا صافہ۔ تنگ پائجامہ، ڈھیلا ڈھالا کوٹ۔ اس کا ازار بند اس سے کبھی نہیں سنبھلتا تھا، ہمیشہ نیچے لٹکتا رہتا۔ ہر روز بلا ناغہ گوردوارے جا کر پاٹھ کرتا۔۔ وہ لڑکوں کی اس زیادتی کے سخت خلاف تھا لیکن ہوسٹل میں اسکی حیثیت بس برائے نام ہی تھی۔ بچارے کی بیوی اور بچے

ہمیشہ بیمار رہتے ۔ انکی تیمارداری سے فرصت پاتا تو کبھی کبھار ہوسٹل میں آنکلتا ۔ لڑکے بظاہر اس کا بڑا احترام کرتے تھے لیکن حقیقت میں انہیں اس کی کوئی پروانہ تھی ۔

جب وہ ہوسٹل میں داخل ہوتا تو عموماً باورچی خانے کا ایک نوکر اس کے ساتھ ہوتا برآمدے میں داخل ہوتے ہی وہ رک جاتا ۔۔ اور ٹانگیں پھیلا کر کھڑا ہو جاتا اس کا منہ اور آنکھیں ہمیشہ سوجی رہتی تھیں اور آنکھوں سے ہمیشہ پانی بہتا رہتا جسے وہ ایک جھاڑن نما رومال سے گاہے بگاہے صاف کر لیا کرتا تھا ۔ آتے ہی وہ ایک ہلکی کھانسی کھانستا تاکہ سب کو اس کی آمد کی خبر ہو جائے سب سے پہلے وہ نوکر سے گفتگو شروع کرتا ۔ کسی معمولی سی بات پر باز پرس ہونے لگتی ۔ "ہوں ۔۔ کیوں بے سور ! یہ پانی یہ تو نے گرایا ۔۔۔۔ ابے راستے ہی میں ۔۔۔ ایں ؟ ۔۔ کسی نے بھی گرایا ہو تو نے اسے صاف کیوں نہیں کر دیا جھاڑو سے ۔۔۔۔"

اتنے میں لڑکوں کو بھی معلوم ہو جاتا کہ حضرت آگئے ہیں عموماً سب سے پہلے بغداد سنگھ جس کا چہرہ چقندر کی طرح سرخ تھا ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا آگے بڑھتا اور بڑی متانت سے ہاتھ جوڑ کر کہتا ۔ "ست سری اکال سردار جی !"

" ست سری اکال ۔" پھر سپرنٹنڈنٹ کا پہلا سوال یہ ہوتا ۔۔۔ "کیوں سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

بغداد سنگھ یہ بڑا ہاتھ دھپ مارنے کے انداز میں اٹھا کر کہتا "ساب ٹھیک ٹھاک ہے جی ۔

سپرنٹنڈنٹ قدرے سکوت کرتا ۔ اب اور لڑکے بھی جمع ہونے شروع ہو جاتے سپرنٹنڈنٹ کے جسم کی بناوٹ بھی عجیب سی تھی موٹا تو وہ تھا ہی ۔ لیکن ورزش نہ کرنے کی وجہ سے اوپر کا دھڑ اور ٹانگیں ہلکی تھیں اور پیٹ خوب پھیلا ہوا ۔ چنانچہ جب وہ اطمینان کے ساتھ بڑی سنجیدہ صورت بنا کر کوٹ کو پیٹ کے آگے سے ہٹا کر دونوں ہاتھوں کو کولھوں پر رکھ کر کھڑا ہوتا اس کا پھولا ہوا پیٹ اور بھی آگے بڑھ جاتا اور وہ کسی سپیرے کی بین کی طرح نظر آنے لگتا ۔ اسے دیکھ کر لڑکوں کو ہنسی آجاتی ۔ سپرنٹنڈنٹ دل میں سمجھتا تھا کہ لڑکے اسی سے ہنس رہے ہیں چنانچہ وہ مقبول ہونے کی غرض سے ذرا بے تکلف ہو کر بناوٹی غصہ سے پوچھتا ۔ "اااا د سنگھ تم بڑے شیطان ہو گئے ہو ۔" "جی میں ؟" بغداد سنگھ اپنی موٹی سی انگلی اپنے سینہ پر رکھ کر حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ۔ " باگورو ۔۔۔ میں تو آپ کا داس ہوں جی ۔ کہئے تو ابھی سر اتار کر رکھ دوں قدموں میں ۔

اس بات پر لڑکے خوب قہقہے لگا کر ہنستے ۔ کوئی لڑکا کسی کی اوٹ میں ہو کر کہتا "کس کا سر ؟"

اب بغداد سنگھ نتھنے پھلا کر للکارتا ۔ "اوئے اوئے ۔۔۔ بچو سردار جی کھڑے ہیں ورنہ ابھی

تیرا موڑ بنا دیتا پکڑ کر۔"

اس کے بعد سپرنٹنڈنٹ اسی طرح کی بات کرتا ہوا سارے ہوسٹل میں لٹو کی طرح گھوم جاتا۔ اور باہر نکلنے سے پہلے ایک مرتبہ لڑکوں کو تنبیہہ کے طور پر کہتا۔ "اچھا اب سبزی بازار سے آتی ہے نا۔"

"جی بالکل" ۔۔۔ اب تو ہم روز کا حساب بھی لکھ کر رکھتے ہیں۔ دیکھئے گا؟"

وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں لیکن وہ اسی بات پر مطمئن تھا کہ کم از کم اس کی عزت تو رکھ لیتے ہیں۔ وہ اسی بات پر اپنی خیر مناتا۔ حساب وغیرہ دیکھے بغیر اچھا اچھا کہتا ہوا چلا آتا۔

اس کے جانے کے بعد لدھا سنگھ پانی کے گلاس میں سے چند بوندیں آنکھوں پر ٹپکا لیتا۔ کولھوں پر ہاتھ رکھ کر تولئے سے آنکھیں پونچھتا ہوا کہتا۔ "اوہوں اوہوں ۔۔۔ بغداد سنگھ! سب ٹھیک ٹھاک ہے نا؟"

میں نہ صرف کم سن بلکہ دبلا پتلا بھی تھا۔ اس لئے وہ سب مجھے بجائے میرے اصلی نام کے بکری سنگھ کہہ کر پکارتے تھے۔ بکری سنگھ نام تو بہت برا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد میں اس نام سے مانوس ہو گیا۔ اب مجھے بکری سنگھ مذاقاً شاذ و نادر ہی کہا جاتا تھا۔ نہایت سنجیدہ گفتگو میں بھی سب مجھے اس نام سے پکارتے تھے۔ میں کمزور تھا اور وہ لوگ سرکاری سانڈوں کی طرح پلے ہوئے تھے۔ لیکن وہ مجھ پر ہاتھ اٹھانا گئو ہتھیا کے برابر پاپ سمجھتے تھے۔ یہاں تک کہ اگر کبھی میں طیش میں آکر ان میں سے کسی کو لڑنے کے لئے بھی للکارتا بھی تو وہ میرے سامنے ہتھیار ڈال دیتا۔ میں اپنی کمزوری کے طفیل ان لوگوں میں قطعاً محفوظ تھا۔

ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں کسی سکھ تہوار کی ہفتہ بھر کی چھٹیاں ہوئیں۔ تقریباً سبھی لڑکے بوریا بستر باندھ کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیئے۔ میں محنتی لڑکا تھا پہلے تو ہوسٹل ہی میں چھٹیاں گزارنے کا ارادہ کیا۔ لیکن پھر اتنے بڑے ہوسٹل میں اکیلے جی نہ لگا۔ نہ تر و تازہ سبزی نہ وہ چہل پہل۔ رات کے وقت تاریک برآمدوں میں بھتنے ناچتے دکھائی دیتے چنانچہ دو ہی دن میں نے ابھی اپنے گاؤں جانے کی ٹھانی۔

گاؤں میں میری اماں، پھوپھی اور دو بڑے بھائی رہتے تھے میں نے میلے کپڑوں اور چند کتابوں کی گٹھڑی باندھی اور سائیکل کے پیچھے کیریر پر رکھ کر رسی سے باندھ دی پچیس میل کا سفر تھا۔ پمپ سولیوشن ربڑ وغیرہ ضروری سامان چمڑے کے چھوٹے تھیلے میں رکھ لیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور دھوپ کی تمازت نسبتاً کم ہوئی تو چل دیا۔

اس وقت پانچ بجے تھے۔ خیال تھا کہ زیادہ سے زیادہ چار گھنٹے میں گاؤں پہنچ جاؤں گا۔ جب شہر سے باہر نکل آیا تو ایک کمہار کی دکان پر رکنا پڑا۔ میں شام کو جب کبھی ادھر سے

گزرتا تو میری آنکھیں کسی کی تلاش میں اس دکان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔ کمہار کی بیوی بہت خوبصورت تھی۔ اس کا سن اگرچہ تیس سے کم نہ تھا لیکن تھی بڑی طرحدار اور پھر اس کی چہاردہ سالہ لڑکی کے کیا کہنے۔ میں شرمیلا اور خاموش ضرور تھا۔ لیکن بچپن ہی سے ایک حسن پرست طبیعت اور عاشقانہ مزاج رکھتا تھا۔ کمہار کی بیٹی کو دیکھ کر مجھے سوہنی کا خیال آجاتا تھا۔ سوہنی بھی کمہارن تھی وہ لوگ اس قسم کے قصوں کو باور نہیں کرتے۔ اور انہیں ڈھکوسلوں سے زیادہ اہمیت نہیں دیتے۔ لیکن میری نظروں کے سامنے یہ زہرہ جبیں لڑکی تھی۔ اس پر کوئی بڑے سے بڑا شہزادہ بھی عاشق ہوسکتا تھا۔ میرا عشق کس قدر بے بس اور اپنے آپ ہی میں سلگنے والا تھا۔ نہ میری شکل اچھی تھی نہ جسم۔ مہینوال جب سوہنی کمہارن کی دکان پر گیا تھا تو اس نے ساری کی ساری دکان ہی خرید ڈالی تھی۔ لیکن میں دکان تو کیا خرید کرتا۔ بس اس کی صورت دیکھنے کے لئے وہاں چلا جاتا۔ کبھی مٹی کا دیا یا ایک پیالہ یا صراحی خرید لیتا۔ اس کی ماں پرے کھاٹ پر بیٹھی رہتی تھی۔ مجھے مطلوبہ برتن اٹھا اٹھا کر دکھاتی۔ اسکی ماں مجھے نابالغ سمجھ کر اس طرف زیادہ توجہ نہ کرتی تھی۔ ادھر میں جی بھر کر اس ننھی سوہنی کو دیکھا کرتا۔ وہ بھی الھڑ سی تھی۔ اسے کبھی میری آنکھوں میں کوئی غیر معمولی بات نظر نہ آئی وہ سرد مہری سے میری طرف دیکھتی۔ "اچھا یہ پیالہ تمہیں پسند نہیں ------ کیا خرابی ہے۔ اس میں ---اچھا یہ لو ----"

مرعوب ہو کر کہتا۔ "نہیں نہیں اگر تم کہتی ہو تو میں یہی خرید لیتا ہوں ----"

وہاں سے برتن لاکر میں ہوسٹل کی پچھلی دیوار کے ساتھ لگا کر رکھ دیتا۔ اور دل شکستگی کے عالم میں ہوسٹل کے اندر داخل ہو جاتا۔ تو اودھم سنگھ میرا منہ لٹکا ہوا دیکھ کر پکار کر کہتا۔ "سنا بائی بکری سنہیا!"

اس دن جب میں ان کی دکان کے سامنے رکا تو اس وقت ماں تو غالباً گرمی کے مارے مکان کے اندر گھس بیٹھی تھی۔ البتہ لڑکی سر پر کپڑے کا ایک ٹکڑا اڑائے ادھر ادھر گھوم رہی تھی۔ اس کا چہرہ گرمی سے تمتمایا ہوا تھا۔ گال خوب سرخ ہو رہے تھے۔ میں اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میرا دل اچھل کر حلق میں آن پھنسا۔ کیا یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے کبھی اپنے گال چومنے کی اجازت دے دے --------- "کیا چاہیئے۔" اس نے پیٹھ موڑ کر کوئی بنی ہوئی صراحی میری طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔ "یہ لے جاؤ پانی ایسا ٹھنڈا ہوا کرے گا کہ بس یاد کرو گے عمر بھر.."

"عمر بھر یاد کرنے" والی بات تو اس نے محض دکانداری کے خیال سے کہہ دی تھی۔ لیکن میرا دل چھاتی کے قفس میں سے نکل کر اس کے قدموں پر نچھاور ہو جانا چاہتا تھا۔ میں اسے بتادینا چاہتا تھا ---------------- کہ میں تو اسے ہر وقت یاد کیا کرتا ہوں۔ لیکن کہہ کچھ نہ سکا۔ بس تھوڑی دیر تک چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس نے میری طرف دیکھا تو میں نے دانت نکال کر

کہا ۔ "اب میں گاؤں جارہا ہوں ۔"

" پھر کب آؤ گے ۔ " یہ کہہ کر وہ میرا جواب سنے بغیر اپنے کام میں مصروف ادھر ادھر گھومنے لگی ۔۔۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے ۔ میں نے جلدی سے دام دیئے اور پیڈل پر پاؤں رکھ کر چل کھڑا ہوا ۔ میرا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا ۔ آخر اس نے یہ بات کیوں پوچھی ۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک سراب ہے ۔ اسی لئے مجھے یہ اس قدر عزیز بھی تھا ۔ دل ہی دل میں میں شاداں و فرحاں سفر پر روانہ ہو گیا

دھوپ ہلکی پڑ چکی تھی ۔ لیکن گرمی اب بھی کافی تھی ۔ سڑک بڑے بڑے کھیتوں میں سے ہو کر جاتی تھی ۔ راستے میں سڑک کے ذرا پرے ہٹ کر جابجا رہٹ چلتے دکھائی دے رہے تھے ۔ کنوؤں کا صاف و شفاف پانی چھالوں میں گرتا ہوا آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا ۔ ان پر ان کنوؤں کے ارد گرد قینچی سے کتری ہوئی داڑھیوں والے کسان موٹے سوتی کپڑے کے تہبند باندھے بڑے سرور کے عالم میں حقے گڑ گڑاتے نظر آتے تھے ۔ جب کنوؤں پر کام کرنے والی لڑکیاں اور عورتیں کھیتوں میں مٹک مٹک کر ادھر ادھر چلتی تھیں تو ان کی لمبی لمبی چوٹیاں ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کر لہراتی تھیں ۔ بیلوں کی ٹانگوں میں گھس گھس کر بھونکنے والے کتے اپنا الگ شور مچا رہے تھے ۔ اور اپنی میلی کچیلی چندریوں میں سوکھے ہوئے گوبر کے ٹکرے جمع کرنے والی لڑکیاں کبھی کبھی اپنا کام چھوڑ کر گلہریوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگتی تھیں ۔

ابھی میں نے چار پانچ میل ہی کا فاصلہ طے کیا تھا کہ سائیکل پنکچر ہو گئی ۔ میں نے سڑک سے ہٹ کر پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نگاہ دوڑائی ۔ رہٹ بہت پیچھے رہ گیا تھا ۔ چنانچہ ایک جوہڑ کے کنارے سائیکل کو لٹا دیا ۔ ٹیوب میں بہت بڑا پنکچر ہو گیا تھا ۔ ڈبل پنکچر لگانے میں بیس پچیس منٹ صرف ہو گئے ۔ دو میل چل کر سائیکل کی ہوا پھر نکل گئی ۔ اب کے پانی بھی قریب نہیں تھا ۔ چنانچہ سائیکل لڑھکاتے ہوئے آدھ میل کے قریب پیدل چلنا پڑا ۔ سڑک کے کنارے ایک گاؤں آباد تھا ۔ وہاں ایک سائیکل والے کی دکان بھی تھی ۔ میں نے سائیکل اس کے سپرد کر دی ۔ میرا لگایا ہوا پنکچر اکھڑ گیا تھا ۔ اسے از سر نو درست کیا گیا ۔ اسی گڑ بڑ میں سورج افق تک جا پہنچا ۔ اور میں نے ابھی آدھا سفر بھی طے نہیں کیا تھا ۔ پنکچر لگ جانے پر میں نے سائیکل خوب تیز چلا دی ۔ یہاں تک کہ راستے میں مرغیاں کڑ کڑاتی اور پر پھڑپھڑاتی ہوئی ادھر ادھر دیواروں پر جا بیٹھیں ۔ گاؤں سے باہر نکلا تو سورج تقریباً غروب ہو چکا تھا ۔ کھلی ہوا تھی ۔ دھواں ، گرد ، شہر کی پکی دیواروں کی تپش وغیرہ کا نام تک نہ تھا ۔ کچھ دور تک میں نے خوب زور سے سائیکل چلائی ۔ یہاں تک کہ میں ہانپ گیا ۔ پیاس بھی محسوس ہونے لگی ۔ کھلے آسمان تلے کھیت حد نگاہ تک پھیلے ہوئے تھے ۔ کہیں کہیں ببول کے درخت جھنڈوں میں ایک دوسرے کے قریب قریب کھڑے ہوئے ایسے دکھائی دیتے تھے ۔ جیسے سرگوشیاں کر رہے ہوں ۔ کھیتوں کی پگ ڈنڈیاں قینچیوں کی طرح ایک دوسرے

کو کاٹتی ہوئی دور تک چلی گئی تھیں۔ دور افق میں کوئی شخص گھوڑے پر سوار اسے سرپٹ دوڑائے چلا جارہا تھا۔ اس قدر تیزی اور روانی سے جیسے نہ تو اس کا گھوڑا کبھی تھکے گا اور نہ زمین ہی کہیں پر ختم ہوگی۔ بس اسی تندی اور برق رفتاری سے ابد تک دوڑتا چلا جائیگا اور وہ خود اسی جوش و خروش سے رہتی دنیا تک اس پر بیٹھا رہیگا۔ بلند پرواز پرندوں کی ٹکڑیاں آسمان کی طرف پرواز کرتی چلی گئیں۔ یہاں تک کہ پرندے چھوٹے چھوٹے نقطوں کی طرح نظر آنے لگے۔ آسمان کی وسعت بے کنار تھی۔ اور پرندوں کی طاقت پرواز بے انداز ہوا کے جھونکے چلنے لگے اور میلوں تک پھیلے ہوئے کھیتوں میں اگے ہوئے پودے ایک رخ کو سربہ سجود ہوئے جاتے تھے۔ جیسے کوئی ازلی نغمہ سن کر وہ ایک ساتھ سر دھن رہے ہوں۔ دراصل وہ شاہد قدرت کی ایک صدا تھی جسے سن کر سوار نے منہ زور گھوڑے کو سرپٹ دوڑایا۔ پرندے تیر کی سی تیزی کے ساتھ آسمان کی وسعتوں میں پرواز کر گئے اور کھیتوں میں پودے وجد میں آکر جھومنے لگے۔

موسم خوشگوار تھا۔ میں نے روں روں کرتے ہوئے رہٹ کے قریب سائیکل روک لی نہانے کو جی چاہ رہا تھا۔ چنانچہ میں کپڑے اتار کر اولو میں جا گھسا۔ بیلوں کی آنکھوں پر کھوپے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سرہلاتے اور منہ سے جھاگ اڑاتے، تیز تیز قدم اٹھانے لگے۔ رہٹ گیت گانے لگا۔ اور پانی اس تیزی سے باہر گر رہا تھا۔ جیسے کنوئیں میں پڑے پڑے اس کا دم گھٹ گیا ہو سرد پانی میرے جھلسے ہوئے جسم پر گرا تو میں نے ایک آسمانی فرحت محسوس کی اور سنبھل کر جھال کے نیچے ہی بیٹھ گیا۔ پانی کی ململ کی طرح باریک چادر میں سے آسمان، زمین، درخت پودے کلیلیں کرتے ہوئے بچھڑے، قلابازیاں لگاتے ہوئے مینڈک سب میری مسرت میں برابر کا حصہ لے رہے تھے۔

میں بہت دیر تک نہاتا رہا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا کسان، جس کی ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے کانوں کے پیچھے چکنے پٹے نظر آرہے تھے، حقہ گڑگڑاتا ہوا ادھر آنکلا۔ مجھے خوش دیکھ کر مسکرانے لگا۔ اولو میں سے نکلنے کو دل نہ چاہتا تھا۔ لیکن سورج غروب ہو چکا تھا اور افق کے قریب سیاہی مائل دھوئیں کی ایک لکیر سی کھنچ گئی تھی ------۔ چنانچہ میں اولو میں سے نکلا اور گیلے بدن پر کپڑے پہن کر پھر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

اب میں نے سوچا کہ راستے میں کسی بھی جگہ نہیں رکوں گا۔ میں نے سائیکل پہلے سے بھی تیز چلادی۔ پکی سڑک کا تقریباً آٹھ میل راستہ رہ گیا تھا اور کھیتوں کا راستہ تقریباً آٹھ میل اور تھا۔ میری سائیکل ہوا سے باتیں کرنے لگی۔ نصف منزل پر ایک گاؤں تھا جسے قلعہ کاہن سنگھ کہتے تھے۔ خاصہ بڑا موضع تھا۔ پانچ سات پکے مکانات بھی تھے۔ ایک چھوٹا سا اسکول بھی تھا۔ پہلے خیال آیا کہ آج کی رات اسی گاؤں ہی میں گزار دوں۔ لیکن پھر گھر کا خیال آیا ہمارے گھر کے صحن میں ایک چھوٹا سا ڈول پڑا رہتا تھا۔ سوچا کنوئیں پر ڈول بھر بھر کر نہاؤں گا۔ ماں کئی کئی تہوں والے

پراٹھے پکائے گی۔ اور میں ہری مرچوں کی چٹنی کے ساتھ مزے لے لیکر کھاؤں گا۔ اگر راستے میں کوئی خاص رکاوٹ پیدا نہ ہوتو میرے لئے گھر پہنچنا ناممکن نہ تھا۔ اس لئے میں نے پھر زور زور سے پیڈل چلانے شروع کئے۔ جب میں ایک زمانے کے ساتھ گاؤں میں سے ہوکر گزرا تو گاؤں کے ننگ دھڑنگ پھولے ہوئے پیٹوں والے بچے "اوئے اوئے" کا شور مچاتے میرے پیچھے بھاگے اور وڑیاں سونگھتے ہوئے اور مٹیالے کتے بھی دمیں ہلاتے ہوئے میرے پیچھے پیچھے ہولئے۔ کتوں کو بے طرح بھونکتے دیکھ کر مسجد کے کچے چبوترے پر بیٹھے ہوئے ایک نوجوان نے طیش میں آکر حقے کی نئے کھینچ ماری۔ گاؤں سے باہر ایک مردہ بیل پر جھپٹے مارنے والے بڑے بڑے گدھ شور و غل سن کر ہراساں ہوگئے ل۔ اور اپنے لمبے لمبے پر پھڑپھڑاتے اور اچکتے ہوئے ذرا پرے ہٹ گئے۔ رادھر میں کسی فرار شدہ ڈاکو کی طرح بڑی تیزی سے بڑھا چلا جارہا تھا۔ یہاں تک کہ لڑکے اور کتے بہت پیچھے رہ گئے اور ان کا شور بھی مدھم پڑ گیا۔

آگے سنسان سڑک کے دونوں کناروں پر پاس پاس کھڑے ہوئے شیشم کے درختوں کے سلسلے شروع ہوگئے۔ ان کے نیچے گری ہوئی خشک پتیاں میری سائیکل کے پہیوں کے نیچے چرمر کرتی ہوئی گھومنے لگیں اور گاؤں کے بچوں کی طرح وہ دور تک تیزی سے چکر کھاتی ہوئی میرا پیچھا کرتیں اور پھر جیسے دم پھول جانے پر وہ ہنس کر ایک جگہ بیٹھ کر رہ جاتیں۔

اب اکادکا تارا بھی نظر آنے لگا تھا اور شفاف آسمان پر زرد زرد چاند کسی تالاب میں تیرتی ہوئی کانسی کی کڑھائی معلوم ہوتا۔

دائیں بائیں دور تک ناہموار زمین چلی گئی تھی۔ خاردار جھاڑیوں کے سلسلے شروع ہوگئے تھے۔ یہاں پر بھیڑیوں کا بھی خطرہ تھا۔ اگر بھیڑیوں کا کوئی غول آن گھیرے تو پھر؟ میں خوفزدہ ہوکر سائیکل اور بھی تیزی کے ساتھ دوڑانے لگا۔ رفتہ رفتہ غروب آفتاب کے بعد دن کی رہی سہی روشنی بھی ختم ہوگئی۔ صرف چاند کی پھیکی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی۔ شیشم کے درختوں کی وجہ سے سڑک پر اور بھی زیادہ گہری تاریکی چھا گئی تھی۔ میں اس سے پہلے صرف دو مرتبہ یہ سفر اکیلا کر چکا تھا۔ لیکن دونوں مرتبہ دن ہی میں سفر ختم ہوگیا تھا۔۔۔۔ میرا خیال تھا کہ دوڈھائی میل پر کاکو شاہ کے مقبرے کے قریب سے سڑک چھوڑ کر اپنے گاؤں کیطرف گھوم جاؤں گا۔ دل کو کچھ اطمینان ہو چلا تھا کہ کم از کم سڑک کا سفر تو ختم ہونے والا تھا۔

میں اندھادھند چلا جارہا تھا کہ آگے سڑک رکی ہوئی معلوم ہوئی جیسے نئے سرے سے بنائی جارہی ہو۔ میں نے سائیکل دھیمی کردی نزدیک پہنچ کر پتہ چلا کہ واقعی سڑک بن رہی ہے۔ ساری سڑک اکھڑی پڑی تھی۔ مجبوراً سائیکل سے اتر کر ناہموار زمین پر پیدل چلنا پڑا۔ یہ ایک نئی آفت آن پڑی تھی۔

راستے میں سڑک کے کنارے کنارے پٹھان مزدوروں کی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں، ہم

لوگ انہیں "راشے" کہا کرتے تھے۔ یہ "راشے" خوب موٹے تازے اور ہیبت ناک صورتوں والے ہوتے تھے۔ میں نے سنا تھا کہ یہ لوگ بچوں کو بوریوں میں بند کر کے کابل لے جاتے ہیں۔ اور آٹھ دس روپے میں بیچ ڈالتے ہیں۔ میں دل ہی دل میں خوفزدہ بھی تھا۔ لیکن بظاہر بڑے حوصلے کے ساتھ بڑھتا چلا گیا۔ آگ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی لرزتی ہوئی روشنی میں راشیوں کے چہروں کے خوفناک خطوط، الجھے ہوئے بال اور چمکتی ہوئی سرخ آنکھیں صاف نظر آرہی تھیں۔

بڑی مشکل سے یہ راستہ بھی ختم ہوا۔ اور میں پھر سائیکل پر سوار ہو گیا۔ رات بھیگ چکی تھی۔ اس وقت تک مجھے اول تو گاؤں میں پہنچ جانا چاہیئے تھا۔ یا گاؤں کے قریب ہی ہونا چاہیئے تھا۔ اب سوائے سفر جاری رکھنے کے اور کوئی چارہ نہ تھا۔ کاکو شاہ کے مقبرے کے قریب پہنچکر میں پگ ڈنڈی پر ہولیا۔

تنگ راستہ صاف دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس لیے مجھے سائیکل سے اترنا پڑا۔ کھیتوں میں پانی کھڑا تھا۔ مجھے ایک نشانی یاد تھی۔ دو فرلانگ کے قریب ایک پرانا رہٹ تھا جو آج کل سنسان پڑا تھا۔ میں نے پہلے اسی کا رخ کیا۔ جب پانی سے بچتا ہوا کنوئیں تک پہنچا تو دیکھا کہ آگے پانی اور بھی زیادہ دور دور تک پھیلا ہوا ہے۔ پگڈنڈی پانی ہی میں گم ہو گئی تھی۔ میں پانی سے بچتا ہوا خشکی کے راستے چلتا گیا۔ دو ڈھائی فرلانگ چلنے کے بعد پانی کم ہوا۔ اور میں اندازاً گاؤں کی طرف چل دیا۔ لیکن بہت دور نکل جانے کے بعد بھی گاؤں کا نام و نشان تک دکھائی نہ دیا۔

دھندلی چاندی میں میں چلتا ہی گیا۔ اب مجھے شک گزرا کہ کہیں میں نے غلط راستہ تو اختیار نہیں کر لیا۔ ہر طرف نگاہ دوڑائی کھیتوں اور درختوں کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ بعض کھیتوں میں کوئی فصل بھی کھڑی نظر آجاتی تھی۔ میں کچھ پریشان سا ہو گیا۔ یونہی اندھا دھند چلتا گیا کہ دفعتاً مجھے دور سے گرد اڑتی ہوئی دکھائی دی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔

تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ کوئی ترچھا بانکا سانڈنی سوار چلا جارہا ہے۔ سنسان جگہ پھیکی چاندنی۔ جھینگروں کا شور ۰۰۰۰ پہلے خیال آیا اسے آواز دے کر راستہ دریافت کر لوں۔ لیکن اس کی وضع قطع کچھ ایسی تھی کہ میں نے اسے بلانا مناسب نہ سمجھا۔ بلکہ سوچ میں پڑ گیا کہ نہ معلوم یہ کون ہے۔ کاش! وہ مجھے دیکھے بغیر آگے نکل جائے۔ میں سمٹ کر کیکر کے ایک چھوٹے سے درخت کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ لیکن اس درخت کے سائے میں بھی انسان کسی شخص کی نظروں سے اوجھل نہیں رہ سکتا تھا ۰۰۰۰ اس کے ہاتھ میں ایک لمبے دستے کی کلہاڑی دیکھ کر دم اور بھی خشک ہو گیا۔

وہ اپنے راستے پر چلا جارہا تھا۔ میری طبیعت کچھ سنبھلنے لگی ۰۰۰۰ دفعتاً اس نے رخ بدلا اور بظاہر میری طرف مڑا۔ میں نے سوچا شاید وہ اس راستے سے سیدھا آگے کو چلا جائیگا۔ چنانچہ میں ذرا پہلو بدل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن وہ سیدھا میری طرف آیا اور قریب پہنچکر اس نے سانڈنی روک لی۔ میں نے اس کی طرف دیکھا یوں معلوم ہوتا تھا۔ جیسے اونٹ کے اوپر ایک اور اونٹ بیٹھا ہوا

ہے ۔ وہ ایک لمبا تڑنگا اکہرے بدن کا مضبوط سکھ تھا ۔ اس کا چہرہ بیضوی تھا ۔ ڈاڑھی چھوٹی اور چھدری سی ۔ بھنویں گھنی ، ناک جیسے بطخ کی چونچ نتھنے پھولے ہوئے ۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی مگر چمکدار ٹھوڑی عین بیچ میں دبی ہوئی ، کانوں میں سنہری بالیاں گلے میں سونے کا چمکتا ہوا کنٹھا

وہ تھوڑی دیر تک منہ کھولے میری جانب دیکھتا رہا ۔ پھر اس نے بیٹھی ہوئی آواز میں پوچھا ۔

" کہو بھئی لونڈے ! کون ہو تم ؟ "

میرا دل ڈوب گیا ۔ " جی میں گاؤں کو جا رہا ہوں " ۔

" کہاں سے آ رہے ہو ۔ "

" شہر سے آ رہے ہو " ۔

" شہر سے ••••• جی " ۔

" کیا کرتے ہو وہاں " ۔

" جی پڑھتا ہوں ۔ "

" کیا پڑھتے ہو ؟ "

میں اس سوال پر چکرایا ۔ " کتابیں پڑھتا ہوں جی " ۔

اس نے سائیکل کے پیچھے بندھی ہوئی گٹھری کو کلہاڑی کے دستے سے ٹھوکا دیتے ہوئے پوچھا ۔ " اس میں کیا ہے ؟ "

" جی اس میں میلے کپڑے ہیں •••• کیا جی کھول کر دکھاؤں ؟ "

وہ ہنس پڑا " رہنے دو " ۔

میری جان میں جان آئی ۔ اس نے ڈاچی کی نکیل کھینچی اور چلنے ہی لگا تھا کہ پھر رک گیا " کہاں جا رہے ہو " ۔

" جی اپنے گاؤں کو " ۔

" کون گاؤں " ۔

" جی اکال گڑھ " ۔

" اکال گڑھ ؟ "

" جی "

اس نے قدرے سکوت کیا ۔ پھر اپنے کلوں کے نیچے زبان پھیرتے ہوئے بولا " ادھر آؤ " ۔

میں ڈرتے ڈرتے اس کے قریب گیا ۔ اس نے کہا " سائیکل نیچے رکھ دو " ۔

میں نے سائیکل زمین پر ڈالدی ۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر کہا ۔ " میرا ہاتھ پکڑ کر میرے پیچھے

بیٹھ جاؤ"۔

میں ڈرا لیکن اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے اس کے پیچھے اڑ کر بیٹھ گیا۔ اس نے اوپر بیٹھے بیٹھے کلہاڑی میں سائیکل اڑا کر اوپر کھینچ لی۔ نکمیل کو جھٹکا دیا اور سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے روانہ ہو گئی۔

میں نے اس کی پسینے میں تر گردن پر نظر جمادی۔ اس کے سر کے بال اس قدر کھینچ کر بندھے تھے کہ اس کی گدی پر بالوں کی جڑوں کا گوشت اوپر ابھر آیا تھا۔ جیسے ننھی ننھی پھنسیاں نکل آئی ہوں۔ ہوں۔ اس نے پھر اپنی بیٹھی ہوئی بھاری آواز میں پوچھا۔

"تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارا گاؤں کدھر کو ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اب تم اپنے گاؤں ہی کو جا رہے تھے۔

"جی میں راستہ بھول گیا تھا۔ میں پہلے شہر سے صرف دو مرتبہ آیا ہوں لیکن دن ہی دن میں گھر کو پہنچ جاتا تھا۔ لیکن آج رات ہو گئی اور پھر راستہ میں پانی بھی کھڑا تھا۔ اس لئے مجھے راستے کا پتہ ہی نہیں چلا۔"

اس پر اس نے اپنی بے باک آواز میں قہقہہ لگایا۔ "میاں! اگر تم رات بھر بھی اس طرح چلتے رہتے تو بھی اپنے گاؤں نہ پہنچ پاتے۔۔۔۔۔۔ تمہارے جیسے چھوٹے لڑکوں کو رات کے وقت سنسان جگہوں میں ہرگز نہیں گھومنا چاہیئے۔"

اس کے بعد رفتہ رفتہ وہ خوب مزے مزے کی باتیں کرنے لگا۔ پہلے تو میں دل ہی دل میں بہت ڈرا میں نے سنا تھا کہ بعض لوگ نو عمر لڑکوں کے سروں میں سے مومیائی نکال لیا کرتے ہیں• سر مونڈ کر چوٹی میں ایک کیل ٹھونک دیتے ہیں اور ٹانگیں باندھ کر درخت سے لٹکا دیتے ہیں اور سر کی چربی پگھل جاتی ہے اور مومیائی کیل کے سرے سے بوند بوند کر کے ٹپکتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ سر کی ساری مومیائی نکل جاتی ہے اور لڑکا مر جاتا ہے۔۔۔۔۔۔ سانڈنی سوار کی صورت تو ہیبت ناک ضرور تھی۔ لیکن اس کی باتوں سے کسی قسم کے خطرے کی بو نہ آتی تھی۔ وہ بڑا ہنس مکھ اور خوش مزاج شخص تھا۔

کہنے لگا کہ کسی نے دن کے وقت کہانی کہی ہوگی تبھی تو تم راستہ بھول گئے۔

میں سانڈنی کے کوہان سے پھسلا جاتا تھا۔ چنانچہ میں اس کی کمر سے لپٹ گیا۔ اس کی گاڑھے کی قمیص پسینے میں تر ہو رہی تھی۔ بغلوں سے ہلکی ہلکی بو آ رہی تھی۔ بازوؤں کے گھنے بال پسینے میں تر ہو کر چپک گئے تھے اس کے جوڑے پر بندھی ہوئی جالی کے نیچے کو لٹکتے ہوئے پھندنے میرے نتھنوں اور آنکھوں میں گھسے جاتے تھے۔ مجھے پہلے کبھی اونٹ کی سواری کرنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس قدر تکلیف دہ سواری تھی کہ بدن کا جوڑ جوڑ دکھنے لگا تھا۔ اور وہ میری تکلیف سے بیخبر اندھا دھند سانڈنی دوڑائے چلا جا رہا تھا۔۔۔۔۔ وہ بڑا باتونی شخص تھا۔ اس کی بھاری بھرکم بھر

پور آواز اور قہقہوں سے فضاء گونج رہی تھی ۔

ہم ایک ایسے درخت کے قریب سے گزرے جس پر بیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے ۔ ایک گھونسلہ تو میرے اس قدر قریب تھا کہ میں نے اسے کھسوٹ لینے کے لئے ہاتھ بڑا دیا تھا ۔ لیکن گھونسلہ میری زد سے باہر رہا ۔ وہ کہنے لگا ۔ "بیا بڑا سمجھدار پرندہ ہوتا ہے وہ اپنے گھونسلہ بڑی محنت اور کاریگری سے بناتا ہے ۔ دنیا میں کوئی پرندہ اس قدر خوبصورت گھونسلہ نہیں بناسکتا ۔ تم نے بانسوں پر لٹکے ہوئے گھونسلے نہیں دیکھے ؟ بےحد خوشنما ہوتے ہیں ۔ ہوا میں لہراتی ہوئی ٹوپیاں سی ۔ بیئے پھدک کر کبھی اندر چلے جاتے ہیں ۔ کبھی باہر آجاتے ہیں ۔ اور ایک قسم کا گھونسلہ بھی بناتے ہیں ۔ یعنی ایک تو اپنے رہنے کے لئے نرم تنکوں اور پتوں سے جس میں ایک طرف کو اندر جانے کا راستہ ہوتا ہے ۔ اور دوسرا گھونسلہ جھولے کی شکل کا ہوتا ہے ۔ جب بادل گھر گھر کر آتے ہیں اور ہلکی ہلکی پھوار پڑتی ہے ۔ سرد ہوا کے جھونکے چلتے ہیں ۔ تو بیئے چہچہاتے ہوئے ان پنگھوڑے جیسے گھونسلوں پر پہنچ جائے جھولا جھولتے ہیں ۔"

مجھے اس کی باتیں بہت دلچسپ معلوم ہوئیں ۔ میں نے کہا ۔ "سنا ہے بیئے اپنے گھونسلوں میں روشنی کرنے کے لئے جگنو پکڑ کر گھونسلوں کے اندر تنکوں میں اڑس دیتے ہیں"

اس نے اثبات میں سرہلا کر مجھے یقین دلاتے ہوئے کہا ۔ "ہاں یہ درست ہے یہ بہت ہی سیانا پرندہ ہے" ۔

اس پر میں نے اسے بندر اور بیئے کی کہانی سنائی جو میں نے تیسری جماعت میں اردو کی کتاب میں پڑھی تھی ۔ اس نے بچوں کے سے انہماک کے ساتھ وہ کہانی سنی ۔ اور جب میں نے کہانی کا نتیجہ بتایا تو وہ بہت خوش ہوا ۔

اس طرح بندر سے دوسرے جانوروں کا ذکر شروع ہوا ۔ میں نے بتایا کہ جب میں سڑک پر سائیکل چلاتا ہوا آرہا تھا تو کس طرح مجھے ڈر محسوس ہوا کہ کہیں کسی جھاڑی میں سے کوئی بھیڑیا نہ نکل آئے ۔

اس پر وہ پھر اپنے بے باک لہجے میں ہنسا" ۔ نہیں ڈرنے کی کوئی بات نہیں اس علاقے میں بھیڑیے بہت کم ہیں ۔ تاہم کبھی کبھار دکھائی بھی دے جاتے ہیں" ۔ پھر اس نے بتایا کہ شیخو پورہ کے علاقہ میں آبادیوں سے پرے خونخوار بھیڑیے غول بنا کر گھوما کرتے ہیں ۔ اور وہ قد میں گدھے سے کم نہیں ہوتے ------"

میں بہت حیران ہوا ۔ میں نے پوچھا کہ اگر کوئی بھولا بھٹکا مسافر ادھر جانکلتا ہوگا ۔ تو بھیڑیے اس کی تکابوٹی کر ڈالتے ہونگے ۔

اس نے یہ بڑا منہ پھیلا کر کہا ۔ "ہاں ------ ایک مرتبہ ایک آدمی ادھر سے جارہا تھا ------ میں نے یہ بات کسی سے سنی تھی ------"

"کیا وہ کوئی بڑا طاقت ور شخص تھا؟"

"ہاں وہ بہت تگڑا آدمی تھا ------ دوپہر کے وقت راستہ چلتے چلتے وہ تھک گیا تو ایک درخت کے نیچے آرام کرنے کے لئے بیٹھ گیا۔ ایک جھاڑن میں روٹی بندھی تھی۔ اس نے روٹی کھائی اور پھر وہ درخت کے تنے سے لگا کر تھوڑی دیر کے لئے اونگھ گیا۔ پھر یکایک اس کی آنکھ کھلی تو اس نے عجیب عجیب سی آوازیں سنیں۔ اور اسے جھاڑیوں میں جانوروں کی تھوتھنیاں دکھائی دیں ------

میں نے اچھل کر کہا۔ "وہ بھیڑیے ہونگے۔ ہے نا۔"

ہاں تم جانتے ہی ہو کہ بھیڑئے کا دہانہ بہت بڑا ہوتا ہے۔ اس کے جبڑے خون کی طرح سرخ ہوتے ہیں۔ بھیڑیا بہت ہی مکار جانور ہے ------"

"پھر کیا ہوا" ۔ میں نے اشتیاق سے پوچھا۔

"بس بھئی۔ وہ آدمی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دیکھا کہ ارد گرد کی جھاڑیوں میں بہت سے بھیڑیے بالشت بالشت بھر کی زبانیں نکالے چور نظر سے اس کو گھور رہے ہیں --------- اسے محسوس ہوا کہ اب وہ بچ کر نکل نہیں سکتا۔ اس نے درخت کی طرف دیکھا تو اس کا تنا اس قدر چکنا تھا کہ اس پر پھرتی سے چڑھنا ناممکن تھا۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ وہ اس پر چڑھنے کی کوشش کریگا۔ تو بھیڑیے اس پر جھپٹ پڑیں گے ---- لمحہ بہ لمحہ بھیڑیے اس کے قریب چلے آرہے تھے۔ وہ اسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے۔ اور آہستہ آہستہ وہ اپنے گھیرے کو تنگ کئے جا رہے تھے۔ زیادہ وقت باقی نہیں تھا۔ اس نے ادھر ادھر نگاہ ڈالی، نہ کوئی لاٹھی نہ ہتھیار ------ اتفاق سے قریب دو چار اینٹیں نظر پڑیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کسی شخص نے کبھی اس جگہ اینٹوں کا چولھا بنا کر روٹی پکائی تھی ------- اس نے اپنی کھدر کی موٹی چادر کو دوہرا کر کے پھرتی سے وہ اینٹیں اس کے اندر رکھ کر انہیں گرہ دے دی۔ ابھی اس کے سرے ہاتھوں میں تھامے ہی تھے کہ سب بھیڑیے ایک دم اس پر پل پڑے۔ اس نے چادر میں بندھی ہوئی اینٹوں کو زور زور سے گھمانا شروع کر دیا۔ جو بھیڑیا اس کے قریب آتا اینٹیں اس کی تھوتھنی پر اس قدر زور سے لگتیں کہ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ بھیڑیئے بڑھ بڑھ کر حملے کرتے رہے وہ بھی بڑی پھرتی اور تندی کے ساتھ اینٹیں گھماتا رہا۔ اس طرح قریب آدھ گھنٹہ تک وہ بھیڑیوں کے حملوں کو ناکام بناتا رہا ------ یہاں تک کہ وہاں چند راہگیر بھی آن پہنچے۔ انہوں نے دور ہی سے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ بھیڑیے اس قدر شور و غل کی آوازیں سن کر بھاگ نکلے۔ اور اس آدمی کی جان بچ گئی

یہ سنسنی خیز قصہ سنا کر وہ ساندنی کو گالیاں دینے لگا۔ اور میں اپنے خیالات میں کھو گیا ---- زرد چاند کی پھیکی روشنی میں دور دور تک کالے کالے درخت پھیلے ہوئے دکھائی دے

رہے تھے۔ کہیں بہت دور سے کسی کے گانے کی اڑتی ہوئی تان سنائی دینے لگی۔ سانڈنی اپنی بے ڈھنگی چال سے لپکی ہوئی چلی جارہی تھی۔ ہم ایک اونچے درخت کے قریب سے ہو کر گزرے۔ جس پر خشک لوکیاں لٹک رہی تھیں۔ اس نے کلہاڑی کے دستے سے ایک لوکی کو ٹھکرا کر کہا۔ "دیکھو یہ ہے تونبی۔ بچپن میں جب ہم لوگ نہر پر نہانے جایا کرتے تھے تو بس اسی قسم کی تونبی بغل میں لیکر اپنا مزے سے بوتل کے کاگ کی طرح تیرا کرتے تھے"۔

لیکن میرا دھیان ابھی تک بھیڑیوں کی طرف لگا ہوا تھا۔ میں نے پھر بات چھیڑی۔ "کیا بھیڑیے بڑے آدمی پر بھی حملہ کر دیتے ہیں؟"۔

اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ اگر بھیڑیے تعداد میں زیادہ ہوں اور کوئی اکیلا دکیلا آدمی ملجائے تو وہ اس پر حملہ کر دیا کرتے ہیں۔ لیکن عموماً آدمیوں سے ڈرتے ہیں ------ لو میں تمہیں ایک مزیدار قصہ سناتا ہوں -------- یہ جگ بیتی نہیں آپ بیتی ہے ------- تقریباً چار برس پہلے کی بات ہے ---- میں اپنے ننھیال کو جارہا تھا۔ راستے میں جنگل پڑتا تھا۔ لیکن مجھے پروانہ تھی۔ میرے ہاتھ میں ایک بڑی لمبی لاٹھی تھی۔ جس کے نیچے لوہے کی یہ موٹی شام لگی ہوئی تھی۔ اگر اس لاٹھی کی ایک بھی ٹھکانے کی چوٹ کسی بھیڑیے کے سر پر پڑجاتی تو وہیں ڈھیر ہو جاتا۔ خیر! دوپہر کا وقت تھا۔ ابھی میں جنگل میں تھوڑی ہی دور گیا تھا کہ میں نے چونک کر دیکھا کہ میرے داہنے ہاتھ کی طرف کوئی جانور جھاڑیوں میں چھپا ہوا ہے۔ میں نے جلدی سے چاروں طرف نگاہ دوڑائی تو دیکھا کہ بائیں ہاتھ کی طرف جھاڑی کے پیچھے ایک بھیڑیا کھڑا ہے ------ میں چوکنا ہو کر راستہ طے کرنے لگا۔ جس جگہ جھاڑیاں ذرا کم ہوتیں تو دیکھتا کہ میرے دائیں بائیں دو بھیڑیے تیس تیس یا چالیس چالیس قدم کا فاصلہ دے کر چلے جارہے ہیں۔ میں نہ لٹھ اٹھاکر کندھے پر رکھ لیا۔ اور ان پر نگاہ رکھتا ہوا بڑھتا چلا گیا تھا۔ کبھی وہ میرے قریب آجاتے۔ اور کبھی پھر دور چلے جاتے۔ جب ہم گھنی جھاڑیوں میں سے ہو کر گزرتے تو وہ نظروں سے غائب ہو جاتے۔ مجھے اس وقت خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ کہیں حملہ نہ کر دیں اور جس جگہ جھاڑیاں کم ہو جاتیں وہ دکھائی دینے لگتے۔ اور وہاں ----- ایک عجیب بات دیکھی ------ کبھی دائیں ہاتھ والا بھیڑیا بائیں ہاتھ کی طرف چلا آتا اور بائیں ہاتھ والا دائیں ہاتھ کی طرف چلا جاتا۔ اس طرح وہ راستہ بھرادل بدل کرتے رہے۔ یہاں تک کہ جنگل ختم ہو گیا۔ لیکن ان کو مجھ پر حملہ کرنے کی جراءت نہیں ہوئی۔ جنگل ختم ہونے پر میں تو آگے بڑھ گیا۔ اور وہ جنگل ہی میں رہ گئے"۔

جب وہ اپنا قصہ ختم کر چکا تو میں نے اس پر سوالات کی بوچھاڑ کر دی۔ اب وہ مجھے بہت ہی دلچسپ آدمی معلوم ہونے لگا تھا۔ اس کا لہجہ اس قدر دوستانہ تھا۔ اور باتیں ایسی سنسنی پیدا کرنے والی اور مزے کی کرتا تھا کہ جی چاہتا تھا کہ وہ باتیں ہی کرتا چلا جائے۔ میں نے اصرار کیا کہ

مجھے بھیڑیوں کی کوئی اور کہانی سناؤ۔ وہاں قصوں کی کیا کمی تھی۔ اس نے کہا۔ "اب میں تمہیں اپنے پرنانا کا چھوٹا سا قصہ سناتا ہوں ------- پرنانا یعنی میرے نانا کے باپ اپنے زمانے میں بہت ہی طاقتور شخص سمجھے جاتے تھے۔ علاقہ بھر کے لوگ ان سے تھر تھر کانپتے تھے۔ ایک مرتبہ میرے پرنانا اپنی پھوپھی سے ملنے کے لئے گئے۔ وہاں انہیں کچھ کام تھا۔ ڈیڑھ دو ماہ وہیں رہے۔ انہیں خبر ملی کہ گھر پر میرے نانا جو اس وقت بچے ہی تھے بیمار پڑ گئے ہیں۔ خبر ملتے ہی پرنانا فوراً اپنے گاؤں کی طرف روانہ ہو گئے۔ جلدی میں انہوں نے اپنے ہاتھ میں لاٹھی تک نہ لی بیس پچیس میل کا فاصلہ تھا۔ وہ بڑی تیزی سے چلتے تھے۔ اس وقت چونکہ اپنے بیٹے کی بیماری کی فکر تھی، اس لئے ان کی یہی کوشش تھی کہ وہ جلد از جلد اپنے گاؤں پہنچ جائیں۔ نصف راستہ طے کرنے کے بعد وہ ایک گاؤں کے قریب سے ہو کر گزرے تو اس گاؤں کے لوگوں نے ان سے کہا کہ وہ جس راستے سے جا رہے ہیں۔ ادھر سے نہ جائیں۔ بلکہ دوسرے راستے سے چلے جائیں۔ دوسرے راستے سے بہت بڑا چکر پڑتا تھا۔ اس لئے پرنانا اس راستے سے جانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے سبب پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اس راستے پر ایک بھیڑنی نے بچے دے رکھے تھے۔ جو شخص ادھر سے گزرتا تھا۔ وہ اس پر حملہ کر دیتی تھی۔ چونکہ دوسرا راستہ بہت طویل تھا۔ اور انہیں جلد از جلد پہنچنا تھا۔ اس لئے انہوں نے لوگوں کے کہنے کی پروا نہ کی اور سیدھے راستے ہی سے جانے کی ٹھان لی۔ جب کوئی ایک ڈیڑھ میل آگے نکل گئے تو دیکھا کہ عین راستے کے بیچ میں ایک خشمگیں بھیڑنی بیٹھی ہے۔ وہ تھوڑا سا راستہ کاٹ کر گزرنے لگے۔ تو اس نے ان پر حملہ کر دیا۔ انہوں نے جھپٹ کر اس کے جبڑوں کے پچھلے حصہ میں جہاں دانت نہیں ہوتے دونوں ہاتھ ڈالکر اس کا منہ پھاڑ دینے کی کوشش کی ادھر وہ جھنجھلائی۔ لیکن زندگی اور موت کا سوال تھا۔ انہوں نے خونخوار جانور کو ٹانگوں میں جکڑ کر زور جو لگایا تو اس کا منہ پھاڑ ڈالا۔ وہ بہت تڑپی اور انہوں نے ایک بڑی سی اینٹ سے اس کو جان سے مار ڈالا -------"

مجھے اس قصے میں بہت مزا آیا۔ اس طرح ہم باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ مگر اب میں کچھ تھک گیا تھا۔ جسم بھی دکھنے لگا تھا۔

دور سے درختوں کے جھنڈوں میں سے روشنی چھن چھن کر نکلتی دکھائی دی۔ جب ہم اور قریب پہنچے تو باجوں اور ڈھول کا ہلکا ہلکا شور بھی سنائی دینے لگا۔ اس ویرانے میں یہ رونق! پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہاں میلا لگا ہوا ہے۔ یہ بڑا میلہ سات دن تک مسلسل لگتا تھا۔ بڑی بڑی دکانیں اور بھانت بھانت کے کھیل تماشے آتے تھے۔ میں نے دریافت کیا۔ "کیا اب میلے میں چلنا ہوگا"۔

"ہاں مجھے وہاں ایک ------- سے ملنا ہے اور اس میلے کا مطلب ہی کیا ہے جہاں میل نہ ہو سکے ------ کیا سمجھے؟"

میں کچھ نہ سمجھا۔

اب ہم ایک چوڑے ریتیلے راستے پر ہولئے۔ اس راستے کے دونوں کنارے اوپر کو اٹھے ہوئے تھے۔ اور ان کناروں پر ببول کے اونچے اونچے درخت قطار در قطار میلے کے مقام تک چلے گئے۔

جب ہم قریب پہنچے تو کالے کالے درختوں کے تنوں کے بیچ میں سے گیس کے ہنڈے اور خیمے نظر آنے لگے۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے توں توں زیادہ رونق دکھائی دینے لگی۔ حلوائیوں، بساطیوں، کمہاروں، کھلونے اور شربت فالودے والوں کی دکانیں۔ ایک طرف اوپر نیچے گھومنے والے پنگھوڑے اور دوسری جانب بازوؤں پر نام یا پھول وغیرہ گودنے والوں کے اڈے، گھوڑے، گدھے، تانگے، ٹھیلے، بیل اور اونٹ بھی نظر آنے لگے۔ اس وقت خوب گہما گہمی ہو رہی تھی۔ مردوں اور عورتوں کے جھنگڑ کے جھنگڑ ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ روشنی اور گانے بجانے کی وجہ سے جنگل میں منگل ہو رہا تھا۔

میلے میں پہنچکر ایک درخت کے تلے میرے ساتھی نے سانڈنی کو زمین پر بٹھا دیا۔ میں اترا تو میری ٹانگیں سن ہو گئی تھیں۔ میں کھڑا نہ رہ سکا۔ اس لئے فوراً زمین ہی پر بیٹھ گیا۔ وہ میری طرف دیکھ کر دانت نکال کر ہنسا۔ "کیوں بس تھک گئے"۔

میں کچھ جھینپ سا گیا۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ اس وقت میرے جسم کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔

اس نے پوچھا۔ "تمہیں بھوک تو لگی ہوگی خوب زور کی"۔

میرے اثبات میں جواب دینے پر وہ مجھے اپنے ساتھ لیکر حلوائی کی سب سے بڑی دکان پر پہنچا۔ کڑاہے آگ پر چڑھے ہوئے تھے۔ گرما گرم جلیبیاں اتر رہی تھیں پہلے تو اس نے مجھے گرم گرم جلیبیاں دلوائیں۔ مجھے بھوک بھی لگ آئی تھی۔ اس دن جلیبیاں کھانے کا بڑا لطف آیا۔ اس نے میری پیٹھ پر تھپکی دے کر کہا۔ "بس اب تم جو جی چاہے کھاؤ خوب پیٹ بھر کر، کچھے!"۔

مجھے دکان پر چھوڑ کر وہ خود ایک طرف کو چلدیا۔ میں نے جو جی چاہا کھایا۔ جب کھا چکا تو حلوائی کے نوجوان لڑکے نے دام طلب کئے۔ میں گھبرایا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ میرا ساتھی کہیں نظر نہیں آتا تھا۔ مجھے پیاس بھی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن اب میں خوب پھنسا۔ میں نے حلوائی سے کہہ دیا کہ میرے پاس دام نہیں ہیں۔ اس پر نوجوان حلوائی نے کہا۔ "کرسی پر بیٹھے رہو جب تک پیسے نہیں دوگے یہاں سے ہرگز نہیں جانے دونگا۔" میں بہت پریشان ہوا۔ تھوڑی دیر بعد حلوائی پھر تقاضا کرنے لگا۔ میں ڈرا کہ کہیں دو چار چپت ہی نہ جمادے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اتنے میں بطخ کی چونچ کی سی ناک والا میرا ساتھی بھی لمبے لمبے ڈگ بھرتا آن پہنچا۔ اسے آتا دیکھ کر میری جان میں جان آئی۔ اس وقت حلوائی کا لڑکا مجھے کھری کھری سنا رہا تھا۔ میرے ساتھی نے آتے ہی بڑی زور دار آواز میں اسے للکار کر کہا۔ "ابے او حرامی کے پلے! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کیا کہتا ہے ہمارے چھوکرے کو

--------؟

پھر اس نے آگے بڑھ کر ٹیٹوا دبالیا۔ "برخوردار میرا نام جسا سنگھ ہے جسا سنگھ --------" شور سن کر لڑکے کا باپ ہاتھ جوڑ کر دکان سے نیچے اتر آیا۔ اور جسا سنگھ کے سامنے رونی صورت بنا کر کھڑا ہو گیا۔ "لالہ جانتے ہو میں کون ہوں ----"

لالہ ہانپ رہا تھا۔ مٹکے کی طرح پھولا ہوا اس کا پیٹ نیچے اوپر ہو رہا تھا۔ جی ان داتا جانتا ہوں -------"

جسا سنگھ نے اس کے جوان لڑکے کو گردن سے پکڑ کر اس زور سے پیچھے دھکیل دیا کہ وہ گرم گرم گھی کے کڑاہے میں گرنے سے بال بال بچا-----" تو پھر اپنے اس لونڈے کو بھی بتادو کہیں مجھے اس کا بھر کس نہ نکالنا پڑے------ کیوں بے سور تجھے اتنی جراءت کیونکر ہوئی کہ تو ہمارے لڑکے پر پیسے لینے کے لئے چڑھ دوڑا------" وہ لال لال آنکھیں نکالے لالہ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ادھر ادھر کے لوگ بھی آن جمع ہوئے۔ لالہ نے کدو سا سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی میں نے پیسے نہیں مانگے------- ابی مجھے تو معلوم بھی نہیں ہوا اس حرامزادے نے کب پیسے مانگنے شروع کر دیئے"۔

جسا سنگھ نے کہا۔ "خون پی لونگا خون-----یہاں انگریز کا راج نہیں میرا راج ہے ------کہو تو دکان برابر کردوں صبح تک"۔

اتنے میں ایک اور قد آور مسلمان نوجوان آگے بڑھا۔ "ابے جانے دے یار غلطی ہو گئی بیچارے سے"۔جسا سنگھ نے گھوم کر دیکھا تو اسکی باچھیں کھل گئیں۔دونوں بغلگیر ہو گئے۔ شاید بہت دنوں بعد دونوں دوستوں کا ملاپ ہوا تھا۔ نو وارد بھی ایک خونخوار گدھ کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

حلوائی کی اتنی تنبیہہ ہی کافی سمجھی گئی۔ اس کے بعد ہم لوگ میلے میں گھومنے لگے۔ وہ دونوں بہت دیر تک مقدموں، پولیس، اور تھانے وغیرہ کی باتیں کرتے رہے۔

میلے سے ذرا ہٹ کر ایک جگہ کھلے کھیت میں الغوزے بج رہے تھے۔ لوگ ایک بڑے گھیرے میں بیٹھے تھے۔حقے کا دور چل رہا تھا۔ کچھ لوگ لاٹھیاں بغلوں میں دبائے ان کے سہارے بیچ میں کھڑے تھے۔ بعض لاٹھیوں پر ٹھڈیاں ٹکائے اچکے ہوئے کھڑے تھے۔ الغوزے بجانے والے کے قریب ایک گبھرو ہاتھ کان پر دھرے بڑے مزے میں پورن بھگت کا قصہ گا گا کر سنا رہا تھا۔ساری محفل پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف گانے والے کی درد میں ڈوب ڈوب کر ابھر آنے والی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔ جب گانے والا ایک بول کہہ کر خاموش ہو جاتا تو الغوزوں کی لہکتی ہوئی دلکش آواز دو بولوں کے درمیانی وقفہ کو اور بھی دلکش بنادیتی۔

ایک اور جگہ بہت بھیڑ تھی۔ خوب ہلڑ مچا ہوا تھا۔ جب ہم قریب پہنچے تو دیکھا کہ لوگوں

نے ایک رنگین مزاج سرمست بوڑھے کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔ بوڑھے کی سپید داڑھی اور لمبے لمبے پٹھے ہوا میں اڑ رہے تھے۔ پہلے وہ ایک لمبی سی ہانک لگا کر بڑی تے کے ساتھ کوئی عریاں سی بولی سناتا۔ لوگ قہقہے لگاتے اور وہ ہاتھ اٹھا کر چٹکیاں بجاتا اور کہنیاں ہلاتا ہوا اچھل اچھل کر رقص کرتا تھا۔ اس کے منہ میں ایک دانت تک نہ تھا۔ لیکن آنکھوں میں بلا کی چمک تھی۔ پھر اس نے بڑی شوخ نظروں سے حاضرین کی طرف دیکھا۔ اور بلند آواز میں پکار کر بولا۔

ادئے۔ نالے بابا کھیر کھا گیا۔

نالے دے گیا دوانی کھوٹی

ہو ہو

"بلے ادئے بابیا"۔ ہر طرف سے تحسین اور آفرین کی صدائیں بلند ہوئیں۔

ہم اسی طرح گھومتے پھرتے چلے جا رہے تھے۔ جسا سنگھ اور اس کا دوست عقابوں کی طرح آگے کو جھک جھک کر تالیاں بجاتے ہوئے قہقہے لگا رہے تھے۔ میں ان کی لمبی لمبی ٹانگوں پر نگاہ رکھتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ تھا۔ اتنے میں جسا سنگھ میری طرف مخاطب ہوا۔ "کاکا•••• کیا نام ہے تمہارا •••"

میں "بکری سنگھ کہنے ہی کو تھا کہ یکایک رک گیا۔ ورنہ میرا خوب مذاق اڑایا جاتا۔ میں نے سنبھل کر اصلی نام بتادیا۔

"تم نے کبھی اونٹنی کا دودھ پیا ہے •••• اہا! بہت ٹھنڈا ہوتا ہے۔ آؤ تمہیں ایسا دودھ پلائیں کہ بس یاد ہی کیا کرو۔"

ہم میلے سے ذرا پرے ہٹ آئے۔ ایک جگہ بہت سی اونٹنیاں بندھی ہوئی تھیں۔ ادھر ادھر کھلے میدان میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ اور ان پر میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے آدمی بیٹھے دکھائی دے رہے تھے۔ روشنی کی کمی کی وجہ سے انکے چہرے صاف طور پر نظر نہ آتے تھے۔ ہم بھی ایک چارپائی پر جا بیٹھے۔ جسا سنگھ نے اپنے سامنے دودھ دہایا۔ اور پھر تین منڈیں دودھ کی بھری ہوئی لایا۔ وہ دونوں تو اپنی اپنی منڈیں ایک ہی سانس میں چڑھا گئے۔ لیکن میں باوجود شدید پیاس کے تین ساڑھے تین سیر کی منڈ پی نہ سکا۔ چنانچہ جسا سنگھ میری منڈ کا دودھ بھی پی گیا۔ وہاں سے اٹھ کر ہم پھر میلے میں واپس چلے آئے۔ ہم بہت دیر تک گھوم چکے تھے۔ ارد گرد کے دیہات سے آئی ہوئی عورتیں بھی واپس جا رہی تھیں۔ اگرچہ اب رونق کافی تھی۔ لیکن جہاں تک عورتوں کا تعلق تھا۔ محفل پہلے کی نسبت کچھ سرد پڑ چکی تھی۔

ایک طرف مجرے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ ایک سفید ریش بزرگ سیاہ کپڑے پہنے تخت پوش پر جلوہ افروز تھے۔ دانتوں میں حقے کی نے دبی تھی ادھر ادھر عقید تمندوں کا جمگھٹا تھا چند نوجوان عورتیں بار سنگار کرنے کے بعد پاؤں میں گھنگرو باندھ رہی تھیں۔ طبلے پر آٹا ملا جا رہا

تھا۔ کچھ وقفے کے بعد تھپ تھپ تھاپ کی آوازیں سنائی دے جاتی تھیں۔ ایک طرف سارنگی نواز بیٹھے سارنگیوں کے کان مروڑ رہے تھے۔ ادھر ان کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے گز ہلتے اور ادھر ان کے بڑے بڑے پگڑوں والے سر بھی بڑی ہم آہنگی کے ساتھ حرکت کرتے سب لوگوں کی نگاہیں ان عورتوں پر جمی ہوئی تھیں۔ جو بل کھا کھا کر سو سو طرح سے اپنے پاؤں کی طرف دیکھتی تھیں • وہ اچھی طرح جانتی تھیں کہ سیاہ پوش پیر کی سرمگیں آنکھوں سے لیکر معمولی سے معمولی شخص کی آنکھوں تک سب انہی کی شیدائی تھیں۔

جسا سنگھ کے دوست نے مجراد یکھنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ جسا سنگھ کا بھی خیال تو یہی تھا لیکن شاید میرے خیال سے اس نے وہاں زیادہ دیر تک رکنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لیے وہ دوست سے رخصت ہوا۔ اور ہم لوگ اپنی سانڈنی کی نکیل پکڑ کر میلے سے چل نکلے۔

جب ہم میلے سے باہر آگئے تو سامنے پھر گھنی گھنی جھاڑیاں اور اونچے اونچے درخت تھے۔ ہمارے دائیں بائیں اب بھی کوئی اکادکا خیمہ نظر آہی جاتا تھا۔ تھوڑی دور جانے کے بعد جسا سنگھ رک گیا۔ اس نے مجھے وہیں ٹھہرایا اور سانڈنی کی مہار میرے ہاتھ میں دے کر خود اس ریتلے راستے کے اونچے کنارے کی طرف رخ کر کے تن کے ایک اور درخت کے قریب پہنچا۔

وہ درخت کے نیچے جاکر کھڑا ہی ہوا تھا۔ کہ درخت کے سائے میں ایک نوجوان عورت تنے کی اوٹ میں سے باہر نکل آئی۔ وہ دونوں ہنس پڑے اور بہت آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگے۔

مدھم روشنی میں اس عورت کی صورت صاف طور پر نظر نہیں آتی تھی۔ البتہ جب وہ باتیں کرتی ہوئی اپنی جگہ سے ایک طرف کو ہٹ جاتی تو چاند کی روشنی میں اس کے چہرے کے خطوط صاف صاف دکھائی دینے لگے۔

وہ ایک خوب پلی ہوئی جنگلی بلی کی مانند تھی۔ اس کے چلنے کا اندازہ بھی اس موٹی تازی بلی کی طرح تھا جو پیٹ بھر کر چوہے کھالینے کے بعد خرخر کرتی ہو۔ خوب کھینچی تنی ہوئی وہ ٹھسا ٹھس گوشت کا تڑپتا ہوا ایک ٹکڑا تھی۔ جیسے خربوزے کی قاش یا میٹھے سنگترے کی رس بھری پھانک۔ اس نے گہرے نیلے رنگ کی اوڑھنی کی ماتھی بکل مار رکھی تھی۔ جس میں سے اس کا صرف چہرہ ہی نظر آتا تھا۔ اگر اس کے صحت ور گالوں پر اس قدر گوشت نہ ہوتا تو اس کی آنکھیں خوب بڑی بڑی دکھائی دیتیں۔ ابرو چمکتی کٹار تھے اور دانت صاف و شفاف اور آبدار اخروٹ کے درخت کی چھال سے رنگے ہوئے مسوڑھوں میں سے ہنستے وقت اس کے دانتوں کی چمک بجلی کی طرح کوند جاتی تھی۔ اسکے ہونٹوں میں سمندر کی لہروں کا سامدوجزر پیدا ہوتا اور وہ گرم ریت پر پڑی ہوئی کسی مچھلی کی طرح پیچ و تاب کھانے لگتے تھے۔

وہ دونوں مجھ سے کچھ فاصلے پر تو تھے ہی۔ پھر وہ باتیں بھی بہت دھیرے دھیرے کر رہے تھے۔ کم از کم میرے کان میں کچھ نہیں پڑنے دیتے تھے۔ البتہ عورت کے ہونٹوں کے اتار چڑھاؤ

اور پیچ و خم سے معلوم ہوتا تھا کہ مضامین کے دفتر کے دفتر کھولے جا رہے ہیں ۔۔ کبھی شوخ نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر ٹھینگا دکھانے کے انداز میں اوپر والا ہونٹ بھینچ کر نیچے کا ہونٹ آگے بڑھا دیتی ۔۔۔ اس نے اپنی چندریا کو سنوارا تو اس کے سیاہ، گھنے اور لمبے بال بارش کی بوچھاڑ کی طرح باہر نکل پڑے ۔ اس کی خوش وضع گردن کی جھلک بھی لمحہ بھر کو دکھائی دی اور پھر اس کی بادل نما اوڑھنی میں روپوش ہو گئی ۔ وہ مستی میں آئی ہوئی کبوتری کی طرح اٹکھیلیاں کر رہی تھی ۔۔۔ جسا سنگھ نے غالباً اس کی ٹھوڑی اوپر اٹھانے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا ۔ عورت نے نرمی سے اس کا ہاتھ راستے ہی میں روک دیا اور بڑے بانکپن سے ٹھمک کر سپردگی کے انداز میں اس کے قریب ہو گئی اور اس کے کان کے پاس سرگوشی میں کچھ کہا ۔ جسا سنگھ نے میری طرف دیکھا اور کھکھلا کر ہنس پڑا ۔۔۔ پھر جسا سنگھ ایک قدم پیچھے ہٹ گیا ۔

پتوں میں سے چھن چھن کر آنے والی چاندنی میں عورت کی تیز آنکھوں میں سے روشنی کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں ۔۔۔۔۔۔ اور جب جسا سنگھ واپس لوٹا تو وہ درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر کھڑی ہو گئی ۔ اور کچھ غمناک آنکھوں سے جسا سنگھ کی طرف ٹکٹکی باندھ کر دیکھنے لگی ۔ اس کا ایک گال درخت کے تنے سے لگا ہوا تھا ۔

ہم بدستور سابق سانڈنی پر سوار ہو گئے ۔ اور سانڈنی پہلے کی طرح بے ڈھب چال سے بھاگ نکلی ۔ کافی دور آجانے کے بعد میں نے گھوم کر پیچھے کی طرف دیکھا ۔ وہ عورت ابھی تک اسی طرح درخت کے تنے کے ساتھ سمٹ کر کھڑی ہوئی تھی ۔

جب ہم کھیتوں میں پہنچ گئے ۔ تو جسا سنگھ نے اپنا بوہے جیسا منہ کھولکر میری طرف دیکھا اور ناک کی بجائے منہ سے سانس لینے لگا ۔ اس کی چھوٹی موٹی مونچھوں کے تلے اس کے کچھ بھدی ہونٹوں پر شوخ مسکراہٹ کھیل رہی تھی ۔ بھاری سی آواز میں بولا "کیا سوچ رہے ہو ۔"

سانڈنی نچلا ہونٹ آگے کو بڑھائے کسی روٹھی رانی کی طرح ٹھمک ٹھمک کر چلی جا رہی تھی ۔ جسا سنگھ نے لوہے کے کڑے والا ہاتھ اٹھا کر کان پر رکھ لیا ایک لمبی ہانک لگائی ۔ اس کے منہ میں سے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ زندگی سے بھرپور آواز نکلی جو فضا میں پھسلتی چلی گئی ۔ اس قدر آزاد اور بھرپور آواز میں نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی ۔ اس کی آواز میں موسیقی نہ سہی ۔ لیکن ایک ایسی کشش، ایک ایسا خلوص اور کرارا پن تھا ۔ جس پر سنگیت سے بھرپور ہزاروں آوازیں قربان کی جا سکتی تھیں ۔ لمبی ہانک کے بعد وہ گانے لگا ۔

او ئے ۔

میں مل لاں تخت لاہور دا (میں لاہور کے تخت پر بیٹھ جاؤں)

میں کھو دلال راجے دیاں رانیاں (میں راجے کی رانیاں چھین لوں)

او ئے ۔ ہو ہو

پھر اس نے بلند قہقہہ لگایا "لو میں تمہیں ایک اور گانا سناتا ہوں ۔ بہت مزے کا گیت ہے ۔ ایک عورت جس کا نام بھاگن ہے اپنے ۔۔۔۔ یعنی کجھے نا! اس سے پوچھتی ہے ۔

بیں دے کتھے چلے او

حاکماں تسی، تسی دے کتھے چلے او ۔

اب حاکم جواب دیتا ۔

بے نی دلی چلے آں

بھاگنے! اسی، اسی نی دلی چلے آں

اس پر بھاگن کے دل میں لڈو پھوٹنے لگتے ہیں ۔ کہتی ہے

بیں وے کی لیادو گے ۔

حاکماں! تسی، تسی دے کی لیادو گے ۔

بھلا حاکم بھاگن کے لیے کچھ لانے سے کب چوک سکتا تھا ۔ لیکن اس موقعہ پر اسے شرارت سوجھتی ہے ۔ وہ اصل تحفے کا ذکر تو کرتا نہیں بلکہ کہتا ہے ۔

بیں نی! بلی لیاداں گے ۔

بھاگنیں! اسی، اسی نی بلی لیاداں گے ۔

بلی کا نام سن کر بھاگن کا جی کٹ جاتا ہے ۔ تیور بگڑ جاتے ہیں ۔ پوچھتی ہے ۔

بلی کی کرجے گی ۔

حاکماں! بلی، بلی دے کی کرجے گی

حاکم کنکھیوں سے بھاگن کی طرف دیکھتا ہے ۔ اس کے برہم ہو جانے سے لطف اندوز ہوتا ہے ۔

بے نی نہو ندر مارے گی ۔

بھاگنیں! بلی ۔ بلی نہو ندر مارے گی ۔

بھاگن اس بات پر بظاہر مسرت کا اظہار کرتی ہے اور پھر طنزاً پوچھتی ہے ۔

پٹی کون بھنے گا ۔

حاکماں! پٹی پٹی دے کون بھنے گا ۔

اب حاکم کی باری تھی ۔ بھاگن سمجھتی تھی کہ اب حاکم سے کوئی بات نہ بن پڑے گی ۔ اب حاکم نے پہلے تو بھاگن کی طرف ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ شرما گئی ۔ جب شرم کے مارے بھاگن کے رخسار سرخ ہو گئے تو اس نے کہا ۔

پٹی توں بھنیں گی ۔

بھاگنیں پٹی، پٹی توں بھنیں گی ۔

او ہو ہو ہو

"کیوں میرا گانا پسند آیا؟"

گانا تو خیر جو تھا سو تھا ہی ۔ لیکن گانے میں جو زندگی اور للکار اور اس کے انداز میں جو بے باکی سنی وہ مجھے بہت پسند آئی ۔

اس نے پوچھا ۔ "تم بھی گانا جانتے ہو" ۔

میں گانا نہیں جانتا تھا ۔ کاش میں اسے گانا گا کر ہی سنا سکتا ۔ میں نے باتوں ہی باتوں میں پوچھا ۔ "وہ مسلمان کون تھا ۔ ؟"

وہ ہنس پڑا ۔ "وہ میرا جگری دوست ہے مجھے بڑے عرصے کے بعد بڑے گھر سے آیا تھا ۔ اچھا ہی ہوا جو مجھے مل گیا ۔"

"بڑا گھر کیا ہوتا ہے ؟"

"ارے تم بڑا گھر نہیں جانتے ۔ ہائے افسوس تم بڑے گھر کبھی نہیں جا سکو گے ۔ صرف بڑے آدمی ہی بڑے گھر میں جا سکتے ہیں ... بس سردار بہادر را یہ سمجھ لو کہ بڑا گھر صرف انہی لوگوں کے لیے ہوتا ہے جو سرکار کی خدمت کرتے ہیں ۔ جب وہ خدمت کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو انہیں آرام کرنے کے لیے بڑے گھر میں بھیج دیا جاتا ہے ۔ وہاں وہ اطمینان سے بیٹھ کر سرکار اور پرجا کی سیوا کے نئے نئے ڈھنگ سوچا کرتے ہیں ۔ چنانچہ جب آرام کرنے کے بعد سرکار کے بڑے گھر سے نکلتے ہیں تو پھر نئے نئے طریقوں سے بڑے زور شور سے پرجا کی سیوا کرتے ہیں ۔ پرجا سرکار سے انکی پر زور سفارش کرتی ہے ۔ سرکار جتنی زیادہ خوش ہوتی ہے اتنی ہی جلدی ان سیوکوں کو بڑے گھر میں بھیجدیتی ہے ۔ جو شخص جتنی زیادہ تندہی کے ساتھ خدمت کرتا ہے ۔ اتنے ہی زیادہ عرصہ کے لیے اسے آرام کرنے کا موقع دیا جاتا ہے" ۔

میں بہت دیر تک اپنی عقل کے مطابق بڑے گھر کی بابت سوچتا رہا ۔ جسا سنگھ سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے بولا ۔ میرے اس دوست کا نام نورا ہے ۔ اس کے بڑے گھر میں جانے سے پہلے ایک مرتبہ ہم دونوں ایک گاؤں میں رات کے وقت کسی کے گھر میں گھس گئے ۔ ہر طرف سناٹا تھا ہم ہر آہٹ پر کان لگائے ہوئے تھے ۔ کوئی غیر معمولی آواز سنائی نہ دی ۔ لیکن جب ہم باہر نکلنے لگے تو کیا دیکھتے ہیں کہ جس مکان کے اندر ہم گھسے ہوئے تھے ۔ اسے گاؤں کے لوگوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ....."

"آپ لوگ اس گھر میں گھسے ہی کیوں تھے ۔"

"او ہو! دیکھ ننھے! ایسی باتوں میں ٹوکنا اچھا نہیں ہوتا ۔ بس تم یہ سمجھ لو کہ کسی نہ کسی طرح کسی نہ کسی وجہ سے کسی نہ کسی شخص کے گھر کے اندر گھس گئے تھے ۔ گھر والے سوئے ہوئے تھے ۔ پتہ نہیں گھر والوں کی نیند کیسے کھل گئی اور وہ سب گاؤں والوں کو کس وقت بلا

لائے ۰۰۰۰ اتنے آدمیوں کا اجتماع دیکھ کر ہم بہت گھبرا گئے۔ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہے۔ سوچتے تھے کیونکر صحیح و سالم باہر نکلیں۔ کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ پھر یہ بھی کھٹکا لگا ہوا تھا کہ یہیں پڑے پڑے صبح نہ ہو جائے۔ یا پھر وہ لوگ کہیں سے پولیس ہی کو نہ بلا لائیں۔ چنانچہ ہم دونوں نے مشورہ کیا۔ اور ایک دوسرے کی پیٹھ کی طرف پشت کر کے باہر نکلے تو دیکھا کہ وسیع صحن اور گلی میں آدمی ہی آدمی کھڑے ہیں۔ لاٹھیاں ہمارے ہاتھوں میں تھیں۔ بس ہم نے لاٹھیاں چلانی شروع کر دیں۔ ہماری جان پر بنی ہوئی تھی۔ اس قدر جانکاہی سے ہم نے آج تک لاٹھی نہیں گھمائی تھی لوگوں میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ لاٹھیوں کی زد سے بچنے کے لیے وہ ادھر ادھر بچنے لگے ایک بھاگا تو بھگدڑ مچ گئی۔ لیکن جب ان لوگوں نے دیکھا کہ ہم تعداد میں صرف دو ہی ہیں تو پھر ان کا حوصلہ بڑھا۔ اور وہ لپک لپک کر ہمارے قریب پہنچنے کی کوشش کرنے لگے۔ ہم بھی لہو لہان ہو گئے ان کے گھیرے میں سے نکل کر جو ہم بھاگے تو آٹھ کوس تک بھاگتے ہی چلے گئے۔ تاکہ وہ لوگ گھوڑوں پر سوار ہو کر ہمیں گھیر نہ لیں ۰۰۰ مجھے میرا ایک ہی دوست میرے ہمراہ تھا۔ اگر کوئی اور شخص ہوتا تو وہیں پران تیاگ دیتا۔"

مجھے بہت تعجب ہوا۔ "کیا سارے گاؤں میں ایک بھی شخص ایسا نہ نکلا جو آپ کا مقابلہ کر سکتا؟"

"کہا بھیا! ہمارا مقابلہ کرنے کے لیے تو ان پاس پڑوس کے گاؤں میں سے بھی کوئی نہیں نکل سکتا تھا۔ ہاں اگر کہیں میرے ماموں جیسا کوئی آدمی ہوتا وہاں تو پھر ہماری دال نہیں گل سکتی تھی۔"

"کیا آپ کے ماموں بہت طاقتور شخص ہیں ۰۰۰۰"

"طاقتور؟ ۰۰۰۰ میرے ماموں اس قدر طاقتور شخص ہیں کہ ادھر ادھر کے لوگ انہیں "رب" کہتے ہیں۔ بڑا بھاری ڈیل ڈول ہے ان کا۔ قد میں تو خیر مجھ سے بھی کچھ کم ہی ہیں۔ لیکن ان کی للکار ہی ایسی زوردار ہوتی ہے کہ کسی شخص کی ہمت نہیں پڑتی کہ ان کے سامنے سر بھی اٹھا سکے ان کا علاقے بھر میں بڑا دبدبہ ہے ۰۰۰۰"

"کیا وہ کبھی چوروں کے ساتھ بھی لڑا کرتے ہیں۔ کبھی کوئی ڈاکو پکڑا انھوں نے؟"

"انھوں نے بڑے بڑے کام انجام دئے ہیں۔ تمہیں میں ان کی زندگی کا ایک چھوٹا سا بہت ہی دلچسپ واقعہ سناتا ہوں۔ ایک مرتبہ گرمیوں کے موسم میں رات کے وقت وہ گاؤں سے باہر مویشیوں کے باڑے کے پھاٹک کے قریب چارپائی ڈالے سو رہے تھے۔ ان کے سب مویشی باڑے کے اندر بند تھے۔ اتنے میں وہاں چور آنکلے اور انہیں گہری نیند میں مدہوش پا کر اندر گھس گئے۔ اور بیلوں کی ایک بہت عمدہ جوڑی نکال کر چل دیئے۔ ابھی وہ بیل ہانکتے ہوئے کوئی چالیس پچاس قدم ہی گئے ہونگے کہ دفعتاً میرے ماموں کی آنکھ کھل گئی۔ اور وہ فوراً بھانپ گئے کہ چور ان

کے مویشی لیے جا رہے ہیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے اور پکار کر بولے۔ "بھئی تم جو کوئی بھی ••• میری بات کان کھول کر سن لو •••• تم میرے مویشی تو لیے جا رہے ہو بڑی خوشی سے لیجاؤ۔ لیکن اتنی بات یاد رہے کہ تم انہیں جہاں کہیں بھی لیجاؤ گے کل کے دن کے اندر اندر اگر میں اپنے مویشی واپس نہ لے آؤں تو میں اپنے باپ کا بیٹا نہیں ••••اور یہ بھی سن لو کہ میرا نام دسوندھا سنگھ ہے

وہ آدمی کچھ دیر تک چپ چاپ کھڑے مشورہ کرتے رہے۔ پھر ان میں سے ایک شخص بلند آواز میں بولا۔ دسوندھا سنگھ سردار! ہمیں معلوم نہیں تھا کہ یہ تمہارے بیل ہیں۔ نہ ہمیں یہ معلوم تھا کہ چارپائی پر تم ہی سوئے پڑے ہو۔ ہم نے تمہارا نام سن رکھا ہے۔ اس لیے ہم یہ بیل اسی جگہ چھوڑے جاتے ہیں! چنانچہ انھوں نے دونوں بیل باڑے کی طرف ہانک دیئے اور خود اپنی راہ پر روانہ ہو گئے۔"

مجھے اس کی باتیں سننے میں بڑا مزا آ رہا تھا۔ خاموش رات میں سانڈنی کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹیوں کی ٹن ٹن میں اس کی گونجتی ہوئی آواز ایک خاص کشش رکھتی تھی میں اس سے کوئی بات دریافت کرنے ہی لگا تھا کہ ایک بڑے زور کی پھنکار سنائی دی۔ دیکھا تو پرے ایک اونچی سی جگہ پر ایک پھن دار سانپ پھن اٹھائے لہرا رہا ہے۔

میرے جسم میں بجلی کی ایک رو سی دوڑ گئی۔ جسا سنگھ نے سانڈنی روک لی۔

کچھ دیر تک وہ سانپ کی طرف دیکھتا رہا۔ "یہ سانپوں کا راجہ "ناگ" ہے"۔

پھر اس نے مجھے سانڈنی پر بیٹھے رہنے کی ہدایت کی اور خود نیچے اتر گیا۔ سانپ ابھی تک پھن اٹھائے لہرا رہا تھا۔ جسا سنگھ نے کندھے سے چادر اتار کر بائیں ہاتھ میں پکڑ لی اور داہنے ہاتھ میں لاٹھی لیکر وہ آگے بڑھا۔ وہ پھونک پھونک کر قدم رکھ رہا تھا۔ اس وقت وہ ایک اصیل مرغ کی طرح چوکنا ہو رہا تھا۔ اس کی گھنی بھوؤں تلے اس کی تیز آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنا لوہے کا کڑا کلائی سے پیچھے ہٹا کر بازو پر پھنسا لیا۔ سانپ کے قریب پہنچکر وہ رک گیا اور سانپ کی نظروں سے نظریں ملا کر کھڑا ہو گیا۔

میں ڈر گیا۔ میں نے اسے آواز دیکر واپس چلے آنے کے لیے کہا۔ لیکن اس نے میری طرف دیکھے بغیر چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ اور خود سانپ کے اور بھی نزدیک چلا گیا۔

میں نے ادھر ادھر نظریں دوڑا کر دیکھا کوئی آدمی، جانور یا پرندہ نظر نہیں آتا تھا۔ چاند کی روشنی اب کچھ تیز ہو گئی تھی۔ ببول کے درخت چپ چاپ کھڑے تھے۔ ان کی شاخوں کی نازک سے نازک کونپلیں تک ساکن تھیں۔ وہ ایسی بے اعتنائی کے ساتھ کھڑے تھے جیسے انہیں اس بات سے دور کا بھی تعلق نہ ہو۔ اس سنسان مقام پر انسان اور ناگ کا مقابلہ میرے لیے ایک نئی اور عجیب شے تھی۔ مجھے یقین تھا کہ سانپ دھوکے سے جسا سنگھ کی ننگی ٹانگ پر دانت مارے گا۔

اور وہ اسی وقت تڑپ تڑپ کر مرجائے گا۔ میرا حلق خشک ہو رہا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ واپس چلاآئے۔ لیکن وہ میری بات سنتا ہی کب تھا۔ اب وہ عورت بھی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔ ورنہ میں بھاگ کر اسے ہی بلالاتا وہ تو اسے روک سکتی تھی۔

جسا سنگھ کے لبوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ وہ اس وقت ایک چنچل بچے کی طرح ضدی اور کھلنڈرا دکھائی دے رہا تھا۔ سانپ کے قریب کھڑے ہو کر وہ اچک کر اپنا تہبند اس کے پھن کے قریب ہلانے لگا۔ سانپ نے بھی پھن بڑھا بڑھا کر دو تین مرتبہ اسے کاٹنے کی کوشش کی۔ ایک مرتبہ جو اس نے ذرا بڑھ کر چادر اس کے قریب کی تو نڈر سانپ اچھل کر چادر سے لپٹ گیا۔ جسا سنگھ نے چادر زمین پر پھینک کر اسے لاٹھی سے پیٹنا شروع کیا۔ ایک لمحہ کے لیے سانپ اس کے پاؤں کے قریب دکھائی دیا پھر وہ بھاگ نکلا۔ جسا سنگ بھی اچھل کر اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ پھر وہ ہموار ریتلی زمین پر ایک دوسرے کے پیچھے جاگے۔ سانپ پلٹ پلٹ کر اس پر حملے کرتا تھا تھوڑی ہی دیر میں وہ بہت دور نکل گئے جسا سنگھ کی لاٹھی بار بار ہوا میں بلند ہوتی تھی۔ اور پھر دفعتاً جسا سنگھ زمین پر گر پڑا.... اٹھا اور پھر گر پڑا.... میرا دھڑکتا ہوا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ شاید وہ عورت جس سے وہ تھوڑی دیر پہلے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ ابھی تک درخت کے تنے کے ساتھ لگی ہو... جسا سنگھ پھر اٹھ کھڑا ہوا۔ اور پھر بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا میرے قریب آیا۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

"کیا سانپ نے آپ کو کاٹ کھایا تھا"۔

"نہیں تو" وہ ہنس کر بولا "وہاں گیلی زمین تھی۔ میرا پاؤں رپٹ گیا۔ دیکھو یہ میرا کچھا بھی کیچڑ میں خراب ہو گیا... گر کر میں اٹھنے لگا تو پھر گر گیا...."

"تو سانپ بھاگ گیا؟"

"بھئی نہیں سانپ کو بھاگنے بھی دیتا میں۔ تم جانتے نہیں اگر یہ سانپ ایک مرتبہ زخمی ہو کر بچ نکلے تو اپنے دشمن سے انتقام ضرور لیتا ہے۔ اسی لیے میں اس کے پیچھے بھاگا تھا۔ اب تو میں نے اس کا سر اچھی طرح کچل کر رکھ دیا ہے.... آؤ بچے اترو۔ تمہیں سانپ دکھالائیں..."

جب ہم مرے ہوئے سانپ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ کم از کم چھ ہاتھ لمبا سانپ تھا۔ پیٹھ بالکل سیاہ تھی۔ پیٹ سفیدی مائل تھا۔ بل کھایا ہوا مردہ سانپ اب بھی اس قدر خوفناک دکھائی دیتا تھا کہ اس کے نزدیک جانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔

اس بات کی مزید تسلی کر لینے کے بعد کہ سانپ واقعی قطعاً مر چکا ہے۔ ہم واپس آکر سانڈنی پر سوار ہو گئے۔

میں نے زندگی میں اس قسم کے سنسنی خیز واقعات کم ہی دیکھے تھے۔ مجھے ابھی تک پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ جسا سنگھ کی جسارت احمقانہ حد سے زیادہ بڑھ گئی تھی۔ لیکن وہ پورے وثوق کے

ساتھ نیچے اترا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ سانپ کو مار ڈالے گا۔ لیکن میں رہ رہ کر سوچ رہا تھا کہ اگر کہیں سانپ جسا سنگھ کو کاٹ ہی کھاتا تو کیا ہوتا۔

جسا سنگھ نے سانڈنی کو للکار کر ہانکتے ہوئے کہا۔ یہ سانپ بہت ظالم ہوتا ہے یہ گائے کا تھن منہ میں لیکر دودھ پی جاتا ہے۔ اور کبھی کبھی یہ انسان ذات کا دشمن بن بیٹھتا ہے۔ اس وقت اس کی کارستانیاں بہت بڑھ جاتی ہیں۔ جو آدمی دکھائی دے اسے کاٹنے سے نہیں چوکتا۔ ایسا سانپ بہت ہی خطرناک ہوتا ہے۔ اور پھر سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ جانور بھی چھوٹا سا ہوتا ہے اور ہے بہت چالاک اور مکار اس کو مار ڈالنا بھی آسان نہیں۔ بس ایسے سانپ سے واہگورو۔ ہی بچائے"۔

اسی طرح باتیں کرتے ہوئے چلے جا رہے تھے کہ جسا سنگھ نے کہا۔ "بولو یہ سامنے تمہارا ہی گاؤں ہے نا"۔

میں اس کی باتوں میں اس قدر مگن تھا کہ مجھے ادھر ادھر کا کچھ خیال ہی نہ رہا تھا اب ہم گاؤں کے قبرستان کے قریب سے گذر رہے تھے۔ جھڑبیریوں کے بیچ میں ابھری ابھری قبریں چاندنی رات میں اور بھی زیادہ بھیانک دکھائی دے رہی تھیں۔ سامنے نیم کے درختوں کے تلے چماروں کا کنواں بھی نظر آرہا تھا۔ کنوئیں کی چرخی تاریکی میں کسی نقاب پوش آدمی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ گاؤں سے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر تھے جہاں دن کے وقت مرغیاں اور ان کے ننھے ننھے چوزے پنجوں سے زمین کریدتے پھرا کرتے تھے۔ پرے چھوٹے چھوٹے درختوں کا جھنڈ تھا جو ایسے دکھائی دیتے تھے۔ جیسے چور گاؤں میں گھسنے سے پہلے آپس میں صلاح مشورہ کر رہے ہوں۔

جب ہم گاؤں میں پہنچ گئے تو گاؤں کے عین سرے پر بنے ہوئے رہٹ کے قریب جسا سنگھ نے اپنی سانڈنی بٹھا دی میری سائیکل اتاری پھر خود اترا اور مجھے بھی اتارا۔ میری گٹھڑی میرے حوالے کر دی۔

گاؤں پر اس وقت سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کوئی متنفس دکھائی نہ دیتا تھا۔ آدھی رات کے قریب گزر چکی تھی۔ سب لوگ اپنے کچے مکانوں کی چھتوں پر پڑے سو رہے تھے۔ صرف گاؤں کے دوسرے سرے سے کتوں کے بھونکنے کی ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔

اس نے چلتے ہوئے رہٹ سے پانی پیا۔ پانی کی بوندیں اس کی مونچھوں سے نیچے کی طرف لٹک کر لرزنے لگیں۔ میں نے سائیکل قریب کی ایک دیوار کے ساتھ لگا کر کھڑی کر دی۔ گٹھڑی بھی اسی پر رکھ دی جسا سنگھ نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ میں اس سے اس قدر مانوس ہو چکا تھا جیسے ہم برسوں کے واقف ہوں میں ایسے محسوس کر رہا تھا کہ آئندہ ہم زندگی بھر ساتھ ساتھ رہیں گے۔ اس نے اپنے بے تکلفانہ لہجے میں پوچھا۔ "کہو اب تو گھر پہنچ جاؤ گے۔ راستہ تو نہ بھولو گے؟"

میں نے شرما کر کہا "جی نہیں، اب میں پہنچ جاؤں گا۔"

میں اس کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سمجھ نہ سکا کہ اس جذبے کا اظہار کیونکر کروں۔ میں اس کشمکش ہی میں تھا کہ اس نے پگڑی کے شملے سے مونچھیں اور داڑھی پونچھتے ہوئے کہا۔
"اچھا اب تم گھر کو جاؤ۔ میں بھی جاتا ہوں۔"

میں نے اس کی پگڑی کے شملوں کی طرف دیکھا۔ ایک کان کے قریب لٹک رہا تھا اور دوسرا ہوا میں بلند پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ میں نے سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لیا۔ وہ ایک بھاری ستون کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ اس نے اپنے دونوں کاٹھ کے سے ہاتھوں میں میرا کمزور اور چھوٹا سا ہاتھ تھام کر مصافحہ کیا۔ اس طرح اس قدر بڑے آدمی سے ہاتھ ملانے میں مجھے فخر محسوس ہوا۔ مجھے یہ خواب میں بھی خیال نہ تھا کہ وہ ایک دم واپس جانے پر تل جائے گا۔ میں نے کہا
"آیئے ہمارے گھر چلئے۔ گھر کے لوگ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہونگے۔"

یہ بات سن کر اس نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔ اس کی ہنسی رکنے ہی میں نہ آتی تھی۔ اس نے انگلی سے پرے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "کیا کہتے ہو! ••• مجھے دیکھ کر خوش ہونگے! •••ہو ہا ہا ہا۔"

میں نے اس کی انگلی پکڑ کر اپنے ساتھ لیجانے کے لیے اصرار کیا تو پھر وہ کہنے لگا۔ "آج مجھے بہت ضروری کام ہے۔ اس لیے تم جاؤ۔ میں پھر کبھی آؤنگا۔ تمہارا نام تو میں جانتا ہی ہوں•••"
میں نے انگلی اٹھا کر کہا ضرور۔"
"ضرور" وہ ہنسنے لگا۔

اس کے بعد وہ اپنی کلہاڑی سنبھالتا ہوا سانڈنی پر سوار ہوا میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ افق میں غائب ہو گیا۔۔۔ گرد کے بادل اڑتے رہ گئے لیکن وہ پھر کبھی نہیں آیا •••• کبھی نہیں۔

(مشمولہ: "تار و پود" سن اشاعت ۱۹۴۴ء)

"سوشیو پولیٹیکل کہانیاں یا ہیئت کے تجربات کی کہانیاں تو فوراً نقادوں کی نظروں میں آجاتی ہیں اور اُن پر وہ خوب اچھی طرح لکھ بھی سکتے ہیں بلکہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ تخلیقات کے صرف نام رہ جاتے ہیں باقی تمام تر نقاد کے علم و فضل کی نمائش ہوتی ہے یا پھر ادبی، نظریاتی اختلافات کا بکھان۔ اس وجہ سے ایک عام سی فضا یہ بن گئی ہے کہ ایسی کہانیاں چھپتی ہیں، پڑھی جاتی ہیں اور پھر جلد ہی بھلا دی جاتی ہیں۔
آج ہمارے افسانہ نگاروں کو موضوعات اور اسالیب کے تنوع کا احساس تو ہے اور وہ کوشش بھی کر رہے ہیں، لیکن ابھی وہ رنگا رنگی اور دلکشی افسانوں میں نہیں آئی جس کے لئے قاری ترس رہا ہے۔ ہم جب بھی اس میں کامیاب ہوئے بلونت سنگھ ہمارے مقبول افسانہ نگاروں میں ہوں گے۔"
(انور خان۔ اقتباس بشکریہ "آجکل" دلی۔ جنوری ۱۹۹۵)

بلونت سنگھ

پہلا پتھر

○ تب شاستری اور فریسی ایک عورت کو لائے جو بدکاری میں پکڑی گئی تھی۔ اور اس کو بیچ میں کھڑی کر کے کہا۔

○ اے استاد! یہ عورت تو بدکاری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہے۔

○ موسیٰ کے قانون کے مطابق ایسی عورت کو سنگسار کرنا جائز ہے۔ سو تو اس عورت کے بارے میں کیا کہتا ہے؟

○ جب وہ اس سے پوچھتے رہے تو اس نے سیدھے ہو کر ان سے کہا؛

"تم میں سے جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ وہ پہلے اس کو پتھر مارے"

(یوحنا رسول؛ آیت ۳، ۴، ۵، ۷)

۱

رندہ ہاتھ سے رکھ کر باج سنگھ نے چوکنا تیتر کی طرح گردن دروازے سے باہر نکالی اور ایک نظر شاہی اصطبل، پر ڈالی ••••• کوئی خاص چیز دکھائی نہیں دی۔ حالانکہ اسے شبہ یہی ہوا تھا کہ گھکی بڑے دروازے میں کھڑی کسی کو آواز دے رہی تھی۔ وہ اس خیال سے اٹھا تھا کہ اندھیرے میں گھکی کی ایک آدھ چمی لے لینا مشکل نہ ہوگا۔

شاہی اصطبل، دراصل اصطبل نہیں تھا بلکہ یہ سردار ودھاوا سنگھ کی شاندار حویلی تھی جسے باج سنگھ عرف باج اور اس کے چیلے چانٹے شاہی اصطبل کے نام سے پکارتے تھے۔ حویلی کی سب سے بڑی خوبی تھی اس کی کشادگی۔ یہ حویلی ایک بہت بڑے صندوق کے مانند تھی۔ چھت کا طول و عرض اتنا کہ پوری بارات کے لئے چارپائیاں بچھائی جا سکتی تھیں۔ بڑے بڑے ہال کمرے۔ دروازے آٹھ آٹھ فٹ اونچے۔ ان ہال کمروں میں عظیم الجثہ سردار ودھاوا سنگھ فیل پا کے باعث زخمی شیر کی طرح اینڈھ اینڈھ کر چلا کرتے تھے۔ حویلی کا ایک حصہ لیبل پرنٹنگ پریس کے لئے وقف تھا۔ اس کے علاوہ حویلی کے اندر کی جانب بڑے دالان کے گوشے میں نانک فرنیچر مارٹ کے مالک بھی سردار جی ہی تھے۔ فرنیچر کا کارخانہ یہاں تھا اور شوروم حویلی کی دوسری طرف یعنی۔

عین لب سڑک۔

باج ہیڈ مستری تھا۔ ہاتھ کی صفائی اور حرمزدگی کی چستی، کے باعث سب کارندوں کا، خواہ وہ کارخانے کے ہوں یا پریس کے، استاد سمجھا جاتا تھا۔

حویلی کے بغل میں سڑک کی جانب چند دکانیں تھیں مع مکانات کے یہ سب سردار جی کی ملکیت تھیں۔ آخر ان کے آباؤ اجداد جالندھر شہر ہی میں رہتے آئے تھے۔ اس لئے اتنی سی جائداد کا بن جانا غیر معمولی بات نہیں تھی۔

جب ۱۹۴۷ء کے آغاز میں مغربی پنجاب کے مسلمان بھائیوں نے اپنے کراڑ اور سکھ بھائیوں کا ناکہ بند کر دیا تو رفیوجیوں کی ایک بڑی تعداد مشرقی پنجاب میں آگئی۔ ان میں گھکی کا باپ دیوی داس بھی تھا۔ پیشے کے اعتبار سے وہ بنیا تھا۔ چنانچہ سردار جی نے حویلی کے بالکل بغل والی دکان اور مکان از راہ کرم اسے کرایہ پر دے ڈالا اور وہ وہاں پنساری کی دکان کرنے لگا۔ اس کی بیوی کو مسلمان بھائیوں نے ہلاک کر دیا تھا۔ لیکن اس کا اپنی تین جوان لڑکیوں سمیت صحیح سلامت نکل آنا معجزے سے کم نہیں تھا۔ ان میں سے سب سے بڑی کا نام گھکی، اس سے چھوٹی کا نام نکی اور سب سے چھوٹی کا سانولی تھا، سانولی اندھی تھی۔

گھکی خوبصورت اور بانکی لڑکی تھی۔ موقعہ پاکر سب سے پہلے باج سنگھ نے اس کی چمی لی تھی۔ بوسہ لینے کے سلسلے میں کھل جا سم سم تو باج نے کی لیکن اس کے بعد باقی لوگوں کا راستہ بھی صاف ہو گیا۔ اسمیں امیر و غریب کی تخصیص نہیں تھی۔ سردار صاحب کے بیٹے، ان بیٹوں کے دوست اور کارندے وغیرہ سب ایک آدھ چمی کی تاک میں رہتے۔ یہ بات نہیں تھی کہ ان میں سے ہر ایک کا داؤ چل ہی جاتا ہو۔ بعض تو دور ہی سے چٹخارے لینے والوں میں سے تھے۔ کیونکہ گھکی بقول لیبل کاٹنے والے چرن کے بڑی، چلتی پرچی، تھی۔ پٹھے پر ہاتھ نہیں رکھنے دیتی تھی کسی کو۔ اور تو اور خود باج سنگھ جو بڑا دیدہ دلیر اور گھسڑم گھساڑ قسم کا آدمی تھا چمی سے آگے نہ بڑھ پایا تھا، تو بھلا دوسروں کو وہ قریب کہاں پھٹکنے دیتی تھی۔

مایوس ہو کر باج سنگھ ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے کارخانے کے دروازے ہی میں کھڑا رہ گیا۔ اس کے بازو کہنیوں تک لکڑی کے برادے سے سنے ہوئے تھے۔ پینتالیس بہاریں دیکھنے کے بعد بھی اس کا بدن اکہرا اور مضبوط تھا۔ صورت گھناؤنی ہونے سے بال بال بچی تھی۔ مونچھوں کے بال جھڑبیری کے کانٹوں کی طرح ہو گئے تھے۔ ہونٹ موٹے۔ ایک آنکھ میں پھولا۔ اونٹ کے کوہان کی طرح ناک کے نتھنوں میں سے بال باہر نکل آیا کرتے تھے۔ جنہیں وہ چمٹی سے کھینچ ڈالتا۔ آج سے دس برس پہلے اس کی بیوی مر گئی۔ بیوی کے چھ مہینے بعد اس کی اکلوتی بچی بھی چل بسی۔

وہاں کھڑے کھڑے باج نے دیکھا کہ جس ہلچل کا اسے احساس ہوا تھا، بالکل بے معنی

نہیں تھی۔ کیونکہ حویلی کے یکے بعد دیگرے چار دروازوں سے پرے باہر والے برآمد میں برقی روشنی ہو رہی تھی۔ لکڑی کے چھوٹے سے پھاٹک میں سے کچھ سامان اندر لایا جا رہا تھا۔ جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ضرور کوئی نیا مہمان آیا ہے۔ جب سے مغربی پنجاب میں گڑبڑ شروع ہوئی تھی۔ سردار جی کے یہاں کافی مہمان آ رہے تھے۔ کچھ عرصہ پہلے ان کے ایک ہندو دوست اپنے بال بچوں سمیت آ گئے۔ ان کا ایک نوجوان لڑکا تھا۔ چمن۔۔ اس کی گردن مور کی سی تھی اور آنکھیں سرمیلی وہ بھی گھکی کو دلچسپی کی نظروں سے دیکھتا تھا۔ باج کے چیلے چانٹوں کا خیال تھا۔ کہ گھکی بھی اس پر مرتی تھی۔ باج کے دل میں حسد پیدا نہیں ہوا۔ وہ ان چیزوں سے بالاتر تھا۔ کہتا۔ "ارے ہمارا کیا ہے۔۔ہم نے آتے ہی گھکی کی چمیاں لے کر اسے کانی کر ڈالا۔ اب چاہے ٹنڈالاٹ بھی اس کی چمی لیا کرے ہمارے ۰۰۰۰ سے"۔ یہ کہہ کر وہ اپنی ایک ثابت اور دوسری پھولا ماری آنکھ سے سب کے چہروں کا جائزہ لیتا۔

جب چمن کے گھر والے الگ مکان لے کر رہنے لگے تو پھر بھی سردار جی کے یہاں چمن کی آمد و رفت جاری رہی۔ ادھر باج نے گھکی سے زیادہ اس کی چھوٹی بہن نکی کو اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔

دروازے میں کھڑے کھڑے پہلے تو باج کے دل میں آئی کہ جا کر نئے مہمانوں کو دیکھے۔ شاید کوئی "لنڈیا" بھی ان میں شامل ہو لیکن آج کل کام بہت آیا ہوا تھا جسے جلد از جلد ختم کرنا ضروری تھا۔ "ہٹاؤ" اس نے دل ہی دل میں کہا۔ "صبح سب کچھ سامنے آ جائے گا"۔

۲

دوسرے روز آنکھ کھلی تو باج نے جلتا پھنکتا سورج اپنی پیشانی پر چمکتا ہوا پایا۔

ادھر یہ ہڑبڑا کر اٹھا، ادھر بڑی سردارنی حسب معمول بھوری بھینس کی طرح، کدو کدو بھر چھاتیاں تھلتھلاتی، سینہ زوریاں دکھلاتی آگ جلانے کے لئے برادہ لینے کے واسطے چھاج ہاتھ میں پکڑے اس کی جانب بڑھی۔

بڑی سردارنی کے جسم کا ہر عضو اپنے نقطہ عروج تک پہنچ چکا تھا۔ یعنی جو چیز جتنی موٹی، جتنی بھدی، جتنی کشادہ ہو سکتی تھی، ہو چکی تھی، چلتی تو یوں معلوم پڑتا جیسے تنور ڈھانپنے والے چاپڑ کو پاؤں لگ گئے ہوں۔

ایسی ڈبل ڈوز سردارنی بھی سردار جی کے لئے ناکافی ثابت ہوئی۔ چنانچہ انہیں ایک چھوٹی سردارنی بھی کہیں سے اڑا کر لانی پڑی۔ لیکن جب سے ان کے فوطوں میں پانی بھر آیا تھا۔ تب سے انہوں نے سردارنیوں سے توجہ ہٹا کر ہر روز کئی کئی گھنٹے مسلسل گوربانی کے پاٹھ پر مرکوز کر دی تھی۔

موقع ملنے پر بڑی سردارنی ضرورت سے زیادہ دیر تک باج کے پاس کھڑی رہتی۔ کیونکہ

باج نہایت مسکین بن کر کئی بار کہہ چکا تھا۔ " پر وڈھی سردارنی آپ بیالیس برس کی تو نہیں دکھائی دیتیں جی! ••••••• جی! آپ تو مشکل سے تیس برس کی دکھائی دیتی ہیں"۔

اس پر بڑی سردارنی دل ہی دل میں چہک اٹھتیں اور غین (غ) کی طرح منہ بنا کر فرماتیں "ہٹ دے پراں۔ کون کہتا ہے کہ میں بیالیس برس کی ہوں"۔

اس کے بعد وہ دروازے سے کندھا بھڑائے جی کھڑی رہتیں۔ ایک ٹانگ سیدھی رکھتیں اور دوسری ٹانگ کو دھیرے دھیرے حرکت دیتی رہتیں۔ ڈھلکے ہوئے پپوٹوں تلے دبی ہوئی پتلیاں باج کے چہرے پر جمائے رکھتیں*

باج دل ہی دل میں سوچتا کہ گھگی کی کمر تو بڑی سردارنی کی پنڈلی سے بھی پتلی ہوگی۔

بالآخر جب سردارنی ٹوٹے ہوئے چھاج میں برادہ بھر کر لوٹتیں۔ تو ان کے پچھواڑے کا نظارہ دیکھ کر باج کے منہ سے بے اختیار نکل گیا" بلے بلے" پھر اپنے ایک نوجوان ساتھی بونگے سے مخاطب ہو کر بولا " کیوں او بونگیا! اگر سردار جی پھیل بے جنجیر ہیں تو سردارنی بھی وہ چٹان ہے جو جتنی جمین سے باہر ہے اس سے چار گناہ جمین کے اندر دھنسی ہوئی ہے"۔

یہ کہہ کر اس نے بھلاہ کی داتن منہ میں ڈالی تو اس کی چرمراہٹ سے اس کا بدصورت چہرہ اور زیادہ بھدا ہو گیا۔

بونگے نے جواب دیا۔ " ابے تو سردار جی کو کیا سمجھتا ہے۔ اگر سردارنی چار گنا زمین کے اندر ہے تو سردار جی دس گنا جمین میں دھنسے ہیں"۔

باج نے بیٹھے بیٹھے مریل بونگے کو لات رسید کرتے ہوئے کہا۔ " اوئے چل اوئے مٹوں دیا متراڑا" ۔ جو بات یاد آئی تو پھر بولا۔ " پر بونگیا گھگی کی کمر تو سردارنی کی پنڈلی سے بھی کم موٹی ہوگی •••••••••"

" تو پھر کیا؟"

" نا، نا •••••• سوچو بھلا اتنی پتلی کمر ••••• بہت پتلی کمر ہے جار! اتنا ناجک لک"۔

" او ہئی! " بونگے نے مشفقانہ انداز میں کہنا شروع کیا۔ " عورت کی کمر میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ مرد کی ساری طاقت چھاتی میں اور عورت کی کمر میں ہوتی ہے"۔

" اچھا!! " گھاگ باج نے گال کے اندر زبان گھمائی۔

اسی اثنا میں چمن بھی ادھر آنکلا۔ وہ ہر وقت چہکتا رہتا تھا۔ باچھوں میں سے ہنسی یوں پھوٹی پڑتی تھی جیسے وہ ریوڑیاں کھا رہا ہو۔ چلتا تو لہرا کے۔ بات کرتا تو بل کھا کے۔

بونگے نے کہا۔ " لے بھئی! گھنیا جی تو آگئے"۔

" گوپی بھی آتی ہی ہوگی" ۔ باج نے چھدرے دانتوں کی نمائش کی اور منہ سے ٹپکتی ہوئی رال کو بمشکل روکا۔

بونگے نے پہلے تو چمن کو دل پھینک انداز سے دیکھا اور پھر ایک آنکھ بند کر کے دوسری آنکھ باج کی بغیر پھولے والی آنکھ سے ملائی اور گھی میں ڈوبی ہوئی آواز میں بولا۔ "ہمارا جیہ لونڈیا بھی گوپی سے کم نمکین نہیں ہے"۔

باج نے ایک اور لات رسید کی۔ "بڑا ٹھرکی ہے تو۔" بونگے نے بھاؤ بتا کر گانا شروع کیا "اوئے بھگت لبوب کبیر بھی تو فرما گئے ہیں کہ اوئے کپا منڈارن در گا..........."

عین اس وقت چھوٹی سردارنی بھی کولھے مٹکاتی دھم دھم کرتی دروازے سے نکل کر صحن میں آپہنچیں کہنے کو تو وہ چھوٹی سردارنی تھیں لیکن ڈیل ڈول کے لحاظ سے اگر بڑی جیس تھیں تو وہ انیس۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دھنئے نے منوں روئی دھنک کر ہوا میں اڑادی ہو۔ البتہ نقوش تیکھے اتھے۔ رنگ نکھرا ہوا تھا چہرہ چکنا چپڑا۔ اگلے دو دانتوں میں سونے کی امیخیں۔

مشہور تھا کہ وہ سردارجی کی بیاہتا نہیں تھیں۔ بقول باج کچھ جیر جبر، معاملہ تھا۔ باوجود موٹاپے کے چھوٹی سردارنی کی بوٹی بوٹی تھر کتی تھی۔ بڑی سردارنی کو، چل چل چنبیلی باغ میں تجھے میوہ.......الخ" بنادیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ بڑی سردارنی کے سامنے لونڈے لونڈیاں آپس میں ہنسی ٹھٹھول کرنے سے کتراتی تھیں۔ لیکن چھوٹی سردارنی کے سامنے کھلے بندوں چھیڑ چھاڑ کا بازار گرم رہتا۔ گرما گرمی میں چھوٹی سردارنی کی کمر میں بھی ایک آدھ چٹکی بھر لی جاتی جس پر وہ نوخیز لڑکی کے مانند کلبلاتی بل کھاتی اور کھلکھلاتی تھیں۔ وہ رنگین محفلوں کی جان تھیں۔ ان کی عمر اگرچہ پینتیس سے تجاوز کر چکی تھی، تاہم سردارجی اب بھی ان کی نگرانی کرتے تھے۔ کیونکہ چھوٹی سردارنی چلتی تو جھمکڑے کے ساتھ، بنتی تو جھمکڑے کے ساتھ۔ اس کی بے تکلفانہ محفلوں میں آنکھیں لڑانے، چٹکیاں لینے اور ہائے وائے کرنے کے مواقع بڑی آسانی سے فراہم ہو جاتے تھے۔ شاذو نادر وہ ایک آدھ بدتمیزی پر چیں بر جبیں بھی ہو جاتیں تاکہ کہنے کو ہو جائے کہ وہ نوجوانوں پر کڑی نگاہ رکھتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر جبکہ وہ روٹھ جاتیں تو سب لڑکے اور لڑکیاں انھیں منانے لگتے۔ ان کے بدن کو سہلایا جاتا۔ ان سے لپٹ لپٹ کر خوشامدیں کی جاتیں آخر کار وہ من جاتیں۔

چنانچہ اب جو وہ صحن میں داخل ہوئیں تو گویا نسیم سحری کی طرح آئیں اور اپنے ہمرکاب نہ صرف بوئے چمن لائیں بلکہ اپنے اوٹ میں میں نرگس، نسرین اور گلاب وغیرہ بھی لائیں یعنی کھگی۔ نکی اور سانولی اور دیگر لڑکیاں ان کے پیچھے چھپی چھپی آرہی تھیں۔ مقصود اس سے حاضرین کو تعجب انگیز مسرت بہم پہنچانا تھا۔ وہی بات ہوئی کہ دفعتاً "اوئے" کے شور سے فضا گونج اٹھی اور کچے کنوارے قہقہوں کی مسلسل موسیقی سے سارا صحن رسما گیا۔

ان سب سے دور، سڑک والے کمرے میں کسی جٹا جوٹ سنیاسی کی طرح پاٹھ کرتے ہوئے سردارجی کے کان بھی ان آوازوں سے تھر تھرائے، پیشانی کے خطوط گہرے ہو گئے۔ انہوں نے جلدی سے اپنے بڑے بڑے دانتوں پر دونوں ہونٹ پھسلا کر بے چینی سے پہلو بدلا اور غرا کر

کہا؛

"باہگورو نام جہاج ہے، جو چڑھے سو اترے پار"۔

۳

داتن کی آخری منزل پر پہنچ کر باج نے بڑا کنستر اٹھایا اور صحن کے پرلے گوشے میں دستی نلکے کے قریب پہنچا۔

اب فضاء نسبتاً پر سکون تھی۔ کچھ لوگ تو چھوٹی سردارنی کو گھیرے تھے باقی اپنے اپنے مشاغل میں محو تھے۔

کنستر نلکے کے نیچے رکھ کر باج نے دستی کے دو چار ہاتھ ہی چلائے ہوں گے کہ سامنے سے نکی جلد جلد قدم اٹھاتی ہوئی اس کی جانب آئی اور آتے ہی بولی "کنستر اٹھاؤ تو ••••••••"

باج کی خوشی کا بھلا کیا ٹھکانہ تھا۔ داتن چباتے چباتے اس کا منہ رک گیا۔ آنکھوں کے گوشے شرارت اور حرمزدگی کے باعث سمٹ گئے۔ "نی کڑیئے کی گل اے"۔

"اے دیکھ گل ول کچھ نہیں۔ کنستر ہٹا جھٹ پٹ"۔

باج نے دانت پیس کر ہاتھ پھینکا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ نکی پہلے ہی سے تیار تھی۔ جھپ سے پیچھے ہٹ کر بدن چرا گئی اور نیم معشوقانہ انداز سے چلا کر بولی۔ "ہم کیا کہہ رہے ہیں کنستر ہٹا، نا"۔

"اری کنستر سے کیا بیر ہے ••••••••ہماری ہر چیج سے بد کتی ہو"۔

"پانی پئیں گے"۔

باج نے کنستر ہٹا دیا۔ "لو جانی پیو اور جیو۔ جیو اور پیو"۔

نکی نے نل کے نیچے ہاتھ رکھ دیا اور قدرے انتظار کے بعد انجن کی سیٹی کی سی آواز میں چلائی۔ "اے ہے ••••••دستی ہلاؤ"۔

باج نے صوفیانہ رمز کے ساتھ جواب دیا۔ "تم ہی ہلاؤ نا دستی •••••"

"دیکھو تنگ مت کرو"۔

"اری نام نکی ہے تو اس کا یہ متبل تو نہیں کہ تو سچ مچ نکی (چھوٹی) ہے"۔

چھوٹی نہیں تو کیا بڑی ہوں"۔ نکی نے نچلا ہونٹ ڈھیلا چھوڑ کر شکایت آمیز نگاہ اس پر ڈالی۔

اب باج نے بڑی فراخ دلانہ ہنسی ہنس کر دستی ہلانا شروع کی۔

پانی پی کر نکی بھاگنے لگی تو باج نے فوراً اس کی کلائی دبوچ کر ہلکا سا مروڑ دے دیا۔

"اوئی"۔

"کیا ہے؟"
"میری کلائی ٹوٹ جائے گی"۔
"یہاں دل جو ٹوٹا پڑا ہے"۔
"چھوڑ نا! کوئی دیکھ لے گا"۔
"اری کبھی ہم سے بھی دو بات کر لیا کر"۔
"کہانا، کوئی دیکھ لے گا"۔
"تو پھر آئے گی نا ہمارے پاس"۔
"میں نہیں جانتی"۔
ایک اور مروڑا۔ نکی کو واقعی سخت تکلیف ہو رہی تھی۔ جان چھڑانے کے لئے بولی۔ "اچھا اچھا آؤں گی"۔
"پکا وعدہ"۔
"ہاں"۔
"مار ہاتھ پر ہاتھ"۔
ہاتھ پر ہاتھ مارا گیا۔
"دیکھ! اب کلائی چھوڑے دیتا ہوں۔ پر ایک شرط ہے .... تو بھاگے گی نہیں ...."
"اچھا نہیں بھاگوں گی۔ چھوڑ اب کوئی دیکھ لے گا"۔
"بس دو ملٹ بات کر لے ہم سے۔ جادر کھیو جو ہمیں دھوکا دیا تو بانس پر لٹکا دوں گا"۔
ہاتھ چھوٹنے پر نکی ننھی سی خوش وضع ناک چڑھائے اور ابرو پہ بل ڈالے نیم رضامندی سے رکی رہی اور جبکہ باج اس نظارے سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ وہ ٹھمک کر بولی۔
"کہہ اب"۔
"بات کرتی ہو کہ ڈھیلے مارتی ہو"۔
"اب جو تم کہو۔ جلدی سے بات کہہ ڈالو۔ اتا بخت (وقت) نہیں ہے"۔
"بخت (وقت) نہیں ہے۔ کیا کسی جار سے ملنے جانا ہے"۔
"دھت۔ کوئی سن لے گا۔ تم بڑے ......"
"بڑے کیا؟"
"بدماس ہو"۔
ہائے سریپ جادی ...... کبھی کبھار بدماس سے بھی ایک آدھ بات کر لیا کر ..... اچھا نکی یہ بتا کہ تیری عمر کتی ہے"۔

"سولہ برس"۔
"کیسی میٹھی عمر ہے"۔
"ہوگی۔ بس جائیں اب"۔
"گھکی کی بھلا کیا عمر ہوگی؟"
"مجھ سے ڈیڑھ دو سال بڑی ہوگی"۔
"اور سانولی ...."
"چودہ کی ہوگی"۔
"لیکن نکی تو چودہ کی بھی نہیں دکھتی"۔
"دکھتی کیسے نہیں"۔
"جرا نجیک (نزدیک) آنا! دیکھوں"۔
"ہٹ"۔
"آج کل مستی جھاڑ رہی ہو۔ پہلے تو گھکی ہی تھی۔ اب تم نے بھی پر نکال لئے ہیں .... تم کیا اب تو سانولی بھی رنگ دکھلا رہی ہے"۔
"اے دیکھ سانولی کو کچھ مت کہیو۔ وہ بچاری اندھی ہے۔ اس سے بری بھلی بات مت کرنا"۔
"اری نکی جوانی بن بولے بات کرتی ہے۔ اس کو اندھی کہتی ہو۔ کھد مجا اڑاتی ہو ...... لو وہ رہی سانولی۔ چپ چاپ دروجے میں بیٹھی ہے"۔
صحن کے دوسرے کونے میں دروازے کی دہلیز پر اندھی سانولی الگ تھلگ چپ چاپ بیٹھی تھی۔
نکی نے ادھر دیکھا تو باج نے پوچھا۔ "سانولی جنم کی اندھی ہے کیا؟"
"نہیں"۔
"تو کیسے ہوئی اندھی"۔
"دیکھو بیکار باتیں کرتے ہو۔ ہم جاتے ہیں"۔
"ٹھہرنا جرا۔ بتا تو دے"۔ باج نے اصرار کیا۔ وہ قرب یار کو طول دینے کے لئے بے معنی باتیں کئے جا رہا تھا۔
"بھئی ہم کچھ نہیں جانتے۔ لالہ (باپ) کہتا ہے کہ وہ بچپن میں اندھی ہو گئی تھی۔ اب میں کیا جانوں۔ لو ہم چلے"۔
"ارے ہیں دردجے میں سانولی کے پاس کون کھڑا ہے؟"
نکی چلتے چلتے رک گئی۔ "ہم نہیں جانتے"۔

باج یاچھوں کو خوب کھینچ کر ہنسا۔ "تجھے معلوم نہیں .... کبھی تو تیرے جار ہیں

"دیکھ ہم سے بکواس مت کر .... ہم اسے کیا جانیں۔ رات ہی تو آیا ہے"۔
"ارے رات والا .... اچھا اچھا یاد آیا۔ میں نے اس وقت اندر سے سر نکالا۔ بچ
نکی میں سمجھا تم ہو .... لیکن نکی تم ...."
نکی نے جھنجلا کر قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔ "لو ہم چلے"۔
اس پر باج نے زور سے ناک صاف کی اور دستی ہلانے لگا۔

۴

لڈو سرپٹ بھاگتا ہوا آیا اور کارخانے کے دروازے کے دونوں پٹ اس قدر دھماکے کے ساتھ کھولے کہ اندر کام کرتے ہوئے باج اور اس کے ساتھیوں کے ہاتھ رک گئے۔ وہ قدرے حیران ہو کر اس کا منہ تکنے لگے کہ لڈو لیبلوں کی گڈیاں باندھنی چھوڑ کر بے وقت یہاں کیسے آن ٹپکا

اندر پہنچ کر خود لڈو کو اس بات کا احساس ہوا کہ اس قدر دھماکے سے اپنی آمد کے جواز کے لئے جو مواد اس کے پاس ہے وہ کافی اور مناسب ہے بھی یا نہیں۔ بہر حال اس نے ہانپتے ہوئے گردن گھما کر سب کی طرف دیکھا اور بولا۔ "جارو! آج بڑی مجے کی بات دیکھنے میں آئی"۔
مزے کی بات!! ...... اس وقت گیارہ بجنے کو تھے۔ کاریگر مسلسل کام کر رہے تھے۔ اس لئے وہ مزے کی بات سننے کے موڈ میں تھے۔ ادھر باج سنگھ نے صبح باسی مٹھے سے سر دھویا تھا۔ اس کے بالوں سے ابھی سڑی لسی کی بساند دور نہیں ہوئی تھی۔ اس نے بھی موقع غنیمت جانا کہ مزے کی بات سننے کے ساتھ ساتھ وہ بالوں میں کنگھا کر لے گا۔ اس طرح جب اس کے بالوں کے اندر تک ہوا پہنچے گی تو بال سوکھنے کے ساتھ بساند بھی دور ہو جائے گی۔ چنانچہ اس نے اپنا بھاؤڑا سا کنگھا اٹھایا اور اسے داڑھی میں اڑس کر بولا،
"ابے لڈو ماؤں کے متراڑ، جب سے تو پیدا ہوا ہے۔ آج تک تو نے کوئی مجے دار بات نہیں سنائی لیکن آج تو پینڈکی کو بھی ڑکام والی مثال تجھ پر لاگو ہوتی ہے ...... اچھا بول بیٹے۔ بجورے

حالات موافق پا کر باقی کاریگر بھی پنڈے کھجاتے ہوئے لڈو کے قریب آگئے۔ ان میں مونوں، (منڈے ہوئے سروالوں) نے بیڑیاں جلا کر دانتوں میں داب لیں۔
اس غیر متوقع خوش آمدید سے لڈو کی جان میں جان آئی۔ اس نے کھکھیا کر ایک بیڑی طلب کی ..... جو قدرے ناک بھوں چڑھانے کے بعد دے دی گئی۔ اب لڈو نے بڑے اہتمام کے ساتھ بیڑی کو جلایا یہ توقف حاضرین کے لئے ناقابل برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ باج نے دولتی

رسید کرنے کے انداز سے پاؤں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا۔ "اوئے بھین کے بیگن جلدی سے اگل ڈال۔ سالے،ہم تیری بے بے کے نوکر تو نہیں ہیں کہ بیٹھے منہ تکتے رہیں تیرا.........."

"جار آج بڑے مجے کی بات ہوئی" ۔ لڈو نے اس طرح بات شروع کی جیسے ابلتے ہوئے پانی کی کیتلی کا ڈھکنا بھک سے اڑ جائے۔ "آج صبح جب باج، نکی سے...... باج نکی سے......

باج نے خونخوار تیور بنا کر کہا۔ "اوئے تیری،بہن کو چور لے جائیں۔.....ہماری ہی بات ملی سنانے کو........."

"نئیں نئیں جی" ۔ لڈو نے خالص پنجابی لہجے میں حلق سے گھسا کر آواز نکالی۔ "پادشاہو! آپ کی بات نئیں ہے۔ وہ تو گھکی کی بات ہے"۔

ایک کاریگر نے اشارہ کر کے ساتھیوں سے کہا۔ "یہ چونگا بھی ٹھرکی ہے اور گھکی پر ٹھرک جھاڑنے والوں میں شامل ہے،ہاں تو برخوردار کیا بات ہے گھکی کی......"

"اوجی جب چھوٹی سردارنی اکھبار میں لگی ہوئی ماسٹر تاراسنگھ کی تصویر سب کو دکھال رہی تھیں تو گھکی اور چمن کی نجریں ملیں....میں دیکھ رہا تھا چپکے سے"۔

"تو تو دیکھا ہی کرتا ہے گھکی کو۔ پر سالے چمن نے جتنی چمیاں لی ہیں تو نے اتی ٹھوکریں نہ کھائی ہوں گی گھکی کی"۔

اس پر لڈو نے روٹھنے کے انداز سے منہ بسورا تو کسی نے ہمدردی جتائی۔ "بھئی" ایسا مت کہو بچارے کو۔ گھکی کی ٹھوکروں میں کیا کم مجا ہے۔ کئیوں نے تو ٹھوکر بھی نہ کھائی ہوگی اس کی......ہاں تو بول بیٹا بول........بول،بجورے بول"۔

"بس پھر کیا تھا۔ آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارے ہوئے،ابرو چلے۔ اور پھر گھکی بڑی مسومی کے ساتھ اٹھ کر ٹھمک ٹھمک چل دی"۔

"کہاں چھت کو"۔

ابے نہیں.....اس بکت تو وہ اپنے گھر کو گئی۔ تھوڑی دیر بعد چمن نے کہا کہ جرا پکھانے جاؤں گا۔ سردارے (سردار جی کا بڑا لڑکا) نے کھانس کر کہا۔ بئی جلدی آنا۔ نہ جانے پکھانے میں بند کیا کرتے ہو۔ اس پر چمن بڑی میٹھی ہنسی ہنستا ہوا پچھلے کمرے میں چلا گیا،جہاں سے کہ چھت کو سیڑھیاں جاتی ہیں"۔

ایک دو نے جماہی لے کر کہا۔ "ابے لڈو کے سگھے۔ یہ سب پرانی باتیں ہیں،روج کا قصہ ہے......"

"ابے سن تو" ۔ لڈو نے سرزنش کی۔ "سب کی نجر بچا کر میں بھی گیا کہ سیڑھیوں کا دروجہ بند ہے۔ بس بئی یہ دیکھ کر میری پھونک نکل گئی"۔

باج ہنسا۔ "سالے تیری پھونک تو اچھی طرح نکلنی چاہیئے پھول کے گبارہ ہو رہا ہے"۔

لڈو نے سنی ان سنی کرتے ہوئے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ دروجہ کے پاس ہی کھڑے ہوں گے، مگر کوئی آواج سنائی نہیں دی۔ دراڑ میں سے جھانکا تو چھت پر بھی کوئی صورت نہیں دکھائی دی۔ پھر میں نے سوچا کہ جرور برساتی کے اندر بیٹھے ہوں گے"۔

"بڑی جسوسی دکھائی تو نے"۔

لڈو نے بیڑی کا کش لیا۔ "میں نے نیچے اوپر سے ہاتھ ڈال کر چٹکھنی سرکادی۔ یہ دیکھو میری باہنہ پر کھون جم گیا ہے ۔۔۔۔۔۔۔"

"آگے بول"۔

"چھت پر سے ہوتا ہوا میں برساتی کی طرف بڑھا۔ اینٹوں کی جالی میں سے دیکھا کہ وہ دونوں اندر چارپائی پر کچھ بیٹھے اور کچھ لیٹے ہیں"۔

ایک کاریگر بولا۔ "لیکن گھگی وہاں کیسے پہنچی"۔

لڈو کو اس کی حماقت پر بڑا رحم آیا۔ "جار! تم بھی بس ۔۔۔۔۔ چھت سے چھت ملی ہوئی جو ہے"۔

"ہی تو بڑا اعکلبند (عقلمند) ہے۔ اب آگے چل"۔

"بس آگے کیا پوچھتے ہو، بڑے مجے میں تھے دونوں۔ گھگی کا منہ تو لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ اتی پیاری لگ رہی تھی کہ جی چاہا کہ بس جا کر لپٹ ہی جاؤں"۔

"واہ رے بجور ے"۔ باج بولا۔ "اب تو یہ بات پکی ہو گئی کہ معاملہ چمی چھاتی تک ہی نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔ اچھا پھر کیا ہوا؟"

"بڑے پریم کی باتیں ہو رہی تھیں۔ چمن تے گھگی کے منہ کے آگے سے بال ہٹا کر کھوب بھینچ بھینچ کر ۔۔۔۔۔۔۔"

"ارے یہ سب تو ہوا ہی ہوگا۔ جیہہ تو بتا کہ باتیں بھی ہو رہی تھیں کچھ؟ جیہہ تو مالوم ہو کیا ارادے ہیں ان کے"۔

"پھر گھگی نے بڑے پیار سے اس کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھا" چمن تم سچ مچ مجھی سے پیار کرتے ہو "۔۔۔۔۔۔ چمن نے مور کی طرح گردن ہلائی اور بولا" سچ مچ"۔

"مجھے اکین نہیں اتا"۔

"جالم۔ جالم اری ہم تو جان پھدا کرتے ہیں"۔

گھگی نے یہ سن کر سر نیچا کر لیا اور گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ اس پر چمن نے پھر اسے سمیٹ کر اپنی گود میں لے لیا اور کہنے لگا۔ کہو تو آسمان سے تارے توڑ لاؤں، کہو تو اپنی چھاتی چیر کر ۔۔۔۔۔۔۔" گھگی نے اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور پھر ایسے بولی جیسے سفنے میں بول رہی

ہو۔" تم تارے مت توڑو۔ اپنی چھاتی مت چیرو •••••• مجھے •••••• مجھے اپنی داسی بنالو"۔

"داسی! داسی؟ ارے تم رانی ہو رانی۔ داس تو ہم ہیں تمہارے"۔

"کھکی کچھ دیر چپ رہی۔ پھر بولی۔" تم میرا متبل نہیں سمجھے۔ مجھ سے سادی کرلونا"۔

جیبہ سن کر چمن بدک گیا۔ جیسے کھکی کھوب صورت لڑکی نئیں، ناگن ہو اور وہ اسے بڑی عجیب نجروں سے دیکھنے لگا۔ اس بخت کھکی کا سر جھکا ہوا تھا۔ سالی اپنے کھیال میں مگن بولی۔ "میں گریب کی لڑکی ہوں۔ ہر کوئی مجھے بھوکی نجروں سے دیکھتا ہے۔ ہر کوئی مجھے کھا جانا چاہتا ہے •••••• گھر سے باہر پاؤں رکھنا مسکل ہو گیا ہے۔ پھر بھی میں نے اجت بچا کر رکھی۔ مگر تمہارے آگے میرا کوئی بس نہیں چلا۔ سوچو اگر مجھے کچھ ہو گیا تو؟"

"جیبہ کہہ کر اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ اس پر چمن نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔" اری واہ روتی کاہے کو ہے۔ بے پھکر رہو، تمہیں کچھ نئیں ہوگا۔ پریم میں ایسی باتیں دن رات ہوتی رہتی ہیں۔ تم بڑی وہمن ہو"۔

"مگر میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ سدا کے لئے تمہاری۔ جیبہ کہہ کر اس نے اپنے پیلے رنگ کے کرتے سے آنکھیں پونچھیں لیکن آنسو نہیں تھمتے تھے۔ ہچکیاں بھرتی ہوئی بولی۔" چمن! میں عمر بھر تمہارے پاؤں دھو دھو کر پیوں گی۔ تمہاری نوکر رہوں گی۔ تمہارے اشارے پر ناچوں گی۔ لالہ کو میری بڑی پھکر لگی ہے۔ ماں ہے نہیں۔ میں ہی سب میں بڑی ہوں۔ مجھے چھوٹی بہنوں کا بھی کھیال کرنا ہے۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ مجھے چھوڑنا نہیں"۔

"اے ہے ہے، تمہیں کون چھوڑتا ہے۔ پگلی ہوئی ہو کیا؟"

"اس پر کھکی نے بھیگی آنکھوں سے چمن کی طرپھ دیکھا اور بولی نئیں تم وادا کرو کہ مجھ سے شادی کرلو گے •••••• میں بڑی منہ پھٹ ہوں۔ بے سری ماپھ کرو۔ مجھے اپنی بنالو۔ میں کھوب پڑھ لکھ لوں گی اور جیسا تم کہو گے ویسا ہی کروں گی"۔

"جیبہ کہتے کہتے کھکی کا سر جھک گیا اور اس نے مدھم آواج میں پوچھا۔" کہو مجھی سے سادی کرو گے؟" اور جب اس نے پھر چمن کی طرپھ دیکھنے کو سر اٹھایا تو چمن نے جھٹ سے اس کا سر دبا کر چھاتی سے لگا لیا۔" ہاں ہاں بھئی"۔ تجھی سے سادی رچاؤں گا۔ اری تم میں کمی کس بات کی ہے۔ تم سندر ہو۔ ہجاروں میں ایک ہو ـــــ لو اب چلیں تم بھی گھر کو جاؤ۔ نہیں تو نیچے والے سک کریں گے ••••••"

"جیبہ سنکر میں بگٹٹ بھاگا وہاں سے"۔

۵

دوپہر کے وقت گرمی کی وہ شدت ہوتی تھی کہ کیا کارخانے اور کیا پریس کے کاریگر سبھی

کام چھوڑ کر الگ بیٹھ جاتے ۔ دن کا یہ حصہ سب سے زیادہ دلچسپ ہوتا تھا ۔ فرصت کا سماں ہوتا تھا ۔ حویلی جی بھر کر کشادہ تھی ۔ چھوٹے بڑے متعدد کمرے ، ان میں اونچی اونچی الماریاں ، کرسیاں ، میزیں ، پلنگ ، صندوق ۔ ۔ ۔ غرض آنکھ مچولی کھیلنے کا پورا اسامان میسر تھا ۔

باج سنگھ تنور سے روٹی کھاکر لوٹا تو سیدھا حویلی کے اندر داخل ہو گیا ۔ بڑے سردار جی کے سوا حسب معمول سبھی لوگ موجود تھے ۔ لیکن بڑی سردارنی سب سے الگ تھلگ پہلے بڑے کمرے میں براجمان تھیں ۔ دوسرے کمرے سے ہنسی ٹھٹھول اور خوش گپیوں کی آوازیں آرہی تھیں

آج تنور پر روٹی کھانے کا باج کو کچھ مزا نہیں آیا تھا ۔ دال میں کنکر ، راشن کے آٹے میں ریت ۔ تنور والوں کی ایسی تیسی کر کے پیٹ بھرے بغیر ہی وہ لوٹ آیا تھا ۔ جب وہ حویلی میں داخل ہوا تو قدرتی طور پر سب سے پہلے اس کی نگاہ سردارنی پر پڑی ۔ تعجب ! آج وہ پان چبارہی تھی چھوٹی سردارنی تو خیر ہر کھانے کے بعد ایک عدد پان کلے میں دبالیتیں ۔ نہ جانے کہاں سے لت لگی تھی انہیں ۔ بڑی سردارنی کو پان چباتے ہوئے اس نے پہلی بار ہی دیکھا تھا ۔ ان کی باچھوں اور ہونٹوں پر گہرے سرخ رنگ کی تہہ جمی ہوئی تھی ۔ نظریں چار ہوتے ہی بڑی سردارنی اس قدر بے دریغ انداز میں مسکرائیں کہ ایک بار تو باج بدک گیا ۔ لیکن پھر سنبھل کر وہیں اینٹوں کے فرش پر بیٹھ گیا اور اپنے ٹخنوں اور پنڈلیوں پر سے لکڑی کا برادہ جھاڑنے لگا ۔

بڑی سردارنی نے اس کی جانب چوکی دھکیلتے ہوئے کہا ۔ "ہاؤ ہائے ! جمین پر کاہے بیٹھتے ہو چوکی پر بیٹھو" ۔

" نہیں بڑی سردارنی ! اینٹیں ٹھنڈی لگ رہی ہیں ، مجا آرہا ہے ۔ اچھا کریں ہیں آپ جو دوپہر کو پھرش پر پانی چھڑکا دے ہیں ۔ سچ بڑی سردارنی بری دور کی سوجھے ہے آپ کو ...... سچ "

یہ سن کر سرادرانی نے چاہا کہ مارے خوشی کے پھولی نہ سمائے لیکن اب اور پھولنے کی گنجائش ہی کہاں تھی ۔ چنانچہ اس نے پہلے تو کمال انکسار سے سر جھکا دیا ۔ پھر قدرے بھونڈے مستانہ پن سے نظریں اٹھائیں ....

باج کو کوئی بات سوجھ نہیں رہی تھی ۔ اس لئے اس نے پگڑی کے اندر دو انگلیاں داخل کر کے سر کھجانا شروع کر دیا ۔ سردارنی محققانہ انداز میں بولی *

" روٹی کھاکر آرہے ہو " ۔

" جہرمار کر کے آرہے ہیں " ۔

باج کو برہم پاکر سردارنی بڑے مبالغے کے ساتھ پریشان ہوئیں ۔ " آکھر ماجرا کیا ہے ؟ "

باج نے ماجرا سنایا اور نتیجہ یہ برآمد کیا کہ " روٹی ! ہائے روٹی ! تو بڑی سردارنی آپ کی

ہوتی ہے۔ مکھن سسرا روٹی کی نس نس میں رچ جاتا ہے۔ نوالہ منہ میں رکتا ہی نہیں۔ بتاشے کی طرح گھلا اور چل اندر"۔

بڑی سردارنی کو تعریف و توصیف کے یہ فقرے ہضم کرنے کے لئے خاصا پرانا یام (DEEP BREATHING ETC.-----) کرنا پڑا۔ جب دم میں دم آیا تو ایک خاص سرتال میں بولیں۔

"کبھی ہمارے یہاں کھاتے بھی ہو"۔

"کبھی کھلاتی بھی ہیں آپ"۔ چالاک باج نے اسی سرتال میں برجستہ جواب دیا۔

اس پر جلال میں آکر جو بڑی سردارنی اٹھیں تو باج کو یوں محسوس ہوا جیسے زمین سے آسمان تک اودی گھٹا چھا گئی ہو۔

روٹی کھاتے کھاتے باج نے پوچھا۔ "کیوں جی! آج بڑے سردار جی بیٹھک میں کس سے بات چیت کر رہے ہیں؟"

سردارنی نے جھالر دار پنکھا جھلتے ہوئے جواب دیا۔ "معلوم نہیں"۔

گھر میں ایک ہی ٹیبل فین تھا بجلی کا، اور وہ جدھر بڑے سرادار جی جاتے ان کا پیچھا کرتا۔

باج نے نمک حلال کر ڈالنے کے خیال سے کہا۔ "کیوں مجاخ کرتی ہیں سردارنی! بھلا یہ کبھی ہو سکتا ہے کہ ادھر بات چیت ہو رہی ہو اور آپ کو کھبر نہ ہو"۔

سردارنی نے بڑے بٹوے کی طرح منہ کھولا لیکن دفعتاً اس کا دہانہ تنگ کر کے بولیں۔ "جسوس چھوڑ رکھے ہیں ابھی مالوم ہو جائے گا سب کچھ"۔

اسی اثنا میں چھوٹی سردارنی بغل والے کمرے سے نکل کر ان کے کمرے میں داخل ہوئیں۔ بتیسی نکلی پڑتی تھی۔ سنہری کیلیں چمک رہی تھیں۔ حسب معمول لڑکیاں ان کے ساتھ تھیں۔ جب لڑکیاں ساتھ تھیں تو قدرتی طور پر لڑکے بھی ساتھ تھے ....

بڑی سردارنی کو چھوٹی سردارنی کے یہ چھن پسند نہیں تھے اور پھر اس موقعہ پر؟ چنانچہ اس نے چپکے سے ناک بھوں چڑھا کر ہاتھ کو ذرا---- SLOW MOTION سے گھما کر نا پسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسے یقین تھا کہ باج بھی اس معاملے میں اس سے متفق ہے۔ لیکن باج نے بڑی دیدہ دلیری سے اپنے بے ڈول دانتوں کی نمائش کی اور تر مال اپنے سامنے پاکر اس نے دل ہی دل میں نعرہ لگایا۔ "جو بولے سو نہال ...."

چھوٹی سردارنی معہ کمسن پریوں کے اور جنات کے دھوم دھڑاک سے آگے بڑھیں۔ ان کے پہلو بہ پہلو ان کا ہاتھ جھلاتی گھگی چنچکتی پھدکتی چلی آرہی تھی۔ گھگی محض بانکی نہیں تھی۔ بلکہ اسے اپنے بانکپن کا احساس بھی تھا۔ ہر نگاہ جو اس کے چہرے یا جسم پر پڑتی تھی۔ اس کا رد عمل اس کی ابروؤں کی لرزش، ہونٹوں کی پھڑکن یا جسم کی کسی نہ کسی حرکت سے ظاہر ہو جاتا۔

اس کے بعد نکی .... گھگی نوک پلک اور چہرے کے خدو خال کے لحاظ سے غضب تھی تو نکی بدن کے اعضا کی متناسب بناوٹ، تناؤ اور تڑپ کے اعتبار سے قیامت تھی۔ اس کی نظریں بڑی بہن کی طرح دور تک نہیں پہنچتی تھیں۔ وہ اس انسان کے مانند دکھائی دیتی تھی جو ویرانے میں بھٹکتا بھٹکتا دفعتاً میلے میں آنکلے ......

نکی کی چندری کا دامن اندھی سانولی کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا چہرہ اوپر کو اٹھا رہتا۔ وہ بڑی دونوں بہنوں سے کم گوری تھی۔ خدوخال گوارا لیکن چہرہ بحیثیت مجموعی پر کشش تھا۔ اسے اس بات کا مطلقاً احساس نہیں تھا کہ مرلی والا اس کے بدن میں عمر کے ساتھ ساتھ کیا کیا تبدیلیاں کر رہا ہے۔ کیونکہ اس معمے کا احساس تو لڑکی کو آنکھیں چار ہونے پر ہی معلوم ہو سکتا ہے۔ وہاں ایک بھی دیکھنے والی آنکھ نہیں تھی۔ اس لئے آنکھیں چار ہونے کا دوچار ہی پیدا نہیں ہوتا تھا.....

" بلے بلے "۔ باج کو اپنے کان میں آواز سنائی دی۔ دیکھا کہ بونگا بھی اسے کارخانے میں نہ پاکر وہاں آن پہنچا تھا اور پھر رال ٹپکاتے ہوئے بولا۔ " جارا گھگی کی کمر تو دیکھو۔ کیسی پتلی۔ کیسی لچکدار ہے۔ آنکھ نہیں ٹکتی اس پر ...."

اوئے میں جٹی پنجاب دی

میرا ریشم ور گالک ...."

معاً باج نے بونگے کو کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔ " دیکھ اوئے جل ککڑ!! "

جل ککڑ پریس میں لیبل پرنٹ کیا کرتا تھا۔ اس کی عمر چونتیس برس کے لگ بھگ ہوگی دو بچے بھی تھے۔ تعجب! وہ بھی سینگ کٹا کر بچھروں میں شامل ہو گیا تھا۔ یہ راز باج کی سمجھ میں اب تک نہ آیا تھا۔ لیکن آج اس نے دیکھا کہ کیسے جل ککڑ نے دیدہ دانستہ، نکی کو دھکا دیا اور کیسے نکی نے معشوقانہ ادا کے ساتھ اس کی اس حرکت کو برداشت کیا۔ لیکن آخر جل ککڑ میں رکھا ہی کیا تھا۔ اس کی مضحکہ خیز صورت کی وجہ سے ہی تو یاروں نے اس کا نام جل ککڑ تجویز کیا تھا .... مگر عورت کے دل کو کون پا سکتا ہے ....

بونگے نے کہا۔ " جار یہ تو دور مار توپ نکلا۔ کیسا مسکین بنتا تھا "۔

آج کل جل ککڑ زیادہ تر رنگین بشرٹ پہنے رہتا تھا۔ جس کے کپڑے پر چینی طرز کے اژدہا ناچتے دکھائی دیتے تھے۔

سردار جی کے لڑکے بھی " جل کبڑی تارا۔ سلطان بیگ مارا "۔ کہتے ہوئے ساتھ ساتھ چلے آرہے تھے۔ اور ان کے پیچھے وہ نوجوان تھا جو وہاں کوئی امتحان دینے کے لئے نیا نیا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی باج نے پوچھا۔ " اوئے ماں دیا مترا! اِیہہ کون ہے "۔

" اوئے جیہبہ بھی اپنا منڈا ہے۔ نواں دا کھل ہویا اے۔ عسک دے مدرسے دے بچ "۔

" اچھا اچھا ..... ایہہ تاں پرسوں ہی آیا ہے "۔

"اوئے چمن، ہم کو چھوڑ کر میو جا رہا ہے اور ہم کو خبر تک نہیں دی۔

لفظ "ہم" سے اس کا اشارہ گھکی کی طرف تھا۔ یہ الفاظ اس نے کھڑے ہو کر کہے۔ اس وقت اس کی میلی کچھ کا اور بھی زیادہ میلا ازار بند اس کے دونوں گھٹنوں کے بیچ میں جھول رہا تھا اور اس نے پر معنی انداز میں کنکھیوں سے گھکی کی جانب دیکھا۔ بھلا گھکی کو اس بات کا مطلب پا لینے میں کیا مشکل پیش آسکتی تھی۔ اس کے دل میں ایسی گدگدی پیدا ہوئی کہ وہ اٹھ کر رقصاں و شاداں چھوٹی سردارنی کے ایک بازو سے اٹھ کر اس کے دوسرے پہلو میں جا بیٹھی اور بے حد سریلی آواز میں بولی۔ "ہمیں پہلے ہی سے معلوم تھا"۔

گھکی نے یہ بات زیادہ زور سے نہیں کہی لیکن یہ اتنی بلند ضرور تھی کہ باج اسے آسانی سے سن سکے۔

اس پر باج ٹھنڈے ہو کر ٹھنڈے فرش پر اس طرح بیٹھ گیا جیسے غبارے میں سے دفعتاً ساری ہوا نکل جائے اور پھر اس نے ابرو ہلا کر اور مونچھیں پھڑکا کر بونگے کے کان میں کہا،

"جار! سچ مچ یہ لونڈیا بڑی چلتی پرجی ہے"۔

۶

ایتوار!

آج سردار جی کے دونوں لڑکے دس بجے کا انگریزی شو دیکھنے جا رہے تھے۔ بڑے زور شور کے ساتھ تیاریاں ہو رہی تھیں نہ جانے کب کی پرانی نکٹائیاں برآمد کی گئیں۔ ایک مسہری لگانے کے بانس کے سرے پر بندھی تھی اور دوسری بڑے ٹرنک کے پیچھے سے گیند کی طرح گول مول کی ہوئی نکلی۔

چونکہ اس وقت چھوٹی سردارنی غسل کر رہی تھیں اس لئے ان کی چیلیاں بے جان سی ہو کر ادھر ادھر لٹک رہی تھیں۔ نکی بڑی سردارنی کے ساتھ باورچی خانے کے اندر بیٹھی تھی۔ سانولی پرے نل کے پاس بیٹھی ایڑیوں کو رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ دستی ہلانے والا نیا نوجوان تھا گھکی حویلی کے بڑے دروازے کے آگے بنی ہوئی چند پختہ سیڑھیوں پر ٹکی تھیں بیچ والے حصے پر بیٹھی تھی اس کی دونوں کہنیاں اس کے گھٹنوں پر اور دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں اس کا چہرہ پھنسا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں اداس تھیں۔ چمن کو گئے پچیس دن گزر گئے تھے۔ لیکن گھکی کو اس کا ایک خط تک نہ آیا تھا۔ حالانکہ دوسروں کو اس کی چٹھیاں آچکی تھیں.......

اتوار کی وجہ سے چھٹی تھی، اس لئے کاریگروں کی گہما گہمی نہیں تھی۔ البتہ باج اور بونگا موجود تھے۔ کیونکہ وہ مستقل طور سے وہیں پر مقیم تھے۔

دیواروں کی سفیدی کرنے کے کام میں آنے والے پانچ فٹ اونچے اسٹول پر پاؤں کے بل بیٹھا باج داتن چبا رہا تھا۔ اسٹول کے ساتھ سٹ کر زمین پر بیٹھا ہوا بونگا آئینے میں دیکھ دیکھ کر چٹی سے ناک کے بال نوچ نوچ کر پھینک رہا تھا۔

"آہو جی لونڈیوں کیباتیں چھوڑو۔ اب ناریوں کی باتیں کرو"

پریوں کے اس قافلے نے زمین پر ڈیرے ڈال دیئے اور ان کی خوش نوائیوں میں بڑی سردارنی اپنے آپ کو تنہا محسوس کرنے لگی

"اوئے پرجی! چمن کہاں ہے"۔

ایک چھوٹا لڑکا (غالباً بڑی سردارنی کا جاسوس) جو بیٹھک سے اسی وقت وہاں آیا تھا بولا۔

"چمن ادھر بیٹھک میں بیٹھا ہے"۔

باج کو حیرت ہو رہی تھی، یہ کیا "گل ادھر اور بلبل ادھر" پھر اسی جذبے کے تحت اس نے گھگی کی جانب دیکھا۔ وہ نظروں ہی نظروں میں سب کچھ سمجھ گئی۔ اس کے ابرو لرزے، پلکیں جھپکیں، کمر لچکی اور پھر وہ ساکت ہو گئی۔ باج نے دل پھینک تیور بنا کر آنکھوں ہی آنکھوں میں سمجھایا کہ لو ہم تفتیش کرتے ہیں اور حسن کے چور کو حسن کے حضور میں حاضر کرتے ہیں۔ چنانچہ اس نے بلند آواز میں پوچھا۔ "لیکن بئی وہ وہاں کیا کر رہا ہے؟"

"ادھر ایک جرنیل صاحب بیٹھے ہیں"۔

باج نے سوچا کوئی فوجی افسر ہوگا۔ یہ لونڈے ہر ایسے افسر کو ایک دم جرنیل بنا دیتے ہیں پھر بولا۔ "پر بائی! چمن کا وہاں کیا کام؟"

"چمن کے بابو جی بھی بیٹھے ہیں"۔

اس سے مراد یہ کہ چمن کو باپ کی وجہ سے مجبوراً وہاں بیٹھنا پڑ رہا ہے۔ "اچھا تو بچو چمن کو انہوں نے وہاں کس لئے پھانس رکھا ہے"۔ باج نے جرح کی۔

"وہ پھوج میں بھرتی ہو رہا ہے"۔ لڑکے نے میں سے جواب دیا۔

اب باج نے ایک نظر بڑی سردارنی پر ڈالنا ضروری سمجھا اور پھر منہ میڑھا کر کے اس کے ایک کونے میں سے سانپ کی پھنکار کی سی آواز نکالتے ہوئے بولا۔ "اے جی آپ کا جسوس تو بڑا ہسیار نکلا"۔

داد پا کر سردارنی ہاتھی کی طرح جھومنے لگیں اور عرصہ تک جھومتی رہیں۔

جب جسوس لونڈے کو محسوس ہوا کہ وہ ایسی باتیں کہہ رہا ہے جن سے سب کو بڑی دلچسپی محسوس ہو رہی ہے تو اس نے مزید معلومات بہم پہنچانے کے لئے کہا۔ "چمن ماباؤ جا رہا ہے"۔

"اوئے ماباؤ کون جگہ کا نام ہے۔ وہاں تیری ماؤں (ماں) رہتی ہے کیا؟" بوگنے نے دبی زبان میں کہا تاکہ صرف باج سن سکے۔

سردارے نے کہا۔ "اوئے ماباؤ نہیں مہو کہو مہو"۔

"کیا چمن، مہو جا رہا ہے؟" سردارجی کے چھوٹے لڑکے نے سوال کیا اور ساتھ ہی پہلے تو مصنوعی تعجب کے مارے دونوں ٹانگیں خوب پھیلا کر اور پاؤں فرش پر جما کر بالکل بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ اور پھر سمٹ کر جو کودا تو کمرے سے باہر اور بیٹھک کے اندر۔

دور بیٹھک کی طرف سے ایک بڑے سنکھ کی سی آواز میں سردارجی پاٹھ کر رہے تھے ۔ سردارجی کا پاٹھ اور باج کی داتن دونوں مشہور چیزیں تھیں ۔ ادھر سردارجی مسلسل کئی کئی گھنٹے پاٹھ کرنے میں جٹے رہتے ۔ادھر اتوار کو فرصت پاکر باج علی الصبح ہی منہ میں یہ لمبی داتن اڑس کر بیٹھ جاتا پہلے اسے چباتا پھر دانتوں پر گھساتا ۔ پھر چباتا اور دانتوں پر گھساتا ۔یہاں تک کہ داتن ختم ہو جاتی ۔

بونگے نے اپنے کام سے فرصت پاکر اطمینان سے ٹانگیں زمین پر پھیلا دیں ۔

بلند نشین باج نے اپنے تیزی سے ملتے ہوئے منہ کو لمحہ بھر کے لئے روکا اور بونگے سے مخاطب ہو کر دبی زبان میں پھنکار کر بولا ۔ "بونگیا! آج گھکی کچھ اداس ہے ۔ شاید چھوٹی سردارنی کا انتجار ہو رہا ہے" ۔

اس طرح بولنے سے باج کی مونچھوں میں پھنسے ہوئے تھوک کے قطرے اڑ کر بونگے کے چیچک مارے چہرے پر پڑے اور اس نے بھڑک کر اسٹول کو ذرا سا ہلا دیا اور چھوٹی چھوٹی آنکھیں لال چنگاری بنا کر کہا ۔ "اوئے ابھی ہلا دوں تو راج سنگھاسن سے سر کے بل نیچے گر پڑے ۔ ہم پر تھوکتا ہے؟"

اسٹول کے قدرے ہل جانے پر باج نے گدھ کے مانند بازو پھڑپھڑائے اور اس کی بات کی طرف دھیان دیئے بغیر بولا ۔ "کیوں یہی بات ہے نا! ملکاں (چھوٹی سردارنی) کا انتجار ہو رہا ہے"

"اوئے نئیں" ۔۔ بونگے نے نتھنے پھلا کر عالمانہ انداز میں جواب میں دیا ۔ "ہیر کو رانجھے کا سی کو پنوں کا ۔ گوپی کو کنھیا کا انتجار ہے ۔ سمجھے؟"

"سمجھا" ۔ باج سے بھلا کیا بات چھپتی تھی ۔ اس نے بونگے کو محض گرمانے اور پھر اس کی کسی حرکت بازی کا لطف اٹھانے کے لئے انجان پن کا ثبوت پیش کیا تھا ۔

اب بونگے نے احتیاطاً ادھر ادھر دیکھا اور کسی کو قریب نہ پاکر ہلکا سا نعرہ بلند کیا ۔

"ہائے" ۔ روئے سخن گھکی کی جانب ۔

"کیا ہے؟" باج نے پوچھا اور سمجھ گیا کہ بونگے کو مستی سوجھ رہی ہے ۔

"درد" ۔ بونگے نے جواب دیا ۔

"کہاں؟"

"جیہنہ تو میں مرجاواں تاں بھی نہ دساں" ۔ بونگے نے خاص زنانہ آواز میں جواب دیا اور پھر قدرے سکوت کے بعد گانے لگا ۔

"چھوڑ گئے بالم!"

اکیلی مجھ نوں چھوڑ گئے" ۔

فضا بونگے کی تھرتھراتی آواز سے گونج اٹھی ۔

اب دونوں چھوٹے سردار تیار ہو کر اندر سے نکلے تو اس شان سے کہ پہلے تو بڑے بھائی نے اندر سے چھلانگ ماری تو گھکی کے اوپر سے کود کر صحن میں۔ وہ کچھ سمجھنے بھی نہ پائی تھی کہ دوسرا بھائی صاف کود گیا اوپر سے۔ گھکی ہڑبڑا کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو گیا۔ چمک کر بولی۔ ہمیں نہیں اچھا لگتا ایسا مجاخ، اگر ہماری گردن ٹوٹ جاتی تو؟"

اس پر چھوٹے بھائی نے پنجاب کے مشہور لوک ناچ بھنگڑا کے انداز میں چند چک پھیریاں لیں اور گلے کی گہرائیوں میں سے نہایت گھگیائی ہوئی آواز نکال کر گیت کا بول دہرایا۔

"چھوڑ گئے بالم!"

ادھر بونگا بھی بس تیار ہی بیٹھا تھا۔ فی الفور چھاتی پر دو ہتڑ مار کر بین سر میں گا اٹھا،

"اکیلی مجھ کو چھوڑ گئے"۔

اس پر باج نے جو قہقہے لگائے تو وہ سیدھے آسمان کے اس پار پہنچے۔ بڑی سردارنی معہ نکی کے باورچی خانے کے دروازے میں آن کھڑی ہوئیں۔ چھوٹی سردارنی بھی غسل سے فارغ ہو کر نکل آئیں۔ سانولی سمجھی ضرور کوئی مزے دار بات ہو رہی ہے۔ چنانچہ وہ نل کے پاس بیٹھی زور زور سے ہنسنے لگی۔

چلتے چلتے چھوٹا سردار وہی بول دہراتا گیا اور بونگا بھی گرمی کھا کر سینے پر دو ہتڑ مار مار کر جواب دیتا گیا۔ صحن میں قیامت کا شور سن کر بڑے سردارجی اندر سے ہی کڑکے، ------------------------ تو چھوٹے سردار بگٹٹ بھاگے۔ باج اسٹول سے کودا اور بونگے سمیت کارخانے میں جا گھسا۔ بڑی سردارنی اور نکی نے اندر سے باورچی خانہ کا دروازہ بھیڑ دیا گھکی اچھلی اور چھوٹی سردارنی نے اسے بغل میں دابا اور ایک بار پھر غسل خانے کے اندر

۷

دیوی داس کے مکان اور دکان کے آگے سڑک کے آر پار کاغذ کی رنگ برنگی جھنڈیاں لہرا رہی تھیں۔ باجے بج رہے تھے۔ گھر کے اندر کسی تاریک گوشے میں چند عورتیں بطخوں کی قیں قیں کی سی آواز میں ٹوٹے پھوٹے گیت گا رہی تھیں۔

گھکی کی شادی ہو رہی تھی!

چمن سے ساتھ؟ نہیں۔

بارات آنے والی تھی۔ محلے کے لونڈے دوڑ دوڑ کر دولھا کی پیشوائی کو جاتے لیکن بڑے بوڑھیوں کی زبانی یہ سن کر کہ ابھی بارات نہیں آئی۔ تو مایوس ہو جاتے اور چپ چاپ چڑوے ریوڑیاں چبانے لگتے۔

بیٹھک میں بڑے سردار جی اور ان کے چند معزز اور بزرگ ساتھی کاٹھ کے الوؤں کی طرح ساکت بیٹھے تھے۔ کبھی ایک آدھ بات ہو جاتی تو سب اثبات میں سر ہلا ہلا کر اظہار اطمینان کرتے۔

پریس کے کاریگر سڑک کی جانب برآمدے میں کھڑے تماشہ دیکھ رہے تھے۔ ادھر کارخانے کے کاریگر بغلیں بجاتے چھت پر چڑھ گئے۔ وہاں سے دیوی داس کی نیچی چھت صاف دکھائی دیتی تھی۔ اس کی چھت پر دس پندرہ چارپائیاں بچھی تھیں۔ کیونکہ زیادہ براتیوں کے آنے کی امید نہیں تھی۔ چند بچے اور عورتیں بے جان رنگوں کے کپڑے پہنے سست قدموں سے ادھر ادھر کے کام کرتی پھرتی تھیں۔ قریب والے پیپل کے پیڑ کا تاریک سایہ چھت پر پھیل رہا تھا۔۔۔ اور باجے الگ کراہ رہے تھے۔

چھت والے کاریگروں میں سے ایک سر ہلا کر بولا۔ "تت تت عورت کی بے وفائی کے بارے میں سنا تھا، لیکن آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لی"۔

بونگے نے نتھنے پھلا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر کچھ کہنے کے لئے منہ پھیلایا۔۔۔۔ اور پھر نتھنے اور منہ دونوں سکوڑ کر رخ دوسری جانب پھیر لیا۔

کاریگر کو تعجب ہوا۔ اس نے باج کو کندھا مار کر کہا۔ "کہو استاد! آج بونگے کو کیا ہو گیا ہے"۔

باج نے پہلے بھولے ماری آنکھ دکھا کر بے رخی برتی۔ لیکن پھر چشم بینا سے شرارے برسا کر کہا۔ "عورت کی بیوفائی نہیں، مرد کی بیوفائی کہو"۔

"یعنی؟"

"یعنی یہ کہ چمن کو یہاں سے گئے تین مہینے گزر چکے ہیں اس نے ایک سطر تک نہیں لکھی گنگی کو"۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

"اور گنگی نے؟"

"اس نے اپنے ہاتھ سے ٹوٹی پھوٹی ہندی میں اسے کئی چٹھیاں لکھیں لیکن ایک کا بھی جواب نہیں آیا"۔

اب بونگے نے بھی بولنا شروع کر دیا۔ "چمن نے اپنے چار دوستوں کو لکھا کہ کسی نہ کسی طرح گنگی کو چٹھی لکھنے سے روکا جائے۔ ہر چٹھی اس کی اس بات سے کہ "اگر میرے پر ہوتے تو میں اڑ کر آپ کے پاس آ جاتی"۔ "تنگ آ گیا ہوں"۔

"ادھر کہیں چمن کے پتاجی وہاں جا نکلے"۔ باج نے بات آگے بڑھائی "ان کی موجودگی میں کہیں کوئی کھت آیا تو انہوں نے پڑھ لیا۔ پہلے بیٹے کے کان مروڑے اور پھر یہاں آکر بڑے سردار جی کو بتایا۔ سردار جی نے دیوی داس کو بلایا اور کہا۔ "او ئے لونڈیا کی سادی کر دے جھٹ

پٹ، پندرہ دن کے اندر۔ نہیں تو دکان خالی کر دے اور اٹھالے بوریا بستر مکان سے بھی"۔ ایسے مسکل سے میں بھلا دیوی داس کہاں جاتا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا پرجی غریب کی لڑکی کی سادی بھلا اتی جلدی کہاں ہو سکتی ہے؟" چمن کے باپ نے کہا۔ "آخر تمہاری لونڈیا کو ایسے کھت لکھنے کی ہمت کیسے ہوئی۔ جمین کی کھاک سر کو چڑھے، بڑے سردارجی نے ڈانٹ پلائی۔ اب میں نے کہہ دیا۔ جیادہ ریائت نئیں نا ہو سکتی۔ پندرہ دن کے اندر اندر سادی کر ڈال کہیں، نئیں تو مکان اور دوکان دونوں سے کھارج"۔

گفتگو اسی منزل پر پہنچی تھی کہ بڑی سردارنی جی بھی اوپر آنکلیں۔ اور حسب عادت باج کے قریب کھڑی ہو گئیں۔ اپنی آمد پر سب کو چپ دیکھ کر بولیں "بارات نہ جانے کب آئے گی؟" ان کی بات ختم بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ لوگ بھاگ چلا اٹھے "بارات آئی۔ بارات آئی!

شہنائیاں اور زور سے کائیں کائیں کرنے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد سردارجی کا چھوٹا لڑکا دوڑا دوڑا آیا۔ "اوئے لٹیا ڈوب گئی، وحت تیرے کی"۔

"کیوں کھیریت؟ دولہا دیکھا؟ کیسا ہے؟" سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔

لڑکے نے بڑے واہیات انداز سے بازو دا ھر ادھر پھینک کر جواب دیا۔ "دحت تیری کی••••••• چڑی مار••••••• بالکل چڑی مار دکھائی دیتا ہے"

۸

اگست ۴۷ کے فسادات زور شور سے سروع ہوئے تو حویلی کے مکینوں اور کاریگروں کے وقت کا کچھ حصہ قتل و غارت، ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے گئے مظالم اور ان کی خواتین کی آبرو ریزی جیسے موضوعات پر صرف ہونے لگا۔ لیکن وہاں کی روزمرہ کی زندگی اور چہل پہل میں کوئی خاص فرق نہیں آیا تھا۔ سوائے اس کے کہ گھکی کی شادی کو تین ساڑھے تین ماہ گذر چکے تھے۔ ان تین مہینوں کے دوران میں چمن دو چار دن کے لئے جالندھر آیا۔ انہوں نے الگ مکان کا انتظام کر لیا تھا۔ پھر بھی چمن سردارجی کے گھر چوری چھپے آتا رہا۔ وہ گھکی سے بچ کر رہتا تھا۔ خود گھکی نے بھی بطور خاص اس امر کی احتیاط برتی کہ اس کی چمن سے مڈبھیڑ نہ ہو۔

چمن نے سردارجی کے لڑکوں کو بتایا کہ مہو میں اس کی زندگی بڑے مزے اور چین میں کٹ رہی تھی۔ ارد گرد معشوقوں کی بھی کچھ کمی نہیں تھی۔ اس نے ایک نیا آرٹ سیکھا تھا جس کا مظاہرہ اس نے سگریٹ کے دھوئیں کے مرغولے بنا بنا کر کیا۔ اگر گھکی کی کوئی بات چلتی تو کہتا۔ "ہندوستانی لڑکیاں بھی بس عجیب ہوتی ہیں۔ ذرا ہنس کر بات کر لو تو گلے کا ہار ہو جاتی ہیں۔ فلش (FOOLISH)....... چائلڈش (CHILDISH)....... !! "

بالآخر وہ گھگی سے ایک بات کئے بغیر ہی واپس چلا گیا۔

بظاہر گھگی پر اس کا کوئی خاص رد عمل دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ اب بھی چھوٹی سردارنی کے ساتھ اٹھتی بیٹھتی، ہنستی بولتی، لیکن اس کے دل کو گھن لگ چکا تھا۔ اس کا جسم نرم اور کمزور تو پہلے ہی تھا۔ لیکن اب تو بالکل ہی ہڈیوں کا ڈھانچ سا ہوتا جا رہا تھا۔ وہ نہایت نازک اور شگفتہ پھول کے مانند تھی اسے اگر مناسب حالات میسر آجاتے تو یقیناً اس کی مہک دور دور تک پھیلتی۔ لیکن اب وہ درد دبا کر خاموش ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے سے ایسا سنجیدہ وقار ٹپکتا تھا کہ اب کسی کو اس سے چہل بازی کرنے کی جرات تک نہیں ہوتی تھی۔ اسے کھانسی آنے لگی تھی۔ جب وہ کھانسی چھوٹتی تو وہ اپنے کمزور سینہ کو چھوٹے چھوٹے ہاتھوں سے تھام کر کھانستے کھانستے بے حال ہو جاتی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو جاتا۔ بعض دیکھنے والوں کو اس کی حالت پر ترس آنے لگتا۔ لیکن وہ مسکراتی ہوئی اپنے خوش وضع سر کو پیچھے کی جانب پھینک کر اسے دائیں بائیں دو چار جھٹکے دیتی اور پھر بات چیت میں مصروف ہو جاتی۔

نکی، البتہ اب اڑ نکلی تھی۔ اسے بات بے بات پر اس قدر ہنسی چھوٹتی تھی کہ بس لوٹ پوٹ ہو جاتی۔ پہلے گھگی ان محفلوں کی جان تھی تو اب نکی! گھگی کا رویہ پہلے بھی پروقار تھا۔ اب سینہ پر زخم کھا کر وہ اور سنجیدہ ہو گئی تھی۔ مگر نکی شروع ہی سے شوخ تھی اور اب میدان صاف پا کر وہ تڑپتی ہوئی بجلی بن گئی تھی۔ چھیڑ چھاڑ کی اس میں بہت برداشت تھی۔ اس لئے وہ گھگی سے زیادہ مقبول تھی۔ خفا ہونا تو اسے آتا ہی نہیں تھا۔ سمٹنا۔ ہنسنا، بچنا، جھوٹوں ہی ابرو پہ بل ڈالنا پیٹھے پہ ہاتھ نہ رکھنے دینا، یہ سب درست، پھر بھی وہ خفا نہیں ہوتی تھی۔ خواہ کچھ بھی ہو جائے اس کی چہک اور مہک میں فرق نہیں آتا تھا۔

اب نکتہ سنجوں کے لئے یہ بھی کوئی راز کی بات نہ رہی تھی کہ نکی کا خاص منظور نظر پریس کا وہی آدمی تھا جسے سب جل ککڑ کہتے تھے۔ لیکن سمجھ میں نہ آنے والی بات یہ تھی کہ آخر اس کے پاس کون سی ایسی گیدڑ سنگی تھی جس کی وجہ سے نکی سب کو چھوڑ چھاڑ کر اسی کی بغل گرم کرتی تھی۔

ایک روز شام کے وقت ایک بہت بڑے زمین دوز چولھے پر لوہے کی کڑاہی جمائی گئی جسے دیکھ کر سب کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کیونکہ چند مہینوں کے وقفے کے بعد یہ وہ شام ہوتی تھی۔ جب بڑی سردارنی کڑاہی میں ریت گرم کر کے اس میں مکی، چنا اور چاول بھونتیں۔ گڑ ملا کر ان کے مرونڈے تیار کرتیں اور سب کو جی بھر کر کھلاتیں۔ چنانچہ جب کارخانے کے اندر تیشہ چلاتے ہوئے باج سنگھ کو بونگے نے خبر سنائی کہ آج صحن میں کڑائی جمائی گئی ہے اور بڑی سردارنی کے کیا تیور ہیں تو اس سے نہ رہا گیا۔ وہ تیشہ ویشہ پھینک فوراً باہر نکلا اور دیکھا کہ بونگے نے جو زیادہ تر جھوٹ بولا کرتا تھا۔ اب کے جھوٹ نہیں کہا تھا۔

بڑی سردارنی نے جب باج کو دیکھا تو اس انداز سے مسکرائی کہ جیسے اسے پہلے ہی سے

یقین تھا کہ باج سب کام چھوڑ چھاڑ کر فوراً باہر آئے گا۔ آج سردارنی نے جامنی رنگ کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ اس رنگ کے تلے اس کے پلپلے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی جارہی تھی۔ باج سے آنکھیں چار ہوتے ہی وہ بامعنی انداز سے ٹھمک کر باورچی خانے میں داخل ہو گئی۔

رفتہ رفتہ سب قسم کے دانے بھن چکے تو پھر نکی کی مدد سے بڑی سردارنی نے سوندھی سوندھی بو والے دانوں کو گڑ میں ملا کر الگ الگ قسم کے مرونڈے تیار کئے۔

چرن منت منٹ کی خبر پریس میں پہنچا رہا تھا۔ کارخانے کے کاریگر چونکہ باورچی خانے کے زیادہ نزدیک تھے، اس لئے وہ کام میں من لگا ہی نہیں سکے۔ وہ اس بات کے منتظر تھے کہ کب سردارنی اپنی لوچدار آواز میں انہیں کھانے کی دعوت دے اور کب وہ پل پڑیں میٹھے مرونڈوں پر

سب سے پہلے سردارنی نے گھکی کو آواز دی۔ اب اسے گھکی پر پیار سا آنے لگا تھا۔ گھکی دونوں کہنیاں گھٹنوں پر ٹکائے اور منہ بازوؤں میں چھپائے کھانس رہی تھی۔ کھانس چکی تو حسب عادت اس نے سر کو پیچھے کی جانب پھینک کر سر کو دائیں بائیں دو چار جھٹکے دیئے اور پھر ہنسنے لگی .... اس کی ہنسی خوب فراخ ہوتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود اس کے چہرے پر عجیب کیفیت طاری رہتی تھی۔ اب اس پر پہلے والے لطیف ردعمل نہیں ہوتے تھے، یوں معلوم ہوتا تھا جیسے وہ خود اپنے لئے ہنس رہی ہے .... اسی طرح کھلکھلا کر ہنستی ہوئی وہ آگے بڑھی اور اس نے دونوں ہاتھ ایسے پھیلائے جیسے اسے مندر یا گوردوارے سے پرشاد مل رہا ہو۔

بڑی سردارنی نے سب کو نام لے لے کر بلایا۔ "دے بونگیا، دے چرن، نی سانو لیئے، نی پریمو ...." باج اپنے محبوب اسٹول پر ٹنگا ہوا تھا۔

اسے نہیں بلایا گیا۔

نہیں، اسے نام لے کر نہیں بلایا گیا۔ بلکہ سب کی نظریں بچا کر سردارنی جی اسے ابروؤں آنکھوں اور سر کے اشاروں سے بلاتی رہیں۔ گویا اس کے لئے مخصوص پیغامات بھیجے جارہے تھے۔

باج بھی ایک کائیاں تھا۔ جی میں حیران بھی تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کسی روز سردارنی بغلگیر ہو جائے کچھ دیر تک سردارنی کی حرکات سے محظوظ ہونے کے بعد وہ قلانچ بھر کر اسٹول سے اترا اور دوسری قلانچ میں وہ سردارنی کے قریب پہنچا۔ مرونڈے لیتے وقت اس نے سردارنی کی پسلیوں میں کہنی کا ایک ٹہوکا بھی دیا۔ کیوں کہ .... اب اتنا حق تو ضرور تھا سردارنی کا اس پر۔

بونگا آج بہت لاڈ میں آیا ہوا تھا۔ باج کے پاس بیٹھنے کے بجائے وہ چھوٹی سردارنی کے قریب جا بیٹھا اور بندر کی طرح بڑے مبالغے کے ساتھ منہ آگے کو بڑھا کر اور چپ چپا چپ کی آوازیں نکالتا ہوا مرونڈے چبانے لگا۔ اسی وقت نکی کو قریب سے خاص انداز میں اٹھتے اور ذرا غیر قدرتی انداز میں چلتے دیکھ کر بونگے نے چھوٹی سردارنی سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑی بیباکی سے کہا

"اوجی! نکی کا پاؤں تو بھاری دکھائی دیتا ہے"۔
باج نے بھی یہ بات سن لی۔ اس نے غور سے دیکھا تو اسے بھی یقین سا ہونے لگا اس نے سوچا۔ آخر بات کیا ہے۔ آج بونگا سچ ہی بولے جارہا ہے۔

۹

رفتہ رفتہ نکی کا پاؤں اور زیادہ بھاری ہوگیا تو حویلی میں کچھ چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اور پھر دفعتاً نکی غائب ہوگئی۔ پہلے تو یہ افواہ اڑی کہ وہ جل ککڑے کے ساتھ غائب ہوئی لیکن جل ککڑ حسب معمول کام پر آتا رہا۔
سب سے اہم بات یہ تھی کہ جس روز نکی غائب ہوئی تو اس کے گھر والوں نے پریشانی کا اظہار بالکل نہیں کیا۔ تیسرے دن گھکی نے دبی زبان سے اعتراف کیا کہ موسی گاؤں سے آئی تھی وہ اسی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ موسی کب آئی تھی؟ بس وہ آئی اور چلی گئی۔ لیکن نکی نے کبھی کہیں جانے کا ارادہ ظاہر نہیں کیا تھا۔۔۔۔۔ ان سب سوالوں کا مال مٹول کے سوا کوئی جواب نہیں تھا ۔۔۔۔۔۔۔ اگر کوئی اور زیادہ کرید کر پوچھتا تو گھکی کو کھانسی چھڑ جاتی۔ وہ کھانستے کھانستے بے حال ہوتی۔ یہاں تک کہ بات آئی گئی ہوجاتی۔
ماہ اکتوبر ختم ہونے کو تھا لیکن اگست سے جو فسادات شروع ہوئے تھے، ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔
حویلی کے طویل و عریض صحن کے ارد گرد متعدد کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ بہت سے کاریگر شہر کے خطرناک حصوں سے نکل کر معہ بال بچوں کے عارضی طور پر وہاں مقیم تھے۔ چنانچہ رات کو کارخانے میں کافی رونق ہوجاتی۔ کھانے سے فارغ ہوکر کاریگر گئی رات تک آپس میں گپ شپ ہانکتے اور مغربی پنجاب میں جو مظالم ہندوؤں اور سکھوں پر ڈھائے جارہے تھے۔ ان کی دل کھول کر مذمت کرتے۔
ایسی ہی ایک رات تھی۔
کھانا کھانے کے بعد کاریگروں کا ایک گروہ کارخانے میں گھسا گپ شپ میں مصروف تھا ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگی تھی۔ اسی لئے اندر سے کنڈی چڑھادی گئی تھی۔ بلکہ بونگا تو سلگتے ہوئے اپلوں کی مٹی کی انگیٹھی رانوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ کسی نے آوازہ کسا!
"ابے بونگے اچھی جوانی ہے سالے، انگیٹھی رانوں میں دابے ہے"۔
"جار! جن انگیٹھیوں کی گرمی تھی ان میں سے ایک کی سادی ہوگئی اور دوسری گائب ۔۔۔۔"
"ہاں بھائی ڈیڑھ مہینہ ہوگیا نکی کو گئیب ہوئے"۔

ایک بولا۔ "ہاں اچھی بات یاد دلائی مجھے۔ آج ایک آدمی ملا تھا جو نکی کی اسی کے گاؤں کے قریب والے گاؤں میں رہتا ہے"۔

"کیا نکی کی کوئی کھبر ملی؟" ایک دو نے دلچسپی لی۔۔

"ہاں"۔

"کیا؟"

"اس نے کنوئیں میں چھلانگ لگا دی تھی"۔

"ہرے رام!!"

"اس نے یہ بھی بتایا کہ اس کے بچہ ہونے والا تھا"۔

"ہو ۔۔۔۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔۔ پھر؟"

"اس نے بتایا جیا وہ کھو۔ نہیں۔ سنا تھا کہ لڑکی بچ جائے گی"۔

باج نے رائے دی۔ "میرے کھیال میں تو دیوی داس نے اس کی حالت دیکھ کر گاؤں بھیج دیا ہوگا تاکہ وہیں کہیں بچے سے جان چھڑا کر لوٹ آئے گی تو جلدی سے سادی کر دی جائے گی اس کی"۔

اس افسوسناک واقعہ کا سب کے دلوں پر اثر ہوا اور ہنستی بولتی محفل پر خاموشی طاری ہو گئی ۔۔۔۔۔۔۔ اتنے میں دروازے پر دستک کی آواز آئی۔

"کون؟" باج نے دریافت کیا۔ لیکن جواب میں پھر مسلسل دستک کی ہلکی ہلکی آوازیں آتی رہیں۔

سب کو یہ بات عجیب سی معلوم ہوئی۔ باج اپنی جگہ سے اٹھا لیکن اس کے دل میں کھد بد کھد بد ہو رہی تھی کہ کہیں بڑی سردارنی نہ ہو۔ موقعہ پا کر اس نے چڑھائی کر دی ہو شاید۔

باج نے کنڈی کھول دی۔

باہر سے دروازے کو بہت آہستہ آہستہ دھکیلا گیا۔

چراغ کی تھرتھراتی ہوئی لو کی مدھم روشنی میں ایک لڑکی اندر داخل ہوئی۔

سانولی!!

باج دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔

حاضرین میں سے سب کی آنکھیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ سانولی کو دیکھ کر قریب تھا کہ ان کے منہ سے بے اختیار مختلف آوازیں نکل جائیں۔ لیکن باج کے اشارے پر وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

سانولی اور آگے بڑھی۔ اس کا گول گول چہرہ نوخیز جوانی کی حدت سے تمتمائے ہوئے چہرے کی جلد، قدرے موٹے اور بھرپور ہونٹ۔ چکنے گال ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان سب چیزوں کے

حسن کو پہلے کبھی کسی نے قابل توجہ نہیں سمجھا تھا۔ ان سب دل لیوا خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے چہرے پر شیر خوار بچے کا سا بھولپن ہویدا رتھا۔

لیکن اتنی گئی رات کو وہ وہاں کیا کرنے آئی تھی؟

سانولی نے ہاتھ پھیلا کر اس اونچی اور بھاری بھر کم میز کا سہارا لیا۔ جس پر باج فرنیچر بناتے وقت مختلف حصوں پر رندہ کیا کرتا تھا۔ لڑکی نے منہ کھولا اور سرگوشی میں بولی، "باج، چاچا!"

"ہاں"۔ باج نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا۔

سانولی نے گردن اِدھر اُدھر گھما کر کوئی اور آواز سننے کی ناکام کوشش کی۔ اس وقت اس کے نیم وا منہ کے اندر دانتوں کی قطار کے پیچھے اس کی جیبھ چھوٹی سی مچھلی کی طرح متحرک تھی۔ پھر اس نے رازدارانہ لہجے میں دریافت کیا" تم اکیلے ہو؟"

یہ سن کر سب نے گردنیں آگے کو بڑھائیں۔ ان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

باج نے آواز کا لہجہ بدلے بغیر جواب دیا۔

"ہاں سانولی! میں اکیلا ہوں"۔

"کہاں ہو؟" یہ کہہ کر وہ بازو پھیلا کر ہاتھ ہلاتی ہوئی آگے بڑھی۔ پھر اس نے اسے چھو لیا۔

"یہ رہے تم!" وہ اسے چھو کر بہت خوش ہوئی۔

"سانولی! تم اس بخت یہاں کیوں آئی ہو؟"

"کیوں اس وخت کیا ہے؟"

"اس بخت رات ہے تم •••••• تم جوان ہو •••••••• کر یب کر یب"۔

"میرے لئے رات اور دن ایک برابر ہیں"۔

"لیکن اس بخت رات کے گیارہ بج چکے ہیں ••••••اور پھر تم اکیلی ہو"۔

یہ سن کر سانولی کے صاف ستھرے چہرے پر اذیت کے آثار پیدا ہوئے وہ حیران ہو کر بولی۔

" پر باج چاچا! بھلا تمہارے پاس آنے میں کیا برائی ہو سکتی ہے۔ تم تو دیوتا ہو ••••••••"

"باج ٹھٹک کر پیچھے ہٹا۔

"تم نہیں جانتے چاچا۔" سانولی نے پھر کہنا شروع کیا۔ "تمہاری دنیا اور ہے اور اندھوں کی دنیا اور۔ چاچا تم کتنے اچھے، کتنے مہربان ہو۔ جب میں تمہاری آواج سنتی ہوں تو گھنٹوں اس کی مٹھاس اور پیار کے بارے میں سوچتی رہتی ہوں۔ جب کبھی لالہ (باپ) مجھے گسے ہوتا ہے تو میں سوچتی ہوں کہ کوئی بات نہیں میرا باج چاچا جو ہے۔ وہ مجھے لالہ سے کم پیار تو نہیں کرتا •••••• ٹھیک ہے نا"۔

اس دوران میں باج موچھ کا ایک سرا دانتوں میں ہلکے ہلکے چباتا رہا اس کی بات ختم ہو جانے پر اس نے تامل کیا اور پھر اس کے بدنما چہرے پر ایک دلکش مسکراہٹ پیدا ہوئی اور اپنا کھدرا ہاتھ اس کے سر پر رکھ کر بولا۔ "ہاں سانولی! یہ سچ ہے ••••••• لیکن •••••••اس بخت تم جاؤ"۔

"نہیں، نہیں چاچا میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں"۔

"اچھی لڑکی۔ سنو سانولی! اس ٹیم جاؤ۔ کل کریں گے باتیں ••••"

"او نہیں چاچا، کل تک صبر ہو سکتا تو میں بستر سے اٹھ کر کیوں آتی؟"

سب دم بخود۔

کارخانے کے کمرے میں ایک بار پھر سانولی کی آواز گھنٹی کی طرح گونج اٹھی۔ "باج چاچا! تم سمجھتے نہیں۔ میں تم سے باتیں کرنے آئی ہوں۔ اس بخت یہاں کوئی نہیں۔ جبھی تو میں تم سے باتیں کرنا چاہتی ہوں"۔

"کیا باتیں کرنا چاہتی ہو"

"باج چاچا!" اب سانولی کی آواز بدل گئی۔ اس نے توقف کیا اور پھر بولی۔ "باج چاچا! ••••• کلدیپ بابو بہت اچھے ہیں۔ ••••••• وہ کہتے تھے کہ میری آنکھیں ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ میں جنم کی اندھی نہیں ہوں نا! اس لئے •••••••اور ••••وہ•••••کہتے تھے کہ تم سے بیاہ ••••• بیاہ کروں گا"۔

اس پر باج نے اپنی ڈاڑھی کو مضبوطی سے مٹھی میں پکڑ لیا۔

"کون کلدیپ؟"

"وہ جو نئے آئے تھے۔ وہی ناں!"

"کیا کہتا تھا وہ••••••••"

"وہ کہتے تھے۔ سانولی! تم مجھے بڑی پیاری لگتی ہو۔ میں کہتی میں اندھی ہوں، بھلا اندھی لڑکیاں بھی کسی کو پیاری لگتی ہیں۔ وہ کہتے باؤلی! پیار کیا نہیں جاتا۔ ہو جاتا ہے۔ میں تمہیں پیار کرتا ہوں اور پھر تم جنم کی اندھی نہیں ہو۔ تمہارا علاج ہو سکتا ہے۔ تم دیکھنے لگو گی ••••••• پر چاچا! ان کو گئے پندرہ دن ہو چکے ہیں۔ لوٹ کے نہیں آئے ••••••اور ••••••اور •••"

یہ کہتے کہتے سانولی نے اپنی بے نور آنکھوں کو اور پھیلایا جیسے کچھ دیکھنے کی کوشش کر رہی ہو اور پھر جھینپ کر بولی۔ "••••••••اور میرا پاؤں بھی بھاری ہے ••••••"۔

باج نے دفعتاً کھل جانے والے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔

سانولی کچھ دیر کے لئے خاموش ہو گئی اور بغیر جوش و خروش کے ذرا غم میں ڈوبی ہوئی آواز میں اس نے پھر سلسلہ کلام جاری کر دیا۔ "آج بستر پر لیٹے لیٹے میں سوچ رہی تھی کہ اگر وہ نہ

آئے تو ۰۰۰۰۰۰۰؟ ۔ ۔ ۔ لالہ بہت دکھی ہے ۔ وہ کہتا ہے گھگی اور نکی دونوں کھراب ہیں ۔ ایک کو ایسا روگ لگ گیا ہے جس سے بچنا محال ہے ۔ دوسری کا پاؤں ۰۰۰۰۰۰۰۰۰سچ باج چاچا ۔ لالہ بے حد دکھی ہے ۔ وہ رات رات بھر روتا رہتا ہے ۔ ۰۰۰۰۰۰۰۰۰وہ مجھ سے پیار کرتا ہے ۔ مجھے گلے سے لگا کر کہتا ہے ۔ یہ میری رانی بیٹا ہے ۔ اسے پاپ چھو کر بھی نہیں گیا ۰۰۰۰۰ لیکن اسے نہیں ملوم کہ میرا پاؤں بھی ۰۰۰۰۰ میں سوچتی ہوں کہ اگر کلدیپ بابو نہ آئے تو ۰۰۰۰۰۰۰لالہ کو ملوم ہو جائے گا وہ مرجائے گا ۔ ایک دم مرجائے گا ۰۰۰۰۰۰۰۰ یہ سوچتے سوچتے مجھے رونا آگیا ۔ مجھے کچھ نہیں سوجھا تو جی کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے تمہارے پاس چلی آئی ۰۰۰۰۰۰۰ لیکن وہ جرور آئیں گے ۰۰۰۰۰ہیں نا! چاچا! وہ آئیں گے نا؟"

سب لوگ دم سادھے بیٹھے رہے ۔

باج نے ایک بار پھر اپنا بھاری بھرکم ہاتھ اس کے سر پر رکھا اور اسے تسلی دیتے ہوئے کہا ۔ "ہاں سانولی! کلدیپ آئے گا ۰۰۰۰۰ وہ جرور آئے گا ۰۰۰۰۰"

تھرتھراتی ہوئی مدھم روشنی میں باج نے دیکھا کہ سانولی کی بے نور آنکھوں کے گوشوں میں آنسو دمک رہے ہیں ۰۰۰۰۰۰۰۰

"اور اب سانولی تمھیں واپس جانا چاہیئے" ۔

یہ کہہ کر باج نے دروازہ آہستہ سے کھولا اور سانولی کی پیٹھ پر ہاتھ رکھ کر اسے آگے بڑھایا ۔ وہ قدم بقدم چلنے لگی ۔

باج دروازے پر ہی رک گیا ۔ وہ سانولی کو جاتے ہوئے دیکھتا رہا ۔ ہر چہار جانب خاموشی کی حکومت تھی ۔ تاروں کی مدھم روشنی میں سانولی ایک سائے کے مانند دکھائی دے رہی تھی ۔ اس کے لئے اندھیرا اجالا ایک برابر تھا ۔ وہ بلا کسی ہچکچاہٹ کے بڑھتی چلی جارہی تھی ۔

باورچی خانے کے کونے سے گزر کر حویلی کی پر شکوہ لیکن سیاہ دیوار کے سیاہ تر سائے تلے سے ہوتی ہوئی جب وہ بڑے پھاٹک پر بنی ہوئی اس اونچی محراب کے تلے پہنچی ۔ جس کے نیچے سے تین ہاتھی اوپر تلے آسانی سے گزر سکتے تھے تو باج کو میلے کچیلے کپڑے پہنے وہ ابھرے بدن کی بلکی پھلکی اندھی لڑکی بہت کمزور ، بے حقیقت اور بے دست و پا دکھائی دی ۔ جیسے وہ کوئی رینگتا ہوا حقیر کیڑا ہو ۔

باج وہیں پر کھڑا رہا ۔ اس نے آسمان کی وسعتوں ، حویلی کی بلند و بالا دیواروں ، بے جان عمارتوں کے سلسلوں اور پھر اس طویل و عریض دالان پر نگاہ دوڑائی جس کی فضا میں کئی کچے کنوارے قہقہے گونجتے گونجتے دفعتاً دردناک چیخوں میں تبدیل ہو گئے تھے ۰۰۰۰۰۰۰

رات ، کوئی رات اس قدر کالی اس کے دیکھنے میں پہلے کبھی نہیں آئی تھی ۰۰۰۰۰۰ اور تارے خون کے چھینٹوں کے مانند دکھائی دے رہے تھے ۔

۱۰

جوں جوں دن گزرتے جارہے تھے۔ توں توں سانولی کے رازداں کاریگروں۔ خصوصاً باج کی پریشانی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ سانولی اپنی بہنوں کی طرح برباد ہو۔ نل کے پاس یا دروازے کی سیڑھیوں پر، یا اونچی محراب تلے بیٹھی ہوئی اندھی سانولی کی حالت انہیں بڑی قابل رحم دکھائی دیتی تھی۔ آتے جاتے جب بھی ان کی اس سے مڈبھیڑ ہوتی تو سانولی نے کبھی ان سے۔۔۔ یا باج سے دوبارہ اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا۔

بیس دن اور بیت گئے۔

پنجاب برباد ہورہا تھا۔ وارث شاہ کا پنجاب، گندم کے سنہرے خوشوں والا پنجاب، شہد بھرے گیتوں والا پنجاب، کونجوں اور رہٹوں والا پنجاب!! اور اس کی ایک بے نور آنکھوں والی حقیر سی بیٹی بھی برباد ہورہی تھی۔

ایک رات جب کہ سب کاریگر کھانے دانے سے فارغ ہوکر حسب معمول کارخانے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے تو قدرتی طور پر سانولی کا ذکر شروع ہوگیا۔ ان سب کی دلی تمنا یہی تھی کہ کاش! سانولی کا اپنی بہنوں کا سا حال نہ ہو۔ لیکن وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے تھے کہ یہ ناممکن ہے اور یہ سوچنا پرلے درجے کی حماقت ہے۔

باج کھلے دروازے میں کھڑا کالے آسمان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بونگے کو سردی محسوس ہوئی تو اس نے چلا کر کہا۔ "اوئے منوں دیا مسزاز! دروازہ بند کردے، سالے تو تو سانڈ ہورہا ہے پھول کر، ہم گریبوں کا تو کھیال کر"۔

اور کوئی موقعہ ہوتا تو باج بونگے کی گالی کے جواب میں کوئی نئی اور بھاری بھرکم گالی کی اختراع کرتا۔ لیکن اس وقت اس نے چپکے سے دروازہ بھیڑ دیا اور خود بڑی میز پر ہاتھ ٹیک کر کھڑا ہوگیا۔

سب اسے ہنسنے بولنے کے لئے اکساتے رہے لیکن جب اس کا موڈ ٹھیک نہیں ہوا تو انہوں نے بڑے اصرار سے پوچھا۔ "بئی باج آج کیا بات ہے"۔

"میں سوچ رہیا ہوں"۔

بونگے نے سردی لگنے کے باوجود اٹھ کر جھٹ سے کبڈی کھیلنے والے کھلاڑی کا سا پوز بنایا اور قریب آکر بولا۔ "بچے بادشاہو! کیا سوچ رہے ہو؟"

باج نے اس کی جانب فلسفیانہ انداز سے دیکھا تو اسے ہنسی آگئی۔ لیکن باج کے تیور ویسے کے ویسے رہے۔

بونگے کو مسخرانہ انداز میں اپنی جانب دیکھتے ہوئے باج نے کلے کے اندر زبان گھمائی

اور پھر سر کو حرکت دے کر اس نے بونگے اور دیگر ساتھیوں پر چھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور کہا،

"میں ایک بات سوچ رہا ہوں"۔

"کیا؟" سب کو اس کا فلسفیانہ موڈ دیکھ کر ہنسی آ رہی تھی جسے وہ بمشکل روکے ہوئے تھے

باج نے سر کو یوں جھٹکا دیا جیسے وہ بہت بھاری جہاندیدہ بزرگ ہو اور پھر میز کو دونوں ہاتھوں سے مضبوطی سے پکڑ کر بولا،

"پنجاب میں کتا جلم ہو رہا ہے۔ ایسا کھون کھرابا نہ دیکھا نہ سنا ٹھیک؟"

"ٹھیک"۔

"۰۰۰۰۰۰ اور پھر ہندو اور سکھ عورتوں کی جو بجتی (بے عزتی) پچھمی پنجاب میں مسلمان کر رہے ہیں۔ وہ سب تم کو مالوم ہے۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک" سب نے ذرا جوش میں آ کر جواب دیا۔

اب کچھ دیر تامل کرنے کے بعد باج دھیرے دھیرے سپاہیانہ انداز میں سیدھا کھڑا ہو گیا اور ایک ایک لفظ پر زور دے کر بولا،

"پر ۔ ۔ ۔ ۔ میں سوچتا ہوں کہ مسلمان گسے میں آ کر جو بیاکوپھی (بیوقوفی) کر رہے ہیں۔ وہی بیاکوپھی ہم چنگے بھلے اپنی بہنوں اور بہو بیٹیوں کے ساتھ کر رہے ہیں۔ بتاؤ مسلمانوں کو دوش دینے سے پہلے ہمیں کھد کو شرم مسوس نہیں ہونی چاہیئے"۔

محفل پر سناٹا چھا گیا۔

ننھے سے چراغ کی پتلی سی تھر تھراتی لو کی روشنی میں باج نے اپنی موٹی اور لمبی انگلی اٹھاتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا،

"۰۰۰۰۰۰ ایسے ہی پاکستان میں گھکی، نکی اور سانولی کی ہزاروں لاکھوں بہنیں ہوں گی۔ تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یا وہ کس ججت (عزت) کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کیوں ایک دوسرے کو جانگلی کہتے ہیں؟"

اتنے میں دروازہ بڑے دھماکے کے ساتھ کھلا۔ سب نے ادھر نگاہ ڈالی تو دیکھا کہ سانولی دروازے کے بیچوں بیچ کھڑی ہے۔ اس کے روکھے سوکھے بال روئی کی طرح دھنے ہوئے ہیں۔ اس کے بازو پھیلے ہوئے ہیں۔ اس کے اعضاء میں لرزش ہے۔ پیشتر اس کے کہ کوئی بولتا، وہ زور سے چلائی،

"باج چاچا! باج چاچا!"

زندگی میں پہلی بار باج کا کلیجہ دھک سے ہو کر رہ گیا۔

"باج چاچا! باج چاچا!"

سانولی کی آواز فضا میں دوبارہ گونجی۔

"ہاں، ہاں سانولی بول۔ گھبرائی ہوئی کیوں ہے تو، بول....."

"وہ آگئے!"

"کون؟"

"کلدیپ بابو آگئے۔"

"آگیا وہ؟" سب خوشی کے مارے چلّا اٹھے۔

"اور آتے ہی وہ مجھے ڈاکدار کے پاس لے گئے۔ ڈاکدار نے کہا۔ آنکھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔ لیکن علاج بہت دن کرنا پڑے گا....."

باج نے بڑھ کر سانولی کے دونوں کمزور کندھوں کو اپنے ہاتھوں میں دبوچ لیا اور اُسے ہلا کر بولا:

"سچ، کب؟"

"ہاں سچ۔ اُن کی ماتا جی بھی ساتھ آئی ہیں۔"

"اری تو وہ اتنے دن کہاں گیب رہا؟"

"انھوں نے مجھے بتایا کہ پہلے اُن کی بات کوئی نہیں مانتا تھا۔ انھوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ بڑی مشکلوں سے انھوں نے اُن کی بات مان لی۔ وہ کہتے ہیں کہ ایسا رگڑا جھگڑا ہوا کہ میں کھت بھی نہ لکھ سکا۔ لکھتا بھی تو کیا لکھتا....."

"او ہو ہو ہو۔" سب بے اختیار ہنسے۔

سانولی نے جھوم کر کہا۔

"وہ میری منّتیں کرنے لگے، کہنے لگے۔ سانولی مجھے ماپھ کر دو....... اگر تمہیں کوئی دُکھ پہنچا ہو۔ ہم کوئی امیر نہیں ہیں، لیکن سب کام ٹھیک ہو جائیں گے... ہم تمہیں دلّی لے جائیں گے....."

اب سب لوگ سانولی کی طرف بڑھے اور اپنے اپنے انداز اور لہجے میں خوشی کا اظہار کرنے لگے۔

آخر باج نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر کہا:

"بھائیو! ٹھہرو۔ میرے کھیال میں اب سانولی کو آرام کرنا چاہیئے۔ اِسے رات کے سمے گھر سے باہر نہیں رہنا

چاہئے ..... سانولی! ہم بہت کھٹن ہیں۔ اب کل باتیں ہوں گی۔ چلو .... اب تم جلدی سے گھر جاؤ۔"

سانولی کے ساتھ کسی کا جانا مناسب نہیں تھا۔ کیوں کہ وہ گھر والوں کی چوری سے آئی تھی۔

سب اُسے انتہائی پیار سے کارخانے کے دروازے تک چھوڑتے گئے۔

آٹھ، دس منٹ کے بعد جب سارا ٹولہ بازار جانے کا پروگرام بنا کر باہر نکلا تو اونچی محراب تلے سے گزرتے وقت انھیں دیوار کے ساتھ ایک میلا لا مٹ سا نظر آیا۔

وہ سب رُک گئے۔

باآج نے آگے بڑھ کر غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ سانولی ہے۔

"سانولی! تم ابھی تک گھر نہیں گئیں؟"

سانولی نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔

"باآج چاچا! نہ جانے میرے دل کو کیا ہو گیا ہے۔ کچھ سوجھتا ہی نہیں کہ کیا کروں۔ ذرا دم لینے کے لئے رک گئی ..... باآج چاچا! سوچتی ہوں۔ ایسی کھٹنی کی بات کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن چاچا تمہیں میری بات پر یقین ہے نا؟"

باآج نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کی جانب سوالیہ انداز سے دیکھا۔ سب چُپ تھے۔ وہ بھی چُپ رہ گیا۔

سب کو خاموش پا کر سانولی نے اپنا سوال دُہرایا۔ "آپ سب کو یقین نہیں آتا؟"

باآج کی آنکھوں کے گوشے پُرآب ہو گئے۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر سانولی کے سر پر رکھ دیا اور پھر دھیمی آواز میں بولا:

"ہمیں یقین ہے ـــ اور دیکھو تمہیں بے وقت گھر سے باہر نہیں رُکنا چاہئے، اور پھر سردی پڑنے لگی ہے کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ۔"

سانولی نے اُس کی مضبوط کلائی کو اپنی کمزور انگلیوں سے چھو کر پوچھا۔ "پر باآج چاچا! آپ سب لوگ بے وقت کہاں جا رہے ہیں؟"

"ہم۔" باآج نے پدرانہ پیار سے لرزتے ہوئے اُس کے گال کو چھوتے ہوئے جواب دیا۔ "..... سانولی بیٹی! ہم اِس کھوشی میں برفی کھانے جا رہے ہیں۔"

(مشمولہ "پہلا پتھر"۔ سنِ اشاعت: دسمبر ۱۹۵۶ء)

بلونت سنگھ

مہمان

سردی میں ٹھٹھرا ہوا، ہاتھ پتلون کی جیبوں میں چھپائے بشمبر خدا خدا کر کے ہوٹل تک پہنچا اس کا جی چاہتا تھا کہ فوراً بستر میں گھس کر لحاف پلیٹ لے اور سو جائے۔ لیکن ابھی اس نے کھانا بھی نہ کھایا تھا۔ وہ بھٹیوں کے قریب جا کھڑا ہوا، ہاتھ سینکتے ہوئے اس نے پوچھا۔ کیا پکایا ہے آج ---- مونگ کی دال اور کدو ---- کدو سے اس کو نفرت تھی۔ ہوٹل والے ماہوار کھانے والوں کے لئے بغیر گھی کی، سب سے گھٹیا سبزی پکاتے تاکہ کھانے والا سپیشل ترکاری یا گوشت وغیرہ کی پلیٹ خریدنے پر مجبور ہو جائے۔

.... سپیشل کیا ہے؟ .... گوبھی، آلو، مٹر، میٹ بھی ہے، کوفتہ، قیمہ ....

اس کے ہاتھوں کی ٹھنڈک اب دور ہو چکی تھی۔ اس نے مٹھیاں کھولتے اور بند کرتے ہوئے سوچا کہ اگر آدھی پلیٹ روغن جوش لیا تو چار آنے خرچ ہونگے، اگر نصف پلیٹ قیمہ تو تین آنے اور گوبھی کی آدھی پلیٹ دو آنے میں ہی مل جائے گی۔ .... تو بھئی آدھی گوبھی سپیشل اور باقی جو کچھ بھی ہو۔

پتھر کی میز کے آگے کرسی پر بیٹھ کر وہ انگلیوں سے طبلہ بجانے لگا۔ پھر اس نے کوٹ کے کالر سیدھے کر لئے جو کان ڈھانپنے کے لئے اوپر اٹھا دیئے گئے تھے۔ سامنے ایک جاپانی تصویر تھی۔ دریا کا کنارہ .... افق میں اونچے نیچے ٹیلے .... پیش منظر میں دو جاپانی عورتیں نہانے کا لباس پہنے ہنستی چلی آرہی تھیں ان کے درمیان ایک چھوٹی سی لڑکی جس کے ہاتھ سے اس کا ربڑ کا غبارہ چھوٹ کر نیچے پانی میں گر پڑا تھا۔ وہ اچک کر اس کو پکڑنے کی فکر میں تھی۔ نہ معلوم لڑکی کا لباس عورتوں کی طرح کا کیوں تھا۔ چھوٹی سی کمسن لڑکی تھی۔ اگر اس کو پورے لباس کی بجائے صرف ایک جانگھیہ پہنا دیا جاتا تو کیا ہرج تھا۔ کس قدر گھٹیا تصویر تھی نہ کوئی کلر سکیم، نہ توازن ...... عورتیں بالکل بے جان، احساسات سے خالی جیسے سلولائڈ کے ببولے ---- ان کے پاؤں کی ٹکر سے جو پانی اٹھتا دکھایا گیا تھا وہ ٹخنوں کے قریب اٹھنا چاہیئے تھا اور پھر ٹانگوں سے ٹکرانے کے بعد میں پانی کا کچھ دور تک ناہموار ہونا سمجھ میں آسکتا ہے۔ لیکن یہ بات فہم سے باہر ہے کہ ٹانگیں تو ابھی دور اور پانی ان کی سیدھ میں دو گز ادھر سے ہی اچھلنے لگا ہے۔ گھٹیا قسم کے آرٹسٹ اپنا الو سیدھا کرنے کے لئے دس دس منٹ میں ایسی تصویریں بنا کر روپیہ کماتے ہیں

نوکر ادھر سے گزرا اے ردی لا۔

اس کی آواز سن کر ہوٹل کا بھاری بھرکم منیجر ادھر چلا آیا۔ اس کا منہ ہمیشہ پان کی پیک

سے بھرا رہتا اور پیک روک روک کر بڑی مشکل سے بات کیا کرتا تھا۔ طبیعت کا برا نہ تھا۔ لیکن اس کی اس عادت سے بشمبر کو سخت گھن آتی تھی۔ "بابو بشمبر لعل! ••••••" اس نے منہ کھول کر ایک دم بند کر لیا۔ "تم سے کوئی ملنے آیا تھا"۔

"مجھ سے ملنے کے لئے؟"

مینجر نے بڑی مشکل سے منہ کھولا۔ "ہاں تمہارا اگیسٹ ••••••"

یہ مہمان کون تھا۔ آخر اس سے ملنے کے لئے کون آسکتا تھا۔ وہ بہت کم لوگوں واقف تھا۔ اور جو تھوڑے بہت شناسا تھے ان کو اس کی جائے رہائش کا پتہ معلوم نہ تھا۔ وہ ایک معمولی کلرک تھا۔ مشکل سے گزر ہوتی تھی۔ صرف دو تین مقامی دوستوں کو اس کا ٹھکانا معلوم تھا۔ سو وہ کبھی کبھار آتے ••••• آخر کون آیا تھا؟

"مینجر صاحب اس کا نام کیا تھا؟"

"نام تو میں نے پوچھا نہیں •••••• گورے گورے سے ••••••"

"گورے گورے ••••••• بہت لوگ گورے ہو سکتے ہیں۔ گورے ہونے کی بھی کوئی نشانی ہے۔ بعض لوگ کس قدر بے وقوف ہوتے ہیں ------

نوکر نے تھالی آگے رکھ دی۔

اس کی موجودہ بے کیف اور خالی خالی زندگی میں، جب کہ وہ بالکل تنہائی اور خاموشی سے دن گزار رہا تھا۔ اس خبر نے ہلچل سی پیدا کر دی۔ اس وقت وہ کسی مہمان کی آمد گوارا نہ کر سکتا تھا۔ اس کا کمرہ اس قدر چھوٹا تھا کہ ایک اور چارپائی ڈال دینے پر اندر چلنا پھرنا بھی دوبھر ہو جاتا۔ پیسے اس قدر کم کہ کسی مہمان کو ایک دن بھی کھانا کھلانا دشوار تھا۔ اور پھر مہمان مہمان میں بھی فرق ہوتا ہے۔ مثلاً وہ لانبی داڑھی اور بڑے پگڑ والے بزرگ جو دو ڈھائی ماہ بعد جب کبھی آٹپکتے تو جینا محال ہو جاتا۔ وہ اپنی داڑھی جھٹکتے ہوئے اس کے ساتھ اپنی دور دراز رشتہ داری کی اہمیت واضح کرنے کے بعد خشک باتوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیتے۔ ان کی مقدمہ بازیاں، فلاں رشتہ دار نے ان سے کیا کہا اور انہوں نے اس کو کیا جواب دیا۔ وہ عورت جو ان کے بھانجے نے بھگائی تھی۔ دراصل اس نے خود نہیں بھگائی تھی۔ بلکہ ایک رات عورت خود اس کے پاس آئی بولی چلو مجھے لے چلو کہیں نہ کہیں لے چلو میں تمہاری داسی ہوں۔ وہ بچارا کل کا چھوکرا کیا جانے آگیا جھانسے میں ----- اب بچہ کے وارنٹ نکلے ہوئے ہیں •••••••••• یا پھر، بھئی! ذرا انگریزی میں درخواست تو لکھ دو۔ اس نے درخواست کبھی نہ لکھی تھی اور پھر ان کی زبانی۔ جس بے ربط طریقے سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور جس طرح بار بار ایک ہی بات کی تاکید فرماتے وہ کہتا جناب! یہ بات ایک مرتبہ لکھی جا چکی ہے۔ بار بار اس بات کی تکرار انگریزی میں مناسب نہیں ہوتی تو وہ حیرت سے منہ کھولے اس کی طرف دیکھنے لگتے جیسے کہہ رہے ہوں۔ "اے

توکل کا چھوکرا مجھے سبق پڑھاتا ہے؟ اب بے تو؟" جب وہ آتے تو اس کا دل چاہتا کہ وہ اس دروازے سے آئیں تو ادھر کے دروازے سے وہ کھسک جائے ••••••اور کبھی اس کے پھوپھا کا لڑکا چونی گاؤں سے ادھر آنکلتا تو بجائے نمستے کرنے کے وہ بازو پھیلا کر اس کے گلے سے لپٹ جاتا۔ ساتھ ہی زور زور سے بے معنی الفاظ اس کے منہ سے فر فر نکلنے لگتے۔ باتیں اس قدر زور زور سے کرتا کہ راہ ادھر ادھر کے لوگ ان کی طرف دیکھنے لگتے •••••••• گھر ہو، گلی ہو، بازار ہو، کوئی جگہ ہو اس کا رویہ تبدیل نہ ہوتا۔ کبھی وہ ایک نہایت ہی معمولی بات اس قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرتا کہ اس کا جی چاہتا اپنے بال نوچ لے۔ چونی چھکڑے کے بھاری بھرکم پہیئے کے کیچڑ میں دھنس جانے کی داستان چھیڑ بیٹھتا۔ صاحب! پہیہ کیچڑ میں دھنس گیا۔ دو بیل زور لگا رہے ہیں۔ اس زور آزمائی میں ان کی دمیں تن کر سیدھی ہو جاتی ہیں لیکن پہیہ ہے کہ اور بھی دھنسا جاتا ہے۔ چھکڑے والے نے بھی زور لگانا شروع کیا۔ لیکن پہیہ ••••• جیسے کنوئیں میں اترتا جارہا ہو۔ راہ ادھر ادھر کے دو چار راہگیر بھی لنگوٹا کس کر ایک بڑے لٹھ سے دوسرے پہیئے کو اڑیں دیکر گھمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ کچھ لوگ دھکے دے کر اسے نکالنا چاہتے ہیں۔ لیکن سب بے سود ••••••آخر ہوتا کیا ہے؟ وہ خود کیچڑ میں گھس جاتا ہے۔ اور پہیئے کو کندھا دے کر جو بلہ بولتا ہے تو پہیہ کیچڑ سے باہر، بیل بھاگتے چلے جاتے ہیں رکتے ہی نہیں۔ خدا خدا کر کے اگر یہ بات ختم ہو جاتی تو وہ فوراً اسی قسم کا ایک دوسرا قصہ لے بیٹھتا ••••••• یا پھر اس کے بڑے ماموں صاحب تھے۔ خاموش، چپ چاپ چار پائی پر لیٹے رہتے سارا سارا دن پڑے رہتے۔ اس کو ان کے آنے پر کوئی خاص تکلیف محسوس نہ ہوتی تھی لیکن عادات ان کی بھی عجیب تھیں جو پگڑی جس طرح باندھ کر آتے جب تک اس کے پاس ٹھہرتے اس کو اسی طرح باندھے رکھتے۔ کبھی کھول کر از سر نو نہ باندھتے نہ معلوم کسی غیر سے بندھوا کر آتے تھے۔ رات کو سونے سے پہلے اسے قریب کی کرسی پر رکھ دیتے صبح اٹھتے تو منہ ہاتھ دھونے کے بعد پھر اس کو سر پر رکھ لیتے ویسے تو پگڑی کا کچھ نہ بگڑتا تھا۔ جس بھدے طریقہ پر وہ بندھی ہوتی تھی۔ اس سے زیادہ بھدی تو خیر کیا ہو سکتی تھی۔ لیکن ڈھیلی ضرور ہو جاتی مگر اس کے ڈھیلے ہو جانے کی ان کو پرواہ نہ تھی۔ اسی کو تھپتھپا کر سر پر جمائے رکھتے وہ کبھی کام کے بغیر نہ آتے تھے اتنے بڑے شہر میں یونہی چلے آنا تو محض فضول خرچی تھی۔ اس لئے ضرور کسی نہ کسی کام سے آتے۔ لیکن جب تک وہ کام پورا نہ ہو ان کا اس کے ہاں رہنا لازمی ہوتا تھا۔ سارا دن چار پائی پر پڑے رہتے ••••• معمولی اردو پڑھ لکھ لیتے جو کتاب یا اخبار ہاتھ لگتا بلا تکلیف پڑھنا شروع کر دیتے غلط سلط جو کچھ بھی سمجھتے اس کو ختم کر کے چھوڑتے۔ روسو کا معاہدہ عمرانی دو ڈھائی گھنٹہ میں ختم کر کے کہتے۔ بشمبر! یہ پوتھی تو میں نے ختم کر دی۔ کچھ اور دو۔ ماموں! آپ کو پسند بھی آئی یہ پوتھی؟ بھئی میری سمجھ میں تو آئی نہیں لیکن بغیر پڑھے میں چھوڑتا بھی نہیں ••••••• اس کے بعد اگر ان کو پستالوزی یا کانٹ پڑھنے کو مل جاتا تو وہ ہرگز اعتراض نہ کرتے پھر شام

ہو جاتی تو ایک موٹا سا کھیس لپیٹ کر بلا تکلف مال روڈ کی سیر کے لئے چل کھڑے ہوتے ۔ بشمبر کو ہمراہ ضرور لیجاتے اور وہ پتلون کوٹ پہنے بھیگی بلی کی طرح ساتھ ہولیتا ••••••• کوئی دوست ملجائے یا کسی خوش پوش شریف آدمی سے باتیں شروع ہوجائیں •••••• لیکن وہ اپنی عادت نہ چھوڑتے تھے ۔

لیکن اب وہ بزرگ بنوں میں تھے وہاں ٹھیکیداری کا کچھ کام تھا ۔ چونی کو اس کے بڑے بھائی نے ماما نگر بلالیا تھا ۔ گاؤں میں انہیں دنوں ایک بڑا میلہ لگنے والا تھا اس لئے ماموں جی کی تشریف آوری کا احتمال بھی نہ تھا ••••• شاید شہباز سنگھ ہو ، وہ اکٹھے پڑھتے رہے تھے ۔ اب وہ موٹر ڈرائیور تھا ۔ سہارن پور سے دہرہ دون تک ۔ دہرہ دون سے سہارنپور تک ، تین ماہ پہلے اس کو شہباز کی ایک چھٹی ملی تھی ۔ لکھا تھا کہ وہ پنجاب آنے والا ہے ۔ شاید وہی آیا ہو ۔ مارا مارا پھرتا ہو گا ۔ کہیں سے پتہ چل گیا ہو گا میرا ۔

بچارا شہباز سیدھا سادا سکھ تھا ۔ بقول شخصے ، الٹ پلٹ کر جدھر سے دیکھو سکھ ہی نظر آتا تھا ۔ وہ اس کا لنگوٹیا یار تھا ۔ لڑکپن میں وہ خوب موٹا تازہ تھا ۔ ان کی پہلی ملاقات نہ معلوم کس جگہ ہوئی تھی ••••••••• اس میں تو شبہ نہ تھا کہ وہ •••••• خدا جانے اس اسکول کا کیا نام تھا •••••••• خیر اس اسکول میں شہباز ہی اس کو لے گیا تھا ۔ دونوں دوست تھے ۔ دونوں کی صلاح ٹھہری کہ وہ دونوں ایک ہی اسکول میں پڑھیں ۔ چنانچہ اس نے اپنا اسکول چھوڑ دیا اور شہباز کے اسکول میں داخل ہو گیا ۔ چھوٹا سا پرائیویٹ اسکول تھا ۔ جہاں ہمیشہ لڑکوں کی کمی محسوس کی جاتی تھی ۔ اور اسی لئے نئے لڑکوں کی جستجو رہتی ۔ طالب علم نہ صرف کتابیں پڑھتے ، فیسیں دیتے ، مار کھاتے بلکہ اپنے غریب اسکول کے لئے نئے رنگروٹ بھی پھانس کر لاتے ۔

ایک چھوٹے سے گدلے تالاب کے قریب بوسیدہ سی عمارت ۔ باہر لوہے کی چادروں کا ایک سائبان اور اس جگہ بجلی کے تار سے بندھا ہوا ریل کی پٹڑی کا ٹکڑا جو گھنٹی کا کام دیتا تھا ۔ نہ کوئی نوکر نہ چپراسی ۔

ہیڈ ماسٹر ایک بارعب شخص تھا ۔ اگرچہ اکہرے بدن کا آدمی تھا ۔ لیکن ٹانگیں خوب پھیلا پھیلا کر چلتا ۔ پہلوانوں کی طرح جھوم جھوم کر قدم اٹھاتا ۔ اسکول کی چھت سے جب لڑکوں کو وہ آتا دکھائی دیتا تو شور مچ جاتا ۔ ہیڈ ماسٹر صاحب آگئے ۔ ادھر جب ہیڈ ماسٹر کو اسکول کی عمارت دکھائی دیتی تو وہ مونچھوں کو انگلیوں سے چھونے لگتا •••••• راستے میں لڑکے ہاتھ جوڑ جوڑ کر نمسکار کرتے ۔ وہ دیدہ دانستہ خوب اینٹھ سے نمسکار کا جواب دیتا ۔ کبھی وہ رک جاتا کسی لڑکے کا کان پکڑ کر کہتا " کیوں بے چمٹے ! کل آدھی چھٹی کے بعد کہاں چل دیا تا ۔ ایں ؟ " یہ چمٹے " اس کی اپنی اختراع تھی ۔ نہ معلوم اس کا مطلب کیا تھا ۔

اسکول کی دوسری اہم ہستی •••••• ماسٹر جگل کشور •••••• ایک آنکھ پتھر کی ، گورا چٹا

ہلکاپھلکا، چلتا پرزہ، ہونٹ خوب سرخ، دانت از حد سفید، گالوں کی ہڈیاں، ابھری ہوئی، وہ کسرت بھی کرتا تھا۔ سننے میں آیا تھا کہ وہ کشتی لڑا کرتا تھا۔ لڑکوں کو خوب پیٹتا•••• شہباز نے اسے بتایا کہ دیکھو پہلے پہل رعب جمانے کے لئے جنگل کشور تمہیں پیٹے گا گھبرانا نہیں •••••••• ادھر یہ بھی پرانا پاپی تھا۔ چھوٹی موٹی مار کو وہ خاطر میں کب لاتا تھا۔ اسی قسم کی مشترکہ صفات پر تو ان کی دوستی قائم تھی۔

پہلے پہل جب وہ جنگل کشور کی جماعت میں بیٹھا تو ماسٹر صاحب نے فرمایا کہ دوسرے دن سب لڑکے اردو سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کے لئے نئی کاپیاں خرید کر لائیں۔ جب دوسرا دن ہوا تو بہت سے لڑکے تو کاپیاں لے آئے۔ لیکن وہ ان میں شامل تھا جو کاپیاں نہ لائے تھے۔ خیر اس دن جنگل کشور نے محض لعنت ملامت کرنے پر اکتفا کیا اردو کی چند سطور ترجمے کے لئے دیں دوسرے دن شہباز تو جماعت میں ہی نہ آیا باقی سب لڑکے ترجمہ کر لائے تھے سوائے دو کے۔ ان دونوں میں ایک وہ خود تھا۔ ماسٹر صاحب کی آنکھیں مارے غصہ کے خون کبوتر ہو گئیں۔ اس نے بید منگوایا پہلے تو دوسرے لڑکے کو بید پڑے۔ دونوں ہاتھوں پر چار چار۔ جب اس لڑکے کے ہاتھ پر بید پڑتی وہ ہاتھ جھٹک کر گھٹنوں میں دبالیتا، منہ سرخ ہو جاتا غرض اس طرح اس نے مار کھائی۔ پھر اس کی اپنی باری آئی۔ ماسٹر صاحب مارنے میں ماہر تو یہ مار کھانے میں۔ ماسٹر نے بید جو ماری تو اس کا ہاتھ جوں کا توں۔ دوسری مرتبہ پھر اس کا ہاتھ بے حس و حرکت بید لگنے پر اس کا ہاتھ سرخ ہو گیا۔ لیکن ہاتھ کو جنبش نہیں ہوئی۔ چار ضربوں کے بعد ماسٹر نے کہا بڑھاؤ دوسرا ہاتھ اس نے دوسرا ہاتھ اطمینان سے کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈال رکھا تھا۔ بولا، آپ اسی پر لگالیجئے باقی چار ••••••"زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد۔ ماسٹر دم بخود۔ اس نے بید پھینک دی۔ بے شرم! •••••• پھر اس کو کبھی مار نہیں پڑی۔

دوسرے دن جب شہباز نے اس کے مار کھانے کا معرکہ خیز کارنامہ سنا تو وہ اس کے گلے سے لپٹ گیا۔ محبت کا رشتہ مضبوط تر ہو گیا۔

اس کے بعد شہباز کا کارنامہ بھی یاد رہے گا۔ غریب اسکول نے نہ معلوم کیسے، پانچ چھ سو روپیہ جمع کرکے سائنس کا سامان خریدا تجویز یہ تھی کہ لڑکوں کو سائنس کی ابتدائی تعلیم بھی دی جائے۔ پہلے پہل شہباز اور وہ شیشے کی نلکیاں، پیالیاں، سپرٹ کے چراغ وغیرہ دیکھ کر پہلے خوش ہوئے۔ بڑی بے صبری سے ان کو استعمال کرنے کے موقع کا انتظار کرنے لگے۔ شروع شروع کے تجربے بھی کھیل تماشے سے کم پر لطف نہ تھے۔ لیکن جب نئے نئے فارمولے یاد کرنے پڑے اور پھر عملی تجربوں سے ان کو ثابت کرنے کی نوبت آئی تو سب لوگ بہت چکرائے خصوصاً سردار شہباز سنگھ •••••••• چنانچہ ایک دن علی الصبح دیکھا تو کھڑکی کے شیشے ٹوٹے ہوئے، سلاخیں مڑی ہوئی، سائنس کا کل سامان غائب۔۔۔۔۔ فرش پر جمی ہوئی گرد کی تہ پر پاؤں کے یہ بڑے بڑے

نشان اتنے بڑے بڑے پاؤں اسکول بھر میں کس کے ہو سکتے تھے؟۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ شہباز سے باز پرس ہوئی۔ وہ صاف مکر گیا۔ پولیس کو اطلاع دی گئی۔ شہباز کو اسکول کے سامنے والے بڑ کے نیچے کوتوال کے ہاتھوں وہ مار پڑی کہ خدا کی پناہ۔ اس کی پگڑی اتر گئی، بال بکھر گئے۔ دو تین دن حوالات میں رکھا گیا، جرح ہوئی، دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن وہاں وہی ڈھاک کے تین پات۔ آخر جب ہنگامہ ختم ہوا اور بات آئی گئی ہو چکی تو ایک پر سکون شام کو شہباز اس کو اپنے ساتھ شہر سے باہر لے گیا۔ ویرانے میں اس نے سائنس کا کل ٹوٹا پھوٹا سامان دکھادیا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بشمبر مسکرانے لگا۔ نوکر روٹی دینے آیا" کیوں بے وہ جو ملنے آئے تھے کیا وہ سکھ تھا؟" معلوم ہوا سکھ نہیں مسلمان تھے۔ "ابے مسلمان؟ سچ کہہ نا!۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔" مسلمان کون ہو سکتا تھا۔ وہ کئی اسکولوں میں پڑھ چکا تھا۔ جس جگہ والد صاحب کا تبادلہ ہو جاتا اس کو ہمراہ جانا پڑتا۔ نیا اسکول نئے ساتھی۔۔۔۔۔۔۔ اس نے ذہن پر زور ڈالا۔۔۔۔۔۔۔ مسلمان، آخر مسلمان کون۔۔۔۔۔۔ کہیں حنیف نہ ہو۔ ارے حنیف وہ کدھر بھول پڑا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ برف کے لڈوؤں کا شوقین دبلا پتلا، سر پر بے پھندنے کی ٹوپی، کم گو، سست رفتار۔۔۔۔۔۔ لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ وہ اس جگہ کیسے آیا۔ اس کو پتہ کیسے چلا۔ اوہ حنیف! افسوس کہیں بے چارا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس کے لئے یہ شہر اجنبی ہے لیکن کیسے ٹھیک پڑاوہ۔ اب ملے بغیر کیونکر معلوم ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہائے کاش آج وہ سرکس دیکھنے نہ جاتا۔۔۔۔۔۔ اب تو سالا بڑا ہو گیا ہوگا۔ کتنی بے تکلفی تھی دونوں میں۔ نہ کھانے میں پرہیز نہ پینے میں۔۔۔۔۔۔ اور تو اور پیٹنے میں بھی دونوں ساتھی تھے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان دنوں وہ اے پی مشن ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اسکول کی عمارت بیچ شہر میں تھی۔ ارد گرد تھوڑی سی خالی جگہ بھی چھوٹی ہوئی تھی۔ آدھی چھٹی میں لڑکے وہاں والی بال کھیلا کرتے تھے۔

حنیف یوں تو کم گو لڑکا تھا۔ لیکن جس کسی سے گھل مل جاتا تو پھر اس کی زبان بے لگام ہو جاتی۔ اس کی باتیں اور اس کے پروگرام ختم ہونے میں ہی نہ آتے تھے۔ اسکول کا کام شروع ہونے سے پہلے جب یسوع کے پہاڑی والے وعظ، یا لوقا، متی، یوحنا کسی رسول کی کتاب میں سے کچھ پڑھ کر سنایا جاتا۔ کبھی امریکن پرنسپل حضرت داؤد کے گیت پڑھتا۔ اس کے بعد دعا شروع ہوتی۔ "اے خدا! تو جو آسمان پر ہے۔۔۔۔" اس دوران میں حنیف کھسر پھسر کئے جاتا، کلاس میں، آدھی چھٹی میں، گھر میں، بازار میں ان دونوں کا ساتھ تھا۔

ایک مسٹر ینگ تھے۔ جو لڑکوں کو پیٹنے میں بڑا لطف محسوس کرتے تھے۔ وہ کلاس میں آتے اچک کر بجائے کرسی کے میز پر چڑھ بیٹھتے۔ مار پیٹ کا بہانہ ڈھونڈتے دیر نہ لگتی۔ چنانچہ لڑکوں کی پٹائی شروع ہو جاتی۔ اگر لڑکا بید کھانے کے بعد آہستہ آہستہ سسکیاں بھرتا ہوا روتا تو کہتے آہاہا کیسی میٹھی آواز ہے جیسے پہاڑی ندی بہہ رہی ہو۔ کبھی لڑکے کی دبی دبی سی چیخ نکل جاتی تو فرماتے یہ لیجئے گاڑی کے انجن نے سیٹی دے دی۔۔۔۔۔۔۔ تشبیہہ و استعارے کے معاملے پر

زیادہ غور نہ کرتے تھے ان کو تو کچھ نہ کچھ کہنے کی لت تھی ۔ بات بنے یا نہ بنے ۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ لڑکوں کے پیٹنے کا اصلی شوق انہیں کو تھا ۔ جس دن سب کے سب لڑکے کام کر کے لے آتے کوئی بہانہ مار پیٹ کا نہ سوجھتا تو سٹ پٹا کر رہ جاتے ۔

ایک صاحب اور تھے مسٹر پیٹرک ۔ یہ مخلوط قسم کے صاحب تھے ۔ خاصے سانولے آدھے تیتر آدھے بٹیر ۔ مسٹر پیٹرک کا رنگ کالا تھا ۔ لیکن منہ کے دہانے پر اندرونی سرخی جھلک دکھاتی تھی ۔ ان کے منہ کا دہانہ بھیڑیئے کے جبڑے کی طرح نظر آتا تھا ۔ لڑکوں کو ہر وقت نہیں پیٹتے تھے ۔ لیکن اگر اس پر اتر آئیں تو پھر اللہ دے اور بندہ لے ۔ اس قدر مارتے کہ ادھ مرا کر کے چھوڑتے ۔ وہ نوجوان تھے ۔ چاق چوبند ۔ سیماب کی طرح بے چین اور کلبلاتے ہوئے ۔ لڑکوں کو ڈرل بھی کرواتے تھے ۔ آنکھ جھپکتے میں زمین پر ہاتھوں کے بل ڈنڑ پیلنے کے انداز میں ••••• اور پھر جھٹ سے سیدھے کھڑے ہو جاتے ۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے ان کو سپرنگ لگے ہوئے ہوں میاں حنیف ان کی ڈرل سے بہت گھبراتے تھے اور وہ سست لڑکوں کے دشمن ۔

لیکن ایک ہستی ایسی بھی تھی جس کو وہ عمر بھر نہ بھلا سکتے ۔۔۔۔۔۔ مسٹر جیمز ۔۔۔۔۔ جیمز بچارے دائم المریض ۔ ان کے کندھے جھکے ہوئے ۔ گردن خم کھائی ہوئی ۔ پیشانی نیلی نیلی ابھری ہوئی رگیں ، بے نور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی ۔ مزاج چڑچڑا ۔ ہاتھ میں بالشت بھر کا بید ۔ ہنسنے کا تو خیر ذکر ہی کیا ۔ وہ مسکرانے سے کتراتے تھے ۔ ان کی مونچھیں نہ لمبی نہ چھوٹی ، نہ تنی ہوئی نہ گری ہوئی ••••• وہ لڑکوں کو مارتے وقت زیادہ تر اپنے چھوٹے سے بید سے کچوکے دیتے ، ایک مرتبہ مارتے تو چار مرتبہ کچوکے دیتے ۔ اس کے ساتھ ایک ہی سوال کی گردن کرتے "کیوں ؟" "جناب میرے سر میں درد تھا ۔" "کیوں ؟" "جناب میری بہن نے مجھے دسوتی خریدنے کے لئے بازار بھیجدیا تھا ۔" "کیوں ؟" "جناب میرے خالو آگئے تھے" "کیوں ؟" "جناب میری دادی اماں کا انتقال ہو گیا تھا ••••••" "کیوں ؟"

ان کی کسی ٹیچر سے دوستی نہ تھی ۔ آدھی چھٹی میں وہ شوربہ دار چنوں کے ساتھ ایک آدھ کلچہ کھا کر پانی پی لیا کرتے اور اپنے کمرے میں پڑے اونگھتے ۔

ایک مرتبہ آدھی چھٹی میں حنیف اور وہ بازار میں گھوم رہے تھے ۔ دفعتاً مسٹر جیمز سامنے آگئے ۔ یہ دونوں ان کو دیکھ کر اس قدر گھبرائے گئے کہ سلام کر دیا ۔ مسٹر جیمز نے اشارے سے ان کو بلایا اپنے کمرے میں لیجا کر بید سنبھالتے ہوئے پوچھا ۔ یہ سلام کرنے کا وقت ؟ حنیف بولا جناب ہم نے سلام ہی تو کیا کوئی بری بات تو نہیں کی نا! "کیوں ؟" "جناب ہم سے غلطی ہو گئی ۔" "کیوں ؟" "ہم آئندہ ایسا کبھی نہیں کریں گے" "کیوں ؟" "جناب ہم کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں توبہ کرتے ہیں ۔" "کیوں ؟" ••••••••••

اتنے میں ہوٹل کا مینجر ادھر سے گزرا ۔ بشمبر نے کہا ۔ مینجر صاحب! آپ نے غضب کر دیا

وہ تو میرے پرانے دوست تھے ۔ حنیف صاحب بہت دور سے آئے تھے بچارے یو ۔ پی کے رہنے والے ۔

"حنیف تو اسلامی نام ہے وہ مسلمان کہاں تھا ۔ وہ تو ہندو تھا ہندو" ۔

"ہندو تھا ؟ منیجر صاحب! ہوش کی بات کیجئے ۔ آخر یہ کیا مذاق ہے ۔ میرا مہمان آیا ۔ آپ نے اس کو بٹھایا تک نہیں .... دال بھجئے اور پیاز بھی ۔ واہ صاحب واہ!"

"اجی صاحب! وہ ہندو تھا ۔ کس گدھے نے کہدیا کہ وہ مسلمان تھا ۔ ہندو تھا ۔ کاشمیری ہوگا ۔ گورا چٹا .... کچوری کے سے گال ...."

کچوری کے سے گال! علم میں نیا اضافہ ہوا .... گورا چٹا کچوری کے سے گالوں والا شخص کون ہو سکتا تھا ۔ اس کے واقف کاروں میں کسی کا حلیہ ایسا نہ تھا ۔ کس قدر غیر ذمہ دار لوگ ہیں یہ ہوٹل والے ۔ کوئی ملنے آئے تو اس کا نام تک نہیں پوچھتے ۔ آخر کیونکر معلوم ہو کہ وہ کون شخص تھا .... یہ حلیہ .... ایک دھندلی سی صورت حافظہ میں محفوظ تھی ۔ گورا چٹا، یہ بڑی بڑی آنکھیں ۔ کچوری کے سے گال .... وہ اس حلیہ والے شخص سے ملا ضرور .... نہ معلوم کہاں .... یا شاید .... اب وہ دھندلی صورت واضح ہوتی جا رہی تھی .... لیکن کہاں! کب؟ .... یاد آگیا، یاد آگیا .... وہ ان دنوں ایک انگریزی اسکول میں پڑھتا تھا ۔ وہ اس کا ہم جماعت تھا ۔ کتنی مشکل سے یاد آیا، وہ اتنے گہرے دوست نہ تھے ۔ لیکن پھر بھی دونوں میں راہ و رسم تھی ...... وہاں زندگی دلچسپ تھی ۔ دو چار مرتبہ تو وہ اچھے خاصے دوستوں کی طرح مچھلیاں پکڑنے بھی گئے کانٹے پانی میں چھوڑ کر وہ ندی کے کنارے درخت کی چھاؤں تلے بیٹھے لوڈو کھیلا کرتے تھے ۔ مچھلی پکڑنا بھی ایک بہت صبر آزما مشغلہ ہے .... اب تو اسے اس کا نام بھی یاد نہ رہا تھا ۔ ان کی دوستی بتدریج بڑھ رہی تھی لیکن انہیں دنوں اس کے والد کا تبادلہ ہو گیا ورنہ یہ معمولی دوستی ضرور گہری دوستی میں تبدیل ہو جاتی

وہ چند سال جو اس نے انگریزی اسکول میں گزارے تھے اس کی زندگی کے بہترین سال تھے اس قدر پر لطف دن اس نے نا پہلے کبھی گزارے تھے ۔ اور نہ آئندہ اس بات کی امید ہی تھی اسکول کی ظاہری صورت بھی اور اسکولوں کی طرح نہ تھی ۔ بلکہ وہ دو عمارتیں کسی رئیس کی کوٹھیاں معلوم ہوتی تھیں ہلکے صندلی سے رنگ کی دلکش ہوادار عمارتیں ۔ عام طور پر ان کا اسکول یلو ہاؤس Yellow House کہلاتا تھا ۔ ان کوٹھیوں کے ارد گرد کھلے لان تھے ۔ روشوں کے دونوں کناروں پر گلاب کے گھنے پودے قطار در قطار کھڑے تھے ۔ موسم آنے پر یہ پودے بڑے بڑے زرد رنگ کے پھولوں سے لد جاتے ..... فیسیں بہت زیادہ تھیں صرف امرا کے لڑکے پڑھتے تھے یا اینگلو انڈین طلبا بھی تھے ۔ کسی کلاس میں بھی تیرہ چودہ سے زیادہ طالب علم نہ

تھے ۔ برآمدوں میں کلاسیں لگتیں ۔ وہ مختصر سی کلاسیں کس قدر بھلی معلوم ہوتی تھیں ۔ کوٹھی کے ہر کونے پر خوش پوش لڑکوں کی ایک کلاس ابتدائی جماعتوں کے لئے علحدہ عمارت تھی ۔ جونیئر کلاسیں برآمدوں میں سنیئر کمروں میں ۔ وہاں سب لڑکے خوب سج دھج کر آتے ۔ ماسٹروں کو پیٹنے کی اجازت نہ تھی ۔ صرف پرنسپل لڑکوں کو سزا دے سکتا تھا ۔ وہ بھی اپنے دفتر کے کمرے میں ۔ پبلک سزا شاذ و نادر ہی دی جاتی ۔ کھیل کود کی طرف بھی کافی توجہ کی جاتی ۔ اس کے علاوہ ڈرامے بھی کھیلے جاتے ۔ ہر ہفتے سیمنا دیکھنے کی بھی اجازت تھی ۔

ہوسٹل میں ان کی دیکھ بھال کے لئے دو انگریز عورتیں مقرر تھیں ۔ ایک بڑی میم دوسری چھوٹی ۔ وہ سب ان کو میڈم کہہ کر بلایا کرتے تھے ۔ ان کے سب کام میڈم کی نگرانی میں ہی ہوتے تھے ۔ خصوصاً ہفتے والے دن تو میڈم بھی بہت چہکتی پھرتی تھیں ۔ لڑکے بھی میڈم میڈم کی رٹ لگائے ان کے آگے پیچھے گھومتے پھرتے ۔ میڈم! کیا یہ ٹارزن کی فلم ہے ؟ میڈم! اس کھیل میں کون کام کرتا ہے ۔ میڈم! کیا پکچر میں لڑائی بھی ہوگی ۔ اسی قسم کے بیسیوں سوالات سے میڈم کو پریشان کیا جاتا تھا ۔

کیسے کیسے ساتھی تھے وہاں بھی ••••••• اور وہ بلیک برڈ ••••••• ہوبہو ••••• اس کا اصلی نام نہ معلوم کیا تھا ۔ لیکن سب اس کو بلیک برڈ ہی کہتے تھے ۔ جو کچھ جماعت میں لکھایا جاتا پہلے تو وہ جلدی سے لکھ لیتا ۔ پھر ہوسٹل میں پہنچکر وہ سب کچھ از سر نو خوشخط لکھتا ۔ ٹیچر ہمیشہ اس کی تعریف کیا کرتے تھے ویسے بھی وہ بڑا ذہین طالب علم تھا ۔ لیکن جب امتحان نزدیک آتے تو اسکی کاپیاں چرالی جاتیں ۔ بچارے کی سال بھر کی محنت بیکار جاتی ، بھاگ دوڑ کر کے ، بچارا دوسروں کی کاپیاں مانگ مانگ کر کچھ نقل کرتا کچھ یاد کر لیتا •••••••••••

وہاں بھپو برادرز بھی تھے ۔ یہ تین بھائی تھے ۔ تینوں لاڈلے ۔ اور پرلے درجے کے کند ذہن ہر جماعت میں پہلے ایک دو برس فیل ہونا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا ۔ پہلے سال فیل ہونے پر ان کے کسی رشتہ دار یا دوست کو رنج یا تعجب نہ ہوتا تھا ۔ اور پھر اس کا وہ دوست جو آج اس کا مہمان بنکر آیا تھا ۔ اور جس کا نام تک اس کو یاد نہ تھا ۔ یہ معلوم کر کے کہ یہاں اس کا نام تک یاد نہ تھا ۔ اس کو کس قدر رنج ہوگا ••••••••• وہ باغیچہ جہاں گرمیوں کی دوپہر کو گھنٹہ خالی ہونے پر وہ کلوں میں چاکولیٹ دبائے ہرز گشت کرتے یا پھر امرود کے کسی درخت تلے بیٹھ جاتے ۔ اس کے دوست کا جسم فربہ اور گداز تھا ۔ اس کی آنکھیں نیند کی ماتی ۔ وہ بقول مینجر ہوٹل کا شمیری تھا ۔ گورا چٹا گوری کے سے گالوں والا وہ اپنے سہارے پر کبھی نہ بیٹھتا تھا ۔ ہمیشہ اسکی ٹانگوں سے ٹانگیں چھوڑ کر اس پر گرا پڑتا تھا ••••• سر اس کے کاندھے پر رکھ کر وہ کہتا اچھا بھائی کوئی بات سناؤ مزیدار •••••••

اتنے میں ہوٹل کا باورچی ادھر سے گزرا ۔ سنو بھائی! کتنی مرتبہ تم کو سمجھا چکا ہوں کہ اگر

کوئی ملنے آئے تو اس کا نام پوچھ لیا کرو۔ لیکن تم سے اتی سی بات بھی نہیں ہو سکتی اب مجھے کیا خاک پتہ چلے کہ وہ کون تھے۔" جناب کھانا کھلا رہا تھا اس وقت ورنہ ضرور پوچھتا ••••••• لیکن وہ واپس آنے کے لئے کہہ گئے تھے بلکہ اب آتے ہی ہونگے۔ میں نے ان سے بیٹھنے کے لئے کہا۔ وہ بولے ذرا بازار تک گھوم آئیں۔ اسی لئے میں نے نام نہیں پوچھا۔ آئیں گے وہ ضرور •••• عورت ذات کا ساتھ ••••••،

عورت ؟•••••• کیا ان کے ساتھ عورت بھی تھی ؟"

"ہاں جی" ۔ باورچی نے انگلیاں نچائیں ۔" لڑکی تھی نوجوان ۔ سانولا رنگ تیکھی ناک اور ناک میں ایک کیل ••••••• آئے تو مجھی سے بولے " کیوں بھائی یہاں کوئی مسٹر بشمبر لعل بھی رہتے ہیں •••••" ہاں صاحب! رہتے ہیں ۔ پھر وہ کہنے لگے ••••••

" ارے لڑکی کا تو کسی نے ذکر بھی نہیں کیا۔ افوہ کمبختوں نے کیسا بات کا بتنگڑ بنا دیا۔ وہ تو ہمارے گاؤں کے چمن لعل تھے ۔ ہم دونوں بچپن کے ساتھی ۔ گاؤں میں ہم اکٹھے رہے ۔ اکٹھے پڑھے ۔ اس کے ساتھ اس کی بہن ہو گی ۔ میں کئی برس بعد گاؤں گیا نا! تو مجھے وہ میرا لنگوٹیا یار ملا ۔ میں نے پوچھا بھئی وہ لیلا کہاں ہے ۔ اس کی بہن بھی ہمارے ساتھ کھیلا کرتی تھی ۔ وہ بولا تجھے معلوم نہیں اس کی شادی ہو چکی ہے ۔ اب وہ سسرال میں ہے ۔ میں نے اس سے کہا بھئی لیلا سے ملنے کو دل چاہتا ہے ۔ اس نے جواب دیا اب میں اس کو سسرال سے لاؤنگا تو راستے میں تمہارے پاس ٹھہروں گا ۔ دو دن ••••••• لو کتنی سیدھی سی بات تھی ۔ تم لوگوں نے تو چکرا دیا مجھ کو ۔ گورا چٹا تو نہیں ہے وہ ۔ "

" باورچی چکرایا ۔ صاحب کس نے کہہ دیا گورا چٹا ۔ اچھا خاصہ گندمی رنگ ہے ۔ ہاں گال تو پھولے ہوئے ہیں اس کے ••••••"

غضب ہو گیا ۔ بشمبر نے چھوٹے نوکر کو آواز دی ۔ " تم جانتے ہو نا پچھلی گلی میں جو بابو رہتے ہیں ••••••• ارے وہ ہمارے ہاں آیا کرتے ہیں نا ، جن کے منہ پر سیتلا کے ہلکے ہلکے داغ ہیں ••••••••• تو ان کے ہاں جا کر کہنا کہ بشمبر بابو نے دو بستر منگوائے ہیں ۔ اور دیکھ دو چار پائیاں میرے کمرے میں پہنچا دے •••• بھاگا چلا جا ۔ سن بے ، •••••• فوراً جا ایسا نہ ہو وہ لوگ سو جائیں •••••• ہاں برتن صاف کر لے ۔ لیکن فوراً •••••••••

وہ جلدی جلدی روٹی کھانے لگا ۔ کمبخت ایک دم سب کچھ نہیں کہہ دیتے ۔ کتنی سیدھی سی بات تھی ••••• میں الگ پریشان •••••• میں بھی کہوں کہ آخر کون تھا مجھ سے ملنے والا •••••••••••••

•••••••• واہ رے چمن لعل •••••• میرے دوست •••••• چھوٹے سے تھے ۔ جب گھر کی چھت پر زرد رنگ کی کوڑیوں سے دونوں کھیلا کرتے تھے ۔ چمن لعل لمبا سا لڑکا تھا ۔ لیکن

تھا بچارا کمزور، ڈھیلا ڈھالا ••••••• اور وہ لیلا ••••••• سانولی سلونی ••••••• ان کے گھر ایک دوسرے سے ملے ہوئے تھے جیسے کہ عام طور پر گاؤں کے سبھی مکان ہوتے ہیں ••••• سردیوں کے دن تھے وہ اپنی چھت پر ٹاٹ بچھائے کاغذ کی جھنجھیریاں بنا رہا تھا۔ اس وقت لیلا کٹوری میں ساگ لئے ان کے گھر آئی۔ جب وہ سیڑھیوں سے اترنے لگی تو ان دونوں کی نظریں ملیں۔ وہ بے اعتنائی کے ساتھ نیچے اتر گئی۔ اس کو لیلا کا یہ انداز ذرا نہ بھایا۔ شیخی خوری! جب وہ اوپر آئی تو اس نے اس کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ وہ ایک ہاتھ میں روٹی اور ساگ دوسرے میں لسی کا کٹورا لئے تھی۔ چاچی نے بھیجا ہے۔ اس کی ماں کو وہ چاچی کہتی تھی۔ "رکھ دے" اس نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا۔

روٹی کی رکابی اس کے پاس رکھنے کے بعد وہ اس کے قریب ہی کھڑی رہی۔ قدرے سکوت کے بعد وہ بولی کیا بنا رہے ہو "اس نے ذرا فخر سے جواب دیا۔ جھمبیری، وہ اس کے پاس ہی اکڑوں بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر تک اس کی انگلیوں کی طرف دیکھتی رہی۔ کیا یہ گھومے گی "ہاں بھئی! گھومے گی اور نہیں تو یونہی ••••••• بچاری پر رعب جمادیا اس نے، اس نے کنکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کو وہ بہت پیاری معلوم ہوئی۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے ایک انگریزی فلم دیکھی تھی۔ جنگل کی شہزادی۔ لیلا جنگل کی شہزادی کی طرح خوبصورت تھی۔ سانولی سی تیکھی ناک، وحشی سی آنکھیں ••••••• اور ہیرو نے جنگل کی شہزادی کے کس کس طرح بوسے لئے تھے •••••••

اس کے بعد لیلا کو تکئے کے غلاف پر "ویل کم" کاڑھنا تھا اس نے پنسل سے نہ صرف "ویل کم" لکھ دیا۔ بلکہ ادھر ادھر کونوں پر پھول بھی بنا دیئے۔ اس دن سے تو لیلا اس کی کنیز بن گئی ••••••• پھر تعلقات بڑھے۔ میاں بیوی بن کر کھیلے بھی۔ موقعہ پاکر وہ اس کو چوم بھی لیتا ••••••• اس نے لیلا کو ہوائی بوسہ کی ترکیب بھی بتادی۔ وہ دور سے اپنے ہاتھ کو چوم کر بوسہ ہوا میں اڑا دیتا۔ جواب میں وہ بھی دور کھڑی ہوا میں بوسہ اڑا دیتی ••••••• وہ اس کے لئے کچھ نہ کچھ تحفے بھی لاتا۔ صابن۔ ویسلین، کلپ ••••••• وہ بہت خوش ہوتی، معمولی سی بات پر بھی وہ پھولی نہ سماتی ••••••• ان دنوں وہ معصوم تھے نابالغ تھے۔ اب لیلا نے کیسا جو بن نکالا ہوگا۔ مکمل جوان عورت ہوگی، پکے ہوئے پھل کی طرح ••••••• کیا اب بھی وہ ••••••• اب اگر وہ موقع پاکر اس کو گلے سے لپٹالے تو وہ برا مان جائے گی ••••••• اس کو بھی اشتیاق ہوگا ملنے کا اس کی کھاٹ کے قریب چین لعل کی چارپائی، اس سے پرے لیلا کی ••••••• وہ اپنے بستر پر گٹھری بنی بیٹھی ہوگی۔

اب وہ اس کے بھائی کے سامنے براہ راست اس سے تو کچھ نہ کہے گا۔ یہ تو ہوگی بد تمیزی ••••••• باتیں تو وہ چین لعل سے کرے گا۔ لیکن باتوں باتوں میں لیلا کی معصوم شرارتوں کا بھی

ذکر ہو جائے گا .... تو وہ آنچل میں منہ چھپا کر ہنسے گی .... اور جب چین لعل پیشاب کرنے کی غرض سے یا کسی اور کام سے باہر جائے گا تو حسب موقع وہ اس کا ہاتھ تھام لے گا یا گلے سے لپٹا لے گا۔ یا اس کے ہونٹ چوم لے گا .... اور پھر نہ معلوم ....

وہ کھانا تو ضرور کھائیں گے۔ ان کے کھانے کے ساتھ کچھ ربڑی اور دہی بڑے بھی منگوا لئے جائیں۔ کھانے کے بعد پھلوں کا انتظام ہو جائے تو رعب جم جائیگا۔ شاید پھل والے کی دوکان ابھی تک کھلی ہو۔ اس نے کھانے کی رفتار اور بھی تیز کر دی۔ اتنے میں باہر سے مینجر کی آواز آئی ------ "آپ آگئے۔ اچھا ہوا صاحب وہ تو ہمارے سر ہو گئے۔ کہنے لگے تم نے ہمارے مہمانوں کو بٹھایا کیوں نہ ...... جی ہاں ادھر بائیں جانب ...... آگے بڑھ جائیے .... بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں ...."

بشمبر نے گھوم کر دیکھا۔ ایک مردانہ صورت کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی .... وہ کرسی سے اٹھنے لگا ------ وہ ان صورتوں کو پہچاننے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا منہ کچھ کہنے کے لئے کھلا .... نووارد مرد کے لبوں پر مسکراہٹ پیدا ہو کر معدوم ہونے لگی۔ ایک لمحہ کے لئے وہ ایک دوسرے کو دیکھتے رہے۔ وہ چین لعل نہ تھا۔ نووارد نے کچھ محجوب ہو کر معذرت چاہی ...... اوہ معاف کیجئے .... آپ نہیں .... بابو بشمبر کمپونڈر ....

مینجر بھی آگیا۔ "جناب ہمارے ہاں تو یہی بابو بشمبر لعل رہتے ہیں"۔

نوجوان عورت کی آنکھیں پل بھر کو دکھائی دیں۔ پھر اس نے منہ پھیر لیا۔ نووارد نے پھر معذرت چاہی .... غلطی ہوئی معاف کیجئے گا ...... وہ اور ہیں بابو بشمبر لعل کمپونڈر .... انہوں نے اسی بازار کا پتہ دیا تھا .... آپ نہیں جانتے ان کو؟"

مینجر، نوکر، اور اجنبی باتیں کرتے ہوئے پرے چلے گئے۔ بشمبر پھر کرسی پر بیٹھ گیا .... اس نے روٹی کا نوالہ توڑا۔ بجائے کھانے کے وہ تھالی میں اس کو اپنی انگلیوں سے ٹھوکریں لگا لگا کر کھیلنے لگا۔

(مشمولہ: تاردپود سن اشاعت ۱۹۴۴ء)

بلونت سنگھ

دیمک

چابیوں کا گچھا زینو کے میلے آنچل سے باندھا لٹک رہا تھا وہ پھونکیں مار مار کر آگ جلانے میں مصروف تھی منہ لال آنکھیں پر آب اور بالوں میں راکھ خالد ہاتھ میں یوکلپٹس کی چند سبز پتیاں لیے اپنی ماں کو ان کی خوشبو سنگھانے کی کوشش کر رہا تھا جب آلوؤں کے قتلے مسالے اور گھی میں لت پت ہو گئے تو اس نے پتیلی میں پانی ڈالنے سے جو سوں کی آواز نکلی تو خالد سوں سوں کر کے اسکی نقل اتارنے لگا اس کے بال آگے کو گرے ہوئے تھے اور آنکھیں بمشکل نظر آتی تھیں

ناجی، آٹھ سالہ بچی، منی پور ناچ ناچتی ہوئی باورچی خانہ میں آگئی۔ پیچھے پیچھے اس کا بڑا بھائی بجو چھوٹے کنستر کا مردنگ بجاتا داخل ہوا۔ ناجی نے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں پھنسا کر بازو اٹھائے اور آنکھوں پر ہاتھوں کا سایہ کر کے آنکھیں مٹکانے لگی۔ گاہے ناک کے ایک نتھنے میں سے بہتی ہوئی ریزش باہر کی طرف جھانکتی۔ لیکن سڑرکی ایک ہی آواز کے ساتھ غائب ہو جاتی۔ ناجی گردن کو خاص انداز میں گھما گھما کر کولہوں کو بھدے طریقے سے جھٹکے دے دے کر لٹو کی طرح چکر جو کھانے لگی تو اس کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ اوندھے منہ بالٹی میں جا گری۔ خالد ہنس کر آگے کو جھکا۔ اس کی ٹیڑھی کمزور ٹانگیں اس کا بوجھ نہ سنبھال سکیں توازن خراب ہو گیا۔ وہ ناک کے بل گرا تو دو تین تھالیاں بھی لڑھک گئیں، ایک ہنگامہ مچ گیا، بجو نے مردنگ بجانا بند کر کے انگریزی ناچ شروع کر دیا۔ جب وہ پتلی پتلی ٹانگیں اٹھا اٹھا کر ناچتا تو اس کے گھٹنے گلے میں لٹکے ہوئے کنستر سے ٹکرا ٹکرا کر کانوں کے پردے پھاڑ دینے والا شور پیدا کرنے لگے۔

ٹونکل ٹونکل لٹل سٹارز   باؤ آئی ونڈر وٹ یو آر

ٹونکل ٹونکل ۔۔۔۔

ماں کی للکار سنائی دی۔ بچوں کو شور کرنے سے باز رکھنے کے لیے وہ خود ان سے بھی زیادہ زور سے چلانے لگتی تھی۔

"میں کہتی ہوں تو نے میری ریڈر کہاں رکھ دی؟ ناجی کی بچی!" سب سے بڑی بہن بجی آن چلائی۔ اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے۔ گردن کی رگیں بولتے وقت ابھر آتی تھیں۔

ناجی کو ماں پچکارنے لگی۔ اس کے ہونٹ سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ روئے جاتی تھی ماں نے دلاسہ دیتے ہوئے دو آنے کا لالچ دیا۔ تاکہ وہ چپ ہو جائے لیکن وہ رضامند نہ ہوئی۔ "نہیں میں دو آنے نہیں لوں گی۔ میں تو وہ لال لال پھولوں والا فراک پہنوں گی۔" گویا یہ ناچ نہ تھا ایک سازش تھی۔ جس میں اماں کو پھنسا کر دراصل پھولدار فراک اینٹھنے کا ارادہ تھا۔

"بجّی مردود تو سارس کی طرح لمبی لمبی ٹانگیں نکالے بے شرمی سے ادھر ادھر بھاگی پھرتی ہے۔ تجھ کو عقل کب آئے گی؟"

ہائے اللہ میں کہاں جاؤں۔ میری ریڈر جو چھپادی ہے ناجی کی بچی نے۔"

بچوں کے ابا آئے۔"پانی گرم ہو گیا کیا؟"

"ہو رہا ہے۔ دیکھئے نا! بچوں نے کیا غدر مچار کھا ہے۔"

"ارے کمبختو! تم کو آج پڑھنے کے لیے نہیں جانا ہے کیا" این؟ کیوں بے خالد! تو جتنا چھوٹا اتنا ہی کھوٹا۔ اپنی ماں کو کام نہیں کرنے دیتا۔ ہر وقت اس کا آنچل پکڑے رہتا ہے۔ گدھے کے بچے؟" اپنی گالی پر خود ہی مسکرا کر اس نے کنکھیوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ "تیرا باپ گدھا اور تیری اماں گدھی"۔

"ہٹائیے بھی۔" زینو بگڑی۔ "صبح سویرے اللہ کا نام لیجئے نا! بچے کیا تمیز سیکھیں گے؟"

زینو کو خالد بہت پیارا تھا۔ وہ اس کو نیک بخت بختی تھی۔ اتنا بڑا ہو گیا تھا پر وہ ماں کا دودھ پیئے جا رہے تھا۔ اور وہ پلائے جا رہی تھی۔ اس نے گھسیٹ کر خالد کو گود میں لے لیا۔ قمیص اٹھا، چھاتی اس کے منہ میں دے دی اور اوپر دوپٹے کا سایہ ڈال لیا۔

"بھئی یہ کیا حرکت ہے سو مرتبہ سمجھایا کہ اب اسے اپنا دودھ نہ پلایا کرو"۔

"لاؤ پانی۔"

ذرا صبر کیجیے نا! بیٹھ جایئے گھڑی کی گھڑی۔"

وہ اسٹول پر مڈے کی طرح ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھ گیا۔

زینو نے پانی میں انگلی ڈالی۔ "بجّی! یوں تو تو بڑی شوقین بنتی ہے۔ ایک کی بجائے دو دو چوٹیاں لٹکائے پھرتی ہے۔ لیکن بال سمٹتے بھی ہیں تجھ سے۔ دیکھ تو بالوں کی لٹیں کیسی الجھ رہی ہیں

"شوقین، شوقین، کہاں ہوں میں شوقین "آپ جب کب مجھ ہی پر الزام دھرتی رہتی ہیں۔ دو چوٹیاں نہ کروں تو کروں بھی کیا" اتنے گھنے بال ایک چوٹی میں سمٹتے ہی کہاں ہیں؟" بڑبڑاتی زمین پر زور زور سے پاؤں مارتی ہوئی وہ چلی گئی۔

مجو جا میرا بیٹا اچھا سے کہو کھانا کھالیں آکر۔ آج تو یوں بھی دیر ہو گئی ہے۔"

زینو کا دیور علی۔ اے آنرز کا طالب علم تھا۔

مجو چچا کو بلانے گیا۔ چچا کتنے عرصے سے بیٹھا ابل رہا تھا۔ اب اس نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ وہ بھوکا ہی پڑھنے چلا جائے گا۔ تاکہ اس کا بڑا بھائی بھابی پر خفا ہو اور آئندہ وہ اس کو ایک غیر اہم ہستی سمجھ کر کھانا تیار کرنے میں دیر نہ لگایا کرے۔ چنانچہ اس طرف سے مجو کمرے کے اندر داخل ہوا، دوسری طرف سے چچا کمرے کے باہر "چچا اماں کہتی ہیں کھانا کھالو"۔

"اب اتنا وقت کہاں ہے ؟ کھانا کھا لیجئے اب "۔۔۔۔ اور وہ ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا چل کھڑا ہوا۔ اس نے اپنی صورت پر ایسی مظلومیت طاری کر لی جیسے اس گھر میں ہفتہ بھر سے اس کو کھانا نہ ملا ہو اور نہ آئندہ ہفتہ بھر تک کوئی امید ہو۔

مجو خبر لایا "وچا چلے گئے۔ وہ کہتے تھے اب وقت نہیں ہے۔"

"ہائے میں مر گئی۔ بچارہ بھوکا چلا گیا۔ سارا دن بھوکا رہے گا۔ اچھا نوکر کے ہاتھ کھانا کالج ہی بھجوا دوں گی۔"

"کالج کیا کرو گی بھجوا کر۔ اس نے سو مرتبہ کہا ہے کہ اس کو کھانا کالج نہ بھیجا کرو سب کے سامنے کھانے سے اس کو شرم محسوس ہوتی ہے۔ لاؤ مجھے پانی دو کہیں میں دفتر سے نہ رہ جاؤں۔"

"یہ لیجئے پانی تو ہو گیا گرم ۔۔۔ اچھا میں کہتی ہوں دوست کو بلا لو۔ کھانا کھا لے اسے بھی جانا ہو گا۔"

"بہت اچھا پکاؤ روٹی۔"

وہ اٹھا اسٹول اندر کے برآمدے میں رکھا اور ایک کرسی کھسکا دی۔

"مجو میرا اچھا بیٹا! جا ناجی کو ساتھ لے جا۔ اپنا منہ بھی دھو اور چھوٹی بہن کا منہ بھی دھو ڈال پھر آکر کھانا کھا لو۔ تب میں تم کو اچھے کپڑے پہناؤں گی۔"

"کمبخت نوکر کہاں ہے ؟"

"وہ دودھ لینے گیا ہے۔ جہاں جاتا ہے بیٹھ جاتا ہے۔ آپ نہا لیے کیا ؟"

"ٹھہریئے میں نکالے دیتی ہوں نیا تولیہ" خالد کو چھاتی سے ہٹایا تو وہ ٹھنکنے لگا۔ ارے ہٹ بیٹا! ماں کو نوچ کر کھا ہی جائے گا کیا ؟"

شوہر کو صابن اور تولیہ دینے کے بعد وہ پھر چولھے کے آگے آن بیٹھی۔ مجو اور ناجی بھی منہ دھو کر آگئے۔

"شاباش شاباش کتنے اچھے بیٹے ہیں۔ لو بیٹھو اب کھانا کھا لو ۔۔۔ مجو بیٹا تمہاری آپا کہاں ہے"

"آپا بجی اندر کے کمرے میں کپڑے سینے کی مشین سے لپٹی رو رہی ہیں۔" زینو نے جلدی سے ان کے آگے کھانا رکھا۔

"مجو چھوٹے بھیا کو بھی بٹھا لو اپنے پاس۔ اس کو بہت چھوٹا لقمہ شوربے میں خوب بھگو بھگو کر دینا۔ جھگڑنا نہیں۔ روٹی کی ضرورت ہو تو رکابی میں سے لے لینا۔ میں ابھی آئی۔"

اندر والا کمرہ جہاں "آپا بجی" کپڑے سینے کی مشین سے لپٹی رو رہی تھیں۔ نسبتاً تاریک تھا وہاں بہت بڑے بڑے ٹرنک پڑے تھے۔ جو زینو کو آج سے قریباً چودہ برس پہلے شادی کے موقعہ پر جہیز میں ملے تھے۔ ان کے علاوہ قیمتی کپڑوں کے ٹرنک لوہے کی پیٹی، گہنے نقدی وغیرہ سب کچھ

اسی کمرے میں رکھا جاتا تھا۔ آپا نجی بقول مجو کے سسکیاں بھر بھر کر رو رہی تھی۔ اس کی گدرائی ہوائی ٹانگیں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ اوندھے منہ پڑی تھی۔ چہرہ بالوں کی گھٹاؤں میں پوشیدہ تھا۔ اس نے اماں کے پاؤں کی چاپ سنی لیکن سر اوپر نہ اٹھایا۔ اور نہ رونا بند کیا۔ وہ تسلسل کے ساتھ ہچکیاں لیتی رہی۔ جب وہ گہری گہری سسکیاں لیتی تو اس کے بازوؤں اور کمر میں لرزش پیدا ہو جاتی زینو چپ چاپ اس کے پاس کھڑی ہو گئی۔ چند سے سکوت کے بعد وہ بیٹھ گئی اور اسکا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا وہ اور بھی شدت کے ساتھ رونے لگی زینو اسکے سر پر ہاتھ پھیرتی رہی۔

"نجی رانی کیا بات ہے؟ میری بچی تو میرے کہے کا برا مانے گی؟ تو تو میرے جگر کا ٹکڑا ہے میری انکھوں کا نور ہے پگلی تجھے اتنا بھی معلوم نہیں تمہاری اماں تجھے کتنا پیار کرتی ہے میری رانی! تیرے ہی دم سے تو اس گھر کی رونق ہے تجھے کیا تکلیف ہے تیرے پاس اچھے اچھے کپڑے نہیں یا خرچ کرنے کے لیے پیسے نہیں یا خوبصورت گڑیا نہیں کوئی لڑکی ہے اڑوس پڑوس میں جس کے پاس تجھ سے زیادہ کپڑے ہوں تو میری سیانی بیٹی ہے تو اس دن فاطمہ کی اماں سے کہ رہی تھی کہ ہماری اماجی ہم کو فضول پیار نہیں کرتی وہ تہ دل سے ہم سے محبت کرتی ہیں بتا تو میری لاڈلی آج تجھ پر کیا وہم سوار ہو گیا کہ تیری ماں تجھ کو پیار نہیں کرتی کیوں تو اس کال کوٹھری میں پڑی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی ہے تیرے رومیں دشمن تیری بلا جانے یہ رونا دھونا کیا ہوتا ہے کیا اب تو یہ سمجھنے لگی ہے کہ تیری اماں بے انصاف ہے جابر ہے بے رحم ہے۔

نجی سسکیاں بھرتی رہی

زینو نے گھسیٹ کر بیٹی کو گود میں لے لیا میری لاڈلی! اب تو سیانی ہو گئی ہے جانتی ہے اب تیری عمر کیا ہے اب تجھ کو تیرھواں برس شروع ہو چکا ہے میں پندرہ برس کی عمر میں بیاہی گئی تھی تجھے کیوں کر سمجھاؤں تو خود ہی سمجھ لے اب تو دودھ پیتی بچی نہیں رہی اچھا تو ہی بتلا کہ تیری عمر کی لڑکی ایک تنگ سا فراک اور ایک جانگیہ پہنے رانوں تک ننگی ٹانگیں نکالے گھومتی اچھی معلوم ہوتی ہے؟ مانا کے تو اپنے گھر میں رہتی ہے لیکن اب تیری عمر گھر میں اس طرح گھومنے کی نہیں ہے میری بچی! یہ باتیں والدین کو اشارتاً کنایتاً کہنی پڑتی ہیں عقلمند اور سگھڑ بیٹیاں تھوڑے کہے کو بہت سمجھتی ہیں ابرو کے اشارے سے مطلب کو پالیتی ہیں ۔۔۔۔ اپنے بال دیکھ رانی! بالوں کی دیکھ بھال کیا کر کتنے لانبے کتنے کالے کتنے گھنے اور کس قدر بوجھل ہیں تیرے بال میں تجھ کو دو چوٹیاں گوندھنے سے منع نہیں کرتی اور نہ میں اس کو برا سمجھتی ہوں سن میری لاڈلی یہ بھی تو درست نہیں کہ تیرے بال ہر پابندی سے آزاد ہوا میں لہراتے رہیں اور تو سر پر چندریا تک نہ رہنے دے۔ تو کنواری ہے۔ اب تو کمسن بھی نہیں کہ تیری حرکات کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اتنی سی بات تھی جو میں نے تجھ سے کہی۔ میں سمجھتی تھی میری بیٹی میرا کہنا مان جائے گی۔ لیکن تو بجائے میری نصیحت پر عمل کرنے کے رونے لگی۔"

نجمی نے اپنی باہیں ماں کے گلے میں حمائل کر دیں۔

"اری دیکھ تو، اب تو میرے برابر ہونے کو ہے۔ اب تو تیرے بوجھ تلے میری ٹانگیں دکھنے لگتی ہیں۔ جب بیٹی ماں کے برابر ہو جائے تو وہ بیٹی نہیں رہتی بلکہ بہن بن جاتی ہے۔ میری نازوں پلی بٹیا! تجھ کو چاہیئے کہ اب تو ہر کام میں میرا ہاتھ بٹائے۔ گھر کے معاملات میں اپنی رائے دے۔ میں اب تھک گئی ہوں میرا جسم کھوکھلا ہو چکا ہے۔ تو پرائی دولت ہے۔ لیکن جب تک میرے پاس ہے اس وقت تو میرا سہارا بن کر رہ۔ میں تو تجھ سے ان باتوں کی امید رکھتی ہوں اور تو نہ معلوم کونسی دنیا میں بستی ہے۔ اب تو سیانی بیٹی بن۔"

زینو کی رانیں سچ مچ دکھنے لگیں۔ نجمی کو دیکھ کر اسے خوف معلوم ہوتا تھا۔ کس قدر بڑھ گئی تھی کمبخت! قد و قامت میں پوری عورت معلوم ہوتی تھی۔ اور دو ڈھائی برس تک تو اس پر نظریں ٹھہر سکیں گی۔ وہ نجمی کے جسم کو غور سے دیکھنے لگی۔ کس قدر بھرا ہوا، چکدار، بے عیب، بے داغ، تنی ہوئی جلد، مہکا ہوا جسم جیسے کھیت کی صاف ستھری نمدار مٹی کی بو یا جیسے جنگل میں خود سر سبز گھاس کی سوندھی سوندھی خوشبو۔ وہ اس کے جسم پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے لگی۔ کس قدر خوبصورت، مکمل، دلفریب، جاذب نظر، بال بل کھاتے اور لہراتے ہوئے جیسے سر کی جلد میں سے فوارے کی طرح پھوٹ کر لاوے کی سی تیزی کے ساتھ بہ نکلے ہوں۔ جیسے وہ آگے ہی بڑھتے چلے جائیں گے •••• اس کے بازوؤں میں جکڑا ہوا نجمی کا جسم کس قدر جاندار، کسمسایا ہوا، بل کھاتا اور لچکتا ہوا سا تھا۔ اس بات کا احساس کر کے کہ یہ جسم اسی کے خون کا پروردہ ہے، اس کو عجیب قسم کی راحت سی محسوس ہونے لگی۔ جب اس نے نجمی کے نصف کے قریب بال مٹھی میں لیے تو اس کی مٹھی بھرپور ہو گئی۔ وہ ان کو مٹھی میں آہستہ آہستہ دباتی رہی ••• اس نے نجمی کا منہ اوپر اٹھایا اور اس کے نمدار رخسار پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ کتنی لذت تھی۔ وہ فخر کرنے لگی۔ اسی نے اس جسم کو اپنی کوکھ سے جنم دیا تھا۔۔۔ وہ نجمی کو از سر نو دیکھنے لگی۔ جیسے اس نے اس کو زندگی میں پہلی مرتبہ دیکھا ہو، اس کے لیے وہ ایک عجوبہ تھی •۔ ایک طلسم تھی۔ جوں جوں نجمی جوان ہوتی جا رہی تھی۔ توں توں اپنی ماں کے دل کے قریب ہوتی جا رہی تھی۔۔۔ وہ اپنی کنواری بیٹی کے اچھوتے جسم کو چومنے لگی۔ جب اس نے اس کی گردن پر اپنے لب رکھے تو وہ کسمسا کر ہنسنے لگی۔ مجھے گدگدی ہوتی ہے۔

"شریر کہیں کی لے اب اٹھ میں اور کام بھی کر لوں"۔

"نہیں میں نہیں" ۔ یہ کہہ کر نجمی ماں کے گلے سے لپٹ گئی۔ اور جیسے ماں کے کان میں جادو پھونک رہی ہو۔ "امی! اب میں کبھی نہ روؤں گی۔ نہ کبھی سارس کی طرح ٹانگیں نکالے پھروں گی۔ اور نہ سر کو ننگا رہنے دوں گی۔"

"میری لاڈلی بیٹی! میری لاڈلی بیٹی!!"

"اور امی! آپ باجی اور مجو کے کپڑے نکال دیں میں ہی ان کو کپڑے پہنادوں گی۔"
"میری سیانی بیٹی! اچھا تو چل میں تجھ کو کپڑے نکال دوں"۔
"اور امی!" نجمی نے اور بھی لپٹتے ہوئے کہا۔ "آج میرے لیے دو انڈے منگوا لینا۔ جب میں اسکول سے واپس آؤں گی تو انڈوں کی سفیدی میں دودھ ملا کر اپنے بالوں کو گھنگریالے بناؤں گی۔"

گھر کے بیسیوں چھوٹے چھوٹے کاموں سے فارغ ہو کر دوپہر کے وقت زینو وسوتی، دھاگہ اور پٹاری سنبھال ڈرائنگ روم میں کوچ پر جا بیٹھی۔ دسوتی پر جھکے جھکے وہ رونے لگی۔
"بچی آپ رو رہی ہیں؟ کیوں؟"
اس نے آنسو پونچھ ڈالے "آ سلمٰی! میرے پاس بیٹھ جا۔ تو کب آئی چپکے سے دبے پاؤں مجھے تو پتہ بھی نہ چلا۔"
"آپ رونے میں اس قدر محو تھیں کہ میری آمد کی خبر بھی نہ ہوئی"۔
"اوہ! میں چھوٹی بہن کو یاد کر کے رو رہی تھی، بچاری•••"
سلمٰی کے چہرے کی سب سے زیادہ دلکش چیز اس کی آنکھیں تھیں۔ وہ آنکھوں سے ہنستی آنکھوں سے روتی، آنکھوں سے سنتی اور آنکھوں ہی سے باتیں کرتی•••چنانچہ اب اس نے آنکھیں جھکالیں۔

زینو نے بات کا رخ بدلنا مناسب سمجھا۔
"تمہاری اماں کیا کر رہی تھیں۔"
"کچھ بھی نہیں بس لیٹی تھیں۔"
"ہمارے ہاں کیوں نہیں چلی آئیں۔"
"نہ جانے۔"
کچھ دیر سکوت رہا۔
"سلمٰی اب میرا جی نہیں لگتا۔"
"کیوں؟"
"نہ معلوم۔"
سلمٰی فرش کی طرف دیکھنے لگی۔ جیسے اس سے کوئی گناہ سرزد ہو گیا ہو۔
"میرا جی چاہتا ہے کہ•••"
"کیا جی چاہتا ہے آپ کا؟"
"یہی کہ تم جلد دلہن بن کر ہمارے ہاں آجاؤ"۔
سلمٰی نے شرما کر برقعہ کے آنچل میں چہرہ چھپالیا۔ سوائے آنکھوں کے حالانکہ اس کو چاہیئے

تھا کہ آنکھیں چھپالیتی ۔ باقی چہرہ خواہ کھلا رہنے دیتی ۔ زینو کے دیور سے اس کی منگنی ہو چکی تھی ۔ زینو ہمیشہ کی طرح سلمیٰ کو بحیثیت دلہن کے جانچنے لگی ۔ سلمیٰ اور زینو کو ایک دوسرے سے محبت تھی ۔ سلمیٰ نے اپنی اماں کو جتادیا تھا کہ وہ زینو چچی ہی کے ہاں دلہن بن کر جائے گی ۔

"جب تو میرے پاس آجائے گی سلمیٰ! تو میرے آدھے دکھ ختم ہو جائیں گے ۔ تو آکر اس گھر کو سنبھال لے ۔ پھر میں آرام سے کھاٹ پر پڑی رہا کروں گی ۔ رانی اپنے گھر کی آپ دیکھ بھال کر لیا کرے گی ۔"

سلمیٰ کو چچی کی گفتگو کا یہ انداز بہت پسند تھا ۔ اس کی اس میٹھی زبان اور دل نشین حرکات پر وہ فدا تھی ۔

قدرے توقف کے بعد سلمیٰ بولی ۔ "چچی اب تو نجی بھی جلد ہی دلہن بنے گی ۔"

"دیکھ تو کتنی بڑھ گئی ہے کمبخت ۔ خدا میری لاڈلی کو نظر بد سے بچائے ۔ اس کی جوانی ہے یا جوار بھاٹا ۔ اللہ سب کی آبرو رکھنے والا ہے ۔ سلمیٰ بیٹی اب تو بھی خیر سے جوان ہے ۔ صحت ور ہے ۔ لیکن وہ موٹی ہاتھ پاوں کی کتنی مضبوط کس قدر تیز اور تند مزاج ہے ۔ اس کے لیے تو کوئی ایسا دلہا چاہیئے جو اس کو ہر طرح سے قابو میں رکھ سکے ۔ ورنہ وہ سب کا ناک میں دم کر دے گی ۔۔۔ لیکن میری بیٹی دل کی بری نہیں ۔"

"ہاں چچی! یوں تو بات بے بات پر مجھ سے الجھ پڑتی ہے ۔ لیکن چچی سچ کہتی ہوں اگر کبھی میں خفا ہو جاؤں تو پھر سو سو طرح سے مناتی ہے مجھ کو ۔۔۔۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ کھیلی ہیں ۔ شادی ہو جانے پر نہ معلوم کہاں جائے گی ۔ ہماری نجی!"

"بیٹی یہی دستور ہے دنیا کا ۔ کیسی کیسی سہیلیاں تھیں میری ۔ میں تصور میں سب کی صورتیں دیکھ سکتی ہوں ۔ کیسی شوخ، کھلنڈری، ہنس مکھ، البیلی ہائے ایک دفعہ بچھڑ کر پھر ہم سب ایک مرتبہ بھی پہلے کی طرح یکجا نہ ہو سکیں ۔ اپنے اپنے دھندوں میں پھنس کر رہ گئیں سب، ان کو یاد کرتی ہوں تو دل میں ایک ہوک سی اٹھتی ہے ۔ وہ جھولے وہ چرخے ۔۔۔۔"

"ایک بات اور کہہ دوں چچی! آپ ابھی بالکل نوجوان دکھائی دیتی ہیں نجی نے تو یوں ہی بڑھ کر آپ کو آن لیا ۔ سچی بات تو یہ ہے کہ آپ اس کی ماں تو معلوم ہی نہیں ہوتیں ۔ آپ تو اس کی بڑی بہن دکھائی دیتی ہیں ۔"

زینو ہزار سنجیدہ اور سگھڑ سہی لیکن یہ بات سن کر پھول گئی ۔ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا ۔ اس نے اپنی مسرت کو چھپانے کی کوشش بھی نہیں کی ۔ بھئی میری عمر بھی کیا ہے ۔ ذرا حساب تو لگاؤ پندرہ برس کی عمر میری شادی ہوئی ۔۔۔ اور بھئی ایک سال بعد نجی پیدا ہوئی یعنی میں اس وقت سولہ برس کی تھی ۔ اور اب نجی خیر سے سات مہینے اوپر بارہ برس کی ہے ۔ اب حساب لگاؤ تو ۔۔۔ ہوئی نا میں اٹھائیس برس کی ۔۔۔۔ پہلے تو شادیاں بھی چھوٹی سی عمر میں ہو جایا

کرتی تھیں۔ بیٹی اب تیری عمر بھی خیر سے سترہ سے اوپر کی ہے۔ تین برس سے پہلے تیری شادی کیا ہوگی۔ کیا تو سمجھتی ہے کہ شادی کے سات آٹھ سال بعد تو بوڑھی ہو جائے گی۔"

بار بار اپنی شادی کا ذکر سلمیٰ سن کر خوش بھی ہوتی تھی ۰۰۰ اور جھنپتی بھی ۔۔۔ اب پھر بچاری کو تھوڑی دیر کے لیے زمین کی طرف دیکھنا پڑا ۔۔ "چچی! ایک بات اور بھی ہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے آپ کی طبیعت ناساز رہتی ہے۔ آپ کچھ غم کرتی رہتی ہیں۔"

"غم کیا سلمیٰ! ابھی چھوٹی بہن کے مرنے سے دل دکھی رہتا ہے۔ بچاری کی یاد آتی ہے تو بے اختیار رو دیتی ہوں۔"

"نہیں چچی یہ تو ایک مہینہ پہلے کی بات ہے نا! لیکن میں آپ کو تقریباً ڈھائی مہینے سے یونہی دیکھ رہی ہوں۔ آپ کھوئی کھوئی سی رہتی ہیں ۰۰۰ اچھا بتایئے چچا نے آبائی مکان کیوں بیچا؟ ۔۔ میں کوئی غیر تو نہیں ہوں۔ آپ چھپاتی کیوں ہیں؟"

"نہیں بیٹی! میں اکیلی جان اور اس پر اتنی پریشانیاں۔ چھوٹے چھوٹے بچے دیور بچوں کے ابا سبھی کی دیکھ بھال کرنی پڑتی ہے۔ گھر کے بیسیوں چھوٹے موٹے کام تجھ سے پوشیدہ نہیں۔ ہمدردی کا ایک کلمہ تک کہنے والا کوئی نظر نہیں آتا البتہ میری بوٹیاں نوچنے کو سب تیار۔ یہ گرہستی بھی جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور تو اور نوکر تک نہیں کہ ہاتھ ہی بٹائے۔ لے دیکر وہ چندھی آنکھوں والا چھوکرا ہے۔ نوکر ہیں کہ ٹکتے ہی نہیں کمبخت فاقے کرتے چیتھڑے لٹکائے آتے ہیں۔ اچھا کھانے کو ملتا اور اچھا پہننے کو۔ آنکھوں پر چربی چڑھ جاتی ہے پھر تو اونچے اڑنے لگتے ہیں کہاں یاد رہتی ہے ان کو اپنی حیثیت۔

"کمبخت نوکروں کا بھی کال پڑ گیا۔ ہمارے گھر میں بھی یہی حال ہے۔ تبھی تو ہم نے بھینس بیچ ڈالی۔ اب کون کرے دیکھ بھال ۰۰۰ چچی آپ دوپہر کے وقت ہمارے گھر آجایا کریں۔ ہمارے بنگلوں کے درمیان ایک باڑہی تو ہے کونسا کالے کوسوں کا فاصلہ ہے۔ دیکھئے نا میں دن بھر میں ایک دو چکر ضرور لگاتی ہوں ۰۰۰ اگر آپ وہاں آجایا کریں تو آپ کا دل بہلا رہے گا۔ اکیلے میں آپ رونے لگتی ہیں۔ مفت میں صحت برباد ہوتی ہے۔"

"میرا نکلنا بھی ہو۔ گھر اکیلا چھوڑ کر کہاں جاؤں جب تک بچے گھر پر رہتے ہیں۔ سر کھجانے تک کی فرصت نہیں ملتی ۰۰۰ اے لو آگیا غریب کالج سے۔ آج صبح کھانا بھی نہیں کھا کر گیا تھا، اٹھوں اب دوں کچھ بچارے کو۔"

ادھر تو سلمیٰ کے ہونے والے شوہر بھوکے مرغ کی طرح چونچ کھولے لڑکھڑاتے اندر داخل ہوئے ادھر ان کی ہونے والی بیوی برقعہ جھپٹ بگولے کی طرح کمرے سے باہر نکل گئی۔

صبح کے ہنگامے کے بعد شام کے ہنگامے کا دور شروع ہوا، رونا دھونا چیخنا چلانا۔ مارنا پیٹنا کھانا پینا، ناچنا گانا، پیار، دلاسا، ۰۰۰ سب کچھ ہو چکا تو بچے پڑ کر سوگئے۔ کالی رات ۰۰۰ زینو

طویل و عریض کھڑکی کی چوکھٹ پر کہنی ٹیکے اور ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے تھکی ماندی سی کھڑی تھی۔ ساتھ کے کمرے سے بچوں کے ہلنے جلنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ سب سے پرلے کمرے میں کتھی رنگ کے سمٹے ہوئے پردے میں سے اس کو اپنا دیور نظر آرہا تھا جو کھانا کھانے کے بعد بڑے اطمینان کے ساتھ سرکنڈوں کی بنی ہوئی آرام کرسی پر بیٹھا ریڈیو سننے میں محو تھا۔۔۔ زینو نے ابھی تک کھانا نہ کھایا تھا۔ وہ شوہر کی منتظر تھی۔

"ابھی ابھی دہلی سے آپ استاد عبدالستار سے ٹھمری سن رہے تھے۔ اس وقت گیارہ بجنے کو ہیں۔ ہمارا آج کا پروگرام ختم ہوتا ہے۔ ہم کل صبح آٹھ بجے تک آپ سے رخصت چاہتے ہیں۔ آداب عرض۔"

جواب میں "آداب عرض" کہہ کر۔۔۔۔ اس کے دیور نے ریڈیو بند کرکے روشنی گل کردی اور کمبل لپیٹ کر سو گیا۔

یہ آخری آواز تھی۔۔۔ اس کے بعد خاموشی ہی خاموشی۔۔۔ تاریکی ہی تاریکی لامتناہی کس قدر وسیع آسمان کس قدر پھیلی ہوئی تاریکی پرے کھیتوں کے سلسلے تاریکی میں اینٹوں کے ٹوٹے پھوٹے بھٹے کے آثار، اس سے بھی پرے گارے کے بنے ہوئے مکانوں والا گاؤں، تاروں کی چھاؤں میں ایک دھبے کی طرح دکھائی دیتا تھا۔

پاؤں کی چاپ سنائی دی۔۔۔ وہ اس آواز سے آشنا تھی۔ یہ اس کے شوہر کے پاؤں کی چاپ تھی۔ وہ اندر داخل ہوا اس نے چند فائلیں میز پر پٹخ دیں۔ اور اس کے قریب چلا آیا۔

کھانا وہ باہر ہی سے کھا کر آیا تھا۔ اس نے زیادہ باتیں نہ کیں۔ کیونکہ آج اس کو ایک دوست کے ہاں برج کھیلنے کے لیے جانا تھا۔ لیکن اس وقت وہ تھا خوش، از حد خوش۔۔۔۔

چنانچہ جب وہ چلا گیا۔ تو وہ کھڑی رہی حرکت کرنے کی سکت باقی نہ تھی۔ دماغ مضمحل تھا۔ اس پر غنودگی سی طاری تھی۔

کھڑکی میں سے اوپر کو اٹھی ہوئی ہری ہری بھنگ کے پودوں کی نازک نازک کونپلیں۔۔۔ خودرو اونچے پودوں کے ہلکے نیلے رنگ کے پھول۔۔۔۔ ساکن، چپ چاپ۔

برج؟؟

کیا واقعی وہ اس کو دودھ پیتی بچی سمجھتے تھے۔ کیا ان کا یہ خیال تھا کہ وہ کچھ نہ سمجھتی تھی؟ کس قدر وسیع آسمان تھا۔ آنکھ جھپکاتے ہوئے سے تارے کس قدر دھندے گدلے، پھیکے، مٹیالے۔۔۔۔

(مشمولہ: تار و پود" سن اشاعت ۱۹۴۴ء)

بلونت سنگھ

گرنتھی

"ست نام" - یہ الفاظ حسب معمول گرنتھی جی کے منہ سے نکلے اور ان کے قدم رک گئے لیکن ان کے کچھیرے کا لٹکتا ہوا آزار بند گھٹنوں کے قریب جھولتا رہا۔

"گرنتھی جی! تم کو سو مرتبہ کہا ہے کہ یوں دندناتے ہوئے اندر نہ بڑھے آیا کرو - ذرا پرے کھڑے رہا کرو - کسی وقت آدمی نامعلوم کیسی حالت میں ہوتا ہے ..." نل کے قریب بیٹھی ہوئی عورت نے اپنی پنڈلی پر شلوار کا پائنچا کھسکا کر ڈھانپ لی - اور ایڑیاں رگڑنے لگی - گرنتھی کب کا پیچھے ہٹ چکا تھا - عورت نے مفت میں رامائن چھیڑ دی - اس کا منہ اوپر کو اٹھا ہوا تھا - منہ اوپر اٹھائے رکھنے کی بھی اسے عادت سی ہو گئی تھی - اس کی ڈاڑھی بہت گھنی تھی - ٹھوڑی کے نیچے گردن کے قریب بال پسینہ سے تر رہتے - گردن کا وہ حصہ اس کو ہمیشہ بے چین رکھتا - غیر شعوری طور پر منہ اوپر رکھنے سے ہوا کا کوئی نہ کوئی بھولا بھٹکا جھونکا آتا اور اس کو ٹھنڈک کا احساس ہونے لگتا۔

وہ بیوقوفی کی حد تک سیدھا سادا ضرور تھا - لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بالکل احمق ہی تھا ... وہ جانتا تھا، آج اس عورت نے وہ بات کیوں کہی پنڈلی - آخر پنڈلی میں کیا رکھا ہے - اگر کوئی دیکھ بھی لے تو - "یہ سو مرتبہ" کی بھی خوب رہی - حالانکہ یہ بات اس کو پہلی مرتبہ کہی گئی تھی - وہ ہرگز اس طرح دندناتا ہوا اندر داخل نہ ہو اگر باہر کھڑا رہنے پر اس کی مدھم آواز سن لی جائے - اس کی آواز اچھی خاصی تھی لیکن زور سے آواز دینے پر اس کو ٹوکا گیا تھا - "یہ کیا بدتمیزی ہے - اس قدر حلق پھاڑنے کی بھی کیا ضرورت ہے -" اگر وہ کھڑا ان کی من پسند آواز میں بڑے ترنم کے ساتھ صبح سے شام تک "ست نام ست نام" کہتا رہے تو کوئی اس کی آواز نہ سن پائے اور نہ اس کو روٹی دے گوردوارے کے مسافر بھی ایک مصیبت تھے - نہ وہ روز روز آویں نہ اس کو روٹیاں مانگنی پڑیں - اپنے واسطے تو وہ کبھی بھی روٹیاں مانگنے نہ آئے .... ایڑیاں رگڑ رگڑ کر پاؤں دھونے والی کی صورت تو دیکھو - یہ تو خیر! اس آفت کی پرکالہ صورت بھی قابل دید تھی - جس نے اس پر بدنیتی کا الزام تھوپ رکھا تھا - سب سے احمقانہ بات جو اس کی بابت کہی جا سکتی تھی یہ تھی کہ اس نے فلاں عورت کی طرف بری نیت سے دیکھا - لیکن وہی الزام اس پر لگا کر وہ طومار باندھا گیا تھا کہ توبہ ہی بھلی - اتنے میں فتح سنگھ چوکیدار صحن میں داخل ہوا۔

عورت نے بے تکلفی سے پوچھا - "او بھتیا! کیا بات ہے" - چوکیدار پھتے نے گرنتھی کی

طرف چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔ "وہ سردار جی گھر پر نہیں؟ وہ آئیں تو کہنا کہ رات کو کنویں پر آجائیں۔" لسی کا کٹورا پیش کئے جانے پر وہ اسے ایک ہی سانس میں چڑھا گیا۔ گر نتھی کے کندھے سے کندھا بھڑا کر باہر نکل گیا••• عورت کی پیشانی ناہموار ہو گئی۔

گر نتھی ان سب باتوں کا مطلب سمجھتا تھا•••• آج اس کو اس کے ناکردہ گناہوں کی سزا ملنے والی تھی۔

اس رات گاؤں کے بڑے کنویں پر گاؤں بھر کے سرکردہ اشخاص جمع ہوئے گر نتھی پر جرح کی گئی اور اگر کوئی بات اس کے حق میں نکل آتی جو جھلاتے •••• سب لگ اس سے خفا تھے۔ کسی کی اصلی شکایت یہ تھی کہ وہ ان کے گھر والوں کو پرشاد ہمیشہ کم دیا کرتا تھا۔ کسی کے بچوں کو اس نے گوردوارے کی پھلواڑی اجاڑنے سے منع کیا تھا۔ کسی کے گھر میں جاکر کچھ کام کرنے سے اس کی بیوی نے انکار کر دیا تھا لیکن اس پر الزام یہ تھا کہ لاجو ایک دن گوردوارے میں ماتھا ٹیکنے کے لیے گئی تو اس نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا•••• لاجو کو گاؤں کے تین سگے بھائی کہیں سے بھگا لائے تھے وہ برائے نام پردہ داری کے ساتھ تینوں کی بیوی تھی۔ وہ تینوں بیکار تھے جو داؤں لگتا کر گذرتے ایک بھائی نے پنساری کی دوکان کھول رکھی تھی۔ کبھی جلیبیاں نکال لیتے۔ کبھی ایک تانگہ تیار کر لیتے۔ موقع پڑنے پر اچھے پیمانے پر چوریاں بھی کرتے، کبھی کسی راہگیر کی گھوڑی چھین لاتے ••• "کیوں لاجو! کیا یہ بات درست ہے کہ گر نتھی نے تمہارا ہاتھ پکڑا؟" لاجو نے بڑی تفصیل سے بتایا کہ کیوں کر گر نتھی نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اس کو گلے لگانے کی کوشش کی۔

"گر نتھی جی تم کو کچھ کہنا ہے؟"

"میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔"

لاجو چمک کر کچھ کہنے کو تھی کہ اس کو روک دیا گیا۔ "تو گر نتھی جی آج تم نے لاجو کا ہاتھ پکڑا کل کسی اور کا آنچل کھینچو گے۔ گاؤں کی بہو بیٹیوں کی عزت تمہارے ہاتھوں محفوظ نہیں۔"

"میں نے اس کا ہاتھ نہیں پکڑا۔" ••••

"تم نے کام تو وہ کیا ہے کہ تم کو ••••• خیر کل شنکرات کا کام بھگتا کر پرسوں یہاں سے چلے جاؤ۔"

گر نتھی واپس آکر بستر پر لیٹ گیا۔ نیند نہ آتی تھی۔

ایک عرصہ تک ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اس گوردوارے میں گر نتھی مقرر ہوا تھا۔ یہاں اسکو ہر طرح کا آرام میسر تھا۔ ایک طرف تو تاریخی عمارت، دوسری طرف نئی عمارت بن رہی تھی۔ چک ۳۵ اور چک ۳۶ کا یہ مشترکہ گوردوارہ تھا۔ یہ گاؤں چونکہ ایک سے دوسرے کے بلکل قریب قریب تھے۔ اسلئے علحدہ علحدہ گوردوارے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی نتیجہ یہ تھا کہ چڑھاوا بھی زیادہ چڑھتا تھا

تھوڑی دیر تک اسکی بیوی اسکے قریب بیٹھی رہی وہ اداس تھی لیکن اسکو اپنے خاوند پر بھروسہ تھا وہ جانتی تھی کہ اسکے خاوند پر جو الزام دھرا گیا تھا وہ سراسر بے بنیاد تھا وہ دونوں اس آفت کا اصل سبب بھی جانتے تھے لیکن لاچار تھے اگر اس جگہ رہنے کا مطلب یہ تھا کہ بات بات میں بے عزتی برداشت کی جائے اس کی بیوی دوسروں کے گھروں میں جاکر نہ صرف کام کرے بلکہ ان کی خوشامد بھی کرے تو اس سے بہتر یہی تھا کہ وہ اس غلامی کو خیرباد کہکر اپنے گاوں کو چلے جائیں ۔۔۔۔ لیکن آئندہ وہ کیا کرے گا؟ یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی

گرمیوں کی چاندنی رات میں وہ کھلے آسمان میں چارپائی پر لیٹا صحیح معنوں میں تارے گن رہا تھا اس نے تاروں کی طرف کبھی دھیان ہی نہیں دیا تھا ورنہ تاروں کی دنیا بھی کس قدر خوبصورت اور انوکھی تھی کتنی دور تک پھیلے ہوے بے شمار تارے اور بادلوں کی صورت کے وہ تارے جن کی بابت یہی کہا جاتا تھا کے مرنے کے بعد انسان کی روح اسی راستے سے ہوکر جاتی تھی نہ معلوم وہ راستہ کیسا ہوگا؟ کیسی جگہ ہوگی؟ درخت ہونگے یا ریت کے ٹیلے۔ جب روح تھک جاتی ہوگی تو اسکو دم لینے کی اجازت ملتی ہوگی یا نہیں یہ راستہ آخر کار کہاں ختم ہوگا؟

اس کی آنکھ لگ گئی جب جاگا تو تارے جھلملا رہے تھے ہوا میں خنکی تھی باڑے میں بوڑھا بیل سینگ ہلا رہا تھا اور اسکے گلے میں پڑی گھنٹیاں بج رہی تھیں گوردوارے کے اندر اس کے چھوٹے سے مکان کے صحن میں اس کی بیوی دہی بلو رہی تھی دہی بلونے کی آواز اس بات کا یقینی ثبوت تھی کہ اب صبح ہونے والی تھی۔

وہ اٹھا کلہاڑی پکڑ کر ببول کے درختوں کی طرف چلا گیا ایک نازک سی شاخ کاٹ کر اسنے تین داتونیں بنائیں اپنے لئے۔ اپنی بیوی کے لئے اور اپنی نو سالہ بچی کیلئے ایک جھاڑن کاندھے پر ڈالے وہ کھیتوں میں سے ہوتا ہوا باڑے میں واپس آیا اور بیل کی رسی کھول کر رہٹ کی طرف بڑھا۔

پرانی طرز کا یہ رہٹ سطح زمین سے بہت اونچا تھا۔ ایک اونچا گول چبوترا جہاں اسے گوبر ملی مٹی نیچے گرتی رہتی تھی۔ چبوترے کے دونوں طرف گارے کی بے ڈول سی ٹیڑھی میڑھی دو دیواریں کھڑی تھیں۔ ان پر درخت کاٹ کر ایک طویل لٹھ ٹکا دیا گیا تھا۔ اس کے بیچوں بیچ چرکھڑی کی لکڑی گھسی ہوئی تھی۔ پاس ہی دوسری چرکھڑی اس میں دانت جمائے کھڑی تھی۔ نچلی چرکھڑی کے پاس لکڑی کا کتا جو اس کو پیچھے کی جانب گھومنے سے روکتا تھا۔ جب بیل کو جوت دیا گیا اور چرکھڑیاں گھومنے لگیں تو کتا کٹ کٹ بولنے لگا۔ کنویں والا بڑا چرکھڑا بھی گھوما، رسیوں سے بندھی ہوئی ٹنڈیں پانی کی طرف لپکیں جو ٹنڈیں رات کی بھری بیٹھی تھیں انھوں نے پانی انڈیل دیا۔ جھال میں سے پانی کی دھار اتیزی سے نکلی کنواں عجیب سروں میں روں روں کی آواز نکالنے لگا کبھی ایسا جان پڑتا جیسے گا رہا ہو۔ کبھی رونے کی سی آواز نکلنے لگتی۔ کبھی اس میں سے

دلسوز چیخ کی سی آواز پیدا ہوتی •••• تاریکی میں یہ عجیب و غریب آوازیں، چھوٹی بڑی گھومتی ہوئی چرکھڑیاں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے کوئی عجیب الخلقت جانور رینگ رہا ہو۔

شور و غل سے فضا میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ ادھر ادھر سے دو چار کتے بھی بھونکنے لگے۔

گرنتھی نے جھال کی طرف تختہ لگا کر پانی روک لیا۔ تاکہ یہ ٹونٹیوں کی طرف چلا جائے۔ جب کھیتوں کو پانی دینا ہوتا تو پانی کا رخ جھال کی طرف کر دیا جاتا۔ چار دیواری پر بیٹھ کر اس نے داتون کی۔ داتون کی کوچی سے دانت اور مسوڑے صاف کیے، پھر داتون کو بیچوں بیچ پھاڑ کر اسے کمان کی صورت گھمایا اور زبان پر رگڑا۔ منہ میں انگلی پھیر پھیر کر وہ کھانستا اور تھوکتا رہا۔

کنویں پر جھکے ہوئے شہتوت کے پیڑ پر پرندے پر پھڑپھڑانے لگے۔ داتون پھینک کر اس نے کپڑے اتارے ٹونٹی کے منہ سے لکڑی ہٹا دی۔ منہ اور ڈاڑھی دھو کر واہگورو واہگورو کا ورد کرتا پانی کی دھارا کے نیچے بیٹھ گیا۔ یہ روز کا معمول تھا۔ کل وہ اس جگہ کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ اس وقت یہ بات کس قدر ناقابل یقین تھی۔

کچھا نچوڑ کر اسے بغل میں دبایا۔ پانی سے لبریز بالٹی اٹھا کر وہ گوردوارے کے اندر چلا گیا بڑے صحن میں اس کی بیوی جھاڑو دے رہی تھی۔ کچھا جھٹک کر رسی پر ڈالنے کے بعد اس نے فرش پر پانی چھڑکنا شروع کیا۔

آج شنکرات تھی۔

صفائی اور چھڑکاؤ کے بعد ٹاٹ فرش پر بچھایا گیا۔ گرنتھ صاحب پر سلک کے رومال ڈال دیئے گئے۔ چوری بھی صاف کر کے قریب رکھ دی گئی۔ پھر وہ اندر سے ہارمونیم، ڈھولکی، چمٹا، چھینے وغیرہ گانے بجانے کے ساز اٹھا لایا۔ اس کی بیوی پاس کھڑی داتون کر رہی تھی۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں کو اس بات کا احساس تھا۔ کہ جب ان کو وہاں رہنا ہی نہیں تو ان کی بلا سے وہ کام بھی کیوں کریں۔ لیکن یہ گوردگھر کا کام تھا۔ یہ تو گوردوارے کی سیوا تھی۔ کسی پر کیا احسان تھا۔ اپنی ہی آخرت کا سوال تھا•••• اور دونوں کے دلوں میں ایک مبہم سا احساس بھی تھا کہ ممکن ہے کوئی ایسی صورت نکل آئے کہ انکا جانا منسوخ ہو جائے۔

لڑکی آج اچھے اچھے کپڑے پہنے پھولی نہ سماتی تھی۔ کتنی پیاری لگ رہی تھی۔

دھوپ نکل آئی۔ اس کی بیوی چہرے پر چھدی مل کر گھڑی کی گھڑی دھوپ میں جا بیٹھی۔ گرنتھی نے بڑے بڑے مٹکوں میں پانی بھرنا شروع کیا تاکہ سنگت کو پیاس لگے تو پانی کو دقت نہ ہو۔ گوردوارے کا بوڑھا بیل کمزور ہو چکا تھا۔ کام کم کرتا اور آرام زیادہ۔ یہ تو ہو نہ سکتا تھا کہ سنگت کو پانی پلانے کے لئے وہ بیل کو شام تک کنویں کے آگے جوتے رکھے۔

سنگھا ہاتھ میں لئے وہ گوردوارے کی ٹوٹی پھوٹی چار دیواری سے باہر نکل آیا۔ دروازے کے قریب درخت کا ایک بھاری بھرکم تنہ پانی کے گڑھے میں دھنسا پڑا تھا۔ ارد گرد گوردوارے

کے وہ کھیت تھے ۔ جن میں اس نے خود ہل چلایا تھا، بیج بویا تھا ۔ چاندنی اور اندھیری راتوں میں پانی سے سینچا تھا ۔ نلائی کی تھی ۔ ان کھیتوں سے اس کا کتنا گہرا تعلق تھا ۔ اس کا پسینہ ان کھیتوں کی بھربھری مٹی میں جذب ہو چکا تھا ۔ اب وہ اپنی امانت کسی صورت میں بھی واپس لینے کا حقدار نہ تھا
قریب ہی بڑ کا ایک بوڑھا درخت تھا ۔ جس کی بابت ایک روایت مشہور تھی ۔ گوروؤں کے زمانے میں ایک نہایت پاکباز شخص اس گوردوارے میں سیوا کیا کرتا تھا ۔ اس نے اپنی عمر اسی جگہ گورو کے چرنوں میں بتادی ۔ یہاں تک کہ وہ بوڑھا ہو گیا ۔ ••••• لیکن اس کی محنت میں فرق نہ آیا ۔ اس کا دل اسی جوش اور خلوص سے لبریز تھا ۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے کہ گرمیوں کی دوپہر میں وہ کھیتوں کی نلائی کر رہا تھا ۔ اس کی پگڑی کے اندر اس کے الجھے ہوئے بال پسینے میں تر ہو رہے تھے ۔ اسے پیاس محسوس ہوئی ۔ اس نے منڈ میں پانی بھر کر رسی کا بگا باندھ کر اسے بڑے درخت کی ٹہنی سے لٹکا رکھا تھا ۔ جب اس نے منڈ کو چھوا تو وہ اس قدر ٹھنڈی تھی جیسے برف ۔ کس قدر ٹھنڈا پانی ہے، اس نے دل میں کہا گورو صاحب سچے پادشاہ اسی طرف کو آنیوالے ہیں ۔ کیوں نہ پانی انہیں کے لئے رہنے دوں ۔ وہ اسمیں سے پانی پی لیں گے تو باقی پانی سے میں اپنی پیاس بجھالوں گا •••• بیشک گورو صاحب دورہ کرتے ہوئے اس طرف کو آنے والے تھے ۔ لیکن ان کے آنے میں ابھی بہت دیر تھی ۔ اس وقت وہ اطمینان سے دربار میں بیٹھے سنگتوں کو درشن دے رہے تھے یکایک گورو صاحب اٹھ بیٹھے ۔ اور فی الفور کوچ کا حکم صادر فرمایا ۔ سب حیران کہ آخر اس میں بھید کیا ہے ۔ یہ بیٹھے بٹھائے ایک دم اتنی عجلت کیوں ؟ گورو صاحب سچے پادشاہ نے فرمایا، میرا ایک سکھ منتظر ہے وہ پیاسا ہے ۔ جب تک میں وہاں جاکر پانی نہ پیوں گا وہ پیاسا ہی رہے گا ••••• گورو صاحب گھوڑا سرپٹ دوڑاتے ہوئے اس جگہ پہنچ جاتے ہی پانی مانگا ۔ بوڑھے سکھ نے وہ منڈ آگے بڑھادی •••• وہ کس قدر خوش تھا ۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔

گر نتھی درخت کے تنے پر کھڑا ہو گیا ۔ جب اس نے سنگھ منہ سے لگایا تو دل میں سوچنے لگا گورو صاحب دلوں کا حال جانتے ہیں ۔ وہ میری بے گناہی سے واقف ہیں ۔ وہ یہاں سے نہیں جائے گا ۔ اس کو یقین تھا کہ ضرور کوئی ایسی صورت نکل آئے گی ۔

سنکھ پورنے کے بعد وہ دیر تک گاؤں کی طرف دیکھتا رہا، جیسے وہ بھی کسی کی آمد کا منتظر ہو ۔ کتنی تیز دھوپ ہو گئی تھی اور لوگ ابھی گھر سے بھی نہ نکلے تھے ۔ مٹیالے مکان ۔ مکانوں کے بیچ میں سر اٹھائے ہوئے سرسبز درخت •••• کچی سڑک سے آگے ڈھلوان پر بھنگیوں کے کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے ۔ دو تین بچھڑے ادھر ادھر قلانچیں بھرتے پھرتے تھے ۔

وہ گوردوارے کے چھوٹے سے باغ میں گیا ۔ انگور کی بیلیں آڑی ترچھی لکڑیوں پر سے گر پڑتی تھیں ۔ ایک کونے میں سے اس نے الجھی ہوئی رسیاں اٹھائیں ، بیلوں کو لکڑیوں کے ساتھ لگا لگا کر رسیوں کے ٹکڑوں سے ، کچھ ڈھیل دے دیکر باندھنے لگا ۔ اس کی موٹی موٹی انگلیاں اپنے کام

میں باہر تھیں ۔ قریب ہی ہرے دھنیئے اور مرچوں کی کیاری تھی ۔ وہ اس کے کنارے پنجوں کے بل بیٹھ گیا ۔ بیچ بیچ میں کھٹ مٹھی بوٹی کے چھوٹے چھوٹے پودے بھی تھے ۔ اس نے احتیاط سے ان کو اکھاڑنا شروع کیا ۔ بچے ان بوٹیوں کو شوق سے کھاتے تھے ۔ انار کے پیڑ خاموش سمادھی میں بیٹھے ہوئے اور درویشوں کی مانند نظر آتے تھے ۔ ہوا بند تھی ۔ پیڑوں کی پتیاں تک نہ ہلتی تھیں معلوم ہوتا تھا، جیسے پرماتما سے ان کی لو لگی ہوئی ہو ۔ باغ کا کتنا حصہ بیکار ۔ پڑا تھا ۔ اس کا خیال تھا ۔ وہ جھاڑیوں اور مدار کے خود رو پیڑوں سے وہ حصہ صاف کر کے وہاں سبزیاں لگائے ۔ مٹر، ٹماٹر، گوبھی ۰۰۰۰

ہر پیڑ اور پودے کو دیکھتا ہوا وہ باہر نکلا ۔ پھر اسی تنے پر کھڑے ہو کر اس نے دوسری مرتبہ سنکھ بجایا ۔ کوئی صورت نظر نہ آتی تھی ۔ مرد تو خیر کھیتوں پر کام کر رہے تھے ۔ لیکن عورتیں گھروں میں گھسی پڑی تھیں ۔ بیوی سے کہنے لگا ۔ "دو مرتبہ سنکھ پور چکا ہوں کوئی شخص نظر نہیں آتا کم از کم عورتوں کو آجانا چاہیئے ۔"

اس کی بیوی چپ رہی ۔ عورتوں کی بابت وہ جانتی تھی ۔ اول تو ہر عورت کے چار چار پانچ پانچ بچے تھے ۔ ان کو نہلانا دھلانا ۔ پھر ہر عورت کو بناؤ سنگھار بھی کرنا تھا ۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں اپنے گہنوں اور کپڑوں کی نمائش کی جا سکتی تھی ۔ اس کے علاوہ دنیا بھر کی باتیں یہیں کی جاتی تھیں ۔ کئی پیچیدہ مسائل یہیں بیٹھ کر سلجھائے جاتے تھے ۔

چھوٹی بچی نے خوشی میں ڈھولکی دھپ دھپانی شروع کی ۔ گرنتھی چمبیلی کے پودوں کے گرد اینٹوں کے اکھڑے ہوئے جنگلوں کی مرمت کرنے لگا ۔ کہیں کوئی اینٹ گری پڑی تھی ۔ کہیں کوئی ٹہنی اینٹوں میں الجھ کر رہ گئی تھی ۔ کسی جگہ پودے اس قدر پھیل گئے تھے کہ جنگلے کو اور وسیع کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی ۔

لوہے کے ڈول بھر بھر کر اس نے پھولوں کو پانی دینا شروع کیا ۔ بچارے گیندے کے پھول تو نرے یتیم ہی تھے ۔ کوئی ان کی خبر گیری نہ کرتا تھا ۔ بچارے خشک اور سخت زمین میں ہی نشو و نما پاتے ۔ کوڑا کرکٹ بھی انہیں پر پھینک دیا جاتا ۔ اس کے باوجود جب پھول آتے تو ہر طرف پیلا ہی پیلا نظر آتا ۔ پھولوں کے ہار گوندھے جاتے ۔ بچے جھولیاں بھر بھر کر گھروں کو لے جاتے ۔ کچھ گرنتھ صاحب کے سامنے چڑھا دیئے جاتے ۔ بڑی درگت ہوتی، بچاروں کی ۔ وہ جب کبھی گیندے کے کسی کھلے ہوئے پھول کی طرف دیکھتا تو اس کو اس کے یتیم ہونے کا خیال آنے لگتا جیسے کہ وہ خود یتیم تھا ۔ وہ پودے کے قریب بیٹھ جاتا پھول ہوا میں ادھر ادھر جھومنے لگتا ۔ وہ پھول کو پیار سے دونوں ہاتھوں میں لے لیتا ۔ جیسے وہ کسی بچے کا چہرہ ہو اس کو ایک بات یاد آجاتی، ایک مرتبہ (غالباً) گوردار جن دیوجی کے لبادہ کی جھپٹ میں آکر پھول کی ایک پنکھڑی خاک پر گر پڑی تو گورو صاحب کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے ۰۰۰۰ یہ سوچتے سوچتے نامعلوم جذبہ کے زیر اثر

گر نتھی پر رقت سی طاری ہو جاتی ۔ وہ کتنی کتنی دیر تک دم سادھے بیٹھا رہتا ۔ وہ کچھ سمجھ نہ سکتا تھا وہ جانتا تھا کہ اس کی عقل موٹی تھی ۔ لیکن اس کے باوجود وہ ایک ناقابل فہم کیفیت میں ڈوب جاتا ۔

بھٹی کے قریب اس نے کڑاہ پرشاد کا کل سامان اکٹھا کر دیا ۔ لکڑیاں اور موٹے موٹے اپلے بھی ایک طرف ڈھیر کر دیئے اور سنگھ لے کر پھر درخت کے تنے پر جا کھڑا ہوا تیسری مرتبہ سنکھ پور کر وہ دیر تک اسی جگہ کھڑا رہا ۔ دھوپ چلچلا رہی تھی ۔ آنکھیں دھوپ میں تپی ہوئی ہوا کی گرمی کو برداشت نہ کر سکتی تھیں ۔ اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ کر گاؤں پر نظر جمادی ۔ شاید کوئی صورت نظر آجائے ۔ اس کو فکر تھی کام ختم کرنے کی ۔

چند ایک نیلے پیلے دوپٹے ہوا میں لہرائے ۔ کچھ نو عمر لڑکے اور لڑکیاں اٹھکھیلیاں کرتے دکھائی دینے لگے ۔ رنگ برنگ کے رومالوں سے ڈھکی ہوئی تھالیاں ہتھیلیوں پر رکھے زاہد صورت بوڑھی عورتیں پیچھے پیچھے چلی آتی تھیں ۔ رفتہ رفتہ دونوں گاؤں کے لوگ چیونٹیوں کی طرح رینگتے ہوئے نکلے ۔ اور چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں گوردوارے کی طرف بڑھے ۔

گر نتھی نے ہاتھ پاؤں دھو کر پگڑی کو درست کیا ۔ گلے میں زرد رنگ کا طویل سا کپڑا ڈالے واہگورو واہگورو کہتا گورو گر نتھ صاحب کے پاس جا بیٹھا ۔

گر نتھ صاحب سے رومال ہٹا کر ان کو احتیاط سے لپیٹ جلد کے نیچے دباتے ہوئے متبرک کتاب کو کھولا اور آنکھیں موند کر چوری ہلانے لگا ۔

لمبے لمبے گھونگھٹ نکالے عورتیں چار دیواری کے اندر داخل ہوئیں ۔ ان میں سے بعض نئی نویلی دلہنیں تھیں ۔ جنہوں نے کہنیوں تک چوڑیاں پہن رکھی تھیں ۔ سرخ رنگ کی قمیص اور شلوار میں گٹھری سی بنی ہوئی وہ بیر بہوٹیوں کی مانند دکھائی دیتی تھیں ۔ گورو گر نتھ صاحب کے سامنے پیسے ، بتاشے ، پھول ، تھالیوں میں دالیں ، چاول آٹا وغیرہ رکھ وہ ماتھا ٹیکتیں اور ایک طرف بیٹھ جاتیں ۔ لڑکیوں میں بعض نے ہارمونیم پکڑ لیا ۔ ایک لڑکا پچھلے تختے کو ہلا ہلا کر ہوا دینے لگا ۔ دوسرا اپنی انگلیوں سے لکڑیوں کے سیاہ و سپید سروں کو بے تماشہ دبانے لگا ۔ ایک نے ڈھولکی بجانی شروع کی دو لڑکے بڑے چمٹے کو بجانے لگے ۔ چھینے بھی چھنا چھن بولنے لگے ۔ ادھر عورتیں آپس میں تبادلہ خیال کرنے لگیں ۔ ان کی آوازیں ہر پابندی سے آزاد دور تک سنی جا سکتی تھیں ۔ کچھ لڑکوں نے ادھر ادھر بھاگنا شروع کیا ۔ نئی عمارت کے اینٹوں کے چٹے لگے ہوئے تھے ۔ لڑکوں نے اینٹوں کی ریل گاڑی بنائی ایک لمبی قطار میں اینٹ کے پیچھے اینٹ کچھ کچھ فاصلے پر رکھ دی گئی پھر ایک کو جو ٹھوکر لگائی تو ساری اینٹیں دھڑا دھڑ گرنے لگیں ۔ لڑکے اچھل اچھل کر شور مچانے لگے ۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی پگڑیاں کھل گئیں ۔ انھوں نے از سر نو باندھنے کی بجائے پگڑیوں کو بغلوں میں دبایا اور باغ کے دورے پر نکل گئے ۔ آج وہ نڈر ہو رہے تھے ۔ وہ اپنی ماؤں کے ہمراہ

تھے ۔ گرنتھی کا اول تو آج کچھ خوف بھی نہ تھا، دوسرے وہ اس وقت آنکھیں بند کئے گرنتھ صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔

اب مردوں کی آمد شروع ہوئی ۔ موٹے کھدر کے تہبند باندھے، گھٹنوں تک لمبے کرتے پہنے ۔ سروں پر آٹھ آٹھ دس دس گز کلف لگی پگڑیاں لپیٹے، ہاتھوں میں لوہے اور پتیل کی شاموں والی مضبوط لاٹھیاں تھامے اور اپنی ڈاڑھیوں کو خوب چکنا کئے ہوئے آئے اور ماتھا ٹیک ٹیک کر وہ ادھر ادھر بیٹھنے لگے ۔ ان میں سرو قد مضبوط نوجوان بھی تھے ۔ جن کے تہبند رنگدار تھے ۔ تہبند کے پچھلے حصے ایڑیوں میں گھسٹتے آتے تھے ۔ بعض جو شلوار یں پہنے ہوئے تھے ۔ ان کے رنگین ریشمی ازار بند خاص طور پر گھٹنوں تک لٹک رہے تھے ۔ پگڑیوں کے شملے خوب اکڑے ہوئے ایسے چھیل چھبیلے بھی تھے جنھوں نے پگڑی کا آخری سرا گھما پھرا کر پگڑی کے اگلے سرے پر آن ٹھونسا تھا جیسے کسی پلے ہوئے مرغ کے سر پر اس کی شاندار کلغی

مردوں کے پہنچ جانے پر کارروائی شروع ہوی چند نوجوانوں نے بڑھ کر ساز سنبھالے ایک ایک الائچی اور لونگ منہ میں ڈال کر ساز بجانا شروع کئے ہارمونیم کے ساتھ تال پر ڈھولک بجنے لگی چمٹے والے نے جھوم جھوم کر چمٹا بجانے شروع کیا ادھر چھینے بھی ٹکرائے ہارمونیم والے نے منہ کھول کر ایک طویل "ہو" کی آواز نکالنے کے بعد گایا ۔

ایتھے بیٹھ کسے نہیں رہنا دو دن دا

اتنا کہ کر مسلسل منہ ہلانے لگا ڈھولکی والے کی گردن ہلتی تھی تو چمٹے والے کا دھڑ

جب ایک مرتبہ کارروائی شروع ہو گئی تو سرکردہ اصحاب نے آپس میں کانا پھوسی شروع کر دی کئی مسائل زیر بحث تھے ۔

شبد کرتن کے بعد سری گرو گرنتھ صاحب کی پوتر بانی پڑھ کر حاضرین کو سنائی گئی جس کے بعد گو نتھی چوکی پر سے اترا اور ارداس (دعا) کے لئے گورو گرنتھ صاحب کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا حاضرین نے بھی اسکی پیروی کی سب لوگ ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو گئے گرنتھی نے آنکھیں بند کر لیں اور ارداس شروع کر دی

" پر تھم بھگوتی سمر کے گرو نانک لئی دھیائے پھر انگد گورتے امرداس رامداسے ہو سہائے ...."

اس طرح دسوں گروؤں کے نام دھائے گئے ۔ اور پھر ..۔

" پنج پیارے چار صاحبزادے (صاحب اجیت سنگھ جی، صاحب جھجھار سنگھ جی، صاحب جوار در سنگھ جی، صاحب فتح سنگھ جی) چالیس مکتے شہیدوں، مریدوں، صدق رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا دھیان دھر کے خالصہ جی، بولو جی واہگورو ...." گرنتھی کے واہگورو کہنے پر حاضرین اسکے ساتھ " واہگورو واہگورو " کہتے ادھر حاضرین کی آواز گونجی ادھر ایک بڑے طبل پر چوب پڑتی اور

طبل کی آواز حاضرین کی آواز ساتھ گھل مل کر دیر تک لرزتی رہتی اور دلوں پر ایک ہیبت سی طاری ہو جاتی ••••" جن لوگوں نے دھرم کے لئے جانیں قربان کیں چکھڑیوں پر چڑھے (بدن کے جوڑ جوڑ جدا کروائے جن کی کھالیں کھینچ لی گئیں جنہوں نے کھوپڑیاں اتروائیں لیکن اپنا دھرم نہیں چھوڑا جنہوں نے سکھی صدق اپنے سر کے پوتر کیسوں (بالوں) اور اپنے آخری سانسوں تک نبھایا ان سنگھوں (شیروں) اور سنگھنیوں (شیرنیوں) کی کمائی کا دھیان کر کے خالصہ صاحب بولوجی واہگورو••"

"واہگورو، واہگورو!!"

•••• " جن گور مکھوں نے گوردواروں کے سدھار نے کی خاطر سری ننکانہ صاحب جی میں اور سری ترن تارن صاحب جی کے سلسلے میں اپنے جسموں پر تکالیف برداشت کیں جیتے جی تیل ڈال کر جلادئے گئے دہکتی بھٹیوں میں جھونک دئے گئے اور وہ (اس طرح) شہید ہو گئے ان گرو کی صورت رکھنے والے سکھوں کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولوجی واہگرو۔"

"واہگرو، واہگرو!!"

••••• " جن ماؤں بہنوں نے اپنے بچوں کے ٹکڑے ٹکڑے کروا کر اپنی جھولیوں میں ڈلوائے ان کی کمائی کا صدقہ خالصہ صاحب بولوجی واہگرو"

"واہگرو، واہگرو!!"

طویل دعا کے آخر میں "••••• (اے گرو صاحب) ہم کو نفسانی خواہشات، غصہ، لالچ، محبت، اور غرور سے بچائیے آپ کے حضور امرت ویلے کی ارداس اگر بھول چوک میں کوئی لفظ کم و بیش ہو گیا ہو تو اسکے لئے ہم معافی کے خواستگار ہیں سب کے کام سنواریئے گرو نانک نام چڑھدی کلا تیرے بھانے سب کا بھلا۔"

سب نے جھک کر پیشانیاں فرش پر ٹیک دیں گر نتھی نے دل ہی دل میں کہا۔ "واہگرو سچے بادشاہ سے دلوں کا حال چھپا نہیں" پھر کھڑے ہو کر "جو بولے سو نہال ست سری اکال" کے تین نعرے لگائے گئے اسکے بعد کڑا پرشاد (حلوا) بانٹا گیا رفتہ رفتہ لوگ پرشاد ہاتھوں میں چھپائے یا کٹوریوں میں لئے رخصت ہو گئے چند سربرآوردہ اشخاص بیٹھے رہے جب تنہائی ہو گئی تو انہوں نے گر نتھی سے کہا کہ اگر پرشاد باقی ہو تو لایا جائے گر نتھی نے پرشاد ان کو بانٹ دیا چہروں کو اپنے چکنے ہاتھوں سے ملتے ہوئے انہوں نے بھی کہا سنبھالا یون گھنٹے کے بحث مباحثے کے بعد سب حساب صاف ہوا گر نتھی سے کہ دیا گیا کہ دوسرے دن رخصت ہونے سے پہلے وہ چابیاں سردار بگا سنگھ نمبردار کو دے جائے۔

انکے چلے جانے کے بعد گر نتھی کی سب امیدیں ختم ہو گئیں اس کی بیوی نے گھر کا سامان سمیٹنا شروع کر دیا گر نتھی کے دل میں اب تک کچھ خلش سی تھی وہ اضطراب میں ادھر ادھر گھومنے

لگا۔

اپنے دونوں ہاتھ پشت پر باندھے وہ تالاب کے قریب کھڑا ہو کر اس کے سبزی مائل پانی کو دیکھنے لگا اس کے کنارے ٹوٹ پھوٹ گئے تھے ایک دو جگہ سیڑھیوں کی اینٹیں بھی اکھڑ گئی تھیں کائی جمی ہوی تھی اس تالاب میں کوئی نہیں نہاتا تھا نا معلوم کب سے برسات کا پانی جمع تھا ببول کے پیلے پیلے پھولوں کی تہ سی جمی تھی بر گدے کے بڑے بڑے زرد رنگ کے پتے پاش پاش ہو جانے والے جہاز کے شکستہ تختوں کی طرح تیر رہے تھے۔

اس کے قریب ایک پرانی سمادھ تھی جس کی دیواروں پر سے جابجا چونا اکھڑا ہوا تھا اس کی دیواروں پر پرانے زمانے کی رنگدار تصاویر بنی ہوی تھیں کئی جگہ سے رنگ اکھڑے ہوے ضرور تھے لیکن جہاں کہیں بھی موجود تھے کس قدر چمکدار اور دلکش نظر آ رہے تھے خاص کر گرو نانک صاحب کی تصویر درخت کی چھاؤں تلے بابا نانک جی بیٹھے تھے ایک جانب بھائی بالا اور دوسری طرف بھائی مردانہ۔ درخت کی شاخ سے پنجرا لٹک رہا تھا جس میں ایک سرخ چونچ والا طوطا صاف دکھائی دے رہا تھا اسی حجرے میں ساتویں گرو صاحب پرماتما کی یاد میں مصروف رہتے تھے تین چار برس پہلے کی بات تھی کہ ایک سکھ اسی حجرے میں بیٹھ کر بلاناغہ بھگتی کیا کرتا تھا ایک مرتبہ رات کے وقت یکایک حجرہ منور ہو گیا ذرہ ذرہ دکھائی دینے لگا اتنے میں ایک نورانی صورت نظر آئی •••• لیکن وہ سکھ جلوے کی تاب نہ لا سکا وہ بھاگ کر باہر نکل آیا اور فی الفور گونگا ہو گیا اس کے بعد کسی نے اُسے بولتے نہیں سنا •••• گر نتھی نے حجرے کا دروازہ کھول کر اسکے نمدار فرش پر اپنا ننگا پاؤں رکھا اور چپ چاپ کھڑا ہو گیا اتنے میں اسکی بیوی وہاں آئی اور اسکی متغیر صورت دیکھ کر کچھ پریشان سی ہو گئی وہ اس کو اپنے ساتھ لے گئی۔

صحن میں دستی چرکھڑی والے چھوٹے سے کنویں کے گرداگرد بنے ہوے چوڑے چبوترے پر نیلے رنگ کی لمبوتری پگڑیاں باندھے نہنگ سکھ پتھر کے بڑے کونڈے میں شردائی گھونٹ رہے تھے پگڑیوں پر لوہے کے چکر گلے میں آہنی منکوں کا مالا لمبے لمبے چغے ••••• وہ لوگ باری باری بادام چاروں مغز کالی مرچیں اور قدرے بھنگ والی شردائی کی گھٹائی کر رہے تھے ایک شخص نے اپنے ہاتھوں اور پاؤں سے کونڈے کو دونوں طرف سے جکڑ رکھا تھا اور دوسرا کھونٹے کا لمبا چوڑا ڈنڈا جو نیچے سے کم موٹا اور اوپر سے بہت زیادہ موٹا تھا ہاتھوں میں لئے گھما رہا تھا ڈنڈے کے اوپر گھنگرو بندھے ہوے تھے جو چھنا چھن بول رہے تھے گر نتھی کچھ دیر تک خاموش دیکھتا رہا۔

سورج غروب ہو چکا تھا ہوا بند تھی جب اسکی بیوی دودھ دوہ کر گھر کے اندر جارہی تھی اس نے حسب معمول اپنی چارپائی باڑے کے قریب ڈال دی جوتے اتار دونوں گھٹنوں پر کہنیاں ٹیک چارپائی پر ہو بیٹھا۔

کوّوں کے جھنڈ کے جھنڈ کائیں کائیں کرتے گاؤں کے چکر لگارہے تھے چھوٹی سی نہر کی اونچی منڈھ چکر لگاتی افق میں گم ہورہی تھی دور چند اونٹ بے مہار ادھرادھر گھوم رہے تھے۔

گرنتھی کھوئی کھوئی نظروں سے افق کی طرف دیکھ رہا تھا جیسے وہ کسی کا منتظر ہو جیسے آسمان سے کوئی نورانی صورت نمودار ہوگی •••• تاریکی بڑھ رہی تھی پورا چاند بلند ہو رہا تھا اتنے میں بنتا سنگھ کندھے پر پھاوڑا رکھے آنکلا بنتا سنگھ کسی عورت کے اغوا کرنے کے جرم میں ڈیڑھ برس قید بامشقت بھگت کر کل ہی اپنے گاؤں میں واپس آیا تھا جیل کی سختیوں کا اس پر کچھ بھی اثر نہ ہوا تھا وہ بدستور ہٹاکٹا تھا جب اسکو سزا ہوئی تھی اسوقت گرنتھی گوردوارے میں آیا ہی تھا قریب پہنچ کر بنتا سنگھ نے بلند آواز میں ست سری اکال کا نعرہ لگایا چارپائی پر بیٹھ گیا •• اسکے پھاوڑے سے گاڑھا گاڑھا کیچڑ ٹپک رہا تھا۔

ادھرادھر کی باتوں کے بعد اسنے پوچھا •••"گرنتھی جی! سنا ہے کچھ آپ کے خلاف جھگڑا کھڑا کیا گیا ہے •••• میں تو کل رات واپس آیا تھا آج صبح سے میں چک ۱۵۶ میں ماموں سے ملنے چلا گیا تھا اب میں سیدھا کھیتوں کی طرف چلا آیا آخر ماجرا کیا ہے ؟"

بنتا سنگھ کا نہ صرف گاؤں میں دبدبہ تھا بلکہ علاقہ بھر میں لوگ اس سے خم کھاتے تھے جب گرنتھی نے اس کو بتایا کہ اس کی قسمت کا فیصلہ بھی ہو چکا ہے تو وہ جھلا کر اٹھ کھڑا ہوا "کس کی مجال ہے کہ تم کو یہاں سے نکالے گرنتھی جی تم اسی جگہ رہو گے اور ڈنکے کی چوٹ رہو گے میں دیکھونگا کون مائی کالال تم کو یہاں سے نکالنے کے لئے آتا ہے۔"

یہ سن کر گرنتھی نے جو اب تک بے حس سا بیٹھا تھا آنکھیں جھپکائیں اس کی بھنوؤں کو حرکت ہوئی وہ مسکین آواز میں بولا" اور سردار بنتا سنگھ واہگرو جانتا ہے میں نے لاجو کو چھوا تک نہیں"

سردار بکا سنگھ کے دو آدمی ادھر سے گذرتے ہوئے یہ باتیں سن رہے تھے بنتا سنگھ ان کو سنا کر بلند آواز میں للکار کر بولا؛"گرنتھی جی! تم یہ کیوں کہتے ہو کہ تم نے اسکا ہاتھ نہیں پکڑا تم ہزار مرتبہ لاجو کا ہاتھ پکڑ سکتے ہو •••• میں بکا سنگھ کو بھی دیکھ لونگا بڑا نمبردار بنا پھرتا ہے •••• اور جن لوگوں نے پنچایت میں حصہ لیا ہے ان میں سے ایک ایک سے نبٹ لونگا••••"

اپنی بھرپور آواز میں اس نے یہ موٹی موٹی گالیاں بھی سنائیں •••••

یہ خبر دونوں گاؤں میں آگ کی طرح پھیل گئی••••• سب لوگ لاجو کو گالیاں دینے لگے حرامزادی مفت میں بچارے گرنتھی پر الزام دھر دیا۔

(مشمولہ "تار پود" سن اشاعت ۱۹۴۴ء)

بلونت سنگھ

خلا

جب میں کوٹھی کے نزدیک پہنچا تو ٹھٹک کر ایک درخت کے تلے کھڑا ہو گیا۔ اس وقت میری صورت سے ۔ ی دحشت ٹپک رہی ہوگی۔ گرمیوں کے دن، گیارہ بجے کا وقت دھوپ کی تمازت، سڑک کے کنکر دہکتے انگارے ہو رہے تھے۔ چند ایک کنکر میرے بوٹوں میں داخل ہو گئے تھے۔ راستہ بھر پریشان رہا۔ تسمے کھول کر بوٹوں کو جھاڑا ۰۰۰۰ اور پھر پسینہ پونچھ کر سوچنے لگا کہ اندر جاکر کیا کہوں گا۔ شاید وہ لوگ حیران رہ جائیں کہ آج اس قدر تیز دھوپ میں میں اکیلا چلا آیا

خاں صاحب ہمارے دور کے رشتہ دار تھے۔ ہم لوگ ان کے مقابلے میں غریب تھے۔ جب تک میرے والد صاحب ملازمت میں تھے اچھا گذارا ہو جاتا تھا۔ لیکن حالات نے پلٹا کھایا۔ نوکری چھوٹ گئی اور وہ گھبرا کر کسی بیمہ کمپنی کے ایجنٹ بن گئے۔ پہلے شہر سے باہر سرکاری مکان میں رہتے تھے۔ اب ہم لوگ شہر میں آگئے تھے۔ موجودہ مکان کے آگے ایک اونچا چبوترا تھا۔ چند پختہ سیڑھیوں کے بعد برآمدہ۔ برآمدے کے دونو گوشوں پر ایک ایک غسل خانہ اس چھوٹے سے مکان کے نصف حصہ میں ایک اور کرایہ ادار رہتے تھے۔ باہر کے برآمدے میں اپنے غسل خانے کی طرف انھوں نے ٹاٹ کا ایک بڑا ٹکڑا لٹکا رکھا تھا۔ اندر ایک دو دو کمرے تھے۔ ایک چھوٹا ایک بڑا۔ صحن مشترکہ ہی تھا۔ البتہ ایک چھوٹا سا باورچی خانہ ہمارے حصے میں آیا تھا اور ایک ان کے۔ ادھر ہماری بھاگ جانے کی سوجھی۔ اسی حیص بیص میں تھا کہ بڑی اماں نے گھوم کر میری طرف دیکھا ۰۰۰۰ گوناگوں جذبات کی وجہ سے نہ معلوم میرے چہرے کی کیفیت کیا ہو رہی ہوگی ۰۰۰۰ لیکن اماں کا چہرہ جذبات سے خالی رہا۔ میں نے ادب سے ہاتھ پیشانی تک لیجا کر کہا۔ "اماں جی! سلام کرتا ہوں"۔

بڑی اماں نے سلام کا جواب نہیں دیا۔ ان کی نظر کمزور تھی۔ گھور کر دیکھتے ہوئے بولیں "تو کون ہے چھوکرے"۔

میں بہت پریشان ہوا۔ دل میں پچھتانے لگا کہ ناحق آیا۔ بوڑھی اماں نے آگے بڑھتے ہوئے عینک صاف کر کے ناک پر ٹکائی۔ اور قریب سے دیکھنے لگیں۔ میرا دل دھڑک رہا تھا۔ زبان سوکھی جارہی تھی۔ بارے وہ مجھے پہچان کر اندر لے گئیں۔ کرسی پر بٹھایا۔ بچاری پریشان

تھیں کہ نہ معلوم کیا افتاد پڑی کہ بچارا ننگے سر اس قدر دھوپ میں پیدل چلا آیا ۰۰۰۰ ٹوپی بغل میں تھی ۰۰۰۰ انھوں نے برقی پنکھا چھوڑ دیا اور شربت کا گلاس منگوایا ۔ نوکر گلاس پلیٹ میں رکھ کر لایا ۔ میں نے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے گلاس اٹھایا مجھ کو خوف تھا اگر گلاس پلیٹ میں سے پھسل کر گر پڑا تو وہ مجھے بے تمیز سمجھیں گی ۔

بڑی اماں باوضع اور مہذب خاتون تھیں ۔ جب میرے دم میں دم آیا تو انھوں نے آنے کا مدعا پوچھا ۔ میں نے بتایا تو بچاری کے چہرے سے مایوسی کے آثار دکھائی دینے لگے ۔ بولیں ۔ " بیٹا! پہلے کیوں نہ بتایا ۔ اب تو لوگوں نے بچے لے لیے " ۔

میرا دل ٹوٹ گیا ۔ روہنکا ہو کر پوچھا ۔ " ایک بھی باقی نہیں بچا ؟ "

وہ مجھے خاں صاحب کے پاس لے گئیں ۔ خان صاحب نے اخاہ کا نعرہ لگا کر مجھے بہت پیار کیا ۔ گھر سے باہر ان کا کس قدر دبدبہ تھا اور جو کوئی انہیں ملنے کیلئے آتا تو ان سے آنکھ نہ ملا سکتا تھا ۔ اماں نے اصل بات بتائی ۔ خاں صاحب نے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا ۔ " بیٹا کل چار بچے دیئے لوسی نے ۔ " تین لڑکے " اور ایک " لڑکی " کیا سمجھے ؟ " پھر ہنس پڑے " تم جانتے ہی ہو کہ ہمارا کتا انگریزی نسل کا ہے اور لوسی بھی لیکن نسل دونوں کی علحدہ علحدہ ہے ۔ اب نتیجہ یہ نکلا کہ کتیا اور دو کتے تو اپنے باپ کی طرح خوب لمبے لمبے بالوں والے ہیں ۔ اور ایک کتا چھوٹے بالوں والا ۔ ہو بہو لوسی کی طرح ۔ سمجھے بھائی ؟ لمبے بالوں والا ایک کتا تو ہماری پڑوسن میمہ صاحبہ نے لے لیا ہے ۔ اور دوسرا ریاست نابھ کے ایک رئیس نے مانگ لیا ہے ۔ میم صاحب تو اپنا کتا لے بھی گئیں ۔ دوسرے کے لیے ہم وعدہ کر چکے ہیں اب کہو ۰۰۰ کتیا لو گے ؟ "

میں نے انکار کے طور پر سر ہلا دیا ۔

پھر ہم لوگ نوکروں کے کوارٹروں کی طرف گئے ۔ لوسی پیال پر لیٹی ہوئی تھی تین بچے اوں اوں کرتے ہوئے ماں کا دودھ پینے کی کوشش کر رہے تھے ۔ خاں صاحب نے چھوٹے بالوں والے پلے کی طرف اشارہ کیا ۰۰۰ دوسرے پلے خوب لمبے لمبے بالوں والے تھے اور اپنے باپ کی طرح ان کے جسم پر کہیں کہیں سفیدی بھی موجود بھی ۔ لیکن چھوٹے بالوں والا پلا بالکل اپنی ماں کی طرح تھا ۔ کالا بھجنگ ۔ اس کی آنکھیں بھی نہ کھلی تھیں نیچے کو لٹکتے ہوئے لمبے کان میموں کے ہموار کٹے ہوئے پٹوں کی طرح دکھائی دیتے تھے ۔ وہ خوب موٹا تازہ گول مٹول سا تھا ۔ پہلے میں اس کی جلد پر ہاتھ پھیرتا رہا جو مخمل کی طرح نرم تھی ۔ پھر میں نے اس کو اٹھا لیا ۔ وہ ہاتھ پاؤں چلانے لگا اس کے پنجوں کے ناخن گنے چاروں پنجوں کے ناخن گنتی میں بیس تھے ۔ سنا تھا کہ بیس ناخنوں والا کتا بڑا لڑاکا اور طاقتور ہوتا ہے اس کے بعد میں نے اسے زمین پر رکھا اور دونوں کانوں سے پکڑ کر اوپر اٹھا دیا ۔ وہ چپ رہا ۔ میں نے ایک کان سے پکڑ کر اٹھایا پھر نہیں چیخا جب تک میں یہ آزمائش کرتا رہا ۔ خان صاحب کھڑے مسکراتے رہے ۔ میں تھوڑی دیر تک کتے کو دیکھتا رہا ۔ جب

دل میں یہ خیال آیا کہ میں اسے اپنا سکتا ہوں تو پھر وہ مجھ کو پیارا معلوم ہونے لگا۔ بالاخر میں نے اسے اٹھاکر جھولی میں ڈال لیا۔ اور کہا "چچا مجھے یہ کتا پسند ہے۔"

خاں صاحب بولے "بیٹا ابھی اسے اسی جگہ رہنے دو۔ بچہ ہے نا! ماں کا دودھ پیئے گا۔ جب آنکھ کھولے گا تو لے جانا یا ہم بھجوا دیں گے۔"

میں اس بات پر آمادہ نہ ہوا۔ اور فوراً چل کھڑا ہوا۔

پلا میری جھولی میں پڑا ہوا بلکتا رہا۔ پھر رفتہ رفتہ سو گیا۔ میں نے جیب میں سے رومال نکال کر اس پر ڈال دیا اور دھوپ سے بچاتا ہوا گھر کی طرف لپکا۔

ایک مشکل تو حل ہو چکی تھی۔ اب دوسرا مرحلہ درپیش تھا۔ فکر یہ تھی کہ کتا گھر میں کیسے لیجاؤں۔۔۔ وہ ننھی سی جان میری گود میں تھی۔ اس کے دل کی دھڑکن اپنے سینہ پر محسوس کر رہا تھا۔۔۔۔ جوں جوں میں گھر کے قریب پہنچ رہا تھا۔ توں توں میرے قدم سست پڑ رہے تھے۔

ہمارے گھر کے نصف حصے میں جو کرایہ دار رہتے تھے۔ ان سے ہمارے بہت اچھے تعلقات تھے۔ فقط میاں بیوی کا ایک جوڑا تھا۔ میاں کسی دفتر میں ملازم تھے۔ نو بجے دفتر کو سدھارتے۔ شام کو پانچ بجے آن صورت دکھاتے۔ ابھی نوجوان تھے۔ ان کی بیوی نئی نویلی دلہن تھی۔ خدوخال اچھے تھے۔ رنگ بہت گورا چٹا تھا۔ بالکل میم صاحب معلوم ہوتی تھیں۔ جسم خوب مضبوط اور بھرا ہوا تھا۔ جب مہندی رچاکر آنکھوں میں سرمہ ڈال لیتیں تو بڑی اچھی لگتی تھیں۔ میاں پردے کی سختی سے پابندی کرتے تھے۔ انکی بیوی جن کو میں خالہ کہا کرتا تھا۔ ایک تو وہ یونہی چھوکری سی تھیں دوسرے شرمیلی تیسرے اپنے میاں سے بہت ڈرتی تھیں۔ اس لیے بچاری کبھی کمرے سے باہر جھانکنے کی جراءت نہ کرتی تھیں۔ میری عمر اس وقت غالباً گیارہ برس کی تھی مجھ سے پردہ نہ تھا۔ خالہ امی کی منہ بولی بہن تھیں۔ بڑی ہنسوڑ اور کھلنڈری معمولی سی بات پر ان کو اتنی ہنسی چھوٹتی کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھیں۔ الھڑ اور طبیعت میں لڑکپن چھپانے سے کیا حاصل۔ انھوں نے ابھی تک اپنے گڈے اور گڑیاں میاں کی نظر سے بچاکر سنبھال رکھے تھے۔ جب ان کے میاں دفتر کو چلے جاتے تو دوپہر کے وقت ہم دونوں گڈوں گڑیوں کے کھیل کھیلتے۔ اس معاملے میں میں ہی ان کا رازداں تھا۔ امی بھی اس بات سے بے خبر تھیں۔

بچاری خالہ جان پر بہت سی پابندیاں عائد تھیں۔ نہ کوئی سہیلی کہ دل بہلالیویں۔ امی کا وہ ادب کرتی تھیں۔ یعنی کم از کم گڑیاں کھیلنے کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہو سکتا تھا مجبوراً خالہ جان کو مجھی سے رجوع کرنا پڑتا۔ جب تک میاں غائب رہتے وہ پریشان سی کمرے میں پڑی رہتیں۔ کبھی دو گھڑی امی سے بات کر لیتیں۔ مجھے دیکھتیں تو آنکھوں میں طفلانہ چمک پیدا ہو جاتی۔ ہم خوب کھیلتے، باتیں کرتے، لڑتے جھگڑتے، روٹھتے مناتے۔۔۔۔ کبھی وہ نہا دھو کر بال بکھرائے، ایک دھوتی لپیٹے جس کے ایک پلو سے جسم کے اوپر کا حصہ ڈھانپے ہوتیں، آئینہ کے سامنے کھڑی

بالوں میں تیل رچاتیں اس دوران میں مجھ سے گپ بانکی جاتی ۔ پھر وہ میری طرف دیکھ کر شرماکر کہتیں " ذرا منہ ادھر کر لو نامیں قمیص پہن لوں ••• " کبھی میں ان کو اپنا گھوڑا بنالیتا ۔ بچاری چوپائے کی طرح چلتیں اور میں ان کی پیٹھ پر سوار ان کی لمبی چوٹی گھماکر ان کے دانتوں میں دے دیتا اور اس لگام کو کھینچ کھینچ کر انہیں کمرے کے اندر خوب دوڑاتا ••••• ایک دن امی نے دیکھ پایا ۔ مارے ہنسی کے پیٹ پکڑ کر بیٹھ گئیں " اللہ رے! تم اچھی خالہ ہو گھوڑا بنی گھٹنوں کے بل چل رہی ہو ۔ " اس دن امی نے ہنسی ہنسی میں یہ بات ابا کو بھی بتادی ۔ ابا کھانا کھا رہے تھے ۔ یہ سن کر بہت بگڑنے لگے ۔ " حرامزادے! کتاب لیکر پڑھا کر ••• شرم نہیں آتی ۔ کیا اب تو دودھ پیتا بچہ ہے ۔ جو اس قسم کے لاڈ بگھارتا ہے ۔ " پھر انھوں نے اٹھ کر مجھ کو دھواں دھوں پیٹ ڈالا ۔ میں مار کھاکر روتا ہوا چھوٹے کمرے میں چلا آیا ۔ بچاری خالہ مارنے کی آواز سن کر بھاگی ہوئی آئیں ۔ اور دروازے کے قریب کھڑی ہو گئیں ۔ انھوں نے میرا بازو چھو کر آنے کا اشارہ کیا ۔ میں نے سر ہلادیا اور سسکیاں بھرتا ہوا الگ جا بیٹھا ۔ انھوں نے لپک کر مجھے بڑی مشکل سے گود میں اٹھالیا اور اپنے کمرے میں لے گئیں ۔ بہت پیار کیا کہنے لگیں " تو میرا ننھا سا بھیا آنکھوں کا تارا ہے ۔ بتا میرا کیا قصور ہے ۔ وہ بات میں نے تو ابا کو نہیں کہی امی ہی نے تو کہی ۔ اچھا! ہم امی سے بھی سمجھ لیں گے " ۔ اس کے بعد انھوں نے مجھے ایک چونی خرچ کرنے کے لیے دی ۔

گھر کے قریب پہنچ کر میں رک گیا ۔ ابھی تک یہ بھی طے نہ کر سکا کہ گھر کے اندر کیونکر جاؤں ۔ شاید ابا گھر پر موجود ہوں ۔ نہ معلوم کس قدر خفا ہوں ۔ پوچھیں کہ صبح سے کہاں تھا ••• کاش! ابا گھر پر نہ ہوں امی سے تو خیر نپٹ لونگا ۔ اگرچہ وہ کتوں سے سخت متنفر تھیں ۔ اگر ضد پر اڑ گئیں تو کتے سے ہاتھ دھونے پڑیں گے ۔ آخر کار یہ ترکیب سوجھی کہ چپکے سے پہلے خالہ کے کمرے میں گھس جاؤں اور وہاں سے اپنے گھر کے حالات معلوم کروں ۔

چنانچہ چبوترے کے ساتھ قدم ناپتا ہوا سیڑھیوں پر چڑھ گیا ۔ اور دم سادھے دبے پاؤں ٹاٹ کا پردہ اٹھاکر ایک دم کمرے کی کھڑکی کے سامنے جا کھڑا ہوا ۔ خوش قسمتی سے خالہ آئینے کے سامنے کھڑکی کے قریب کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھیں میں پہنچا تو بدک کر پیچھے ہٹ گئیں ۔ مجھے ہنسی آگئی ۔ ان کے لیے اچنبھے ہی کی بات تھی ۔ مجھ دیکھ کر دم میں دم آیا ۔ لیکن سانس ابھی تک سینہ میں نہ سماتا تھا " میں تو ڈرہی گئی ••• ارے آج تو چوروں کی طرح •••• " میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا ۔ انھوں نے دروازہ کھولا ۔ حیران تھیں کہ آخر بات کیا ہے ۔ میں منہ سے کچھ نہ بولا ۔ صرف رومال ہٹاکر جھولی آگے کر دی ۔ وہ ڈر کر پیچھے ہٹیں ۔ پھر ایک ہاتھ میں کنگھی دوسرے میں بالوں کی لٹیں سنبھالے آگے کو جھک جھک کر دیکھنے لگیں ۔ پھر انھوں نے ہاتھ بڑھاکر پلے کو چھو کر انگلی فوراً پیچھے ہٹالی ••• میں نے آگے بڑھ کر کہا ۔ " چھولیجئے آپ ڈرتی کیوں ہیں ۔ کیا یہ کاٹ کھائے گا ؟ " لیکن اس بات سے وہ گھبراتی تھیں بہت کچھ کہنے سننے کے بعد انھوں

نے ملائمت سے ہاتھ پھیرنا شروع کیا۔ "ہئی کس قدر خوبصورت ۔۔۔ نرم ۔۔۔ گدگدا ۔۔۔۔"
میں نے بتایا کہ چچا کے ہاں سے لایا ہوں ۔۔۔۔ وہ خاں صاحب چچا میں نا! انگریزی کتا ہے
یہ "۔

"ہائے کتنا پیارا ہے یہ" انھوں نے ہلکی سی تالی بجا کر کہا۔ "لاؤ میں ذرا گود میں اٹھالوں۔"
"اے آپ تو بڑی بہادر ہو گئیں ۔۔۔ ابھی تو چھونے سے دم نکلتا تھا۔" انھوں نے پاہوں
میں پلے کو اس طرح لے لیا۔ جیسے وہ روئی کا گالا ہو۔ مسرت کے مارے باچھیں کھلی جاتی تھیں۔
اس کا نام کیا رکھو گے؟"
قدرے سوچکر میں نے کہا۔ "بھئی اس کا نام جیک رہے گا۔"
خالہ جیک جیک کہہ کر اس کو پکارنے لگیں جیسے وہ باتیں ہی تو کرنے لگے گا۔
یہ پوچھنے پر کہ ابا گھر پر تو نہیں نا! انھوں نے لاعلمی ظاہر کی۔ میں نے کہا ذرا چکر لگا آیئے۔
بولیں بھئی میں پہلے کنگھی کر لوں پھر قمیص پہن کر جاؤں۔ اگر بہن (امی) اس طرح دیکھ پائیں گی
تو مفت میں خفا ہو جائیں گی۔"
"قمیص پہن کر ذرا پتہ لگا دیجئے۔ کنگھی پھر کر لیجئے گا۔ میں نے منت سے کہا۔"
"بھئی ہٹاؤ۔ اس طرح قمیص پر بال جو گر پڑیں گے۔"
"آپ میری خالہ نہیں کیا؟ جائیے نا ۔۔۔۔ آپ کی قمیص پر بال گریں گے تو میں چن دونگا

بڑی مشکل سے گئیں اور پتہ لائیں کہ ابا گھر پر نہیں ہیں اور امی چھوٹے کمرے میں
چارپائی پر بیٹھی جراب بن رہی ہیں۔"
جیک کو بغل میں دبایا اور آگے آگے میں پیچھے پیچھے خالہ ۔۔۔۔ پہلے اندر جھانک کر دیکھا اور
پھر لپک کر جیک کو امی کی گود میں ڈال دیا۔ پہلے تو گھبرا کر وہ کتے کو اچھالنے لگیں۔ لیکن جب انھوں
نے چھوٹا سا پلا دیکھا تو ہاتھ اوپر اٹھا کر چلانے لگیں۔ خالہ نے پلا اٹھا لیا۔ امی کے دم میں دم آیا بولیں
یہ کتا یہاں نہیں رہے گا۔ یہ پلید جانور ہے۔
"تو امی چچا کے گھر میں بھی کتے ہیں ۔۔۔۔"
"وہ بڑے آدمی ٹھہرے۔ پھر ان کے ہاں وسیع جگہ ہے یہاں کتا رکھنے کو جگہ کہاں ہے۔
ایک بڑا کمرہ اور ایک چھوٹا آخر یہ کتا رہے گا کہاں؟ اور پھر کھائیگا کیا؟"
اسی ہنگامے میں برآمدے میں ابا کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ انھوں نے دروازہ
کھٹکھٹایا۔ امی دروازہ کھولنے کے لیے گئیں۔ ادھر خالہ بھی سٹک گئیں۔ میں اکیلا رہ گیا۔ بڑا
گھبرایا۔ جلدی سے جیک کو کرسی پر رکھ کر الماری میں اپنی کتابوں کو ہلانے جلانے لگا۔ ابا نے
چھوٹتے ہی سوال کیا۔ یہ کیا شور تھا؟ امی نے بلند آواز میں کتے کا قصہ دہرایا۔ ابا ماتھے پر تیوریاں

ڈالے اس طرف آئے ۔ میں مسکین صورت بنائے کتابیں ادھر ادھر رکھ رہا تھا ۔ جیسے مجھ کو اس قصہ سے کچھ سروکار ہی نہ ہو ۔

جیک آنکھیں بند کئے کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا ۔ ابا کچھ دیر کھڑے کھڑے اس کی طرف دیکھتے رہے لیکن ماتھے پر بل بدستور قائم تھے ۔ امی بولیں "کھانا لاؤں ابا نے خاموشی سے سر ہلا دیا ۔ امی کھانا لانے کے لیے باورچی خانے کی طرف چلی گئیں ۔ اور ابا چارپائی پر بیٹھ گئے ۔ جیک کی کرسی نزدیک گھسیٹ لی ۔ آہستہ آہستہ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرنے لگے "بہت اعلیٰ نسل ہے" ۔

میں مسرت کو دبا کر نہایت سنجیدگی سے نصاب کی کتاب ہاتھ میں لیے ان کے قریب چلا گیا "اباجی! اچھا کہتے تھے کہ اس کا ابا بھی انگریزی نسل کا ہے اور اس کی ماں بھی، لیکن دونوں کی نسل جدا جدا ہے ۔"

"ہاں ہاں .... لیکن یہ انگریزی نسل کا ہوا نا! بہت اعلیٰ نسل ہے ۔"

امی دو رکابیاں اٹھائے اندر داخل ہوئیں .... ابھی میں اس کو کہہ رہی تھی کہ کتا واپس کر دے ۔ ہم اسے کہاں رکھیں گے کیا کھلائیں گے ؟"

ابا کے ماتھے کے بل اور گہرے ہو گئے لیکن بولے نہیں ۔

پھر امی ابا کو پنکھا جھلتی رہیں اور کتے کے خلاف بولتی رہیں ۔ ابا بالکل خاموش رہے کھانا کھا لینے کے بعد انھوں نے تولیے سے مونچھیں صاف کرتے ہوئے کہا ۔ تھوڑا سا دودھ لے آو" ۔

امی لمحہ بھر کے لیے بے حس و حرکت کھڑی رہیں ۔

ابا نے دوبارہ اپنی بھاری اور بے کیف آواز میں کہا "دودھ لے آو" ۔

امی چپکے سے دودھ لے آئیں ۔ ابا نے ایک ٹوٹی ہوئی پلیٹ دھو کر اس میں دودھ ڈالا اور جیک کے آگے رکھ دی ۔ لیکن جیک کا سوائے اوں اوں کرنے کے اور کسی طرف دھیان ہی نہ تھا ابا دودھ کی پلیٹ اس کی ناک کے قریب لے گئے لیکن اس نے دودھ پینا تھا نہ پیا ۔ اب میں اٹھا اور ایک ہاتھ سے اس کی گردن پکڑ کر اس کا سر دودھ میں ڈبو دیا ۔ لیکن جیک نے دودھ نہ پیا ۔ دودھ اس کی تھوتھنی سے بوند بوند کر کے ٹپکنے لگا ۔ خالہ چھپ کر کھڑی کھڑی ہنس رہی تھیں ۔ امی نے کپڑے کے ٹکڑے سے جیک کا منہ پونچھ دیا ۔

جب ابا کسی بات پر اڑ جائیں تو امی بھی ہامی بھرنے لگتیں ۔

کچھ دیر تک یہی سلسلہ جاری رہا ۔ جیک اندھا دھند ادھر ادھر لپکنے لگا ۔ ابا نے کہا "ابھی رہنے دو ۔ بھوک لگے گی تو خود ہی پی لے گا" ۔

امی بدستور جراب بننے لگیں ۔ ابا دوسرے کمرے میں چلے گئے تو خالہ چھم سے اندر آکر کولھے پر ہاتھ رکھ کھڑی ہو گئیں ۔

میری فاتحانہ نظریں امی سے ملیں تو امی نے ملامت آمیز محبت کے ساتھ مسکرا کر کہا ۔
"ارے یہ کالا کلوٹا اٹھالایا ۔ چتکبرا یا سفید لایا ہوتا" ۔

پہلے دو تین تن تک جیک رات بھر چیختا رہا ۔ کسی کو سونے نہ دیا ۔ لکڑی کے خالی کھوکھے میں ٹاٹ ڈال کر اس پر جیک کو بٹھادیا گیا ۔ بعد ازاں اس میں پانی اور دودھ بھی رکھدیا گیا ۔ خالہ نے ایک چھوٹا ساگدیلا سیا ۔ لیکن جیک رات کے وقت پانی وانی گرا کر اسے بھگو دیتا تھا ۔ خالہ صبح ہی صبح گدیلا اٹھاکر سوکھنے کے لیے دیوار پر ڈال دیتیں ۔ اور حسب عادت کہتیں "ہئی! بچارے کو نمونیا نہ ہوجائے کہیں" ان دنوں ہم بہت تنگدست تھے ۔ تاہم جیک کے لیے ہر روز ایک پاؤ دودھ لینے لگے ۔ پہلے دو چار روز تو جیک نے سوائے شور مچانے کے اور کوئی کام نہیں کیا ۔ نہ دودھ پیتا نہ روٹی کھاتا ۔ عجب مشکل تھی ۔ ایک ترکیب سوجھی ۔ روئی دودھ میں بھگو کر جیک کا منہ کھولتے اور وہ منہ چھڑانے کی کوشش کرتا لیکن ہم کہاں چھوڑنے والے تھے ۔

جیک عموماً پڑا سویا کرتا ۔ جب وہ پاؤں پھیلائے ٹاٹ پر پڑا سویا کرتا تو ٹاٹ پر کالی مخمل کا پیوند دکھائی دیتا تھا ۔ اڑد کے دانے کی طرح اس پر سفیدی نام کو نہ تھی ۔ ابا باہر سے آکر کھانا کھانے کے بعد جیک کو اٹھاکر سامنے کی کرسی پر بٹھادیتے ۔ چٹکی بجابجاکر اس کا نام لے کر پکارے "جیک! جیک! جیکی! جیکی ۔۔۔" لیکن جیکی اندھوں کی طرف ادھرادھر مل جل کر رہ جاتا ۔

ایک دن ہم سب سے بڑے کمرے میں بیٹھے تھے ۔ اتنے میں چھوٹے کمرے کے دروازے پر کھٹکا ہوا ۔ میں نے ادھرادھر دیکھا تو خالہ اپنی مہندی لگی انگلیوں سے اشارے کررہی تھیں ۔ میں اٹھا ۔ خالہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی تھیں ۔ منہ میرے کان کے قریب لے آئیں ۔ شاید الائچی چبارہی تھیں ۔ ان کے منہ سے خوشبو کا ایک بھبکا سانکلا ۔ بولیں "جیکی نے آنکھیں کھول دی ہیں ۔ میں لپک کر آگے بڑھا ۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جیک آنکھیں کھولے ٹک ٹک دیکھ رہا ہے ۔ میرے منہ سے مسرت کی ایک چیخ نکل گئی ۔ میں نے جھپٹ کر اس کو اٹھالیا اور بھاگا بھاگا ابا کے پاس پہنچا "ابا! دیکھئے جیکی نے آنکھیں کھول دی ہیں ۔"

ابا نے جیک کو گود میں بٹھالیا ۔ امی بھی ٹک ٹک کر دیکھنے لگیں ۔ خالہ دروازے کے قریب ابا کی نظروں سے ہٹ کر کھڑی مارے خوشی کے ہاتھ پر ہاتھ رگڑ رہی تھیں ۔ کبھی کمسن لڑکیوں کی طرح اچھلنے لگتیں ۔

ایک ڈیڑھ مہینے تک جیک سب کو پہچاننے لگا ۔ پہلے پہل تو امی کو بھی بہت دقت ہوئی ۔ مہترانی کو بلاکر اس کی غلاظت اٹھوانی پڑتی ۔ لیکن جلد ہی وہ "حاجات ضروری" کے لیے باہر جانے لگا

بھلے دنوں میں ابا سیر و شکار کے بہت شوقین تھے ۔ کتوں سے بھی انس تھا ۔۔۔۔ جیک کا رنگ ہی کالا تھا ورنہ تھا اصلی "انگریز کتا" بے وقت روٹی نہ کھاتا تھا اسے دن میں دو مرتبہ پابندی

وقت کے ساتھ کھانے کو دودھ روٹی ملتی۔ پھر وہ آرام سے پڑا رہتا کیا مجال جو دن میں کوئی کھانا کھائے اور للچائی نظروں سے دیکھے۔ اس کے بال چھوٹے تھے۔ لیکن بہت ملائم اور ازحد چمکیلے۔ آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ پہلے پہل جب وہ رات کے وقت چلاتا تو ابا اس کو اپنی کھاٹ پر بٹھالیتے۔ امی کو پلید جانور کا سفید بستر پر بیٹھنا سخت ناگوار گذرتا تھا۔ لیکن لاچار تھیں۔ اور اب تو جیک خیر سے کسی اور جگہ سونے پر رضامندہی نہ ہوتا تھا۔ اگر اس کو کھوکھے میں سلادیا جاتا تو رات کو اباکی چارپائی کے قریب جاکر زور زور سے بھونکنے لگتا۔ ابا اس کو پائنتی کی طرف ڈال دیتے آرام سے چپ پڑا سوتا۔ اگر کہیں رات کو ابا کے پاؤں حرکت کرتے تو وہ سمجھتا کہ وہ اس کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کر کس کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ لاڈ میں غرّاتا بھونکتا۔ کبھی اچک کر آگے بڑھتا کبھی پیچھے ہٹتا اور کبھی پاؤں کا انگوٹھا منہ میں لے لیتا۔

جو کبھی میں سنیما دیکھنے کے لیے چلاجاتا۔ ابا بھی دیر سے گھر آتے تو امی چارپائی پر بیٹھی ان کا انتظار کرتیں۔ اس وقت جیک امی کی چارپائی کے نیچے دبکا بیٹھا ہوتا اور اگر کوئی ذرا سی آواز سنائی دے جاتی تو فوراً بھونکنے لگتا۔ امی کہتیں۔ بھئی اب تو مجھے ڈر نہیں لگتا۔"

پہلے پہل جب کبھی ابا گھر پر آتے تھے تو اگر ہم لوگ بولتے بھی ہوتے تو خاموش ہوجاتے عموماً خالہ، امی اور میں بیٹھے آپس میں ہنسی مذاق کرتے خوشی میں ہنستے چلاتے اور جونہی ابا کے پاؤں کی آہٹ سنائی دیتی خالہ پھرتی سے اپنے گھر کو چل دیتیں۔ میں کوئی کتاب اٹھالیتا اور امی دروازہ کھولنے چلی جاتیں۔ ابا کے ماتھے پر پہلے ہی کئی تیوریاں ہوتی تھیں گھر کے اندر داخل ہوتے تو ان کی تعداد میں اور بھی اضافہ ہوجاتا۔ لیکن اب وہ آتے تو سب سے پہلے جیک کو ان کے آنے کی خبر ہوجاتی۔ وہ سب سے پہلے دروازے کے قریب پہنچتا۔ چونکہ دروازے کی کنڈی اندر سے چڑھی ہوتی تھی۔ اس لیے دروازہ پنجوں سے کھرچتا اگر اتنی دیر میں امی پہنچ جاتیں تو بہتر ورنہ وہ اپنی مخصوص آواز میں بیتابی کے ساتھ بھونکتا ہوا امی جہاں کہیں بھی بیٹھی ہوتیں۔ ان کے پاس پہنچ جاتا جب دروازہ کھلتا تو جیک کود کر ان کے پاؤں میں پہنچ جاتا اس کی تیزی سے ملتی ہوئی دم ریت پر پڑی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی سی نظر آتی تھی۔ پانچ سات منٹ تک لاڈ کرتا اس دوران میں اگر ابا ذرا بھی کسی اور طرف دھیان کرتے تو وہ بھونک بھونک کر ان کو اپنی طرف متوجہ کرتا۔ عموماً ہوتا یہ کہ جونہی ابا اندر آتے وہ پتلون کی کریز کا خیال کئے بغیر پاؤں کے بل اکڑوں بیٹھ جاتے اور جیکی اچھل اچھل کر پیار کرتا۔ ابا کے خشونت انگیز چہرہ پر مسکراہٹ آجاتی۔ اور وہ بچوں کی طرح چلانے لگتے۔ "ہو ہو ہو جیکی! یو جیکی!!" پھر وہ اس کو دونوں ہاتھوں سے تھپتھپاکر کہتے۔ میرے گھر پہنچنے کی جیکی کو سب سے زیادہ خوشی ہوتی ہے۔"

جب ابا پلنگ پر بیٹھے ہوتے تو جیک کو گود میں بٹھالیتے جیکی کی صورت سے تفاخر کے جذبات صاف عیاں ہوتے تھے۔ وہ اپنے آپ کو بڑی بھاری ہستی محسوس کرتا تھا۔ اگر ہم میں سے

کوئی اس کو چھونے کی کوشش کرتا تو وہ غرانے لگتا۔ یعنی اس وقت وہ کسی اور کے پاس جانا پسند نہیں کرتا تھا۔ ہم بار بار اس کو چھونے کی کوشش کرتے اور جب وہ غراتا تو ابا کہتے " بھئی ہٹو اس وقت جنکی ہمارے پاس ہی بیٹھے گا۔ "۰۰۰۰۰ اور ان کی سرخ کنپٹیوں کے قریب آنکھوں کے گوشوں کی جھریاں اور بھی گہری ہو جاتیں۔

رفتہ رفتہ جنکی بہت سمجھدار ہو گیا۔ وہ سب کو پہچانتا تھا۔ گھر کے لوگ جب اکٹھے بیٹھے ہوتے تو وہ کبھی زمین پر بیٹھنا پسند نہ کرتا تھا۔ اس لیے اسے اسٹول پر بٹھایا جاتا تھا۔ اسٹول پر بڑی تمکنت سے وہ اس انداز میں بیٹھتا جیسے وہ سب کی باتیں سنتا ہو اور بعض اوقات سر گھما گھما کر ہماری طرف اس انداز سے دیکھتا جیسے وہ سب کچھ سمجھتا بھی ہو۔ رات کو پائنتی پر سوئے سوئے اگر کہیں پیشاب کی حاجت ہوتی تو اٹھ کر زور زور سے بھونکنے لگتا۔ چونکہ چھوٹا سا تھا اس لیے تاریکی میں پلنگ سے چھلانگ لگاتے ہوئے اسے ڈر معلوم ہوتا تھا جب اسے نیچے اتارا جاتا تو دروازے کے پاس جاکر بھونکنے لگتا۔ دروازہ کھلنے پر وہ باہر جاتا اور پیشاب کرنے کے بعد لوٹ آتا۔

امی اس کو باورچی خانے میں نہ گھسنے دیتی تھیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ہم باورچی خانے میں چوکیوں پر بیٹھے کھانا کھاتے۔ اس وقت جنیک کو باورچی خانے سے باہر دروازے کے قریب بیٹھنا پڑتا۔ وہ دروازے کی چوکھٹ میں بیٹھا بے چینی سے پہلو بدلتا۔ میاؤں میاؤں کرتا لیکن امی کے خوف سے اندر داخل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ یہ بات ہرگز نہ سمجھ سکتا تھا کہ آخر اس کے لیے یہ ممانعت کیوں تھی۔ امی گاہے بگاہے بیلن اٹھاکر خشمگیں نظروں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ اس وقت جنیک کی حرکات قابل دید ہوتی تھیں اور اگر امی کی توجہ اس کی طرف نہ رہے۔ تو وہ دم دبائے چپکے سے چوروں کی طرف دبے پاؤں ہمارے پیچھے آکر بیٹھ جاتا۔ معاً امی دروازے کی طرف دیکھ کر کہتیں " ارے جنیک کہاں گیا "۔ اس وقت جنیک ہم دونوں کے بیچ میں سے تھوتھنی نکال ان کی طرف خوفزدہ نظروں سے دیکھتا۔ ہم اس کی یہ حرکات دیکھ دیکھ کر ہنسی کے مارے دہرے ہو جاتے۔ ابا سفارش کرتے۔ " اچھا رہنے دو۔ بیٹھا ہے اپنا چپکے سے۔"

جب ابا گھر پر نہ ہوتے تھے تو خالہ جان کے کمرے میں ہم دونوں گڑیوں کے کھیل کھیلا کرتے۔ اب ہم جنیک کو بھی شامل کر لیتے تھے۔ کبھی دلہا دلہن کو ڈبے کی بگھی میں بٹھاکر جنکی کو گھوڑا بنایا جاتا۔ کپڑے کے لمبے ٹکڑوں سے بگھی کے دونوں سرے باندھ کر جنیک کی گردن بیچ میں پھنسا دی جاتی جنکی کو میں قابو میں رکھتا اور اس طرح وہ دلہا دلہن کی بگھی گھسیٹتا۔ کبھی تو وہ یہ کام اچھی طرح کر دیتا۔ اور کبھی اچھل کود کر اپنی بے اعتنائی کا اظہار کرتا ایک دن بہت مزا آیا۔ بگھی کے اندر گڈا اور گڑیا ٹھنسے بیٹھے تھے۔ جنیک بگھی کے آگے جتا ہوا تھا۔ اتنے میں ابا باہر سے آئے۔ انھوں نے باہر سے جنیک کا نام لیکر جو پکارا۔ جنیک بے قابو ہو کر سرپٹ بھاگا تو بگھی (ڈبہ) اڑاتا

سیدھا ان کے پاس پہنچا۔ ابا حیران تھے۔ کہ آخر اس کے گلے میں کیا بلا بندھی تھی۔ جب اصل حال معلوم ہوا تو مجھ کو گالیاں سننی پڑیں۔

ایک مرتبہ اسی طرح کھیلتے جیک چار پائی کے نیچے سے نکلا دبے پاؤں آگے بڑھا اور پھر جھپٹ کر گڈے کو اس کی چھوٹی سی کرسی سے منہ میں۔ دبوچا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ادھر خالہ اور میں شور مچاتے اس کے پیچھے ہولئے۔ جیک کی چمکیلی آنکھوں سے شرارت صاف عیاں تھی۔ وہ کان سمیٹے تیرکی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے غائب ہو گیا۔ ہم نے بہیترا اس کو ادھر ادھر ڈھونڈا لیکن سب بے سود۔ آخر بڑی مشکل سے معلوم ہوا کہ وہ اوندھے ٹب کے نیچے دبکا بیٹھا ہے۔ ٹب اٹھایا تو دیکھا کہ گڈے کے پھوسڑے اڑ چکے ہیں۔ اس پر خالہ منہ بسورنے لگیں۔

ایک روز چار پائی پر لیٹا میں ایک رسالہ پڑھ رہا تھا، ابا باہر گئے ہوئے تھے۔ اتنے میں صحن سے امی کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں میں باہر نکلا تو معلوم ہوا کہ امی نے گھی کا ڈبہ دھوپ میں رکھا تھا تاکہ خوب پگھل جائے۔ کوئی پاؤ ڈیڑھ پاؤ گھی تھا کہیں جیک کی نظر پڑ گئی۔ نہ معلوم وہ کیا سمجھ کر سارا گھی پی گیا۔ خالہ گھبرائی ہوئی قریب کھڑی تھیں۔ جیک کا پیٹ خوب پھولا ہوا تھا اس کی پھرتی مفقود ہو چکی تھی۔ بھاری بھرکم قدموں سے ادھر ادھر گھوم رہا تھا۔

ہم سب پریشان ہو رہے تھے۔ ہمارا خیال تھا اس کو اتنا گھی ہضم نہیں ہوگا۔ اور وہ ضرور ہیضہ کرے گا۔ کسی صورت بچ نہیں سکتا۔ خالہ نے چورن کھلانے کی رائے دی لیکن میں نے سوچا نہ معلوم چورن سے کچھ خرابی ہو جائے۔ جیک کی صورت سے بے چینی کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ البتہ معلوم ہوتا تھا جیسے کہ وہ غنودگی سی محسوس کر رہا ہو۔ امی نے تجویز پیش کی کہ اسے باہر گھمالاؤں شاید اس طرح گھی ہضم ہو جائے۔ چنانچہ میں اسے زنجیر سے باندھ کر گھمانے کے لیے لے گیا۔ وہ پھرتی کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کے پھولے ہوئے پیٹ کے نیچے اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں بمشکل دکھائی دیتی تھیں۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ گھمانے کے بعد میں واپس آیا۔ ہمارے شبہات غلط نکلے۔ جیک کو نہ بد ہضمی ہوئی اور نہ اس کو ہیضہ ہی ہوا۔ اگرچہ رات بھر ہم فکر مند رہے لیکن دوسرے دن اس کا پیٹ بالکل ہموار دیکھ کر دل کو تسلی ہو گئی۔ ہم سنتے آئے تھے کتے کو گھی ہضم نہیں ہوتا نہ معلوم جیک نے کیسے ہضم کر لیا۔

سردیوں کی آمد آمد تھی جیک قدرے بڑا ہو گیا تھا۔ اس کیلئے دودھ بھی بجائے پاؤ بھر کے آدھ سیر آنے لگا تھا۔ اگرچہ دودھ روٹی صبح شام ہی ملتی تھی۔ لیکن اب دوپہر کو چند بسکٹ بھی کھلائے جاتے تھے۔ کچھ دنوں بعد جیک کچھ کمزور سا نظر آنے لگا۔ پہلے تو ہم یہ سمجھے کہ اب وہ بڑھ رہا ہے۔ اس لیے کمزور دکھائی دیتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ اب وہ کچھ مضمحل سا نظر آتا تھا۔

ایک روز ابا کے ایک دوست ملنے کے لیے آئے۔ جیک کو دیکھا کہنے لگے۔ اچھی نسل کا کتا

ہے ۔ لیکن ہم دیسی لوگ ان کو پال نہیں سکتے ۔ ان کتوں کی غور و پرداخت ماہر شخص ہی کر سکتا ہے ۔ ابا نے بتایا کہ پہلے جیک خوب موٹا تازہ تھا ۔ لیکن اب نہ معلوم اس کو کیا ہو گیا ہے ۔ کوئی خفیہ روگ ہے جس کا علم نہیں ۔ غالباً معدے میں گڑبڑ ہے فراغت بھی ٹھیک نہیں ہوتی ۔ بھوک بھی کم لگتی ہے ۔ اب پہلے کی طرح چونچال بھی نہیں رہا ۔ ابا کے دوست نے بتایا کہ اس حالت میں اس کے دودھ میں تھوڑی سی پسی ہوئی گندھک ملا دیا کریں ۔

یہ نسخہ بھی آزمایا گیا ۔ پہلے تو کچھ افاقہ معلوم ہوا لیکن اس دوا کا اثر دیرپا ثابت نہ ہوا ۔ رفتہ رفتہ جیک بالکل دل شکستہ رہنے لگا ۔ یونہی مضمحل سا ایک جگہ پڑا رہتا ۔ دودھ کی پیالی کو پہلے سونگھتا پھر کبھی تھوڑا سا زبان سے لپلپاتا ۔ لیکن کبھی پیالہ بھر نہ پیتا تھا ۔ اب اگر ابا کے پاؤں کی آہٹ آتی تو وہ دروازے تک جاتا ضرور لیکن وہ جوش و خروش مفقود تھا ۔ ابا چارپائی پر بیٹھ جاتے تو یہ چھوٹے کمرے میں واپس آکر اپنے بورئیے پر بیٹھ جاتا ۔

ہم روز اسی کا ذکر کرتے ۔ بسکٹ کے ٹکڑے اس کے آگے ڈالتے ۔ اس کے سامنے گیند لڑکاتے ۔ لیکن سب بے سود جو دوا کسی نے بتلائی کھلائی گئی لیکن کچھ افاقہ نہ ہوا ۔

ایک دن ابا ایک شخص کو ہمراہ لائے اس نے بڑے غور سے جیک کو دیکھا بھالا ۔ اس کی آنکھیں ، پیٹ اور رانیں ٹٹولیں ۔ پھر ابا نے اس کو ایک روپیہ دیا ۔ وہ بولا یہ کتا بہت جلد اچھا ہو جائے گا ۔ ہم سب بہت خوش ہوئے ۔ ابا نے مجھ کو اس کے ساتھ ابھیجا اور میں اس کے گھر سے دوا لے آیا ۔

دوسرے دن جیک کچھ بہتر ہو گیا ۔ ابا جیک کے لیے ایک بہت عمدہ سا پٹکا لائے جس میں نکل کیے ہوئے سفید سفید بڑے سر کے کیل جڑے ہوئے تھے ۔ اس کے ساتھ ہی ایک بہت مہین اور خوبصورت سی زنجیر تھی ۔ اس دن شام کے وقت میں جیک کو نئے پٹکے اور نئی زنجیر کے ساتھ گھمانے لے گیا ۔ ابا کہنے لگے اب جیک بہت جلد اچھا ہو جائے گا ۔

تین چار روز بعد جیک پر کچھ ایسا شدید رد عمل ہوا کہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گیا ۔ بس بورئیے پر لیٹا رہتا ۔ ابا باہر سے آتے تو وہ اٹھنے کی کوشش کرتا لیکن اٹھ نہ سکتا تھا ۔ چنانچہ ابا جب اس کے قریب جاتے تو پڑے پڑے دم ہلا کر پیار کر لیتا ۔

اس کے بعد اسکی آنکھیں بند رہنے لگیں ۔ اگر کھلی بھی ہوتیں تو پتھرائی ہوئی سی ۔ ہم اسکی یہ حالت دیکھ کر بہت گھبرائے ۔ امی نے ابا سے کہا کہ جیک کو حیوانوں کے ہسپتال لے جائیں ۔ چونکہ وہ چلنے سے معذور تھا اس لیے میں نے اسے تولیہ میں لپیٹ کر اٹھا لیا اور ابا کے ساتھ حیوانوں کے ہسپتال میں پہنچے ۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کی فیس لی ۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ۔ ہم ان دنوں بڑی مشکل سے گذر کرتے تھے ۔ خیر ابا نے فیس دے دی ۔ اور جیک کی بیماری کا طویل بیان دیا ۔ ڈاکٹر نے معائنہ کرنے کے بعد کہا اب اس کی حالت بہت نازک ہے ۔ اس کے

بعد وہ انگریزی میں ابا سے باتیں کرنے لگا۔ ابا نے الٹے ہاتھ سے اپنی ناک کو قدرے رگڑا۔ دوائی کے دام دیکر کسی کام سے چلے گئے اور میں جیک کو لیکر گھر آیا۔

تھوڑی دیر بعد ابا بھی آگئے۔ ہم گئی رات تک جیک کے پاس بیٹھے رہے۔ جیک بےحس و حرکت پڑا رہا۔ کئی مرتبہ خالہ جیک کا حال پوچھنے آئیں چونکہ ابا جیک کے پاس بیٹھے تھے اس لیے باہر سے لوٹ جاتی تھیں۔

دوسرے دن علی الصبح میری آنکھ کھلی تو دیکھا کہ ابا اور امی جیک کے قریب بیٹھے ہیں میں بھی اٹھ بیٹھا۔ چارپائی سے اتر کر ان کے قریب گیا دیکھا جیک بڑی بری حالت میں ہے اس کی خوشنما کھال بھدی، میلی اور ڈھیلی ہو چکی تھی۔ وہ ایک پہلو پر لیٹا تھا۔ ایک کان پیچھے کو الٹ گیا تھا۔ کان کے اندر قدرے سرخ گوشت دکھائی دے رہا تھا۔ آنکھیں بے نور تھیں۔ مکھیاں اڑانے کے لیے وہ کان تک نہ ہلا سکتا تھا۔ وہ ٹانگیں جو صحت کی حالت میں ڈھیلی اور قدرے خمدار تھیں اب اکڑ کھینچ کر سیدھی ہو گئی تھیں۔ پیٹھ کے منکے صاف نظر آرہے تھے۔ اسکی حالت بڑی قابل رحم تھی امی گرم پانی والی ربڑ کی بوتل سے اس کو ٹکور کر رہی تھیں۔ جیک کو نہ معلوم کیا مرض تھا۔ وہ بالکل خاموش اور بے حس و حرکت پڑا تھا۔ ابا ذرا جھک کر ملائم آواز میں اس کا نام لیکر اس کو پکارنے لگے "جیکی! •••• جیکی!!"

جیک نے بڑی مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ بہت مشکل سے •••• پھر جیسے اس نے پہچان لیا ہو۔ صرف اس کی دم میں ہلکی سی لرزش پیدا ہوئی۔ دم ایک مرتبہ فرش سے ذرا سی اٹھی اور پھر گر پڑی •••• اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں جیسے پپوٹوں پر اس کا قابو نہ رہا ہو ••••• اس کے بعد سینہ نیچے ہوا اور پھر نہ اٹھا ••••• اس کا دم نکل گیا۔

وہ صبح بہت ہی سہانی تھی۔ ہوا میں خنکی تھی چمکدار دھوپ سایوں کو دھکیلتی دیواروں کے اوپر سے نیچے کی طرف اتر رہی تھی۔ گھڑونچی پر رکھے ہوئے گھڑوں اور دروازوں پر گھریلو جڑے اور چڑیاں پھدکتی پھرتی تھیں۔

جیک دیوار کے ساتھ بورے پر سفید کپڑے سے ڈھکا پڑا تھا۔ اس کی کالی کالی پتلی ٹانگیں کپڑے سے باہر نکل آئی تھیں ••• ابا دوسرے کمرے میں بیٹھے قینچی سے انگلیوں کے ناخن کاٹ رہے تھے۔ امی چھوٹے کمرے میں چارپائی سے پاؤں لٹکائے دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھے عجب بے ڈھنگے طریقہ سے بیٹھی تھیں ••• اور میں یونہی رسی کے ایک ٹکڑے میں گرہیں دئے جا رہا تھا۔ خالہ کے میاں دفتر کو روانہ ہو چکے تھے ان کے جانے کے بعد خالہ عموماً ہلکے سروں میں کوئی گیت گنگنایا کرتی تھیں پھر غسل خانے میں آدھ پون گھنٹہ نہانے دھونے میں صرف کرتیں۔ آج وہ دروازے میں خاموش کھڑی تھیں اور وہ اپنی سفید موم بتی کی سی انگلی سے ناک کی چمکتی ہوئی کیل کو بار بار بے خبری کے عالم میں چھو رہی تھیں۔

ہم میں ایک ہر ایک اپنے بشرے سے یہی ظاہر کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ کوئی اہم واقعہ پیش نہیں آیا۔"

(مشمولہ: "تار و پود" سن اشاعت ۱۹۴۴ء)

"بلونت سنگھ کے گاؤں چک بہلول میں ایک حکیم تھے۔ علی اصغر۔ وہ حکیم بہت اچھے تھے اور اُن کے ہاتھ میں شفا بھی تھی، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اکھاڑے بھی جاتے اور عورتوں کو اغوا بھی کرتے تھے خاصے مقدمہ باز آدمی تھے اور کوئی نہ کوئی فوجداری کھڑی کئے رکھتے تھے۔ بلونت سنگھ کی کہانی کے پہلے مداح وہی تھے۔ بلونت سنگھ کہانی لکھتے اور حکیم کی دُکان پر جا کر کہتے: —— "چاچا! میں نے نئی کہانی لکھی ہے۔"

حکیم علی اصغر انھیں بڑے پیار اور رسنکار (ادب) سے گوبر سے لپے ہوئے چبوترے پر بٹھاتے بڑی یکسوئی سے کہانی سنتے، سر دُھنتے اور ان کے بارے میں حوصلہ افزا پیشین گوئیاں کرتے۔

لڑکپن کی وہ کہانیاں کہیں نہیں چھپیں، لیکن اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اگر چک بہلول میں حکیم علی اصغر نہ ہوتے تو بلونت سنگھ کبھی اتنے بڑے افسانہ نگار نہ بنتے۔ اور یہ بھی کہ نہ جانے بلونت سنگھ نے لڑکپن میں حکیم علی اصغر سے کتنے قصّے سُنے ہوں گے جن پر اُنھوں نے بعد میں اپنے افسانوں کی بنیاد رکھی۔

بلونت سنگھ تو چند ہی برس گاؤں میں رہے پھر دہرہ دون چلے آئے۔ لیکن ان کی کہانیوں میں آزاد سکھوں کی جو زندگی جھلکتی ہے، اس میں نہ جانے کتنا حصّہ حکیم علی اصغر سے سُنے گئے قصّوں کا مرہونِ منّت ہے۔

بلونت سنگھ نے اپنی کہانی "سزا" میٹرک میں لکھی تھی اور وہ دہلی کے مشہور ماہنامہ "ساقی" میں شائع ہوئی۔ کرشن چندر نے اسے پڑھا تو اس کی بہت تعریف کی۔ لیکن جب بلونت سنگھ بی۔ اے پاس کرکے لاہور گئے تو کرشن چندر وہاں نہیں تھے۔ وہ آل انڈیا ریڈیو فلم کمپنی میں چلے گئے تھے۔

جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ بلونت سنگھ بیدی کے ہمراہ کچھ دن رہے —— جن لوگوں نے بیدی اور بلونت سنگھ کی کہانیاں ساتھ ساتھ پڑھی ہیں، وہ مانیں گے کہ دونوں کے افسانوں کی ہیئت، زبان و بیان اور مواد میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ظاہر ہے دونوں نے ایک دوسرے کو پسند نہیں کیا۔ بلونت سنگھ نے اپنی ایک کتاب میں بیدی کے ساتھ گزارے گئے دنوں کو ایک یادداشت میں قلمبند کیا ہے۔ مجھے وہ یادداشت بہت پسند ہے۔ میں ہندی میں بیدی کی کہانیوں کے ایک مجموعے میں اُسے شامل کرنا چاہتا تھا، لیکن بیدی نے منع کر دیا۔"

(اوپندر ناتھ اشک۔ اقتباس بشکریہ "آجکل" دلّی جنوری ۱۹۹۵ء)

بلونت سنگھ

دیش بھگت

شام ہو چکی تھی۔ میں چھوٹے بھائی کو چٹھی لکھ رہا تھا کہ اتنے میں چچا اندر داخل ہوئے۔ بغیر کسی تمہید کے بولے۔
"سنو! آج ذرا خاص کام ہے۔ تم کو میرے ساتھ چلنا ہوگا۔"
"خاص کام" والے الفاظ سن کر میں نے سرہانے سے صفا جنگ[1] اٹھائی اور اُسے فرش پر ٹیک اٹھ کھڑا ہوا۔
"مسلمانوں کا محلّہ ہے..... میاں لوگوں کا، سمجھے؟ ..... اور پھر روپے کا معاملہ[2]....."
میری اُن سے کوئی رشتہ داری نہ تھی، بس ہمارے گاؤں کے رہنے والے، والد صاحب سے بھی کچھ دعا سلام تھی۔
مجھ پر مہربان تھے اور قدرے بے تکلف بھی۔ میری عمر تقریباً بائیس[۲۲] برس کی تھی، قد ذرا نکلتا ہوا، چوڑا سینہ، سڈول بازو، مضبوط ہاتھ پاؤں۔ باوجود چار مرتبہ کوشش کرنے کے بھی ایف۔ اے پاس نہ کر پایا تھا۔ چچا کا میانہ قد، گندمی رنگ، کھچڑی داڑھی، دُبلے پتلے مگر سخت ہڈی کے تقریباً پینتالیس[۴۵] سالہ بزرگ۔ انھیں پنجاب چھوڑے تین سال ہو چکے تھے۔ اس جگہ اُن کا ایک اینٹوں کا بھٹہ تھا۔ تھوڑا بہت ٹھیکیداری کا کام بھی مل جاتا تھا۔

غبار اور دھند کے گہرے کفن نے شہر کو ڈھانپ رکھا تھا، بازاروں میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ یکّہ والوں کے آوازے، اُن کی گالیاں، اور قوالیاں ــــ دور دُھندلکے میں مسجد کے قریب، کسی گھر کی چھت پر سفید سفید کبوتروں کی ٹکڑیاں ہوا میں پرواز کرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

ہم گھنٹہ کے قریب سے ہو کر بیگم سرائے کی طرف چل کھڑے ہوئے۔
نکڑ پر بادشاہ خان پٹھان کی چائے کی دکان تھی۔ اس جگہ سود خوار پٹھانوں کا اجتماع ہوتا تھا۔ بیٹھے چائے پیتے یا قہوہ اڑاتے۔ دو تین بے بال و پر چھوکرے آگ جلانے، پیالیاں دھونے، چائے بنانے اور پھر گاہکوں کے ساتھ ہنس ہنس کر باتیں

---

[1] ایک قسم کی کلہاڑی، سکھوں کا ایک ہتھیار۔ [2] یہ ان کا بہت فرسودہ اور بے معنی بہانہ تھا۔

کرنے کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔ اور کبھی ریکارڈ بجتے:۔

ٹرم دے ٹرم

وہ مورے راد و کا ٹرم دے ٹرم

کبھی کوئی خان اپنی شلوار اوپر چڑھا، ٹانگیں رانوں تک ننگی کر، کسی ہندوستانی موچی سے جھگڑنے لگتا اور کہتا:۔

"اَمرا کابل میں چپّل اونا، تمرا دیس میں چپّلی"

یا پھر پہلو والی "گرم گرم قلیہ پراٹھا" کی دوکان پر شاہ صاحب، ایک بزرگ سبز پوش، داڑھی مہندی سے سُرخ کئے آن بیٹھتے۔ آنکھیں جلالِ معرفت کے مارے خونِ کبوتر، چہرہ کندن کی طرح تاباں، زلفیں چکنی چپڑی اور عطر بیز...... اُن کے تشریف آور ہوتے ہی عقیدت مندوں کے غول کے غول جمع ہونا شروع ہو جاتے۔ مجہّر (مظہر) شہر کے بے تاج بادشاہ، جمّن رنگ ساز، قمر جلد ساز، اور للّو مالک:۔

"جاتے کہاں ہو کس طرف خیال ہے
گھڑیوں کا بس یہی اسپتال ہے"

وغیرہ جیسی ہستیاں آن اکٹھی ہوتیں، گراموفون کو چابی دے کر ملکۂ عالم کا ریکارڈ چڑھا دیا جاتا اور سب لوگ تالیوں کے ساتھ "اللہ ہو، اللہ ہو، اللہ ہو" گانے لگتے۔

اس طرف پیسہ اخبار والا چلاّتا۔ "ہٹلر کی پیش قدمی —— برطانیہ کا دنداں شکن جواب —— جاپان کی برطانیہ کو گیدڑ بھبکی —— ایک پیسہ میں۔"

یہ سُن کر وہ بزرگ سبز پوش سر کو زور کے ساتھ گردش دے کر نعرہ لگاتے "یا علی" اور پھر وہی "اللہ ہو، اللہ ہو۔"

اِدھر یہ ہنگامہ تو اُدھر کھُجلی کے مارے ہوئے کتّے شامی کبابوں کی بُو پا کر تھوتھنیاں اٹھا اٹھا کر ہوائیں سونگھا کرتے اور کبھی موقع پا کر کچھ نہ کچھ لے بھی اُڑتے تھے۔

کچھ دور جانے کے بعد چچا، مہگی پنواڑن کی دوکان کے آگے جا کر رُک گئے۔ مہگی کی عمر بتیس ۳۲ برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ بدن کی بھاری، گورا رنگ، ناز و ادا کی کمی نہ تھی، بڑی بڑی آنکھوں میں بے تحاشہ کاجل، ہونٹوں پر مِسّی کی دھڑی۔ پان کا بیڑا بڑھاتی تو اپنی نشیلی اور کٹیلی آنکھیں پہلے تو گاہک کی آنکھوں سے لڑا دیتی، تب شرما کر اور مسکرا کر نظریں جھکا لیتی اور پنڈلیوں کو دھوتی سے ڈھانپ کر اپنی چاندی کی پازیبوں پر نظریں گاڑ دیتی۔

میلے کچیلے چیتھڑے پہننے والے مزدور، ڈاکخانے کے قریب بیٹھنے والے خطوط نویس منشی یا ہوٹلوں کے گانڈ نشہ کی ترنگ میں

آتے اور اُسے دیکھ کر مچل جاتے۔ اپنی اندر دھنسی ہوئی مخمور آنکھوں سے اُسے دیکھتے کبھی اتنا کہنے کے لئے "ہائے ری آج تو غضب کا بناؤ سنگار کر رکھا ہے۔" کبھی کسی کجری کا بول از قسم:-

"گھر سے نکسی ننند بھوجیا
جُلم دونوں جوڑی ارے، سانوریا"

اور کبھی پان لیتے وقت اُس کی ہتھیلی کو اپنی انگلی سے کھجا دینے کی تمنا میں ایک پیسہ کے پان اور ایک پیسے کی چار، والی پری مارکہ سگریٹ خرید لیتے تھے۔

بچا کو دیکھتے ہی اس نے جھک کر سلام کیا۔ "ارے پنجابی بابو! کون دیس رہت ہو آپ۔"

"مہنگی! بس کیا پوچھو ہو، تم ہمن کو بھولت نا تہہ۔"

مہنگی سر پر آنچل کھینچ سنبھل کر ہو بیٹھی اور پان لگاتے ہوئے کہنے لگی "اور وہ ہمرے لئے تم چندری لال کو کہت رہے۔"

بچا اَن سُنی کر کے اس کے لال لال گالوں کی طرف للچائی ہوئی نظروں سے تاکتے ہوئے بولے "اب لاؤ، دیوگی بھی، کہ نہیں؟"

مہنگی کچھ لجا گئی اور ملامت آمیز نظروں سے بچا کی طرف دیکھنے لگی۔

اتنے میں اور گاہک بھی آ گئے۔ میں ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔

بائیں طرف برآمدے میں ایک بڑھیا کسی چالاک لومڑی کی طرح سب کو تاڑ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ٹاٹ پر ایک عورت بیٹھی تھی، جس میں سوائے اس کے کہ جوان تھی، اور کوئی خوبی نہ تھی۔ نوجوان عورت نے مجمع کے آدمیوں کو اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو جھٹ سے قمیص کے بٹن کھول، گریبان اُلٹ اُلٹ کر لالٹین کی روشنی میں کھٹمل پکڑنے لگی۔ اور گاہے ساڑی ہٹا کر اپنی ٹانگیں کھجانے لگتی۔

پکی اور سیاہ دیواروں پر پان کی پیک کے نشانات ایسے دکھائی دیتے تھے، جیسے بھوت ناچ رہے ہوں۔ کمرے کے اندر جاپانی عورتوں کی نیم عریاں، پھٹی پرانی تصویریں نظر آ رہی تھیں۔ ایک طرف کھاٹ پر بستر بچھا ہوا تھا، اور اس کے پاس ہی فرش پر ایک مٹیالے رنگ کا اُگالدان بھی پڑا تھا۔

ایک مرد نے نوجوان عورت کے بازو پر چٹکی لیتے ہوئے کچھ پوچھا، تو بڑھیا نے تاریکی میں آگے جُھک کر حلق میں سے آواز نکالتے ہوئے آہستہ سے کہا۔ "آٹھ آنے ——"

تاریک اور پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہوتے ہوئے ہم چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی کسی گلی کے نکڑ پر سرکاری لیمپ کی دھندلی روشنی میں صفا جنگ کی چمک اور میری گھیرے دار شلوار سے خائف ہو کر بچے گھروں میں گھس کر کواڑ بند کر لیتے۔

کمہاروں کے محلّے کے قریب پہنچ کر چچا گندے نالے کی طرف چل دیے۔ راستہ گھوڑوں اور گدھوں کی لید سے اٹا پڑا تھا۔ چھپّروں والے ٹوٹے پھوٹے کچّے مکانات تھے۔ کمہاروں کی بھاری بھرکم عورتیں کچے چبوتروں پر لیٹی، روتے ہوئے ننھے بچّوں کو دودھ پلا کر چُپ کرانے کی کوشش کر رہی تھیں۔

گندے نالے کے پُل پر سے گزرتے ہوئے میں نے ناک پگڑی کے شملے سے ڈھانپ لی۔ اس کے بعد ہم بڑے تالاب کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ یہاں شہر بھر کی گندگی جمع تھی۔ لوگ ٹٹّی بھی یہیں پھرتے تھے۔ جب وہ اُٹھ کر چلے جاتے تو بھنگیوں کے محلّے سے سُور آ کر مُنھ مارنے لگتے۔ کہیں کہیں کتّے دم توڑتے نظر آتے تھے۔ کہیں کسی گدھے کا پنجر پڑا تھا اور کسی طرف گھوڑے کے جبڑے کے پاس کوئی گِدھ مرا پڑا تھا۔ یہ کچّا تالاب بہت بڑا تھا۔ اس کے اندر کئی انسانوں اور جانوروں کا پیشاب اور غلاظت جمع تھی۔ اس کا پانی بہت گاڑھا، ازحد بدبودار اور سیاہ رنگ کا تھا۔ چاندنی چاندنی اس کو اور بھی بھیانک بنا رہی تھی۔ اُس کی سطح پر اُبھرے ہوئے بلبلے اس طرح دکھائی دیتے تھے، جیسے کسی شخص کے جسم پر آتشک کے زخم۔

یہاں سے گزر کر بہت دیر تک ہم دونوں چُپ چاپ چلتے رہے۔ آخر کار چچا ایک ٹوٹے پھوٹے گھر کے آگے رُکے اور آوازیں دینے لگے۔ "مجید! او مجیدے!!"

میں نے کہا "چچا! آپ نے فضول میں اتنا بڑا چکّر لگایا، یہ گلی وہی نہیں جو اسٹیشن سے آنے والی سڑک سے جا ملتی ہے؟"

چچا دبیرے چمکا کر بولے "ارے میاں! اُدھر جاتے تو بھلا یہ سیر کیسے ہوتی؟ بس تم بھوندو ہی رہے...... ہی ہی اُدھر کیا رکھا تھا...... ہی ہی...... ارے او مجیدے او۔"

"بجو رگلّام تو ایدھر کھڑا ہے۔"

میں نے گھوم کر دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا، چوڑے شانوں والا مرد جُھکا فرشی سلام کر رہا ہے۔ باوجود سردی کے ایک میلا کچیلا تہبند کمر سے لپیٹے ہوئے تھا اور جسم پر صرف ایک چادر۔

"آئیے آئیے آکا! اندر چلے آئیے۔"

یہ کہہ کر اس نے ٹاٹ کا گلا سڑا پردہ اٹھایا۔ اور ہم اندر داخل ہو گئے۔

"قرآن قسم (بہن کی گالی دے کر) سالوں نے جینا مشکل کر دیا ہے۔ یاہ پولس بھی بس کھُدا کی پناہ ہے۔"

میں نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ سامنے چھوٹے سے صحن کے کونے میں ایک پاخانہ، پاس ہی لکڑیوں کا انبار، گوبر سے لپی ہوئی کچّی دیواروں پر اُپلے، ایک طرف گمٹلوں سے بھرپور ٹوٹی ہوئی کھاٹ، اُدھر چولھے کے قریب مٹّی کے تیل کی ڈبّی، اس کی چھوٹی سی لَو بے پناہ تاریکی سے جنگ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی، چولھے کے قریب ایک بُڑھیا اینٹ پر بیٹھی ایک باسی روٹی

توڑ توڑ کر کھا رہی تھی، ہاتھ میں پیاز اور فرش پر چٹنی کا پتہ۔

مجید چچا کو بتا رہا تھا کہ کیسے اُن کے محلے میں کسی نے ایک ہندو پر لاٹھی چلا دی، جس سے اس کا سر تو بچ گیا مگر ایک کان صاف اُڑ گیا۔ اور کسی طرح وہ چیختا چلاتا محلے کے ناکے کی طرف بھاگا اور پھر ناکہ کے صحن میں بے ہوش ہو کر گر پڑا تھا۔ اور کیسے پولس اس کو (مجید کو) ناحق دو گھنٹے سے کوتوالی میں بٹھائے دِق کر رہی تھی، اور اب کہیں جا کر اس کی خلاصی ہوئی تھی۔ چچا یہ باتیں سُن کر کچھ پریشان ہو گئے۔

مجید چولہے کی طرف گیا، پتہ میں سے انگلی پر چٹنی لگا کر چاٹی اور چٹخارہ لے کر بولا "کاہے کی ہے؟"

"پیاج کی۔"

پھر وہ چھت سے لٹکی ہوئی ہنڈیا میں ہاتھ ڈال کر ٹٹولنے لگا۔ "تنباکو کہاں ہے؟"

پوپلے منھ والی بڑھیا بولی "بو تبے کے پیچھے"۔

مجید حقہ پینے لگا۔ چچا کی جانب دیکھ کر بڑھیا کی طرف ابرو سے اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ "ماں ہے میری"۔

اتنے میں پردہ اٹھا۔ ایک کالے کلوٹے مرد نے اندر جھانک کر دیکھا "کو مجید کہاں! پولس میں کا ہوا؟"

چچا اس کی صورت دیکھ کر گھبرائے، اس کا سر اُسترے سے مُنڈا ہوا، بیر موٹی گردن، ٹوٹے ہوئے کان، چوڑے نتھنے.....

چچا نے میرا ہاتھ دبایا۔

"بتلائیں گے"۔ یہ کہہ کر مجید اٹھا اور اس کے پاس جا کر کانا پھوسی کرنے لگا۔ خیر وہ شخص تو چلا گیا اور مجید پھر آ کر حقہ گڑگڑانے لگا۔

چچا نے پیشانی سے پسینہ پونچھا، کھانس کر گلا صاف کرتے ہوئے بولے "اچھا بھئی مجید اب کچھ معاملہ کی بات ہونی چاہئے"۔

"ہاں ہاں"۔ مجید نے سر کھجا کر کہا۔ پھر بڑھیا کی طرف جُھکا "کیوں ماں! (آنکھ مار کر) پکھا نے گئی کیا؟"

بڑھیا نے دبی زبان میں کچھ جواب دیا۔

"دھت تری کی ماں! تو بھی عجب اُول جلول ہے"۔

اس نے حقہ رکھ دیا اور "ابھی آیا" کہہ کر جانے لگا۔

چچا گھبرا کر اُٹھ کھڑے ہوئے "مجید! ہم باہر سڑک پر کھڑے ہوتے ہیں، تم اُسے اُدھر ہی لے آنا"۔

"کسم اللہ پاک کی، پنجابی بابو! جدھر حکم ہووے آؤں"۔

"اچھا تو ہم سڑک پر کھڑے ہیں"۔

یہ کہہ کر چچا بھاگم بھاگ سڑک پر آ کھڑے ہوئے۔ اور اسٹیشن سے آنے والے یکوں کو دیکھنے لگے۔

چچا، مجید، ایک نوجوان لڑکی، بڑھیا اور میں۔ کل پانچ اشخاص ایک تواریخی باغ کی چار دیواری کے پاس کھڑے تھے۔
مجید نے کچھ طویل بیان شروع کر رکھا تھا اور لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے چچا سے کہہ رہا تھا۔ "..... روح پو جا کرن جات رہی..... میں نے سمجھایا، پگلی! پوجا سے کا ملی؟ چل پنجابی سنگ سادی کرا دوں گا۔ بس پنجاب دیس جا، گہنا کپڑا پہن، کھانا پینا مجا اڑانا..... بس ایسی دھیل میں پھانس کر لایا ہوں پنجابی سردار! لونڈیا کا ہے ہیرا سمجھو... گریب ہیں کو مُلوں میں رکھا... تمرے پاس جا کر چمک بڑھوا ہی کرے گی۔"

لڑکی کی عمر بمشکل تیرہ[۱۳] یا چودہ[۱۴] برس کی ہو گی۔ گندمی رنگ، ناک چوڑی، ہونٹ جیسے سنگترے کی پھانکیں، بڑی بڑی زرد آنکھیں، بال خشک بدبودار، ہاتھوں اور کلائیوں پر میل، دُبلی پتلی، سہمی ہوئی کبوتری کی طرح ایک میلی سی پھولدار چادر اوڑھے کھڑی تھی۔

چچا لڑکی کو لے کر چند قدم آگے نیم کے ایک درخت کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ تھوڑی دیر خاموشی سی طاری رہی پھر چچا کی دبی دبی باتوں کی آواز آنے لگی۔ "..... کیا نام ہے؟ ..... بتاؤ نا! ..... ارے بتاؤ ..... ہوں؟ کیا کہا؟ اچھا ..... اچھا! واہ! خوب نام ہے ..... ہاں! ہاں! ! سردی لگتی ہے؟ ہاں لگتی ہو گی ..... بولو نا! تم تو کچھ بھی نہیں کہتیں.... ... منہ کیوں چھپاتی ہو ..... ارے رے روتی ہو؟ ..... اچھا جانے دو ..... روتی کیوں ہو؟ ..... لو نہ سہی ..... اوہ ..... اوہ ..... اوہو ..... ارے نہیں ......"

"تم کا کرت ہو؟ ہُپھوٹے پنجابی؟" مجید نے مجھ سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

"پڑھتا ہوں۔"

"پڑھت ہو؟ ..... ہُو ہُو ہُو ..... ہی ہی ..... بابو ہو جاؤ گے۔"

چچا اور لڑکی واپس آ گئے۔

مجید نے مجسم سوال بن کر چچا کی طرف دیکھا۔ چچا بولے۔ "ابھی جھینپتی ہے ......"

مجید نے لڑکی کی ٹھوڑی اٹھا کر کہا۔ "اری! چھرماتی کیوں ہے؟ سونے کے کنگن ملیں گے ..... چندر بالے گی ....."

لڑکی نے زرد آنکھوں سے مجید کی طرف دیکھا ..... اور پھر لمبی اور گہری سسکی بھر کر خاموش ہو گئی۔

بڑھیا اور لڑکی کو واپس گھر کی طرف روانہ کر دیا گیا، اور ہم تینوں تاڑی خانہ پہنچے۔

یہ چچا کے رسوخ کا کرشمہ تھا کہ ہمیں تین لوہے کی کرسیاں اور تین ٹانگ کی ایک میز مل گئی۔

تاڑی کی بو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ سامنے جہاں دیوار پر ایک "گندی بیماریوں کا شرطیہ علاج" نمایاں حروف میں رقم تھا، ایک چاٹ والے کی دوکان تھی۔ مزدور لوگ تاڑی کے نشے میں مست، وہاں بینگن کے پکوڑے دہی ڈلوا ڈلوا کر کھا رہے تھے۔ دیوار کے سایے میں ایک گونگی بھکارن بیٹھی تھی۔ اس کی صورت مکروہ تھی اور جسم پر ٹاٹ کے چیتھڑے لٹکے ہوئے تھے۔ جب کوئی شخص دہی آلود پتہ نالی کی طرف پھینکتا تو دُبلے پتلے کتّوں اور اس گونگی بھکارن کے درمیان پتہ حاصل کرنے کی کشمکش مزدور لوگوں کی مسرت کا سامان بہم پہونچاتی تھی، وہ خوش ہوتے تھے کہ دنیا میں کسی کی بے بضاعتی پر وہ ہنس سکتے ہیں، وہ وحشیانہ انداز سے دانت نکال نکال کر قہقہے لگاتے اور اُچھل اُچھل کر اپنے چوتڑ پیٹتے تھے۔

مجید دو آبخوروں میں تاڑی اور ایک مٹی کی چینی میں بھنی ہوئی کلیجی لایا۔ تاڑی فروش نے ایک ہراتی تاڑی سے بھر کر ہمارے سامنے رکھ دی۔ اب دونوں تاڑی پینے لگے۔

لالٹین کی دُھندلی روشنی میں عجب عجب لوگ نظر آرہے تھے۔ نشے میں چور رواہی تباہی بک رہے تھے۔ کہیں ٹوٹے ہوئے آبخورے، کہیں کوئی چچوڑی ہوئی ہڈی پڑی تھی ——— اور کسی طرف کوئی کتا نشے میں بے ہوش شرابی کا منھ چاٹ رہا تھا۔

چچا نے دوبارہ آبخورہ بھر کر کہا "لیکن اس کی ٹانگیں بہت پتلی ہیں..... کمزور ہے بے چاری....."

"ابھی عمر ہی کا ہے۔"

بہت دیر تک ۔ دونوں میں کانا پھوسی ہوتی رہی ۔ پھر مجید بلند آواز میں بول اٹھا۔ "ارے یا بی جابر..... اور حکم کے غلام ہیں..... وہ وہ مٹھائی کھلاؤں گا جو ایک۔ باری یاد بھی کرو تم۔"

"مگر جو بات ہم نے کہی، وہ بھولنا نہیں۔"

"ارے نہیں صاحب! جب کہو تبھی ہو جائے جشن..... پھکر کا ہے؟"

اتنے میں ہم ایک شرابی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ "ارے کوئی ہمری بھی سنو۔ دیکھو یہ لونڈا....."

"اماں ہٹا" ایک... اور بھاری بھرکم پہلوان نے اس کی پیٹھ پر دھول جما کر کہا... اس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ ہاتھ میں تاڑی سے لبریز آبخورہ لے کر اُٹھا، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کے ساتھ ——— اس نے چھلکتا ہوا آبخورہ ہوا میں بلند کرتے ہوئے کہا "میں دیب داس ہوں..... دیب داس!..... (زور سے کھانس کر) دُکھ کے..... دُکھ کے..... ہا..... ہا! ہا! دُکھ کے اب دن....."

اتنے میں نائی کا لونڈا پہلے شرابی سے ہاتھ چھڑا کر بھاگا ——— پہلوان نے زور کی لات اس شخص کے رسید کی۔

"ابے او...... آ...... ادھرآ...... چلاآ...... ہاں بیٹے...... ہاں، توبہ کر...... ہاتھ جوڑ...... دھاما نگ۔ دیکھ جیسے میں مانگتا ہوں:۔

"باالاہی! دے دگائی...... ادر اُدعوُعوُعوُ ودو۔"

معاً اس کا تہبند کھل کر زمین پر آرہا، اس کے منہ سے قے کا فوّارہ نکل پڑا...... اور اس کی آسترے سے مُنڈی ہوئی ٹانگوں پر قے کا مینھ برس گیا۔

تین چار دن کے بعد ـــــــ میں سینما دیکھنے کے بعد دس بجے کے قریب گھر جا رہا تھا۔ سوچا، چلو تھوڑی دیر چچا سے گپ رہے۔

چچا ایک بھوجنالیہ میں سب سے اوپر کی منزل پر ایک کمرے میں رہتے تھے۔

اوپر پہنچا۔ مگر دروازے کے پاس جا کر میں ٹھٹک گیا۔ اندر سے کچھ باتوں کی بھنک سنائی دے رہی تھی۔

میں نے چپکے سے درار میں جھانکا، دیکھا کہ وہی لڑکی کھڑی تھی۔ چچا اُس کے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھے، مجید نے آگے جھک کر کہا۔ "دیکھ بَوت، حرمجدگی کرے گی تو حلال کر کے پھینک دوں گا......"

لڑکی نے انتہائی کرب کی حالت میں تڑپ کر خود کو آزاد کیا اور دروازے کی طرف لپکی۔ وہ چلاّنا چاہتی تھی مگر مارے دہشت کے اُس کے منہ سے آواز نہ نکلتی تھی۔ چچا بڑے جوش و خروش کے ساتھ جھپٹے، انھوں نے اس کو دبوچا اور پلنگ پر پٹخ دیا۔

تھوڑی دیر بعد لڑکی نے جدوجہد بند کر دی......

مجید نہایت اطمینان کے ساتھ گورو نانک صاحب کی تصویر کے پاس کھڑا بیڑی پی رہا تھا۔ اور تصویر کو احترام کی نظروں سے دیکھنے میں مگن تھا۔

دوسرے دن چھٹی تھی۔ میرا ارادہ تھا کہ چل کر اسٹیشن کے بُک اسٹال سے کوئی رسالہ وغیرہ خرید اجائے۔

جب بھوجنالیہ کے قریب پہنچا تو دیکھا کہ چچا سیڑھیوں پر سے اتر رہے ہیں۔ مجھے اشارے سے بلایا اور پوچھنے لگے کہ بھائی اتنے دن کہاں رہے؟ دکھائی نہیں دئے۔

سیڑھیوں کے پاس ہی پنڈت جی کی دکان تھی۔ پنڈت جی پان بھی لاتے اور لسی بھی بیچتے تھے۔ چچا کو دیکھتے ہی انھوں نے دونوں ہاتھ (کہنیوں تک) جوڑ کر کہا۔ "جے واہگورو جی کی۔"

"کہئے پنڈت جی! چت پرسن ہے نا؟"

چچا اس وقت اکالیوں والی پگڑی باندھے تھے۔ کھدّر کا لمبا کُرتا، گلے میں پیلے رنگ کی صافی اور ریچھ کرپان......

"سردار جی! آج تو بہت دیر سے اُترے۔" پنڈت جی نے سوال کیا۔

چچا نے نہایت متانت سے سر جھکا کر جواب دیا۔ "پنڈت جی! آج سکھ منی صاحب کا پاٹھ کرتے ہوئے دیر ہو گئی۔

اتنے میں کچھ اور لوگ بھی آگئے۔ چچا اور پنڈت جی دونوں نے ایک بھکارن کو دُھتکارا۔ پنڈت جی بولے۔ "ماپھ کرو پاپ کر

.....حرامجادی..... نکھرے مت دکھا..... بہت دیکھے۔"

عورت ڈر کر پیچھے ہٹ گئی۔ پنڈت جی نے مونچھوں کو ہٹا کر گنگا جل کی لُٹیا منھ سے لگائی اور پھر لوگوں کی طرف مخاطب ہو کر بولے۔ "جب بھگانیوں نے بھارت ورش پر حملہ کیا تو یہی لوگ تھے جنھوں نے ان کا مکابلہ کیا، ابلاؤں کی رکشا کی۔ بہت پراپکاری لوگ ہیں یہ۔"

چچا نے اپنے دُبلے پتلے کمزور کاندھوں کو حرکت دی۔ اور پھر اپنی ۳/۴ انچ کی تلوار کو سنبھالتے ہوئے بولے۔ "پیڑے ہیں پنڈت جی؟ دو گلاس لسی......"

"چچا میں تو لسی پی کر آرہا ہوں، مجھے اجازت دیجئے۔" میں نے کہا۔

اسٹیشن پر جا کر دیکھا تو اس قدر بھیڑ تھی کہ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ پلیٹ فارم تک پہنچنا ناممکن ہو گیا۔ لہٰذا باہر سے ہی تماشہ دیکھتا رہا، ایک شخص نے بلند آواز میں نعرہ لگایا۔ "بولو راشٹرپتی پنڈت جواہر لال کی جَے!"

ساری مخلوق نے گلا پھاڑ پھاڑ کر کہا۔ "راشٹرپتی جواہر لال کی جَے! مہاتما گاندھی کی جَے!! بھارت ماتا کی جَے!!!"

اور جب جواہر لال جی بگھی پر آکر بیٹھ گئے تو اتنے میں چچا ہاتھ میں گیندے کے پھولوں کا ہار لئے نمودار ہوئے۔

انھوں نے متعدد بار پرنام کرنے کے بعد ہار پنڈت جی کے گلے میں پہنا دیا۔

"مجید کھاں" بھی کھدّر کا کُرتا پہنے کانگریسی رضاکار کی حیثیت سے اِدھر اُدھر دوڑتا پھر رہا تھا۔

یکایک ہٹو، بچو، بڑھو، جے رام جی کی، رام رام، راشٹرپتی، ہاں ہاں، نہیں نہیں کا شور بلند ہوا۔ اور جلوس شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔ سب لوگ حبِّ قومی کے جوش میں نہایت عقیدت مندانہ انداز سے گا رہے تھے ؎

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

جھنڈا اونچا رہے ہمارا

جھنڈا........

پچا کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔

جب جلوس مجید کے محلّے کے پاس پہنچا تو سڑک کے کنارے بھیڑ میں مجھے وہی میلی کچیلی لڑکی دکھائی دی۔ وہ حیرت سے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اِن جھنڈا اونچا رکھنے والوں کو دیکھ رہی تھی۔ وہی گرد آلودہ بال، سہمی ہوئی، بے زبان صورت، زرد زرد آنکھیں۔

معاً گلی میں سے ایک کتا نکلا اور مجید کو دیکھ کر بے طرح بھونکنے لگا۔ وہ بھاگ کر بھیڑ میں گھس گیا۔

ایک ہوا کے جھونکے سے اس کوچے کی خاک اُڑی اور پچا کی چکنی داڑھی گرد سے اَٹ گئی۔

"عام تاثر یہ ہے کہ بلونت سنگھ نے ایک دو افسانوی مجموعے اور دو تین ناول پیچھے چھوڑے ہوں گے۔ حیرت ہوتی ہے جب مرزا حامد بیگ کی مرتب کی ہوئی فہرست پر نظر پڑتی ہے۔ ہندی اور اردو میں کُل ملا کر اُن کے دس ناول اور دس افسانوی مجموعوں کے نام سامنے آتے ہیں۔

اگر بلونت سنگھ بھلا دیے گئے تو اس میں قصور اُن کے فن کا نہیں یعنی وہ ان کمزور لکھنے والوں میں سے نہیں تھے جن کے افسانے وقت کا مقابلہ نہیں کر سکے۔ بلونت سنگھ دراصل اس الم ناک صورتِ حال کے صید زبوں ہیں جس سے ہماری بدنصیب زبان پچھلی نصف صدی سے دوچار ہے۔ دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی مانند ہم اپنے گراں مایہ لیکن نایاب ادب پاروں کو نئی نسل کے قارئین تک پہنچانے کا کوئی معقول اشاعتی پروگرام مرتب نہیں کر سکے ہیں۔ ہماری کتابوں کو دوسرا ایڈیشن دیکھنا مشکل سے نصیب ہوتا ہے۔ ایک ہی مصنّف کے بہترین افسانوں کے انتخابات کی اشاعت میں بھی اداروں اور پبلشروں کو دلچسپی نہیں۔ ایک معنی میں ناول اور افسانہ کی قحط سالی کا ہمیں جو سامنا ہے وہ فطری بھی ہے اور مصنوعی بھی۔ فطری اس معنی میں کہ نئی صلاحیتیں سامنے نہیں آرہی ہیں اور مصنوعی اس معنی میں کہ افسانوں کے ذخیروں پر تالے لگے ہوئے ہیں۔ کم از کم بلونت سنگھ، دیویندر ستیارتھی، اختر اورینوی، ابوالفضل صدیقی کی کتابیں نہیں تو جامع انتخابات کے ذریعہ نئی نسل کو اُن کے کارناموں سے واقف کرانا ہماری ذمّہ داری ہے۔ ورنہ ہوگا یہ، اور یہی ہو رہا ہے کہ ہم اپنی بہترین نگارشات سے واقف نہیں ہیں اور صرف عصری ادب سے دعوتِ کام و دہن کرتے رہیں گے۔ کلاسک سے بے بہرہ محض عصری ادب سے شغف ذوقِ ادب کے اندرونی انتشار اور بگاڑ میں منتج ہوتا ہے۔"

(وارث علوی۔ اقتباس بشکریہ "آجکل" دلّی۔ جنوری ۱۹۹۵ء)

بلونت سنگھ

جگا

ماجھا کے علاقے میں بھیکن ایک چھوٹا سا اور غیر معروف گاؤں تھا۔ مشکل سے سو گھر ہوں گے، زیادہ تر سکھوں کی آبادی تھی۔ یہاں کی ایک عجیب بات تھی۔ وہ یہ کہ بعض اوقات یہاں کوئی غیر معمولی طور پر حسین لڑکی وجود میں آتی جس کے ساتھ کسی نوجوان مرد کے عشق کی داستان اس قدر شہرہ پا جاتی کہ سسی پنوں، سوہنی مہینوال اور ہیر رانجھے کے قصّے بھی مات ہو جاتے تھے ـــــ اور اب کے قرعہ گورنام کور کے نام پڑا تھا۔

گُرنام کے حسن نے آس پاس کی بستیوں کے نوجوانوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی۔ وہ ایک گڑیا کی مانند تھی، چینی کی مورت۔ چلتی تو اس سبک رفتاری کے ساتھ کہ نقشِ قدم معدوم۔ سُرمگیں اور بدمست آنکھیں ایسے گناہ کی دعوت دیتی تھیں کہ جس سے بہتر ثواب کا تصور ذہن میں نہ آتا تھا۔ لیکن ابھی وہ معصوم تھی، شباب کی آمد آمد تھی اور وہ ایک بے فکر اور پُر شباب دوشیزہ کی پُر زور حس کو ابھی اس طرح محسوس کرتی تھی جیسے خاموش اور پُرسکون سَمے میں کہیں دور سے شہنائی کی اڑتی ہوئی آواز سنائی دے جائے۔ ابھی وہ مردوں کے اشاروں اور کنایوں کا مطلب نہ سمجھتی تھی۔ وہ اپنی مسکراہٹ ہر کسی کو بخش دیتی، وہ سب سے ہنس کر بات کر لیتی۔ ابھی اس میں پندار حسن پیدا نہ ہوا تھا۔ اس لئے جو شخص بھی اس سے بات کر لیتا یہی سمجھتا کہ گرنام اس سے محبت کرتی ہے ـــــ ایک مرتبہ تو شنگارا سنگھ نے علانیہ نوجوانوں کے جھرمٹ میں کھڑے ہو کر کہہ دیا تھا کہ وہ گرنام کو بھگا لے جائے گا۔ اس وقت دلیپ سنگھ ادھر سے گزرا تو دوسروں نے اُسے سمجھایا کہ دیکھو دلیپ سنگھ بھی گرنام کے عاشقوں میں شمار ہوتا ہے۔ اُس نے سُن پایا تو حالات خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ اس پر شنگارا سنگھ نے زبردست قہقہہ لگایا اور دلیپ کے پیچھے کھڑے ہو کر بکرا بلا دیا[1]۔ اس پر دلیپ سنگھ کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اُس نے خشمگیں نظروں سے شنگارے کی طرف دیکھا، اور کڑک کر بولا "تو نے بکرا کیوں بُلایا ہے"۔

شنگارے نے تہبند کس لیا اور خم ٹھونک کر مقابلے پر آن کھڑا ہوا۔ دلیپ کی آنکھیں قہر برسا رہی تھیں، قریب تھا کہ دونوں

[1] کسی کی تضحیک کرنے کے لئے اپنے منہ کے آگے ہاتھ رکھ کر بھق بھق کی آواز نکالنا۔

جوان باہم گتھ جائیں مگر سب نے بیچ بچاؤ کر دیا ـــــ آخر کہاں تک؟ ایک دن خونی ٹیل پر دونوں کا مقابلہ ہو گیا۔ دلیپ کا تخنہ اتر گیا اور دلیپ کی لاٹھی کی ایک ہی ضرب سے شنگارے کا جبڑا ٹوٹ گیا۔ جان تو بچ گئی مگر صورت بگڑ گئی۔ اس دن سے سب کو کان ہو گئے۔ اور اب دلیپ کے جیتے جی کوئی نام کا دعویدار پیدا ہونا ناممکن تھا۔

رات بھیگ چکی تھی، چاند جوبن پر تھا، گاؤں پر ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آواز آجاتی یا اس وقت رہٹ کی چرخی کے پاس ایک جنگلی بِلا بیٹھا دُم ہلا رہا تھا اور نہایت انہماک کے ساتھ میاؤں میاؤں کر رہا تھا۔

یہ رہٹ اروڑیوں[1] کے پاس گاؤں کے باہر کی طرف تھا۔ ساتھ ہی پیپل کا ایک بہت بڑا اور گھنا درخت، جس پر ایک جھولا پڑا تھا۔ چونکہ بیلوں کو ہانکنے والا کوئی نہیں تھا، جی چاہتا چل دیتے جی چاہتا ٹھہر جاتے، اس وقت خاموشی سے سینگ ہلا رہے تھے۔

اتنے میں سانڈنی سوار ایک سکھ مرد پیپل کے نیچے آکر رکا، اُس نے سانڈنی کو نیچے بٹھانا چاہا، سانڈنی بلبلا کر مچلی اور پھر دھپ سے بیٹھ گئی۔ پنجاب کے دیہاتوں میں چھ فٹ اونچا نوجوان کوئی خلافِ معمول بات نہیں، مگر اس مرد کے کاندھے غیر معمولی طور پر چوڑے تھے، ہاتھوں اور چہرے کی رگیں اُبھری ہوئی، آنکھیں سُرخ انگارہ، ناک جیسے عقاب کی چونچ، رنگ سیاہ، چوڑے اور مضبوط جبڑے، سر ایسے دکھائی پڑتا تھا جیسے گردن میں سے تراش کر بنایا گیا ہو، چوڑے پر رنگ برنگ کی جالی، جس میں سے بڑے بڑے پھندنے نکل کر اُس کی سیاہ داڑھی کے پاس لٹک رہے تھے، کانوں میں بڑے بڑے مندرے کالے رنگ کی چھوٹی سی پگڑی کے دو تین بل سر پر، بدن پر لانبا کرتہ اور مونگیا رنگ کا دھاریدار تہبند اُس کی ایڑیوں تک لٹکتا ہوا۔ گریبان کا تسمہ کھلا ہوا، اور اُس کے سینے پر کے گھنے بال نمایاں۔ اور پھر اس کے ہاتھ میں ایک تیز اور چمکدار چھوی[2]۔

آتے ہی اُس نے بیلوں کو دُھتکارا اور وہ چلنے لگے، اس نے جوتے اتارے، تہبند کو اوپر اٹھایا اور اپنے موٹے کڑے[3] کو پیچھے ہٹا کر پانی کی چھال کی طرف بڑھا۔ پہلے اس نے منہ ہاتھ دھویا، زور سے کھانسا اور پھر پانی پینے لگا۔

جب وہ پگڑی کے شملے سے منہ پونچھنے لگا تو ایک نوجوان دوشیزہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ لڑکی نے پانی بھرنے کے لئے گھڑا چھال کے نیچے کیا۔ اس کی گوری کلائی پر کالی کالی چوڑیاں ایک چھن کی آواز کے ساتھ یکجا ہو گئیں۔ گلابی رنگ کی شلوار، چھینٹ کا گھٹنوں تک کا کرتا، سر پر دھانی رنگ کی ہلکی پھلکی اوڑھنی، کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں۔ جب اس نے اپنا نازک ہونٹ دانتوں تلے دبایا، گھڑے کو ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھا کر کولھے پر رکھا تو اس کی کمر میں ایک دل نشیں خم سا پیدا ہو کر رہ گیا۔

مرد نے پہلے ایک پاؤں اڈ لُو[4] سے باہر نکالا اور اُسے جھٹک کر جوتا پہن لیا پھر اس نے اپنے دوسرے پاؤں کو جھٹکا دیا

---

[1] کوڑے کا ڈھیر۔
[2] ایک تیز دھار ہتھیار جو کہ لاٹھی کے سرے پر چڑھا لیا جاتا ہے۔
[3] آہنی کڑا جو کہ سکھ کلائی میں پہنے رہتے ہیں۔
[4] جہاں پانی گرتا ہے۔

اور دوسرا جوتا بھی پہن لیا۔ تب وہ اپنی چھوٹی ہاتھ میں لئے ہوئے اور ٹی پر جہاں کہ ایک سفید مرغی کے بہت سے پر پڑے تھے، کھڑا ہو گیا۔ پاس ہی کسی کے گھر کی کچی دیوار تھی، جس پر اُپلے رکھے تھے۔ جب لڑکی دیوار کے قریب سے گزرنے لگی تو مرد نے چھوٹی سے ایک اُپلا نیچے گرا دیا۔ جو لڑکی کے پاؤں کے پاس جا کر گرا۔ اس وقت اجنبی مرد نے اس کے پاؤں دیکھے جیسے سپید سپید کبوتر، تلوؤں کی ہلکی گلابی رنگت ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے وہ پاؤں ابھی ابھی گلاب کی کلیوں کو روند کر چلے آ رہے ہوں ــ لڑکی نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید اُس نے اُسے محض ایک راہ گیر سمجھا تھا مگر اس کی ڈراؤنی صورت دیکھ کر اُس کی بڑی بڑی سرمگیں آنکھوں میں خوف کا سایہ دکھائی دینے لگا۔ مرد نے بھاری بھر کم اور کرخت آواز میں پوچھا "تو کون ہے؟"

لڑکی کی نظریں مرد کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کسی شخص نے اُسے اس قدر بے مروّتی کے ساتھ مخاطب کیا۔ اس کے سرخ سرخ نازک ہونٹ پھڑکنے لگے جیسے کسی نے لال مرچیں ان پر چھڑک دی ہوں۔ مگر مرد غیر معمولی طور پر بھیانک تھا۔ مرد نے اُسی لہجے میں اپنا سوال دہرایا "تو کون ہے؟"

لڑکی سمجھ نہ سکی کہ اس بات کا کیا جواب دے۔ اُس نے اپنی حنائی انگلی اٹھا کر اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا "میں وہاں اس گھر میں رہتی ہوں۔"

مرد نے چبھتی ہوئی نظروں سے اُس کی طرف دیکھا۔ اپنے چوڑے شانوں کو حرکت دے کر بولا "تیرا نام کیا ہے؟"

دوشیزہ کی آنکھیں پُر آب ہو گئیں۔ بولی "گُرنام۔"

"تو وہاں کس کے ساتھ رہتی ہے؟"

"میری ماں ہے، بے بے[۱]، ویر[۲]، چاچا[۳]، بابو[۴] سب ہی رہتے ہیں۔"

"مجھے اپنے گھر لے چل۔" مرد نے اس کے ساتھ ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے کہا۔

"مجھے تجھ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔"

مرد کی پیشانی پر بہت سی تیوریاں پڑ گئیں، اس نے اپنی دلہن کی طرح آراستہ سانڈنی کی مہار پکڑ کر اپنی دانست میں ذرا نرم لہجے میں پوچھا "کیوں؟ کیا تم لوگ سکھ نہیں ہو کیا؟"

لڑکی کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ "لیکن مجھے تجھ سے خوف معلوم ہوتا ہے۔"

"کیوں؟" مرد نے اُجڈپن سے اصرار کرتے ہوئے پوچھا۔

لڑکی نے ایک لمحہ کے لئے اس کی چمکدار آنکھوں کی طرف دیکھا۔ "تم ہنستے کیوں نہیں؟"

---

[۱] ماں [۲] بھائی [۳] باپ [۴] دادا۔

"ارے! یہ بات؟" یہ کہہ کر اجنبی نے ایک خوفناک قہقہہ لگایا، جیسے کوئی پانی سے لبریز مٹکا زمین پر انڈیل دے، اس کے قہقہے کی آواز سُن کر چمگادڑیں اپنی کمیں گاہوں سے نکل کر پرواز کر گئیں۔

گرنام کا گھر گاؤں سے باہر دھریک[1] کے درختوں کے جھنڈ کے پاس تھا۔ اس کی ممٹی تو بہت دور سے نظر آتی تھی۔ دروازے کے سامنے پہنچ کر اجنبی رک گیا اور گرنام نے اندر سے اپنے باپو اور بھائی کو باہر بھیجا۔ ان کو دیکھتے ہی اجنبی نے بلند آواز میں کہا۔ "واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

"واہ گورو جی کا خالصہ سری واہ گورو جی کی فتح!"

اجنبی بلا کسی ہچکچاہٹ کے بولا "میں دور سے آرہا ہوں، رات زیادہ گزر چکی ہے۔ میں آج یہیں ٹھہروں گا۔"

باپو درانتی اپنے پوتے کے ہاتھ میں دے کر اجنبی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ بہت خوش خلق اور ملنسار شخص تھا مگر اجنبی کی بھیانک شکل اسے شش و پنج میں ڈالے ہوئے تھی۔ خیر اُس نے رضامندی ظاہر کرتے ہوئے جواب دیا "میں ہر طرح سے خدمت کے ....."

پیشتر اس کے کہ وہ اپنا فقرہ پورا کر سکے اجنبی سانڈنی کو لڑکے کے سپرد کر کے دروازہ کے اندر داخل ہو چکا تھا۔ اگرچہ گھر کا کل سامان غریبانہ تھا۔ مگر گوبر سے لپی ہوئی کچی دیواریں اس بات کا ثبوت دے رہی تھیں کہ گھر کی عورتیں کاہل یا آرام طلب ہرگز نہ تھیں۔ گھر کے سب افراد بیاہ والے گھر گئے ہوئے تھے، سوائے چار کے۔

ڈیوڑھی سے نکل کر اجنبی صحن میں داخل ہو گیا۔ ایک بچہ سینہ سے گلی ڈنڈا لگائے سو رہا تھا۔ صحن مویشیوں کے مُوت اور گوبر سے اٹا پڑا تھا۔ ایک طرف کھُرلی[2] کے پاس ایک بھینس جگالی کر رہی تھی بھُس اور کھلی کی سانی کی بُو ہر چہار جانب پھیلی ہوئی تھی۔ رسّی پر میلے کچیلے کپڑے لٹک رہے تھے۔ ایک طرف خراس[3]، دوسری طرف تنور اور اس کے پاس ہی دیوار سے ٹکا ہوا چھکڑے کا پہیہ، بڑے بڑے اُپلے، کونے میں کپاس کی چھڑیاں، چولھے کے پاس جھوٹے برتنوں کا انبار، ایک کمرے میں سے سفید سفید چمکتے ہوئے برتن دکھائی دے رہے تھے۔ ساتھ ہی تاگے میں پروئے ہوئے شلغم کے قتلے سوکھنے کے واسطے لٹک رہے تھے۔

صحن سے گزر کر بوڑھا باپو اجنبی کو دروازہ سے باہر چھپر کے نیچے لے گیا۔ تھوڑی سی جگہ کے تینوں طرف ایک کچی دیوار اٹھا دی گئی تھی۔ سوکھے ہوئے اُپلے جو جلانے کے کام میں آسکتے تھے، اسی جگہ رکھے جاتے تھے۔ یہاں پر ایک چارپائی ڈال دی گئی۔ چارخانوں والا ایک کھیس اور اجنبی کے دل کی طرح سخت ایک عدد تکیہ اس پر رکھ دیا گیا۔

---

[1] نیم کے درخت سے ملتا جلتا ایک پیڑ۔ [2] ناند جس میں سانی کی جاتی ہے۔ [3] بیلوں کے ذریعہ چلنے والی چکی۔

گرنام نے کپاس کی چھڑیوں کا ایک گٹھا تنور میں پھینکا اور خود آٹا گوندھنے لگی۔ جس وقت وہ تنور میں روٹیاں لگانے لگی تو اس کی اوڑھنی سر سے کھسک گئی۔ اس کی لانبی چوٹی کے رنگ برنگ کے پھندنے اس کی پنڈلیوں تک لٹک رہے تھے۔ دہکتے ہوئے تنور کی روشنی اس کے حسین چہرے پر پڑ رہی تھی — اور اجنبی چپکے چپکے اُسے دیکھ رہا تھا۔

شلغم کی ترکاری، ایک کٹورے میں شکر گھی، ڈیلوں[1] کا اچار، دو بڑی بڑی پیاز کی گٹھیاں اور آٹھ چوڑی چوڑی روٹیاں تھال میں رکھ کر گرنام اس کو دے آئی۔

جب اجنبی نے اوپر نیچے تین چار ڈکاریں لیں اور بڑے زور شور کے ساتھ مُنہ میں انگلی پھیر کر کلّی کی تو گرنام کو معلوم ہو گیا کہ وہ کھانا ختم کر چکا ہے۔

وہ برتن اٹھانے لگی تو اس نے دیکھا کہ اجنبی کپڑے اتار رہا ہے۔ جب اس نے تہبند اتارا اُسے جھاڑ کر تکیہ کے قریب رکھنے لگا تو سونے کا ایک کنٹھا نیچے گر پڑا۔ گرنام ٹھٹک کر واپس جانے لگی تو اجنبی نے آہستہ سے پوچھا۔ "گرنام! بس جا رہی ہو کیا؟"

گرنام حسبِ معمول اپنے دلفریب طفلانہ انداز سے مُسکرائی اور اوڑھنی سنبھالتے ہوئے آگے جھک کر آہستہ سے بولی۔ "سب لوگ سو جائیں تو میں آؤں گی۔"

اجنبی دور کھیتوں کی طرف دیکھ رہا تھا، شریںہہ اور ببول کے پیڑ سیاہ دیوؤں کی طرح خاموش کھڑے تھے۔ ٹنڈ منڈ بیریوں پر بئیوں کے گھونسلے لٹک رہے تھے۔

ایسے سنسان وقت میں تاروں بھرے آسمان تلے، کسی دور افتادہ رہٹ سے کسی نوجوان کی مسرّت انگیز گانے کی ہلکی ہلکی آواز آ رہی تھی۔

باگے وِچ کیلا امی

نِکل کے مِل بالو!

ساڈے ونجھنے دا ویلا امی

نکل کے مِل بالو!

اتنے میں گرنام دبے پاؤں شلوار کے پائنچے اٹھائے، نچلا ہونٹ دانتوں تلے دبائے چپکے چپکے قدم ناپتی ہوئی آئی۔

---

[1] بیر کی مانند ایک پھل۔

تھوڑی دیر بعد دونوں میں گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

اجنبی نے بہت سے سونے کے زیورات اور موتیوں کے ہار نکالے۔ قریب تھا کہ گرتام کے منہ سے حیرت اور مسرت کے مارے ایک چیخ نکل جاتی مگر اجنبی نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

گرتام بہت دیر تک مینا کی طرح چہکتی رہی، ادھر اُدھر کی باتیں کرتی رہی۔ مگر اس کا دھیان زیورات کی طرف تھا۔ آخر کار اس نے اپنی باتوں سے آپ ہی اکتا کر ایک گہری سانس لی اور زکام زدہ آواز میں بولی۔

"کیوں تم یہ زیورات کہاں سے لائے ہو — میرے خیال میں تم جیب کترے تو نہیں ہو۔ مجھے جیب کتروں، چوروں اور ڈاکوؤں سے سخت نفرت ہے۔ وہ جھٹ سے گلا دبا کر آدمی کو مار ڈالتے ہیں۔" یہ کہہ کر گرتام اپنی موٹی موٹی آنکھوں سے خلا میں گھورنے لگی، جیسے کوئی سچ مچ کا قاتل اس کا گلا دبانے کو آ رہا ہو۔

"مت گھبراؤ۔ تم بھی کیسی بچوں کی سی باتیں کرتی ہو۔ بھلا میرے ہوتے ہوئے تم کو کس بات کا خطرہ؟ اٹھو یہاں میرے پاس چارپائی پر بیٹھ جاؤ۔"

گرتام اٹھ کر اس کے پاس بیٹھ گئی۔ اس نے اجنبی کے چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا نیم دل سے مطمئن ہو کر کہنے لگی۔ "تم بہت اچھے ہو — یہ زیورات تو تم اپنی بیوی کے لئے لائے ہو گے نا؟"

"ہاں!"

گرتام نے اپنی ہتھیلی پر رخسار رکھتے ہوئے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"تمہاری بیوی کیسی ہے؟"

"مگر میری تو ابھی شادی بھی نہیں ہوئی۔"

"اچھا تو ہونے والی بیوی کے لئے لائے ہو؟"

اجنبی نے اپنی داڑھی کے کھردرے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "ابھی تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ میری بیوی کون بنے گی۔ بنے گی بھی یا نہیں۔"

گرتام نے اپنی دونوں ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھ کر اپنی آنکھوں کو جلد جلد جھپکاتے ہوئے، ناک ذرا سکیڑ کر بھولے پن سے کہا۔ "ہاں تم کالے ہو ذرا۔"

اجنبی کے سینے میں جیسے کسی نے گھونسہ مار دیا۔

مگر گرنام نہایت سنجیدگی سے کسی گہری سوچ میں ڈوب چکی تھی، شاید وہ اجنبی کے لئے بیوی حاصل کرنے کی ترکیب سوچ رہی تھی۔

"یہ زیور تم لے لو۔"

گرنام نے چونک کر اجنبی کی طرف دیکھا۔ "پھر تم اپنی بیوی کو کیا دو گے؟"

اجنبی کو کچھ جواب نہ سوجھا۔ لڑکھڑاتی زبان سے بولا۔ "پھر میں تم سے لے لوں گا۔"

گرنام کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کی باچھیں کھل گئیں۔ تالی بجا کر بولی۔ "میں ان کو اُپلوں میں چھپا دوں گی ـــــ کبھی کبھی رات کو اچھے اچھے زیورات پہن کر کھیتوں میں جایا کروں گی۔"

کچھ دیر سکوت کے بعد اجنبی نے کہا۔ "گرنام! تم بھی تو مجھ کو کچھ دو۔"

گرنام نے دونوں ہاتھوں سے چہرہ چھپا لیا۔ "میرے پاس کیا ہے؟"

"کچھ بھی ہو۔"

گرنام چہرے سے ہاتھ ہٹا کر کچھ دیر تک سوچتی رہی۔ پھر اس نے اپنے گلے سے کوڑیوں اور خربوزہ کے رنگ برنگ کے بیجوں کا ہار اتار کر اجنبی کی طرف بڑھا دیا۔ وہ اپنے اس حقیر تحفہ کو دیکھ کر جھینپ سی گئی اور اس کے رخسار دہکنے لگے۔

تھوڑی دیر بعد گرنام نے ایک انگشتری اٹھا کر کہا۔ "یہ میری انگلی میں پہنا دو۔ دیکھوں کیسی لگتی ہے۔"

اجنبی نے اپنے کالے کالے میلے کچیلے لمبے چوڑے ہاتھوں میں گرنام کا کنول سا ہاتھ لیا۔ گرنام نظریں جھکائے بچوں کی سی سادگی اور انہماک کے ساتھ انگوٹھی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی زلفوں نے اس کے رخساروں کا ایک بڑا حصہ ڈھانپ رکھا تھا۔ اجنبی وارفتگی کے عالم میں اُس کے خوبصورت سیپوں جیسے پپوٹوں پر نظریں گاڑے ہوئے تھا۔ جب وہ اس کی انگلی میں انگوٹھی پہنانے لگا تو اس کی اپنی انگلیاں لرزنے لگیں۔ اور اسے ایسا محسوس ہونے لگا جیسے اس کی چار چار انگل چوڑی کلائیوں کی کل طاقت کشید کی جا رہی ہو۔

گرنام چونکی اور سہمی ہوئی ہرنی کی طرح اٹھ کھڑی ہوئی۔ "اماں کھانس رہی ہیں ـــــ اب میں جاتی ہوں۔"

اجنبی اپنے خواب سے چونکا۔

گرنام نے آگے جھک کر لرزتی آواز میں پوچھا۔ "جاؤں کیا؟"

اجنبی کی اجازت لے کر وہ زیورات کی پوٹلی بغل میں دبائے جھٹ اندر چلی گئی۔

علی الصبح گاؤں کے مویشی رات بھر کی گرمی سے گھبرا کر جوہڑ میں گھس پڑے۔

اجنبی جانے کے لئے تیار بیٹھا تھا۔ گرنام نے اسے ایک باسی روٹی پر مکھن، اور ایک چھنا[1] لسی کا دیا۔ اور جب اجنبی کپڑے پہن کر تیار ہوا تو گرنام رونے لگی۔ اجنبی نے آہستہ سے کہا۔ "روتی کیوں ہو؟"

"تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔ تم مت جاؤ۔"

اجنبی ہنس پڑا۔ "میں پھر آؤں گا۔"

باپو کو آتے دیکھ کر اس نے آنسو پونچھ ڈالے۔

باپو اجنبی کو رخصت کرنے کے لئے کچھ دور تک اس کے ساتھ گیا۔ اس نے اجنبی سے پوچھا۔ "کیا میں اپنے معزز مہمان کا نام دریافت کر سکتا ہوں؟"

"ہاں" اجنبی نے اپنی تیز نظریں اس کے چہرے پر گاڑ کر جواب دیا۔ پھر اس نے اپنے دھوپ میں چمکنے والے گنڈاسے کی طرف فخریہ انداز سے دیکھتے ہوئے مزید کہا۔ "اور تم کو یہ بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اگر میرے نام کا ذکر اپنے یا بیگانے کسی سے بھی کیا تو تمہارے اور تمہارے خاندان کے سب افراد کے خون سے مجھے ہاتھ رنگنے پڑیں گے۔"

بوڑھے کا چہرہ فق ہو گیا۔

اجنبی سانڈنی پر سوار ہو گیا اور مہار کو جھٹکا دے کر اپنی بھاری آواز میں بولا۔ "آج رات جگا ڈاکو تمہارا مہمان تھا۔"

جگا ڈاکو، اصلی نام سردار جگت سنگھ ورک[2]، وہ خوفناک شخص تھا کہ جس کا نام سن کر بڑے بڑے بہادروں کے چھکے چھوٹ جاتے تھے۔ قتل، غارتگری، ظلم، لوٹ مار اس کے ہر روز کے مشاغل تھے۔ لڑکپن اور شباب خون کی ہولی کھیلنے میں ہی گزر گیا۔ بہت سی زمین کا مالک تھا۔ بڑوں بڑوں پر ہاتھ صاف کرتا تھا، غریب خوش تھے۔ اس کے خلاف گواہی دینے کا کوئی شخص حوصلہ نہ کر سکتا تھا۔ اب تیس برس سے اوپر سن تھا۔ موت کے ساتھ کھیلتا ہوا سو جاتا اور موت کا مذاق اڑاتا ہوا جاگ اٹھتا۔ محبت، حسن، شفقت، نیکی وغیرہ کا اس کے نزدیک کچھ بھی مفہوم متعین نہ تھا۔ دور دور تک اس کی دھوم تھی۔ علاقہ بھر اس سے تھرّاتا تھا۔ اس کا دل پتھر، بازو آہن، غصہ قیامت، ذہن شعلہ ــــ وہ قہر تھا۔

لوگوں نے اس کے نام پر کئی گانے بنا لئے تھے۔ نوجوان جھوم جھوم کر ان کو گایا کرتے تھے۔ ایک واقعہ کا ذکر یوں ہوتا تھا:

پکےّ پُل تے لڑائیاں ہوئیاں، پکےّ پُل تے

پکےّ پُل تے[3] لڑائیاں ہوئیاں تے چھویاں دے کِل ٹُٹ گئے..... جگیا۔

---

[1] بڑا کٹورہ۔ [2] جاٹوں کی ایک ذات۔ [3] پکے پل پر اتنی سخت لڑائی ہوئی کہ چھویوں کے کیل ہی ٹوٹ گئے۔

بابھڑلایل پور میں اس نے ایک زبردست ڈاکہ ڈالا تھا اور بچ کر واپس بھی آگیا تھا۔ اس کا ذکر یوں ہوتا تھا:۔

جگّے ماریا لایل پور ڈاکہ، جگّے ماریا۔

جگّے ماریا لایل پور ڈاکہ، تے تاراں کھڑک گیاں آپے[1]۔

اس کی طویل، تاریک اور بھیانک شبِ حیات میں ایک تارا طلوع ہوا جس نے اس کی نظروں کو خیرہ کردیا۔ اور وہ تارا تھی ـــــ گرنام!

گرنام بے چاری نادان چھوکری۔ اسے عشق و محبّت کا پتہ ہی نہ تھا۔ اسے لوگ کنکھیوں سے دیکھتے وہ ہنس دیتی، اس کے جذبۂ پندارِ حسن و شباب کو کسی نے بھی صحیح طور پر متحرک کرنے کی کوشش نہ کی تھی۔ ابھی اس کو اتنا ہوش ہی نہ تھا کہ دیدہ و دانستہ شکار کھیلے، بسملوں کا تڑپنا دیکھے اور اس لذّت سے محظوظ ہو جو کہ صیّادوں کے لئے مخصوص ہے۔ وہ بھولی بھالی، سادہ رو چھوکری یہ جانتی ہی نہ تھی کہ وہ شاہین جس کو زخمی کرنے کیلئے پنجاب کے شہزور نوجوانوں کی کمانیں ٹوٹ چکی تھیں، اور جس پر جو بھی تیر پھینکا جاتا تھا وہ اُسے چھو کر اور کند ہو کر زمین پر گر پڑتا تھا، وہی شاہین اس کے تیرِ غلط انداز کا شکار ہو کر نیم بسمل اس کے پیروں کے پاس پڑا تھا۔ اور وہ تیر قدرت نے اس کی پلکوں میں پنہاں کر کے رکھ چھوڑا تھا۔

رات کی تاریکیوں میں جگّا ان کے ہاں آتا اور سپیدۂ سحر کے نمودار ہونے سے پہلے ہی رخصت ہو جاتا۔ اس نے خود کو ایک متموّل زمیندار ظاہر کیا۔ باپو کے علاوہ گھر کے سبھی افراد اس کو دھرم سنگھ کے نام سے جانتے تھے۔ گرنام کی کشش اُسے کھینچ لاتی تھی۔ اس کے دل میں ایک خلش سی رہتی تھی کہ وہ اُس فرشتہ کو اپنانے سے پہلے خود کو کیونکر اس کے قابل بنائے۔ اس نے کبھی بھی اس سے محبّت جتلانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کیونکر اس کا آغاز کرے۔ وہ سوچتا تھا کہ نامعلوم اِس کے اظہارِ محبّت کرنے پر گرنام کیا رویّہ اختیار کرلے۔ وہ اس کے پاس بیٹھی چہکتی رہتی تھی اور وہ مبہوت سا بیٹھا سُنا کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کو خود سے نفرت ہونے لگتی۔ صورت تو اس کی پہلے ہی مکروہ تھی مگر اُس کی سیرت پر تو شیطان دامن میں منہ چھپاتا تھا۔ گرنام تھی کہ اس نے کبھی بھی اس سے اظہارِ نفرت نہ کیا۔ وہ نہایت مہر و محبّت کے ساتھ اس سے پیش آتی۔ اگر وہ اسے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہتا تو وہ اس کے قریب ہی بیٹھ جاتی، اگرچہ اس نے آج تک اس کو چھونے کی جرأت نہ کی تھی۔ گرنام کی فرشتہ سیرتی اس کے دل میں دھڑکا پیدا کر دیتی تھی، اس کا ملکوتی جمال اس کا سرنگوں کر دیتا تھا۔ صرف اس کے دل کی بے چینی اور ضمیر کی ملامت بڑھ گئی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے نہایت حیرت سے سُنا کہ:۔

· جگّے نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔

---

[1] جب جگّے نے لایل پور میں ڈاکہ ڈالا تو ہر طرف برقی تاروں کے ذریعہ سے اس بات کی خبر کر دی گئی۔

ڈیڑھ برس کا عرصہ آنکھ جھپکتے ہیں گزر گیا۔

جگا صبح و شام پاٹھ کرتا، غریبوں کو کھلاتا پلاتا، دان کرتا، گرودوارے میں جا کر سیوا کرتا، ہر کسی کے ساتھ نرمی اور حلیمی سے گفتگو کرتا۔

اس نے باپو کی منت کی کہ گرنام کور کی شادی اس کے ساتھ کر دی جائے۔ اس نے ڈاکہ زنی ترک کر دی ہے۔ اور جو کچھ اس نے لوٹا وہ سب بڑی توندوالوں کا تھا۔ غریبوں کی کمائی کا ایک پیسہ اس کے پاس نہ تھا۔ وہ اپنی بہت سی زمین اور روپیہ ان کو دینے کے لئے تیار تھا۔ اور باپو کو وہ ہمیشہ بزرگ سمجھ کر اس کی خدمت کرے گا۔ لیکن گرنام کو یہ نہ معلوم ہونے پائے کہ وہ جگا ڈاکو تھا اور نہ ہی اُسے فی الحال اس بات کا علم ہونے پائے کہ اس کی شادی کس سے ہونے والی ہے کیونکہ اُس کو یقین تھا کہ وہ اس کو چاہتی تھی اور جب وہ اپنے پریتم کو یک بیک اپنا خاوند دیکھے گی تو اس کی حیرت کی انتہا نہ رہے گی۔

نیک باپو نے سب کچھ منظور کر لیا۔

جگا بھیکن سے چودہ کوس پرے رہتا تھا۔ اس کی آمد و رفت کی خبر کسی کو کانوں کان نہ ہوتی تھی۔ لوگوں نے اس اجنبی کو کبھی کبھار ان کے گھر سے نکلتے ہوئے دیکھا تھا مگر کسی نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ کیونکہ اوّل تو وہ آتا ہی کبھی کبھار تھا اور دوسرے وہ راتوں رات واپس بھی چلا جاتا تھا۔ وہ ہمیشہ اپنی بڑھی ہوئی مصروفیتوں کا بہانہ کر دیتا تھا۔ جگے کو دنیا جانتی تھی مگر اس کو کوئی نہ پہچانتا تھا۔

جگے کو شادی کی منظوری مل ہی چکی تھی۔ اب وہ چاہتا تھا کہ گرنام کی زبان سے بھی اس عشق کا اقرار کروالے، خواہ اسے یہ نہ بتلائے کہ اس کا ہونے والا خاوند وہی ہے۔

ایک دن بعد از غروبِ آفتاب وہ بھیکن میں داخل ہوا۔ گھر پہنچ کر پتہ چلا کہ گرنام ساتھ والے گاؤں میں جولاہوں کو سُوت دینے کے لئے گئی ہوئی تھی۔

جگے نے آئینہ میں اپنی صورت دیکھی۔ اس نے پگڑی کو ذرا کج کیا۔ شملہ کو ذرا اور بلند کیا۔ اور پھر اس نے سب کی نظریں بچا کر چراغ میں سے سرسوں کا تیل ہتھیلی پر الٹ لیا اور اسے اپنی گھنی اور کھردرے بالوں والی گرد آلود داڑھی پر خوب اچھی طرح مل لیا۔ پھر وہ مونچھوں کو بل دیتا ہوا گھر سے باہر نکلا اور آہستہ آہستہ ٹہلتا ہوا پانچ چھ فرلانگ تک چلا گیا۔

ہر طرف دھندسی چھائی ہوئی تھی۔ چاند کی ملگجی روشنی میں وہ ایک بھوت کے مانند دکھائی پڑتا تھا۔

دور سے ایک صورت دکھائی دی، اُسے غور سے ٹکٹکی باندھ کر دیکھا، کوئی عورت تھی۔ اور وہ یقیناً تھی بھی گرنام۔
جگا اصیل مرغ کی طرح تن کر کھڑا ہو گیا۔

گرنام قریب آتے ہی مسکرا دی۔ لیکن مسکراہٹ میں کچھ متانت جھلکتی تھی۔ سر پر ایک بھاری گٹھڑی تھی "میری تو گردن ٹوٹ گئی۔"

"اس گٹھڑی میں کیا بھر لائی ہو؟" یہ کہتے ہوئے جگے نے ایک ہاتھ سے یہ من بھر بوجھ اس کے سر پر سے یوں اٹھایا جیسے کوئی دو سال کے بچے کو ٹانگ پکڑ کر اٹھا دے۔

"اُپلے — اور ہوتا کیا؟" گرنام نے اپنی پتلی سی ناک سکیڑ کر کہا۔ "آرہی تھی، رستہ میں اُپلے چننے لگی۔ یہاں تک کہ شام اسی میں ہو گئی۔"

دونوں کھیت کی بلنڈھ پر بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

آج جگے نے گرنام کی طرف دیکھا تو اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات پیدا ہونے لگے۔ وہ اپنی ہونے والی بیوی کی طرف بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹیوں اور ساگ کا تصوّر اُسے بے چین کئے دیتا تھا۔ کبھی تو اُس کے دل میں آتی کہ سارا بھید کھول دے اور کبھی سوچتا کہ ہرگز نہ بتائے۔ آخر کار اس سے رہا نہ گیا کیونکہ گرنام کچھ افسردہ سی ہو رہی تھی۔ "گرنام!" یہ کہتے کہتے رال اس کی داڑھی پر ٹپک پڑی۔ اس نے اسے اپنی آستین سے پونچھا اور پھر بولا۔ "گرنام! تم کو ایک خوشخبری سنانا چاہتا ہوں۔"

گرنام نے کچھ جواب نہیں دیا۔ وہ اپنے پاؤں کے انگوٹھے سے زمین کریدنے میں مصروف تھی اور گہری سوچ میں تھی۔ اگرچہ وہ پہلے سی شوخ اور الّھڑ نہ رہی تھی مگر چونکہ جگے سے کافی مانوس تھی اس لئے اُس سے زیادہ شرماتی بھی نہیں تھی۔

جگّے کو کچھ الجھن سی ہونے لگی۔ اس نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ "کیوں گرنام! کس سوچ میں ہو؟"

گرنام پہلے تو چونکی۔ پھر اس نے دھیرے سے کہا۔ "میں بہت پریشان ہوں — میں بہت دن سے چاہتی تھی کہ تم کو سب حال سناؤں لیکن ....."

"لیکن کیا؟"

"شرم آتی تھی۔" گرنام نے جھینپ کر کہا۔

جگا کچھ کچھ تاڑ گیا۔ "زیرِ مونچھ مسکرایا۔ "ارے مجھ سے شرم کیسی؟"

گرنام چپ رہی۔

جگا کھسک کر اس کے قریب ہو گیا۔ اس کے بار بار اصرار کرنے پر گرنام نے بتایا۔ "وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ شادی تو سبھی کی ہوتی ہے۔"

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ بھرائی ہوئی آواز میں بولی۔"وہ کسی روپیہ پیسہ والے شخص سے میرا بیاہ کرنا چاہتے ہیں، جسے میں نے دیکھا بھی نہیں۔ مگر میں اور کسی سے....."

یہ کہہ کر وہ رو پڑی۔

جگے نے اپنے اوپر کی طرف اٹھے ہوئے شملہ کو چھو کر دیکھا کہ وہ نیچے تو نہیں جھک گیا۔ پھر اس نے سینہ پھلا کر کہا۔

"نہیں گرنام، نہیں۔ جس کو تم چاہو گی اسی سے تمہاری شادی ہوگی۔ میں باپو کو خود سمجھاؤں گا..... ہاں تو..... مگر وہ ہے کون؟"

جگے کی آنکھیں مارے خوشی کے چمک رہی تھیں۔

گرنام نے اس کے سینہ پر سر رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آج اُسے اس کے چوڑے شانوں اور صندوق جیسے سینہ کو چھو کر گونہ تسکین حاصل ہو رہی تھی۔

جگا گھبرا گیا۔ اس نے اس کو چمکارا اور دلاسا دیا اور پھر اس شخص کا نام پوچھا۔

گرنام نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر رُک گئی..... اور زور زور سے رونے لگی۔ جگے نے تسکین دی تو وہ بولی۔"تم ضرور میری مدد کرو گے، ان سب کے ہاتھوں سے میں سخت بیزار ہوں۔ تم بہت اچھے ہو۔ اس کا نام....."

جگے کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔

"اس کا نام ہے دلیپ .... دلیپ سنگھ۔"

جگے کو سانپ نے ڈس لیا۔

اس کا چہرہ یکایک بھیانک ہو گیا۔

"دلیپ سنگھ اس کا نام ہے۔" گرنام نے دہرایا۔

جگے کی مونچھیں لٹکنے لگیں۔

اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ جسم کے رونگٹے کانٹوں کی طرح کھڑے ہو گئے۔ آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ گردن کی رگیں پھول گئیں ــــ گرنام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"گھر جاؤ۔" اس نے بھاری آواز میں کہا۔

یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"تم فوراً واپس چلی جاؤ۔" اس نے کرخت لہجہ میں گرج کر کہا۔ گرنام چپ چاپ حیرت کے ساتھ اٹھی اور گٹھڑی سر پر رکھ کر گھر کی طرف چل دی۔ جگا اسی طرح کھڑا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ لحظہ بہ لحظہ بھیانک ہوتا جا رہا تھا۔ عقاب کی چونچ نما ناک سرخ ہو گئی۔ آنکھیں خون آلود ہو کر رہ گئیں اور چہرہ سے بربریت ٹپکنے لگی ـــ معاً اس نے خنجر نکالا اور اسے مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ دانت پیستے ہوئے آہستہ سے بولا "دلیپ سنگھ؟ ـــ"

موت کا فرشتہ دلیپ سنگھ کے سر پر منڈلانے لگا۔

خونی پُل علاقہ بھر میں مشہور تھا۔

یہ پُل ایک چھوٹی سی نہر پر واقع تھا۔ نہر کے دونوں کناروں پر شیشم کے بہت ہی گھنے پیڑ تھے۔ وہاں نہ تو سورج کی دھوپ پہنچ سکتی تھی، اور نہ ہی چاند کی چاندنی۔ پل بڑے بڑے اور بھدّے پتھروں سے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے نیچے صرف ایک کوٹھی تھی۔ اور پانی دو حصّوں میں تقسیم ہو کر بہتا تھا۔ رات کے وقت یہ دو بڑے بڑے منہ ایسے دکھائی پڑتے تھے جیسے دو منہ والا کوئی دیو، انسانوں کو ہڑپ کر لینے کے لئے منہ کھولے بیٹھا ہو یا جیسے کسی مُردے کی دو بڑی بڑی آنکھیں جن کی پتلیاں کوّے نوچ کر کھا گئے ہوں۔

پاس ہی ایک قبرستان تھا۔ اور کچھ فاصلہ پر مرگھٹ۔ رات کے وقت کوئی شخص اُدھر سے گزرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کیونکہ اس پُل پر اتنے قتل ہو چکے تھے کہ اس کا نام ہی "خونی پُل" رکھ دیا گیا تھا۔ نوجوان لڑکیاں اور بچّے تو دن کے وقت بھی اکیلے اِدھر نہ آتے تھے۔ مشہور تھا کہ وہاں ایک سر کٹا سید رہتا تھا۔ کبھی کبھی اس کا سر تو پُل کے نیچے دلدوز چیخیں مارا کرتا اور وہ خود بلا سر کے نہایت اطمینان کے ساتھ قبرستان میں ٹہلا کرتا تھا۔

نصف رات گزر چکی تھی۔

دلیپ سنگھ شہر سے واپس آ رہا تھا۔ چھوٹے سے گدھے پر دو بوریوں میں سامان تھا۔ وہ سُنار کا کام بھی کرتا تھا اور پنساری کی دوکان بھی۔ اس کی اپنی تیار کردہ گلقند خوب بکتی تھی۔

وہ نوجوان تھا۔ خوش رو و خوش وضع۔ مسیں ابھی بھیگ ہی رہی تھیں۔ گالوں اور ٹھوڑی پر بالکل چھوٹے چھوٹے بال جیسے زعفران۔ آنکھیں، شربت سے لبریز کٹورے۔ سر پر اس وقت لنگی باندھے ہوئے تھا، اس کا ایک چھوٹا سا شملہ نیچے کی جانب لٹکتا ہوا اور دوسرا اوپر کی طرف اٹھا ہوا۔ الغوزے خوب بجاتا تھا۔ جب رانجھا ہیر کی شادی کے بعد اس کے ہاں بھیک مانگنے کے لئے جاتا ہے تو اس واقعہ کو وارث کی ہیر سے بڑی دردناک لے میں گایا کرتا تھا بلکہ اس میں تو دور دور تک اپنا ثانی نہ رکھتا تھا۔

دلیپ طاقتور اور دلیر نوجوان تھا۔ مگر خونی پُل کا نظارہ اور پھر اس کے ساتھ وابستہ خونی روایات اس جگہ کو اور بھی بھیانک بنا دیتی تھیں۔ رات کی تاریکی میں شیشم کے گھنے درختوں تلے نہر کے سِسک سِسک کر بہنے والے پانی کی آواز سُن کر اس کے دل کو کوفت سی ہونے لگی ــــ اس نے ذرا بلند آواز میں "چھلّی"[1] گانا شروع کر دیا۔ تاریکی اور خاموشی میں اپنی آواز سُن کر اس کو تسکین ہوئی۔

اس کا گھوڑا پُل پر سے پار ہو چکا تھا، وہ عین پُل کے درمیان میں تھا۔ دل میں شاداں تھا کہ کوئی خاص واقعہ پیش نہیں آیا۔ معاً پیچھے سے اُسے اپنی گردن میں کسی تیز شے کی چبھن محسوس ہوئی اور جیسے کوئی اس کے کُرتے کو پکڑے پیچھے کی طرف کھینچ رہا ہو ــــ اس نے گھوم کر دیکھا۔

ایک دیو ہیکل مرد پُل کی دیوار پر سے اُچکا ہوا تھا۔ اس نے اپنی چھَوی پیچھے سے اِس کی قمیص میں اَڑا دی تھی۔ اُس کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔

"تم کون ہو؟" دلیپ نے ہمّت کر کے پوچھا۔

"اِدھر آ" بھاری اور تحکمانہ آواز آئی۔

دلیپ اس کی طرف بڑھا ــــ یکایک اس نے اجنبی کو پہچان لیا۔ بولا "مجھے ایسا معلوم پڑتا ہے کہ میں نے تجھ کو کہیں دیکھا ضرور ہے۔ کیا تم وہی شخص نہیں جس نے تین سال پہلے چند اشخاص سے لڑتے وقت میرا ساتھ دیا تھا .... ہاں شاید وہ ننکانہ صاحب کا میلہ تھا۔ تبھی کا واقعہ ہے .... اور تم نے دو آدمی جان سے بھی مار ڈالے تھے۔"

"بے شک میں وہی ہوں۔ لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ تیرا نام دلیپ سنگھ تھا۔ میں تجھے ایک اجنبی اور نوعمر چھوکرا سمجھ کر تیرا مددگار بنا ــــ اور قتل تو میں نے بہت کئے ہیں، اسی پل پر گیارہ آدمی قتل کر چکا ہوں ..... اور آج مجھ کو بارھواں قتل کرنا ہے۔"

دلیپ کو اس اجنبی پر تعجب ہوا۔ بولا "میں نہیں جانتا تمہاری مجھ سے کیا دشمنی ہے، تم تو میرے محسن ہو۔"

"تو گُرنام سے محبّت کرتا ہے، جو صرف میری ہے۔ مجھ کو یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ تو نے شنگارا سنگھ کو اسی پُل پر سخت زخمی کیا تھا ــــ آج تیرا میرا فیصلہ ہو گا۔"

یہ کہہ کر اجنبی نے چھَوی ہاتھ سے رکھ دی اور اس کی طرف بڑھا۔ "....... اور میں چاہتا ہوں کہ تو ایک مرد کی طرح میرے مقابل آ جائے۔"

دلیپ پس و پیش کر رہا تھا۔ اس نے کہا "میں اپنے محسن سے لڑنا پسند نہیں کرتا۔"

---

[1] پنجاب کا ایک مشہور گیت۔

اجنبی نے گرج کر جواب دیا" تو بزدل ہے۔ یہ عورتوں کی طرح گلے میں ریشمی رومال لپیٹ کر گھومنا اور بات ہے۔ اور کسی مرد کے ساتھ دست پنجہ لڑانا کچھ اور بات ہے۔ اگر تو واقعی اپنے باپ ہی کے تخم سے ہے تو میرے سامنے آ۔" یہ کہہ کر اس نے اس کے منہ پر تھوکا۔

دلیپ کو غیرت آگئی۔ وہ شیر کی طرح بپھر گیا۔ وہ ڈنڈا جو وہ گدھے کو ہانکنے کے لئے ہاتھ میں لئے ہوئے تھا، اس نے اس کے منہ پر دے مارا۔ لیکن اجنبی نے وار روکنے کی کوشش نہیں کی۔ دلیپ نے دوسری ضرب اس کے کان پر رسید کی ڈنڈا ٹوٹ گیا۔ اس کی پیشانی اور کان سے خون بہنے لگا۔ دلیپ جوش میں تھا، اس نے پوری قوّت کے ساتھ ایک مکّہ اس کے منہ پر رسید کیا، جس سے اس کا جبڑا اپنی جگہ سے ہٹ گیا اور منہ بگڑ گیا..... مگر اجنبی نہایت سکون کے ساتھ کھڑا رہا۔

اس وقت اس کی پیشانی سے خون بہہ بہہ کر اس کی داڑھی کو تر کر رہا تھا، ایک کان کا اوپر والا حصّہ ٹوٹ کر لٹک رہا تھا اور اس میں سے خون کی دھارا چھوٹ رہی تھی۔ منہ ٹیڑھا ہو جانے کی وجہ سے اس کی صورت اور بھی بھیانک ہو رہی تھی ـــــــ مگر وہ حیرت انگیز طور پر مطمئن تھا۔

پھر اس نے دلیپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی گہری اور بھاری آواز میں کہا" اس طرح نہیں، دلیپ! تم ابھی محض بچّے ہو۔ لیکن جگّا کوئی طفلانہ حرکت نہیں کرنا چاہتا۔"

یہ کہہ کر اس نے ایک گھونسا اپنے منہ پر دیا اور اس کا جبڑا عین اصلی جگہ پر آ گیا ـــــــ دلیپ "جگّے" کا نام سن کر کچھ خوفزدہ سا ہو گیا۔

اجنبی اپنی چھوی پکڑ کر بولا" تیرے پاس چھوی ہے؟"

"نہیں"

"تلوار ہے؟"

"نہیں"

"صفاجنگ؟"

"نہیں"

"مگر لاٹھی تو ہے، وہ تیرے گدھے کی پیٹھ پر بوری میں ٹھنسی ہوئی۔"

دلیپ مارے تعجّب کے چپ چاپ کھڑا تھا۔

"جا" اجنبی نے پکار کر کہا" لاٹھی لے آ ـــــ میں نے سنا ہے کہ تو علاقہ بھر میں سب سے زیادہ تیز دوڑنے والا

جوان ہے۔ لیکن میں امید کرتا ہوں کہ تیری غیرت تجھے ایک بزدل کی موت ہرگز نہ مرنے دے گی۔"

دلیپ بہادر تھا۔ مگر اس قسم کے شخص سے آج تک پالا نہ پڑا تھا۔

جگے نے چھوی اتار کر علیحدہ رکھ دی اور صرف لاٹھی اٹھالی۔ اور وہ دونوں ایک دوسرے کو للکارتے ہوئے میدان میں کود پڑے۔

اُن کی للکار کی آواز سُن کر پرندے گھونسلوں میں پھڑپھڑانے لگے۔ گیدڑوں نے ہُوا ہُو ہُوا ہُو کا شور بلند کیا۔ چاروں طرف گرد ہی گرد نظر آنے لگی۔

لاٹھی سے لاٹھی بج رہی تھی۔ دلیپ ہلکا پھلکا چست چالاک نو آموز اور نوجوان چھوکرا۔ بجلی کی طرح بے چین، جوڑ جوڑ میں پارہ۔ جگا بھاری بھر کم، قوی ہیکل، کہنہ مشق دیو۔ باوجود موٹا ہونے کے اب بھی جس وقت سرک لگاتا تھا تو ایسا معلوم پڑتا جیسے سطحِ آب پر ٹھیکری پھسلتی ہوئی چلی جا رہی ہو۔ دلیپ نے داؤ لگا کر پہلا وار کیا۔ جگا اسے خالی دے کر چلایا "ایک"۔

دلیپ نے پھر وار کیا۔ جگا اسے بچا کر گرجا "دو"۔

دلیپ نے تیسرا وار کیا۔ جگے نے اسے بھی روکا اور کڑکا "تین"۔ یہ کہہ کر وہ آگے کی طرف لپکا "او سنبھل بے چھوکرے اب جگا وار کرتا ہے۔"

پسینہ کی وجہ سے دلیپ کے ہاتھ سے لاٹھی چھوٹ گئی۔ وہ فوراً گھبرا کر جھپٹا۔ جگے نے ایک لات اس کے پیٹ میں رسید کی اور وہ لڑکھڑاتا ہوا پل کی دیوار سے ٹکرا کر گر پڑا۔

اب جگے کے لبوں پر خونی مسکراہٹ پیدا ہوئی۔ اس نے ایک وحشی بھیڑیئے کی مانند حلق سے ایک خوفناک آواز نکالی اور پھر دونوں ایڑیاں اٹھا آگے کی طرف اُچک اس نے بھرپور وار کیا۔ دلیپ نے پھُرا سنبھالا اور چیتے کی مانند تڑپ کر ہوا میں جست کر گیا مگر کہنہ مشق استاد کا وار اپنا کام کر گیا۔ شاید پہلی صورت میں یہ وار اس کے سر کو توڑ دیتا اور لاٹھی اس کے سینہ تک پہنچ جاتی۔ مگر اب بھی لاٹھی کافی زور کے ساتھ سر پر پڑی۔ سر پھٹ گیا اور وہ تڑپ کر بارہ سنگھے کی مانند نہر کے کنارہ پر جا گرا .... کچھ دیر تک تڑپتا رہا اور پھر سرد پڑ گیا۔

گرم گرم خون بہہ بہہ کر نہر میں ملنے لگا۔ نہر کے پانی کی کل کل کی آواز ایسے معلوم پڑتی تھی، جیسے خونی پُل قہقہے لگا رہا ہو۔

قبرستان میں بوسیدہ قبروں کے روزنوں میں سے ہوا سسکیاں لیتی ہوئی چل رہی تھی۔

زرد چاند بدلی میں سے نکل آیا۔ مگر اس کی شعاعیں شیشم کے گھنے پتوں میں اُلجھ کر رہ گئیں۔

جگے نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی خون آلود پیشانی کو صاف کیا۔ منہ ہاتھ دھویا۔ کان پر پگڑی پھاڑ کر پٹی باندھی۔

اس نے دلیپ کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر دل کی حرکت سننے کی کوشش کی۔ پھر اس نے چھوی اٹھائی اور دلیپ کو پیٹھ پر لاد کر کھیتوں کی طرف چل کھڑا ہوا۔

اس واقعے کے پچیس۲۵ دن بعد!

دیہات میں شام ہوتے ہی خاموشی طاری ہو جاتی ہے۔ خصوصاً سردیوں میں تو لوگ فوراً اپنے گھروں میں گھس بیٹھتے ہیں۔

گرنام کے ہاں سب ہی لوگ اپنے اپنے کاموں سے فراغت پا کر بڑے کمرے میں بیٹھے تھے۔ عورتیں چرخہ کات رہی تھیں، بڑے بوڑھے باتوں میں مشغول تھے اور بچے شرارتوں میں مصروف۔

اتنے میں جگا اندر داخل ہوا۔

شاید ڈیڑھ برس کے بعد آج پھر اس کے مضبوط ہاتھ میں چھوی چمک رہی تھی۔ سب نے اس کو دیکھ کر اظہارِ مسرت کیا۔ گرنام حیرت سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ بے بے نے اسے بیٹھنے کے لئے کہا۔ مگر اس نے بتایا کہ اس کی ڈاچی[1] باہر کھڑی ہے اور اسے جلد ہی واپس جانا ہے۔

چند لمحوں کے لئے اس نے سکوت کیا۔ پھر اس نے نہایت مختصر اور فیصلہ کن انداز سے کہنا شروع کیا۔ "میں آپ لوگوں سے صرف اتنی بات کہنے کے لئے آیا ہوں کہ آپ گرنام کی شادی جس شخص سے کرنا چاہتے ہیں وہ ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی ——— بلکہ اس کی شادی اس شخص سے ہوگی جس سے کہ میں چاہوں گا۔"

سب لوگ حیران تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ گرنام کا ہونے والا خاوند وہ خود ہی تھا۔ مگر چونکہ انھیں یہ راز پوشیدہ رکھنے کی سخت تاکید کی گئی تھی، اس لئے وہ خاموش رہے۔

"....... اور وہ شخص یہ ہے۔" یہ کہہ کر اس نے دروازہ کی طرف دیکھا ——— اور دلیپ اندر داخل ہوا۔

ہر شخص پر حیرت زا خاموشی طاری ہو گئی۔

گرنام نہ معلوم کس دنیا میں پہنچ گئی۔ اس کو شرمانا چاہئے تھا مگر وہ اٹھ کر اس کے قریب آ گئی۔

جگے نے دلیپ کے کان میں کہا "اگر گرنام کو مجھ سے محبت ہوتی تو تم آج زندہ نظر نہ آتے۔ دلیپ! تم مرد ہو۔ میں نے اچھی طرح سے تم کو آزما کر دیکھ لیا ہے۔ میں چاہتا تو تم کو قتل کر ڈالتا۔ مگر مردوں سے مجھے محبت ہے۔ اب جبکہ تمہاری گرنام

---

[1] سانڈنی۔

تمہارے سپرد کر رہا ہوں تو امید کرتا ہوں کہ تم میرا راز ظاہر نہ کرو گے.......“

دلیپ نے تشکر آمیز نظروں سے اپنے محسن کی طرف دیکھا۔

جگّا بلند آواز میں بولا ”باپو! ہاں!! ہے ہے!!! ___ میں ان کی شادی کے لئے ضرورت سے بھی کہیں زیادہ روپیہ دوں گا۔ اور ان کو بہت سی زمین دوں گا۔“

باپو اصل قصہ بھانپ گیا۔ لیکن سب کو زیادہ تعجب اس بات پر تھا کہ دلیپ زندہ کیونکر ہو گیا۔ مشہور ہو چکا تھا کہ دلیپ کو ڈاکوؤں نے خونی پل پر قتل کر دیا تھا۔

دلیپ نے قصہ مختصر کر سنا دیا کہ خونی پل پر ڈاکوؤں نے اس کو گھیر لیا۔ اس لڑائی میں وہ سخت زخمی ہوا، اور قریب تھا کہ ڈاکوؤں کے ہاتھوں قتل ہو جاتا کہ سردار دھرم سنگھ وہاں پہنچ گئے اور وہ اس قدر تندی سے لڑے کہ ڈاکوؤں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اور ان کو بھاگتے ہی بنی۔ پھر وہ اس کو اپنے گھر لے گئے اور تیمارداری کرتے رہے۔

جگّے کی مونچھوں کے نیچے اس کے لبوں پر ایک تلخ مسکراہٹ پیدا ہوئی۔

گرنام کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

وہ مسحور ہو کر آگے بڑھی۔ اس نے جگّے کا بھدا ہاتھ اپنے کنول ایسے ہاتھوں میں لے لیا۔ پہلے اس نے جگّے کے بلند سینے اور اس کے غیر معمولی طور پر چوڑے شانوں کا جائزہ لیا اور پھر گویا مطمئن ہو کر بھرائی ہوئی آواز میں بولی ”تم کتنے اچھے ہو... تم یہیں ہمارے پاس ہی رہا کرو۔“

قریب تھا کہ جگّا چیخیں مار مار کر رو پڑے مگر جلدی سے پگڑی کے شملے میں منہ چھپا کر بگولے کی طرح دروازہ سے باہر نکل گیا۔

شادی ہو گئی ___

کچھ عرصہ بعد رات کے وقت گرنام باپو کے ساتھ گھر سے باہر کریلے کی بیل کے پاس کھڑی تھی۔ معاً دور سے غبار اٹھا۔ کچھ سانڈنی سوار نمودار ہوئے۔ ان کی سجی سجائی سانڈنیاں، مردانہ اور دیو پیکر صورتیں، چمکتی ہوئی چھویاں ___ عجب منظر پیش کرتی تھیں ___ اُن کا سالار تو غیر معمولی طور پر چوڑا چکلا شخص تھا۔ گرنام اسے دیکھتے ہی چلا اٹھی ”باپو! وہ کون لوگ ہیں؟ ___ یہ سب سے آگے والا شخص تو دھرم سنگھ دکھائی پڑتا ہے۔“

”نہیں بیٹی نہیں، وہ دھرم سنگھ نہیں“۔ یہ کہہ کر اس نے اپنی پوتی کا سر سینہ سے لگا لیا ___ اور پھر ببول کے درختوں کے جھنڈ میں غائب ہوتے ہوئے سانڈنی سواروں کی طرف خواب ناک نظروں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑایا۔ ”آج جگّا ڈاکو ڈاکہ ڈالنے کے لئے جا رہا ہے۔“

بلونت سنگھ

عہدِ نو میں ملازمت کے تئیس مہینے

دار السلطنت کی اس نسبتاً سنسان سڑک پر سے میں قریب قریب ہر روز گزرتا تھا۔ اس کے دونوں جانب کوٹھی نما مکانات کے سلسلے دور تک چلے گئے تھے۔ ان کے چھوٹے چھوٹے پھاٹک تھے اور ان پر نمبر لکھے تھے۔ دو رویہ درخت یوں دکھائی دیتے تھے جیسے دل برداشتہ، سرنگوں کھڑے ہوں۔ کبھی کبھی رنگین آنچل یا خشک پتے، سڑک پر بچھی ہوئی سرمئی بجری پر سرکتے، گھومتے اور پھڑپھڑاتے نظر آجاتے۔

یہ سڑک عام طور سے اداس اور ہرہنگامے سے دور رہتی تھی، یہاں مجھے چوکنا ہو کر چلنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اس لیے یہ سڑک مجھے محبوب تھی۔

میں نے ملازمت کے لیے درخواست دے رکھی تھی اسی سلسلے میں مجھے یہاں ایک سردار صاحب سے ملنا ہوتا تھا۔ ان سے بعض مفید معلومات حاصل ہو جاتی تھیں۔ میری نظر کے سامنے عظیم الشان دوکانوں کی قیمتی اشیاء رقص کرتیں۔ ملازمت ملے گی تو میں انھیں خرید کر اپنا سکوں گا یہ طفلانہ خیال زیادہ مدت تک میرا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ سردار صاحب سے ملاقات کے دوران میں مجھے ان مشکلات کا احساس ہوتا جو قریب قریب ناقابل عبور تھیں۔ لوٹتے وقت میں عجیب عجیب حرکتوں سے اپنا دل بہلانے کی کوشش کرتا۔ زمین کی جانب دیکھتے ہوئے میں چھوٹے چھوٹے قدموں سے بڑی تیزی سے چلنے لگتا۔ اور یہ محسوس کرنے کی کوشش کرتا جیسے میں ہوا میں اڑا جا رہا ہوں، جیسے اس سخت اور بوجھل زمین سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں اس سے قطعاً الگ تھلگ ہوں ۔۔۔۔۔۔ میں آسمان کا باشندہ ہوں ۔۔۔۔۔۔ لیکن زندگی کے حقائق بھلا کب تک خیالی دنیا میں رہنے دیتے ہیں۔

اس ہیراپھیری کا ایک رنگین پہلو بھی تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔ ایک لڑکی! جس سے فلرٹ کرنے کی مجھے کبھی جراءت تک نہ ہوتی تھی۔

آج آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں اسی سڑک پر گامزن تھا۔ جب پھاٹک میں داخل ہوا تو حسب معمول غیر دوستانہ ماحول نے میرا استقبال کیا۔ ڈھیلے ڈھالے گوبر کی طرح پھیلے ہوئے مکان، کھڑکیوں کے پٹ یوں کھلے ہوئے تھے جیسے وہ مجھے دیکھ کر ہکابکا رہ گئی ہیں ۔۔۔۔۔۔

سب سے پہلے مجھے وہی لڑکی دکھائی دی ۔
میں نے اسے اچھا شگن سمجھا ۰۰۰۰۰۰۰ اس کا رنگ نکھرا ہوا تھا اور نوک پلک درست ۔ لیکن خاص قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس کا شمار ان عورتوں میں کیا جا سکتا تھا جنھیں پنجابی میں دھواں کہتے ہیں ۔ عجیب پر چیلنج تیور تھے اس کے ۔ اس کے بدن کے ہر عضو کی الگ ہستی تھی ۔ وہ آپس میں گڈمڈیا گتھم گتھا نہیں ہو رہے تھے ۔
میری آمد و رفت سے اسے کوئی دلچسپی نہیں تھی ۔ وہ اپنے آپ ہی میں سرشار رہتی ۔ جانو ہمالہ پربت کی کسی چوٹی پر بیٹھی ہے اور سچے ساجن سے لو لگائے ہے ۔
سردار صاحب مکان کے دوسرے ونگ میں رہتے تھے ۔ میں ادھر بڑھا تو بچے مجھے دیکھتے ہی اندر چلے گئے اور چلانے لگے ۔
"وہ آیا ہے وہ آیا ہے" ۔
"کون آیا ہے ؟" دغدغے دار آواز میں سوال گونجا
"جو روز آتا ہے" ۔
باہر ٹٹی کی موری کے پاس مجھے کرسی بچھا دی گئی ۔ جب میں ہر رنگ کی بدبو سونگھ چکا تو سردار صاحب ڈاڑھی پر ٹھاٹھا کستے ہوئے باہر نکلے ۔
میں نے جلدی سے اٹھ کر دونوں ہاتھ جوڑ دیئے ۔ "ست سری کال اے جی" ۔
"ست سری کال" ۔
وہ موٹے تو خیر تھے ہی لیکن انھیں موٹا کہہ دینے سے ہی ان کی شخصیت اجاگر نہیں ہوتی ۔ میں نہیں جانتا کہ ان کا حلیہ کن الفاظ میں بیان کروں ۔ اس لیے اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑے دیتا ہوں ۰۰۰۰۰۰۰۰۰۰ لیکن ان کی مونچھوں کے بارے میں خاموشی اختیار کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے ۔ ان کی مونچھوں کے بال فوارے میں سے نکلتے ہوئے پانی کی دھاروں کی طرح بے دریغانہ آگے کو بڑھ کر بڑی سنجیدگی سے سرنگوں ہو گئے تھے ۔ بولتے تو پہلے بات مونچھوں کی تاریک بھول بھلیوں میں سرگرداں رہتی ۔ بالآخر جب اس پنجرے کو توڑ کر نکلتی تو بال یوں پھڑ پھڑاتے جیسے بات کا تعاقب کر رہے ہوں ، لیکن بالآخر بے نیل و مرام واپس اپنی جگہ پر پہنچ کر دم بخود رہ جاتے ۔
میں نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں اور مونچھوں میں مونچھیں ڈال کر ہچکچاتے ہوئے پوچھا

"سناؤ جی کوئی کھبر؟"
انھوں نے میرا سوال سن کر پہلے ٹٹی کی موری کی طرف ، پھر مجھے ، اور بعد ازاں آسمان کی

جانب دیکھا اور پھر دفعتاً مجھ سے مخاطب ہو کر بولے ۔ " دیکھو جی ! لیس اپنے سکھ بھرا ہو ۔ پاکھستان توں آئے او ۔ بوہت دکھی او ••••••• میں تساں نو دسناں آں کہ اک مسٹر گورکھ ہین ۔ اگر جی او نہناں تائیں تھاڈی پہنچ ہو وے تاں جی کچھ کر لو جی مگر جی •••••••••"

"جی حد ہو گئی ••••••••" میں نے خوش ہو کر کہا ۔ " گورکھ تاں ساڈی اونی ور سٹی وچ پڑھانداسی جی ••••"

" بچھاجی "

سردار جی کی مونچھیں متواتر بل رہی تھیں ۔

میں نے مزید اطمینان کے لیے پوچھا ۔ " تاں گویا گورکھ داجور چل سکدا اے ؟ "

" باؤجی! او ہ بوہت کج کر سکدے ہین " ۔

میں نے دونوں ہاتھ مچھر مارنے کے انداز میں بجاتے ہوئے کہا ۔

" بچھاجی •••••••• ست سری کال "

" ست سری کال "

(۲)

اپنے شہر پہنچ کر میں نے والد صاحب کو گورکھ کے بارے میں بتایا تو وہ بولے " ان سے مل لیں گے " ۔ میں نے یہ کہ کر شبہہ دی کہ دوسرے کنڈی ڈیٹوں کے باپوں نے بھی ان سے ملاقات کی ہے یا خطوط لکھے ہیں " ۔

والد صاحب میری ادبی لنترانیوں سے بری طرح تنگ آچکے تھے ۔ پہلے پہل لڑکپن میں میری ادبی حرکتوں کو انھوں نے دلچسپی کی نظر سے دیکھا تھا ۔ لیکن بعد میں جب انھوں نے محسوس کیا کہ میں تو محض 'بادب' ، ہو کر رہ گیا ہوں تو چشم زدن میں ہم دونوں کے درمیان ایک خلیج سی حائل ہو گئی ۔

بی ۔ اے کا نتیجہ نکلا تو میں نے تھرڈ ڈویژن کی فہرست چھان ماری ، اپنا رول نمبر نہیں دکھائی دیا تو مایوس ہو گیا ۔ ایک دوست نے مشورہ دیا کہ سیکنڈ ڈویژن کی فہرست پر نگاہ ڈال لو ۔

یہ سن کر میں نے اس پر میلوڈرامیٹک سی نظر ڈالی تو اس نے مزید ڈھارس بندھائی ۔

" ممتحن بھی تو غلطی کا شکار ہو سکتا ہے " ۔

لیکن میں نے دل میں سوچا ، (بھلا میں کہاں کا شکاری ہوں جو ممتحن میری غلطی کا شکار ہو جائے گا) ۔ •••••••• لیکن میرے مہربان کا شبہ درست نکلا ••••••

والد صاحب کو نتیجے کے بارے میں معلوم ہوا تو انھیں حیرت ہوئی ۔ حیرت رفع ہوئی تو مجھے طلب فرمایا اور پوچھا ۔

"اب کیا ارادہ ہے "

" جو آپ فرمائیں " ۔

"فوج میں بھرتی ہو جاؤ " ۔

ان دنوں دوسری جنگ عظیم زوروں پر تھی ۔ بھلا میں فوج میں کیونکر بھرتی ہو سکتا تھا ۔ ہمارے سب قومی لیڈر انگریز کی جیل میں تھے اور میں نوکری کروں ۔ میرا وطن غلام رہے اور میں اپنے حاکموں کی بہتری و بہبودی کے لیے لڑوں ؟

والد صاحب نے نتیجہ برآمد کیا ۔ تو یوں کہو کہ تم بزدل ہو ۔ بیٹا ؟ جب لڑائی ختم ہوگی تو اس وقت تم اونچے درجے پر پہنچ چکے ہو گے ۔ "

میں نے ان کی نصیحتوں کو اس کان سے سنا اور اس کان سے اڑجانے دیا ۔ چنانچہ تقسیم ہند تک آپس میں جی بھر کے جوتوں میں دال بٹا (سکھوں میں دال کے بجائے دالا بٹتا ہے)

لیکن یہ نیا موقع پاکر والد صاحب نے مجھے للکارا ۔ اور میں پورے چار مہینے تک دارالخلافے کی خاک بسرو چشم چھانتا رہا ۔ یہاں تک کہ گورکھ والی خبر میں نے والد صاحب کے کانوں تک پہنچائی ۔

پہلے میں خود گورکھ سے ملنے کے لیے گیا اور جاتے ہی کہا ۔ " جناب مدت سے آپ کے نیاز حاصل نہیں ہوئے ۔۔۔۔۔۔ کل شام ہی ۔۔۔۔۔۔۔ سے آیا ہوں سوچا آپ کی زیارت ۔۔۔۔۔۔ "

اس کے بعد میں نے انہیں دعوت دی کہ ایک شام ہمارے یہاں چاء یا کوئی اور مائع شئے پینے کے لیے تشریف لائیں ۔ والد صاحب کو بھی آپ سے ملنے کا اشتیاق ہے ۔ کہتے ہیں مدت سے درشن نہیں ہوئے آپ کے ۔ "

گورکھ جی نے میری ڈاڑھی کو بڑی ناقدانہ نظروں سے دیکھا اور جواب دیا ۔

" بہتر آئیں گے ۔ "

جب آئے تو شنبھی کرتا، غبارہ سی دھوتی، بالوں میں چکناہٹ، لبوں پہ مسکراہٹ

والد صاحب اور گورکھ صاحب کے مابین قریب قریب فرشی سلاموں کا تبادلہ ہوا ۔ کافی لے دے اور پکڑ دھکڑ کے بعد دونوں بزرگ میرامن کے درویشوں کے انداز میں ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہو بیٹھے ۔

" چاء ؟ "

"اجی صاحب ۰۰۰۰" گورکھ بہ ہزار خرابی شرمائے۔
ہم نے مدعا پالیا۔ فوراً مائع شئے ان کے روبرو رکھی گئی۔ وہ مائع شئے کے روبرو اور دونوں کے تیور قابل دید۔
موقع و محل کو موافق پاکر والد صاحب نے مطلب کی بات کہہ ڈالنے کے لیے ارادے سے جو پہلو بدلا تو گورکھ نے یہ کہہ کر ان کا وار خالی کر دیا۔
"اجی صاحب! ۰۰۰۰۰ گزشتہ شب کا ذکر ہے آدھی رات ادھر اور آدھی رات ادھر ۰۰۰۰ معشوق ادھر اور ہم ادھر بس صاحب ۰۰۰۰۰ اسی عالم میں چند رباعیاں موزوں ہو گئی تھیں۔ عرض کرتا ہوں۔"
(پھر ان کی آواز کا شور یوں بلند ہوا جیسے بل ڈوزر Bull Dozer کے ذریعے سے مرا ہوا ہاتھی شارع عام سے ہٹایا جا رہا ہے۔)

(۳)

انٹرویو کے ایر کنڈیشنڈ کرے میں سے جو میں بوکھلا کر نکلا تو سیدھا اپنے ڈیرے کی جانب بھاگا بعد میں معلوم ہوا کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئیے۔ کیونکہ بعض اوقات امیدوار کو دوبارہ بھی بلالیا جاتا ہے۔
میں تانگے میں سوار تھا۔ گھوڑا تیز رو تھا۔ ظاہر تھا کہ وہ مجھے بہت جلد منزل مقصود تک پہنچا دیگا لیکن میں اس قدر پریشان اور مایوس سا تھا۔ اس وقت جب کہ موسم گرما کا آفتاب نصف النہار پر تھا میں چاہتا تھا کہ دفعتاً اس طاقت ور گھوڑے کے نتھنوں میں سے آگ کے شعلے نکلنے لگیں اور اس کے سموں تلے سے چنگاریاں اڑنے لگیں اور تانگہ قدیم بابل کے کسی پرشکوہ بادشاہ کا رتھ بن جائے اور سامنے کے برگد کے پیڑ تلے زمین دوز شاہراہ پر دوڑتا ہوا یہ رتھ مجھے پاتال کی خواب ناک روشنی میں اپنی سیج پر نیم دراز حسن کی دیوی نو خیز اشطر کے قدموں میں ڈال دے یا پھر یہ رتھ سطح زمین سے اوپر کو اٹھ جائے اور یہ منہ توڑ گھوڑا آفتاب عالم تاب کی نگاہوں سے نگاہیں لڑانے لگے۔ سورج اپنی شعلہ سی زبان سے خبردار خبردار پکارے۔ لیکن ہم ایک بار تو اس کے جلتے ہوئے سینے سے ٹکر لے ہی لیں۔
دماغ غیر حاضر تھا بس ایک آنکھوں میں دم تھا۔ جب میں نے غیرآباد بازار کے ایک گوشے میں انسانی جبڑوں کی چند تصاویر اور نقشے دیکھے تو دفعتاً مجھے چینی لڑکی ای ٹسو کا خیال آیا جسے میں آئٹ سی کہا کرتا تھا۔
اس لڑکی کی ماں جو میڈم کہلاتی تھی دندان سازی کا کام کرتی تھی۔ ان سے میری ملاقات

ذرا دلچسپ طریقے سے ہوئی ۔ ایک روز دس بجے کے قریب جب میں ناشتہ کرنے کے بعد باہر جانے لگا تو اتفاقاً آئینہ دیکھتے وقت مجھے ایک داڑھ کے اوپر کا داغ دکھائی دیا ۔ میں ڈرا کہ شاید کیڑا لگ گیا ہے ۔ بارہا اس چینی دکان کے آگے سے گزرنے کا اتفاق ہو چکا تھا ۔ سوچا میڈم کو دکھاؤں میڈم نے بڑی آؤ بھگت سے مجھے مخصوص کرسی پر بٹھلایا ۔ ڈاڑھ دیکھ کر اظہار تشویش کیا اور رائے دی کہ اس ڈاڑھ کو فوراً نکلوا دیا جائے تاکہ باقی دانتوں پر اس کا اثر نہ پڑے ۔ فیس فی ڈاڑھ نکلوائی دو روپے ۔

عجیب بات یہ تھی کہ مجھے نہ کبھی درد ہوا تھا نہ پہلے کبھی یہ نقص دکھائی دیا تھا ۔ چھوٹا سا آئینہ لیکر میں دکان سے باہر جا کھڑا ہوا اور ڈاڑھ کو غور سے دیکھنے لگا ۔ انگلی کے سرے سے کریدا تو کالی مرچ کا چھلکا پھسل کر الگ ہو گیا ۔ یہ دیکھ کر آئٹ سی ہنستے ہنستے دہری ہو گئی ۔ میڈم کو مایوسی ہوئی ۔ ان کی تشخیص غلط ثابت ہوئی تھی اور دو روپے ہاتھ سے گئے سو الگ ۔

اس روز میں نے آئٹ سی کو غور سے دیکھا ۔ عمر بارہ سے اوپر ، چینی طرز کا چھوٹا سا پھولدار کرتہ ، اونچا پائجامہ ، لمبے کالے اور سیدھے بالوں کی ڈھیلی ڈھالی چوٹی ۔ اس کی ہنسی کی جلترنگ ہمیشہ بجتی رہتی تھی ۔ غیر مانوس خد و خال کے باوجود بڑی پیاری بچی دکھائی دیتی تھی ۔ اس کا ایک چھوٹا بھائی تھا جو بے حد شریر اور چونچال تھا ۔ اس کا نام تھا آہ چونگ ۔ اس دن کے بعد میری ان کے یہاں آمد و رفت شروع ہو گئی ۔

میں نے تانگہ رکوایا اور تانگے میں بیٹھے بیٹھے دکان میں جھانکا ۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھے اس قدر بڑھیا تانگے سے اترتے دیکھ لیں ۔ میری مراد بر آئی ۔ جب میں کرایہ دے چکا اور تانگہ آگے بڑھ گیا تو میں نے آئٹ سی کی ننھی ننھی تار اسی آنکھیں خوشی سے چمکتی دیکھیں ۔ ادھر سے میڈم بھی چھجے تلے آکھڑی ہوئی تھی انھیں مجھ پر رشک ہو رہا اور مجھے ان پر ۔ ان کی اس چھوٹی سی لیکن پر سکون دنیا پر ۔

میں تین تختے کی سیڑھی چڑھ کر ان کی دکان میں لوہے کی گرم گرم کرسی پر بیٹھ گیا ۔ انٹرویو کے سرد کمرے کے بہ نسبت ان کی دکان کی گرم فضا کہیں زیادہ پر سکون اور روح پرور تھی کتنے مہینوں سے بلکہ کتنے تھکا دینے والے طویل برسوں سے میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہا تھا ـــــــــــــــ اور اب میں کس قدر تھک گیا تھا ـــــــــــــــــ

شدت کی پیاس لگ رہی تھی ۔ اس وقت میں آہ چونگ کے مشین سے کٹے ہوئے بالوں والے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا ۔ اپنے سر پر لمبے لمبے بالوں کی وجہ سے مجھے اس کے رگڑوم رگڑا سر پر ہاتھ پھیرنے سے ناقابل فہم لذت کا احساس ہو رہا تھا ۔

میں شربت پینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ تنہا پینا مناسب نہیں تھا۔ اس لیے حساب لگا رہا تھا کہ کل کتنے پیسے خرچ کرنے پڑیں گے۔ پوچھنے پر میڈم انکار کر دیا کرتی تھیں۔ کہتیں آئٹ سی کو پلا دیجیے لیکن آئٹ سی نے رازدارانہ لہجے میں مجھے بتایا کہ اگر میں شربت کا گلاس اس کے ہاتھ میں چھوڑ کر چلا جاؤں تو میڈم تھوڑا سا شربت چکھنے میں چنداں ہرج نہیں سمجھتی تھیں۔ ادھر آئٹ سی کو بہت دھیرے دھیرے ایک ایک گھونٹ پی کر مزا آتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ شربت کے گلاس کی لذت سے محروم رہے۔ اس لیے میں نے یہی طے کیا کہ میڈم کو ضرور بہ اصرار شربت پلاؤں گا۔ جب میں نے اصرار کیا تو میڈم نے ناک کی نوک پر اٹکے ہوئے چشمے کے شیشوں کے اوپر تلے سے جھانک کر پوچھا۔

"کیوں نوکری مل گیا ہے کیا؟"

ان سب کو معلوم تھا کہ مجھے نوکری ملنے والی ہے اور میں بڑا آدمی بننے والا ہوں۔ میں نے جواب دیا۔

"میڈم نوکری اس قدر آسانی سے نہیں مل سکتی اور اگر مل ہی گئی تو میں آپ کو ایک گلاس شربت پر نہیں ٹالوں گا۔"

"تو کیا کرو گے اس روز؟"

اس روز آپ کو مٹھائی کھلائی جائے گی۔ ممکن ہے کہ سینما بھی دکھایا جائے ــــــ آپ سب کو سینما والی بات پر آئٹ سی اور آہ چونگ تالیاں بجا کر اچھلے۔

میڈم خوش ہو کر شربت پینے پر راضی ہو گئیں۔ اور میں نے ان کو خوشی کی خوشی میں چار گلاس شربت کا آرڈر دے دیا۔ اور جب آئٹسی اور آہ چونگ قریب والی دکان سے ہاتھوں میں دو دو شربت کے چھلکتے ہوئے گلاس تھامے رقصاں قدموں سے آرہے تھے تو ان کے ابھرے ابھرے گالوں اور بادامی آنکھوں میں سے ہنسی پھوٹی پڑتی تھی۔ جیسے سچ مچ مجھے نوکری مل گئی تھی۔

(۴)

مجھے ملازمت مل گئی۔

اس سلسلے میں مجھے دو باتوں کا علم ہوا۔ پہلی بات یہ کہ میں تین کامیاب امیدواروں میں اول رہا ہوں۔ دوسری بات یہ کہ مجھے فوراً دفتر میں حاضر ہو جانا چاہیے۔ کیونکہ جو شخص سب سے پہلے پیش ہو گا وہی سینیر مانا جائے گا۔

(میں فوراً ایڈمنسٹریشن آفیسر سے ملا جو ذرا معشوق ٹائپ، متلون مزاج انسان تھا۔ اس نے وہ کمرہ دکھایا، جس میں مجھے بیٹھنا تھا، کام کرنا تھا ــــــــــ اور اداس ہونا تھا)۔

یہ کمرہ قریب قریب بیس فٹ لمبا اور دس فٹ چوڑا تھا۔ ایک طویل و عریض ہال کو لکڑی کے تختوں کے ذریعے ایسے ایسے کئی کمروں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ کمرے کے عین بیچوں بیچ میری میز لگا دی گئی۔ جب کرسی پر بیٹھا تو یوں محسوس ہونے لگا جیسے لق و دق صحرا میں بیٹھا ہوں۔ لیکن برآمدے میں تیزی سے چلتی ہوئی زلف بردوش لڑکیوں کی جھلک دکھائی دی تو معلوم ہوا کہ اس ویرانے میں، رنگ و بو کا بھی گزر ہے۔ میں نے اپنی میز اور کرسی ایک گوشے میں لگا دی اور اپنے سامنے پھیلے ہوئے کمرے کا پھر سے جائزہ لینے لگا۔ یہاں چند دن تک میرے کو لیگ بھی بیٹھنے والے تھے۔

(معاً دروازے میں ایک جٹادھاری جن نما صورت دکھائی دی۔ جٹاؤں میں گرد، ڈاڑھی میں خاک، آنکھیں تابناک، حیثیہ زیب تن، ایسی ویران صورت دیکھ کر ایک بار تو چھکے چھوٹ گئے۔ لیکن میں نے جلدی پہچان لیا کہ وہ میرے نہایت دیرینہ دوست شری بھکشوجی ہیں)۔ نوکری سے پہلے وہ سب کے دوست تھے۔ زمین کے دوست سڑکوں کے دوست، پیڑوں کے دوست، سنسان راہوں کے دوست، دوستوں کے دوست، دشمنوں کے دوست اور اب؟ وہ اپنے دوست آپ تھے --------- نمبر ایک گزیٹیڈ آفیسر -- اور میں نمبر ۲۔

یہ محسوس کر کے کہ میں نے انھیں پہچان لیا ہے (انھوں نے ترکی مرغ کی طرح جھوم کر ہاتھ آگے بڑھایا اور اس شان سے چلے کہ ہاتھ آگے آگے اور خود بادل نخواستہ پیچھے پیچھے۔ میں نے فوراً کرسی سے دو انگل اوپر اٹھ کر ان کے ہاتھ کو دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا)۔

" بڑی خوشی ہوئی جی۔ یہ کہہ کر انھوں نے میری جانب یوں دیکھا جیسے یہ جاننے کی کوشش کر رہے ہوں کہ کہیں میں نے ان کے دل کا حال تو نہیں پا لیا۔

کرسی پر بیٹھتے ہی انھوں نے حسب عادت پہلے تو ایک ہاتھ سے جوتوں کو سہلایا اور پھر ڈاڑھی لہرا کر کہا۔ "یار جی بوہت اچھا ہوا تم ہمارے پاس آگئے"۔

اس کے بعد ادھر ادھر کی باتیں ہونے لگیں پھر انھوں نے نہایت رازدارانہ لہجے میں سر آگے کو بڑھا کر کہا۔ دیکھو یہاں سے تین رسالے نکلنے والے ہیں۔ ایک ادبی، دوسرا سیاسی، تیسرا بچوں کا۔ تم ادبی رسالے کی ادارت سنبھالنا۔ اس لیے کہ تم اس کام کو بہتر طور پر انجام دے سکتے ہو اور پھر اس کی اہمیت بھی سب سے زیادہ ہے۔ (یہ کہ کر انھوں نے کچھوے کی طرح گردن سکیڑی یہاں تک کہ گنجان لہراتی ہوئی ڈاڑھی اور جٹاؤں میں سے ان کی بڑی بڑی آنکھیں چمکتی رہ گئیں۔) مجھے متاثر کرنے کے لئے کچھ دیر تک اسی آسن میں رہے اور پھر بٹوے کی طرح ہونٹ سکوڑ کر گردن آگے کو بڑھائی۔ " اور میں اس وقت تم لوگوں کے سیکشن کا انچارج بھی ہوں۔ یہ کہ کر وہ

اپنی گردن کو کھینچ کر انتہائی بلندیوں پر لے گئے ۔ اس وقت ان کی پیشانی پر چند نہایت اہم بل تھے

(میں نے اظہار مرعوبیت کیا ۔ بڑی مشکل سے انھوں نے سر کو بلندیوں سے نیچے اتارا ۔
"--------- اور میں لکھ کر " کلجگ " کی ادارت تمہارے سپرد کیے دیتا ہوں ۔ "
انہوں نے اپنا وعدہ پورا کیا اور وہ کاغذ میرے کولیگوں میں سے ایک نے چرا لیا ۔

(۵)

حضرت نقش --------- میرے بعد آئے ۔ وہ میرے کولیگ نمبر ایک تھے ۔
ان کا قد ٹھگنے سے کچھ اوپر ۔ عمر چالیس کے لگ بھگ ، منہ میں دانت اور پیٹ میں آنت سلامت ، چہرہ گل ، آنکھیں ٹن ، سر پہ بال خال...... وہ نوکری مل جانے پر خوش تھے ۔ (ہم دونوں میں فرق یہ تھا کہ مجھے یہ نوکری بیک جست ملی تھی اور انھیں بیس برس تک کام اس دشت کی سیاحی کے بعد) ۔ ان کا نام نیک ، کام شعر گوئی ، تخلص نقش کرتے تھے ، محفل میں ترنم سے پڑھتے تھے ۔

ان کے بعد کولیگ نمبر دو آئے یعنی حضرت فگار ۔ (موچھیں جیسے نتھوں سے تار کول بہہ نکلا ہے نوجوان جوان فکر ، مفکر جہاں ، پیشانی تابناک ، آنکھیں غم ناک ، ناک نم ناک ، دونوں کولیگ شاعر ابن شاعر تھے ۔)

بوس BOSS پیر مغاں نکلے ۔ آتے ہی کمرے میں گھس گئے ۔

میں نے پاس جاکر سلام کیا ۔ فوراً کھڑے ہو کر جواب دیا اور ہاتھ ملایا ۔ معلوم ہوا کہ پیشہ آبا سپہ گری تھا لیکن خود شعر گو ٹھہرے ۔ میں نے قدرتی طور والد صاحب کے نام کے حوالے سے اپنا تعارف کروایا تو کلوں میں پان کی پیک روکتے ہوئے بولے ۔ "جی ہاں میں ان سے اچھی طرح واقف ہوں ۔ بڑے نفیس انسان ہیں ۔ "

ہم دونوں ڈائریکٹر صاحب سے ملنے چلے ۔

ڈائریکٹر صاحب بنگالی تھے ۔ نہایت ہی شریف النفس ، اس دفتر میں بڑے بڑے طرّے خاں انھیں گھیرے ہوئے تھے ۔ نقار خانے میں طوطی کی مانند تھے ۔

اچھا تو آپ نے رہائش کا کیا انتظام کیا ہے ؟ "

"ابھی تو کچھ نہیں کیا ۔ "بوس سر ہلایا ۔

"یہاں کی رہائش کی بڑی دقت ہے ۔ لوگ کہتے ہیں کہ نوکری آسان ہے لیکن مکان ملنا مشکل ۔ "ڈائریکٹر صاحب نے نرمی سے قہقہہ لگایا ۔

بوس نے سپاہیانہ تجسس سے ڈیڑھ پسلی کے بنگالی بابو کو نظروں ہی نظروں میں تول کر جواب دیا ۔ بس صاحب نواب چنو پودی کو پکڑوں گا یا مہاراجہ بٹالہ کو ------- ان کے مہمان خانے تو کہیں نہیں گئے ۔"

یہ سن کر میں سمجھ گیا کہ بوس پورا ایملاجٹ ہے ۔

میرے دونوں ساتھیوں کو بھی میرے ساتھ جگہ ملی ۔ ایک گوشہ میں تو میں پہلے ہی سے گوشہ گیر تھا دوسرے کونے پر نقش صاحب نے قبضہ جمالیا ۔ اور بیچوں بیچ فگار صاحب معلق تھے ۔

شروع شروع میں ہم یوں ملے جیسے سانڈ ٹکراتے ہیں ۔ بڑی گرد اٹھی ۔ خوب پسینے چھوٹے تو تو میں میں ہوئی ۔۔ ہم لوگوں میں جناب نقش صاحب صحیح معنی میں گھسے ہوئے تھے ۔ لیکن ان کی روح کی پاکیزگی سلامت تھی ۔ حضرت فگار صاحب گھس رہے تھے اور میں ناقابل گھس تھا ۔

پہلے پہل کوئی کام نہیں تھا ۔ ہم ایک دوسرے کو کچوکے دیتے اور لیتے رہتے ۔ ایک دوسرے کی چیزوں کا جائزہ لیتے رہتے ۔ کس کے پاس کیسی میز ہے ۔ کیسی کرسی ہے ۔ میز پر کس قسم کی اسٹیشنری ہے ۔

نقش صاحب ہم میں بزرگ تھے اس لیے بعض اوقات بڑی دور کی کوڑی لاتے ۔ ایک روز دیکھا گیا کہ وہ باہر سے آئے اور بڑی سبک رفتاری سے اپنی میز کی جانب بڑھے اور پھر رومال کی اوٹ میں سے ایک گول سی چیز نکال کر بڑی پھرتی سے میز پر رکھ دی ۔

حالانکہ انھوں نے کمال احتیاط سے کام لیا تھا ۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہم دونوں کی متجسس نظروں سے یہ چیز کہاں چھپی رہ سکتی تھی ۔ چندے ہم دم بخود بیٹھے رہے ۔ پھر فگار صاحب سے نہ رہا گیا ۔ بڑے زور سے کھنکارتے ہوئے کلبلا کر اٹھے اور بلغم تھوکنے کے لئے سیدھے باہر نکل گئے اور واپسی پر نقش کی میز کے ارد گرد منڈلانے لگے ۔ عینک کو اوپر تلے کرکے اس گول چیز کو بغور دیکھنے لگے ۔ موقعہ غنیمت جان کر میں بھی اٹھا اور بے تعلقی سے ان کی جانب بڑھا ۔

"نقش صاحب! یہ کیا ہے ؟"

اس پر نقش صاحب نے اپنا ٹنڈ سا سر اوپر اٹھایا اور فگار صاحب کی طرف یوں دیکھا جیسے دنیا کا غبی ترین انسان ان کے سامنے کھڑا ہے ۔ پھر بے کیف آواز میں بولے " گھنٹی ہے ۔ "

فگار صاحب نے ان کی آتش نگاہی کی جانب مطلقاً دھیان نہیں دیا ۔ بلکہ ایک ہاتھ پتلون میں ڈال کر اور زیادہ ایٹ ایز ہوگئے اور دوسرے ہاتھ کی بال دار انگلی بڑھا کر گھنٹی کے گنبد پر اٹھی ہوئی ننھی سی ڈوڈنی کو چھو کر بولے ۔

"اسے دبانے سے بجتی ہوگی؟"
نقش صاحب نے ان کی کم فہمی سے اکتاکر بڑے مبالغے سے خون کا گھونٹ پیا اور غراکر جواب دیا۔

"جی ہاں" اور پھر میز پر پڑے ہوئے کاغذات پر جھک گئے۔
اسی اثنا میں میں بھی قریب پہنچ گیا۔ نئی طرز کی گھنٹیاں دیکھنے میں آئی تھیں لیکن ایسی گھنٹی کبھی نہ سنی (یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی برہماچی کے کسی بگوڈے کی کسی قدیم دیوی کی آنکھ بچاکر اٹھالایا) ہے۔ ذرا انفرادیت پیدا کرنے کے لیے نقش صاحب نے دفتر والوں سے گھنٹی کے لیے اصرار کیا تھا اور انھوں نے راہِ فرار نہ پاکر دفتر کے آثارِ قدیمہ میں سے یہ گھنٹی دے کر جان چھڑائی تھی۔
نقش صاحب کا موڈ بگڑا پاکر میں چپ چاپ لوٹنے لگا (تو نگار صاحب نے میری آستین کھینچ کر منہ کے گوشے میں سے چھوٹی سی جیبھ نکال کر ایک آنکھ بند کی اور ناک کے راستے سے نقش صاحب کو ایک بے ضرر سی گالی دی)۔ اس کے بعد ہم دونوں اپنی اپنی کرسیوں پر آ بیٹھے۔
نقش صاحب بظاہر اپنے کام میں مصروف تھے۔ لیکن ان کے چہرے سے یہ بات تو صاف عیاں تھی کہ وہ ہمیں غچہ دے کر پھولے نہیں سمارہے وہ یہ بھی جانتے تھے کہ ہم دونوں جی ہی جی میں پھنک رہے ہیں اور ہمیں مزید جلانے کے لیے انھوں نے گھنٹی پر ہاتھ مارا۔ اس میں سے نہایت مسکین "ٹن" کی آواز نکلی۔
پھر نقش صاحب چپراسی کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔
ہم بھی منتظر تھے۔ لیکن چپراسی نہ آیا۔
انھوں نے دوبارہ ہاتھ مارا۔ نتیجہ صفر۔
تیسری بار انھوں نے مسلسل ہاتھ پٹخا۔ لیکن چپراسی کو نہ آنا تھا نہ آیا۔
اس پر نگار صاحب نے بکمال سنجیدگی رائے دی "قبلہ! گھنٹی اٹھاکر لے جائیے اور چپراسی کے کان میں بجائیے ـــــــ"
نقش صاحب نے یہ بات سنی اَن سنی کر دی اور زیرِ لب بڑبڑائے۔ وہ الو کا پٹھا باہر ہوگا ہی نہیں۔"
بہ نفسِ نفیس باہر گئے تو دیکھا چپراسی دروازے کے قریب دیوار سے ٹیک لگائے اسٹول پر بیٹھا ہے۔ پھر کیا تھا، برس پڑے۔
چپراسی راولپنڈی کے علاقے کا لمبا تڑنگا رفیوجی تھا۔ وہ باہیں ہلا ہلا کر بڑے زوردار لہجے

میں اپنی صفائی پیش کرتا ہوا اندر چلا آیا۔ نقش صاحب زچ ہو کر بولے۔
"اوے میں تینوں کجھایا وی سی ------- "
فگار اور میرے درمیان پر معنی نظروں کا تبادلہ ہوا، یعنی حضرت، چپراسی کو پہلے ہی بجھا بجھا آئے تھے۔
چپراسی نے خالص رفیوجانہ انداز میں منہ پھاڑ کر کہا۔ "اوے جبر جستو! میں تاں بوہے دے نال کن لاکے بیٹھا سی جی ------ ہاں دیکھو جی ------ بج ----- "
اب اس نے بتانا شروع کیا کہ کیسے وہ شلوار کے پائنچے اٹھائے، کان دروازے سے لگائے بیٹھا تھا۔ اور پھر اس نے ہماری حمایت حاصل کرنے کے لیے مظلوم نگاہی سے ہماری جانب دیکھا ----- لیکن اسی اثنا میں فگار صاحب ہنستے ہنستے کرسی کے نیچے جا گرے تھے اور میں اچھل کر میز پر جا بیٹھا تھا ------- ہو ہو ہو ----- ہو ہو ہو!!

(۷)

اس دفتر سے تین رسالے نکلنے والے تھے۔ پہلا کلجگ (ادبی اور ثقافتی) دوسرا بساط (سیاسی) تیسرا (نابالغ بچوں کے لیے)
ہم سب کی آنکھ کلجگ پر تھی۔ اس بات پر سب میں ٹھن گئی۔ آپس میں دھمکیوں اور گھڑکیوں کا تبادلہ ہوا۔ اب ضرورت اس امر کی تھی کہ ہم میں سے کوئی دوسرے درجے پر کھڑا ہونے کے لیے تیار ہو جائے۔ سب کو ڈٹے دیکھ کر میں نے بوس سے کہا۔ مجھے کسی خاص رسالے کی ادارت پر اصرار نہیں ہے۔ اس لیے اب یہ قضیہ میرے دونوں کولیگ طے کر لیں۔
اس وقت میں نے سمجھا تھا کہ میں پیچھے ہٹ کر شریفانہ فعل کر رہا ہوں۔ فی الحقیقت مجھے مطلقاً یہ خیال نہیں تھا کہ کسی کو میرے کلجگ مرتب کرنے پر اعتراض ہو گا۔ لیکن جب ایسا ہوا تو اس سلسلے میں زور آزمائی کرنا مجھے مضحکہ خیز سا معلوم ہوا۔ اسی لیے میں نے اپنا قدم پیچھے ہٹا لیا۔
لیکن بعد میں مجھے اس بات کا احساس ہوا کہ میری یہ حرکت نہ صرف طفلانہ تھی بلکہ اس سے میرا کمینہ پن بھی ظاہر ہوتا تھا۔ کیونکہ اس حرکت سے میں نے کولیگوں کو اخلاقی طور پر پست بنا دیا تھا صحیح طریقہ یہ تھا کہ میں بھی لڑتا۔ اور اگر میں ہار جاتا تو کم از کم اپنے ساتھیوں کی تذلیل کے گناہ کا مرتکب تو نہ ہوتا اپنی غلطی اور کمینے پن کا احساس ہو جانے کے بعد بھی میں کسی طرح اس جرم کی تلافی نہ کر سکا۔
یہ نہایت تلخ منزل تھی جس سے ہم کسی نہ کسی طرح سے گزر گئے۔ نقش صاحب حسب خواہش کلجگ کے انچارج بنے اور فگار صاحب حسب خواہش بساط کے۔

ان واقعات کے بعد فگار صاحب نے مجھ سے کہا۔ "توں بڑا احمق ایں"۔

(۸)

شروع کے کئی بے کار دنوں کے بعد کام شروع ہوا۔ جو گرد ہمارے ٹکراؤ کی وجہ سے اٹھی تھی وہ رفتہ رفتہ بیٹھنے لگی۔ لیکن پھر بھی کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ پیش آجاتا جس سے ہمارے تعلقات قدرے بگڑ جاتے۔ حالانکہ یہ سب طفلانہ حرکتیں تھیں۔ لیکن لطف سے خالی نہیں تھیں۔

اب یوں ہوا کہ ایک روز چوبی تختوں کے ذریعہ سے میرا کمرہ الگ کر دیا گیا۔ یعنی میں تنہا اور میرے دونوں کولیگ ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں یہ بڑا قیامت خیز واقعہ تھا اسی دوران میں جب میں نے دیکھا ایک چپراسی سر پر آرام کرسی رکھے میرے کمرے میں سے گزر کر میرے کولیگوں کے کمرے کی جانب بڑھ رہا ہے تو میں نے اسے للکارا۔ اس نے بتایا کہ یہ نقش صاحب کی کرسی ہے۔ مقام حیرت کہ ایسی کرسی نہ فگار صاحب کے پاس نہ میرے پاس تو گویا نقش صاحب نے چپکے چپکے ہمیں جلانے کے لیے یہ حرکت کی تھی۔ چنانچہ میں نے چپراسی سے کہا کہ کرسی اسی کمرے میں رکھ دو۔ وہ بچارا سمجھا کہ اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہے۔ کرسی چھوڑ کر بھاگ گیا۔

ادھر نقش صاحب نہ جانے کس دن کی سازش پر کامیاب ہو جانے پر خراماں خراماں اپنے کمرے میں پہنچے۔ آرام کرسی نہ پاکر انھوں نے ایک چیں اپنی جبیں پر ڈالی اور ذاتی چپراسی کو بلایا اور کہا"۔

" جائیں۔ اے۔ او صاحب نوں کنیں میں جیڑی آرام کرسی تھاڈے بندے دے ہتھ بھجوائی سی او کتھے اے۔"

آرام کرسی کے بارے میں سن کر فگار صاحب کے بھی کان کھڑے ہو گئے۔ ان کے دل پر چھریاں سی چل گئیں۔ مجھے یہ خبر سنانے کے لیے فوراً تشریف لائے اور سامنے مجھے آرام کرسی پر نیم دراز دیکھ کر ٹھٹکے جھینپے، ہنسے اور پھر فوراً اپنی رائے میں ترمیم کا اعلان کر دیا۔

("اوے توں احمک نیئں ایں"۔)

(جب حضرت نقش کو میری اس حرکت کا علم ہوا تو وہ نقشِ فریادی بن کر رہ گئے۔)

(۹)

میرا علاحدہ کمرہ میرے کولیگز کے دلوں میں کھٹکتا رہا۔ یہاں تک کہ حضرت نقش کو بھی الگ کمرہ مل گیا۔ اب حضرت فگار اور میں ایک دوسرے کے پڑوسی تھے۔ لیکن ان کے حصے میں مجھ سے دوگنا کمرہ آیا۔ چنانچہ میں نے فوراً متعلقہ افسر سے کہہ کر اپنی چوبی دیوار آگے بڑھا کر برابر برابر

حصہ بانٹ لیا اور بیچ کا دروازہ بھی بند کروادیا۔ اس پر فگار صاحب کو بڑا لمبا چکر کاٹ کر آنا پڑا۔ اور آتے ہی چشمہ ہٹا کر مجھے غور سے دیکھا اور پھر مجھے دوبارہ چشمے سمیت دیکھا اور کہا۔

"اوے توں بوہت کمینہ ایں۔ بوہت کمینہ!"

بات یہ تھی کہ ہمارے ابا لوگ بھی ہم لوگوں کو دیکھنے کے لیے آیا کرتے تھے۔ علاحدہ کمرے کی وجہ سے میری شان میں بھی انفرادیت پیدا ہو گئی تھی اور وہ دونوں خود کو کمتر محسوس کرتے تھے۔ ادھر بوس کو بہت عمدہ گدے دار آفس کرسی ملی تھی لیکن وہ بید کو ترجیح دیتے تھے۔ گدا انھیں راس نہ آیا۔ چنانچہ مجبوراً میں نے وہ کرسی اٹھوا کر اپنے کمرے میں رکھ لی اور مؤدبانہ اپنی بید والی کرسی ان کی نذر کر دی۔ میری اس حرکت نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔

(میرے والد صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ مجھے زندگی میں فائز (ESTABLISHED) ہوتے دیکھیں۔ کیوں کہ میری بے کاری اور بالادبی نے ان کی راتوں کی نیند حرام کر دی تھی۔ چنانچہ جب انھوں نے دفتر میں اس قدر اپٹوڈیٹ طریقے سے ESTABLISH (فائز) دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔)

ایک روز ہم تینوں کو لیگ خوش گپیوں میں مصروف تھے کہ حضرت نقش نے کہا۔ "اجی ابھی کیا ہے ابھی تو ہمارا ایک اور انٹرویو ہو گا۔"

جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا حضرت موصوف دفتری صحرا کے پرانے آوارہ گرد تھے۔ جس اثنا میں حضرت فگار اور میں مونچھوں کو تاؤ دیتے حضرت آنے والے حادثات کی کھوج اور رد کے ہر قسم کے جوڑ توڑ میں مصروف رہتے۔

یہ بات سن کر ہم دونوں حیران رہ گئے۔ "بھئی اب کون سا انٹرویو باقی ہے؟"

نقش صاحب نے ایسے تیور بنا کر ہم دونوں کا جائزہ لیا جیسے گدھوں کا معائنہ کر رہے ہوں۔ اور پر معنیٰ انداز میں سر ہلا کر بولے۔ "جی ابھی اسپیشل سروس کیشن باقی ہے۔)

(یہ بم کا گولہ چھوڑ کر حضرت تو چلتے بنے اور فگار اور مجھے سرنگوں چھوڑ گئے۔ نہ جانے ہم کب تک سوگ مناتے کہ اتنے میں مجھے شری بشن پنجری کا دستی رقعہ ملا۔ وہ بھی ایک سرکاری دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان کا دفتر الگ لیکن عمارت قریب ہی تھی۔

شری بشن پنجری صورت و سیرت کے لحاظ سے ان نایاب انسانوں میں سے تھے جو جیتے جی زندہ جاوید ہو جاتے ہیں۔) ان کے ایک دوست بھی تھے جن کا نام شری موہن بھوگ تھا۔

یہ دونوں حضرات سچ مچ بڑے حضرت تھے۔

حلیہ ایسا کہ بیان کیجیے تو دشمنی مول لیجیے۔ لباس کے معاملے میں شری بشن پنجری مرصع

تھے تو شری موہن بھوگ مرقع ۔ شغل بلاناغہ فرسٹ کلاس ہوٹلوں میں جانا ۔ مرنجان مرنج بیٹھے آپس میں شرطیں بدا کرتے ۔ ایک کہتے کہ فلاں دو لڑکیاں جو گول میز کے گرد بیٹھی ہیں ان میں سے تیکھی ناک والی لڑکی کے ابھی پورے بیس دانت نہیں نکلے ۔ حضرت نمبر ۲ کہتے اجی نہیں ۔ آپ غلط کہتے ہیں ، ایسی تیز طرار چھوکری کے منہ میں بتیس کے بجائے چونتیں دانت بھی ہوں تو کوئی تعجب نہیں ۔ اسی بات پر دونوں گرما جاتے ۔ لڑکیوں کو بھی مؤدبانہ اطلاع دے دی جاتی کہ ہم دونوں کے مابین اس بات پر شرط بد گئی ہے کہ جو ہارے سو آپ کے کھانے پینے کا بل ادا کرے ۔ ان میں سے ایک کا ہار ناضروری تھا ، حالانکہ دونوں بیک وقت ہار جانا چاہتے تھے ۔ جب لڑکیاں اٹھ کر چلی جاتیں تو دونوں حضرات آپس میں خوش ہوتے کہ بچاری مہذب لڑکیاں تھیں انھوں نے کچھ برا نہیں مانا ۔ (چار چھ ہفتے کے بعد پتہ چلتا کہ جس لڑکی پر ایک حضرت کی آنکھ تھی اور دوسرے کا دانت وہ اپنے محبوب بیرے کے ساتھ فرار ہو گئی ہے) ۔ ایک شام فرار شدہ لڑکی کے ذوق کا ماتم کیا جاتا اور پھر کسی مائع شئے سے غم غلط کیا جاتا ۔

رقعہ پاکر میں آستانہ حضرت بشن پنجری کی جانب روانہ ہو گیا ۔

(۱۰)

سردیوں کا موسم تھا ۔ میں گیارہ بجے کے قریب اپنی میز پر پڑے کاغذات کو دیکھ رہا تھا کہ چپراسی نے اطلاع دی کہ ایک لڑکی مجھ سے ملنا چاہتی ہے ۔

"لڑکی ؟" مجھے تعجب ہوا ۔

"باجی" ۔

میں نے ذہن پر زور ڈالا کہ بھلا مجھے کون لڑکی ملنے کے لیے آسکتی ہے ۔ دفتر کی چند خواتین جو شریف مرد سمجھ کر مجھ سے مل لیا کرتی تھیں ۔ وہ یا تو چٹ بھیج دیتی تھیں یا بغیر اطلاع کیے اندر گھس آتی تھیں ۔

"اوئے کیسی لڑکی ؟"

اس پر چپراسی نے بھونڈے پن سے شرما کر کہا ۔ "جی کے دساں ۔"

(مجھے اس کا اس طرح پر معنی انداز میں مسکرانا اور شرمانا ناگوار گزرا) ۔ شاید وہ سمجھے بیٹھا تھا کہ میری معشوقہ یا منگیتر وغیرہ آئی ہے ۔ میں نے غصہ دبا کر پوچھا ۔ "کیا حلیہ ہے بھئی ۔"

"اوجی حلیہ دل اے ۔ ہور جی اک بندہ نال اے ۔"

میں نے اس سے معلومات حاصل کرنا بے کار سمجھا اور کہہ دیا کہ انھیں اندر بھیج دو" ۔

یہ سن کر چپراسی نے چوکڑی سی بھری اور فوراً ہی ایک صاحبہ اندر داخل ہوئیں ۔ عمر

امنگوں اور ترنگوں سے چھلکتی ہوئی، قد بوٹا سا، بدن کے اتار چڑھاؤ بے حد متناسب۔ رنگ پرنور آنکھیں مسرور، ترشے ہوئے لب، مہین کپڑے کی قمیض اور جھلملاتا ہوا غرارہ۔ (غرض ساری خوبیاں جو کبھی پڑھی سنی تھیں ان میں موجود تھیں)۔

(میں بھونچکا سا رہ گیا۔ میں ہر معقول عورت کو دیکھ کر بھونچکا رہ جاتا ہوں)۔
ان کے ہمراہ ایک حضرت بھی تھے۔ جو صورت سے طبلچی دکھائی دیتے تھے۔ لیکن ایک رومنٹک رسالے کے ایڈیٹر نکلے۔

"مجھے نازی کہتے ہیں۔ خاتون کی آواز میں نور میں ڈوبی ہوئی نغمگی تھی۔
میں نے انھیں بغل والی آرام کرسی پر بیٹھنے کی دعوت دی جو انھوں نے مسکرا کر قبول کی اور ان کے ساتھی کو میں نے اس انداز سے ایک پرے پڑی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا کہ اگر کوئی اور ہوتا تو فوراً بھاگ کھڑا ہوتا۔ لیکن وہ بیٹھ گئے اور بیٹھتے ہی بولے۔
"آپ مس نازی ہیں۔ آپ کی بڑی مداح بلکہ پرستار ہیں۔ آپ سے ملنے کا انھیں بہت اشتیاق تھا۔ لیکن شرماتی تھیں۔ باتوں باتوں میں مجھ سے انھوں نے اپنی اس خواہش کا ذکر کیا میں انھیں ہمت دلا کر یہاں لے آیا۔

میں نے سوچا اگر انھوں ہی نے سچ مچ ہمت دلائی تب تو ان کی قدر ہونی چاہیے۔
اسی اثنا میں نازی صاحبہ نے اپنے خوش وضع چھوٹے سے گورے ہاتھ سے بالوں کی لٹ پیشانی سے ہٹا کر مجھے نیم وا آنکھوں سے دیکھا۔ ساتھ ہی ان کے منہ کا دہانہ بھی نیم وا ہو گیا اور ان کے موتیوں سے دانت جھلک دکھانے لگے۔
"ہاں ہاں --------- جی بھر کے دیکھ لیجیے --------- " ان کے ساتھی نے شہ دی "اپنے محبوب و ممتاز فن کار کو جی بھر کر دیکھ لیجیے"۔
مجھے ان الفاظ میں کچھ اسرار کی جھلک نظر آئی لیکن میں نے اپنے آپ کو رو میں بہہ جانے دیا اور کہا۔

"اجی حضرت! ایک ہی دن میں جی بھر کے دیکھ لینے میں کیا مصلحت ہے؟"
اس پر خاتون کھکھلا کر ہنسنے لگیں اور اپنے خوشنما سر کو جنبش دے کر پریشان زلفوں کو اور پریشان کیا۔
اب کچھ ادبی باتیں ہونے لگیں (اس خاتون کی صحبت کو مناسب حال پا کر میں نے نشست کو طول دینے کے فارمولے پر عمل کیا)۔ "پہلے تو یہ بتائیے کہ آپ کیا کھائیں گی اور کیا

پئیں گی ؟" "غم فرقت کھاؤں گی اور خون جگر پئیوں گی۔" نازی نے تھیٹریکل انداز میں برجستہ جواب دیا۔

اس پر ہم دونوں نے نعرہ ہائے تحسین بلند کیے اور نازی نے آنکھ پر گری ہوئی زلف کو بصد ناز ہٹا کر مجھے اس معصومانہ تحیر کے ساتھ دیکھا۔ اب میرا بھی فرض تھا کہ میں اور زیادہ بے بضاعتی کا اظہار کر کے اس نیک خاتون پر واضح کر دوں کہ میرے لیے فرار کی کوئی راہ باقی نہیں رہی چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔

دفتر سے پرے ایک معمولی سا ریستوران تھا جہاں سے دفتر کے کلرکوں اور افسروں کو چاء اور کھانے پینے کا سامان آتا تھا۔ میں نے سوچا کہ اگر کمرے میں چاء منگوائی تو آدھ گھنٹے میں ایک ہنگامہ برپا ہو جائے گا جوں جوں خبر اڑے گی یا لوگ کسی نہ کسی بہانے سے تاک جھانک کرنے آئیں گے۔ بہتر یہی رہے گا کہ انھیں اپنے ریستوراں میں لے جاؤں۔ لنچ کے وقفہ میں آدھ گھنٹہ باقی تھا۔ جب ہم چلے تو چپراسی نے پیچھے سے ذرا جھکتے ہوئے پکار کر کہا۔

"صاحب جی میں کھانا کھا آواں ؟"

میں نے اس کی جانب دیکھا تو حسب عادت اس نے مجھے انگلیوں کو نوالہ پکڑنے کے انداز سے یکجا کر کے دو تین بار منہ کی جانب بڑھا کر اپنا مفہوم واضح کیا۔ اگر کوئی خاتون مجھ سے ملنے آتی تو بڑا فخر محسوس ہوتا تھا وہ اپنے فخر کو چھپانے میں ناکامیاب رہتا۔ میری غیر حاضری میں وہ اکثر دیگر چپراسیوں سے کہتا کہ اوئے ساڈے صاحب کو ساریاں مساں آندیاں ہن۔"

اب بھی اس حرکت سے گویا خواہ مخواہ مجھ سے آنکھ ملانا مقصود تھا۔ میں نے جواب دیا۔

"اچھی بات تم کھانا کھالو۔ ہمیں ایک آدھ گھنٹہ لگ ہی جائے گا۔"

ریستوراں میں ہم نے چائے پی۔ بڑی پر تپاک، ملائم اور نفیس گفتگو ہوتی رہی۔ لنچ ٹائم شروع ہو گیا تھا۔ کمرے میں واپس جانا ٹھیک نہیں تھا اس لئے قریب ہی دریا کی سیر کرنے کی ٹھانی

جب نازی صاحبہ دریا کے کنارے کنارے ٹہل رہی تھیں تو جل پری سی دکھائی دیتی تھیں جو ابھی ابھی اپنے دریائی محل سے نکل کر زمین، آسمان اور آفتاب کو دعوت نظارہ دے رہی ہو۔

باتوں باتوں میں نازی کے ساتھی نے کہا۔ "اجی باتوں باتوں میں ہماری بات نہ بھول جائیے گا۔"

اس پر نازی دفعتاً رک گئیں۔ "اوہ خوب یاد دلایا۔ میں تو بھول ہی گئی تھی" پھر مجھ سے مخاطب ہوئیں۔

"دیکھیے صاحب! یہ میرے منہ بولے بھائی ہیں۔ رسالہ "جمال" کے ایڈیٹر ہیں۔ انھیں ایک کہانی عنایت کیجیے گا۔"

میں نے جمال کے ایڈیٹر صاحب کا از سر نو سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور کہا۔ "حضرت بڑے بڑے ایڈیٹروں سے وابستہ پڑ چکا ہے۔ ان کے ہتھکنڈے دیکھے بھالے ہیں لیکن جو بے خطا تیر آپ نے چھوڑا ہے اس کی داد نہیں دی جا سکتی۔

اس پر وہ جھینپ کر ہنسے۔ جھینپے کم ہنسے زیادہ۔

"منظور کرتا ہوں" میں نے آہ بھرتے ہوئے کہا۔ کتنی مہلت دے سکتے ہیں آپ؟"

"زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ۔ اور امید ہے کہ آئندہ بھی آپ...."

مستقبل کی باتیں ان کے ہاتھ میں ہیں....." میں نے نازی کی جانب اشارہ کیا۔

نازی مسکرا دیں

ایڈیٹر صاحب چہک کر بولے۔ "اچھا نازی صاحبہ اب رخصت مانگیں ان سے؟

(اپنا الو سیدھا ہونے پر ایڈیٹر جمال کی ایڈیٹرانہ ذہنیت عود کر آئی تھی۔) لیکن نازی ڈپلومیسی میں ان سے بڑھ چڑھ کر تھیں۔ شکایت آمیز نظروں سے میری جانب دیکھا۔ جیسے کہہ رہی ہیں۔ دیکھیے نا! یہ کیا کہتے ہیں۔

حسینوں کو حسینوں کے گھر پہنچانے میں میرا ایمان ہے۔ چنانچہ میں نے رائے دی کیوں نا میں آپ کے ساتھ چلوں۔

نازی طفلانہ انداز سے تالی بجا کر اچھلیں۔ بے شک۔ یہاں سے ہم "جمال کے دفتر جائیں گے۔"

لیکن ایک شرط پر۔" میں نے نازی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر سلسلہ کلام جاری رکھا

"وہ کیا۔" نازی نے میری نظر سے نظر ملائے رکھا۔

"وہ یہ کہ آپ وہاں سے میرے ساتھ کناٹ پیلیس چلیں گی۔" میں نے منہ اور آگے بڑھا کر سرگوشی سے اتنا اضافہ اور کیا" صرف ہم دونوں۔"

اس پر نازی نے پلکیں جھکائیں، مسکرائیں اور بالآخر ہنس دیں۔

ماہنامہ جمال کے دفتر تک پہنچنے کے لئے بڑی پیچ در پیچ گلیوں میں سے ہو کر گزرنا پڑا۔

وہاں پر ایک بھدی سی خاتون سے ملاقات ہوئی جن کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ ایڈیٹر جمال کی منہ بولی بہن ہیں۔

مجھے ان کا دفتر بڑا پر اسرار دکھائی دیا جیسے کسی عالم گیر جرائم پیشہ ٹولے کا مسکن ہے۔

وہاں پہنچ کر مجھے کوئی خاص خوشی نہ ہوئی ۔ میں چاہتا تھا کہ ہم جلد از جلد روانہ ہو جائیں ۔ لیکن بھدی ہمشیرہ صاحبہ نے چاء پر بڑا اصرار کیا ۔ اس قدر زیادہ جیسے چاء میں بے ہوشی کی دوا ملا کر میری جیبیں ٹٹولیں گی ۔ ادھر نازی نے اوڑھنی اتار کر الگ رکھ دی ۔ اس سے ان کی شخصیت اور نمایاں ہو گئی ۔ انھوں نے دفتر کی بغل میں بچھے ہوئے پلنگ پر لیٹتے ہوئے کہا ۔

"میں تھک گئی ہوں ۔"

(میں ایک کرسی پر جو پہلے بازو والی اور اب بے بازو کی تھی بیٹھ کر چائے کا انتظار کرنے لگا ۔)

یہ ساری کاروائی میرے لئے بے حد خشک اور اکتا دینے والی تھی ۔ البتہ نازی ایک کپ چاء پی کر ایسی ہوشیار ہوئیں کہ فوراً اچھل کھڑی ہو گئیں ۔

" تانگہ منگوایا گیا اور ہم دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے ۔ ایڈیٹر صاحب ضرورت سے زیادہ چہک رہے تھے ۔ اس لیے میں نے کوچوان کو فوراً چل دینے کے لئے کہا ۔ مبادا حضرت ہمارے بھی ساتھ آن بیٹھیں ۔

ہم دونوں تنہا رہ گئے تو ان کا رخ روشن اور روئے سخن دونوں محض میرے لیے تھے ۔

نازی بہت باتونی تھیں لیکن زبان سے زیادہ وہ آنکھوں ، ابرووں ، ہونٹوں سے کام لیتی تھیں ۔ ان کی باتیں بھی مزیدار تھیں ۔

دیکھیے نا کیسا خراب زمانہ آگیا ہے ۔ میرے اور ایڈیٹر صاحب کے تعلقات بالکل بہن بھائی کے سے ہیں لیکن باتیں بنانے والے باز نہیں آتے اور تو اور بڑی بی نے آپ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے میرے کان میں پھونکا برا تو نہیں حالانکہ آپ اور ہم آج ہی تو ملے ہیں ..... "

یہ کہتے کہتے ان کا کندھا نرمی سے میرے کندھے سے بھڑ گیا ۔

" نازی جی ۔ " میں نے ان کے دونوں شانوں کو بازو کے حلقے میں لاکر جواب دیا ۔ نازی جی زمانہ بڑا خراب ہے ۔ "

" تانگہ ریستوران کے آگے پہنچ کر رکا ۔ ہم ریستوران کے فیملی باکس میں جا بیٹھے ۔ انھوں نے کھایا کم اور باتیں زیادہ کیں ۔ میں نے باتیں کم کیں اور کھایا وافر ۔ ہم ضرورت سے کہیں زیادہ دیر تک بیٹھے رہے ۔ یہاں تک کہ بیرا منفعل سا نظر سا آنے لگا ۔ وہاں سے اٹھے تو دوسرے ریستوارن میں پہنچے ۔ وہاں بھی بالآخر یہی کیفیت پیش آئی یہاں تک کہ ریستوراں بدلتے بدلتے رات کے دس بج گئے ۔

ان لمبی نشستوں میں میں نے ان کی باتوں کو زیادہ دھیان سے نہیں سنا کیونکہ ان میں

سنے بیشتر جھوٹی تھیں ۔ میرے لئے دلچسپی کی چیز ان کی شخصیت تھی ۔
آخر کار انھوں نے کہا ۔ "رات کافی ہو چکی ہے اب مجھے گھر چھوڑ آئیے ۔ "
"بہتر ۔ "
معلوم ہوا کہ ان کا مکان وہاں سے ڈیڑھ میل شہر کے پرانے حصے میں ہے ۔ تانگے میں بیٹھتے ہی غالباً سردی کی وجہ سے انھوں نے اپنی اوڑھنی چہرے کے چاروں طرف لپیٹ لی اور بیچ میں سے ان کا گول گورا چہرہ چاند جیسی چیزوں کی یاد دلانے لگا ۔
کچھ دیر سکوت کے بعد انھوں نے کہا کہ ۔ "اب آپ بھی تو اپنے بارے میں کچھ بتائیے ؟"
"میں نے جواب دیا ۔ " "لیکن میں تو بہ نفس نفیس آپ کے قریب بیٹھا ہوں ۔ "
میں نے جو اپنے بارے میں اتنا کچھ کہا تو کیا میں آپ کے قریب نہیں تھی ۔ "
"جی نہیں ۔ "
"یعنی "
میں نے تامل کے بعد کہا ۔ "کیا آپ نے بھولپن سے یہ سوال کیا ہے اس کا جواب دینا آسان نہیں ہے انھوں نے اور زیادہ بھولی بن کر کہا ۔
"کچھ نہیں سمجھی ۔ "
میں بھی گھٹیا باتیں کرنے پر اتر آیا تھا ۔ بولا ۔ "نازی جی مجھے ایک بار بھی محسوس نہیں ہوا کہ آپ بات کر رہی ہیں ۔ بلکہ یوں محسوس ہوتا رہا جیسے کوئی انوکھا ساز بج رہا ہے ۔ کبھی اداس کبھی دل خوش کن آپ اس خاکی دنیا کی مخلوق ہی معلوم نہیں ہوتیں ••••• حالانکہ آپ میرے اس قدر قریب بیٹھی ہیں ۔ لیکن پھر بھی مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ آپ کو چھونا گویا کہکشاں کو چھونے کی ناکام کوشش کرنا ہے •••• "
اس پر وہ میرے اس قدر قریب آگئیں جس قدر کہ آسکتی تھیں اور بولیں ۔ "مجھے سردی محسوس ہو رہی ہے ۔ "
میں نے اپنا گرم کوٹ اتار کر ان کے شانوں پر ڈال دیا اور ان کے احتجاج سے کھلتے ہوئے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا ۔
"میں نے سوئیٹر پہن رکھا ہے ۔ "
پھر باتیں ، باتیں ، باتیں ••••••
جس محلے میں وہ رہتی تھیں وہ قلعے کی مانند ایک اونچی دیوار سے گھرا ہوا تھا ۔ (تھوڑے تھوڑے فاصلے پر طویل و عریض دروازے یوں دکھائی دیتے تھے جیسے جن جماہیاں لے رہے ہیں ۔

دوسری جانب رفیوجیوں کی، دیار کے تختوں کی بنی ہوئی دو کانیں آپس میں کھچڑی ہو رہی تھیں)۔ دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اور ہر طرف ہو کا عالم طاری تھا۔

تانگے کے رخصت ہو جانے کے بعد دیوار اور دکانوں کے درمیان بڑے میدان میں، ہم دونوں کھڑے رہ گئے۔ مدھم چاندنی میں نازی دھیرے سے بولیں۔

میرا آپ کے پاس سے جانے کو جی نہیں چاہتا۔"

لیکن۔۔ آخر کار انھیں رخصت کرنا پڑا۔ چند قدم چل کر پھر لوٹ آئیں۔ اور میرے ہاتھوں میں ہاتھ دے دیئے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے قدیم بغداد میں ہوں اور ہارون الرشید کی حکومت ہے۔ نازی دنیا کے ہاتھوں ستائی ہوئی پری وش دلربا اور میں نوجوان، ناتجربے کار، جلا وطن شہزادہ ۰۰۰۰۰ رہی سہی کسر نازی نے قدم بہ قدم پیچھے ہٹ کر رخصتی نظروں سے پوری کر دی۔ یہاں تک کہ وہ بڑے دروازے میں گھس گئی بے حس دیواروں کی تہوں میں غائب ہو گئیں۔

میں نے قدرے قیام کیا اور پھر گندی دکانوں کی تنگ اور پر پیچ گلیوں میں کھو گیا۔

۱۱

بمشکل پانچ چھ ماہ گزرے ہوں گے ہمیں اسپیشل سروس کمیشن کے سامنے حاضر ہونا پڑا۔ ہماری آسامیوں کو از سر نو مشتہر کیا گیا۔ (بھوکے ملک کے کئی حاجت مندوں نے عرضیاں بھیجیں۔ ہمارے ساتھ بوس کی آسامی کا اشتہار بھی نکلا)۔ حضرت فگار اور میرے لیے سب سے بڑا حادثہ یہ پیش آیا کہ نقش صاحب نے خود بھی بوس کی جگہ کے لیے عرضی دی۔ ہم دونوں بہت حیران ہوئے کہ اپنے ہی بوس کی جگہ کے لیے عرضی دینا مناسب نہیں تھا۔ (لیکن نقش صاحب نے ہم پر صرف ایک ایسی نگاہ ڈالنے پر اکتفا کیا جو خالص بے وقوفوں کے لیے مخصوص تھی)۔ بعد میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ بھی ڈپلومیٹک چال تھی ۰۰۰۰ اس طرح نقش صاحب کو اور کچھ فائدہ پہنچے نہ پہنچے۔ لیکن وہ کمیشن کی نظروں میں اپنے کو لیگوں کے مقابلے میں ممتاز ہو جائیں گے۔

جب ہم لوگ دفتر کے ادارے میں شامل ہوئے تھے تو یوں محسوس کرتے تھے جیسے ہمارے دکھوں کا بیک قلم خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب ہم لوگ آرام سے اپنا کام شروع کریں گے اور روٹی کھائیں گے مگر حقیقت کچھ اور ہی نکلی۔

وہ دن یاد رہے گا کہ کس طرح ہم اسکولیوں کی طرح ڈرتے ڈرتے اپنے کاغذات بغل میں دابے انٹرویو کے لیے سکریٹریٹ پہنچے۔

کمیشن کے ممبروں کو بڑی دل جمعی سے کسلمندانہ انداز سے کرسیوں میں بیٹھے دیکھ کر

مجھے رشک ہوا۔ یوں دکھائی دیتا جیسے انھیں کسی کے حالات اور اس کے مسائل سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انھیں یہ جاننے کی قطعاً خواہش نہیں تھی کہ کون کتنے پانی میں ہے۔ انھیں یہ جانچنے کی قطعاً کوئی فکر نہیں تھی کہ کون کون ہے یا کیا ہے۔ وہ ارفع دیوتاؤں کی طرح بے پروائی اور بے حسی کے ساتھ بیٹھے تھے۔ یہ افواہ پہلے ہی سے مشہور تھی کہ ہونے والی بات کا فیصلہ پہلے ہی سے ہو چکا ہے۔ چنانچہ انٹرویو کا نتیجہ:۔ ہم سب سلامت رہے۔ میں جو پہلے انٹرویو میں اول رہا تھا، تیسرے درجے پر پہنچا نقش صاحب اول ٹھہرے اور حضرت فگار جن کے بارے میں مشہور تھا کہ پہلے انٹرویو میں ان کے مقابلے میں ایک اور کینڈی ڈیٹ کو رکھا جا رہا تھا۔ لیکن گورکھ صاحب کے اڑ جانے پر تیسرے درجے پر لائے گئے تھے اب نمبر ۲ آئے۔

انٹرویو کے بعد بھکشو جی ملے اور بولے۔

"میں نے تم سے پہلے ہی کہا تھا کہ کلچگ پر قبضہ جمالو۔ مگر تم نے میری ایک نہ سنی۔ نتیجہ دیکھ لیا۔۔۔۔"

میرا جواب سن کر وہ اور بھی گرما گئے۔

"تم گدھے ہو، تم کالجیٹ لڑکوں کی سی باتیں کرتے ہو۔ انصاف ملا نہیں کرتا۔ انصاف حاصل کیا جاتا ہے۔ لڑ بھڑ کر کم از کم اتنا تو مانو گے کہ میں عمر میں تم سے بڑا ہوں۔ اس میدان کا تم سے پرانا شاہ سوار ہوں اور تم سے زیادہ زمانے کے طمانچے برداشت کیے ہیں۔ میں نے اس لیے تمہیں یہ رائے دی تھی کیونکہ میری کوئی رائے سچ مچ تمھارے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہے۔"

اس پر میں مغموم ہو گیا۔

بہت دیر خاموشی طاری رہی۔ میں سوچنے لگا کہ اس چلتی پھرتی دنیا میں ہر انسان کس قدر تنہا ہے۔ اس نظام میں شکست کھاؤ تو تنہا، فتح حاصل کرو تو تنہا۔ لیکن ایسا کیوں نہیں ہوتا کہ کسی بھی فرد کی فتح میں میری فتح ہو۔ اور وہ میری شکست دوسروں کی بھی شکست ہو۔

بھکشو جی نے گھنٹی بجا کر چپراسی کو بلوایا، اور کھانے کا سامان لانے کو کہا۔ اور میرا موڈ ٹھیک کرنے کے لیے مسکرا کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔

میں کسی اور سے کم کمینہ یا خود غرض یا مطلب پرست نہیں ہوں لیکن پھر بھی ----

یہ ہارے ہوئے جواریوں کی سی باتیں ہیں جن میں نہ خلوص ہے نہ صداقت ------ مت بھولو کہ تمہاری ہار ہوئی ہے اور اگر تم چاہتے ہو تو یہی شکست فتح میں تبدیل ہو سکتی تھی۔"

اس کے بعد بھکشو جی نے تامل کیا۔ پھر انہوں نے قابل رحم نظروں سے میری طرف

دیکھنا شروع کیا اور کہا۔۔

"چھوڑو ان باتوں کو ـــ آؤ اب عورتوں کی باتیں کریں۔"

کدے باک نہ چتنڈیے ماری
فی چوڑے والی بانہ کڈھ کے

(۱۲)

میں دفتر میں اداس بیٹھا تھا میرے سامنے لیمو نیڈ گلاس دھرا تھا جس میں ایک عدد لیمو نچوڑ کر اور تھوڑا سا نمک اور سیاہ مرچ چھوڑ کر میں نے اسے چٹپٹا بنالیا تھا۔

اداسی کا سبب یہ تھا کہ نازی سے جھگڑا ہو گیا تھا ـــــ (جس گھٹیا طریقے سے ہم ایک دوسرے کے قریب آئے تھے اس سے بھی گھٹیا طریقے سے الگ ہو گئے) ایک شام ہم ایک ریستوراں میں بیٹھے تھے۔ باتوں باتوں میں انھوں نے اپنے ہینڈ بیگ میں سے اپنا ایک فوٹو نکالا۔ مجھے وہ پوز بہت پسند آیا میں نے کہا کہ مجھے یہ دے دیں۔ انھوں نے تامل کیا اور کہا کہ اب آپ میرے فوٹو چاہے جتنے کھچوالیں لیکن اسے نہ مانگیں۔ میں نے سبب پوچھا۔ کہا ایک راز ہے۔

یہ سن کر مجھے از حد کوفت ہوئی۔ انھوں نے ڈرامائی انداز میں اپنی بات پر اڑے رہنے کی کوشش کی۔ میں اکھڑ گیا ـــــ خفگی میں علاحدگی ہوئی۔ اب چند روز بعد پتہ چلا کہ وہ شہر چھوڑ کر کہیں اور چل دی ہیں ـــــ"

انہی خیالوں میں تھا کہ دروازے کی چق اٹھی اور ایک صاحب اندر داخل ہوئے ـــ لمحے بھر کے تامل کے بعد میں نے انھیں پہچان لیا ـــــ میرے دیرینہ دوست تھے۔ نام عارف ـــــ میانہ قد، بیضوی چہرہ، رنگ گندمی، صورت دلکش، رہنا زمین پر بات آسمانوں کی۔ جوں جوں زمانے کی گرد کی تہیں ان کے چہرے پر جمتی تھیں توں توں وہ اونچے اٹھتے جاتے تھے۔ کبھی کوئی معرکہ کی کتاب لکھ رہے ہوتے۔ کبھی فلم کمپنی قائم کرنے کے چکر میں ہوتے۔ یا بحیثیت نغمہ نگار یا ہدایت کار بمبئی جانے کی تیاریوں میں مصروف ہوتے۔ لیکن رہتے وہیں کے وہیں۔ وہی شغل کہ کبھی پتلون کا بہت بڑھیا اور قیمتی کپڑا خریدنے کی فکر میں ہیں تو کبھی پتلون بیچنے کی فکر میں۔

ملازمت ملنے پر ہماری یہ پہلی ملاقات تھی۔

میری بغل میں بچھی ہوئی آرام کرسی پر نیم دراز ہوتے ہوئے انھوں نے اپنی مخصوص

خواب ناک نظروں سے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر میری جانب دیکھ کر بولے " خوب! تم اس کرسی پر بیٹھ کر واقعی افسر دکھائی دیتے ہو۔"

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

یہ افسری وغیرہ قسم کی باتیں اس دفتر میں بے کار ہیں کیونکہ یہاں کی چپراسی بھی فورتھ کلاس آفیسر ہیں ------- "

" پھر بھی مبارک ہو۔"

یہاں آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے والا معاملہ ہے۔ اسپیشل سروس کمیشن کے چنگل میں سے نکلے تو معلوم ہوا کہ اب اکانومی کمیشن بیٹھے گا۔

" تمہاری مبارک باد کی صداؤں کی گونج ختم بھی نہ ہونے پائے گی کہ ہم پھر حسب سابق سڑکوں کی خاک چھانتے نظر آئیں گے۔"

عارف نے سنی ان سنی کر کے اپنے پاؤں اچھی طرح سے پھیلا دیے اور کسی مطمئن اور آزاد پرندے کی طرح بازو پھڑپھڑاتا ہوا بولا۔ آج میں خوش ہوں کیونکہ آج میں امیر ہوں۔"

اور

" تم امیر؟"

" ہاں -- کیونکہ تم امیر ہو۔ یہ کہہ کر اس نے مجھ پر سے واری جاتے ہوئے اپنے پیلے لیکن خوش وضع دانتوں کی نمائش کی۔

حقیقت یہ تھی کہ باوجود مرنجاں مرنج ہونے کے وہ مجھ سے زیادہ امیر تھا۔ کیونکہ جب کبھی اس کے پاس روپے ہوتے تو وہ شہر کے کسی بڑے ریستوران میں صبح ہی صبح جا بیٹھتا۔ سب یاروں کو باری باری ٹیلی فون پر اطلاع دیتا کہ آؤ اور میرے پلے سے کھاؤ۔

جب تک اس کی جیب گرم رہتی یہ لنگر چوبیس گھنٹوں چلتا۔ وہ ان آدمیوں سے تھا جو ڈٹ کر روپیہ کمانا نہیں جانتے تھے لیکن اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے وافر روپے کی ضرورت رہتی ہے۔

ایسے ہی ایک موقع پر چار دوست عارف کے گرد بیٹھے تھے۔ بڑھیا ڈچ بیر اور مرغ مسلم سے لے کر دہی بڑے تک سب کچھ خوب جی بھر کے اڑایا گیا۔ بل نوے روپے سے اوپر تھا۔ بیرا بل لایا تو عارف نے رشی منیوں کی سی بے اعتنائی سے بل کی جانب دیکھا اور مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بڑے بانکپن سے بولے۔ کہو، جان من! یہ بل کون سی جیب سے ادا کروں؟"

اس وقت وہ سوٹ زیب تن کیے ہوئے تھا۔ قمیص واسکٹ، کوٹ اور پتلون وغیرہ۔

سب ملا کر غالباً ایک درجن جیبیں تھیں ۔ لیکن اس نے یہ اصرار کہا ۔
"شرماؤ نہیں ۔ڈرو نہیں ۔"
آخر کار میں نے اس کی ہپ پاکٹ کو لٹھے کی جیب کی طرف اشارہ کیا ۔ (اس نے فوراً اسی جیب سے نوٹوں کا پلندہ یوں نکالا جیسے کوئی بانکا کر بند میں سے پیش قبض کھینچے ۔) سب نے واہ واہ واہ واہ کے نعرے بلند کیے ۔
اس وقت عارف صاحب کے روئیں روئیں میں مسرت پھوٹی پڑتی تھی ۔ وہ قہقہہ لگا کر شاذ و نادر ہی ہنستا تھا ۔ لیکن اس کی چپ چاپ گم سم سی ہنسی کا جواب نہ تھا ۔ اس نے باری باری ہر ساتھی سے نگاہیں چار کیں اور پھر نہایت نفاست سے صرف دو انگلیوں کی مدد سے پلندے میں سے ایک سو کا نوٹ برآمد کر کے بیرے کے حوالے کیا ۔
اور کبھی یہ حال کہ ریستوراں میں پہنچ بیرے کو آرڈر دیا "بوئے (Boy) سوپ لاؤ گرلڈ چکن لاؤ ۔ رشین سلاد لاؤ ۔ فروٹ کریم لاؤ ۔ کو نا کافی لاؤ ------ "
مع یاروں کے سب کچھ کھا پی چکے تو آرڈر دیا
"پولیس لاؤ ۔"
"کیا فرمایا؟" بیرا مودبانہ سر آگے بڑھا کر دریافت کرتا ۔
ہم بولا پولیس لاؤ ۔
یہ سمجھ کر پولیس بھی کھانے پینے کی شئے ہے جو مینو میں درج نہیں ہے ۔بیرا سر ہلا کر کہتا ۔
"نہیں سمجھا حضور ۔"
اس پر عارف صاحب جلال میں آکر زور سے میز پر ہاتھ مارتے اور بیرا ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ----
تو یہ تھے ہمارے عارف صاحب!
سب سے پہلے اس نے جیب میں سے چاندی کا سگریٹ کیس نکالا اور اسے میری جانب بڑھا کر پوچھا "کیسا ہے؟"
میں نے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا بھالا ۔
"اچھی چیز ہے ۔"
بس تو اسے اور اچھا بنانے کے لیے سگریٹوں سے بھر دو ۔ کیونکہ اس قدر خوبصورت ہونے کے باوجود یہ خالی ہے ---- لیکن سگریٹ کم از کم گولڈ فلیک ہوں ۔ ورنہ اس سے گھٹیا سگریٹ ایسے بڑھیا سگریٹ کیس میں اچھے نہیں لگیں گے ۔"

میں نے اندازہ لگایا کہ اس میں کم از کم بیس سگریٹ سمائیں گے۔ دو ڈبیا سگریٹ منگوائے گئے۔ عارف بولا۔

"کچھ کھان نوں بی منگوا بھو کاہاں۔"

میں نے بزرگانہ انداز سے پوچھا۔ "آملیٹ کھاؤ گے۔"

"کھالاں گا۔"

"چائے؟"

"پی لاں گا۔"

"ٹوسٹ؟"

"کھالاں گا؟"

"" انکار نہیں کرو گے۔"

"نئیں کراں گا۔"

"کھاپی چکے تو میں نے پوچھا کہ اتنی طویل مدت تک کہاں رہے؟

اس نے چپ چاپ سگریٹ جلا کر برقی گھنی کا بٹن دبا دیا۔ چپراسی آیا تو جلتی ہوئی تیلی ہاتھ میں تھما کر کہا۔ "باہر پھینک دو۔"

چپراسی، صاحب کی اس نفاست سے مرعوب ہو کر چلا گیا تو عارف نے میری طرف دیکھ کر ایک آنکھ بند کر لی۔

"خوب خوب" میں نے داد دی۔

اس نے بتایا کہ لاہور کی گلزار کے پیچھے خاک چھانتا پھرا لاہور سے میرٹھ، میرٹھ سے لکھنو لکھنو سے پٹنہ، پٹنہ سے کلکتہ اور کلکتہ سے دہلی تک اس کا تعاقب کیا۔ پھر ناواں ختم ہو گیا اس لیے اس کے پیچھے بمبئے نہیں جا سکے۔

اتنے میں ہمارے دفتر میں کام کرنے والا ایک نوجوان کمرے میں داخل ہوا۔ اکہرا بدن ،انگ ایسا کہ ادھر تاریکی ہوئی اور آپ گم۔ چاق و چوبند، دوستوں کا دوست۔ دشمنوں کا دشمن، میں نے عارف سے تعارف کروایا آپ ہیں شریواستو ——— اور آپ کی تعریف ————————

میری تعریف یہ ہے عارف نے اپنا تعارف خود کروایا۔ ("کہ میں اس آرام جان کا یار غار ہوں۔"

شریواستو ہنسا "یار تو سمجھ گیا لیکن غار والا معاملہ سمجھ میں نہیں آیا) —

اس پر عارف نے اثبات میں سر ہلا کر گویا اظہار ناپسندیدگی کیا اور کہا۔

شریواستو نے کہا۔ "ہمارا حال آپ کیا پوچھتے ہیں۔ اس دفتر میں تو انسان یہ سمجھ کر رہ سکتا ہے کہ وہ چند دن پنشن پا رہا ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس روز نوکری چھوٹ جانے یا دفتر ٹھپ ہو جانے کی افواہ نہ اڑتی ہو۔ دماغ مضمحل رہتا ہے۔ چوبیس گھنٹے یہ فکر لاحق رہتی ہے کہ اگر ملازمت سے جواب مل گیا تو کیا ہوگا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ نہ تو اپنے فرائض کا احساس ہوتا ہے نہ کام کاج میں جی لگتا ہے۔ بس سارا دن اسی جوڑ توڑ میں گزر جاتا ہے کہ بجلی گرے تو پڑوسی کے آشیانے پر۔ اس ڈھرے پر سوچنا ایک قدرتی امر ہے۔ لیکن اس کے نتائج بڑے افسوسناک ہیں جانتے ہیں یہاں پر کس فارمولے پر عمل کیا جاتا ہے۔ اپنے سے نیچے والے کا کچومر نکالو اور اوپر والوں کی وافر خوشامد کرو۔ ان کی ناز برداری کرو۔ ان کا دل بہلاؤ۔ اور اس طرح ان کی ناک کا بال بنے رہو۔ اور کام؟ ------ کام جائے بھاڑ میں۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھنے لگے کہ میں آزاد ملک کا آزاد شہری ہوں، ملک اور اس کے اڈمنسٹریشن کا میں بھی ضروری پرزہ ہوں۔ مجھے اپنے کام اور فرض کی طرف توجہ دینی چاہیے تو ظاہر ہے ایسے آدمی کو جوڑ توڑ کرنے کا وقت نہیں ملے گا۔ وہ اپنا اثر رسوخ نہیں بڑھا سکے گا۔ اس لیے وہ دن دور نہ ہوگا جو اسے مکھن کے بال کی طرح کھینچ کر الگ کر دیا جائے گا۔ ملک کی آزادی کے معنی یہ نہیں کہ چند سرکردہ حضرات کے حلوے مانڈے کا مستقل انتظام ہو جائے۔ بلکہ آزادی کے معنی یہ ہیں کہ فرد واحد کا اور اس کے ضروریات کا احترام ہو۔

"ہیر ہیر۔" ہم نے دھیمے دھیمے تالیاں بجا کر داد دی۔ "تم نے پوری تقریر جھاڑ دی۔" میں نے کہا۔

"یار کیا کریں، دل جلتا ہے تو دھواں اٹھتا ہے۔" شریواستو نے جواب دیا۔

اور جب دھواں اٹھتا رہا ہو تو سمجھنا چاہیے کہ دل جل رہا ہے۔" عارف نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ "ہاہاہا" شریواستو نے میرے ہاتھ پر ہاتھ مار کر کہا۔ لو بھئی اب میں چلا۔ پریس کو جا رہا تھا۔ سوچا بڑے بھائی کے درشن کر لیں سلام کرنے چلیں۔" عارف یار آج شام کو ہم اکٹھے کھانا کھائیں گے۔"

شریواستو کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

"لیکن کھانا بڑا رچ ہونا چاہیے۔"

"جس معنی میں کہ تم کھانے کو رچ کہتے ہو وہ آج ممکن نہیں۔ جیب میں دام نہیں۔ کل بینک سے نکلواؤں گا لیکن دعوت پرسوں رہے گی۔ کیونکہ کل خود میں ایک ڈنر پر مدعو ہوں ------ البتہ آج پشاوری کھانا کھایا جا سکتا ہے۔ استاد! بھاپے دی ہٹی میں بکرے کی ران تیار کی جاتی ہے اسے کھا کر زندگی بھر چٹخارے لیا کرو گے۔"

"ایز یو پلیز۔" عارف نے اس انداز سے سر ہلایا جیسے میری سر پرستی اسے بہر حال منظور ہے۔

شام کو جب ہم کناٹ پیلیس پہنچے تو سیدھے بھاپے کی ہٹی میں گھس گئے اور بکرے کی ران کا آرڈر دے دیا۔

جب ران بڑی پلیٹ میں آئی تو اس کے جم کا جائزہ لیتے ہوئے عارف نے کہا۔

"یہ ران دیکھ کر مجھ پر روشن ہوا کہ میری دعوت منظور نہیں تھی بلکہ تمہیں در حقیقت کمک کی ضرورت تھی۔

(۱۳)

دوسری شام میں ایک ڈنر میں شامل ہوا۔

اس دعوت میں شامل ہونے والوں کی تعداد معمولی تھی۔ ہمارے میزبان کی ایک بہن تھی جو کھیتوں میں ایستادہ نظر بٹو کی طرح بعض بن بلائے مہمان کا دل دہلا دینے کا کام کرتی تھیں۔ ایک نوجوان خاتون تھیں۔ ... تعلیم ایم اے۔ حسین نہ تھیں لیکن قبول صورت ضرور تھیں۔ قطع نظر صورت کے ان کی بعض حرکات بھی کسی حد تک متوجہ کرتی تھیں۔ مثلاً ساڑی کا پلو سنبھالنے کا انداز، ابرو ہلانے کا انداز، باتیں کرتے کرتے شرما جانا اور شرماتے شرماتے کچھ فرما دینا۔ کچھ اور خواتین بھی شامل محفل تھیں لیکن ان کے بارے میں کم سے کم بھی کہنا بڑی سے بڑی زیادتی سے کم نہیں۔

کچھ مرد تھے ------ مجھے اس بات کا دعوا نہیں کہ وہ سب کچھ مرد ہی تھے -- کچھ مدراسی، کچھ پنجابی۔ بیشتر چہرے نئے تھے۔ دو میزبان جو کسی نہ کسی رشتے سے آپس میں بھائی ہوتے تھے، ان سے میں واقف تھا۔ ان میں سے ایک دبلا پتلا تھا۔ موٹا ہوتا تو اچھا ہوتا۔ دوسرا موٹا جو اگر پتلا ہوتو اچھا لگتا۔ پتلا ہمیشہ بیمار رہتا بری بات موٹا کبھی بیمار نہیں پڑتا تھا۔ یہ اور بھی بری بات تھی کہ ان میں میرے محترم جناد ھاری دوست شری بھکشو بھی شامل تھے۔

ہمارے میزبانوں نے ادبی قسم کی گفتگو کا آغاز کر دیا۔ وہ کتابیں چھاپنے کا کام شروع کرنے والے تھے شاید اسی لیے چند مصنفوں کو اکٹھا کر لیا تھا۔ لیکن حاضرین پر ادبی گفتگو کا موڈ طاری تھا۔

کھانا شروع ہوا تو بھکشو جی کانا پھوسی کرنے کے لیے میری بغل میں آن براجے۔ حالانکہ ان کی جھاڑ جھنکار داڑھی اور ان کی گھنی مونچھوں میں سے نکلی ہوئی ہر بات کانا پھوسی معلوم ہوتی

تھی یا ممکن ہے میرے قریب وہ اس لیے بیٹھے ہوں کہ عین میرے مقابل مس چندا تشریف فرما تھیں۔

رفتہ رفتہ ڈونگے آنے شروع ہوئے باتوں کا بازار قدرے گرم ہوا۔ نہ جانے کس سلسلے میں موٹا میزبان کہنے لگا۔

"THE THING IS THAT OUR WRITERS DO NOT TAKE PAINS.

بھکشو جی (جو چند کتابیں ان کے گلے منڈھنا چاہتے تھے، فوراً بول اٹھے)

" پر جی I DO TAKE PAINS

یہ کہتے کہتے انھوں نے ربڑ کے باڈے کی طرح سر ہلاتے ہوئے باری باری سے سب کی جانب دیکھا اور بالآخر اپنے قول کی تائید کرنے کے لیے ان کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔

میں نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی - AS A MATTER OF FACT BHIKSHU JI

(YOU DO NOT WRITE AT ALL. YOU TAKE PAINS ONLY)

دوسری شام ایک ڈنر میں شامل ہوا

بھکشو جی کی ٹیکنیک کے جو رازداں محفل میں شامل تھے وہ بہت محفوظ ہوئے لیکن بھکشو جی کی سمجھ میں دو تین روز بعد آیا۔ اس لیے وقتی طور پر بچاؤ ہو گیا۔

میزبانوں نے محسوس کیا کہ اس قسم کی باتیں اگر بیچ چوراہے میں کی گئیں تو ہانڈیاں پھوٹیں گی۔ اس لیے انھوں نے گفتگو کا رخ پلٹ دیا اور راہ فرار پاتے ہی بھکشو جی نے ایک ڈونگا بڑھاتے ہوئے کمال لجاجت سے کہا۔"

"مس چندا ام۔اے! کیا آپ رائتہ نہیں لیں گی؟"

مس چندا نے ام اے کے دم چھلے کو پسند نہیں کیا۔ لیکن جب نگاہ اٹھا کر دیکھا اس سے مخاطب ہونے والے تو کوئی مہاتما تھے جن کی صورت سے یوں ظاہر ہوتا تھا (جیسے صدیوں عالم استغراق میں رہنے کے بعد ابھی آنکھیں کھول کر تماشہ سے دریافت کیا ہے "کون یگ؟" اور یہ کہہ کر پھر عالم استغراق میں گم ہونے کو ہیں۔ تو اس نے رائتے کے ڈونگے سے چمچ اٹھا کر پلیٹ سے چھوڑ دیا۔ اور باریک آواز میں کہا۔ تھینک یو۔")

ڈونگے کو اپنی جگہ پر رکھ کر بھکشو جی نے ایک کھردرے جھاڑن سے اپنی خار دار لمبی

موچھوں کو صاف کیا اور خود بخود اثبات میں سر ہلاتے ہوئے مجھ سے مخاطب ہو کر پھسپھسائے پائے۔ یہ تو ہمارا فرض ہے ہی۔"

میرے اس جواب پر بھکشو جی کے موٹے ہونٹوں پر فراخ مسکراہٹ کھیلنے لگی اور آنکھیں چمک اٹھیں انھوں نے اپنے لبادے کو جو لباس کی صورت میں سلے ہوئے ہونے کے باوجود چھجر کو اڑھانے کا ٹھاٹ دکھائی دیتا اپنے گرد اچھی طرح لپیٹ لیا اور پھر سنبھل سمٹ کر انھوں نے بڑی بیبی شکل بنائی اور لقمے منہ میں غائب کرنے لگے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اس ہونے والے پبلشر نے ادیبوں کو پھانسنے کے لیے کیسی گھٹیا اسکیم بنائی ہے جو حکومت کی اسکیموں کی طرح بری طرح فیل ہو رہی ہے۔ چنانچہ ادیبوں نے ایک دوسرے کو ناپنا شروع کیا۔ ایک مدراسی ادیب جو بھکشو جی کے پینتروں سے واقف نہیں تھے بولے "بھکشو جی! میں آپ کا بڑا مداح ہوں۔ لیکن معلوم نہیں تھا کہ آپ کی صورت سے اس قدر نور ٹپکتا ہے۔ فی الحقیقت مجھے آپ سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔

اس پر بھکشو جی کے ہاتھ رک گئے۔ یہ درست ہے کہ اپنی تعریف سے بڑھ کر انھیں اور کوئی شئے پیاری نہیں تھی۔ لیکن ان کے لیے وہ لمحے بڑے صبر آزما ہوتے کہ جب سچ مچ ان کی تعریف ہو رہی ہو۔ غالباً وہ یہ فیصلہ نہیں کر پاتے تھے کہ ایسے موقعوں پر ان کے چہرے سے کس قسم کے جذبات کا کس انداز سے اظہار ہونا چاہیے۔ حکمت عملی کو چھوڑیئے ان کے اندر اتنی معصومیت بھی نہیں تھی کہ تعریف سن کر سیدھے سیدھے نہاتے ہوئے کوے کی مانند پھول ہی جائیں۔

مداح صاحب جو مجھ سے متعارف ہو ہی چکے تھے مجھ سے کہنے لگے "کیوں جناب اردو کے کلچگ کے ایڈیٹر کے چہرے سے بھی ایسا ہی نور ٹپکتا ہے۔

"ارے توبہ کیجیے" میں نے جواب دیا۔ بھکشو جی کے نزدیک میری حیثیت سمجھ میں نہ آنے والے ابوالہول کی سی رہتی تھی۔ اس لیے یہ الفاظ سن کر وہ خوش ہوئے۔ میں نے تامل کیا تاکہ اور خوش ہو لیں پھر میں نے سلسلہ کلام کو جاری کیا۔

"بھکشو جی نوری ہیں، میں نے جواب دیا۔ تو ہمارے بوس ناری ہیں۔ ان کے چہرے سے نور نہیں برستا لیکن باطن مست سرمست ہیں۔ اور ہمارے بھکشو جی باہر سے سرمست ہیں اور اندر سے خرمست۔"

مدراسی صاحب نے مستی، سرمستی اور خرمستی کی گردان سنی تو کان کھڑے کر کے بولے۔
"کچھ سمجھا نہیں۔ آپ کیا بولے

میرا بیان وضاحت طلب تھا سو میں نے وضاحت کرنے کے لیے کہا:۔
ایک روز کاتب جو عرصہ دس مہینے سے ہمارے سیکشن میں کام کر رہا تھا کسی اہم غرض سے بوس کے سامنے حاضر ہوا۔ اس وقت کمرے میں کوئی اور نہیں تھا۔ بوس صاحب کرسی پر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ایک مرد مسکین کو اپنے روبرو پاکر حسب عادت کرسی سے اتر کر زمین پر کھڑے ہوئے۔ مصافحہ کیا اور پھر بیٹھ گئے۔ ادھر کاتب مدت سے حاضر خدمت ہونیکی فکر میں تھا۔ گو ڈرتا تھا کہ بڑے صاحب آبروریزی نہ کر دیں۔ لیکن انھیں نہال پاکر اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ اسے بیٹھنے کے لیے کرسی پیش کی گئی۔ وہ بیٹھ گیا۔ ادھر یہ حال کہ اپنا مدعا کیوں کر بیان کیا جائے ادھر بوس صاحب متضاد خیالات کے نرغے میں پھنسے۔ سوچ رہے تھے کہ نہ جانے نو وارد کون ہے۔ کہاں سے آیا ہے بیگم سے بھی حتی المقدور ڈرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کے گاؤں سے آیا ہو۔ شاید مجھے اس کا بستر فوراً گھر بھجوا دینا چاہیے۔ لیکن اجنبی کی صورت کچھ کچھ آشنا معلوم بھی ہوتی تھی۔ جس سے خیال پیدا ہوتا کہ ممکن ہے کہ کہیں اور سے آیا ہو۔ لیکن پچھلے چند ماہ کے دوران حضرت نقش نے انھیں تھوڑا بہت ڈپلومیٹ بھی بنا دیا تھا۔ اس لیے سوچا کہ ہم کیوں اشارہ کریں خود ہی پھوٹے گا۔ لیکن سردست موسم کے بارے میں گفتگو غیر مناسب نہ جان کر بولے۔ صاحب بڑا گرم ہو رہا ہے۔ کیا خوب کہا ہے نظیری نے ------ اس پر کاتب اور پھول گیا کہ بوس اس سے موسم کے بارے میں تبادلہ خیالات فرما رہے ہیں۔ فوراً جواب دیا، جی اب بارشیں شروع ہونے کو ہیں۔ ہام صاحب، بوس صاحب نے جواب دیا۔
بارش سے تپش دور ہو جائے گی۔ اور پنکھے کی ہوا بھی بھلی لگنے لگے گی۔ ادھر ادھر کی دو چار باتوں کے بعد بوس صاحب بھانپ گئے کہ یہ شخص ان کی بیگم کے گانو کا نہیں ہے۔ کیوں کہ ان کے تیور سراسر مختلف ہوتے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے کمال ڈپلومیسی سے پوچھا۔ "اچھا صاحب آپ ملیح آباد سے کب تشریف لائے ہیں؟ ------------
اس پر کاتب نے اپنا سر پیٹ لیا اور کہا بندہ پرور میں تو عرصہ دس مہینے سے ----------

سب خوب ہنسے لیکن مس چندا کی آواز سب سے زیادہ بلند تھی۔
صنف نازک سے اس قدر زور داد پاکر میں سمجھ گیا کہ ضرور میری بات میں گھٹیا پن تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ داد تو مل ہی رہی ہے اس لیے اس دھارے کے رخ کو کسی موافق موڑ کی جانب سے کوتاہی کیوں کی جائے۔ بس میں نے مزید داد طلب نظروں سے ان کی جانب بے باکانہ تاکا اس پر وہ بڑے اہتمام سے شرمائیں اور شرماتے شرماتے کچھ فرمایا جو میری سمجھ میں نہ آیا لیکن یوں بھی عورتوں کی باتوں کو سمجھنے کی کوشش بے وقوف لوگ کیا کرتے ہیں۔ دیکھنا تو یہ چاہیے

کہ وہ کس انداز سے کچھ فرماتی ہیں ------

مس چندرا کی زوردار ہنسی سے دوسری خواتین کے کانوں کی میل بھی صاف ہو گئی اور ان کی زبان پر پڑے ہوئے تالے بھی ٹوٹ گئے اور وہ بھی ہنسنے اور چہکنے لگیں۔

ڈنر کے بعد کافی کا دور شروع ہوا۔ مس چندرا نے مجھے صاحب ذوق جان کر ایک پیالہ کافی بہ نفس نفیس تیار کر کے میری جانب بڑھایا۔ حالانکہ بھکشو جی بات کسی اور سے کر رہے تھے۔ لیکن نہ جانے کن انکھیوں سے دیکھ رہے تھے فوراً ہمالیہ کی بلندیوں سے اترے اور پیالہ میرے سامنے سے سمیٹ لے گئے۔

میں نے مس چندرا سے کہا "بھکشو جی سے میرا یارانہ بڑا CRONIC ہے اس لیے اس میں کچھ تعجب کرنے کی بات نہیں ہے۔

اپنا ذکر اور ان کی محفل میں ------ بھکشو جی نے فوراً سب سے ناطے توڑ کر اپنا سر ادھر کو گھما لائے اور اظہار خوشنودی کیا۔ (اور پھر وہ مس چندرا ایم اے کی جانب ایسی معصومانہ نگاہوں سے دیکھنے لگے جیسے انھیں یہ بھی معلوم نہ تھا کہ طوطے کی چونچ کس طرف ہوتی ہے اور دم کدھر کو۔)

میں نے مس چندرا سے دوسرا پیالہ لیتے ہوئے کہا۔ ایک بار میں اور بھکشو جی کناٹ پیلس سے گزر رہے تھے۔ میں نے کہا مجھے پیاس لگی ہے۔ آج تو آپ کے پلے سے لیمونیڈ پیوں گا۔ آپ تلاشی دینے پر آمادہ تو نہ ہوئے لیکن قسمیں کھا گئے کہ جیب میں ایک دمڑی تک نہیں۔ کتابوں کی ایک دکان میں پیاسے ہی گھس گئے۔ اندر داخل ہوتے ہی بھکشو جی نے ملازم سے دریافت کیا کہ صراحی کا ٹھنڈا پانی ملے گا۔ میں نے سوچا بچارا لیمونیڈ نہیں پلا سکا سادہ پانی کا انتظام کر رہا ہے۔ لیکن جب پانی آیا تو بڑھ کر گلاس منہ سے لگا لیا۔ پھر بولے۔ ایک گلاس اور لاؤ۔ میں نے سوچا چلو یہ آدمی کی فطرت ہی ہے کہ پہلے اپنی حاجت پوری کرتا ہے۔ لیکن وہ دوسرا گلاس بھی خود ہی چڑھا گئے اور لطف یہ کہ اسے اور پانی لانے کے لیے پھر قطعاً نہیں کہا ------- ایسے مذاقیہ آدمی ------- میرا مطلب ہے کہ ایسے مذاقیہ ------- ہیں آپ"

مس چندرا نے کہا۔ پر جناب آپ کو معلوم نہیں کہ بات کہنے سے زبان گھستی ہے۔ اگر وہ آپ کے لیے زبان گھساڈاتے ہیں تو پھر جب انھیں خود پیاس لگتی ہے تو کیا کرتے۔"

گو مس چندرا نے کوئی پتہ کی بات نہیں کہی تھی لیکن ان کا فرمان تھا اس لیے ہنسنا پڑا۔

اب محفل برخاست ہونے کو تھی۔

بھکشو جی یہ جاننے کے بڑے خواہشمند تھے کہ مس چندرا ام اے کدھر کو جائیں گی۔ لیکن وہ

پہل کر گئیں ۔

"بھکشو جی آپ کدھر کو جائیں گے ۔ ؟"

اس پر بھکشو جی چونک اٹھے ۔ حالانکہ مس چندا کے تیور بتا رہے تھے کہ جو سمت وہ بتائیں گے وہ بالکل اس کے الٹ چل دیں گی ۔

"موٹا میزبان بھانپ گیا ۔ بولا ۔

چندا جی آپ جائیے بھکشو جی ہمارے ساتھ رہیں گے ۔ تھوڑی دیر تک ۔ اب ان سے آپ کی ملاقات پھر کبھی ہو جائے گی ۔

چندا اور میں دونوں ایک ساتھ ہو لیے کیونکہ ہم دونوں کا ایک ہی راستہ تھا ۔ بولیں "اچھا ہوا جو آپ کا ساتھ مل گیا ۔ آپ اگلے چوراہے پر مجھے بس پر بٹھا کر آگے بڑھیے گا ۔ کیونکہ یہ سڑک خاصی سنسان رہتی ہے ۔

کچھ دیر تک باتیں کرنے کے بعد چندا خاصی معقول لڑکی معلوم ہوئی ۔

باتوں باتوں میں چندا نے بتایا کہ وہ کسی دفتر میں ملازم ہے ۔ یوں تو ہمارے سبھی دفتروں کا ماحول عورتوں کے لیے خاصا پریشان کن ہوتا ہے ۔ لیکن خاص طور سے ان کے دفتر میں انھیں بڑی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا ۔ آخر میں بولیں ۔ میں دراصل وہاں خوش نہیں ہوں ۔ مگر کیا کیا جائے مجبوری ہے ۔"

اب مجھ پر روشن ہوا کہ وہ فلرٹ ٹائپ نہیں ہے ۔ میں نے ہمدردانہ کلمات کی تلاش میں کہہ دیا ۔ ہو سکا تو میں آپ کے لیے کہیں کوشش کروں گا ۔"

یہ سن کر اس نے شکر گزار آنکھوں سے میری جانب دیکھا ۔

شکریہ ، ضرور کوشش کیجیے "اس نے بہ منت کہا ۔

پھر بولی ۔ "اچھا ہوا جو آپ کے ساتھ آگئے ۔ دیکھیے کس قدر سنسان ہے یہ سڑک" یہ کہتے کہتے وہ کسی خیالی ڈر کے تحت میرے قریب ہو کر چلنے لگی ۔

اس کے قریب آنے پر میرے دل میں ایک عجیب احساس ہوا --- وہ نازی سے مختلف تھی (مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں لمبی لمبی مضبوط ٹہنیوں اور چوڑے چوڑے پتوں والا پیڑ ہوں اور چندا ایک خوش رنگ اور خوش نما چڑیا ہے اور اس کی بوچھاڑ سے بچنے کے لیے میری پناہ لے رہی ہے)

بس اسٹانڈ پر پہنچ کر ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے ۔ بس آئی تو میں نے اسے بٹھا کر ٹاٹا کہا ۔

رات کی تاریکی میں بس آگے بڑھ گئی اور کچھ دور تک اس کی روشنی کھڑکی میں چندا کی مغموم صورت دکھائی دیتی رہی ------ اسے زندگی نے مغموم بنادیا تھا۔

بس آنکھوں سے اوجھل ہو گئی تو کانوں کی لوؤں کو سردی کی شدت سے بچانے کیلیے میں نے کوٹ کا کالر دوہرا کر کے انھیں اس میں چھپالیا اور دونوں ہاتھ پتلوں کی جیبوں میں ٹھونس کر سنسان سڑک پر چل دیا۔

(۱۴)

کچھ دن بعد چندا کے بارے میں سوچتا رہا۔ ہمارے دفتر میں اس کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو سکتی تھی پھر بشن پنجری اینڈ کمپنی کا خیال آیا۔ ہر انسان کی طرح ان کی چند رگیں کمزور ضرور تھیں لیکن اس کے باوجود وہ ایک معقول انسان تھے۔ عورتوں کے معاملے میں بے حد بے ضرر۔ چنانچہ میں نے فوراً الٹی میٹم بھیج دیا کہ آج لنچ ٹائم کے دوران میں خاصر خدمت ہونے کا ارادہ ہے اور پھر موضوع سخن کی طرف بھی ایک لطیف سا اشارہ کر دیا۔

بعض الفاظ اور محاورات بے تکلف دوستوں کے ایک مخصوص حلقے میں رواج پاجاتے ہیں جو باہر والوں کو پھیکے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمارا حلقہ بھی ان تجربات سے مبرا نہیں تھا۔ مثلاً بشن پنجری کے کمرے کو سب آشیانہ حضرت حقیر فقیر و دیگر ۸۴۰ شری بشن پنجری کہتے تھے، اور میرا کمرہ ٹیلیہ سنت گورو بالنا تھ کہلاتا تھا۔

جب میں ان کے کمرے میں پہنچا تو دیکھا کہ آپ شارک سکن کی بشرٹ زیب تن کیے ہیں اور فلالین کی لوہ چوئی پتلون۔ یوں تو جب کبھی ان کے یہاں جاتا تو وہ اتنا اہتمام ضرور کرتے کہ آنے والے کو اپنی اہمیت کا احساس ہو۔ لیکن آج بطور خاص چاروں طرف کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ چاء کا بروقت انتظام کر لیا گیا تھا۔ فضا میں ہر ممکن طریقے سے رنگینی پیدا کی گئی تھی۔ کیونکہ آج گفتگو کا موضوع ایک لڑکی تھی۔

اصولاً اصل مدعا کا بیان ہونا **چاہیے تھا** لیکن میں نے جان بوجھ کر داستان کا آغاز اسی ڈنر سے کیا اور بزعم خود بڑے دلکش پیرائے میں اس نوخیز نیک خاتون کا ذکر کیا۔ سارے واقعات بالترتیب پیش کیے اور یہ بھی کہا کہ آپ کے نہ ہونے سے جلوہ ہائے حسن نڈھال ہو ہو گئے۔ کیونکہ فی الحقیقت ان کا خاطر خواہ قدرداں وہاں کوئی نہ تھا اور پھر ایک نکتہ یہ بھی کہ بھونڈی قدردانی سے نفیس مزاج خواتین کو مسرت کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ الٹے انھیں کوفت ہوتی ہے۔

("وہاں یا تو آپ ایسا بلبل ہزار داستاں ہو یا کوئی ایسا انسان جو زبان خاموشی میں رموز حسن و عشق کا انکشاف کر سکے ۔)

اس پر بشن پنجری نے اظہار مسرت و اطمینان کیا ۔ میں انھیں خوش کرنے کے لیے ذرا مبالغے سے کام لے رہا تھا ۔ اور وہ بھی داد کو بہ کمال دیدہ دلیری سے قبول فرما رہے تھے ۔

شری بشن پنجری نے ساری داستان بڑی توجہ سے سنی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر انھوں نے ٹانگیں اکڑائیں اور کرسی کو پیچھے کی جانب جھکا دیا ۔ اور پھر سگریٹ کا بہت گہرا کش لے کر منہ اور نتھنوں دونوں میں سے دھوئیں کے دبیز بادل چھوڑتے ہوئے فرمایا ۔ " تو گویا آپنے اس پری رو کی محفل میں اہم پارٹ ادا کیا ۔

"جی، لیکن ـــــــ اس سے بھی زیادہ اہم پارٹ اب آپ ادا کرنے والے ہیں ۔ "

ان کی ٹانگیں ڈھیلی پڑ گئیں اور وہ دفعتاً دھڑام سے آگے گر گرے ۔

"میں ؟ "

"جی آپ " میں نے مصمم تیور بنا کر کہا ۔

اس پر ان کی دلچسپی عود کر آئی ۔ "اوہ ـــــــ میں ـــــــــــ میں آپ کا مطلب ـــــــــ "

میں نے ٹھنڈے پانی کا گلاس آگے بڑھاتے ہوئے کہا ۔ "آپ شانت ہو جائیں ، میں سب کچھ بتائے دیتا ہوں ۔

اس الجھن میں وہ گلاس اٹھا کر بیچ بیچ دو چار گھونٹ پی گئے ۔

میں نے کچھ تامل کیا تاکہ ان کی آتش شوق اور بھڑک اٹھے اور پھر کہا ۔ "بات یہ ہے کہ آج کل وہ پری سنکٹ میں ہے ۔ "

"سنکٹ ؟ سنکٹ کیسا ؟ "

"جس دفتر میں وہ کام کرتی ہیں وہاں کا ماحول ان کے مناسب حال نہیں ۔ "

"اچھا تو پھر ۔ ؟ "

"اب ضرورت اس امر کی ہے کہ ان کی مشکل کشائی کی جائے ۔ "

"یعنی ۔ "

"یعنی یہ کہ ہمارے دفتر میں گنجائش ہے نہیں آپ کے یہاں ہو تو بتایئے ۔ "

اس پر بشن پنجری نے قدرے تامل کیا ۔ اور پھر کہا ۔

" ابھی آپ ان سے کہہ دیں کہ دو چار روز اور سنکٹ میں رہیں ۔ ادھر پتہ لگاؤں اگر کوئی

صورت نظر آئی تو پھر ضرور کوشش کی جائے گی۔

(۱۵)

(ادھر بشن پنجری حالات کے دریا میں تکڑم کا کانٹا لٹکائے جل پری چندرا کو اڑنگنے کی فکر میں تھے ادھر ہمارے سر پر اکونومی کمیشن ECONOMY COMMISSION کا گدھ منڈلا رہا تھا۔) اس کمیشن کا مقصد یہ تھا کہ اخراجات کم کرنے کے حیلے سے چند غریب الوطنوں کو سڑکوں کی گرمی سردی کا مزہ چکھایا جائے جو وہ اب کچھ دنوں سے بھولے جا رہے تھے۔

اس اندھیر گردی میں بیچارے نوکری پیشہ آدمی دو وقت ٹکڑوں کی حفاظت کے لیے جو کچھ بھی کرتے سو کم تھا۔ ایسی بے شمار حرکتیں سبھی سے ہوتی رہی تھیں۔ چنانچہ ایک حرکت فگار صاحب نے کی جو خاص دلچسپ تھی۔

ہمارے ایک بزرگ دوست تھے جو ہمارے ہی دفتر میں کام کرتے تھے نام تو پایا تھا نیک اختر لیکن انکی زندگی اس امر کی تردید تھی۔ صورت سنجیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ ایسی جیسی اولوں کی بوچھار سے مارا، پرنچا بیٹر۔ اس قسم کے بیٹر ہمارے ملک میں عام طور سے دیکھنے آتے ہیں --- نیک اختر بوس کے دوست تھے۔ دونوں میں ایک بات مشترک تھی۔ دونوں بوڑھے ہو چلے تھے۔ نیک اختر خوش رہتے تھے اور دوسروں کو خوش رکھتے۔ بیحد ذہین اور شریف الطبع انسان تھے۔ ان کے پہلو میں انسان کی محبت کو گرما دینے والا دل دھڑکتا تھا۔ ایسا نفیس انسان مہاتماؤں کی سرزمین پر اس قدر ناخوش اور بدنصیب تھا کہ انہیں بدنصیب کہنا گالی دینے کے مترادف تھا۔ جیسے لوگ اندھے کو اندھا نہیں سورداس یا حافظ جی کہتے ہیں۔ اسی طرح انھیں نیک اختر کہا جاتا تھا۔

اس خیال کے تحت کہ نیک اختر جی بلند اختر بوس کے پاس زیادہ تر اٹھتے بیٹھتے ہیں۔ فگار صاحب نے ان پر ایک مضمون لکھ مارا تاکہ بوس کی گڈ بکس (GOOD BOOKS) میں آجائیں۔ مدعا تو معمولی سا تھا۔ لیکن فگار صاحب نے قدم قدم پر پنڈت نیک اختر کے نام کی رٹ لگادی۔ لاہور میں ایک مشاعرے کا تذکرہ کرتے ہوئے کچھ اس طرح سے لکھا:۔

"ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلبل ہند پریزاہنڈ کر رہی تھیں۔ پنڈت نیک اختر کو نہ پاکر ادھر ادھر دھیان سے دیکھا اور کارکنوں سے پوچھا۔ پنڈت نیک اختر نظر نہیں آئے۔ حالانکہ پنڈت نیک اختر کو مدعو کیا گیا تھا۔ پنڈت نیک اختر آئے بھی تھے۔ لیکن پنڈت نیک اختر کو دربان نے پھاٹک پر روک دیا۔

ضمناً فگار صاحب یہ بھی لکھ گئے کہ " میں وہ سہانی صبح کبھی نہیں بھول سکتا۔ جب میں بلبل ہند کے پاس بیٹھا محو گفتگو تھا۔ دفعتاً بلبل ہند نے کہا۔ فگار صاحب آپ کا کلام ادبی رسائل میں دیکھنے میں آتا ہے -------- لیکن کیا آپ کا کوئی مجموعہ کلام یا دیوان شائع نہیں ہوا۔ (اس پر میں نے فوراً اپنا کتابچہ چوب طبل آگے بڑھا دیا جو ساڑھے تیرہ صفحوں پر محیط تھا۔ " یہ مجموعہ پیش کر کے آپ اخلاقاً شرمائے اور بلبل ہند اسے دیکھ کر اور زیادہ شرمائیں۔)

دفتر میں ایک سکھ بزرگ جو ہمارے سیکشن میں کام کرتے تھے لیکن انداز بزرگانہ رکھتے تھے۔ اکثر میرے کمرے میں آجاتے، کیوں کہ انھیں تنہائی یہیں پر محسوس ہوتی تھی۔ آرام کرسی میں دھنس کر سوجاتے۔ دو گھنٹے بعد جب جاگتے تو فرماتے میں ہر روز آدھ سیر دہی کی لسی پی لیتا ہوں اس لیے غنودگی طاری ہوجاتی ہے اور پھر پوچھتے کہ کیا آپ کو لسی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ؟ میں جواب دیتا " سردار صاحب جی! پینے کو تو میں ڈیڑھ سیر دہی کی لسی پی جاؤں لیکن مشکل یہ ہے کہ سونے کے لیے اتنا وقت نکالنا میرے لیے ممکن نہیں اس لیے میں اتوار یا چھٹی والے دن لسی پیتا ہوں اور یا اگر لسی پینے کو بہت جی چاہے تو دفتر سے چھٹی لے لیتا ہوں۔ "

میری ان حکمت عملیوں کے تذکرے سے سردار صاحب بہت محظوظ ہوئے۔ لیکن آدھ سیر دہی کی لسی پینے سے پھر بھی باز نہیں آئے۔

وہ بھی زمانے کی کافی مار کر کھائے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے مجھے بھی بعض ہتھکنڈوں سے سرفراز کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان ہتھکنڈوں سے میری حالت سدھرتی تو کسی اور بندہ خدا کی حالت بگڑتی تھی۔ اس لئے میں ان پر ایمان نہیں لاسکا۔ میں خدا ترس نیک طینت، یا پاک باطن انسان نہیں ہوں۔ لیکن جو حرکتیں مجھے مضحکہ خیز معلوم ہوتی وہ عموماً نہیں کرتا۔

چنانچہ اکانومی کمیشن کے سامنے میری کوئی پیش نہ گئی اور میں نوکری سے الگ کر دیا گیا۔ لیکن فوراً ہی ایک اور رسالے کی ادارت کے لیے روک لیا گیا۔ وہی آسمان سے گرے کھجور میں اٹکے والی مثال صادق آتی تھی۔ اس طرح جاتے جاتے کمیشن ہم سے بہتوں کے سر پر دو دھارا تیغا ایک بال سے باندھ کر لٹکتا چھوڑ گیا۔

(۱۶)

اس ناگہانی آفت سے عارضی طور پر چھٹکارا پانے کے بعد ایک روز دفتر میں بیٹھا پسینہ پونچھ رہا تھا کہ شری بشن پنجری مسکراتے ہوئے آئے اور آتے ہی دھڑام سے آرام کرسی میں دھنس گئے اور مجھ سے سوال کیا۔

"بوجھو تو سوامی بالناتھ جی! آج میں اتنا خوش کیوں ہوں؟"
"میں نے جواب دیا۔ یہ پوچھنے سے پہلے میں حلوہ گاجر اور چائے کا آرڈر پسند کروں گا اور پیشتر اس کے کہ چائے یہاں پہنچے میں مس چندا کو فون کرتا ہوں۔ کیونکہ وہ یہاں سے اس وقت دور نہیں ہیں ------"
اس پر بشن پنجری نے اپنا روکھا سوکھا ہاتھ چھاتی پر رکھا اور دوسرا میری جانب پھینکتے ہوئے بولے۔ "مان گئے۔ بالناتھ جی مان گئے۔ واہ کیا بات ہے ------ بیشک آپ کا پد بہت اونچا ہے۔
میں نے چندا کو فون کیا تو بشن پنجری نے اشتیاق سے پوچھا، کیا بولیں۔"
"انکار نہیں کیا انھوں نے۔"
"دھن باد! بالناتھ جی، آپ کی بات میں ایک نکتہ ہوتا ہے۔"
میں آداب بجالایا۔ بشن پنجری نے سلسلہ کلام جاری رکھا۔ "ٹھیک تو ہے اگر انھوں نے انکار نہیں کیا تو یہ کیا کچھ کم ہے۔ مزا آگیا۔ یا پھر ابھی عارف کے منہہ سے ایسے پھول جھڑتے ہیں۔
کافی عرصہ سے عارف سے ملاقات نہیں ہوئی تھی میں نے پوچھا "ہاں بھئی عارف بہت دنوں سے غائب ہے آخر ماجرا کیا ہے؟"
"اس کے ساتھ بڑی ٹریجڈی ہو گئی ہے۔"
یوں تو اس کی ساری زندگی ہی ٹریجک ہے۔ لیکن یہ نئی آفت کہاں سے آگئی۔"
"بات یہ ہوئی کہ بچارے بھکشو جی کے چنگل میں پھنس گئے ------"
"مفصل کہو بھائی۔
"یہ بھی ایک داستاں سے کم نہیں۔ پچھلے ہفتے عارف صاحب آفت کے مارے بھکشو جی کے کمرے میں پہنچ گئے۔ چند منٹ برقی پنکھے کی ہوا کھانے کے بعد رخصت چاہی تو بھکشو جی نے بہ اصرار انھیں بٹھادیا۔ اور کہا۔
تشریف رکھیے عارف صاحب! ایسی بھی کیا جلدی ہے۔ دم لیجیے چار بجے تک ہم کناٹ پیلس چلیں گے (AND WE WILL HAVE GOOD TIME)
عارف صاحب خرچ سے ٹوٹے ہوئے تھے۔ بے تکلفانہ بولے۔ بھئی بھکشو جی آج کل میری جیب میں پھوٹی کوڑی بھی نہیں، بھکشو جی نے دلاسا دیا۔ اجی پیسے کی بھلی کہی۔ بیٹھیے بیٹھیے (WE WILL HAVE GOOD TIME) اب عارف صاحب ٹھہرے باشراب و کباب مائپ کے انسان اور پھر بہت دنوں سے تر نہیں ہوئے تھے مجھے غیب سے مدد مل رہی ہے۔

راضی ہو گئے۔ اس وقت ڈیڑھ بج چکا تھا۔ تین گھنٹے کے طویل انتظار کے بعد دفتر سے نکلے۔ بھکشو جی نے کہا ذرا دریا گنج میں رکنا ہو گا۔ تھوڑا کام ہے۔

بس میں بیٹھے تو اپنا ٹکٹ لے لیا۔ ساتھی کا نہیں لیا۔ جب ٹکٹ چیکر نے عارف کو آدبوچا تو کہا بھول گئے تھے۔ دریا گنج میں آدھے گھنٹے بور کرنے کے بعد بس میں بیٹھے پھر عارف کا ٹکٹ نہیں لیا اور عارف صاحب کے دوبارہ دبوچے جانے پر پھر یہ کہہ دیا کہ ان کا ٹکٹ لینا بھول گئے۔ کناٹ پیلس پہنچے تو ساڑھے پانچ بجے تھے۔ بھکشو جی نے کناٹ پیلس کے باہر والے دائرے کے تین چکر لگا ڈالے۔ عارف میاں اس امید میں بھی بھکشو جی کسی فرسٹ کلاس ریستوران میں گھس جائیں گے جوتے چٹخاتے رہے۔ یہاں تک کہ ان کی چولیں ڈھیلی ہو گئیں۔ بالآخر انھوں نے اپنی ٹوٹی ہوئی کمر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

"بھکشو جی میری تو ٹانگیں لرزنے لگی ہیں۔ اب کہیں بیٹھ جائیے۔"

بھکشو جی انھیں سینما کے سامنے والے گھاس کے پلاٹ کی طرف لے گئے۔ اور وہاں بیٹھ رہے

عارف صاحب کے حلق میں کانٹے پڑ گئے تھے۔ بولے "بھکشو جی پیاس لگی ہے۔"

بھکشو جی نے ادھر ادھر دیکھا اور کہا، کوئی نل بھی تو دکھائی نہیں دیتا، پھر یاد آیا تو چٹکی بجا کر بولے۔

"ہاں خوب یاد آیا۔ مدراس ہوٹل کے پاس پانی کی سبیل ہے، وہاں اوک سے عارف صاحب نے پانی پیا۔ پھر اسی گھاس کے پلاٹ پر آن بیٹھے۔ اندھیرا ہونے لگا تو بھکشو جی بولے، اچھا بھئی (WE HAD VERY NICE TIME) اب اجازت چاہتا ہوں۔ ادھر عارف ادھ موئے ہو رہے تھے بولے۔ "بھکشو جی آپ کے پاس چار آنے ہوں تو عنایت کیجیے، میرے پاس تو بس کا کرایہ تک نہیں ہے۔ اس پر بھکشو جی نے انھیں مزید آدھے گھنٹے تک دنیا کے نشیب و فراز پر لیکچر دیا اور کہا۔ دوست! افسوس کہ میں آپ ایسا خوش قسمت نہیں ہوں۔ آپ آزاد ہیں نہ بیوی نہ بچے نہ کوئی اور جھنجھٹ ------ اچھا رخصت۔ الوداع! یہ کہہ کر انھوں نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور لبادہ پھڑپھڑاتے چل دیے۔ عارف صاحب نے ایک واقف دکاندار سے چار آنے لیے اور بمشکل اپنے ڈیرے تک پہنچے۔ اور اسی دن سے بستر پر دراز ہیں۔ سنا ہے جوڑوں کے درد میں مبتلا ہیں۔"

میں نے کہا بھکشو جی ٹھیک کہتے تھے۔ گھر میں بیوی بھی ایک بچی بھی اور صرف دو ہزار روپے ماہوار تنخواہ۔۔۔۔۔"

کچھ دیر اظہار تاسف کرتے گزری اتنے میں چپراسی نے اطلاع دی کہا کہ ایک مس صاحبہ آئی ہیں۔"

میں نے بشن پنجری کو اچھلنے سے روکتے ہوئے کہا۔ "اندر بھیج دو۔"

چپڑاسی نے چق اٹھاکر بڑی لوچ دار آواز میں کہا۔ "مسی صاب اندر آجائیے۔ صاحب بلار ہے ہیں۔"

تعارف کروانے پر بشن پنجری پھدک کر اٹھے اور پھر دونوں ہاتھ جوڑکر پر نام بجالائے۔

میں نے ملائم الفاظ میں ان کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے عزت اور اعتماد پیدا کرنے کی کوشش کی۔ بشن پنجری نروس ہورہے تھے۔ انھوں نے اس کیفیت پر قابو پانے کے لیے سگریٹ ٹٹولا۔ اور مؤدبانہ اجازت طلب کی۔

مس چندا نے ان سے آنکھیں ملاکر جھکالیں۔ ان حالات میں چائے آڑے آئی، چائے تیار کرنے پلیٹیں بڑھانے نیز دیگر تکلفات میں شروع شروع کی گھبراہٹ دور ہوگئی۔

اب بشن پنجری نے صنف نازک سے برتاؤ کے بارے میں متعدد کتابوں کی ہدایات کو یاد کرتے ہوئے پھونک پھونک کر قدم بڑھانا شروع کیا۔

"مس چندا بات یہ ہے کہ آپ کے لیے یقیناً جگہ پیدا ہوجائے گی۔ اس سلسلے میں آپ کے دل میں جو بھی پریشانی ہو اسے رفع کردیں۔"

مس چندا نے بلا تاخیر پریشانیاں رفع کرتے ہوئے ذرا رفع تر انداز سے مسکرانا شروع کیا جس پر میں نے بشن پنجری کو نظروں ہی نظروں میں داد دی۔

اب باقی تفصیلات میں اہم ترین بات یہی تھی کہ انھیں ایک ٹیسٹ دینا پڑے گا۔

(۱۷)

مس چندا کے دیگر امتحانوں کے علاوہ ایک امتحان راشٹریہ بھاشا کا بھی تھا اور واقعات کی ستم ظریفی دیکھیے کہ یہ پرچے جنچنے کے لیے گئے بھی تو بھکشو جی کے پاس۔

انھیں دنوں ایک شام بھکشو جی اور میں اوپر والی منزل پر واقع "گےلارڈ" ریستوراں میں بیٹھے تھے۔ مدت دراز کے بعد یہ بن باسی کو امیرے قابو میں آیا تھا۔ آج وہ مجھے بیئر پلار ہے تھے۔ اور اس کے بعد کئی اور لذیذ چیزیں کھلانے پلانے والے تھے۔ جس طرح ایک دھرم استھان پر بارہ برس کے بعد کمبھ میلہ لگتا ہے اسی طرح بھکشو جی مجھ ایسے بے تکلف دوست کے اڑنگے تلے بھی کہیں بارہ برس کے بعد ہی آتے تھے۔ میرا پختہ یقین ہے کہ ان کا یہ کمزور لمحہ ضرور علم نجوم کے

کرہ ہائے آسمانی کے مخصوص برجوں میں پہنچنے سے متاثر ہوتا ہوگا۔
اس سہانی شام کو میں نے گفتگو کا آغاز ان الفاظ سے کیا۔
"بھئی بھکشو! تم نے کچھ ایسے گدایانہ تیور پائے ہیں کہ اس وقت باوجودیکہ تم اپنے پلے سے مجھے کھلا پلا رہے ہو۔ پھر بھی دکھائی یوں دیتے ہو جیسے میری گرہ سے کھا رہے ہو۔"
اس پر بھکشو جی بڑی بے سرو سامانی سے مسکرائے اور اپنی آواز میں سوز و گداز پیدا کرکے بولے۔
"یار چھڈ انہاں گلاں نوں کوئی چوندی چوندی گل کر۔"
"میں نے محسوس کیا کہ آج بھکشو جی میزبان ہیں یعنی ان کا زر نقد لگ رہا ہے۔ اس لئے میرا یہی فرض ہے کہ انکی تفریح کا سامان پیدا کروں۔ بھکشو جی ان انسانوں میں سے تھے جو یوں صنف نازک کے قرب کی حسرتیں رگ رگ میں رچائے ہوئے ہوتے ہیں۔ لیکن موقع پڑنے پر رخ تاباں کی گرمی ہی سے موم کے پتلے کی طرح پگھل کر پانی پانی ہو جاتے ہیں۔ پر کیا کیا جائے۔ نمک حلالی کا تقاضہ یہی تھا کہ رنگین و معطر آنچلوں کا ذکر چھیڑا جائے۔ کیونکہ اس ذکر سے بڑھ کر اور کوئی شے ان کی روح کی بے قراری کو قرار نہیں دیتی۔ چنانچہ میں نے بر سبیل تذکرہ دریافت کیا:۔
بھئی! وہ ------- ایک ------- لڑکی ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کا راشٹریہ بھاشا کا پرچہ تمہارے پاس آیا ہے۔"
بھکشو جی بدکے، کیونکہ انھیں اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں اس پرچے کے بارے میں جانتا ہوں اور نہ انھیں اس بات کا علم تھا کہ وہ پرچہ چندا ہی کا تھا۔ ماتھے پر بل ڈال کر بولے۔
"بھئی کون پرچہ؟"
"بچے مت بنو۔ وہی راشٹریہ بھاشا کا پرچہ جو تم آج کل جانچ رہے ہو۔؟
اب مان گئے۔ "ہاں جانچ رہا ہوں۔ اچھا تو وہ کسی لڑکی کا ہے ------- پرچہ اچھا نہیں کیا۔ میں اسے فیل کر رہا ہوں ----------- لڑکی --------- بھئی میں نے وہ لڑکی دیکھی تک نہیں۔ پرچے پر نام وام تو ہے نہیں کسی کا -----"
میں نے فلم ویلن کی طرح کہنی آگے کو بڑھا کر رازدارانہ لہجے میں کہا۔
"اس لڑکی کو بلایا جا سکتا ہے یہاں ----- اسی وقت۔"
بھکشو جی کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ انھوں نے اپنے کوٹ نما چغے کو زور سے بدن کے گرد لپیٹ لیا۔ جیسے تیز و تند آندھی چل رہی ہو۔ سر اور مونچھوں کے بال ایڑیوں کے بل کھڑے ہو گئے

اور ڈاڑھی و دیگر بالوں ے دھواں دھار غبار میں سے ان کے دم بدم پیلے پڑتے ہوئے چہرے کی کیفیت قابل دید تھی اور پھر یک بارگی اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"کوئی دیکھ لے تو---"

"میں نے جواب دیا۔ اس کا سیدھا علاج یہ ہے کہ لڑکی کو تمہاری زد سے باہر بٹھاؤں گا ---یعنی اس کی کرسی میرے قریب ہوگی اور تم سے دور۔"

اس پر انھوں نے اپنے مخصوص انداز سے سر آگے بڑھایا ایک ہاتھ سے پاجامہ سنبھالا اور دوسرا حسب عادت میرے کندھے پر رکھا اور میری دو کوڑی کی آنکھوں سے اپنی مخمور آنکھیں ملائیں ------ مجھے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ ان آنکھوں میں یہ خمار کس سلسلے میں ہے۔ کیونکہ روحانیت تو انھیں چھو کر بھی نہیں گزری۔ ہیرا پھیری، تکڑم بازی، دیدہ دلیری ان کی نس نس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ----- خیر تو انھوں نے جذبات میں ڈوبی ہوئی باریک اور لرزاں آواز میں بہ منت کہا۔

تینوں سو بنہ اے بے تو ایس طراں کریں تاں۔

"بچھا جا، نئیں کراں گا۔" میں نے قول دے دیا۔

"اوئے توں بوت پیار الگنا ایں۔" بھکشو جی نے تعریفی نظروں سے میرے چہرے کا جائزہ لیا۔ "اچھا تو کیسی چڑی ہے وہ۔ اوئے سچ مجھے کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔"

"وہ چڑی تمہارے رنگین خوابوں کی تعبیر ہے۔"

"سچ؟" اس نے وارفتگی سے سر ہلایا۔

اس وقت اس کا منہ نیم وا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ جلدی سے اسے بند کرلے، مبادا رال ٹپک پڑے۔

میں چندا کو فون کرنے کے لیے اٹھا تو اس نے میرا ہاتھ تھام لیا اور نسائی انداز میں کہا۔ "تم مت جاؤ بھئی مجھے تنہا ڈر لگتا ہے۔"

میں نے بزرگانہ انداز میں تشفی دیتے ہوئے جواب دیا۔ "محبت کی منزل تنہا طے پاتی ہے اس راہ میں نہ کوئی ساتھی بن سکتا ہے اور نہ بنانا ہی چاہیے ----- اور پھر ابھی سے گھبرانے کی کیا بات ہے۔"

اس پر بھکشو جی نے میرا بازو چھوڑ کر کرسی کی پشت سے پیٹھ لگالی۔ جیسے لنگر توڑ بیٹھ رہے ہوں۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر میں نے نمبر ملایا۔

"ہلو" چندا کی آواز آئی۔

"میں --- یعنی میں بول رہا ہوں۔"

"میں پہچان گئی آپ کو ----- آپ بول کہاں سے رہے ہیں۔؟"

"میں کایا کے پنجرے سے بول رہا ہوں۔ اور آپ کو بلا رہا ہوں آپ فوراً" گے لارڈ ریستوراں" میں پہنچیں۔یہاں پر ایک فقیر کا آشیرواد دلانا ہے آپ کو۔"

آشیرواد ؟آپ کیا باتیں کر رہے ہیں ؟"

سچ کہہ رہا ہوں۔مذاق کی بات نہیں ہے۔اک بہت بڑے رشی کیلاش پربت سے اتر کر ابھی ابھی یہاں آئے ہیں۔ اگر آپ بروقت پہنچ جائیں تو آپکی ملازمت والا معاملہ سیدھا ہو جائے کیونکہ آپ کا راشٹریہ بھاشا والا معاملہ ذرا گڑبڑ ہو گیا ہے۔وہ ٹھیک ہو جائے گا۔وہ رشی بہت پہنچے ہوئے ہیں۔"

"کہاں پہنچے ہوئے ہیں ؟"

"آپ ان باتوں کو نہیں سمجھیں گی۔بس آنے کی کرپا کیجیے۔"

"بہتر، میں پہلی بس سے پہنچنے کی کوشش کروں گی۔"

جب میں واپس پہنچا تو بھکشو جی نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔"کیا جواب ملا؟"

"ابھی آئی۔"

یار! بھکشو نے میرا بازو تھام کر کہا۔اتنی دیر میں انھوں نے یہی دو الفاظ کہے ---- لیکن تم ایک کلاکار ہو تم مہا کلاکار ہو۔ابھی آئی۔بتاکر تم نے اس لہر کا بین ثبوت پیش کیا ہے ابھی آیا، میں کس قدر پھس پھسا پن ہے۔ لیکن ابھی آئی میں، کتنی شیرینی ہے، کتنی موسیقی ہے، کتنی زندگی ہے، کتنی جھنکار ہے --- "

اور "ابھی آئی، کسی چوندے چوندے عوامی گیت کا عنوان بھی بن سکتا ہے" میں نے ان کی ڈاڑھی کی کونپل کو چھوتے ہوئے رائے دی۔

(۱۸)

انہیں دنوں والد صاحب اپنے اک انجینئر دوست کے ہمراہ آئے۔ وہ اکونومی کمیشن کے رگڑے سے میری جان چھوٹ جانے پر مسرور تھے ---- دیگر بوڑھے باپوں کی طرح ممکن ہے پہلے زمانے میں نوجوانوں کو روزی کمانے کے لیے زیادہ محنت کرنی پڑتی ہو۔

یا جان جوکھوں میں ڈالنی پڑتی ہو۔ لیکن آج کے نوجوان زندگی میں پاؤں جمانے کے لیے جس ذہنی اور روحانی کوفت کا شکار ہونا پڑتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ جلد یا بدیر زندگی کی چنگاری کی چمک تک ان کے کردار سے مفقود ہو جاتی ہے ---- ایسے حالات میں اگر بچے کا تیر نشانے پر بیٹھ جائے تو بزرگوں کے لیے بجا طور پر خوشی کا مقام ہوتا ہے۔ انھوں نے اسی خوشی میں بوس کو مشہور ہوٹل امپیریل میں ڈنر دیا۔

میں بھی اس پارٹی میں شامل تھا۔ چونکہ سامنا ایسے اشخاص کا تھا جو قابل احترام بزرگ تھے اس لیے میں نے کوفت سے بچنے کے لیے ایک ہم عمر کو ہم نوالہ و ہم پیالہ بنالیا اور ہم سب ایک کمرے میں ہوتے ہوئے بھی ذرا ہٹ کر ان بزرگوں کی لنترانیوں سے لطف اندوز ہوتے رہے۔

حضرت بس اگر چہ ہر روز پیتے تھے لیکن اس معاملے میں بہت حساس واقع ہوئے تھے اپنے روبرو گھڑی رکھ کر ایک ایک بیگ کو مختلف منزلیں طے کر کے پیتے تھے۔ لیکن اس شام ترنگ میں آگئے اور گھڑی کے عوض گھڑا سامنے رکھ کر پی گئے۔

جب بزرگ اپنے آپ کو فرش کی سطح سے بالشت بھر اونچا محسوس کرنے لگے تو سوال پیدا ہوا کہ ہم بچوں کی موجودگی میں موضوع سخن کیا ہو؟

"میرا خیال تو یہ ہے کہ اب عزیزم کی شادی کر دی جائے۔

یوں تو بوس ہاں میں ہاں ملانے کے قائل تھے لیکن اس پر ستاؤ پر بھنا اٹھے۔ بولے صاحب میں شادی کا قائل نہیں ہوں۔ وجوہ (وجوہات نہیں) بیان کرنے کے لیے وقت درکار ہے لیکن براہ راست تجربے (تجربہ نہیں) کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ بیوی کی حیثیت سے عورت زہر قاتل سے کم نہیں ہے ----- میں ہو کے عالم کو بیوی پر ترجیح دیتا ہوں ---- سناہاہا!!"

اس پر والد صاحب ہنس دیے اور انھوں نے اپنے مخصوص انداز میں فارسی کا شعر پڑھا۔ جسے سن کر بوس اس قدر محظوظ ہوئے کہ میری شادی پر نیم رضامند ہو گئے۔

انجینئر صاحب بولے "شادی کے لیے لڑکی کا انتخاب بڑی احتیاط سے ہونا چاہیے۔ حسین ہو پڑھی لکھی ہو۔ باسلیقہ، بااخلاق ہو، باوفا ہو ------"

اوصاف کی یہ فہرست سن کر بوس کے ہونٹوں پر زہر خند پیدا ہوا، بھلے پن سے سر ہلاتے ہوئے بولے۔

"ہاں صاحب۔ ضرور۔ ضرور ------ بس ایسی لڑکی تلاش کیجیے۔"

چاندنی رات تھی۔ ہوٹل کی کھڑکی میں سے گہرے سبزے کی لان پر بھولی بھٹکی چند رنگین کرسیاں بڑا دلچسپ منظر پیش کر رہی تھیں۔

اس قدر بے ضرر آغاز کے بعد گفتگو بڑے نازک مراحل طے کرنے لگی۔
عام ڈائننگ ہال کے علاوہ ایک خاص ڈائننگ روم بھی تھا جہاں کی فیس داخلہ ہی تین چار روپے فی کس تھی۔ یہ ہال صرف خاص ہستیوں کے لیے مخصوص تھا۔ یہاں پر اہم ترین ملکی اور غیر ملکی افراد دکھائی دیتے تھے۔
اس پر تکلف کمرے میں کھانا ختم ہی کیا تھا کہ ایک بیرا بوس کے لیے ایک رقعہ لایا۔ معلوم ہوا کہ ان کے ایک دیرینہ مہربان راجہ صاحب جو اب بہت اونچے سرکاری رتبے پر سرفراز تھے دوسرے ٹیبل پر بیٹھے انھیں یاد فرما رہے ہیں۔
بوس فی البدیہہ وہاں پہنچے۔ راجہ صاحب کی شامت جو آئی تو باتوں باتوں میں پوچھ بیٹھے "کیوں صاحب! کوئی تازہ کلام بھی کہا ہے آپ نے۔"
اس پر بوس اصیل عربی گھوڑے کی طرح تھر تھرائے اور اپنی پٹھانی آواز میں مخصوص طوفانی انداز میں بادل کی گڑگڑاہٹ کی طرح گرج اٹھے۔
"عرض کرتا ہوں۔
خوشا! اے پاک سرزمین ہند کہ اس جگہ سکندر آیا، میگستھنیز آیا اور فاہیان آیا
ڈرائنگ روم کی پر تکلف اور مسکین فضا میں جو ایک بے باک قلندر کی دغدغے دار آواز گونجی تو سامعین میں بعض کے ہوش خطا ہو گئے۔ اور بعض کی کوئی اور شے خطا ہو گئی۔ کچھ دیر میں خواتین نے یہ سمجھ کر کہ ڈاکوؤں کے ٹولے نے HOLD UP کیا ہے۔ پہلے ہاتھ اوپر کیے اور پھر خود کھڑی ہو گئیں۔ بیروں کے ہاتھوں سے قاب چھوٹ گئے۔ بعض کے دل دم بھر کو رکے اور پھر الٹی قلابازی کھا کر آگے بڑھے۔
معجزہ یہ ہوا کہ بوس BY INSTINCT چپ ہو گئے۔ ورنہ اس رات کا بیان اس ہوٹل کی تاریخ میں خونی قلم سے لکھا جاتا۔
غرض اس طرح یہ محفل اللہ کے فضل سے بخیر و خوبی ختم ہوئی۔ والد صاحب سے رخصت ہوئے تو میں بوس کو موٹر تک چھوڑنے گیا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے ان کی غیر متزلزل حالت کی جانب اشارہ کیا تو وہ پھر ایک شعر پڑھنے سے بال بال بچے اور کہا اور کہ وہ بڑی آسانی سے موٹر چلا سکیں گے۔"
بجلی کے قمقموں کی روشنی میں ان کا موٹر طوفانی لہروں پر ڈگمگاتے ہوئے جہاز کی طرح بل کھاتا پینترے بدلتا آگے کو بڑھنے لگا۔
ہائے کس قدر دلچسپ شخصیت تھی ہمارے باس کی کہ ان کے جیتے جی بے اختیار یہ کہنے کو

جی چاہتا تھا ؎

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

(۱۹)

چندا کو ملازمت مل چکی تھی اور وہ کچھ ماہ سے اپنا کام بخیر و خوبی انجام دے رہی تھی ۔ آشیانہ حضرت بشن پنجری میں آج کل نت نئے چٹکلے سننے میں آتے تھے ۔ جن کی محرک چندا تھی ۔ لیکن ان محفلوں کی فضا پر تکلف اور شریفانہ ہوتی تھی ۔ کوئی گھٹیا کلمہ سننے میں نہیں آتا تھا ۔ چندا خوش تھی کیونکہ وہ بیہودہ فضا سے وہ متنفر تھی ۔ بشن پنجری کے ہم نوالہ و ہم پیالہ شری موہن بھوگ کی کایا کلپ ہو گئی ۔ میں بھی بعض اوقات وہاں سے چلا جاتا تھا ۔ چند ہی مہینوں کے بعد نوکری کی حالت پھر مخدوش ہو گئی ۔ کئی قسم کی افواہیں سننے میں آتی رہتی تھیں ۔ وہاں جانے سے ذرا دل بہل جاتا تھا ۔

ایک روز لنچ ٹائم سے پہلے میں نے بشن پنجری کے نام مندرجہ ذیل رقعہ بھیجا: ۔

بخدمت فقیر دل گیر حضرت بشن پنجری صاحب!

بعد دعا و سلام کے واضح ہو کہ ایں درویش قائل ہو گیا ہے کہ آپ کو اللہ کی طرف سے ہدایت ہو چکی ہے اور یہی امر اس تحریر کا موجب بنا کہ فقیر سے فقیر کی راہ و رسم جائز و حلال ہے ۔

ہر چند فقیروں کے دل ایک ہی تال پر بجتے ہیں ۔ یہ فقیر خوب جانتا ہے کہ فلاں موقعہ پر آپ کیا کر رہے ہوں گے یا زیادہ سے زیادہ کیا کر سکتے ہیں ۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے احوال سے واقف رہنا مجھ پر لازم آتا ہے ۔ کیونکہ زندگی حرکت سے پیدا ہوتی ہے اور حرکت بغیر ایک دوسرے کو چوکے دیے بغیر پیدا نہیں ہوتی ۔ اس مقام مکتی کا سوال پیدا ہوتا ہے ۔ فقیر کے خیال میں جن لوگوں کو اپنے وجود سے دلچسپی نہیں ہے ۔ وہ مکتی یا نروان حاصل کرنے سے قاصر رہتے ہیں ۔ اس لیے جس مردود کو اپنے تن کی خبر نہیں اور جو اپنی صورت سے بیزار اور اپنی ذات سے بے پروا ہے وہ یقیناً دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہو گا ۔ اور چونکہ دنیا میں قدم قدم پر دھوکے اور فریب کے جال بچھے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ وہ بندہ خدا بندہ شیطان بن کر رہ جائے گا ۔ اس لیے سچا فقیر وہ ہے جو غیر معرفتی باتیں کرے ۔ نفیس لباس سلائے ، بکرے کی رانیں ، مرغ مسلم و دیگر رس دار غذائیں استعمال کرے ۔ اور ایک نظر صنف نازک پر بھی رکھے اس سے زندگی میں لوچ اور بڑا پیارا غم پیدا ہوتا ہے ۔ لیکن زیادہ تر نگاہ اپنی ذات پر مرکوز رکھے ۔ جیسا کہ میر تقی میر خود فرما گئے ہیں ۔

اپنی ہی سیر کرنے کو ہم جلوہ گر ہوئے تھے
اس رمز کو و لیکن معدود جانتے ہیں

اب کچھ حال اس نور کی پتلی کا بھی جاننا چاہتا ہوں جس کے قریب، جب آپ بیٹھے ہوتے ہیں تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ تو ملکہ باد صبا بانو ہیں اور آپ عمر عیار دکھائی دینے سے دم بدم بال بال بچتے نظر آتے ہیں۔ اور اگر کہیں وہ فقیر بھی شامل محفل ہو تو پورا طلسم ہوشربا کا منظر پیش نظر ہوتا ہے۔ اور عجیب طرح کی حیرت ہوتی ہے کہ غنیمت ہے کہ کسی صورت چند صورتیں منہ پر گرد رہ عشق ملے بظاہر ایک دوسرے کے قریب بیٹھی ہیں۔

اگر دفتر میں زیادہ کام نہ ہو یعنی عالم استغراق کی شدت نہ ہو تو حاضر خدمت ہو کر آنکھ سے آنکھ ملا کر رموز حیات پر تبادلہ خیال کرنے کا متمنی ہوں۔

از مسلیہ
گورو بالناتھ

اس رقعہ میں شری بشن پنجری کا فلسفۂ حیات جان بوجھ کر شامل کر دیا تھا۔ تاکہ ان کی آتما کو شانتی پراپت ہو۔

ادھر چپڑاسی رقعہ لے کر روانہ ہوا ادھر حضرت فگار دلکی چال چلتے میرے کمرے میں داخل ہوئے چند دنوں سے میں دیکھ رہا تھا کہ میرے کولیگ چلتے ہیں تو دلکی بات کرتے ہیں تو دلکی ان زنگ خوردہ، گرد آلودہ ہستیوں میں زندگی کی رمق باقی دیکھکر مجھے خوشی ہوتی تھی۔ لیکن حیرت اس امر پر تھی کہ ان سب خوشنما حرکات کا محرک کون ہے۔ رفتہ رفتہ پتہ چلا کہ ایک پری رو در پردہ ان کے رگ و پے میں زندگی کے شرارے چھوڑ رہی ہیے۔ شاید میں ادھر متوجہ ہی نہ ہوتا لیکن فگار صاحب کی بلاناغہ صبح و شام ٹھنڈی آہوں نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ ادھر حضرت نقش صاحب کچھ اس پر اسرار انداز سے مسکراتے تھے کہ معلوم ہوتا کہ وہ فگار صاحب کو ایسا غچہ دیں گے کہ ناکنے کے تاکتے رہ جائیں گے۔

فگار صاحب آئے تو رنگ فق تھا۔ میں نے پوچھا خیریت؟ سرگوشی میں بولے!

"وہ آئی ہے۔"

"کون؟"

اس پر فگار صاحب نے اپنے دونوں ہاتھ جھٹک کر عینک اتارلی میں سمجھ گیا کہ اب وہ بڑی اہم بات کہنے کو ہیں۔ چنانچہ انھیں اس زحمت سے بچانے کے لیے میں اٹھا اور ایک دراز میں سے ان کے کمرے میں جھانک کر دیکھا کہ ایک روکھی سوکھی پھیکی سی خاتون ان کے کمرے میں

تشریف فرماہیں ۔ ذرا غور سے دیکھا تو معلوم ہوا کہ نازی ہیں ۔ ان کی صورت اور رنگ و روپ میں زمین و آسمان کا فرق آچکا تھا ۔ انھیں دیکھ کر کچھ افسوس بھی ہوا پھر میں گھوم کر نگار صاحب سے مخاطب ہوا ۔

"میری بھی راہ و رسم تھی ان سے کبھی ۔"

"اوے چل ۔ توں کمینہ ایں ۔ توں کدیلیا سی اوہنوں ؟"

"قریب دو برس پہلے ۔ یعنی تم دو برس لیٹ ہو ۔"

"اوے جاں پراں ۔ ہاتھی دیا کنّاں! توں تاں دس کھاں اوہدا ۔"

"نازی ----- باقی باتیں تم خود ان سے پوچھ لینا ۔"

نگار صاحب زچ ہو کر لوٹ گئے ۔

چپراسی میرے رقعہ کا جواب لے آیا ۔ حضرت بشن پنجری نے بڑے زور و شور سے مجھ سے اتفاق کیا تھا اور فوراً طلب فرمایا تھا ۔

محفل خوب گرم ہوئی باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ جو کام کر رہا ہوں اس کے ختم ہونے کا امکان ہے ۔ اس صورت میں مجھے جواب دے دیا جائے گا ۔ اس لیے معاملہ قابل غور ہے ۔

شری بشن پنجری نے دوستانہ مشورہ دیا کہ خواہ یہ محض افواہ ہی ثابت ہو لیکن میرا فرض یہی ہے کہ ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دوں تو شاید بچاؤ ہو جائے ۔

(۲۰)

ہاتھ پاؤں مارنے بھی نہ پایا تھا کہ مجھے ایک ماہ کا نوٹس مل گیا -----

ادھر ادھر سے پتہ چلا کہ ہاتھ پاؤں مارنا بھی بے کار تاوقتیکہ اپنا کوئی رشتہ دار یا سرپرست سنٹرل گورنمنٹ میں نہ ہو ۔

چند دن اور گزر گئے ایک شام میں نے دفتری میں شریواستو کو کہلا بھیجا کہ اگر فرصت ہو تو چھٹی ہونے پر وہ رک جائے ۔ دونوں ذرا دریا تک چلیں گے ۔

میرے غمگین لمحوں کا ساتھی شریواستو ہی تھا ۔

ہمارے دفتر کے پچھواڑے ہی دریا بہتا تھا ۔ یہ دریا صدیوں سے بہہ رہا تھا اور صدیوں تک بہتا چلا جائے گا ۔ اگر کنارے پر اگا ہوا کوئی پھول اس پر جھک جائے گا تو وہ اسے چوم بھی لے گا ۔ ورنہ حسین سے حسین پھول کا بوسہ لینے کے لیے بھی وہ اپنا بہاؤ بھول کر ایک بالشت ادھر یا ادھر جانا قبول نہ کرے گا ---- وہ بہتا رہے گا ۔

سردیوں کی آمد آمد تھی۔ دفتر کے پچھواڑے خاموش پیڑوں کے نیچے رو کھی سو کھی گھاس پر سے ہوتے ہوئے جب میں نے جھاڑیوں کی اوٹ میں سے دریا کی جھلک دیکھی تو یوں محسوس ہوا جیسے کسی دیرینہ دوست سے ملاقات کرنے جارہا ہوں۔

شریواستو میرے ساتھ تھا اور ہم دونوں چپ تھے۔

میرے ساتھی کا رنگ کالا تھا۔ اس کا بدن اکہرا۔ وہ بالکل نوجوان تھا۔ گہرے رنگ کے باعث اس کے گوناگوں جذبات کی جھلک اس کے چہرے پر آسانی سے دکھائی نہیں دیتی تھی۔ لیکن جس انداز سے وہ سر جھکائے چلا جارہا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اداس تھا۔

جب میں اس گرد میں جس میں مویشیوں کے گوبر اور پیشاب کی بو ملی ہوئی تھی اور ان خاردار جھاڑیوں میں سے جن کے نوکدار کانٹوں میں سانپوں کی کنچلیاں لہرا رہی تھیں، ہو کر گزرا تو میں نے اپنے آپ کو زندگی کے بہت قریب محسوس کیا۔

دریا کے عین کنارے پر پہنچ کر میں نے بوٹوں کے تسمے کھولے انھیں الگ رکھ دیا۔ زمین پر رومال بچھایا اور پانو نم دار ریت میں دھانس دیئے۔

ہر قسم کے ہنگامے کو ہم بہت پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ دائیں بائیں جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور سامنے دریا کا پاٹ تھا پرلے کنارے پر کچھ مچھلیاں پکڑنے والے پانی میں کانٹے لٹکائے بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔ ان کے پس منظر میں جھاڑیاں سبزی مائل غبار کی مانند دکھائی دے رہی تھیں۔ چند بے چین آبی پرندے پانی کی سطح پر اڑتے، لمحہ بھر کو ساکن ہو جاتے اور پھر رواں ہو جاتے کچھ چڑیاں تیزی سے پھدکتی ہوئی یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے سنگریزوں میں جان پڑ گئی ہو

شریواستو نے مہر سکوت توڑا۔

"کہو اب کیا کرنے کا ارادہ ہے؟"

"بمبئی چلا جاؤں گا۔"

وہ چپ رہا۔ میں نے اس سے آنکھ ملانے سے احتراز کیا۔ کیونکہ میں جانتا تھا کہ اگر کوئی اور موقعہ ہوتا تو وہ میرا مذاق اڑاتا۔ جو ادیب سرکاری دفتر سے بھاگتا سیدھا بمبئی جاکر دم لیتا تھا۔ لیکن چونکہ اس کے سوال کا میرے پاس کوئی معقول جواب نہیں تھا۔ اس لیے میں کہہ سکتا تھا ----- پھر میں نے بچوں کی طرح پانی میں کنکر پھینکتے ہوئے کہا۔

"جانتے ہو میرے والد صاحب میری شادی کر ڈالنے کی فکر میں ہیں ----- وہ دوستوں سے اکثر کہا کرتے ہیں کہ میرے لیے کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ جو آدمی ایک بار سرکاری نوکری میں آجاتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح سے اڑا رہتا ہے" -----"

شریواستو نے بے اعتنائی سے کندھوں کو حرکت دی اور بغیر کچھ کہے میرے ڈھیلوں کے پانی میں ڈوبنے کا تماشہ دیکھتا رہا۔

"------- اور میں نے انھیں نوکری کرنے سے جواب مل جانے کے بارے میں کچھ نہیں لکھا۔ وہ یہاں سے چار سو میل پرے بیٹھے ہیں۔ مدت دراز کے بعد ان کے دل میں میرے لیے فکر پیدا ہوئی ہے۔ اب وہ باپ کی آخری خوشی یعنی میری شادی دیکھ لینا چاہتے ہیں۔ شریواستو! میرا حوصلہ نہیں پڑتا کہ میں انھیں کچھ لکھوں۔ انہیں ان کے رنگین خواب سے جگانا مجھے اچھا نہیں لگتا۔ ہمارے مابین جو بھی اختلافات رہے ہیں لیکن وہ ہمیشہ میری بہتری و بہبودی کے متمنی رہے ہیں انھیں کبھی کوئی آرام نہیں پہنچا سکا------" پھر میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا

"جانتے ہو میں نے زمین کا ایک ٹکڑا قسطوں پر خریدا ہے میں نے انھیں اس بات کی اطلاع بھی دے دی تھی۔ وہ یقیناً خوش ہیں کہ آخر اب میں راہ راست پر آرہا ہوں------ دوست کچھ میں نہیں آتا کہ میں ان کی اکلوتی خوشی کو، جو میں زندگی بھر میں انھیں اس قدر مشکل سے دے سکا کیونکر سنگ دلی کے ساتھ دکھ اور درد میں تبدیل کر دوں------"

میں نے تامل کیا، ایک بھدا سا سکوت طاری ہو گیا جسے میں نے توڑ دیا۔ زندگی کس قدر تھکا دینے والی چیز ہے۔"

پتھر پھینکنا بند کر کے میں نے دونوں ٹانگیں سمیٹ لی تھیں۔ اور گھٹنوں کے بیچ میں ٹھڈی جما کر پانی کی پر سکون سطح پر نظروں کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ میرے ساتھی نے اچانک یہ سوال کیا۔

کیا تمھاری ملازمت کے یہ ڈھائی برس ایک ڈراؤنے خواب کے مانند نہیں تھے؟"

"تھے۔"

اسی طرح بیشتر لوگ تمھاری طرح پریشان رہے اور اب بھی ہیں۔ بعض تم سے کہیں زیادہ بری حالت میں ہیں------- تم لوگ نئے نئے آئے تو سب کولیگ آپس میں کیسے جھگڑے کرتے تھے-------- کیا تم سمجھتے ہو کہ تمھارے کولیگ بد باطن، جھگڑالو اور گندے لوگ ہیں؟"

"نہیں شریواستو! وہ اچھے **لوگ ہیں**۔ ان کی روحیں اب بھی معصوم ہیں۔ میں نے جھگڑوں اور منتوں کے غبار میں بھی ان کی بے لوث محبت اور خلوص کا احساس کیا ہے۔ ------ اگر تم مجھے سچ بولنے کی اجازت دو تو اس ارفع محبت کو، جس پر کہ دنیا قائم ہے، ان پاکیزہ تمناؤں کو جن کے لیے انسانی برادری ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ اپنے روبرو حاضر و ناظر جان کر تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے انھیں اپنے آپ سے بہتر انسان پایا۔"

اب میرے ساتھی نے پہلی بار میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں اور کہا۔
"میں جانتا ہوں کہ تم بے جا انکسار سے کام نہیں لے رہے ہو۔ کیوں کہ جب بھی انسان سچے دل سے اپنے گریباں میں منہ ڈال کر دیکھتا ہے تو وہ اپنے ہم جنسوں میں سے بیشتر کو وہ اپنے سے بہتر پاتا ہے۔"
ہم تھوڑی دیر کے لیے پھر چپ ہو گئے۔ پھر میں نے ایسے بولنا شروع کیا جیسے اپنے آپ کو کہہ رہا تھا۔
"آج سے آٹھ برس پہلے جب میں نے بی۔اے پاس کیا تو والد صاحب نے رائے دی کہ فوج میں بھرتی ہو جاؤ۔ میں نے جواب دیا کہ ہماری قومی جماعت انگریزوں سے برسرپیکار ہے۔ میں ایسے حاکموں کے حق میں اور اپنی قوم اور وطن کے مفاد کے خلاف کیوں کر بھرتی ہو جاؤں۔ اس نظریاتی اختلاف کی وجہ سے چوکا ہوں تو گویا اپنے پاؤں میں خود کلہاڑ مارا۔ پھر میں پنپ نہ سکا۔ مجھے اب والد صاحب کی باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بیٹا! اگر تم اس قدر اناڑی نہ ہوتے جس قدر کہ تم ہمیشہ سے ہو تو اب تک کم از کم میجر بن گئے ہوتے ------"
لیکن کسے معلوم تھا کہ جب دیش آزاد ہو گا تو زندگی کے بنیادی مسائل حل کرنے کے لیے لال بجھکڑ مقرر ہوں گے۔"
"بھئی یہ بات بھی تو ہے کہ حکومت ہر فرد کی روزی کا انتظام کر نہیں کر سکتی ------" میں نے دلیل پیش کی۔
"کیوں نہیں کر سکتی ------ اگر ہماری حکومت کے کارکن شراب کی بو کی تلاش میں راہ چلتے لوگوں اور ہوٹلوں میں سوئے ہوئے مسافروں کو جگا جگا کر ان کے گندے نتھنوں کو سونگھ سکتے ہیں، تو کیا گورنمنٹ انھیں یہ معلوم کرنے کا حکم نہیں دے سکتی کہ ہمارے ملک میں کتنے لوگ پیٹ بھر کے روٹی کھا کر سوتے یا کتنے لوگ فٹ پاتھ پر راتیں بتاتے ہیں۔ کتنے ننگے پھرتے ہیں۔ کتنوں کو ضرورت اور احتیاج نے زندگی سے متنفر بنا دیا ہے -------- کیا یہ ستم نہیں ہے کہ انسان ایمانداری سے کام کر کے اپنی ضروریات پوری کرنا چاہے۔ لیکن نہ کر سکے۔ اگر حکومت انسانوں کا بچے پیدا کرنے کا حق تسلیم کرتی ہے تو انھیں زندہ رہنے کا حق کیوں نہیں دینا چاہتی۔ نئے زمانے میں وہ حکومت کوئی حکومت نہیں ہے جو ہر فرد کے لیے کام پیدا نہیں کر سکتی۔ وہ نظام کوئی نظام نہیں جس کے تحت صرف آزادیاں ہی آزادیاں ہیں لیکن زندہ رہنے کی کوئی پابندی کوئی کشش نہیں۔"
اس کی باتیں زہر میں ڈوبے ہوئے نشتروں کی مانند تھیں جن کی میں تاب نہ لا سکا۔ اور

کپڑے جھاڑتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اور دھیمی آواز میں بولا۔

"دوست تم ٹھیک کہتے ہو ---------- لیکن جہاں تک میری شکست کا سوال ہے یہ ایک معمولی ------ بہت معمولی انسان کی شکست ہے۔"

اس نے اٹھنے سے پہلے میری جانب تلخ نظروں سے دیکھا اور تلخ تر لہجے میں کہا۔

ان روحانی بلند پروازیوں اور ان شکست خوردہ کھوکھلے کلمات کی میرے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔" اور پھر وہ میرے سامنے سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اور اپنی چبھتی ہوئی نظر کو میری نظر سے ملایا اور مضبوط لہجے میں کہنے لگا۔

"آج معمولی افراد کو شکست کی نہیں فتح کی ضرورت ہے ۔۔۔ مجھے ایک بات کا جواب دو۔ اگر معمولی افراد اسی طرح شکستوں پر شکستیں کھائے چلے گئے تو بالآخر کیا ہو گا؟"

(۲۱)

"بالآخر کیا ہو گا؟"

یہ سوال میرے کانوں میں گونجتا رہا۔ میں شریواستو سے رخصت ہو کر تانگے پر سوار ہو گیا لیکن اس کی زبان سے چابک کے زناٹے کی مانند نکلے ہوئے اس سوال نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

سردیوں کا موسم تھا۔ مکان ماتم کدے دکھائی دیتے تھے۔ غبار اور دھواں سردی کی وجہ سے سطح زمین کے قریب ہی گھس ہو کر رہ گئے تھے جس سے فضا میں ایک گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ زندگی کراہ رہی تھی اور بوجھل تھی۔

دفعتاً مجھے خیال آیا کہ دندان ساز میڈم کی دکان کے میں کافی قریب ہوں۔ ان سب کی یاد ایسے ائی جیسے بھولا بسرا گیت، ملازمت کے دوران میں ان سے بہت کم ملا تھا۔ اگر اتفاقاً کبھی ملا بھی تو سرسری طور سے۔ نہ ان کی دعوت کی نہ سینما دکھایا۔ ان معصوم بچوں کے دل کیا کہتے ہوں گے نوکری بھی چلی گئی تو کیا میں انھیں سینما تو دکھا سکتا ہوں۔ کوچوان کو اگلے موڑ پر مڑجانے کے لیے کہا۔ مڑا تو مجھے شربت والی دکان روشنی میں جگمگاتی دکھائی دی۔ جہاں سے ہم شربت منگا کر پیا کرتے تھے ---- لیکن اس کے آدھ پون فرلانگ پرے میڈم کی دکان پر تاریکی چھائی ہوئی تھی۔

میں نے تانگے کو وہیں سے رخصت کر دیا۔ دکان دار سے میڈم کے بارے میں پوچھا تو اس نے جواب دیا "جی وہ چلی گئیں، بچاری کا کام ٹھپ تھا۔"

"میرے دل کو دھکا سا لگا۔ "کہاں چلی گئی ہیں؟"

"اپنے وطن کو --- ان کی دکان موقع پر نہیں تھی نا ۔۔۔ دو سو روپے پگڑی پر ایک

باموقع دکان مل رہی تھی ۔ لیکن ان سے اتنی رقم کا بندوبست نہیں ہو سکا ۔ بہت پریشان تھیں
--------"

دو سو روپے ------ میڈم! دو سو روپے تو میں ہی تمہیں دے دیتا ۔ تم نے مجھے ایک کارڈ ہی ڈال دیا ہوتا ۔ لیکن تم اتنی ہمت کیوں کرتیں ۔ جب کہ ملازمت مل جانے پر سینما تک دکھانا مجھے یاد نہیں رہا --- میں جذباتی ہو رہا تھا ۔

جیسے مجھے دکان دار کی زبان کا یقین نہ آیا ہو میں قدم بہ قدم دکان کی جانب بڑھنے لگا
------ آئی نخا آہ چونگ!

وہاں پہنچا تو دروازہ بند تھا ---- کئی ماہ سے دروازہ بند تھا ۔ میں گرد آلود چبوترہ پر تھکے ہارے مسافر کی طرح بیٹھ گیا ۔ وہاں کی فضا میں عجیب قسم کی بو اور تاثر تھا -------
میرے دل کی کیفیت ناقابل برداشت ہو رہی تھی ----

(۲۲)

اب صرف ایک ہفتہ باقی رہ گیا تھا ۔ میں نے نوٹس کا مہینہ بھی دفتر ہی میں گزارا ۔ والد صاحب آرہے تھے ۔ میں نے سوچا کہ جب وہ آئیں گے تو ان کو سب حالات اس طریقے سے بیان کروں گا جس سے ان کے دل کو کم سے کم دکھ ہو ۔

ایک روز تار آیا ۔ میں سمجھا ان کی آمد کی اطلاع ہوگی ۔ مضمون تھا ۔ آپ کے والد وفات پا گئے ہیں ۔ فوراً پہنچیں ۔

(۲۳)

فوراً گاڑی پر سوار ہو کر گھر پہنچا ۔

رات کے گیارہ بجے کے قریب جب عورتوں کے رونے کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں ۔ میں تنہا تنگ و تاریک سیڑھیوں پر چڑھتا ہوا مکان کی چھت پر پہنچا ------ عورتوں کے کراہ کراہ کر رونے کی آوازیں عجیب سی معلوم ہوتی تھیں ۔ روح پر کالے مٹیالے سائے سے رینگتے محسوس ہوتے تھے ۔

والد صاحب کی وفات دل کی حرکت بند ہو جانے کی وجہ سے ہوئی تھی ۔

اونچی چھت سے سارا شہر دکھائی دیتا تھا ۔ کفن پوش مکانات آپس میں کھچڑی ہو رہے تھے --- آسمان میں کہکشاں کے بارے میں بچپن سے سن رکھا تھا کہ وہاں ٹھنڈے پانی کا کنواں ہے

مرنے کے بعد انسان کی روح بھگوان کے پاس پہنچنے سے پہلے وہاں دم لیتی ہے ۔ ------- اب شاید والد صاحب کی آتما وہاں آرام کر رہی ہوگی ۔ انھیں کیا معلوم کہ اب میں زندگی میں پھر بے کار ہوں ------- پھر عجیب قسم کا اطمینان سا ہونے لگا ------- اچھا ہوا جو وہ دنیا سے رخصت ہوتے وقت خوش تھے اور ہر لحاظ سے مطمئن تھے ۔

------- لیکن بہت جلد مجھے یہ اطمینان سراسر شیطانی سا لگنے لگا ۔ میں نے انھیں دھوکے میں رکھا ------- جان بوجھ کر ان کے آخری وقت میں جھوٹا ثابت ہوا ----- میں نے سب لیڈروں اور مہاتماؤں کے ساتھ مل کر ان کے ساتھ بڑا اوچھا مذاق کیا تھا ۔

پھر مجھے یوں محسوس ہوا جیسے دفعتاً میرے منہ پر زور کا چانٹا پڑا ہے ۔ ایسا چانٹا وہ جیتے جی غلطی کرنے پر مجھے مارا کرتے تھے ۔

میری آنکھیں ڈبڈبا آئیں -------

وہ زمانہ کب آئے گا جب ہمارے عام قابل احترام بوڑھے اس دنیا سے بہتر طور پر رخصت ہوا کریں گے ؟

میں نے آنکھوں کے آگے آنسوؤں کی لرزاں چادر میں سے دیکھا کہ میرے اس سوال کے جواب میں ساری کائنات خاموش ہے ۔ مجرموں کی مانند خاموش -----

ممتاز شیریں

ہماری افسانہ نگاری کے دو سال

(سنہ ۱۹۴۵ء ، سنہ ۱۹۴۶ء)

بلونت سنگھ ، احمد ندیم قاسمی ——— ان دو برسوں میں ہمارے افسانوی ادب کی سطح پر یہ دو نام سب سے زیادہ اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سنہ ۴۵ء میں بلونت سنگھ ، سنہ ۴۶ء میں احمد ندیم قاسمی۔

سنہ ۴۴ء کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے میں نے بلونت سنگھ کے بارے میں لکھا تھا:

"بلونت سنگھ نے صرف ایک افسانہ لکھا ہے۔ لیکن آج سنہ ۴۵ء میں وہ سب سے نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کی یہ اٹھان سنہ ۴۴ء ہی میں ظاہر تھی۔ لیکن اس سال بعض دوسرے افسانوں کی ظاہری آب و تاب بڑی خیرہ کن تھی۔ اسی لئے "دیمک"، "سمجھوتہ"، "واپسی"، "شہناز" ـــ اس گلدستے کے خاموش حسن اور بھینی مہک کی طرف توجہ کھنچی نہ رہی۔ ورنہ یہ گلدستہ واقعی حسین اور اچھوتا تھا۔ اور "سمجھوتہ" کا سا نفسیاتی مطالعہ، "واپسی" کی سی تصویر کشی، "شہناز" کی سی فنِش اور "دیمک" سا شہ پارہ۔ یہ سب ایک ساتھ پیش کرنے والا فنکار اونچی جگہ کا مستحق تھا۔ اور اب تو وہ کافی بلندی پر پہنچ چکا ہے اور برابر اپنی سطح قائم رکھ کر چل رہا ہے۔

بلونت سنگھ کو اب فن پر کچھ ایسا عبور حاصل ہو چکا ہے اور اُس کا اندازِ نگارش اس طرح نکھر چلا ہے کہ وہ کسی بھی موضوع اور مواد کو کسی بھی طرح ڈھال کر اُس سے ایک دلچسپ اور دلکش افسانہ بنا دیتا ہے۔ اور ایک ماہر کمہار کی طرح مواد کی مٹی گوندھتا، تھپتھپاتا، کھینچتا اور مروڑتا چلا جاتا ہے۔ اُسے اپنی کاریگری پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ یہ دیکھنے کے لئے نہیں رُکتا، فلاں جگہ کچھ زیادہ کھنچ گیا ہے۔ اس کا اپنے آپ پر اعتبار پڑھنے والوں میں بھی اُس پر اعتبار پیدا کرتا ہے۔ وہ بھی اس کی تکنیک کا جائزہ لینے یا توازن کے بگاڑ کو دیکھنے کے لئے نہیں رُکتے۔ بلکہ بڑھتے ہی چلے جاتے

ہیں، صرف یہ محسوس کرتے ہوئے کہ افسانہ دلچسپ ہے، بہت اچھا ہے۔ اپنے افسانوں میں یہ بات ایک ماہر افسانہ نگار ہی پیدا کر سکتا ہے۔ یہی بات کرشن چندر کے افسانوں میں ہے۔ خواہ توازن بگڑ جائے، مواد پھیل جائے، کہیں کہیں جذباتی انداز آجائے، کہیں طنز جوشیلی تقریر کا انداز اختیار کرے، پھر بھی ان کے افسانے اچھے ہوتے ہیں، شاندار ہوتے ہیں، مؤثر ہوتے ہیں۔ یہ بات اپنے افسانوں میں ایک بڑا افسانہ نگار ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ورنہ دوسروں میں یہ خامیاں بہت واضح دکھائی دیتی ہیں۔

بیدی اور راختر رائے پوری افسانے کو ہر طرح سے متوازن اور متناسب بناتے ہیں۔ یہ دونوں فنکار اپنے افسانوں کے خدوخال میں مکمل تناسب پیدا کر کے اسے ایک فنش (Finish) دینے کے قائل ہیں۔ لیکن ان کے افسانے پڑھتے ہوئے ہمیں کبھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ فنکار نے بڑی محنت اور دقت سے یہ تراش، یہ تناسب اور یہ فنش دی ہے۔ ایک خوبصورت چیز ہمارے سامنے ہوتی ہے اور بس۔ یہ بات بھی ایک بڑا فنکار ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ورنہ ہمیں کاریگری تو نظر آتی ہے لیکن یہ محسوس ہوتا ہے کہ فنکار بڑی محنت اور دقت سے بنا رہا تھا۔ چنانچہ مدھوسودن کے اکثر افسانے کاریگری کے اچھے نمونے ہوتے ہیں لیکن ان میں اس دقت کا احساس ہوتا ہے۔

ایچ۔ ای۔ بیٹس کی کہانیوں[1] پر تبصرہ کرتے ہوئے سٹیفن سپنڈر کہتا ہے "مختصر افسانے دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک[1] یہ کہ افسانہ ایک چھوٹی سی شبیہہ ہے۔ فنکار ہر لمحہ فنی شعور کو ساتھ رکھ کر بڑی چابکدستی اور نزاکت سے افسانہ کی چھوٹی سی دنیا تعمیر کرتا ہے۔ مشاہدے کی باریکی، اشارات و کنایات، چھوٹے چھوٹے واقعات جو افسانے کے لئے اہم اور معنی خیز ہیں، یہ افسانے کی خصوصیات ہیں۔ کینوس بڑا ہو تو ان چیزوں کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ دوسری[2] قسم یہ ہے کہ افسانہ لکھنے والے کے پورے تجربے کا ایک ٹکڑا ہوتا ہے۔ اس میں اتنی کاریگرانہ تراش اور فنش نہیں ہوتی۔ لیکن ایسے افسانوں میں دلچسپی اور روانی زیادہ ہوتی ہے۔ یہاں بڑی نفاست سے ایک چھوٹی سی چیز تیار نہیں کی جاتی۔ لیکن خواہ کنارے گھس کر صاف بھی نہ کئے گئے ہوں، مواد پھیلا ہوا ہو، پھر بھی ایسی کہانیاں زیادہ دلچسپ ہوتی ہیں۔ اور گہری اور عظیم بھی ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ ان میں ایک چھوٹا سا نقش نہیں، ایک تجربے کی، زندگی کے فلسفے کی جھلک ہوتی ہے۔"

بلونت سنگھ نے دونوں طرح کے افسانے کامیابی سے لکھے ہیں۔ "چکوری" اور "رنگ" بڑی نزاکت اور نفاست سے ترشے ہوئے ٹکڑے ہیں۔ "دیمک" اور "بازگشت" میں دوسری طرح کے افسانوں کی وسعت ہے۔ "خدا کی وصیت" میں پہلی قسم کی نفاست اور کاریگری بھی ہے اور دوسری کی شان اور عظمت بھی۔

ان دو سالوں میں بلونت سنگھ کی تخلیق کی رفتار بھی بہت تیز رہی۔ گرنتھی، لمس، بابو مانک لعل جی، تین باتیں

---

[1] THE BEAUTY OF THE DEAD

اس حمام میں، خدا کی وصیت، پنجاب کا البیلا، رنگ، بھول بھلیاں، خود دار، پامسٹ، منّی کی موت، دوسری غلطی چکوری، سنگ انداز، بازگشت۔ اور تعجب ہوتا ہے کہ بلونت سنگھ نے اتنا لکھ کر بھی اچھا لکھا ہے۔ ان میں "خدا کی وصیت" اور "بازگشت" تو سال بھر کے بہترین افسانوں میں جگہ پاتے ہیں۔ اور "پنجاب کا البیلا"، "گرنتھی"، "بابو مانک لعل جی" اور "چکوری" بھی سال کے بہت اچھے افسانوں میں شمار ہو سکتے ہیں۔

ان افسانوں میں غضب کا تنوّع ہے۔ "رنگ" دو صفحوں کا مختصر سا افسانہ ہے۔ "پنجاب کا البیلا" اور "بازگشت" بہت طویل افسانے ہیں۔ "دیمک"، "خدا کی وصیت" اور "بازگشت" سے گہرے اور سنجیدہ افسانے لکھنے والا کامیاب مزاح نگار بھی ہے۔ اور "پامسٹ"، "اس حمام میں" اور "بھول بھلیاں" جیسے ہلکے پھلکے مزاحیہ افسانے بھی لکھ سکتا ہے۔ (یہاں صرف افسانوں کا ذکر ہے۔ ورنہ "چار سو برس پہلے" میں ان کے مزاح کا رنگ خوب کھلا ہے۔) "بابو مانک لعل جی" کامیاب کیرکٹر سکیچ ہے، تو "چکوری" ایک نہایت کامیاب نفسیاتی مطالعہ۔ "رنگ" میں نازک اور نفیس کاریگری ہے۔ "منّی کی موت" اور "دوسری غلطی" وغیرہ میں بالکل سیدھا سادا بیان۔ "چکوری" میں وہ ایک نوخیز پردہ نشین لڑکی کے دل کی چھوٹی سی دنیا سے جتنا مانوس ہے، ایک عظیم تہذیب و تمدّن کے گہوارے مصرِ قدیم میں بھی وہ اتنا ہی مطمئن اور مانوس نظر آتا ہے۔ ہر جگہ یہی محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا مواد پر اچھی طرح حاوی ہے۔ اور اس کا ہاتھ منجھا ہوا ہے۔ اِسی لئے کامل اعتماد سے وہ اس مواد کو بے دردی سے کھینچتا چلا جاتا ہے۔ لیکن وہ اس گُر سے بھی واقف ہے کہ مواد سے کس طرح اچھا اثر پیدا کیا جا سکتا ہے۔ بلونت سنگھ جدید یا جاذب تکنیکوں کا استعمال نہیں کرتے۔ نہ اُن کے آغاز ایسے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والے کی توجّہ فوراً کھینچ لیں۔ وہ افسانہ کہیں سے بھی شروع کر دیتے ہیں اور ان کے افسانے اکثر سیدھے سادے بیانیہ ہوتے ہیں۔ لیکن اتنے دلچسپ کہ شروع کرنے پر ہم آئیں تو پڑھتے ہی چلے جاتے ہیں۔ اور ختم کرتے ہیں تو مجموعی اثر ایسا اچھا ہوتا ہے کہ افسانے کی بعض خامیوں کی طرف دھیان نہیں جاتا۔ لیکن یہ خامی ہے ضرور کہ وہ داستان کہیں سے بھی شروع کر دیتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ایسا کرنے سے بناوٹ کا احساس نہیں رہتا اور چیز زیادہ فطری اور حقیقی معلوم ہوتی ہے۔ اور بظاہر فن سے بے نیاز ہو کر سادگی میں دلکشی پیدا کرنا بجائے خود ایک فن ہے (اور یہ فن بلونت سنگھ میں بدرجۂ اتم موجود ہے) لیکن انتخاب بھی آرٹسٹ کی ایک بڑی ذمّہ داری ہے۔ ورنہ بعض حصّے غیر ضروری معلوم ہونے لگتے ہیں۔ اور بلونت سنگھ کے بعض افسانوں میں یہ خامی اسی لئے زیادہ کھٹکتی ہے کہ افسانہ کا آغاز ہی ایسا ہوتا ہے — "چکوری" میں تانگے کے آکر رکنے سے پہلے گھر کا جائزہ بے محل معلوم ہوتا ہے۔ لیکن "پنجاب کا البیلا" میں ہوسٹل والا حصّہ بہت دلچسپ ہونے کے باوجود غیر ضروری ہے۔ کیونکہ افسانے کے اصل حصّے سے اس کا کوئی لگاؤ نہیں۔ اگر یہ حصّہ

لا نا ہی تھا تو سفر کے درمیان میں کہیں یاد کے طور پر لایا جا سکتا تھا۔ (گو یہ حصّہ بالکل الگ ہے اور اس سے ایک الگ اچھا افسانہ تیار کیا جا سکتا تھا) اس سے کم از کم یہ احساس ہوتا کہ یہ سارا افسانہ سفر کے دوران میں ہے اور وقت ایک ہی ہے۔ "بازگشت" میں بھی یہ خامی ہے۔ اس افسانے کا آغاز تو اچھا ہے۔ ریل گاڑی تپتی ہوئی پٹریوں پر چلی جارہی ہے اور منیر احمد اس میں بیٹھا ہوا گاؤں واپس آرہا ہے۔ یہ پہلا پیراگراف ہے۔ پھر اس کے فوراً بعد منیر احمد کے بچپن سے لے کر اب تک کی طویل داستان معمولی بیانیہ میں کہی گئی ہے۔ ایسے آغاز کے بعد یہ حصّہ بہت کھٹکتا ہے۔ داستان آغاز سے ٹوٹ کر ایک دم الگ ہو جاتی ہے۔ اگر یہ حصّہ معمولی بیانیہ ہونے کے بجائے تصوّرات اور بیانیہ کا امتزاج ہوتا تو یہ بات نہ کھٹکتی۔ اور ماضی اور حال کا رشتہ قائم رہتا۔ جیسے دوسرے حصّے میں انھوں نے سنبھال لیا ہے۔ "پنجاب کا البیلا" اور "بازگشت" تو بہت اچھے افسانے ہیں۔ معمولی افسانے میں یہ خامی اور واضح نظر آتی ہے جیسے "دوسری غلطی" میں۔ "دوسری غلطی" میں بات بالکل چھوٹی ہے۔ اس کے لئے اپنی ڈاکٹری کی دوکان کھولنے کی طویل تمہید بڑی بے ہنگم تمہید معلوم ہوتی ہے۔ پھر اتفاقاً سروپ سنگھ سے ملاقات، پھر اُن دنوں کے حالات جب سروپ سنگھ کے ساتھ وہ ہوسٹل میں رہا کرتا تھا۔ اتنی سب تفصیلوں کی ضرورت نہ تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ دوسری غلطی کرنے کے بعد اتنی آسانی سے اس مغرور اُستانی کو پھنسا کر لے اُڑنے والے سروپ سنگھ کے کردار کو کچھ تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت تھی۔ اور اس ہوسٹل والے حصّے میں اس کے کردار کی چند اہم کڑیاں ہیں۔ لیکن یہ تفصیلیں درمیان میں لائی جا سکتی تھیں۔ "دوسری غلطی" ان کا یہ ایک ہی کمزور افسانہ ہے۔ "اس حمام میں"، "بھول بھلیاں"، "سنگ انداز"، "پامسٹ" وغیرہ ہلکے پھلکے افسانے ہیں لیکن کمزور نہیں۔ "لمس" اس لئے نہیں جچا کہ اس کا موضوع اور تفصیلیں تقریباً وہی ہیں جو "دیمک" کی ہیں۔ اور اس شہ پارے کا نقش ہمارے دماغ پر ابھی تازہ ہے اور گہرا۔ اور اس کے سامنے یہ تصویر بہت پھیکی نظر آتی ہے۔ لیکن "دوسری غلطی" فنّی لحاظ سے بھی کمزور ہے اور موضوع کے لحاظ سے بھی۔ اس میں صرف ایک خوبی ہے کہ سروپ سنگھ کا کردار اچھا کھنچا ہے۔ لیکن جتّا سنگھ سا جاندار کردار تخلیق کرنے والے کے لئے سروپ سنگھ کے کردار کا خاکہ بنانا معمولی بات تھی۔

بلونت سنگھ کردار نگاری میں بھی کامیاب ہیں۔ سروپ سنگھ (دوسری غلطی) مزیدار کردار ہے۔ جتّا سنگھ (پنجاب کا البیلا) میں انھوں نے ایسا جیتا جاگتا کردار پیش کیا ہے۔ اُس کا حلیہ، اُس کی آواز، اُس کی ایک ایک حرکت کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ یہ کردار برسوں ہمارے ذہن سے محو نہ ہو گا۔ اردو میں بہت کم ایسے کردار ہیں جو افسانے سے الگ ہو کر زندہ رہ سکیں۔ جتّا سنگھ بلاشبہ اُن میں سے ایک ہے۔ "بابو مانک لعل جی" بھی نہایت کامیاب کیرکٹر سکیچ ہے۔ ایک آزادی، بغاوت، نڈر پن، دھاک کا مجسّمہ ہے (جتّا سنگھ) تو دوسرا نہایت مسکین

نرم، سادہ لوح، کتّے کی طرح وفادار (بابو مانک لعل جی) خودداری میں محض جھجک کی کیفیت سے — انتہائی مجبوری کی حالت میں بھی، وہ اپنا دیا ہوا ایک روپیہ واپس مانگنے میں شرم محسوس کرتا ہے — اور سارے افسانے میں صرف یہ جھجک کی کیفیت بیان کر کے اس کی خودداری بتائی گئی ہے۔

"رنگ" اور "چکوری" میں ہمیں بلونت سنگھ کی کاریگری نظر آتی ہے۔ "رنگ" میں انھوں نے رنگوں کا ایک سماں باندھ دیا ہے۔ مختلف چیزوں سے ایک ہی تاثر قائم کیا ہے — رنگ کا — بادلوں کے گوناگوں رنگ۔ عورتوں کے، ساریوں کے، فراکوں کے رنگ، ان کے ہونٹوں، رخساروں، بالوں کے رنگ۔ مشرقی اور مغربی عورتوں کے اور مشرقی اور مغربی مردوں کے رنگ، سیاہ اور سفید کا فرق۔ ہوٹل میں اور ہوٹل سے باہر رنگوں کا ایک دریا ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن اس افسانے میں فضا کی تعمیر نہیں ہے۔ چلتے چلتے انھوں نے پتے کی باتیں کہی ہیں، چپکے سے ایک تیر چھوڑ کر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ اس افسانے میں ایک دلچسپ اور جاذب تکنیک استعمال کی گئی ہے۔ جن الفاظ پر ایک پیراگراف ختم ہوتا ہے، انھیں الفاظ پر دوسرا پیراگراف اٹھا لیا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک پیراگراف یوں ختم ہوتا ہے "مسز جاؤلہ کی میٹھی میٹھی نگاہیں جیسے ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی ہو"۔ اور دوسرا پیراگراف انھی الفاظ سے شروع ہوتا ہے۔ "ہلکی ہلکی پھوار پڑ رہی تھی ....." یا "وہ بادل جو نہ صرف گرجتا ہے بلکہ برستا بھی ہے۔" پھر دوسرا پیراگراف "کامریڈ ٹپ ٹپ جو گرجتے ہیں لیکن برستے نہیں"۔ اس چھوٹے سے افسانے کے لیے جس میں الگ الگ تاثرات پیش کیے گئے ہیں، یہ تکنیک بہت زیب دیتی ہے۔ "چکوری" میں انھوں نے ایک نہایت نازک موضوع کو بڑی نزاکت سے سنبھالا ہے۔ میرے خیال میں "چکوری" عورت کی فطرت کا "سمجھوتہ" سے بھی زیادہ کامیاب مطالعہ ہے۔ "سمجھوتہ" میں "میں" کے ردِّ عمل کو پہچاننا اتنا مشکل نہیں ہے۔ لیکن "چکوری" میں نزہت پردہ نشین لڑکی ہے جس پر کسی مرد کی چھاؤں بھی نہیں پڑی ہے۔ وہ ممتاز کو دیکھ بھی نہیں پاتی۔ پھر بھی بلونت سنگھ اس کی اندرونی اور دلی کیفیت کو تاڑ جاتا ہے۔ اس کی نظر اتنی تیز ہے کہ نزہت کے نازک سے احساس، جذبات کی نرم سے نرم لہر، اضطراب اور بےچینی کی سی کیفیت، اس کے دل کے تاروں کے ہلکے سے ہلکے ارتعاش کو دیکھ لیتی ہے۔ "چکوری" کی ساری تفصیلات اتنی اچھی اور سچی ہیں کہ حیرت ہوتی ہے اُسے ایک مرد نے لکھا ہے۔ نزہت ممتاز کو دیکھ بھی نہیں پاتی۔ یہی بات ہے جس نے افسانے میں اتنی لطافت پیدا کر دی ہے۔ اور ان ہلکے ہلکے لطیف، نازک اشاروں اور تفصیلوں نے افسانے کو اور بھی لطیف بنا دیا ہے۔ جس میں انھوں نے ممتاز کی موجودگی کے احساس کا اثر نزہت پر بتایا ہے۔ ممتاز کا ٹرنک۔ (بیڈمنٹن کی چڑیا) آنگن میں اس کے پاس آکر گرنا اور پھر بچوں کا "آیا ....

...آپا.....آپا! آپ جانتی ہیں ممتاز بجیا کیسے بیٹھتے ہیں؟ ...." پھر مردانے سے سرپٹ بھاگتا ہوا نکلا اور اس سے ٹکرا گیا۔ "آپا جی!" "ہٹت کیا ہوتا ہے" "جی وہ جو آئے ہیں..... وہ..... "ٹھٹت..... ٹھٹت.....!"

"مجھے تو ٹمو پیسٹ چاہئے۔ میرے بیگ میں....." مردانہ سے یہ آواز سن کر نزہت دم بخود رہ گئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکنے لگا..... اس کے کانوں میں نہایت میٹھا، رسیلا سا ترنم گونجتا رہ گیا..... پھر وہ تانگہ جو گرڈھل کے درختوں سے گزرتا ہوا، ممتاز کو لئے اس کے گھر کے سامنے آ رکا تھا، چند دن بعد پھر ممتاز کو لئے گرڈھل کے درختوں سے ہوتا ہوا نکڑ پر گھوم گیا۔ اور نزہت، جس کے دل کے پُر سکون دریا میں، ان چند دنوں نے ہلکی ہلکی موجیں پیدا کر دی تھیں۔ اس کے دل کا یہ جوار بھاٹا ایک کسک بن کر رہ گیا۔ پھر اس کے ساتھ روزمرّہ گھریلو زندگی کی چھوٹی چھوٹی دلچسپ تفصیلیں۔ "چکوری" ایک دلکش، خوبصورت، مکمل افسانہ ہے۔ اردو افسانے میں، جس میں جنس کے ساتھ بدعنوانیوں اور کریہہ عریانی تصوّر کے سوا اور کوئی تصوّر نہیں آ سکتا تھا، یہ نازک احساسات کا افسانہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے۔ "سمجھوتہ"، "دیمک" اور "چکوری" میں بلونت سنگھ نے عورت کی فطرت اور زندگی کے ایسے پہلو ڈھونڈ نکالے ہیں اور انھیں اس کمال خوبی سے پیش کیا ہے کہ شاید کوئی عورت بھی ان سے اس کامیابی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتی تھی۔

مبارک باد بلونت سنگھ!

"چکوری" اور "زرنگ" اُن کی نفیس کاریگری کے نمونے ہیں۔ لیکن سادگی بلونت سنگھ کے افسانوں کی خصوصیت ہے۔ اور وہ سادگی میں بھی لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ "تین باتیں" ایک بیکار نوجوان کی داستان ہے۔ جو فوج میں بھرتی ہو گیا۔ سیدھی سادھی داستان ہے، سیدھا سادھا دیہاتی نوجوان اور اس کے سیدھے سادے مسئلے۔ اس کی زندگی میں حرفِ سوالیہ آیا تو وہ روزی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ پھر کافی تلاش کے بعد اُسے ایک بورڈ پہ "تین باتوں" میں اس سوال کا حل مل گیا۔ یہ نوجوان اُن ہزاروں لاکھوں ہندوستانیوں کا نمائندہ ہے جو بھرتی ہو کر سمندر پار جنگ لڑنے گئے۔ ایک سیاسی جماعت کہتی تھی کہ یہ دو سامراجی حکومتوں کے درمیان جنگ ہے۔ ایک سامراج اپنی مقبوضہ نوآبادیات کو اپنی جکڑ بندیوں میں رکھ کر مزید توسیعِ تسلّط کے لئے لڑ رہا ہے اور دوسرا پہلی حکومتوں سے چھین کر اُن پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے میدان میں کود پڑا ہے — اس لئے یہ اداروں کی جنگ ہے۔ اس میں حصّہ لینے سے ہندوستان کو کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اس میں حصّہ نہ لینا چاہئے۔ دوسری جماعت کہتی تھی کہ یہ شروع سے ہماری قومی جنگ ہے بین الاقوامی خانہ جنگی ہے۔ ہمیں اس وقت کی ترقی پسند قوتوں سے مل کر پہلے بڑے دشمن فسطائیت کا خاتمہ کرنا چاہئے۔ ایک اور جماعت کہتی تھی کہ پہلے یہ سامراجی جنگ تھی۔ اُس وقت ہمیں عدمِ تعاون کرنا چاہئے تھا۔ لیکن روس پر

جرمنی کے حملے کے بعد یہ جنگ عوامی جنگ ہوگئی۔ اس میں حصّہ لینا ہمارا فرض ہے۔ لیکن یہ تو سیاسی پارٹیوں کی اور بڑے بڑے آدمیوں کی باتیں تھیں۔ ورنہ رویل سنگھ جیسے ہزاروں، لاکھوں نوجوان جو اپنی جان ہتھیلی پر لئے، اپنے وطن سے ہزاروں میل دور ان جنگ کے میدانوں میں لڑنے گئے، وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ وہ وہاں کیوں جارہے ہیں۔ کس لئے لڑ رہے ہیں۔ بس ان تین باتوں کی مقناطیس نے انھیں کھینچ لیا تھا۔ اچھی خوراک، اچھی پوشاک، اچھی تنخواہ۔

بلونت سنگھ کے افسانوں میں ہمیں سکھ قوم کی زندگی کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ ان کے رسم و رواج اور رہن سہن۔ "تین باتوں" میں بھی ایسی چند جھلکیاں ہیں۔ لیکن "گرنتھی" کا پورا افسانہ ایک سکھ گوردوارے اور اس کے گرنتھی کی داستان ہے۔ گوردوارا، اس کے گرد و پیش کی زینات، شنکرات کا تہوار اور سکھوں کا مخصوص طریقۂ عبادت سب کا تفصیلی نقشہ ہے۔ لیکن کمال یہ ہے کہ ہم ان تفصیلات میں گرنتھی کو نہیں بھولتے۔ جیسے گاؤں والے جھوٹا الزام لگا کر گرودوارے سے نکال دینا چاہتے تھے۔ گرنتھی اور اس کی مظلومیت اور بے گناہی کا احساس ہمیشہ جاگتا رہتا ہے۔ "منّی کی موت" ایک چھوٹا سا سادہ افسانہ ہے۔ ایک معمولی واقعہ اور اسی انداز میں کہا بھی گیا ہے۔ لیکن یہ اس کی مثال ہے جہاں مصنف کچھ نہ کہہ کر بھی سب کچھ کہہ جاتا ہے۔ اور اس چھوٹے سے بظاہر "معمولی" افسانے میں ایک بڑی اور اہم حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ ایک چیز کو، جو جب تک زندہ تھی ہمیں بہت عزیز تھی، ہم سپرد خاک کر آتے ہیں۔ تو کچھ دیر بعد اُسے بھول جاتے ہیں اور ہمیں زندوں کی فکر رہتی ہے۔ اور پھر ایک اور "منّی" کے استقبال کی تیاریوں میں لگ جاتے ہیں۔

"پنجاب کا الببیلا"۔۔۔ اسے تفصیل نگاری اور تصویر کشی کا شہ کار کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ بلونت سنگھ نے جس طرح ایک طلسمی فضا اور رجّا سنگھ کے کردار کی تعمیر ساتھ ساتھ اور یکساں کامیابی سے کی ہے، داد نہیں دی جاسکتی۔ افسانے کی ایسی طوالت کے باوجود کہیں بھی ہماری دلچسپی میں کمی نہیں ہوتی۔ سفر کی داستانوں میں شاذ ہی کوئی داستان اتنی دلچسپ ہو۔ جیسا کہ مولانا صلاح الدین احمد نے کہا ہے کہ یہ پنجاب کی الف لیلہ کا ایک ورق معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یہ الف لیلوی داستان اگر اس جگہ سے شروع ہوتی جہاں افسانے کا رومانی ہیرو اپنی محبوبہ سے رخصت لے کر سفر پر روانہ ہوتا ہے، اس وقت یہ کتنی مکمل ہوتی۔

"بازگشت" بہت گہرا افسانہ ہے۔ اس میں حقیقی معنوں میں ایک آدمی کی ساری زندگی ہے۔ ایک مکمل تفصیلی نقش۔ بلونت سنگھ کو تفصیلیں دینے میں واقعی کمال حاصل ہے۔ لیکن اس افسانے کی "کاملیت" اس کے اختتام سے دھکّا کھا جاتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بھرپور داستان کا سلسلہ ایک دم کاٹ دیا گیا ہو۔

اس کے علاوہ افسانے کی گہرائی کا لحاظ کرتے ہوئے یہ اختتام کچھ سستا اور عامیانہ سا نظر آتا ہے۔ یہ احساس ہوتا ہے کہ فنکار کا مقصد صرف یہ بتانا تھا کہ اتنے سالوں کے بعد اُسے اپنی بیوی کا گٹھا ہوا بدن اپنی بیٹی میں نظر آیا۔ تو منیر احمد کی پوری زندگی کا نقش اور اتنی تفصیلیں دینے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ ٹھیک ہے کہ یہ اختتام بجائے خود اچھا ہے۔ اور بالکل ناقابلِ یقین نہیں ہے۔ پہلے بھی اس کے لئے میدان صاف کیا گیا ہے۔ منیر احمد کی بیوی کے تندرست جسم کا بڑا تفصیلی عکس کھینچا گیا ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ وہ جسم اس کے لئے کیا معنیٰ رکھتا تھا اور اُسے اس جسم سے کیسی دیوانہ وار محبّت تھی۔ پھر برسوں بعد یہی جسم اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ہاں! یہ افسانے کا ایک چھوٹا حصّہ ہو سکتا تھا۔ لیکن اسے اختتام بنا کر بہت زیادہ اہمیت دیدی گئی ہے۔ اور وہ بھاری عمارت جو فنکار نے اتنی محنت سے تیار کی تھی، الٹی نظر آتی ہے۔ ایک ایسے وسیع افسانے کو جس میں ایک ساری زندگی کا جائزہ ہے، ایک ایسے گہرے افسانے کو ایسے عامیانہ مقام پر ٹھہرانا نہیں چاہیئے تھا۔ اختتام کی تعجب انگیزی اور نفسیاتی نکتہ وغیرہ کا خیال کئے بغیر داستان کو کچھ اور بڑھا کر یہاں ٹھہرانا چاہیئے تھا ــــ اپنی لڑکی کی یہ جنسی بیداری دیکھ کر وہ اس کی جلد شادی کر دیتا ہے۔ وہ اپنے شوہر کے گھر چلی جاتی، اور وہ پھر اس دنیا میں اکیلا رہ جاتا ــــ یہ کتنا اچّھا اختتام ہوتا۔ منیر احمد کی زندگی میں درد بھرا تھا۔ اس کی محبوب بیوی نہایت قلیل عرصے میں اس سے چھِن گئی تھی۔ اس کی غیر حاضری میں جب وہ اپنے اُجڑے ہوئے گھر کو واپس آتا ہے تو اپنی بچّی کو دیکھتا ہے۔ اور بچّی اب اس کی محبّت کا دوسرا مرکز بن جاتی ہے۔ اس کی ساری کائنات، اس کی زندگی کا سہارا۔ وہ اس کے لئے جیتا چلا جاتا ہے ..... اور وہ بھی اس سے چھِن جاتی ہے۔ وہ پھر اکیلا رہ جاتا ہے۔ تنہا۔ زندگی کا بوجھ گھسیٹتا ہوا ......

"بازگشت" ۱۹۴۲ء کے بہترین افسانوں میں گنا جا سکتا ہے۔ اور "خدا کی وصیت" ۱۹۴۵ء کا ایک بہترین افسانہ ہے۔ یہ ایک شاندار افسانہ ہے۔ اس میں نفاست، نزاکت اور صنّاعی بھی ہے، شان اور عظمت بھی۔ اس افسانے میں بلونت سنگھ نے انسانی فطرت کی ایک بنیادی خصوصیت بیان کی ہے۔ انسانی فطرت ایک خارجی سہارا ڈھونڈتی ہے۔ ایک اَن دیکھی اور انجانی قوّت پر ایمان لانا اس کے لئے دشوار ہے۔ وہ کم از کم اس اَن دیکھی انجانی قوّت کا نمائندہ قائم کر لیتی ہے۔ پتھر، درخت، پانی ہی سہی۔ اور جب یہ زندہ انسان ہو تو...... صدیوں کی مذہبی تاریخ اس بات کی شاہد ہے۔ ہر چھوٹے بڑے مذہب میں ایسا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو ہندوستانی ماحول میں بھی پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن بلونت سنگھ نے مصر کا انتخاب کیا ہے۔ اور مصرِ قدیم اپنی عظیم تہذیب کے ساتھ اس افسانے کے لئے ایک شاندار ماحول فراہم کرتا ہے۔ فرعون، فرعون کا محل، کاہن، تہوار کا دن، مندر اور دریائے نیل۔ ایک

مکمل اور موزوں ماحول ہے۔ اور افسانے میں عجب شان اور گمبھیرتا آگئی ہے۔ اس طرح کا اثر پیدا کرنا بہت مشکل ہے۔ ایسے افسانوں میں جن میں ایک مانوس ماحول لیا جاتا ہے، عام طور پر مواد کے بارے پن اور تفصیلوں کی کمی یا اُن میں غلطیوں سے افسانے میں سطحی پن آجاتا ہے۔ لیکن بلونت سنگھ نے جیسی تفصیلیں دی ہیں، جیسے منظر کھینچے ہیں اور آخر تک فضا کی تعمیر جس طرح کی ہے، واقعی حیرت انگیز ہے۔ انھوں نے مصر کو بھی کامیابی سے پیش کیا ہے۔ بلونت سنگھ صرف اور واحد پنجاب نگار نہیں کہا جا سکتا۔ ایک تو اس لئے کہ خود ان کے افسانے موضوع اور ماحول کے لحاظ سے بہت متنوع ہیں۔ اور پھر دوسروں نے بھی پنجاب کے دیہاتوں کو بڑی خوبی اور گہرائی سے پیش کیا ہے۔

حمید عثمانی

بلونت سنگھ کی یادیں

ایک نارمل آدمی پبلشر بن کر نام کما سکتا ہے۔ لیکن "پہلا پتھر" نہیں لکھ سکتا۔ بلونت سنگھ تھوڑے بہت نیوراتی (NEUROTIC) ضرور تھے، اور ان کے نیوراتی ہونے کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ وہ حساس بہت تھے۔ دوسرے یہ کہ ان کے والد سخت گیر تھے اور گھر میں وہ پرسکون ماحول نہیں تھا جس میں ایک ذہین اور ذکی حس بچے کی پرورش خاطر خواہ طور پر ہو سکتی۔ بچپن کے تناؤ بھرے ماحول نے ان کی زندگی پر گہرا اثر چھوڑا تھا جو آخر وقت تک باقی رہا۔ ان کے افسانے अपरिचित (اردو میں غالباً "اجنبی" کے نام سے شائع ہوا ہے) میں بلونت سنگھ کی زندگی کے اسی دور کی جھلک ملتی ہے۔

"دور والے کمرے سے باتیں کرنے، گانے اور قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔"

صاحب خانہ ادھر کا رخ کرتے ہیں۔ پھر تھوڑی دیر تک باہر ہی سے تماشا دیکھتے رہتے ہیں۔ پھر کمرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔ اُن کے وہاں پہنچتے ہی ہیبت سی چھا جاتی ہے۔

"کمرے میں ایسا مون چھا گیا کہ یدی فرش پر سوئی بھی گرتی تو اس کی آواز سنائی دے جاتی۔"

اس افسانے کے آخری جملے ہیں:

"جیتے جاگتے انسانوں کے اس کمرے میں قبرستان سے بھی ادھک خاموشی چھا گئی تھی۔" (اپریچت)

شروع زندگی ہی میں اگر کسی وجہ سے کومپلیکس پیدا ہو جاتا ہے تو اُن سے مفر نہیں ملتا۔ ایک الجھا ہوا شخص عمر بھر چوٹ پر چوٹ کھاتا چلا جاتا ہے۔ آگے چل کر ایک ناکام محبت اور پھر ناکام شادی۔ وہی کریلا، اُس پر سے نیم چڑھا والی بات ہو گئی۔ بلونت سنگھ کی زندگی کا یہ دور بہت ابتری کا تھا۔ دنیا کو بے دلی سے ٹھکرا دینے والی حالت تھی اور بلونت سنگھ آٹھوں پہر بے چین رہا کرتے تھے۔

راکا کے کردار کی تخلیق کرنے والا خود بھی راکا بن گیا۔ ویسی ہی بے دلی اور ویسی ہی ہٹ۔ راکا کی منزل کا اختتام جس

کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے ، اسی طرح کی کیفیت بلونت سنگھ پر بھی طاری تھی ۔

"سورج راکا کی پشت پر تھا۔ قاتل کا سایہ اس کو صاف نظر آرہا تھا۔ وہ نیزہ تانے راکا کی طرف حملہ کرنے کی نیت سے بڑھ رہا تھا۔ مگر راکا اپنی جگہ پر ٹس سے مس نہیں ہوا۔"

اس دور کے گزر جانے کے بعد کی بات ہے ۔ ایک دن ہم اُن کے گھر پہنچے تو وہ کچھ تصویریں لئے بیٹھے تھے ۔ اُن میں سے دو تصویریں انھوں نے ہماری طرف بڑھائیں ۔ ایک تصویر کسی اور کی تھی ۔ دوسری اُن کی اپنی تھی ۔ تصویریں میں بلونت سنگھ بہت صحتمند دکھائی دیتے تھے ۔ حالات اگر خراب نہ ہوتے تو اُن کی صحت ایسی نہیں تھی کہ جواب دے جاتی ۔ انھوں نے دھیرے دھیرے حالات سے سمجھوتہ کرلیا اور کچھ ایسا محسوس کرنے لگے کہ ___ KAZANTZAKIS کے لفظوں میں :

"سچی خوشی یہی ہے کہ آدمی تمام حوصلوں سے دست بردار ہو جائے مگر اپنے کام میں ایک گھوڑے کی طرح جُٹا رہے ___ گویا کہ کرنے کے لئے بہت کام ہے ۔ آدمیوں سے دور رہنا ، اُن کی ضرورت محسوس ہی نہ کرنا پھر بھی اُن سے محبّت کئے جانا ۔ کرسمس کی تقریبات میں خوب اچھی طرح کھانا پینا اور اپنے آپ کو کھو دینا تاکہ آپ اپنے ہی گلے میں پڑے ہوئے پھندے سے نکل بھاگ سکیں ۔ اور پرستاروں کو دیکھنا ، اپنے بائیں طرف پھیلے میدانوں کو اور دائیں طرف سمندر کو دیکھنا اور اچانک یہ محسوس کرنا کہ اپنے دل میں تم نے اور زندگی نے اپنا آخری معجزہ بھی دریافت کرلیا ہے ___ اور یہ کہ زندگی اب ایک پری کتھا بن گئی ہے ۔"

اکثر ایسا ہوتا کہ کسی ندی کے کنارے پہنچ کر وہ اپنی ڈگن پانی میں ڈال دیتے ۔ پھر دیر تک گرد و پیش کے مناظر سے اور اپنی تنہائی سے لطف اندوز ہوتے رہتے ۔ اُن کی ڈگن میں نہ تو کانٹا ہوتا تھا ، نہ مچھلیوں کا چارہ ۔ مگر یہ عجیب و غریب مشغلہ گھنٹوں جاری رہتا ۔ لوگوں سے ، بھیڑ بھاڑ سے ذرا دور رہا کرتے تھے ۔ ملنے ملانے کا زیادہ شوق نہیں تھا ۔ اسی لئے ایک ادیب شہیر نے بلونت سنگھ کو نک چڑھا SNOB لکھا ہے ۔ کچھ لوگ خود کو برتر ثابت کرنے کے لئے دوسروں میں کوئی نہ کوئی جھول دیکھ ہی لیتے ہیں ۔

آل احمد سرور نے مجاز کے بارے میں لکھا تھا کہ اس نے کبھی کوئی ٹولی نہیں بنائی ۔ ہم عصروں میں جس سے ملتا ، اُسی کی سطح پر ملتا ، شہرت کے لئے اُس نے کوئی جال نہیں بچھایا ، اُس کے دوستوں میں ہر مشرب و مسلک کے لوگ تھے ۔ یہی حال بلونت سنگھ کا تھا ___ اُن کا سب سے پسندیدہ مشغلہ کتب بینی تھا ۔ بے تحاشا پڑھنے والوں میں تھے ۔ اُن سے ہماری پہلی ملاقات UNIVERSAL BOOK CO. میں ہوئی تھی جو سول لائنس کے علاقے میں الٰہ آباد کا سب سے مشہور کتاب گھر تھا ۔ مجھ جیسے عام انسان سے بھی وہ کھل کر ملے تھے ۔ خوب باتیں کرتے تھے ، فقرے بازی میں بھی ملکہ حاصل تھا ۔

گرودوارے پابندی سے نہیں جاتے تھے مگر گرودوں سے عقیدت تھی ۔ گرو ارجن کے بارے میں انھوں نے ہی مجھے

یہ بتایا تھا کہ گروجی جنگ کے دوران جو تیر دشمن پر چلاتے تھے اس میں تھوڑا سونا لگا رہتا تھا تاکہ میت کے آخری رسوم کی ادائیگی میں کوئی معاشی مسئلہ پیدا نہ ہو۔ گلا کوما (GLAU COMA) ہو جانے کی وجہ سے کتب بینی کا سلسلہ لگ بھگ ٹوٹ گیا تھا۔ گرودوارے جانے لگے تھے۔ کہتے تھے اس سے قلب کو طمانیت ملتی ہے۔ اِدھر اُدھر کی گپ شپ میں کبھی اُن کی زبان سے کسی کا یہ جملہ بھی سنا تھا کہ "اے خدا! اگر تو کہیں ہے، تو میری روح کو، اگر روح وجود رکھتی ہے، تو شانتی دے!"

خود حساس تھے اس لئے یہ خیال بھی ہمیشہ رکھتے تھے کہ دوستوں میں کسی کے جذبات کو کبھی ٹھیس نہ پہنچے۔ صحرا نوردی (یا آوارہ گردی) کے بعد کبھی شام کو ہم ساتھ لوٹتے تو گھر تک انھیں پہنچانے ضرور جاتے۔ انھیں اگر یہ گمان بھی ہو تا کہ ہماری جیب ہلکی ہو چکی ہو گی تو یہ نہیں کہتے کہ تمہارے پاس پیسے نہیں ہوں گے بلکہ یہ کرتے کہ کچھ CHANGE ہماری طرف بڑھاتے، یہ کہتے ہوئے کہ شاید تمہیں چینج نہ ہونے سے زحمت ہو، کچھ لیتے جاؤ ـــــ سکھ گروؤں کے بارے میں بھی کبھی کبھار باتیں ہوتیں۔ انھیں گروؤں کے "انسانی اوصاف" سے زیادہ دلچسپی تھی۔ کہتے تھے ـــــ "گروؤں نے کرامتیں دکھانے سے ہمیشہ گریز کیا، یہ اعلان بھی کیا کہ اُن کو بھگوان سمجھنے والا جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں جائے گا۔"

زندگی کی تلخیوں نے بلونت سنگھ میں ایک طرح کی فکر مندی پیدا کر دی تھی۔ وسوسوں میں گھرے رہتے۔ ایک طرح کی FLOAT-ING WORRY کے عادی ہو گئے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گیسٹک السر (GASTIC ULCER) کے مریض ہو گئے۔ یہی مرض کچھ عرصہ بعد ان کے لئے مہلک ثابت ہوا۔ بے اطمینانی، تذبذب کی ایک مستقل کیفیت ان کا مزاج بن گئی تھی۔ ہر چیز کو وہ اس انداز سے دیکھتے جیسے انھیں ڈر ہے کہ یہی چیز آگے چل کر اُن کے لئے کوئی مصیبت نہ کھڑی کر دے۔ معمولی سی خراش بھی لگ جاتی تو اینٹی ٹیٹنس انجکشن (A.T.S) انکے لئے ناگزیر ہو جاتا۔

پہلی شادی کی ناکامی کے بعد عہد کر لیا تھا کہ اب دوسری شادی نہیں کریں گے۔ گھر بسانے کی کوئی نیت نہیں تھی، حد تو یہ ہے کہ ڈرائنگ روم کا فرنیچر تک کرائے کا تھا۔ کوئی بچہ گود لینا چاہتے تھے۔ ہم اس ارادے کے حق میں نہیں تھے۔ بالآخر انھوں نے ہماری بات مان لی اور یہ ارادہ ترک کر دیا۔ ایک اندیشہ جس میں وہ مبتلا رہنے لگے تھے، یہ تھا کہ کہیں پہلی بیوی، جس سے علیحدگی ہو چکی تھی، انھیں کسی قانونی مخمصے میں نہ پھنسا دے۔ "جیل جانا پڑ گیا تو ـــ؟" اس سلسلے میں ہم نے کئی وکیلوں سے مشورے کئے۔ انھیں مطمئن کرنا آسان نہیں تھا۔ ہر بات صیغۂ راز میں رکھی گئی۔ یہ ساری کارروائی ہماری ہی تحریک پر شروع کی گئی تھی مگر انھوں نے ہم سے بھی اصل بات چھپائی۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں ہماری زبان سے کوئی بات نکل نہ جائے اور وہ کسی پریشانی میں پڑ جائیں۔ اسی طرح کے وہم گھیرے رہتے تھے۔ ایک دن اچانک نوٹس دیا۔ "چلو ہمارے ساتھ! شادی کے کاغذات پر دستخط ہونے ہیں۔"

بلونت سنگھ کے گرد اتنے اندیشوں کا جال پھیلا ہوا تھا کہ آٹھوں پہر الجھے رہتے۔ شاید ہی کبھی RELAXED رہتے ہوں ـــــ "شاید کہ پلنگ خفتہ باشد" کا بھوت ہر دم ان پر سوار رہتا تھا۔ دنیا میں ان کے لئے کہیں کوئی دارالامان نہیں تھا۔

پھر بہت کھینچ تان کے بعد دوسری شادی بھی ہو گئی۔ یہ بیوی بہت قاعدے کی نکلیں۔ ان سے دو بچے ہوئے۔ گھر کا ماحول پُر سکون بھی ہو گیا ـــــ مگر شاید اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی۔

بلونت سنگھ کی باتیں

پہلی گفتگو : بلونت سنگھ سے براہِ راست ۔ بات کرنے والے کا نام نہیں معلوم ہوسکا ۔

س ۔ آپ نے کب اور کس ماحول میں لکھنا شروع کیا ؟

ج ۔ ہندوستان کی سیاسی اور سماجی صورتِ حال نازک اور متزلزل تھی ، اُس وقت لکھنا شروع کیا ۔

س ۔ آپ کو لکھنے کی تحریک کہاں سے ملی ؟

ج ۔ ہمارے خاندان میں خاص ادبی روایت نہیں تھی ۔ میرے والد صاحب پریم چند کو بہت پسند کرتے تھے ۔ اس کے علاوہ سدرشن اس زمانے میں چھائے ہوئے تھے ۔ میں ان کی کہانی سے محظوظ ہوتا تھا اور پڑھتا رہتا تھی ۔

س ۔ پنجاب کے فنکار زیادہ فکشن کی طرف متوجہ ہوئے ۔ آپ نے کبھی شاعری کی یا ڈائریکٹ افسانے پر آگئے ؟

ج ۔ میں نے شاعری میں دلچسپی لی ۔ لیکن فراق صاحب ، جو میرے والد کے دوست تھے ، ان سے بھی مشورہ ہوتا تھا انھوں نے مجھے شاعری سے ہٹا دیا اور کہا پروز لکھو ، پروز لکھنا ضروری ہے ، شاعری میں تو وہ آئے جیسے کوئی چارۂ کار نہ ہو ۔ وہ میرے استاذ بھی تھے اور والد صاحب کے دوست بھی ، مجھے ان کی رائے پسند آئی اور میں نے اس پر عمل کیا ۔

س ۔ آپ کی ولادت کہاں اور کس سنہ میں ہوئی ؟

ج ۔ میں ۱۹۲۰ء میں گجرانوالہ کے گاؤں چک بہلول میں پیدا ہوا ۔ لیکن پنجاب میں نے بہت چھوٹی عمر میں چھوڑ دیا ۔ پنجاب کا نقش میرے دل میں بن گیا ۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ میں نے پنجاب کو چھوڑ دیا ۔ اگر وہاں رہتا تو اس کے نقوش اس قدر واضح نہ ہوتے میرے ذہن میں ۔ پنجاب چھوڑ دینے سے یادیں میرے مَن میں تازہ رہیں ۔

س ۔ آپ نے تعلیم کہاں حاصل کی ؟

ج۔ پنجاب میں میری کوئی تعلیم نہیں ہوئی۔ میں نے کیمبرج اسکول، دہرہ دون میں تعلیم حاصل کی۔ میں نے ہائی اسکول مشن اسکول، دہرہ دون سے کیا۔ ایونگ کرسچن کالج سے اِنٹر اور الٰہ آباد سے بی۔ اے کیا۔

س۔ کہا جاتا ہے کہ پنجاب کی زمین کو سمجھنا، اس کی خوشبو کو پکڑنا ہے تو بلونت سنگھ کو پڑھئے۔ آپ کے موضوعات میں وسعت نہیں ہے۔ کیا آپ نے اتنی مختصر مدّت کے دیکھے ہوئے پنجاب کے ساتھ انصاف کیا ہے؟

ج۔ بارہ کتابیں تو میری پنجاب سے تعلق ہی نہیں رکھتیں۔ بمشکل پانچ کتابیں پنجاب سے تعلق رکھتی ہیں۔ لوگوں کو پنجاب کا رنگ زیادہ پسند آیا۔ لاہور میں "ادبی دنیا" نکلتی تھی۔ صلاح الدین احمد صاحب میرے بڑے مدّاح تھے۔ انھوں نے میری بڑی ہمّت افزائی کی۔ وہ میری کہانی پر نوٹ لکھتے تھے۔

س۔ اردو شعر و ادب کا جو مزاج ہے اس میں عورت کی تصویر کشی پر جتنی محنت کی ہے وہ مرد کی تصویر کشی پر نہیں۔ آپ کے افسانوں کے مرکزی کردار مرد ہیں۔ جس طرح مردوں کا کردار پیش کیا ہے اس کا جواب نہیں ملتا۔ کیا آپ کو عورت سے الرجی ہے۔ ڈاکوؤں کے کردار، ٹھاکروں کے کردار۔ یہ لاجواب تصویر کشی کسی عورت میں نہیں پائی جاتی؟

ج۔ شروع سے میرا مزاج ایسا ہے کہ اگر مجھے پتہ چلے کہ فلاں جگہ مجرا ہو رہا ہے اور فلاں جگہ دنگل ہو رہا ہے تو دنگل مجھے زیادہ اپیل کرتا تھا۔

س۔ کیا آپ کی زندگی میں بھی کوئی عورت تھی؟

ج۔ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ بہت سی ایسی لڑکیاں تھیں جو میری مدّاح تھیں۔ ملتی تھیں۔ دہلی میں پبلیکیشنز ڈویژن میں تھا تب بھی میرے پاس لڑکیاں آتی تھیں مگر کسی نے مجھے متاثر نہیں کیا۔

س۔ پریم چند اور اُپیندر ناتھ اشک کے بعد تیسرا بڑا نام آپ کا ہے جس نے اردو سے ہندی میں ہجرت کی۔ ایسا کیوں ہوا؟

ج۔ اس کی صحیح وجہ تو یہی تھی کہ ہندی میں ہماری ریڈر شپ واسٹ تھی۔ اردو میں تقسیم کے بعد کوئی اچھا میگزین اچھا پبلشر نہیں تھا۔ ہندی میں کتابیں بھی چھاپتے تھے، پیسہ بھی اچھا دیتے تھے۔ میری زندگی میں ایک طویل دور ایسا رہا ہے جب اپنے قلم کے بل بوتے پر زندہ رہنا پڑا۔ مگر اردو میں ایسا کوئی میگزین نہیں تھا جو پیسے دے سکے، سوائے "آجکل" وغیرہ کے۔

س۔ جب آپ نے ذہن و فکر کو اردو سے ہندی میں پیش کیا تو اسکرپٹ ٹیکنگ میں دقت ہوئی یا آپ اسکرپٹ CHANGE کر کے پیش کر دیتے تھے؟

ج۔ میں نے ہندی میں آنے کے بعد زبان اردو ہی رکھی۔ اس لئے ہندی والے محسوس کرتے ہیں کہ میں اردو وائز ڈ ہندی

لکھتا ہوں ۔کیونکہ میں نے اردو کی چیزوں کو اسی طرح ہندی میں کنورٹ کر دیا ہے ۔

امرت رائے کہتے تھے کہ ہندی نیشنل لنگویج بن گئی ہے تو اس میں یہ ہوگا ہی ۔ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے لوگ بھی ہندی میں لکھیں گے ۔ ہندی کی جو پریم پرائیں ہیں وہ اس کے پابند رہیں ، ضروری نہیں کہ وہ اپنا رنگ لائیں ۔ میں نے تو صرف اسکرپٹ بدلی ۔کیونکہ اردو صاف ستھری زبان ہے ۔یہ دربار ی زبان رہی ۔ اس کو بادشاہوں نے گلے لگایا ، اس میں لکھا بھی اور شاعری بھی کی ۔

<u>دوسری گفتگو:</u> رام سنگھ ، بلونت سنگھ کے پرانے دوست ہیں ۔یہ بات چیت شاہدہ پروین اور رام سنگھ کے مابین ہوئی ۔

س ۔ منجو جی نے مجھے بتایا کہ بلونت سنگھ جی سے آپ کے مراسم بہت پرانے تھے ۔ آپ انھیں کب سے جانتے تھے اور کتنے عرصے ان کے ساتھ رہے ؟

ج ۔ میں ۱۹۳۷ء سے لے کر آخری وقت تک بلونت سنگھ کے ساتھ رہا ۔وہ میرا عزیز تھا ، میرا ساتھی تھا ، میرا دوست تھا ، میرا بھائی تھا ، میرا کلاس فیلو تھا ۔ ہم دونوں یونگ کرسچن کالج میں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے ۔ B.A کے بعد وہ <u>لکھنے لگے</u> کیونکہ اردو کا دائرہ ۴۷-۱۹۴۶ء میں لاہور اور پنڈی وغیرہ میں خوب پھلا پھولا ۔

س ۔ آپ نے بلونت سنگھ کو بہت قریب سے دیکھا ہے ۔ براہ کرم کچھ ایسے واقعات یا باتیں ہمیں بھی بتائیے جو اُن کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کو روشن کر سکیں ۔

ج ۔ نہایت ہی سادہ طبیعت کے مالک تھے ۔کرتا پاجامہ پہنتے تھے ۔خودداری کا عالم یہ تھا کہ اگر کپڑے پھٹ گئے ہیں تو سی کر پہن لیں گے مگر باپ سے یہ نہیں کہتے تھے کہ میرے کپڑے پھٹ گئے ہیں ۔ باپ کی نظر پڑتی تو چلاتے اور کہتے "ارے بلونت ! یہ تو نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے ۔" اور انھیں کپڑے بنا کر دیتے ۔حد یہ ہے کہ باپ سے فیس تک نہیں مانگتے تھے ۔جب وہ پوچھتے "بلونتیا ! تو نے اپنی فیس جمع کر دی ؟" تو بلونت بڑی انکساری سے سر جھکا کے جواب دیتا " آپ نے دی ہی نہیں ۔" اور اکثر اس جواب پر چاچا جی جھلا رہتے ۔ البتہ میری یہ خوش نصیبی تھی کہ وہ ضرورت پڑنے پر اکثر میرے کپڑے بلا تکلف استعمال کر لیا کرتے تھے ۔

وہ ایک آزاد منش تھے اور اتنے آزاد تھے کہ اپنی ذات پر اپنے ماتا پتا کی حکومت بھی قبول کرنے کو تیار نہیں تھے ، جتنا کہ ہمارے ہندوستانی گھرانوں میں لائق بیٹوں سے امید کی جاتی ہے ۔ اس رد بچے کے پیچھے ان کے والد کی

سخت گیری بھی تھی۔ ان کے والد سدھو سنگھ جی ریٹائرڈ ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انگریز افسروں نے ان کے ساتھ جو کچھ اور جس انداز سے کیا بالکل وہی نظم و ضبط اور وہی انداز وہ گھر میں بھی رکھنا چاہتے تھے۔ یہ سختی اور پابندی ان کے مزاج کو راس نہیں آئی اور وہ اپنے والد سے خفا رہنے لگے۔ یہاں تک کہ بارہ تیرہ سال کی عمر میں کسی بات پر ناراض ہو کر انھوں نے گھر چھوڑ دیا اور ایک چھوٹی سی گلی میں چار آنے مہینہ پر کوٹھری کرائے پر لے کر رہنے لگے اور لیمپ کے شیڈ بنا بنا کر بیچنے لگے اور اس قدر خوبصورت شیڈ بناتے کہ لوگ دیکھتے رہ جاتے۔ گھر والوں نے انھیں منانے کی بڑی کوشش کی مگر وہ گھر واپس نہیں گئے۔ لاہور میں MEHRA MENTIONS میں پریس کھولنا چاہتے تھے مگر وہاں سے چلے آئے۔

اس کے بعد انھیں بزنس کرنے کا شوق ہوا اور گاؤں جا کر اپنی ساری زمین بیچ دی۔ اس وقت میں لاکھ، سوا لاکھ روپیہ ان کو ملا۔ کچھ عرصہ تک وہ ٹھیکے داروں کا کام کرتے رہے اور پھر بزنس کرنے کی غرض سے ایک شناسا کے پاس بمبئی چلے گئے۔ وہاں سیٹھ جی نے ان کی خاطر مدارات تو بہت کی مگر وقت نہیں دیا۔ یہ بے نیازی دو چار دن بعد ان سے برداشت نہ ہو سکی اور اکتا کر وہاں سے چلے آئے اور جب کچھ نہیں سوجھا تو کراچی میں انھوں نے گھاس خریدی، اکھٹی ۷۶ ہزار کی اور LOSTAL جہاز سے بمبئی کے لئے روانہ کر دی۔ بمبئی تک جہاز پہونچنے میں چھ دن لگتے تھے مگر راستے میں ہی جہاز میں آگ لگ گئی۔ جہاز جل گیا۔ گھاس جل گئی۔

اس واقعے کا بلونت سنگھ پر بہت اثر تھا۔ روپیہ کھونے کا غم اس قدر نہیں تھا جتنی کہ والدین سے شرمندگی تھی۔ مگر اُس وقت چاچا جی نے ان کی بڑی ڈھارس بندھائی اور کہا کوئی بات نہیں، تو ۷۶ ہزار روپیہ مجھ سے لے لے۔ اس کے دماغ سے تجارت کا بھوت ابھی اترا نہیں تھا۔ چنانچہ ۷۶ ہزار روپیہ لے کر میرا بھائی پھر بڑی شان سے بزنس کرنے نکل کھڑا ہوا اور ناسک وغیرہ گھومتے گھامتے لمبا چکر کاٹ کر الہ آباد پہونچا جہاں اُس نے ایک RESIDENTIAL ہوٹل کھولا جس کا نام امپیریل ہوٹل رکھا گیا۔ مگر اس کے ہاتھ میں آتے ہی وہ ہوٹل ایک ادبی کلب بن کر رہ گیا۔ اس کے ادیب اور شاعر دوست وہاں آتے اور مہینوں مہینوں اس ہوٹل میں پڑے رہتے۔ غرضیکہ ہوٹل کا بھی کام تمام ہو گیا۔ ساری جمع پونجی ٹھکانے لگا کر اُس نے فیصلہ سنا دیا کہ ”میں تو صرف قلم ہاتھ میں لے سکتا ہوں، تجارت میرے بس کی بات نہیں۔“

س۔ آپ نے تو ان کی والدہ کو بھی دیکھا ہوگا؟

ج۔ ہاں ... بڑی لائق خاتون تھیں۔ بڑھی لکھی تو نہیں لیکن بحیثیت ماں، وہ ایک مثالی عورت تھیں۔ میں تو اُن کے

اکلوتے بیٹے کا چہیتا دوست تھا۔ لہٰذا میرے لاڈ پیار میں بھی کبھی کسر نہیں اٹھا رکھتی تھیں۔ ہمارے گھر کی چھوٹی بڑی تقریبوں میں شریک ہوتیں اور دل کھول کر لینا دینا کرتی تھیں۔

س۔ بلونت سنگھ کی پہلی شادی کب اور کن حالات میں ہوئی؟

ج۔ ان کی پہلی شادی ۱۹۵۱ء میں ہوئی۔ اور ان کی مرضی جانے بغیر ان کی والدہ نے اپنے بھائی کے کہنے پر یہ شادی پکی کر دی۔ لڑکی کے باپ D.O. مہ کینال تھے۔ بڑے پیسے والے آدمی... اُن کی بیٹی کئی بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ضرورت سے زیادہ آرام طلب اور عیش و عشرت کی عادی۔ ادھر یہ حضرت بھی خاصے نازک مزاج تھے۔ حالانکہ وہ اس کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اس کا پہننا اوڑھنا، اس کی دوسری ضروریات، گھمانا پھرانا۔ اپنا خاصہ وقت اُسے دیتے تھے مگر پھر بھی دونوں کا نباہ نہ ہو سکا اور یہ شادی ٹوٹ گئی۔ دوسری شادی اس نے اپنی پسند سے کی جو بہت کامیاب رہی۔

س۔ اپنے رشتہ داروں کے تئیں بلونت سنگھ کا کیا رویّہ تھا؟

ج۔ بلونت سنگھ جھکنا نہیں جانتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے رشتے داروں سے بھی دور ہی دور رہتے۔ البتہ ان کے ایک ماما جی تھے جو چنڈی گڑھ سے اکثر اُن کے پاس آجایا کرتے تھے۔ خاندان والوں کے یہاں جینے مرنے میں شریک ہوتے مگر خود کو بڑا لئے دئے رکھتے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے "بھائی! ہماری دنیا الگ ہے، ہمارے پاس صرف قلم ہے۔ ان کی دنیا الگ ہے، وہ لوگ پیسہ کما رہے ہیں" شاید اُس کے مَن میں کہیں یہ خوف تھا کہ پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے وہ لوگ اس کی عزت نہیں کریں گے۔ حالانکہ یہ محض اس کی غلط فہمی تھی۔ ورنہ اس کے عزیز تو اس سے بے حد محبت کرتے تھے۔ وہ اگر کبھی اشارہ بھی کر دیتا تو وہ لوگ ہنسی خوشی اسے بہت کچھ دینے کو تیار ہو جاتے۔ مگر اس قسم کی باتیں اس کے مزاج کے منافی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ اپنے ساتھیوں میں اشک وغیرہ کی طرح اس نے اپنی مالی حالت سدھارنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔

س۔ اُن کی زندگی میں مذہب کی کیا حیثیت تھی؟

ج۔ مذہب ان کے یہاں ایک رویّہ تھا، کوئی بندش نہیں تھی۔ ان کے مذہب نے انھیں وسیع القلب بنا دیا تھا تنگ نظر نہیں۔ ان کا مذہب ظاہری رسوم و قیود سے آزاد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں کبھی گردوارے جاتے نہیں دیکھا۔ وہ گیتا بھی پڑھتے تھے، گرنتھ صاحب کا پاٹھ بھی کرتے تھے اور قرآن شریف بھی پڑھتے تھے۔ مگر ان کتابوں کی حیثیت ان کے لئے ایک ادبی شہ پارے سے زیادہ نہ تھی۔ تنگ نظری انھیں چھو کر بھی نہ گزری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بڑے مسلمان گھرانوں میں بے تکلّف آنے جاتے تھے۔ الٰہ آباد میں دائرۂ شاہ اجمل اور پرنا بگر میں مفتی فضل حسین مرحوم وغیرہ کے گھر اُن کا خاصہ آنا جانا تھا اور مفتی صاحب کا

احترام تو وہ یوں بھی کرتے تھے کہ مفتی صاحب ہم لوگوں کے استاذ تھے۔ ہم دونوں نے ان سے فارسی پڑھی تھی۔ نہایت سادہ لوح اور نیک انسان تھے مشکل سے مشکل مضمون دو جملوں میں بیان کر دیتے تھے۔ بلونت سنگھ گھنٹوں گھنٹوں ان کے پاس بیٹھا کرتے۔ فارسی کی بیشتر چیزیں بلونت نے انہی سے پڑھی تھیں۔ ان سے بلونت سنگھ کی لگاوٹ کا یہ عالم تھا کہ ان کے انتقال کے بعد بلونت سنگھ نے وہ راستہ چھوڑ دیا۔ اور کبھی اگر اس مکان کے سامنے گزرتا تو سر جھکا کے چلتا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے ذہن میں کسی شکل میں بھی تعصب کا کیڑا رینگ رہا ہوتا تو بلونت سنگھ نہ تو ان لوگوں سے محبت کر سکتا اور نہ ان کی شفقتوں کا ساجھے دار بنتا۔

س۔ بلونت سنگھ کی خودداری نے انھیں کبھی کھلنے نہیں دیا مگر آپ کو ان سے جو قربت رہی ہے تو یقیناً آپ نے انھیں ٹوٹتے اور بکھرتے بھی دیکھا ہوگا؟

ج۔ پریشان تو وہ شروع سے رہے۔ باپ سے نہیں بنی۔ بیوی سے پریشان رہے۔ مالی طور پر نا آسودہ رہے۔ عمر کے آخری حصّے میں صحت خراب ہوگئی تو مرتے دم تک بیوی بچّوں کے مستقبل سے خوفزدہ رہے لیکن ان تمام پریشانیوں کو وہ بڑے وقار سے جھیل گئے۔ انھوں نے اپنی پریشانیوں کو کبھی مشتہر نہیں ہونے دیا۔

ایک بات اور۔ بولتے بہت اچھا تھے۔ سرداروں پر لطیفے بہت سناتے تھے۔ ایسے ایسے بیہودہ اور واہیات لطیفے بھی اس میں شامل ہوتے تھے کہ خدا کی پناہ۔ یہی نہیں، جب لطیفہ یاد نہ آتا تھا تو وہ جھٹ سے خود لطیفہ خلق کر لیتے تھے۔ سکھوں پر اتنے لطیفے شاید ہی کسی کو یاد ہوں۔ خود اپنے اوپر پھبتیاں کستے رہتے اور کہتے "آدمی میں خود پر ہنسنے کا حوصلہ ہونا چاہئے۔ دوسروں کو تکلیف دینے سے کیا حاصل"۔ یہ حقیقت ہے کہ اس نے کبھی دوسروں کو تکلیف نہیں دی۔ اپنا بڑے سے بڑا دکھ بھی اپنے قہقہوں میں چھپائے گیا۔

س۔ اُن سے آپ کی آخری ملاقات کب اور کہاں ہوئی تھی؟

ج۔ اس سے میری آخری ملاقات بسترِ علالت پر ہوئی تھی جب اس کی طبیعت بہت خراب تھی، منجو نے مجھے اطلاع دی اور میں فوراً اُسے دیکھنے پہنچ گیا۔ اس وقت عظیم الجثہ بلونت ڈھے چکا تھا۔ نقاہت غالب تھی۔ مجھے دیکھا تو مسکرا کر میرا ہاتھ پکڑ لیا اور بولے:

"میرے دوست! میرے بھائی! تم نے میرے ساتھ بہت زمانہ گزارا ہے۔ ہمیشہ میرا ساتھ دیا ہے۔

فرق اتنا رہا کہ تم کماتے رہے اور میں لکھتا رہا۔ بس اب یہ ساتھ چھوٹا ہی جاتا ہے"۔

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گیا اور خالی خالی نظروں سے خلا میں گھورنے لگا۔ آنے والی قیامت کی بو باس میرے حواس پر بھی چھائی جا رہی تھی جس کے احساس سے میری آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔

س ۔ آپ کو ان کے انتقال کی اطلاع کب ملی ؟

ج ۔ میری طبیعت خراب تھی ۔ جب آپریشن ہوا تو منجو نے مجھے تار دیا کہ ان کا آپریشن ہوا ہے اور دوسرے ہی دن تار آیا کہ آپریشن کامیاب رہا ۔ مجھے اطمینان ہوا ۔ ابھی میں الہ آباد جانے ہی والا تھا کہ اچانک اطلاع ملی کہ اس کا انتقال ہو گیا ۔ فوراً روانہ ہونے پر بھی میں اُسے کاندھا نہ دے سکا ۔ اس کی صورت بھی مجھے نہ مل سکی ۔ کیونکہ گرمی بے حد شدید تھی اس لئے کسی کا انتظار کئے بغیر ہی اس کا کریا کرم کر دیا گیا ۔ مجھے امید نہ تھی کہ پچاس ، پچپن سال ساتھ رہنے کے بعد وہ یوں بغیر ملے چل دے گا ۔

جہاں پورے کا پورا واقعہ زندگی سے لے کر اُس پر کہانی نہیں لکھی جاتی بلکہ صرف تھیم لی جاتی ہے ، وہاں کہانی شروع کرنے کے بعد آخری نقطے تک پہنچنے کے لئے بہت کچھ پیڈنگ کرنی پڑتی ہے ۔ یعنی بہت کچھ ایسا مواد بھرنا پڑتا ہے ، جس کا کہانی کی تھیم سے براہِ راست اتنا تعلق نہیں ہوتا ۔ بیدی ایسے میں دنیا جہان کی جزئیات دے دیتے ہیں اور وہ سارا علم کہانی میں بھر دیتے ہیں جو انھوں نے سائنس ، آرٹ ، سنگیت یا فلسفے کے سلسلے میں حاصل کیا ہو ۔ لیکن بلونت سنگھ یہ بھراؤ بھی ایسی صفائی اور چابکدستی سے کرتے ہیں کہ وہ تمام جزئیات بنیادی تھیم کے ہی عناصر لگتے ہیں ۔ جبکہ بیدی کے یہاں یہ محسوس ہوتا ہے اور مجھ جیسے تنک مزاج قاری کو یہ بات گراں گزرتی ہے ۔

جہاں تک منٹو کا تعلق ہے ، تھوڑی مماثلت بلونت سنگھ اور منٹو میں بھی ہے ۔ منٹو کی طرح ان کی کہانیوں کے انجام کا پتہ آخر تک نہیں چلتا اور قاری بے پناہ تذبذب و اشتیاق کی حالت میں ڈوبا رہتا ہے ۔ اختتام پر پہنچ کر اُسے ویسا ہی جھٹکا لگتا ہے جیسا منٹو کے افسانوں میں ۔ فرق دونوں میں ادب کے سلسلے میں اُن کے نقطۂ نظر کے باعث ہے ۔ منٹو کے یہاں اکثر اُن کہانیوں میں جہاں انھوں نے سماج کی کسی برائی کی تصویر کشی کی ہے ، بے پناہ غصّہ ہے یا پھر تھوڑا سا چونکا دینے والا عنصر ۔ بلونت سنگھ کے یہاں ایسا نہیں ہے ۔ جیسا کہ میں پہلے اپنی کتاب "ہندی کہانی : ایک انترنگ پریچے" یعنی ہندی افسانے کا ایک قریبی تعارف ، میں لکھ چکا ہوں ۔ بلونت سنگھ کے یہاں نہ کرشن جیسا غصّہ ہے نہ منٹو جیسا غیظ و غضب اور اندرونی تکلیف ، بیدی جیسی دردمندی ـــــ انسان کی شُدرتی کے خیال سے ان کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ آتی ہے ۔ کبھی دُکھ بھری ، کبھی سُکھ بھری اور کبھی دُکھ سُکھ بھری ۔ اور یہی مسکراہٹ اپنے ہونٹوں پر لئے ہوئے بلونت سنگھ انسان کو اپنی کہانیوں میں اسیر کرتے ہیں ۔" (اوپیندر ناتھ اشک ۔ اقتباس بشکریہ "آجکل" دلّی جنوری ۱۹۹۵ء)

شاہدہ پروین

بلونت سنگھ

بلونت سنگھ اردو افسانے کا ایک بھولا بھٹکا نام ہے ۔ اس نام کو اردو قاری اور نقاد ، دونوں نے بڑی خاموشی کے ساتھ فراموش کر دیا ہے ۔ اس میں کچھ قصور بلونت سنگھ کا بھی تھا ۔ اس مرد آزاد نے نے کبھی اپنے ہنر کے تئیں سنجیدگی کا رویہ اختیار نہیں کیا ۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ انھوں نے کبھی نام کمانے کی کوشش نہیں کی ۔ اپنے نام کے ساتھ وہ کسی تحریک ، کسی پارٹی یا کسی حلقے کا لیبل لگالیتے تو ان کی زندگی میں نہ سہی ۔ کن از کم مرنے کے بعد ان کے نام پر دو ایک تقریبات برپا ہو ہی جاتیں ۔ مگر انھوں نے یہ بھی نہیں کیا ۔

ان کی نجی زندگی سلامت روی کے باوجود کسی چیز کی پابند نہیں رہی ہے مجھے ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں جو تفصیلات معلوم ہوئیں ان سے اسی امر کی تصدیق ہوتی ہے ۔ مثال کے طور پر بچپن میں بھی اکثر یہ ہوتا تھا کہ گھر سے اسکول کے لیے چلتے ۔ راستے میں دریا کے کنارے بیٹھ گئے ہیں ۔ بستہ ایک طرف پڑا ہوا ہے کنکر جمع کرتے ہیں اور دریا میں پھینکتے جارہے ہیں سطح آب پر بنتے بگڑتے دائرے دیکھ کر خوش ہو رہے ہیں ۔ اس کا ہوش نہیں گھر سے اسکول کے لیے نکلے تھے

یہ واقعہ خود بلونت سنگھ نے بیان کیا ہے ۔

ایک دن گھر سے اسکول کے لیے روانہ ہوا ۔ راستے میں تماشہ ہو رہا تھا ۔ بس پھر کیا تھا ۔۔۔۔ میں بھی بھیڑ میں جا گھسا اور پورے انہماک سے تماشہ دیکھنے لگا ۔ یہاں تک کہ وقت کا رتی بھر احساس نہ رہا ۔ ادھر اسکول سے غائب ہونے پر والد صاحب مجھے ڈھونڈنے کے لیے نکلے ۔ یہاں محویت کا یہ عالم کہ مجھے اپنی خبر تک نہیں ۔ ۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ میرے کندھے پر پیچھے سے کسی نے سختی سے ہاتھ رکھا ہے میں نے کندھے کو جھٹکا دیتے ہوئے بڑی ناگواری کے ساتھ پلٹ کر دیکھا تو والد صاحب کو کھڑا پایا ۔ کہنے لگے " بلونت گھر چلو " تماشا دیکھنے کا سارا مزہ کرکرا ہو گیا اور اپنا ہی تماشہ بنتا ہوا نظر آیا ۔ مگر والد صاحب نے مجھے کچھ نہیں کہا والدہ کے سامنے لا کھڑا کر دیا اور بولے لو سنبھالو اپنے لاڈلے کو ۔

اپنی ملازمتوں کے سلسلے میں بھی انہوں نے اس آزادی کو برقرار رکھا۔ دفتر جانے کے لیے تیار ہوئے، چلتے چلتے، کچھ یاد آگیا اور لکھنے بیٹھ گئے۔ لیجیے! اب ہو گئی ہفتہ ہفتہ بھر کی چھٹی۔

وہ اپنی ماں کو بے حد چاہتے تھے۔ جب کبھی ان کی باتیں کرتے تو لفظ لفظ سے محبت پھوٹی پڑتی تھی۔ ماں بھی ان کو چھوٹے بچے کی طرح عزیز رکھتی تھیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا بڑا خیال رکھتی تھیں۔

اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ دوستوں کے ساتھ بحث و مباحثہ میں مصروف ہوتے کہ ایک چھوٹا سا لڑکا آتا اور ان سے کہتا: ماں جی پوچھ رہی ہیں کہ تم نے اب تک کھانا کیوں نہیں کھایا۔ یا ماں جی پوچھ رہی ہیں کہ تم نے ابھی تک لسی کیوں نہیں پی۔

والد کا تذکرہ کرتے تو اس میں عقیدت کا اظہار زیادہ ہوتا تھا، والہانہ محبت کا اظہار کم۔ دراصل وہ اپنے والد سے ڈرتے بہت تھے۔ شاید اس لیے کہ والد ان کے استاد بھی تھے۔ مگر اپنے والد کی ایک بات کی وہ بہت تعریف کرتے تھے۔ وہ ان کی والدہ کا بے حد لحاظ رکھتے تھے۔

بلونت سنگھ عقیدے، وضع قطع اور عادات و اطوار کے اعتبار سے ٹھیٹھ سکھ تھے۔ ان کا گھریلو ماحول مذہبی ضرور تھا۔ گھر میں پردے کا بھی سخت رواج تھا۔ لیکن اس گھر میں مذہبی تنگ نظری یا کٹر پن کا کہیں گزر نہیں تھا

یہی دو انسان دوستی، مذہبی رواداری اور ذہنی آزادی ان کے افسانوں کا حصہ بنی۔ ان کے افسانے ان کے مشاہدے کا بے باک بیان اور جذبات کا بے تکلف اظہار ہیں۔ ان میں اوپر سے لادی ہوئی مقصدیت نہیں ملتی۔

ان کے ذہن کے کینوس پر پنجاب کا دیہات پھیلا ہوا ہے، ایک گہری ارضیت اور زندگی کی حرارت کی ساتھ۔ وہ شعوری طور پر اپنے بیان کو آراستہ کرتے ہیں اور نہ کرداروں کو تزیین۔ وہ پنجاب کو جس طرح سے دیکھتے ہیں ویسا ہی دکھا بھی دیتے ہیں۔ ماحول کی شادابی اور زرخیزی مزاجوں کی سچائی اور اجڈ پن، قہقہے اور آنسو، ہمدردی اور نفرتیں، آپسی رشتے اور ان رشتوں کی نزاکتیں، پھر پنجاب کے کھیت، میلے ٹھیلے، شادی بیاہ، رسوم اور روایات، غرضیکہ اس زندگی کے تمام خوشگوار اور ناخوشگوار پہلوؤں کو ان کی مکمل تفصیلات کے ساتھ پیش کرتے ہیں صرف ایک تصویر دیکھیے۔

"دھوپ ہلکی پڑ چکی تھی۔ لیکن گرمی اب بھی کافی تھی۔ سڑک بڑے بڑے کھیتوں سے ہو کر جاتی تھی۔ راستے میں سڑک سے ذرا پرے ہٹ کر جا بجا رہٹ چلتے دکھائی دے رہے تھے کنوؤں کا صاف و شفاف پانی جھالوں میں گرتا ہوا

آنکھوں کو کس قدر بھلا معلوم ہوتا تھا۔ ان کنوؤں کے گرد قینچی سے کتری ہوئی
ڈاڑھیوں والے کسان موٹے سوتی کپڑے کی تہبند باندھے بڑے سرور کے عالم
میں حقے گڑگڑاتے نظر آتے تھے۔ جب کنوؤں پر کام کرنے والی لڑکیاں اور
عورتیں کھیتوں میں مٹک مٹک کر ادھر ادھر چلتیں تو ان کی لمبی لمبی چوٹیاں
ناگنوں کی طرح بل کھا کھا کر لہراتی تھیں۔ بیلوں کی ٹانگوں میں گھس گھس کر
بھونکنے والے کتے اپنا الگ شور مچا رہے تھے۔ اور اپنی میلی چکیلی چندریوں میں
سوکھے ہوئے گوبر کے ٹکڑے جمع کرنے والی لڑکیاں بھی اپنا کام چھوڑ کر
گلہریوں کی طرح میری طرف دیکھنے لگتی تھیں"۔

[پنجاب کا البیلا]

پنجاب کی سرزمین اور اس کے موسموں سے جڑا ہوا یہ فطری لب و لہجہ ہی بلونت سنگھ کو
اس معاشرے سے تعلق رکھنے والے تمام افسانہ نگاروں میں ایک منفرد اور ممتاز مقام عطا کرتا ہے

ان کے کردار شاہین صفت ہیں۔ انھیں اپنی آن اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ان کے
یہاں جمال اور جلال ایک دوسرے کے معاون ہیں۔ یہ رویہ پنجاب کی ایک ناگزیر تہذیبی قدر کے
طور پر سامنے آتا ہے اور قاری کو مسحور کر دیتا ہے۔ اس ضمن میں بلونت سنگھ کے صرف ایک
افسانے کا حوالہ کافی ہے اور وہ ہے "جگا"۔ ان کا ناول "رات چور اور چاند" بھی اسی حقیقت کی
تفسیر ہے۔

بلونت سنگھ اکثر کہا کرتے تھے۔ "میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بہت اچھی کہانی لکھوں۔ ابھی
میں نے اپنی سب سے اچھی کہانی لکھی ہی نہیں۔ ابھی تو بہت سے زندہ کردار پیاسی آنکھوں سے
میری جانب دیکھ رہے ہیں۔ میں نے انھیں چھوا ہی نہیں"۔ اس سلسلے میں وہ اکثر ایک قصہ سنایا
کرتے تھے۔

قصہ یہ ہے کہ ....

ایک بار وہ اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ ریسٹوران میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اتنے میں ان
لوگوں نے دیکھا کہ ایک مخنی سا شخص سر پہ گٹھری ہاتھ میں لاٹھی لیے چلا آ رہا ہے۔ اس کے پیچھے
گھونگھٹ نکالے قدرے بھاری بھرکم ایک لڑکی بھی آ رہی ہے۔ اس نے پایل پہن رکھی ہے چلتی
ہے تو پایل چھم چھم بولتی ہے۔ وہ دونوں سر جھکائے چلے جا رہے تھے کہ سردار جی کو شرارت سوجھی
انھوں نے ہوٹل میں بیٹھے بیٹھے ہانک لگائی "اوئے پاپے نام تو بتاتے جانا"۔ بس ان کا یہ کہنا تھا کہ
نوجوان رکا۔ اس نے بغور ان سب کا جائزہ لیا۔ زبان سے کسی نے کچھ نہیں کہا۔ بیوی کو ایک پیڑ

کی چھاؤں میں کھڑا کیا جوتے اتارے صافہ کھولا خاموشی سے میدان میں اترا اور لاٹھی چلانا شروع کردی ۔ وہ اس پھرتی کے ساتھ لاٹھی چلا رہا تھا گویا فضا میں بجلی سی چمکتی تھی اور لاٹھی کی سائیں سائیں تھی ---------- تقریباً آدھے گھنٹے اس نے اسی برق رفتاری کے ساتھ لاٹھی چلائی ۔ دیکھنے والوں کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے ۔ آنکھیں خوف اور حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں ۔ کافی دیر لاٹھی چلانے کے بعد وہ سکون سے کھڑا ہو گیا ۔ بڑے فاتحانہ انداز سے اس نے ان لوگوں کی طرف دیکھا اور بہت اطمینان سے پوچھا" ہے کوئی نام پوچھنے والا " ۔ اس کے بعد اس نے جوتے پہنے سامان اٹھایا اور خراماں اپنی منزل کی جانب روانہ ہو گیا ۔

یہ واقعہ سناتے وقت بلونت سنگھ کھو سے جاتے تھے ۔ محسوس یہ ہوتا کہ جیسے پورا واقعہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہوں ۔ ایسے ہی جیوٹ والے کردار بلونت سنگھ کے کردار ہیں ۔ بلونت سنگھ نے ان کرداروں کو زندگی کی بھیڑ سے ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالا ہے ۔

وہ بے حد تیز لکھتے تھے ۔ لکھنے کے دوران کبھی بھی کہانی کو دوبارہ نہیں پڑھتے تھے ۔ یہاں تک کہ اکثر مسودہ نظر ثانی کے بغیر ہی پریس کو چلا جاتا تھا ۔

" کافکا " انھیں بے حد پسند تھا ۔ فارسی سے اچھی واقفیت رکھتے تھے ۔ وارث شاہ کے دلدادہ تھے ۔

" دنڈ " ان کی پہلی کہانی تھی ۔ " رات چور اور چاند " ان کا شاہکار ناول ہے ۔ دوا کال گڑھ اور کالے کوس ہندی میں شائع ہوا ۔ ان کے ایک دیرینہ رفیق جناب ضیاء الاسلام نے مجھے بتایا کہ " راوی کے پار " راکا کی منزل " عورت اور آبشار " آگ کی کلیاں اور باسی پھول بھی ان کی مطبوعہ کتابوں میں شامل ہیں ۔ لیکن ابھی یہ مسئلہ تحقیق طلب ہے کہ یہ تمام تخلیقات بلونت سنگھ کی ہی ہیں یا بلونت سنگھ کی شہرت اور مقبولیت کو دیکھتے ہوئے ان کے نام سے شائع کر دی گئی ہیں "پہلا پتھر " " سنہرا دیس " اور " ایک معمولی لڑکی " بھی بلونت سنگھ کی مشہور تصانیف ہیں ۔

ان کا ایک ضخیم ناول صاحب عالم ہندی میں شائع ہوا ہے ۔ اس ناول کو وہ اردو میں بھی شائع کرنا چاہتے تھے ۔ بیماری نے انھیں مہلت نہیں دی ۔ ذیابطیس کے مریض تھے ۔ آخری ایام میں آنکھوں سے دھندلا دکھائی دینے لگا تھا ۔ اب اس ناول کو غالباً ان کی بیگم اردو میں منتقل کر رہی ہیں ۔

بلونت سنگھ نے اپنے انتقال سے کوئی پندرہ سال قبل اردو میں لکھنا تقریباً ترک کر دیا تھا ۔ شاید اسی لیے اردو والوں نے ان کی جانب وہ توجہ نہیں دی جس کا مطالبہ ان کی تحریریں ہم سے کرتی ہیں ۔ افسانے کی تاریخوں میں ان کا ذکر تو ہوتا ہے لیکن بہت ناکافی طور پر حالانکہ بلونت

سنگھ کا فنی کارنامہ اور اردو فکشن پر اسی کارنامے کے اثرات کا جائزہ لیے بغیر ہم اردو افسانے کی روایت کو پوری طرح سمجھ ہی نہیں سکتے۔

بلونت سنگھ کا فن ہندستانی ذہن کے طرزِ احساس کی نوعیتوں کو بھی اس طرح اجاگر کرتا ہے کہ اس کے توسط سے ہم برصغیر کے ایک مخصوص علاقے کی معاشرتی اور تہذیبی و اجتماعی اقدار کو بھی پہچان سکتے ہیں۔

(بشکریہ: کتاب نما۔ دلی)

بلونت سنگھ کے لیے طاقت اور تشدد کے مظاہر اپنا ایک فطری اور پُراسرار حسن رکھتے ہیں۔ اور اس حسن کو انھوں نے افسانوں میں اس طرح پیش کیا ہے کہ ہم مسحور لیکن سہمی ہوئی نظروں سے اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ "جگا" اور "تین چور" میں تحیر خیزی کا آرٹ اپنے عروج پر پہنچا ہوا ہے۔ اور واقعہ نگاری اتنی محزرس، مصورانہ اور حیرت خیز ہے کہ ہم دھڑکتے ہوئے دل سے ایک عجیب محویت کے عالم میں اُن کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ حیرت کا یہ عنصر محض خارجی نہیں ہے نفسیاتی بھی ہے۔ مثلاً "جگا" میں بدصورت خوفناک جگا ڈاکو جب بھی نازک اندام خوب صورت دوشیزہ گرنام کے قریب ہوتا ہے تو کچھ نہیں، لیکن اس قربت میں جگا کی شوریدہ سر محبت اور گرنام کے اکھڑپن سے جو نفسیاتی صورت حال پیدا ہوتی ہے، اس میں تحیر اور خوف کی ایسی ملی جلی کیفیت ہے کہ دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ کہنے کا مطلب یہ کہ ان افسانوں میں حیرت کا عنصر محض خارجی نہیں ہے بلکہ داخلی اور نفسیاتی بھی ہے۔ "تین چور" کے کردار بہت طاقتور لیکن اکھڑ، اُجڈ اور ناکارہ ہیں۔ "پنجاب کا البیلا" کا راوی اسکول کا ایک دھان پان طالب علم ہے، جسے ایک دیوقامت ڈاکو اپنی اونٹنی پر بٹھا کر رات کی خاموشیوں میں مختلف جگہوں پر گھماتا ہے۔ لڑکے کا تجسس، خوف اور حیرت اس کے بیانیہ کو رزمیہ رفعت کی بجائے ظرافت، ارضیت اور حقیقت کے قریب کرتا ہے۔ تکنیک، طریقۂ کار اور اندازِ بیان ان افسانوں کی رومانی اور مہماتی فضاؤں کو الف لیلوی داستانوں کا ایک ہلکا سا لمس دے کر پنجاب کی کہانیوں کی حقیقت پسندانہ سطح پر لے آئے ہیں۔ (وارث علوی۔ اقتباس بشکریہ "آجکل" دلّی۔ جنوری ۱۹۹۵ء)

عابد حسن منٹو

ایک افسانہ نگار ـــــ بلونت سنگھ

اردو افسانہ عام طور سے درمیانہ طبقے کی زندگی کے گرد گھومتا ہے۔ ہماری سماجی زندگی کی بنیاد دیہات پر ہے۔ اگر ہمارا کوئی کلچر کبھی تشکیل پاسکا تو وہ پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد کی دیہی ثقافتوں سے آزاد ہو کر لاہور اور کراچی کی شاہراہوں پر ہر دم بدلتے بدیسی کلچر کی بنیادوں پر نہیں ہوگا۔ ہمارے ہاں ایک کلچر تشکیل پائے یا ایک سے زیادہ اس کی بنیاد ان کروڑوں انسانوں کی زندگیوں پر ہی ہوگی جو شہروں میں نہیں رہتے اور اسی اعتبار سے ہمارے سماج کا اہم ترین حصہ یہ دیہات ہیں۔ اردو افسانہ نگار شہری زندگی سے باہر بہت ہی کم نکلا ہے۔

اس کی وجوہ سے مجھے یہاں بحث نہیں ہے۔ البتہ اس کے اثرات کا اظہار یہاں ضروری ہے۔ اس کا اثر ہمارے ادب کو محدود کرنے کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ہمارے ادب کا مطالعہ ہندوپاک کا نقشہ ذہن میں پیش نہیں کرتا، وہ صرف بمبئی، دہلی، لاہور اور کراچی کی تصویریں دکھاتا ہے اور بمبئی اور کراچی اور دنیا کے دوسرے ممالک کے شہروں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہے غرضیکہ سماجی زندگی کے پہلو سے جدید اردو افسانہ وسیع تر ہونے کی بجائے محدود ہو کر رہ گیا ہے۔

موضوعات کے اعتبار سے اور کرداروں کی تخلیق کے اعتبار سے بلونت سنگھ اردو کے ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جن کا کینوس انتہائی وسیع ہے۔ پنجاب کے دیہات، پنجاب کے شہر، کسان، کلرک، ہندو، سکھ، مسلمان، درمیانہ اور نچلا درمیانہ طبقہ، طوائف، چور، آزادی، فسادات، بھوک، بیکاری، رومان، یہ سب باتیں ان کے افسانوں میں موجود ہیں۔ اس کے حدود پنجاب کی سرحدوں نے متعین کیے ہیں۔

پنجاب کا شہر ہو یا دیہات اس کا ایک خاص لب و لہجہ ایک مخصوص ٹھیٹ پن ہے اور یہ لب و لہجہ اور ٹھیٹ پن بلونت سنگھ کی تمام اچھی کہانیوں کی خصوصیت ہے۔

پنجاب کی زندگی کی بنیاد اس کے دیہات ہیں اور دیہات کی جاگیردارانہ معیشت میں زراعت اور اس کے پسماندہ طریقوں کی بدولت ایک خاص قسم کا آہستہ پن، ایک عجیب سا ٹھہراؤ اور آہستہ پن اور ٹھہراؤ کے ساتھ بے باکی، دلیری اور جرات، (جو اپنے ہاتھ سے محنت کرنے اور منہ اندھیرے کھلی فضاؤں میں نکل آنے اور سنسان اندھیروں میں سفر کرنے اور اپنی حفاظت خود کرنے کا لازمی نتیجہ ہے)۔

پنجابی کسان کی زندگی کا خاصہ ہے۔ دلیری، جب کمزور معیشت میں پرورش پائے تو جرائم بھی جنم لیتے ہیں، چنانچہ پنجاب کا دیہات جرائم کے اعتبار سے بھی کم مشہور نہیں ہے۔

بلونت سنگھ کے ان افسانوں میں جو دیہات سے تعلق رکھتے ہیں، یہ آہستہ پن اور یہ ٹھہراؤ بھی موجود ہے اور بہادری سے منسلکہ جرائم کی داستانیں بھی جگہ پاتی ہیں۔

تین چور، کالی تیتری، بابا مہنگا سنگھ، گر نتھی، پنجاب کی زرعی معیشت کا تعلق یا مسلمانوں کے ساتھ تھا یا سکھوں کے ساتھ، اور بلونت سنگھ کو اپنے لوگوں سے جو گہری واقفیت ہے، اس کے مدنظر شاید سکھ کرداروں کی تخلیق ہی اس کے لیے آسان اور مناسب تھی۔

ان میں سے ہر ایک کہانی ہمیں بلونت سنگھ کو پہچاننے کی بجائے پنجاب کو جاننے میں مدد دیتی ہے، ہر کردار، ہر موقعہ ایسا ہے جو اپنے حقیقی اور فطری ہونے کا یقین دلاتا ہے۔

فن کار کی کامیابی کی سب سے بڑی دلیل یہی ہے کہ وہ تخلیق کے افسانوی تخلیق ہونے کا احساس مٹادے۔

"تین چور" پنجاب کے دیہات کے نوجوانوں کے ADVENTURES کی کہانی ہے تینوں چور، پیشے کے اعتبار سے چور سہی، لیکن اپنی سوچ اور خیالات کے اعتبار سے چور نہیں ہیں۔ بنیادی طور پر وہ بہادر ہیں اور یہی بہادری انھیں ڈاکے ڈالنے کی طرف بھی لے جاتی ہے۔ ڈاکہ زنی اور چوری کے باوجود تینوں چوروں کی اپنی اقدار ہیں اور ان میں سب سے اہم قدر و قیمت کا احساس ہے۔ وہ کسی ایسے شخص پر ہاتھ صاف کرنا پسند نہیں کرتے، جو خود بہادری اور دلیری کا مجسمہ ہے۔

اس کہانی میں بنیادی انسانی اقدار کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔ انسان کمتر پیشے کے باوجود اچھے اور برے کی تمیز کے لیے کچھ نہ کچھ اصول، کوئی نہ کوئی قدر تخلیق کرلیتا ہے۔

اردو کے ان افسانہ نگاروں میں جنھوں نے پنجاب کے دیہات کو کہانیوں کا موضوع بنایا ہے، بلونت سنگھ کے علاوہ احمد ندیم قاسمی کا نام بڑا اہم رہا ہے۔

قاسمی اور بلونت سنگھ کی کہانیوں کے پنجاب میں ایک بنیادی فرق ہے۔ یہ فرق قاسمی کی رومانیت اور بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کا پیدا کردہ ہے۔ قاسمی کو پنجاب کے دیہات میں غربت اور افلاس کا احساس ہے، لیکن وہ اپنی شاعرانہ طبیعت کی وجہ سے کھیتوں، میدانوں رہٹوں البیلے جوانوں اور الہڑ دوشیزاؤں کی کہانیوں کے خالق کی حیثیت سے یاد رہے گا۔

بلونت سنگھ پنجاب کے رومان سے بھی واقف ہے لیکن وہ اس رومان کی فضا کو اپنی کہانیوں پر چھا جانے کی اجازت نہیں دیتا کہ اس سے اس کے کرداروں کی حقیقی تصویریں نہیں

ابھر سکتیں، وہ حسن کا اظہار تو کرتا ہے لیکن حقیقت نگار کی نظر سے رومانوی نگاہ سے نہیں۔
پنجاب کی دیہاتی دوشیزہ میں جتنی ملائمت ہے اتنا ہی کھردرا پن یہاں کے جوان کی مردانگی میں ہے۔

بلونت سنگھ اس کھردرے پن کی کہانیاں سناتا ہے، جبکہ قاسمی اس ملائمت کی۔
دیہات کی کہانیوں کی تعداد بلونت سنگھ کے افسانوں میں دس بارہ سے زیادہ نہیں ہے لیکن اس کے باوجود ناقدین نے عام طور پر یہی کہا ہے کہ بلونت سنگھ محض پنجاب کے دیہات کا ترجمان ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بلونت سنگھ محض دیہات کا نہیں بلکہ پورے پنجاب کا فسانہ خواں ہے۔ اس کے کرداروں اور فضا کا تعلق پنجاب سے ہے چاہے دیہات کا پس منظر ہو یا شہر کا۔
اور جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا پنجاب کا ایک خاص مزاج ہے، ایک خاص لب و لہجہ اور انداز ہے۔ یہ لب و لہجہ اور انداز بلونت سنگھ کے افسانوں کی جان ہے اور اسی سے یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے کہ وہ محض دیہات کا ترجمان ہے۔ کیونکہ عام طور پر پنجابیت محض دیہات سے مختص کی گئی ہے۔ شہر کی کہانیوں میں پنجابی ٹھیٹ پن کا اظہار یوں تو کئی افسانوں میں ہوتا ہے لیکن یہاں میں صرف "پہلا پتھر" سے ہی دو ایک اقتباسات پیش کروں گا۔

" بلے بلے " باجے کو اپنے کان میں آواز سنائی دی۔ دیکھا بونگا بھی اسے کارخانے میں نہ پاکر وہاں آن پہنچا تھا۔ اور پھر رال ٹپکاتے ہوئے بولا۔ " جار " کھکی کی کمر تو دیکھو۔ کیسی پتلی کیسی لچکدار ہے۔ آنکھ نہیں ٹکتی اس پر ...."

اوے میں جٹی پنجاب دی
میرا ریشم ہر کالک
معاً باجے نو بونگے کو کہنی کا ٹھوکا دیتے ہوئے کہا۔
" دیکھ اوے جل ککڑ"

" سردار جی کے لڑکے بھی " چل کبڈی تارا۔ سلطان بیگ مارا " ۔ کہتے ہوئے ساتھ چلے آرہے تھے اور ان کے پیچھے وہ نوجوان تھا جو وہاں کوئی امتحان دینے کے لیے نیا نیا آیا تھا۔ اسے دیکھتے ہی باجے نے پوچھا۔ " اوے ماں دیا مترا ڑا یہہ کون ہے " ۔
" اوئے جیہہ بھی اپنا منڈا ہے۔ نواں دا کھل ہویا اے عسک دے مدرسے دے بچ " ۔
" اچھا اچھا۔ ایہہ تاں پرسوں ہی آیا ہے " ۔

"آ ہو جی لونڈوں کی باتیں چھوڑو۔ اب ناریوں کی باتیں کرو"۔

"پہلا پتھر" کا ذکر ہوا، تو بلونت سنگھ کی کہانیوں کے ایک اور موضوع کا تذکرہ بھی یہیں ہو جانا چاہیے۔ یہ انسانی ہمدردی یا انسان دوستی کا موضوع ہے اردو کے اکثر افسانہ نگاروں نے یہ موضوع اپنایا ہے اور میں نے عرض کیا تھا کہ یہ موضوع بھی ترقی پسند تحریک کے لائے ہوئے شعور کا ہی نتیجہ ہے۔

لیکن انسان دوستی کا تصور بڑا مبہم سا معاملہ ہے۔ یہ شعور کی ترقی بھی ہے اور اس کی معذوری بھی ظاہر کرتا ہے۔ ترقی تو ان معنوں میں ہے کہ فن کار بنیادی انسانی اقدار کا شعور رکھتا ہے، لیکن معذوری ان معنوں میں ہے کہ وہ انسانی جذبات کی اس اٹھان اور انسانی زندگی کی بہتری کی اس جدوجہد سے وابستہ نہیں نظر آتا جو انفرادی مثالوں سے بڑھ کر وسیع تر سماجی زندگی کی جدوجہد بن کر سامنے آتے ہیں، وہ طبقاتی کشمکش میں طبقاتی نفرت اور محبت کے جذبات اور ان سے پیدا ہونے والی عالمگیر انسانیت، اخوت اور ہمدردی کی اقدار کی جگہ ISOLATED کوششوں تک اپنی نظر کو محدود کر لیتا ہے اردو کا کوئی بھی افسانہ نگار ابھی تک اس وسیع تر جدوجہد کی عکاسی نہیں کر سکا جو انسانی اقدار کی عظمت قائم کرنے کے لئے لڑی جا رہی ہے۔

"پہلا پتھر" میں ہر کردار ابھر کر یوں سامنے آگیا ہے۔ گویا قاری خود باجے سنگھ کے "شاہی اصطبل" کے برابر کسی REAR WINDOW میں سے جھانک کر سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے۔

اور باجے سنگھ کا کردار تو بے مثال ہے۔ شہری نچلے طبقے کی سماجی زندگی کا اس سے بہتر نمائندہ آسانی سے تخلیق نہیں ہو سکتا۔ نچلے طبقہ کی معاشی اور اخلاقی زندگی کے تضادات کا نتیجہ اس میں ایک خاص قسم کی بے حجابی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اس کیفیت کو انگریزی میں INHIBITIONS کی غیر موجودگی کہتے ہیں۔ یہ بے حجابی اور لڑکیوں سے آزادانہ چھیڑ چھاڑ کے باوجود بجے سنگھ انسانی دل رکھتا ہے اور اندھی سانولی جب اپنے محبوب کے خیالی وعدوں کا تذکرہ باجے سنگھ اور اس کے ساتھیوں سے کرتی ہے تو:

باجے نے گھوم کر اپنے ساتھیوں کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا، سب چپ تھے، وہ بھی چپ رہ گیا۔

سب کو خاموش پا کر سانولی نے اپنا سوال دہرایا، "آپ سب کو یقین نہیں آتا"؟

باجے کی آنکھوں کے گوشے پر آب ہو گئے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر سانولی کے سر پر رکھ دیا

اور پھر دھیمی آواز میں بولا ۔ "ہمیں اکین ہے اور دیکھو تمھیں بے بخت گھر سے باہر نہیں رہنا چاہیے اور پھر سردی پڑنے لگی ہے کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ" ۔

سانولی نے اس کی مضبوط کلائی کو اپنی کمزور انگلیوں سے چھو کر پوچھا ۔

" پر باجے چاچا، آپ سب لوگ بے وقت کہاں جا رہے ہیں ؟"

"ہم" ۔ باجے نے پدرانہ پیار سے لرزتے ہوئے اس کے گال کو چھوتے ہوئے جواب دیا

" سانولی بیٹی! ہم اس خوشی میں برفی کھانے جا رہے ہیں" ۔

میں نے بار بار کہا ہے کہ بلونت سنگھ حقیقت نگار ہے ۔ لیکن اردو افسانہ نگاری کے ضمن میں حقیقت نگاری کی اصطلاح بھی مختلف طریقوں سے استعمال کی گئی ہے ۔ کرشن چندر بھی حقیقت نگار ہے اور منٹو بھی ۔ کرشن کی حقیقت نگاری محض موضوع کے ساتھ تعلق رکھتی ہے ، ورنہ انداز تحریر کے اعتبار سے وہ ہمیشہ ہی رومانوی رہا ہے ۔ اس کے برعکس منٹو اپنے موضوع اور اسلوب نگارش دونوں کے اعتبار سے حقیقت نگار ہے ۔ بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کرشن چندر کی حقیقت پرستی نہیں بلکہ منٹو کی حقیقت نگاری سے قریب تر ہے ۔ بلونت سنگھ براہ راست بات کہنے کا عادی ہے ۔ اس کے اظہار میں وہی بے باکی اور وہی بے رحمی کا سا انداز پایا جاتا ہے جو سعادت حسن کے اسلوب کی خوبی سمجھا گیا ہے ۔ دونوں فن کاروں کا بنیادی فرق ان کے افسانوں کے مواد کی وجہ سے ہے ۔ سعادت حسن منٹو کے افسانوں کا مواد عجیب و غریب کرداروں کے جنسی معاملات سے تعلق رکھتا ہے جبکہ بلونت سنگھ اپنی کہانیوں کا مواد خالص جنسی مسائل کے بجائے ان مسائل کے سماجی اثرات سے حاصل کرتا ہے ۔ خود جنسی معاملات کے اظہار میں بھی بلونت سنگھ جنس ، سے زیادہ معاملے ، کو اہمیت دیتا ہے اور اس لیے منٹو سے مختلف ہو جاتا ہے ۔ لیکن چونکہ طریق تحریر میں وہ منٹو سے حد درجہ قریب ہے اس لیے بعض ایسی تحریروں میں وہ بالکل ہی منٹو معلوم ہوتا ہے جن میں موضوع بھی منٹو والا ہی ہو ۔ "پھلا پتھر" کے بہت سے حصے اس کی بڑی اچھی مثال پیش کرتے ہیں ۔

رادھر یہ ہڑ بڑا کر اٹھا ، ادھر بڑی سردارنی حسب معمول بھوری بھینس کی طرح کدو کدو بھر چھاتیاں تھلتھلاتی ، سینہ زوریاں دکھلاتی آگ جلانے کے لیے برادہ لینے کے لیے چھاج ہاتھ میں پکڑے اس جانب بڑھی" ۔

" بڑی سردارنی کے جسم کا ہر عضو اپنے نقطہ عروج تک پہنچ چکا تھا ، یعنی جو چیز جتنی موٹی جتنی بھدی ، جتنی کشادہ ہو سکتی تھی ہو چکی تھی ۔ چلتی تو یوں معلوم پڑتا ۔ جیسے تنور ڈھانپنے والے پاپڑ کو پانو لگ گئے ہوں" ۔

"ایسی ڈبل ڈوز سردارنی بھی سردار کے لیے ناکافی ثابت ہوئی ...... اسی طرح" تعمیر" کا سارا کا سارا انداز سعادت حسن کی کہانیوں کی سا ہے۔

بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کی چند خوبصورت مثالوں میں اس کی کہانیاں " سنہرادیس" اور " کٹھن ڈگریا" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

" کٹھن ڈگریا" تو بعض جگہ منٹو سے قریب بھی ہو گئی ہے، لیکن " سنہرادیس" خالصاً بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کی نمائندہ ہے۔

تھوپ سنگھ ریاست بٹری کے ایک غیر معروف گاؤں میں پیدا ہوا۔ بچپن کے بعد لڑکپن بھی اس جگہ گزر رہا تھا۔

جب اس کی عمر چودہ برس کی ہوی تو اس کی شادی کر دی گئی۔ جب اس کی دلھن گھر میں آئی تو وہ اسے دیکھ کر حیران سارہ گیا۔ وہ دور ہی دور سے بیوی کو دیکھ لیا کرتا۔ اسے اس بات کا کچھ علم نہیں تھا کہ بیوی کس کام آتی ہے۔

سرمئی رنگ اور تیکھے نقوش والی بیوی سر نیہوڑائے زمین کی طرف دیکھتی رہتی تھی اور تھوپ سنگھ اپنی ماں کی آڑ میں گھور گھور کر اس کی طرف دیکھا کرتا ......"

"...... لیکن اس وقت جب اس نے اپنی بیوی کی طرف دیکھا تو زمین کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ وہ اسے بہت مرغوب نظر آئی تھی اس سے تحکمانہ انداز میں پوچھا" کیوں آئی ہو"۔

بیوی نے انچل سے روٹیاں اور دال نکال کر اس کے آگے رکھ دی اور پھر اس کی منت کرنے لگی کہ وہ روٹی کھالے۔ وہ بڑی مشکل سے رضامند ہوا۔ نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے اس نے بیوی کو پانی لانے کے لیے کہا۔

وہ فوراً اٹھی اور کٹورا لے کر بڑی پھرتی سے ندی کی طرف چل دی۔ اس دن اسے بیوی کی اہمیت کا کچھ احساس ہوا ....."

حقیقت نگاری اور پنجابی کلچر جب دونوں اکٹھے ہو جائیں تو زبان پر بھی گہرا اثر ہونا ضروری ہے۔ بلونت سنگھ کے افسانوں میں پنجابی الفاظ و محاورات کا آزادانہ استعمال کیا گیا ہے۔ یہ الفاظ پورے افسانے میں اس طرح پیوست ہو کر اور رچ بس کر آتے ہیں کہ ان کے استعمال سے افسانے کے بیان کو کسی قسم کا نقصان پہنچنے کی جگہ تقویت پہنچتی ہے۔

بلونت سنگھ، سعادت حسن منٹو کی طرح نئے نئے الفاظ تراشنے میں بھی بڑی مہارت رکھتا

ہے مثلاً "ڈبل ڈوز سردارنی"، "دور مار توپ" وغیرہ۔

حقیقت نگاری اور پنجابی ٹھیٹ پن کو اپنے اسلوبِ نگارش کی بنیاد بنانے کی وجہ سے بلونت اردو افسانے کی ایک کمزوری سے آزاد ہو گیا ہے۔ وہ کمزوری نثر میں شاعری کرنے کے طریق کی ہے۔ نثر خود اپنی خوبصورتی کے باعث دلچسپ اور حسین معلوم ہونی چاہیے۔ نہ کہ اس وجہ سے کہ وہ شاعری سے قریب تر ہو گئی ہے اور اردو میں جدید افسانہ نگاروں میں سعادت حسن منٹو اس اعتبار سے سب سے بڑا افسانہ نگار ہے اور اب میں یہ کہتا ہوں منٹو کے بعد غیر شاعرانہ حسین نثر لکھنے والا افسانہ نگار بلونت سنگھ ہی ہے جس کے افسانے کی خوبصورتی اس کے طرزِ تحریر کے باعث ہے، اس کے اس اندازِ نگارش کے باعث جو شاعری سے دور کا واسطہ نہیں رکھتا۔

اگرچہ بلونت سنگھ کے اسلوب کی بنیادی خوبی وہی ہے جو میں کہہ چکا ہوں، لیکن اس کے باوجود یہاں یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ جب کبھی بلونت سنگھ نے خالص رومانوی کہانی لکھی ہے، وہ اپنے اسلوب میں بھی خالصتاً رومانوی ہو گیا ہے اور اس انداز میں بھی وہ خاصا کامیاب رہا ہے، اس سلسلے میں اس کی کہانیوں "ایک معمولی لڑکی"، "شہناز" اور "چکوری" پیش کی جا سکتی ہیں۔ (لیکن چونکہ اس کی نمائندہ کہانیوں کے مقابلے میں مجھے ان رومانوی کہانیوں کی اہمیت بہت کم معلوم ہوتی ہے، اس لیے میں اس پہلو کا اظہار کرنے میں کسی قسم کے جوش کا اظہار نہیں کر رہا ہوں)۔

بلونت سنگھ کی کہانیوں کے کردار عام زندگی کے کردار ہونے کے باوجود اپنی خصوصیت رکھتے ہیں اور کبھی "بابا مہنگا" اور کبھی "بابو نانک لعل جی" اور "نہال چند" خیال کے پردوں میں سے رہ رہ کر ابھرتے ہیں، ان کرداروں کی خصوصیات بلونت سنگھ کی چابک دستانہ کردار نگاری کی مرہونِ منت ہیں۔

ان میں سے ہر ایک کردار خود اپنے عمل سے اپنا تعارف کرواتا ہے نہ کہ فن کار کے بیان کے ذریعے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زندہ کردار بن گیا ہے۔

طویل مضمون سے چند اقتباسات۔ بشکریہ "ادبِ لطیف" سالنامہ ۶۱۔

انور سدید

بلونت سنگھ ۔ موت کے بعد

تعزیت نامہ

مجھے حیرت اس بات پر ہے کہ افسانہ نگار بلونت سنگھ کی موت پر ادب کے سمندر میں ایک ہلکی سی لہر بھی پیدا نہیں ہوئی حالانکہ وہ اردو افسانے کا اہم نام تھا، اس نے دلوں کو ہلادینے اور آنکھوں پر آنسوؤں کو چمکا دینے والی کہانیاں لکھی تھیں اور ایک زمانے میں اس کی پنجاب نگاری کا ڈنکا چار دانگ عالم میں گونج رہا تھا ۔ لیکن ادبی دنیا کے لیے یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ افسانے کی کہکشاں سے ایک تابندہ ستارہ ٹوٹ گیا اور کسی نے اس کا ذکر تک نہیں کیا ۔

بلونت سنگھ شہرت پسند لوگوں سے مختلف قسم کا ادیب تھا ۔ اسے ادب کے کسی تکیے نے شہرت کی بھنگ پلانے کی کوشش نہیں کی، اس کی شہرت اس کے افسانے کی طرح بے ساختہ اور خود رو تھی، اس کے افسانے "ادبی دنیا" میں چھپنے شروع ہوئے تو سب سے پہلے مولانا صلاح الدین احمد نے اہل ادب کو اطلاع دی کہ افسانے کے افق پر ایک شہاب ثاقب طلوع ہو گیا ہے ۔ اس کا افسانہ "جگا" اتنا مقبول ہوا کہ اس کی اشاعت پر ہی اسے نامور افسانہ نگاروں کی صف میں جگہ دے دی گئی ۔

مولانا صلاح الدین احمد نے اس کے بارے میں یوں اظہار خیال کیا تھا ۔

"پنجاب نگار بلونت سنگھ اپنے مشاہدے میں جس حد تک زیرک اور اس کی ترجمانی میں جس حد تک مخلص ہے اس کا احساس کچھ ان ہی لوگوں کو ہو سکتا ہے جو فن کی صحیح اقدار سے واقف ہیں ۔ فن زندگی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے اور خود زندگی کو جنم دیتا ہے اور اس کے سوا اور کچھ نہیں ۔ مگر یہ راز بہت کم لوگوں کو معلوم ہے" ۔

عابد حسن منٹو جنھوں نے بلونت سنگھ کے فن پر پہلا بھرپور مقالہ ۱۹۶۱ء میں لکھا تھا بلونت سنگھ کی دیہات نگاری کا موازنہ محترم احمد ندیم قاسمی کی دیہات نگاری سے کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

"قاسمی اور بلونت سنگھ کی کہانیوں کے پنجاب میں ایک بنیادی فرق ہے ۔ یہ فرق قاسمی کی رومانیت اور بلونت سنگھ کی حقیقت نگاری کا پیدا کردہ ہے ۔ قاسمی کو پنجاب کے دیہات میں

غربت اور افلاس کا احساس ہے لیکن وہ اپنی شاعرانہ طبیعت کی وجہ سے کھیتوں، میدانوں، رہٹوں البیلے جوانوں اور الھڑ دوشیزاؤں کی کہانیوں کی فضا پر چھاجانے کی اجازت نہیں دیتا کہ اس سے کرداروں کی حقیقی تصویریں نہیں ابھر سکتیں"۔ (نقطہ نظر۔ ص ۲۱۶)

بلونت سنگھ کے سکور کارڈ پر بہت سے لازوال افسانوں کے نام درج ہیں، اس نے "پہلا پتھر"، "پنجاب کا البیلا"، "اعتراف"، "کٹھن ڈگریا"، "بابو نانک لعل جی"، "لمحے"، "دیپلے ۳۸ لمحے اور کالے کوس جیسے افسانے لکھے جو دماغ پر زور ڈالے بغیر مجھے یاد آرہے ہیں۔ بلونت سنگھ نے خاصے بھیانک اور حیوانی کرداروں کو افسانوں میں زندگی دی لیکن ان کے باطن میں فطری انسان کا دل دھڑک رہا تھا۔ بلونت سنگھ نے ان کرداروں کے دل میں اٹھنے والے جزر و مد کی ہر لہر کو محسوس کیا تھا اور افسانے میں ان کا جاندار نقش ابھارا تھا۔ چنانچہ اب میں اردو افسانے کے فراموش نگار قاری سے دریافت کرتا ہوں کہ کیا موت کے بعد بلونت سنگھ ہماری رگ جاں کے اور زیادہ قریب نہیں آگیا؟۔

(بشکریہ: کتاب نماذلی)

OOOO

فارقلیط

ایک کالم۔۔۔افسانہ نگار بلونت سنگھ کے لئے

کتنے افسوس کی بات ہے کہ افسانہ نگار بلونت سنگھ کی موت پر اردو دنیا کی کسی ایک آنکھ سے بھی تاحال ایک آنسو نہیں ٹپکا۔ وجہ یہ نہیں کہ وہ کمزور افسانہ نگار تھا یا اس کا حلقۂ اثر وسیع نہیں تھا بلکہ وجہ یہ ہے کہ بلونت سنگھ ادب کی غیر وابستہ تحریک کا ممبر تھا۔ اس کی اپنی کوئی پارٹی نہیں تھی، نہ وہ ترقی پسند تھا نہ حلقۂ ارباب ذوق کا رکن۔ اسے ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے پیشہ ور تعزیت خوانوں کا تعاون بھی حاصل نہیں تھا۔ اس لیے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس نے مرنے کے بعد بھی اپنی غیر جانبداری قائم رکھی اور کسی کو یہ زحمت نہیں دی کہ کوئی اس کے بارے میں ایک لفظ بھی کہے یا لکھے چنانچہ اس نے پیشہ ور تعزیت خوانوں کا یہ موقع بھی ضائع کر دیا کہ وہ بلونت سنگھ کے ذکر سے اپنا نام جگمگاتے اور اس کی تعزیت خوانی کے لیے ساڑھے تین سو روپے کا چیک لے کر گھر واپس آجاتے۔

اس سے یہ نہ سمجھیے کہ لاہور نے بلونت سنگھ کو بھلا دیا ہے۔ بلونت سنگھ کا نام تو گذشتہ ہفتے بھی لاہور میں گونجا۔ تقریب نقوش کے مدیر محمد طفیل کی یاد میں جمیلہ ہاشمی نے منعقد کی تھی اور مقرر تھے "دردِ لکشا" کے مصنف شیخ منظور الٰہی۔ شیخ صاحب نے اپنی مصفیٰ اور آبدار علی گڑھی اردو میں محمد طفیل سے اپنی یادوں کی زنجیر ہلائی تو انھیں یاد آیا کہ محمد طفیل کبھی الہ آباد جاتے تھے تو بلونت سنگھ کے ہوٹل میں ٹھہرتے تھے لیکن شیخ صاحب کو بھی شاید یہ علم نہیں تھا کہ بلونت سنگھ کا دیہانت ہو گیا ہے۔ اور اس کا ہوٹل بھی اب نہیں رہا۔ لیکن دوستو، المیہ یہ ہوا کہ بلونت سنگھ جس نے جگا، کالی، ترتی، تین چور، پہلا پتھر، کٹھن ڈگریا، بابو مانک لعل، دیمک اور اعتراف جیسے افسانے لکھے تھے اور جسے مولانا صلاح الدین احمد نے پنجاب نگار کا خطاب دیا تھا۔ لوگوں کے لوح دماغ سے کیوں مٹ گیا تھا۔ کیا اس کی وجوہ وہی ہیں جو ہم نے اوپر بیان کی ہیں؟ لیکن یہ کیا بات ہے کہ بلونت سنگھ کا نام آتے ہی مجھے اس کا ناول "رات چور اور چاند" یاد آرہا ہے مجھے یاد آرہا ہے کہ اس نے ایک افسانہ "ہندوستان ہمارا" لکھا تھا جس کا ہیرو انگریزی راج کے زمانے میں ریل میں سوار ہوتے وقت ایک مائی کی بے جا مداخلت پر برانگیختہ ہو جاتا ہے اور اسے

پیٹ دیتا ہے ۔ مجھے بلونت سنگھ کا کردار بدھ سنگھ بھی یاد آرہا ہے جو خود پاٹھ کرتا تھا اور دوسروں کو عبادت کی تلقین کرتا تھا لیکن آزادی کے وقت آبادیوں کے تبادلے ہوئے تو بھاگتے ہوئے مسلمانوں کی ہزاروں کی جایدادیں بدھ سنگھ نے کوڑیوں کے مول خرید لیں اور دولت مند شرنارتھیوں کے پاس لاکھوں میں بیچ دیں ۔ اور دیکھتے دیکھتے امیر بن گیا ۔ مجھے بلونت سنگھ کا وہ کردار بھی یاد آرہا ہے جس نے مذاہب کی تقسیم ختم کردی تھی اور جس نے کہا تھا کہ

" اب مذہب صرف دو رہ گئے ہیں ، ایک دوسروں کا خون چوسنے کا اور انھیں لوٹنے والوں کا مذہب اور دوسرا اپنا خون دینے والوں اور لوٹے جانے والوں کا مذہب ، اس کے علاوہ کوی مذہب نہیں ہے ۔ آپ سمجھے ! "

لیکن ہمیں سمجھنے کی ضرورت کیا ہے ۔ کیونکہ ہم خود دوسروں کا خون چوسنے اور دوسروں کو لوٹنے والے لوگوں میں شامل ہیں اور محروم لوگوں کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں چھیننے میں مصروف ہیں ۔

بلونت سنگھ ایک حقیقت نگار تھا اس نے کرشن چندر کی طرح حقیقت کو رومانی آنکھوں سے دیکھنے اور شبنم سے دھونے کی کوشش نہیں کی ۔ اس نے حقیقت کو احمد ندیم قاسمی کی طرح محدب شیشے سے گزار کر مبالغہ آمیز بنانے اور رقت انگیز کیفیت ابھارنے کی کوشش بھی نہیں کی ، اس کے کردار پنجاب کے حقیقی کردار ہیں ، اس کی کہانیاں پنجاب کے کھیتوں اور کھلیانوں سے لالہ خودرو کی طرح اگتی ہیں ۔ اس کے افسانوں کے سکھ جسمانی سطح پر محنت کے بل بوتے پر رہنے والے اور حواس خمسہ کو سرشار رکھنے والے سکھ ہیں ۔ ان کے دل میں حیوانیت جاگتی ہے تو وہ بابا بدھ سنگھ بن جاتے ہیں لیکن جب انسانیت کروٹ لیتی ہے تو سردار باجے سنگھ سامنے آتا ہے جو " پہلا پتھر " کا مرکزی کردار ہے اور جس نے اس افسانے کے ایک کردار " اندھی " لڑکی سانولی کے سر پر باپ کی طرح ہاتھ رکھا ہوا ہے کہ وہ کہیں اپنے محبوب کے خیالی وعدوں میں بھٹک نہ جائے ۔

دوستو ! بلونت سنگھ کو یاد کرتے ہوئے مجھے باجے سنگھ بے اختیار یاد آرہا ہے ۔ اور وہ اندھی لڑکی بھی یاد آرہی ہے ۔ سانولی باجے سنگھ کی ورک شاپ میں افسانۂ عشق بیان کرکے پوچھ رہی تھی ۔ " آپ سب کو اکین نہیں آتا ؟ "

باجے سنگھ کی آنکھوں کے گوشے پرآب ہوگئے اس نے ہاتھ بڑھاکر سانولی کے سر پر رکھ دیا اور پھر دھیمی آواز میں بولا " ہمیں اکین ہے اور دیکھو تم بے بکت گھر سے باہر نہ نکلا کرو ، اور پھر سردی پڑنے لگی ہے کہیں تم بیمار نہ ہو جاؤ ! " ۔

سانولی نے اس کی مضبوط کلائی کو اپنی کمزور انگلیوں سے چھوکر دیکھا۔
"پرباجے چاچا۔ آپ سب لوگ بے وقت کہاں جارہے ہیں؟"
"ہم"۔ باجے نے پدرانہ پیار سے لرزتے ہوئے اس کے گال چھوتے ہوئے جواب دیا۔
"سانولی! ہم اس خوشی میں برفی کھانے جارہے ہیں"۔
اور یہی وہ مقام ہے جہاں لاکر بلونت سنگھ نے ہمیں معاشرے کی سولی پر چڑھادیا ہے؟
کیا یہ موقعہ رونے کا ہے یا خوشی میں برفی کھانے کا؟
بلونت سنگھ کی خوبی بس یہی ہے کہ وہ آپ کی داخلی سوچ کو مہمیز لگادیتا ہے، آپ کو زندگی کے دوراہے پر لاکر کھڑا کردیتا ہے۔
مجھے اب بھی تعجب ہے کہ اتنے بڑے افسانہ نگار کے فن کی بازیافت کیوں نہیں ہوئی۔ جب کہ ناقابل ذکر افسانہ نگاروں کے قصیدے لکھنے میں نقادوں نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی، اردو افسانے کی ساری تنقید میں بلونت سنگھ کا نام کہیں نہیں آتا۔ ہاں سعادت حسین منٹو کا دم غنیمت ہے کہ اس نے ۱۹۶۱ء میں ادب لطیف کے سالنامے میں بلونت سنگھ کے فن پر ایک بھرپور مضمون لکھا عابد حسن منٹو اگر چہ ترقی پسند ادب سے پوری طرح وابستہ ہے لیکن وہ پیشہ ور نقاد نہیں اور اس کی ترقی پسندی اس تحریک کی معین کھائیوں میں سے گزرنے کے بجائے عقلی تقاضوں کی روشنی سے بھی منور ہے۔ چنانچہ اس نے بلونت سنگھ کی افسانہ نگاری کا تجزیہ غیر جانب دارانہ انداز میں کیا اور اس کے فن کے منفرد گوشے ابھار دیے۔ عجیب اتفاق ہے کہ عابد حسن منٹو کے مضامین کی کتاب نقطہ نظر جس میں یہ مضمون بھی شامل ہے عین اس وقت شائع ہوئی جب بلونت سنگھ دنیا سے رخصت ہورہا تھا۔ بلونت سنگھ پر دوسرا مضمون انور سدید نے اپنی کتاب "اردو افسانے میں دیہات کی "پیش کش" میں لکھا اور بلونت سنگھ کی دیہاتی افسانہ نگاری کے منفرد گوشے ابھار دیے۔ عابد حسن منٹو کا مقالہ بلونت سنگھ کے پورے فن کا جائزہ ہے۔ انور سدید نے اس کے فن کا صرف ایک گوشہ دریافت کیا ہے۔ ہم یہ دونوں مضامین بلونت سنگھ کی سمادھی کے لیے پاکستان کی طرف سے پھولوں کے ہار کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اعتراف کرتے ہیں کہ وہ اردو کا ایک بہت بڑا افسانہ نگار تھا۔۔

(بشکریہ: کتاب نما۔ دلی)

OO----OO

عذابِ دانشِ حاضر

سراب کا مستقبل :—— سگمنڈ فرائڈ کی کتاب "فیوچر آف این الیوژن" کی تلخیص اور ترجمہ جو پہلی بار ۱۹۲۷ء میں چھپی تھی۔ مترجم: خالد سہیل

ذہریت کی اقسام:—— ادکتاوریا پانز کی فلسفیانہ مضامین کی کتاب "آلٹرنیٹنگ کرنٹ" کے ایک باب کی تلخیص اور ترجمہ۔ مترجم: خالد سہیل

خدا کی تاریخ

خدا کی موت؟ / خدا کا مستقبل] کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب "اے ہسٹری آف گاڈ" کے آخری دو ابواب کی تلخیص اور ترجمہ۔

سینٹ مینوئل بونئو شہید (کہانی) —— ترجمہ: مریم زمانی

اونامونو کا

انسان اور آدمی

—— تعارف و تبصرہ: محمود ایاز

سگمنڈ فرائڈ
تلخیص و ترجمہ: خالد سہیل

سراب کا مستقبل

(سگمنڈ فرائڈ کی کتاب The Future of An Illusion پہلی بار ۱۹۲۷ء میں چھپی تھی)

(۱)

جب کسی شخص کی زندگی کا بیشتر حصہ اس غور و خوض میں گزر گیا ہو کہ وہ جس تہذیب اور ثقافت میں پلا بڑھا ہے انکا ماضی کیسا تھا، ان کی جڑیں کہاں تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان کی نشو و نما میں کن عوامل نے اہم کردار ادا کیا تھا تو کبھی کبھار وہ بھی سوچتا ہے کہ ان کا مستقبل کیا ہوگا اور ان میں کس قسم کی تبدیلیوں کی توقع کی جا سکتی ہے۔ اس موضوع پر غور کرنے سے ہمیں اس بات کا جلد ہی اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ موضوع اتنا بڑا ہے کہ اس پر صرف چند لوگ ہی سیر حاصل بحث کر سکتے ہیں کیونکہ اکثر لوگ اس موضوع کے ایک صرف ایک مخصوص پہلو پر تحقیق اور غور و خوض کرتے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنے ماضی اور حال سے ہی پوری طرح باخبر نہیں ان کے لیے مستقبل کے بارے میں قیاس آرائی کرنا اور بھی مشکل ہے اور اگر وہ اس کی کوشش بھی کریں تو ان کی رائے میں ان کی ذاتی پسند و ناپسند، توقعات، امیدوں اور خوابوں کی حقائق کی نسبت زیادہ پر چھائیں نظر آئے گی اور ایسی رائے میں معروضی پہلو کم ہوگا۔ میرے خیال میں اکثر لوگ اپنے حال کو اپنے ماضی اور مستقبل سے جوڑ کر نہیں دیکھتے اور ان رشتوں پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے۔

اسلیے جو شخص بھی مستقبل کے بارے میں پیشین گوئی کرے گا اسے بہت سے مسائل کا سامنا کرنا ہوگا اور نئے اور انجان علاقوں میں قدم رکھنا پڑے گا۔ مستقبل کے بارے میں بھلا کون کوئی حتمی رائے دے سکتا ہے کل کی بھلا کس کو خبر ہے۔

اس صورت حال میں چاہیے تو یہی کہ یا تو میں ذاتی طور پر اس کام سے دستبردار ہو جاؤں اور کیوں کہ یہ بھاری بوجھ مجھ سے نہ اٹھ پائے گا اور میں اپنی توجہ انسانی زندگی کے صرف ایک پہلو پر مرکوز کروں اور اس کے بارے میں اپنے خیالات اور نظریات کا اظہار کروں۔

میرے اس مضمون کا موضوع انسانی تہذیب و ثقافت ہے اور تہذیب و ثقافت سے میری مراد انسانی زندگی کے وہ تمام پہلو ہیں جو انسانوں کو حیوانوں سے ممتیز کرتے ہیں۔ ان میں وہ علوم بھی شامل ہیں جن کی وجہ سے ہم نے فطرت پر بالادستی اور اس سے اپنی ضروریات کو پورا

کرنے کے لیے دولت حاصل کی ہے اور وہ تمام قوانین، رسوم اور روایات بھی شامل ہیں جن کی روشنی میں ہم ایک دوسرے سے انسانی رشتے قائم کرتے ہیں اور دولت کی تقسیم کرتے ہیں۔

میری نگاہ میں تہذیب اور ثقافت کے یہ دونوں پہلو آپس میں مربوط ہیں۔

ایک طرف انسانوں کے آپس کے رشتے اور ان کی جمع کی ہوئی دولت اسی بات کا فیصلہ کرتے ہیں کہ انسان اپنی خواہشات کی کس حد تک تسکین کر سکتے ہیں تو دوسری طرف زندگی کے اسی کاروبار میں انسان دوسرے انسانوں کو اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے (چاہے وہ مزدوری ہو، دولت ہو یا جنسی آسودگی ہو) استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

اس مسئلے کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ میرے خیال میں انسان بنیادی طور پر تہذیب کا دشمن ہے کیونکہ تہذیب اجتماعی مفادات کی نگہبانی کرنا چاہتی ہے جبکہ انسان اپنی انفرادی خواہشات کی تسکین کو اہمیت دیتے ہیں۔ ایک پر امن معاشرتی زندگی کو برقرار رکھنے کے لیے ہر مرد کو قربانیاں دینی پڑتی ہیں ان قربانیوں سے انسان مجموعی طور پر دولت اور فطرت سے ایسا رشتہ قائم کرتے ہیں جس میں سب کی بھلائی مضمر ہو تاکہ ایک خوشحال اور منصفانہ معاشرے کی تشکیل ہو سکے۔ اگر انسان اجتماعی طور پر ایسا معاشرہ قائم کرنے میں کامیاب نہ ہوں تو انسانی جذبات بے قابو ہو جاتے ہیں اور وہ سائنس اور ٹکنالوجی کو انسانی ارتقا کی بجائے انسانی تباہی کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیتے ہیں بدقسمتی سے وہ چیزیں اور وہ نظام جنہیں تعمیر کرنے میں طویل عرصہ لگتا ہے انہیں تباہ و برباد کرنے میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔

بعض دفعہ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے تہذیب و ثقافت کے ارتقا کے لیے ایک اقلیت اپنی آرا اور اپنی اقدار اکثریت پر مسلط کرتی رہی ہو کیونکہ اسی اقلیت کا دعوی تھا کہ وہ انسانوں کی معاشرتی زندگی کے لیے ایسی بصیرتوں کی حامل تھی جن سے اکثریت محروم تھی تہذیب کے ارتقا کا یہ سفر تضادات سے پر رہا ہے۔ ہمیں اس حقیقت کا بھی احساس ہے کہ انسانوں کے لیے فطرت پر قابو پانے کا عمل انسانی رشتوں میں ایک توازن قائم کرنے سے آسان رہا ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانوں کی اکثریت اس قابل ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تسکین کے دوران دوسری کا استحصال نہ کرے یا ہمیں ان کے منفی جذبوں، رد یوں، جذبات اور اعمال سے دوسروں کو بچانے کے لیے ہمیشہ قوانین اور روایات کا سہارا لینا پڑے گا۔ جب ہم انسانی مسائل اور رشتوں پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ فطرت پر قابو پاکر دولت حاصل کرنا اور ایسی دولت کو انسانوں میں مساوی تقسیم کرنا تاکہ سب ایک خوشحال اور صحتمند زندگی گزار سکیں ایک پیچیدہ عمل ہے۔ اس عمل کا ایک پہلو مادی ہے تو دوسرا نفسیاتی۔

انسانوں کے معاشی مسائل نفسیاتی مسائل سے جڑے ہوئے ہیں۔ اگر انسانوں کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو عین ممکن ہے کہ تہذیب اور ثقافت کی روایت بری طرح مجروح ہو جائے

کیونکہ عوام کی اکثریت کاہل اور سادہ لوح ہوتی ہے وہ اپنے جذبات کی فوری تسکین چاہتی ہے اور وہ بڑے مقاصد کے لیے چھوٹے مقاصد قربان نہیں کرنا چاہتی اس لیے ان پر اقلیت کو قوانین اور پابندیاں نافذ کرنی پڑتی ہیں ۔ عوام پر پابندیاں نافذ کرنا اتنا تکلیف دہ نہ ہو اگر ان کے رہنما ایسے انسان ہوں جو باعمل اور اعلیٰ اقدار و کردار کے مالک ہوں، عوام ان کی عزت کرتے ہوں اور ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیں ۔ ایسی صورت میں عوام کے ایک صحتمند اور منصفانہ زندگی کو اختیار کرنے کے زیادہ امکانات ہو سکتے ہیں ۔ ایسے رہنماؤں اور لیڈروں سے ہمیں یہ امید ہوگی کہ انہیں عوام سے ہمدردی ہوگی اور وہ زندگی کی بصیرتیں رکھتے ہوں گے ۔ ایسے رہنماؤں کی موجودگی میں عوام کے لیے قوانین پر عمل کرنا آسان ہو جاتا ہے لیکن پھر بھی رہنماؤں کو تھوڑا بہت دباؤ تو ڈالنا ہی پڑتا ہے کیونکہ عوام ۔ نیادی طور پر نہ تو سخت کام کرنا اور نہ ہی اپنی خواہشات کی تسکین کو ملتوی کرنا چاہتے ہیں وہ اپنے ۔ پر فوری عمل کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔

بعض لوگ میرے ان خیالات پر اعتراض کریں گے اور کہیں گے کہ عوام پر دباؤ اس لیے ڈالنا پڑتا ہے ۔ [illegible] ب اور ہمارے نظام میں بہت سی خامیاں ہیں ایک مثالی معاشرے میں اس کی ضر[illegible] ۔ نہ ہوگی ہر شخص ایک صحتمند زندگی گزارے گا اور دوسروں کا استحصال نہ کرے گا چونکہ ایسا معاشرہ قائم نہ ہو سکا اس لیے غیر منصفانہ نظام نے لوگوں کو غصیلا اور باغی بنا دیا ہے ۔ اگر ہم اگلی نسلوں کے بچوں کی محبت، شفقت اور ایک ذمہ دارانہ ماحول میں پرورش کریں گے تو وہ ایک بہتر نظام کو تشکیل دیں گے ۔ وہ نہ صرف اپنا کام ذمہ داری سے کریں گے بلکہ ایک دوسرے کی خواہشات اور حقوق کا احترام بھی کریں گے اور اگر معاشرتی فلاح و بہبود کے لیے قربانی کی ضرورت ہوگی تو وہ خوشی سے قربانی بھی دیں گے ۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسانی ارتقا کے جس مرحلے پر ہم سب انسانی زندگی گزار رہے ہیں اس معاشرے میں کیا قربانیاں دینے والے عوام کی اور ایسے رہنماؤں کی امید رکھنا جو خدمت خلق کو اپنا فریضہ سمجھیں اور قوموں کی صحتمند خطوط پر پرورش اور رہنمائی کریں اور ایسے معاشرے کو تشکیل دیں جہاں دباؤ اور جبر کی کم از کم ضرورت پیش آئے حقیقت پسندانہ فعل ہے میرا خیال ہے کہ ہر دور میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا ہوگا جو خود غرضانہ اور مجرمانہ ذہنیت اور کردار کا مالک ہوگا اور عوام کے امن اور سکون میں روڑے اٹکائے گا ۔ لیکن اکثریت کی تعلیم، تربیت ایسے خطوط پر ہو سکتی ہے کہ وہ ایک صحتمند اور منصفانہ نظام کے لیے قربانیاں دے سکے اگر ایسا ممکن ہو جائے تو وہ انسانی معاشرے کے لیے ایک اچھا شگون ہوگا ۔

مجھے اس بات کا احساس ہے کہ اس گفتگو کے دوران میں اپنے اصل موضوع سے کافی دور نکل آیا ہوں لیکن میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرے اس مضمون کا مقصد انسانی تہذیب و ثقافت کے مستقبل کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا نہیں ہے ۔ میرے پاس نہ تو ایسا علم ہے اور

نہ ہی میں کسی ایسے طریقہ کار سے واقف ہوں جس سے ایسے معاشرے کے قیام کے تجربے کے خواب کو شرمندہ تعبیر کیا جاسکے ۔ میں تو صرف اس موضوع پر اپنے ذاتی خیالات اور نظریات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں ۔

(۲)

ہماری گفتگو آہستہ آہستہ معاشی دائروں سے نکل کر نفسیاتی دائروں میں داخل ہوتی جارہی ہے ۔ پہلے ہم تہذیب اور ثقافت کو معاشرے میں دولت کی فراہمی اور تقسیم کے حوالے سے سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جب ہمیں اندازہ ہوا کہ کسی بھی تہذیب کو قائم رکھنے کے لیے ہمیں عوام پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت ہے تاکہ منصفانہ اور صحتمند معاشرے کے قیام کے لیے وہ اپنی خواہشات کی تسکین کی قربانیاں دے سکیں اور عین ممکن ہے کہ ان پابندیوں کے خلاف احتجاج اور بغاوت کی آواز بلند کریں گے اور تہذیب کی عمارت پر حملہ آور ہوں گے تو ہمیں احساس ہوا کہ معاشرتی مسائل کے اس شعور سے ہم معاشی دائرے سے نکل کر انسانی تہذیب کے نفسیاتی دائرے میں داخل ہوگئے ہیں ۔

جب ہم انسانی نفسیات کے حوالے سے بات آگے بڑھاتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ انسانوں کے انفرادی اور معاشرتی تعلقات کافی پیچیدہ ہیں ۔

انسانی بچے اپنی جبلتوں کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں اور اپنی خواہشات کی فوری تسکین چاہتے ہیں ۔ انسانی معاشرہ ان پر کچھ پابندیاں عائد کرتا ہے ۔ تاکہ انسانی زندگی اور معاشرے میں ایک ہمواری اور توازن قائم ہوسکے ۔ بعض انسانوں کے لیے ان پابندیوں کو قبول کرنا آسان ہوتا ہے اور بعض کے لیے بہت مشکل ۔ اور بعض انسان تو ان پابندیوں اور قربانیوں کی وجہ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ وہ ان جبلتوں پر جو انھوں نے حیوانی آباد اجداد سے وراثت میں پائی ہیں قابو نہیں پاسکتے اور تہذیب کو درہم برہم کرتے رہتے ہیں وہ انسان اپنی زندگی حیوانی سطح پر گزارنا چاہتے ہیں ۔ آج بھی ہم ان کی مثالیں ایسے معاشروں میں پاتے ہیں جہاں دوسرے انسانوں کے گوشت کو کھانا، قریبی رشتہ داروں سے جنسی اختلاط کرنا (Incest) اور انسانوں کا قتل کرنا ابھی ختم نہیں ہوا ۔ ان لوگوں نے انسانی اقدار کو ابھی پوری طرح نہیں اپنایا اور اپنی جبلی خواہشوں پر قابو پانا نہیں سیکھا ۔ ایسی اقدار اور ایسی پابندیاں ایک انسانی معاشرے کے قیام کے لیے ناگزیر ہیں ۔ ہمیں امید ہے کہ انسانی معاشرے اور تہذیب کے ارتقا کے ساتھ ساتھ ایسے حیوانی اعمال سے معاشرہ پاک ہو تا جائے گا اور ایسے لوگوں کی تعداد میں بتدریج کمی آتی جائے گی ۔

جب ہم انسانی دماغ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ انسانوں نے سائنس اور ٹکنالوجی میں تو بہت ترقی کی ہے لیکن آج کے انسانی بچے کا دماغ آج سے ہزاروں سال پیشتر کے انسانی بچے کے دماغ سے زیادہ مختلف نہیں ہے یہ علحدہ بات کہ آج کا بچہ جس معاشرے میں

پرورش پاتا ہے اس سے اس کے شعوری اور لاشعوری ضمیر (Superego) کی تشکیل ہوتی ہے وہ آہستہ آہستہ نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی، صحیح اور غلط کی تمیز سیکھتا ہے اور وہ آہستہ آہستہ ایک جسمانی اور نفسیاتی ہستی سے معاشرتی اور اخلاقی ہستی بن جاتا ہے۔ انسانی ضمیر کی پرورش انسانی شخصیت کے ارتقا کا ایک اہم مرحلہ ہے۔ جن لوگوں میں ضمیر کی پرورش صحتمند خطوط پر ہوتی ہے وہ جوان ہو کر تہذیب کی مخالفت کرنے کی بجائے اس کا تعاون کرتے ہیں اور انسانی معاشرے کے ارتقا میں اہم کردار ادا کرتے ہیں اور جس معاشرے میں ایسے لوگوں کی تعداد جتنی زیادہ ہوتی ہے اتنا ہی وہ معاشرہ صحتمند خطوط پر استوار ہوتا ہے اور لوگوں کو خارجی دباؤ کی کم ضرورت پڑتی ہے۔ ایسے ماحول میں خارجی پابندیاں آہستہ آہستہ داخلی پابندیوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور انسانوں کے ذہنوں میں حکومت کی خارجی عدالت کی بجائے ضمیر کی داخلی عدالت قائم ہو جاتی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ عوام کے لیے ایک صحتمند زندگی گزارنے کی خاطر خارجی اور داخلی دونوں طرح کی عدالت کی ضرورت پڑتی ہے ان کے لیے نفسیاتی دباؤ کے ساتھ ساتھ معاشرے کا اخلاقی دباؤ بھی ضروری ہوتا ہے۔ صدیوں کے معاشرتی ارتقا کے بعد بھی ہمیں بہت سے ایسے لوگ مل جائیں گے جو قتل سے تو دور رہیں گے لیکن اگر انہیں سزا کا ڈر نہ ہو تو وہ جھوٹ بولنے، دھوکہ دینے، اپنے غصے اور جنسی جذبات کے غیر صحتمندانہ اظہار سے دریغ نہ کریں گے۔ ایسے لوگوں کو راہ راست پر رکھنے کے لیے خارجی قوانین اور پابندیاں ضروری ہیں۔

اگر کسی معاشرے میں ایسے گروہ، طبقے یا اقلیتیں موجود ہوں جو بنیادی حقوق سے محروم ہوں تو وہ گروہ ہر ممکن کوشش کریں گے کہ ایسی صورت حال کو بدلیں تاکہ ایک منصفانہ نظام قائم ہو سکے اور امیر و غریب، مرد اور عورتیں اور کالے اور گورے سب ایک ہی قطار میں کھڑے ہو سکیں۔ ایک غیر منصفانہ نظام میں اقلیتوں میں غصے، نفرت اور بغاوت کے جذبات بڑھتے ہیں اور وہ تہذیب اور قانونی پابندیوں کو تباہ کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے کہ غیر منصفانہ نظام سے اکثریت متاثر ہونے لگے اور صرف ایک اقلیت آسودگی اور خوشحالی کی زندگی گزار رہی ہو تو وہ اکثریت احتجاج کرنے لگتی ہے اور بالآخر ایک انقلاب لے آتی ہے۔ میری نگاہ میں ایسی اقلیت کو جو اکثریت پر ظلم اور جبر کرتی ہو اور ان کے مسائل سے ہمدردی نہ رکھتی ہو اسے حکومت کرنے کا ویسے بھی حق نہیں ہونا چاہیے۔

کسی معاشرے کی تہذیب کے ارتقا کے لیے صرف وہ پابندیاں ہی اہم نہیں ہیں جنہیں لوگوں نے اپنی ضمیر کی آواز کے طور پر اپنا لیا ہو بلکہ اسکے لیے وہ تخلیقی کاروائیاں اور فن پارے بھی اہم ہیں جو اسی معاشرے کا سرمایہ ہیں اور جن سے لوگ ایک مخصوص قسم کا حظ اٹھاتے ہیں۔ کسی معاشرے کے تہذیبی سرمایے میں وہ آورش بھی شامل ہوتے ہیں جن کے حصول کے لیے عوام ہر وقت کوشاں رہتے ہیں اور جو لوگ ان تک پہنچنے میں کامیاب ہو جائیں انہیں انعام و اکرام سے

نوازتے ہیں۔ ایسے آدرشوں تک رسائی کے لیے افراد کی کوشش اور مصلاحتیں اور معاشرے کی مدد اور حوصلہ افزائی سب اہم کردار ادا کرتے ہیں بعض دفعہ تو کوئی معاشرہ اپنے آدرشوں کو اتنا عزیز رکھتا ہے کہ وہ ایک مقام پر پہنچ کر یہ ثابت کرنے لگتا ہے کہ اس کے آدرش باقی معاشروں کے آدرشوں سے بہتر ہیں اس طرح ان میں ایک طرح کا احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے اور یہ احساس مختلف معاشروں، قوموں اور ثقافتوں میں رشک، حسد اور دشمنی کے بیج بوتا رہتا ہے۔ عوام کی اس احساس برتری کا بعض دفعہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ عوام جن رہنماؤں سے شاکی ہوتے ہیں وہ رہنما جب دوسری قوتوں سے مقابلے پر اتر آتے ہیں تو بھی عوام ان رہنماؤں کا ساتھ دینے لگتے ہیں اور انہیں اپنا ہیرو بنالیتے ہیں اس طرح وہ لیڈر جو عوام میں مقبول نہیں ہوتے جب دشمن سے جنگ کا اعلان کرتے ہیں تو وہ اپنی عوام کی ہمدردیاں حاصل کر لیتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ کئی ظالم اور جابر حاکموں نے اس حربے سے خوب فائدہ اٹھایا اور مدتوں حکومت کرتے رہے۔

ہر معاشرے کے لوگ اپنے فنی اور تخلیقی کمالات کا خوشی سے ذکر کرتے ہیں یہ علحدہ بات کہ عوام کی اکثریت ان فنونِ لطیفہ کے شاہکاروں سے پوری طرح لطف اندوز نہیں ہو سکتی کیونکہ ان کے ذوق کی ان خطوط پر تربیت نہیں کی جاتی لیکن وہ پھر بھی ان شاہکاروں پر فخر کرتے ہیں۔

جب ہم کسی معاشرے کی نفسیاتی زندگی پر توجہ مرکوز کرتے ہیں اور عوام کے آدرشوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ اپنے رہنماؤں اور فنونِ لطیفہ کے شاہکاروں پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ ایک اور حقیقت بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، جس پر اب تک ہم نے توجہ مرکوز نہیں کی اور وہ ہیں ان کے مذہبی نظریات میری نگاہ میں مذہبی نظریات کی اہمیت سراب سے زیادہ کچھ نہیں اور میں اسی موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

(۳)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں مذہبی نظریات کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہے؟

ہم اپنی گفتگو کے دوران دیکھ چکے ہیں کہ ہر معاشرے میں تہذیبی اور قانونی پابندیوں کے خلاف لوگوں میں غصے، نفرت اور بغاوت کے جذبات پائے جاتے ہیں۔ اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے فرض کر لیں کہ معاشرے سے پابندیاں اٹھا دی گئی ہیں اور

ہر مرد کو کھلی اجازت دے دی گئی ہے کہ وہ

جس عورت سے چاہے مباشرت کرے اور جس رقیب کو چاہے قتل کرے اور

ہر شخص کو کھلی چھٹی دے دی گئی ہے کہ وہ

جس شخص کی جو چیز پسند کرے لے لے

تو بظاہر تو یہ صورت حال بہت دلکش نظر آتی ہے لیکن اگر ہر شخص کو ہر دوسرے شخص کی چیزیں بے دریغ حاصل کرنے کی اجازت ہو تو حقیقت میں سوائے ایک شخص کے باقی سب لوگ پریشان ہوں گے اور وہ ایک شخص ایک ڈکٹیٹر، ایک ظالم اور ایک جابر انسان ہو گا جس کی نہ تو کوئی عزت کرے گا اور نہ ہی معاشرے کو اس سے فائدہ ہو گا۔ ایسی صورت حال سے بچنے کے لئے مذہب نے ہمیں قانون دیا ہے کہ

"کسی انسان کو دوسرے انسان کو قتل کرنے کی اجازت نہیں"

اس گفتگو سے یہ واضح ہے کہ اگر کوئی شخص تہذیب و ثقافت سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ کوئی دانشمندانہ انداز میں نہیں سوچتا۔ اگر تہذیب ختم ہو جائے گی تو ہم فطرت کے ساتھ حیوانی سطح پر زندگی گزاریں گے اور ایسی زندگی مسائل اور مصائب سے پر ہو گی۔ ایسی صورت میں اگرچہ ہماری جبلتوں اور خواہشات پر کوئی پابندی تو نہ ہو گی لیکن ہمیں اپنی خواہشات کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑے گی۔ فطرت ایک حوالے سے بڑی ظالم ہے اور انسانوں پر بڑے ظلم کرتی ہے انسانی تہذیب کے ارتقا کا ایک مقصد فطرت کے مظالم سے بچنا بھی تو ہے۔ ہم جس قدر مہذب ہو رہے ہیں اسی قدر ہم فطرت پر قابو پا رہے ہیں لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہم کبھی بھی پوری طرح فطرت پر قابو نہ پا سکیں گے۔ زلزلے، سیلاب، آندھیاں اور طوفان آتے رہیں گے اور انسانی جانوں کو ضائع کرتے رہیں گے۔ انسان بیماریوں کے زیر عتاب بھی آتے رہیں گے اور اگر ان سب سے بچ بھی گئے تو انہیں موت سے نبرد آزما ہونا پڑے گا جس کا نہ تو ہمیں کوئی علاج مل سکا ہے اور نہ ہی مل پائے گا۔ یہ طاقتور ہتھیار ہمیں بے بس محسوس کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ اسی بے بسی سے نجات حاصل کرنے اور اپنے تئیں طاقتور محسوس کرنے کے لئے انسانوں نے تہذیب کو فروغ دیا ہے۔ جب انسانوں کا فطرت کے جبر سے مقابلہ ہوتا ہے تو وہ اپنے مسائل اور تضادات کو ایک طرف رکھ کر فطرت کے خلاف متحد ہو جاتے ہیں کیوں کہ انہیں زندگی عزیز ہے

جہاں انسان اجتماعی طور پر فطرت سے مقابلہ کرتے ہیں وہیں انسان اپنی انفرادی زندگی میں بھی فطرت سے نبرد آزما رہتے ہیں اور اسے قسمت (Fate) کا نام دیتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انسان جو خارجی پابندیوں کو قبول کرنے سے انکار کرتا ہے اور ان کے خلاف غصے اور نفرت کے جذبات رکھتا ہے وہ قسمت کا کیسے مقابلہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بھی تہذیب انسان کی مدد کرتی ہے تاکہ وہ اپنے محدود وسائل سے ایسا ماحول اور طرز زندگی اختیار کر سکے جس سے فطرت اور قسمت اس پر کم از کم اثر انداز ہوں۔

اس عمل کی ابتدا بچپن سے ہوتی ہے۔ بچہ اپنے آپ کو بالکل بے بس اور مجبور محسوس کرتا ہے اور اپنے والدین سے خوف کھاتا ہے لیکن وہی باپ جس سے وہ ڈرتا ہے وہی باپ اسے

باقی دنیا کے مصائب اور مسائل سے بچاتا ہے اور نوجوانی تک پہنچتے پہنچتے انسان اپنے خوابوں میں فطرت اور دشمنوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنے باپوں اور خداؤں کے ہیولے بناتا ہے اور ان سے مدد مانگتا ہے تاکہ وہ اسے دشمنوں سے بچاتے رہیں۔

اس طرح خداؤں کا تصور انسانی زندگی میں کئی حوالوں سے اہم ہے

خدا انسان کو فطرت کے مظالم سے بچاتے ہیں

خدا انسان کو قسمت کے جبر سے محفوظ رکھتے ہیں اور

خدا انسان کو ان قربانیوں کا انعام دیتے ہیں جو وہ تہذیب کے ارتقا کے سلسلے میں دیتا ہے۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ وہی خدا جنہوں نے فطرت کو جنم دیا ہے اس کے قوانین میں عام حالات میں دخل اندازی نہیں کرتے اور اگر مذہبی کتابوں میں اس دخل اندازی کا ذکر آتا بھی ہے تو ہم انہیں معجزے (Miracles) کہتے ہیں۔

انسانی ارتقا کے سفر میں انسان اپنی فطرت کی تکمیل کرنا چاہتا ہے اور جسم کی ضروریات سے زیادہ اپنی روح کی تسکین اور نشوونما چاہتا ہے۔ آہستہ آہستہ انسان ایسی روحانی خصوصیات کا حامل بن جاتا ہے کہ جو اسے زندگی اور موت کے مسائل سے نبرد آزما ہونے میں مدد دیتی ہیں۔ اسے احساس ہوتا ہے کہ انسانی زندگی کی طرح کائنات میں جمادات اور نباتات کی زندگیاں بھی قوانین فطرت کے تابع ہیں اور جب قوانین شکنی ہوتی ہے چاہے وہ حیوانوں سے یا انسانوں سے تو ان کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ انسانوں نے یہ باور کر لیا کہ اگر انسانی نتائج مرتب ہونے سے پہلے وہ مر جائیں تو وہ اعمال ان کی حیات بعد الموت کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر انسان دوسرے انسانوں پر ظلم کرتے ہیں تو انہیں ان کی سزا مرنے کے بعد ملتی ہے۔ انسانوں نے ایسے مذہبی نظریات وضع کئے جس کے تحت انسانی زندگی کا ایک مقصد قرار پایا اور انہیں بتایا گیا کہ روز حشر تمام نیکیوں کا انعام اور سب بدیوں کی سزا ملے گی کیوں کہ یہی انصاف کا تقاضہ ہے اس طرح سب ظالموں کو سزا ملے گی اور سب مظلوم اپنی دنیاوی زندگی کی تکالیف کا اجر اخروی زندگی میں پائیں گے۔ انسانوں نے نیکی بدی کے اسی حساب کے لئے آسمانی اور روحانی طاقتوں کو تخلیق کیا جن کا کام دنیا میں عدل و انصاف قائم کرنا تھا۔ آہستہ آہستہ وہ تمام روحانی اور آسمانی طاقتیں ایک طاقت میں جمع ہو گئیں جسے ہم نے خدا کا نام دے دیا۔ اس طرح انسان اور خدا کے رشتے میں بچے اور باپ کے رشتے کی قربت اور گہرائی پیدا ہو گئی اور خدا کو ماننے والے انسانوں نے خدا کے ساتھ ایک خاص رشتہ قائم کر لیا اور اپنے آپ کو اس کے چہیتے لوگوں (Chosen people) میں شامل کر لیا۔

میں نے جن مذہبی تصورات کا اختصار سے ذکر کیا ہے ان کے ارتقا میں کئی قوموں اور کئی تہذیبوں نے اپنا کردار ادا کیا ہے۔ میں نے یہاں صرف عیسائی نظریات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

عیسائی معاشروں میں مذہبی نظریات کو بہت اہم اور مقدس سمجھا جاتا ہے۔ لوگ ان کے

لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار ہوتے ہیں۔

ہمارے لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان نظریات کی نفسیاتی اہمیت کیا ہے اور انسانوں کے لئے یہ نظریات اتنے مقدس کیونکر بن گئے ہیں"

ہماری گفتگو کے اس مرحلے پر عین ممکن ہے کہ میرے خیالات کا مخالف مجھ سے کہے "آپ جو یہ کہہ رہے ہیں کہ معاشرے کی تہذیب نے ان مذہبی نظریات کو جنم دیا ہے اور اس مہذب معاشرے کے لوگ ان سے چھٹکارا ابھی حاصل کر سکتے ہیں تو مجھے یہ بات عجیب سی لگتی ہے مجھے مذہبی نظریات معاشرے کے ان قوانین کی طرح نہیں لگتے جن کے تحت لوگ دولت اور محنت کی تقسیم اور بچوں اور عورتوں کے حقوق کے فیصلے کرتے ہیں۔

میرے مخالف کی بات بجا لیکن میں پھر بھی اس بات پر اصرار کروں گا کہ میری نگاہ میں مذہبی نظریات نے بھی انسانی تہذیب کی باقی روایات کی طرح انسان کی فطرت سے بالادستی سے نجات پانے کے لئے پرورش پائی ہے۔ انسان جب کسی معاشرے میں پرورش پاتا ہے تو وہ ریاضی کے مروجہ قوانین کی طرح مذہبی نظریات بھی وراثت میں پاتا ہے فرق یہ ہے کہ ان نظریات کو روحانی رنگ میں پیش کیا جاتا ہے اور اسے بتایا جاتا ہے کہ ان نظریات کو انسانوں نے وحی کے توسط سے حاصل کیا ہے جس کی وجہ سے ان نظریات کو مقدس سمجھا جاتا ہے۔ ان نظریات کو وحی کے طور پر پیش کرنے سے ان کی تاریخی اہمیت کو کم کرنے اور مذہبی اہمیت کو بڑھانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مجھ سے اختلاف کرنے والے کہہ سکتے ہیں "آپ کی یہ دلیل کہ انسانی تہذیب کا ارتقا فطرت پر بالادستی حاصل کرنے کی کوشش کا ماحصل ہے کچھ زیادہ وزنی نہیں لگتی ہو سکتا ہے کہ وہ انسانی تجسس کا نتیجہ ہو۔ آپ نے خدا کے تصور کو پہلے باپ کے تصور سے تشبیہ دی اور پھر انسان کو بچوں کی طرح معذور و مجبور ثابت کیا آخر ان دلائل کا ماخذ کیا ہے"

ان اعتراضات کے جوابات میں میں یہ کہوں گا کہ انسان کا متجسس ہونا بجا لیکن تجسس اس پورے ارتقا کی ادھوری تشریح ہے۔ انسان فطرت کو سمجھنا چاہتا ہے تاکہ بعد میں اس پر قابو پا سکے اور بالادستی حاصل کر سکے۔

دوسری بات یہ ہے کہ انسانوں میں **بچپن** کی بے بسی کا احساس بلوغت کے بعد بھی رہتا ہے یہ علیحدہ بات ہے کہ اس کی **صورت بدل جاتی** ہے۔ بچپن میں پہلے بچہ اپنی ماں کے قریب ہوتا ہے کیوں کہ وہ اس کی ضروریات کا خیال رکھتی ہے اور اس کی خواہشات کی تسکین کرتی ہے بعد میں بچہ باپ کے قریب ہو جاتا ہے کیوں کہ باپ اسے تحفظ کا احساس دلاتا ہے لیکن باپ کے ساتھ یہ رشتہ دو دھاری تلوار کی طرح ہوتا ہے۔ ایک طرف بچہ باپ کی طاقت سے ڈرتا ہے اور دوسری طرف وہ باقی دنیا سے باپ کی طاقت کے پیچھے چھپنا بھی چاہتا ہے۔ بعد میں یہی احساس اور یہی جذبہ

انسان کو مذہب کے قریب لے آتا ہے اور جوانی میں ہمیں بچے اور باپ کے رشتے کا عکس انسان اور خدا کے رشتے میں نظر آتا ہے۔

آئیں ہم اپنی گفتگو کو ایک قدم آگے بڑھائیں اور مذہبی نظریات کی نفسیاتی اہمیت جاننے کی کوشش کریں۔

میری نگاہ میں مذہبی خیالات و حقائق اور نظریات ہیں جن تک انسان منطق کے ذریعہ نہیں بلکہ ایمان کے راستے پہنچتا ہے اس لئے اسے بہت عزیز رکھتا ہے۔ مذہبی انسان ان لوگوں کو جو ایمان نہیں رکھتے کم فہم سمجھتا ہے اور اپنے نظریات کی وجہ سے اپنے آپ کو خوش قسمت اور ایمان کی دولت سے مالامال سمجھتا ہیں۔

مذہبی علوم اور دیگر علوم میں یہ فرق ہے کہ اگر ہم بچپن میں جغرافیے کا سبق پڑھتے ہیں تو بعد میں ہم ان کی تصدیق کر سکتے ہیں۔ ہم جوانی میں دنیا بھر میں گھوم کر ان جگہوں کو خود جاکر دیکھ سکتے ہیں جنہیں ہمیں جغرافیے کے اساتذہ نے پڑھایا تھا یا ہم نے کتابوں میں پڑھا تھا لیکن مذہبی علوم پر یہ اصول لاگو نہیں ہوتا جب ہم مذہبی نظریات کی حقیقت کے بارے میں اساتذہ سے سوال پوچھتے ہیں تو ہمیں کچھ اس قسم کے جواب ملتے ہیں۔

ہمیں ان نظریات پر اس لئے ایمان لانا چاہیئے کیوں کہ ہمارے آباو اجداد ان پر ایمان لائے تھے۔

ہمیں ان نظریات کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہیئے اور ان کے بارے میں سوال نہیں پوچھنے چاہئیں۔

ایک وہ زمانہ تھا جب ان نظریات کو شک کی نگاہ سے دیکھنے والوں کو سزا ملا کرتی تھی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ نظریات سچے ہوں تو پھر ان پر سوالات اور اعتراضات کی ممانعت کیوں۔ سوال تو وہ نظریہ برداشت نہیں کر سکتا جو عدم اعتماد کا شکار ہو۔ اگر مذہبی نظریات حقائق اور سچائیوں پہ مبنی ہوتے تو وہ ہر قسم کے سوالات کو خوش آمدید کہتے۔

مذہبی عقائد کے بارے میں یہ دلیل پیش کرنا کہ ہمارے آباو اجداد ان پر ایمان لائے تھے کوئی موثر دلیل نہیں۔ ہمارے آباو اجداد اور بزرگ کئی حوالوں سے کم علم اور کم فہم تھے۔ وہ بہت سی ایسی چیزوں پر یقین رکھتے تھے جو بعد میں غلط ثابت ہوئیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا مذہبی عقائد بھی تو اس گروہ کا حصہ نہیں ہیں؟ ہمارے بزرگوں نے اپنے عقائد کے حق میں جو دلائل پیش کئے ہیں وہ نہ صرف کچھ زیادہ جاندار نہیں ہیں بلکہ غلط بیانیوں اور تضادات سے بھی بھرے پڑے ہیں۔ ان عقائد کے بارے میں روحانیت اور وحی کے دلائل پیش کرنا انہیں معتبر اور قابل قبول نہیں بناتا۔

اس گفتگو سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ بچپن میں ہمیں جو علم دیا جاتا ہے اس کا سب

سے اہم حصہ جس کا تعلق زندگی کے رازوں سے ہوتا ہے سب سے زیادہ غیر معتبر ہوتا ہے کیوں کہ ہم اس کی کوئی تصدیق نہیں کر سکتے ۔ یہ صورت حال ہمارے لئے ایک نفسیاتی الجھن پیدا کرتی ہے ۔ میرا یہ کہنا کہ ہم مذہبی عقائد کے حق میں کوئی عقلی ثبوت یا کوئی منطقی دلیل پیش نہیں کر سکتے کوئی نئی بات نہیں ۔ ہم سے پہلے لاکھوں لوگوں کے دلوں میں مذہبی عقائد کے سلسلے میں سوال اور شک پیدا ہوئے لیکن ان پر معاشرتی پابندیاں اتنی زیادہ تھیں کہ انہیں ان جذبات اور خیالات کے اظہار کی اجازت نہ دی گئی ۔ انہیں ڈر تھا کہ ایسا کرنے سے ان کی زندگیاں خطرے میں پڑ جائیں گی اور انہیں بہت سی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ مذہبی عقائد کے بارے میں جتنے بھی ثبوت فراہم کئے جاتے ہیں ان کا تعلق ماضی سے ہوتا ہے ۔ اگر ان عقائد میں سے چند ایک کا بھی حال میں ثبوت فراہم کیا جا سکتا تو عین ممکن تھا کہ وہ لوگوں کی نظروں میں کچھ معتبر قرار پاتے مثال کے طور پر مذہبی لوگ انسانی روح پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمیں بھی اس کا قائل کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ کسی طور پر بھی اسے ثابت نہیں کر سکتے اور لوگ اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ عقیدہ حقیقت پر مبنی نہیں بلکہ مذہبی لوگوں کے ذہن کی اختراع ہے ۔ وہ عظیم لوگوں کی روحوں سے گفتگو کرنے کا دعویٰ بھی کرتے ہیں لیکن جو گفتگو بیان کرتے ہیں وہ نہایت ناقص ہوتی ہے ۔

جب مذہبی لوگوں کا اس قسم کے سوالوں اور اعتراضات سے سامنا ہوتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ مذہبی عقائد منطق کے دائرے سے باہر اور بالاتر ہیں ۔ ایسے عقائد کی سچائیوں کو انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے انہیں عقل سے ثابت نہیں کیا جا سکتا ۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ مذہبی عقائد کو قبول کرنے کے لئے ایک داخلی تجربے کی ضرورت ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان لوگوں کا کیا ہو گا جنہیں عمر بھر یہ تجربہ نصیب نہ ہو اور ان لوگوں کو ، جو عقل کی بجائے کسی داخلی تجربے کی وجہ سے نظریات تبدیل کریں ۔ کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ نہ صرف اصرار کریں کہ دوسرے لوگ ان کے نظریات کو قبول کریں بلکہ ان پر عمل بھی کریں ۔ بعض دفعہ مذہبی لوگ یہ بھی کہتے ہیں " فرض کریں اگر ایسا ہو گیا تو ... " میرے نزدیک ایسے نظریات کا تعلق حقیقت سے کم اور فکشن سے زیادہ ہے جنہیں عاقلو بالغ انسان اپنی زندگیوں کے لئے مشعل راہ نہیں بنا سکتے ۔ اس قسم کی سوچ کے انداز کی امید ہم فلاسفروں سے رکھتے ہیں جو بعض ایسے مصنوعی حقائق (Theoretical truths) کا ذکر کرتے ہیں جن کا منطق کے معیار پر پورا اترنا لازم نہیں ہوتا ۔

جب میں اپنے بچوں کو پریوں کی کہانیاں سنایا کرتا تھا تو وہ پوچھا کرتے تھے " ابو ! کیا یہ کہانی سچی ہے یا ہم اسے فرض کر لیں " اور جب میں یہ کہا کرتا تھا کہ وہ کہانی سچی نہیں ہے تو ان کے چہروں پر ناگواری کے جذبات نمایاں ہوتے تھے ۔ انہیں یوں لگتا تھا جیسے ان کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہو ۔ میرے خیال میں مذہبی لوگ کتنی بھی اپنے عقائد کی پریوں کی کہانیاں سنالیں سمجھدار لوگ

ان کے دام میں نہ آئیں گے۔

سچی بات تو یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے نامعتبر ہونے کے باوجود مدتوں لوگوں کو ان پر اعتراض کرنے کی اجازت نہیں دی گئی لیکن اب حالات بدل گئے ہیں اور اب ہم ان عقائد کو انسانی فکر اور تجربے کے ترازو میں تول سکتے ہیں اور ماننے والوں کے داخلی تجربے کو منطق کی کسوٹی پر پرکھ سکتے ہیں۔

اب ہم ان سوالوں کے جواب کے قریب آرہے ہیں جو ہم نے اس گفتگو کے شروع میں اٹھائے تھے۔ ہم مذہبی عقائد کی نفسیاتی وجوہات کی تلاش میں نکلے تھے۔ ہماری گفتگو سے یہ بات واضح ہوئی کہ مذہبی عقائد کی عمارت نہ تو انسانوں کے روزمرہ کے تجربات اور نہ ہی انسانی غور و تدبر کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ ان کی حقیقت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔ ایسا سراب جو انسانوں کے دلوں میں صدیوں کی پوشیدہ خواہشات کا ماحصل ہے۔ ہم نے دیکھا کہ بچپن کے اس احساس بے بسی کی وجہ سے انسان تحفظ کی تلاش میں رہتے ہیں۔ محبت کا تحفظ۔ جو بچپن میں باپ سے حاصل ہوتا ہے اور جوان ہو کر خدا سے۔ خدا کا تصور جو باپ کے تصور سے زیادہ طاقتور اور پائدار سمجھا جاتا ہے انسانوں کو زندگی کے مختلف خطرات کے خوف سے نجات دلاتا ہے۔ زندگی کو نیکی اور بدی کا ایک پیمانہ بھی دیتا ہے اور زندگی کی ناانصافیوں کا مرنے کے بعد ازالہ بھی فراہم کرتا ہے۔ خدا کا یہ تصور مذہب کے عقائد کے ایک نظام کا حصہ بن جاتا ہے اور اس نظام میں کائنات کی ابتدا، جسم اور روح کے رشتے اور زندگی کے بیسیوں مسائل اور تضادات کا حل بھی پیش کیا جاتا ہے۔

مذہب کا نظام انسانی ذہن کو بہت سے تضادات سے نجات دلاتا ہے۔ اس سے انسانوں کو بہت سے سوالوں کے بنے بنائے جواب مل جاتے ہیں اور انہیں اپنے مسائل پر غور کرکے حل تلاش نہیں کرنے پڑتے اس طرح بہت سے انسان اس نظام میں ایک گوشہ عافیت اور سکون محسوس کرتے ہیں۔

جب میں ان عقائد کو سراب کہہ کر پکارتا ہوں تو میرے خیال میں مجھے اپنے سراب کے تصور کی توضیح کرنی چاہیئے۔ سراب سے میری مراد غلط نتیجہ نہیں ہے جس کی ایک مثال یہ ہو سکتی ہے کہ اگلے زمانے کے طبیب یہ سمجھتے تھے کہ ٹیبز ڈورسیلیز (Tabes dorsalis) کی بیماری جنسی بے راہ روی کی وجہ سے ہوتی ہے۔ بعض کم فہم لوگ تو آج بھی اس پر یقین رکھتے ہیں لیکن آپ ہم جانتے ہیں کہ وہ تصور غلط تھا۔ میری نگاہ میں سراب کی مثال کولمبس کا امریکہ پہنچ کر یہ کہنا تھا کہ اس نے ہندوستان تلاش کر لیا ہے۔ اسے ہندوستان پہنچنے کی اتنی خواہش تھی کہ اس خواہش کی شدت نے اسے غلط نتائج پر پہنچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس قسم کے سراب کی دوسری مثال بعض ماہرین نفسیات کا یہ تصور ہے کہ بچوں میں جنسی جذبات موجود نہیں ہوتے۔

سراب انسانی خواہشات کی شدت کا مرہون منت ہوتا ہے اور اس حوالے سے وہ نفسیاتی مریضوں کی جنونی کیفیت اور مصنوعی ایمان (Delusions) کے قریب ہوتا ہے۔ مریضوں کے مصنوعی ایمان کو تو ہم منطق کی رو سے غلط ثابت کر سکتے ہیں لیکن اس نفسیاتی سراب کو غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

اگر ایک درمیانے درجے کی پردہ دہ لڑکی یہ باور کرلے کہ ایک دن ایک امیر شہزادہ آ کر اس سے شادی کرے تو ایسا ممکن ہو سکتا ہے اور بعض دفعہ ایسا ہوا بھی ہے لیکن عیسیٰ کا زمین پر واپس آکر اس دنیا کو جنت بنانا بعید از قیاس ہے اور اس کا بالکل امکان نہیں چاہے ہم اس یقین کو سراب کہیں یا دیوانگی کا حصہ یہ ہمارے نقطۂ نظر پر منحصر ہے۔ مسیحا کے دوبارہ آنے کا یقین کسی لوہار کے اس ایمان سے مختلف نہیں کہ ایک دن اس کا سارا لوہا سونے میں منتقل ہو جائے گا۔ سراب کا تعلق حقیقت سے کم اور انسانی خواہشات سے زیادہ ہے۔

مذہبی عقائد کی بدقسمتی یہ رہی ہے کہ ہم ان میں سے کسی ایک کو بھی سچا ثابت نہیں کر سکتے نہ صرف یہ کہ سچا ثابت نہیں کر سکتے بلکہ ہم نے صدیوں کی محنت اور ریاضت سے جو علم حاصل کیا ہے اور انسان اور کائنات کے بارے میں جن حقیقتوں کا سراغ لگایا ہے وہ عقائد ان سے بالکل لگا نہیں کھاتے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر ہم ان عقائد کو صحیح ثابت نہیں کر سکتے تو غلط ثابت بھی کر سکتے۔ کائنات کے راز آہستہ آہستہ ان لوگوں پر منکشف ہوتے ہیں جو ان کے بارے میں تفکر اور تحقیق کرتے رہتے ہیں۔ آج بھی زندگی اور کائنات کے بارے میں سائنس بہت سے سوالوں کے جواب نہیں دے سکتی لیکن سائنسی نقطۂ نظر وہ واحد معتبر طریقہ ہے جس سے ہم زندگی اور کائنات کے بارے میں حقائق اور بصیرتیں حاصل کر سکیں گے۔ ایسی بصیرتیں جن پر انسان متفق ہو سکیں۔ ہم اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر ایسی صداقتیں تلاش نہیں کر سکتے جن پر سب لوگ متفق ہوں اپنے من کی گہرائیوں میں اتر کر ہم صرف اپنی شخصیت اور ذہن کے بارے میں جان سکتے ہیں۔

ہماری گفتگو کے اس موڑ پر کوئی کہہ سکتا ہے "اچھا اگر مذہبی عقائد عقل اور دلیل سے ثابت نہیں ہو سکتے تو ان پر ایمان لانے میں کیا قباحت ہے ان عقائد کی نہ صرف روایات طرفداری کرتی ہیں بلکہ ان سے بہت سے دکھی اور غمزدہ دلوں کو ڈھارس بھی ملتی ہے"۔

اس سلسلے میں میں صرف یہی کہہ سکتا ہوں کہ جس طرح ہم کسی شخص کو کسی بات یا عقیدے پر ایمان لانے پر مجبور نہیں کر سکتے اس طرح ہم کسی کو ایمان نہ لانے پر بھی مجبور نہیں کر سکتے لیکن اب ہم اس قسم کی باتوں سے دھوکہ نہ کھائیں گے اور اپنی ناقدانہ سوچ کو معطل نہ کریں گے۔ جہالت بہرحال جہالت ہے چاہے اس کے حق میں کتنے ہی بچکانہ دلائل کیوں نہ پیش کیے جائیں۔ زندگی کے کسی اور شعبے میں کوئی شخص ایسی کمزور بنیادوں پر اپنی زندگی کے فیصلے نہ

کرے گا لیکن مذہبی عقائد اور معاملات میں انسان اپنی عقل اور سمجھ بوجھ کو پیچھے چھوڑ آتے ہیں۔ مذہبی عقائد کی بحث میں لوگ ہر قسم کی حقائق سے چشم پوشی اور بے ایمانی روا رکھتے ہیں اور الفاظ کے وہ معانی نکالتے ہیں جو بعید از قیاس ہوتے ہیں۔ مذہبی لوگ خدا کا ایک ایسا تجریدی تصور پیش کرتے ہیں جنہیں انھوں نے اپنے ذہنوں میں تخلیق کیا ہوتا ہے اور پھر مصر ہوتے ہیں کہ انھوں نے حقیقت پالی ہے۔ اصحاب فکر جانتے ہیں کہ ایسا تصور انسان کی اپنی بے بسی اور مجبوری کے احساس کا نتیجہ ہے لیکن یہی بے حسی اور مجبوری کی زمین خدا اور مذہب کے تصورات کے لیے بہت زرخیز ثابت ہوتی ہے۔

مذہبی عقائد کی حقیقت کی جانچ پڑتال میرے مضموں کا موضوع نہیں۔ میرا مقصد ایسے عقائد کی نفسیاتی توجیح پیش کرنا ہے اور یہ ثابت کرنا ہے کہ ان کی حیثیت سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

دلچسپ سوال یہ ہے کہ وہ کون لوگ تھے جنہوں نے ایسے عقائد کو جنم دیا۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ زندگی اور کائنات کا غیر منصفانہ نظام دیکھ کر انسان خواہش کریں کہ کاش ایک ایسا خدا ہو جو زندگی میں انصاف نافذ کرے اور اگر اس دنیا میں نہیں تو اگلی دنیا میں انصاف کی فضا قائم کرے لیکن یہ خیال ایک خواہش سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ کاش ہمارے آباؤاجداد نے اپنے مذہبی عقائد میں پناہ لینے کی بجائے زندگی کی تلخ حقیقتوں کو قبول کرنے اور کائنات کے پیچیدہ مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی ہوتی۔

مذہبی عقائد کو سراب کہنے کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

کیا انسانی تہذیب اور ثقافت کے بارے میں ہمارے دیگر نظریات بھی سراب نہیں ہیں؟ ہماری سیاسی اور رومانوی زندگیوں کی بنیاد جن نظریات پر ہے کیا وہ بھی سراب نہیں ہیں؟

اور

کیا یہ نظریہ کہ ہم زندگی اور کائنات کی حقیقتوں کی تفہیم اور ادراک سائنس کے علم کے ذریعے کر سکتے ہیں بذات خود ایک سراب نہیں ہے؟

میرا خیال ہے کہ ہمیں ان سب اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیئے عین ممکن ہے کہ ایسی سوچ مذہبی عقائد کو سراب ثابت کرنے میں ممد ثابت ہو۔ لیکن موجودہ مضمون میں میں اپنی توجہ صرف مذہبی عقائد پر مرکوز کروں گا۔

میری گفتگو کے اس مرحلے پر مجھ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ "آثار قدیمہ کی کھدائی اور تحقیق کا عمل خوب سہی لیکن کوئی بھی محقق کسی ایسی کھدائی کے عمل میں شریک نہ ہوگا جس کے نتیجے میں قریبی شہر کے لوگوں کا ان گہرائیوں میں گر کر مر جانے کا اور ان کے کھنڈرات کا ان کے

قبریں بن جانے کا خطرہ ہو۔
ہم مذہبی عقائد کے بارے میں زندگی کے باقی نظریات کی طرح بحث نہیں کر سکتے انسانی تہذیب اور ثقافت کی عمارت ان بنیادوں پر استوار ہے اور اس عمارت کا قیام اس بات پر منحصر ہے کہ عوام کی اکثریت ان عقائد پر ایمان لائے۔
اگر انسانوں کو یہ درس دیا گیا کہ
نہ تو کوئی طاقتور اور منصف خدا اور نہ ہی کوئی روحانی دنیا موجود ہے اور نہ ہی موت کے بعد زندگی کی کوئی حقیقت ہے تو۔
وہ تہذیب کی سب روایات، اقدار اور قوانین کو ماننے سے انکار کر دیں گے ہر شخص خودغرضانہ زندگی گزارنا شروع کر دے گا۔
طاقت کا ناجائز استعمال ہو گا
ظلم اور جبر کا دور دورہ ہو گا
معاشرے میں بدامنی پھیل جائے گی اور
انسانی تہذیب کے ارتقا کا ہزاروں سالوں کا کام نیست و نابود ہو جائے گا۔
اگر ہم پر یہ حقیقت آشکارا ہو بھی جائے کہ مذہب کے دامن میں سچائیاں نہیں ہیں تب بھی ہمیں اس حقیقت کو عوام سے چھپا کر رکھنا چاہیئے کیونکہ اسی میں انسانیت کی بقا ہے اگر ہم نے عوام سے ان کے عقائد چھین لیے تو بڑا ظلم ہو گا ان گنت لوگ انہی بیساکھیوں کے سہارے زندگی گزارتے ہیں۔
ہم سب جانتے ہیں کہ سائنس نے آج تک کوئی بڑے کارنامے سرانجام نہیں دیے اور اگر اس نے کارنامے سرانجام دیے بھی ہوتے تب بھی وہ انسان کی ساری ضروریات کو پورا کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ انسان کی بہت سی نفسیاتی اور جذباتی ضروریات کا سائنس کے پاس کوئی علاج نہیں اور حیرانی کی بات یہ ہے کہ وہ ماہرِ نفسیات جو ساری عمر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ انسانی اعمال اور زندگی کے محرکات کا تعلق عقل سے کم اور جبلتوں اور خواہشات سے زیادہ ہے آج انسانیت کو ان کے جبلی اور جذباتی خواہشات کی تسکین سے روک رہا ہے اور انہیں عقل کا ایسا درس دے رہا ہے جو انسانی تہذیب کی بقا کے لیے نہایت مضر ہے۔
اگرچہ اس اعتراض پر میرے موقف اور نقطۂ نظر پر بہت سے حملے کیے گئے ہیں لیکن میں انکا جواب دینے کو تو تیار ہوں۔ میری نگاہ میں انسانی تہذیب اور ارتقا کے لیے ان مذہبی عقائد پر ایمان لانا نہ لانے سے زیادہ خطرناک ہے۔
جب میں اپنے موقف کے حق میں دلائل پیش کرتا ہوں تو مجھے اس حقیقت کا احساس ہوتا ہے کہ مذہبی عقائد رکھنے والے شخص پر ان دلائل کا کوئی اثر نہ ہو گا اور وہ میرے خیالات کی وجہ

سے اپنے ایمان کو خیرباد نہ کہے گا۔ مجھے اس بات کا بھی احساس ہے کہ میں نے کوئی ایسی بات نہیں کہی جو مجھ سے پہلے اصحاب فکر و نظر نے نہ کہی ہو۔ میں نے صرف ان کے دلائل اور اعتراضات کو نفسیاتی بنیادیں فراہم کی ہیں۔ کوئی مجھ سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ اگر میرے دلائل سے لوگوں کے ایمان میں فرق نہ آئے گا تو پھر مجھے اتنی محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے میں اس سوال کا بعد میں جواب دوں گا۔

میری اس تحریر سے اگر کسی شخص کو نقصان پہنچ سکتا ہے تو وہ خود میری اپنی ذات ہے۔ لوگ مجھ پر تنگ نظری، سطحی پن اور انسانیت کی اعلیٰ اقدار کی مخالفت کرنے کے اعتراضات کر سکتے ہیں لیکن میرے لیے ایسے اعتراضات کوئی نئی بات نہیں۔ مجھ جیسا شخص جس نے جوانی میں بھی اپنے ہم عصروں کی تنقید اور توصیف سے بے نیاز ہو کر اپنا کام شروع کیا تھا وہ بڑھاپے میں کہاں قلم روک سکتا ہے ایک وہ زمانہ تھا جب اگر کوئی خدا یا مذہبی عقائد پر اعتراض کرتا تو اس کا دائرہ حیات تنگ کر دیا جاتا لیکن اب زمانہ بدل گیا ہے اب ایسی تحریریں نہ تو مصنف اور نہ ہی قارئین کو نقصان پہنچاتی ہیں زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا ہے کہ اس کتاب کی طباعت، ترجمے اور تقسیم پر بعض ممالک میں پابندی لگادی جائے اور وہ صرف وہی ممالک ہوں گے جنہیں اپنے نظریات اور عقائد پر بڑا گھمنڈ ہوگا اگر کوئی شخص اپنی قسمت کو قبول کرنے کے لیے تیار ہو تو اسے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہونا چاہیئے۔

اس تحریر سے ایک اور نقصان ہو سکتا ہے اور وہ نقصان ذاتی نہیں بلکہ تحلیل نفسی کے نطقہ نظر اور تحریک کو ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ تحلیل نفسی کا مکتبہ فکر میری تخلیق ہے اور اب تک وہ بہت سے اعتراضات اور حملے سہہ چکا ہے۔ میری موجودہ تحریر سے میرے مخالفین تحلیل نفسی کو نشانہ بدف بنا سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں "ہم نہ کہتے تھے کہ تحلیل نفسی ایک نقصان دہ نظریہ ہے اب اس کا نقاب گر گیا ہے اور واضح ہو گیا ہے کہ تحلیل نفسی کے در پردہ دہریت کا پرچار ہو تا رہا ہے اور اخلاقی اقدار سے نجات پانے کا درس دیا جاتا رہا ہے اب ہمارے سب شبہات یقین میں بدل گئے ہیں"

اس قسم کا اعتراض میرے لیے نہایت تکلیف دہ ہوگا کیونکہ میرے تحلیل نفسی کے کئی رفقا کار میرے مذہب کے بارے میں نظریات سے اتفاق نہیں کرتے لیکن مجھے امید ہے کہ اس قسم کے اعتراضات سے تحلیل نفسی کے مکتبہ فکر کو نقصان نہیں پہنچے گا کیونکہ اس سے پہلے بھی وہ بہت سے طوفانوں کا سامنا کر چکا ہے اور وہ اس طوفان کا بھی دلیرانہ طور پر مقابلہ کرے گا۔

میری نگاہ میں تحلیل نفسی ریاض کی کیلکولس (Calculus) کی طرح ایک غیر جانبدارانہ طریقہ کار کا نام ہے۔ اگر ایک ماہر طبیعات اپنی کیلکولس کی تحقیق سے اس نتیجے پر پہنچے کہ عنقریب کرہ ارض تباہ ہونے والا ہے تو کیا وہ اس نتیجے کا الزام ریاضی کے سر لگائے گا۔ میں نے

مذہبی عقاید کے بارے میں جو کچھ کہا ہے اس نقطہ نظر کو مجھ سے اور تحلیل نفسی کی پیدائش سے پیشتر بھی پیش کیا جاچکا ہے ۔ تحلیل نفسی کے علم نے صرف اس نقطہ نظر کو چند نفسیاتی دلائل پیش کیے ہیں اور مذہبی عقائد کی سچائیوں کا تجزیہ کیا ہے ۔ میرا کوئی مخالف تحلیل نفسی کو اپنے عقائد کو سچ ثابت کرنے کے لیے بھی استعمال کر سکتا ہے ۔

مجھے اس حقیقت کو قبول کرنے میں کوئی عار نہیں کہ مذہب نے انسانی معاشرے اور تہذیب کے ارتقا میں گرانقدر خدمات سے سرانجام دی ہیں ۔ اس نے انسانی جبلتوں پر پابندیاں عاید کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے ۔ میرا صرف یہ کہنا ہے کہ مذہب کی ایک صحتمندانہ اور منصفانہ معاشرہ قائم کرنے کی کوششیں پوری طرح کامیاب نہیں ہوئیں ۔ مذہب نے انسانی معاشروں پر ہزاروں سالوں سے حکمرانی کی ہے اسے اپنے نتائج پیدا کرنے کا پورا پورا موقع ملا ہے ۔ اگر اس نے بنی نوع انسان کو خوشیاں اور سکون اور ایک اعلیٰ زندگی دی ہوتی تو کوئی بھی اس پر معترض نہ ہوتا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان گنت انسان دکھی زندگی گزار رہے ہیں ۔ اب لوگ زندگی کے اس موڑ پر آگئے ہیں کہ یا تو وہ تہذیب کو بالکل بدل کر رکھ دیں گے اور یا اپنے دلوں میں مذہب اور تہذیب کے خلاف غصے اور نفرت کے طوفان لیے لیے پھریں گے ۔

بعض لوگ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کو معاشرے کو بدلنے کا پورا موقع نہیں ملا کیونکہ سائنس اس کی راہ میں روڑے اٹکاتی رہی ہے لیکن میرے خیال میں یہ دلیل نہایت کمزور ہے ۔ اگر آج مذہب کی بنیادیں ہل چکی ہیں تو ہم ان دنوں کا بھی تصور کر سکتے ہیں جب مذہب کو معاشرے پر پورا اختیار حاصل تھا ۔ اس دور میں بھی انسانی زندگی مصائب اور آلام اور ناانصافیوں سے پر تھی ۔ اس دور میں بھی انسان گناہ کرتے تھے اور پادری انہیں یا تو گناہوں کی سزا دیتے تھے یا توبہ استغفار کرنے کو کہتے تھے ۔ بعض روسی ماہرین کا تو کہنا ہے کہ اگر خدا کی بخشیش انسان کے کثرت سے گناہ کرنے پر منحصر ہیں تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو انسان کا گناہ کرنا اچھا لگتا ہے ۔ صدیوں سے پادری اپنی ہوس اور طاقت کے نشے میں گناہگاروں کو معاف کرتے رہے ہیں تاکہ وہ مذہب کا دائرہ چھوڑ کر باہر نہ چلے جائیں وہ یہی کہتے رہے خدا نیک اور طاقتور ہے جبکہ انسان کمزور اور گناہگار ہے اس صورت حال نے انسانی معاشرے میں اچھائی کی کوئی صورت پیدا نہ کی ۔

اگر ہم اپنے دور کے معاشرتی حالات کا تجزیہ کریں تو ہمیں احساس ہوگا کہ یورپ کی تہذیب پر عیسائیت کا اثر کم ہونے کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ لوگوں کا مذہب سے اعتبار اٹھتا جارہا ہے اور معاشرے کے اعلیٰ طبقوں میں سائنسی نقطۂ نظر مقبول ہورہا ہے ۔ مذہبی کتابوں اور اعتقادات کو جب تنقید اور سائنس کی نگاہ سے دیکھا جائے تو ان میں بہت سی کوتاہیاں اور خامیاں دکھائی دیتی ہیں اور مذہبی اعتقادات اور غیر مہذب قوتوں (Primitive Peoples) کی سوچ میں بہت سی مماثلتیں نظر آتی ہیں ۔

سائنس ہمیں زندگی اور کائنات کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھنے پر اکساتی ہے جوں جوں سائنسی رجحانات رکھنے والوں کی تعداد بڑھتی جارہی ہے توں توں مذہبی عقائد پر ایمان رکھنے والوں کی تعداد میں کمی آتی جارہی ہے۔

انسانی تہذیب کو تعلیم یافتہ اور اصحاب فکر لوگوں سے کوئی خطرہ نہیں انھوں نے آہستہ آہستہ مذہبی عقائد اور روایات کو سیکولر نظریات سے بدلنا شروع کر دیا ہے اور انسانی تہذیب کے ارتقا میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ان کے مقابلے میں انسانی تہذیب کو غیر تعلیم یافتہ اور مجبور و معتوب عوام سے زیادہ خطرہ ہے۔جب تک وہ یہ نہ جانیں کہ لوگوں نے خدا پر ایمان لانا چھوڑ دیا ہے،ہم عافیت میں ہیں لیکن جلد یا بدیر انہیں اس حقیقت کی خبر ہو جائے گی۔المیہ ہے کہ وہ سائنسی سوچ کے نتائج کو تو قبول کر لیں گے لیکن اپنے اندر وہ تبدیلی پیدا نہ کریں گے جو سائنس نقطہ نظر رکھنے والوں کو اپنے اندر پیدا کرنی پڑتی ہے۔

اگر کسی دوسرے انسان کو قتل نہ کرنے کا واحد جواز یہ ہے کہ اسے خدا نے منع کیا ہے اور اگر کسی انسان کو یہ پتہ چل جائے کہ نہ تو خدا ہے اور نہ ہی اسے مرنے کے بعد اس کی سزا ملے گی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کا قتل شروع کر دے اگر ایسا ہے تو پھر تو واقعی عوام کو ذہنی طور پر بیدار نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ انسانے کا مستقبل خطرے میں پڑ جائے گا ورنہ مذہب اور تہذیب کے رشتے میں ایک انقلاب پیدا ہوگا۔

میرے خیال میں مذہبی عقائد کی عمارت کے ڈھے جانے سے انسانیت کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا لیکن بعض لوگ ایسے ہیں جو اس خیال سے ہی گھبرا اٹھتے ہیں انہیں ڈر ہے کہ اس عمل سے انسانی تہذیب بحران کا شکار ہو جائے گی مجھے اس موقع پر آٹھویں صدی عیسوی کے سینٹ بونیفس (St. Bonifiec) کا واقعہ یاد آتا ہے جس نے جب گاؤں کے ایک مقدس درخت کو کاٹا تو لوگ خوفزدہ تھے کہ ان پر کوئی قیامت ٹوٹے گی لیکن اس واقعہ کے بعد نہ تو کوئی عذاب آیا اور نہ ہی لوگوں کی جانیں خطرے میں پڑیں۔

جب انسانی معاشرے اور تہذیب نے یہ قانون وضع کیا کہ کسی انسان کو اپنے ہمسایہ کو قتل کرنے کی یا اس کی جائداد پر ناجائز قبضہ کرنے کی اجازت نہیں تو اس قانون کا مقصد ایک صحتمند اور منصفانہ معاشرے کا قیام تھا کیونکہ قتل کے بعد قاتل کو مقتول کے دوست احباب کے بدلہ لینے کے جذبے کا سامنا کرنا پڑتا اور دوسرے لوگ اس سے حسد کرتے کیونکہ اس نے ان کے وحشی جذبات کو عملی جامہ پہنادیا تھا اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ جلد یا بدیر وہ خود بھی کسی کے ہاتھوں قتل کر دیا جاتا۔اگر وہ کسی ایک دشمن سے بچ بھی جاتا تو کمزور عوام مل کر اسے نیست و نابود کر دیتے۔اگر ایسا نہ بھی ہوتا تب بھی قتل و غارت کا بازار گرم ہو جانے سے معاشرے کا امن اور سکون درہم برہم ہو جاتا اور ہم ایک ایسے معاشرے میں ایک دفعہ پھر داخل ہو جاتے جہاں کسی کی

جان، مال اور خاندان محفوظ نہ رہتے۔ اس وقت ہم معاشرے کے ارتقا میں اس مقام تک آ گئے ہیں کہ دنیا میں قوموں کی جنگوں اور قتل و غارت کے علاوہ روزمرہ زندگی میں انسانی قتل کو قبول نہیں کیا جاتا۔ اگر کوئی شخص قتل کا مرتکب ہو تو معاشرہ اجتماعی طور پر اس کی سزا کا فیصلہ کرتا ہے اس طرح معاشرے میں انصاف کا بول بالا رہتا ہے۔

لیکن جب ہم قتل کی ممانعت کی بات کرتے ہیں تو اس قسم کی منطقی دلیل پیش نہیں کرتے اور یہ نہیں کہتے کہ منصفانہ معاشرے کے قیام کے لیے قتل پر پابندی ضروری ہے بلکہ کہتے ہیں کہ یہ خدا کا حکم ہے اور پھر یہ سوچتے ہیں کہ آخر خدا نے ایسا حکم کیوں دیا ہے۔ اس طرح ہم قتل نہ کرنے کے حکم کو مقدس بناتے ہیں اور اس پر عمل کرنے کے تصور کو خدا پر ایمان لانے کے تصور سے جوڑ دیتے ہیں اگر ہم اس درمیانی کڑی سے نجات حاصل کریں اور قتل نہ کرنے کے لیے مذہبی جواز کی بجائے معاشرتی جواز پیش کریں تو ہم ارتقا کے سفر کو ایک قدم آگے بڑھائیں گے اور انسانی مسائل کے حل کے لیے خدا کی مرضی کو تلاش نہ کرتے پھریں گے کیونکہ مذاہب کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف قوموں اور مختلف مذاہب میں خدا کی مرضی کو مختلف ہی نہیں متضاد انداز میں بھی پیش کیا گیا ہے اور کسی انسان کے لیے ان کی صحت کی جانچ پڑتال کرنا ناممکن ہے۔ اگر ہم انسانی زندگی کے معقول اور منصفانہ قوانین آپس کے مشورے سے چاہے وہ پارلیمنٹ اور چاہے وہ قانون دانوں کے حوالے سے ہوں تلاش کرنے میں کامیاب ہو سکیں تو ہمیں اس عمل میں خدا، مذہب اور آسمانی کتابوں کو لانے کی کیا ضرورت ہے میرا خیال ہے کہ وہ وقت آگیا ہے کہ ہم اس مصنوعی تقدس سے نجات حاصل کریں اور اس بات کا اقرار کریں کہ انسانی معاشرے کے قیام اور ارتقا کے لیے ہمیں خداؤں کی ضرورت نہیں رہی۔ اب انسان اجتماعی طور پر وہ قوانین خود بنا سکتے ہیں۔ ایسا کرنے سے وہ قوانین آسمانوں سے اتر کر زمین پر آجائیں گے ان میں حالات اور انسانی معاشرے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ تبدیلیاں بھی لائی جا سکیں گی اور وہ حقیقت پسندانہ بھی ہوں گے۔ ایسا کرنے سے عوام کا ان قوانین کے بارے میں رویہ بھی ہمدردانہ اور دوستانہ ہوگا اور وہ ان کے خلاف اس غصے، تلخی اور نفرت کا اظہار بھی نہ کریں گے جو وہ آسمانی قوانین کے بارے میں کرتے ہیں۔ انہیں اندازہ ہوگا کہ وہ قوانین ان کے اپنے بنائے ہوئے ہیں اور ان میں ان کی اپنی بہتری مضمر ہے۔ اس طرح انسانی تہذیب کا ارتقا نئے خطوط پر استوار ہونا شروع ہو جائے گا۔ لیکن جب ہم انسانی معاشرے کے قوانین کی عقلی اور معاشرتی ضرورت کی دلیل پیش کرتے ہیں تو بہت سے لوگ ہمیں شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسانی قتل کی ممانعت کے قانون کا تاریخی جواز درست ہے؟ میرا خیال ہے کہ نہیں۔ مجھے یہ ایک جذباتی مسئلے کا عقلی حل نظر آتا ہے جسے ہم تحلیل نفسی کی زبان میں ریشنلائزیشن (Ratiunaization) کہتے ہیں جو جذباتی مسائل پر عقل کا پردہ ڈالتا

ہے۔ ہم تحلیل نفسی کے علم سے یہ بخوبی جانتے ہیں کہ جب کسی انسان میں کسی کام کرنے کی شدید خواہش ہوتی ہے تو وہ اس کے حق میں عقلی دلائل پیش کرتا ہے۔ ایسے دلائل جنکا اس کام سے کوئی حقیقی تعلق نہیں ہوتا پرانے زمانے کے انسان میں اپنے جابر باپ کے خلاف اتنا غصہ پیدا ہو جاتا تھا کہ بعض دفعہ اس کے دل میں اپنے باپ کو قتل کرنے کے جذبات ابھرتے تھے۔ ان جذبات پر قابو پانے کے لیے معاشرے نے باپ کے قتل کی ممانعت کا قانون پاس کیا لیکن آہستہ آہستہ وہ قانون صرف باپ کے قتل کے لیے ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کے قتل کے لیے استعمال ہونے لگا

ہم پر انسانی تاریخ کے تجزیے سے واضح ہوا ہے کہ خدا کا تصور بھی باپ کے تصور کا رہین منت ہے۔ اس لئے یہ کہا جا سکتا ہے کہ قتل نہ کرنے کا قانون صرف معاشرتی ضرورت کے تحت وجود میں نہیں آیا بلکہ مذہبی عقائد کے مطابق یہ خدا کا حکم بھی ہے اور یہ عقیدہ تاریخی حقیقت کا بھی اظہار کرتا ہے کہ ہمارا منطقی استدلال معاشرتی ضرورت کا تو اقرار کرتا ہے خدا کی اہمیت کو نہیں مانتا۔

اب ہم مذہبی عقائد کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ وہ عقائد صرف انسانی خواہشات کا بھی اظہار نہیں کرتے بلکہ وہ تاریخی یادداشتوں کی بھی ترجمانی کرتے ہیں اس طرح مذہبی عقائد کو حال اور ماضی دونوں قسم کے محرکات طاقتور بناتے ہیں۔ ہم انسانی تاریخ اور تہذیب کے ارتقا کا انسانی بچے کی نشوونما سے موازنہ کر سکتے ہیں۔ ہمیں تحلیل نفسی کے علم نے بتایا کہ بچہ بلوغت کے زینوں کو عبور کرتے ہوئے ایک نفسیاتی طور پر غیر صحتمند نیوروٹک ( ) Neurotic دور سے بھی گزرتا ہے جس میں اسے اپنی جبلی خواہشات کو دبانا پڑتا ہے کیوں کہ اس کا ذہن ان پابندیوں کو عقلی طور پر نہیں سمجھ سکتا اور کچھ عرصے کے بعد ان خواہشات کو لاشعور میں پناہ لینی پڑتی ہے۔ اکثر بچوں میں وہ نفسیاتی گرہیں آہستہ آہستہ وقت کے ساتھ ساتھ خود ہی کھل جاتی ہیں اور جوانی تک پہنچتے پہنچتے وہ بچے ان مسائل کا صحتمند حل تلاش کر لیتے ہیں اور وہ نوجوان جو اس دباؤ سے نفسیاتی مسائل کا شکار ہو جاتے ہیں وہ تحلیل نفسی کے علاج سے ایک صحتمند زندگی گزارنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔

ایک انسان کے جذباتی اور ذہنی مدارج کی طرح پوری انسانیت بھی ارتقا کے مدارج سے گزر رہی ہے اور وہ اپنی جہالت، کم عقلی اور بہت سے مسائل کو لاشعور میں دبا رکھنے کی وجہ سے نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہو گئی ہے۔ انہی الجھنوں میں مذہبی عقائد بھی شامل ہیں جنہیں انسان آج تک گلے سے لگائے ہوئے ہیں اس لئے ہم مذہب کو انسانیت کا عالمی نفسیاتی مسئلہ کہہ سکتے ہیں۔
(Universal obsessional neurosis of Humanism)
بچوں کے نفسیاتی مسائل کی طرح اس کی جڑیں بھی اوڈی پس کمپلکس (Oedious)

complex اور بچے کے باپ کے ساتھ تضادات تک پھیلی ہوئی ہیں اور جس طرح بچوں کو جوانی تک پہنچنے کے لئے ان مسائل اور الجھنوں کو پیچھے چھوڑنا پڑتا ہے اسی طرح انسانیت کو بھی بلوغت تک پہنچنے کے لئے مذہبی عقائد کو پیچھے چھوڑنا ہوگا۔ جس طرح ایک مشفق استاد بچوں کی تربیت میں ان کے بلوغت کے سفر میں ان کا ممد ثابت ہوتا ہے اسی طرح ہمیں بھی ان انسانوں سے جو ان عقائد سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کر رہے ہیں، ہمدردی سے پیش آنا چاہیئے اور ان کی حوصلہ افزائی کرنی چاہئے۔

جب ہم مذہبی عقائد کی تاریخ سے واقف ہوتے ہیں تو ہمارے دلوں میں ان کی قدر بڑھ جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہمیں بلوغت کے سفر کو ترک کر کے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے سینے سے لگائے رکھنا چاہیئے۔ تاریخ کے مطالعہ نے ہم پر یہ بھی اجاگر کیا ہے کہ ان عقائد پر ایمان لانے میں لاشعوری محرکات نے اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ مرحلہ آگیا ہے کہ ہم ان لاشعوری عوامل کی بجائے اپنے شعور اور عقل پر زیادہ انحصار کریں جس طرح ایک ذہنی مریض اپنی الجھنوں کی تفہیم کے بعد اپنا نقطہ نظر اور لائحہ عمل بدلتا ہے اور زندگی کے فیصلے عقل و دانش کی بنیادوں پر کرتا ہے میری نگاہ میں یہ قدم انسانی تہذیب کے ارتقا کے اگلے مرحلے کے لئے راہ ہموار کرے گا اور اس کے لئے مدلل اور معقول بنیادیں فراہم کرے گا۔ مذہبی عقائد اور نظریات صدیوں کے سفر کے بعد اتنا گرد و غبار سے اٹ گئے ہیں کہ ان میں سے حق اور سچ تلاش کرنا مشکل ہو گیا ہے۔ یہ اس طرح ہے کہ جب بچے پوچھتے ہیں کہ نوزائیدہ کہاں سے آتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ وہ آسمانوں سے اترتے ہیں اور انہیں پرندے لے کر آتے ہیں۔ ہم بچوں سے تشبیہوں اور استعاروں کی زبان میں بات کرتے ہیں لیکن بچے ان تشبیہوں اور استعاروں کو حقیقت سمجھ لیتے ہیں اور بڑے ہو کر جب انہیں اصل حقیقت کا ادراک ہوتا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ انہیں والدین نے دھوکہ دیا تھا۔ اب ہم جان گئے ہیں کہ بچوں سے استعاراتی زبان میں بات کرنے سے یہ بہتر ہے کہ ہم ان کی عقل کے مطابق انہیں زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں بتائیں یہی صورت حال مذہبی عقاید کو ماننے والے انسانوں کی بھی ہے۔

گفتگو کے اس مرحلے پر کوئی معترض کہہ سکتا ہے

"آپ کی باتیں مجموعہ تضادات ہیں۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ آپ کی تحریر بے ضرر ہے اور آپ کے دلائل سے کوئی اپنا ایمان نہ چھوڑے گا لیکن دوسری طرف یہ بھی واضح ہے کہ آپ کی تحریر لوگوں کے دلوں میں اپنے عقاید کے بارے میں شکوک کھڑے کر رہی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسی تحریر کو چھپوانے کا مقصد کیا ہے؟"

آپ نے اس بات کا بھی اقرار کیا ہے کہ بعض لوگوں کے لئے یہ تصور کہ لوگ خدا پر ایمان نہیں لاتے بہت خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اور وہ سب زنجیروں اور پابندیوں کو توڑ کر شتر

بے مہار کی طرح زندگی شروع کر سکتے ہیں۔ آپ کے یہ کہنے سے کہ اخلاقیات اور قوانین کی عمارت کو مذہبی عقاید پر استوار کرنا تہذیب کے لئے مضر ہے، عین ممکن ہے کہ لوگ مذہب کو بالکل ہی چھوڑ دیں۔

آپ کی گفتگو میں ایک اور تضاد بھی ہے۔ ایک طرف تو آپ کہتے ہیں کہ انسانی زندگی عقل کی نسبت جذبات اور جبلتوں کی مرہون منت ہے تو دوسری طرف آپ یہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ انسانوں کو اپنی زندگیوں کے فیصلے جذبات کی بجائے عقل و شعور کے حوالے سے کرنے چاہئیں۔

آپ کی گفتگو سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ آپ نے تاریخ سے کچھ نہیں سیکھا۔ اس سے پہلے بھی کئی معاشروں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم زندگی کے مسائل کا حل تلاش کرنے میں مذہب کی بجائے عقل اور منطق کو استعمال کریں گے لیکن وہ سب تجربات ناکام ثابت ہوئے۔ انقلاب فرانس اس کی ایک عمدہ مثال ہے۔ وہی تجربہ روس میں دہرایا جا رہا ہے اور ہم بخوبی جانتے ہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا۔ ان تجربوں سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ انسان مذہب کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے

آپ نے مذہب کو انسانیت کا ایک نفسیاتی مسئلہ قرار دیا ہے اور آپ انسانیت کو اس سے نجات دلانا چاہتے ہیں لیکن مذہب سے نجات حاصل کرنے کے عمل میں انسان کتنی قیمتی چیزوں سے محروم ہو جائے گا اس کی طرف آپ نے کوئی توجہ نہیں دی۔"

ان اعتراضات کے جواب میں میں یہ کہوں گا کہ میری گفتگو میں بظاہر تضادات شاید اس لئے نظر آ رہے ہیں کیوں کہ میں نے اپنا مافی الضمیر بڑے اختصار سے پیش کیا ہے۔ اگر میں اپنے خیالات تفصیل سے لکھتا تو شاید میرا موقف واضح ہو جاتا۔ میں اب بھی اصرار کرتا ہوں کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک حوالے سے بے ضرر ہے۔ کوئی بھی ایمان رکھنے والا میرے دلائل کو سن کر اپنا ایمان نہ بدلے گا۔ ایمان رکھنے والا اپنے عقاید سے عقل کی بجائے جذبات سے جڑا ہوتا ہے لیکن ہمارے ارد گرد بہت سے ایسے لوگ ہیں جو مذہبی عقاید کو دل سے تو نہیں مانتے لیکن ان پر اس خوف سے عمل کرتے ہیں کہ اگر انہوں نے انکار کیا تو ان کی زندگیوں کو مشکل بنا دیا جائے گا۔ انہوں نے ان مذہبی روایات کو زندگی کی دیگر تلخ حقیقتوں کی طرح قبول کر رکھا ہے اگر انہیں موقع دیا جائے تو وہ ان عقاید کو پیچھے چھوڑ دیں۔ ایسے لوگ جب یہ دیکھیں گے کہ باقی لوگ مذہب سے خوف زدہ نہیں ہیں تو ان کے دلوں سے بھی مذہب کا خوف ختم ہو جائے گا۔ میری گفتگو کا مخاطب ایسے لوگ ہی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ معاشرے میں اس قسم کی تبدیلی آہستہ آہستہ آتی رہے گی چاہے میری تحریریں چھپیں یا نہ چھپیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسان عقل اور شعور کی بجائے جذبات اور جبلتوں کے غلام

ہیں تو ہم انہیں اس جذباتی تسکین سے کیوں محروم کریں۔ میرا جواب یہ ہے کہ اگر "ایسا ہے" تو کیا "ایسا ہونا چاہیئے" کیا یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے یا صدیوں کی تربیت کا ماحصل ہے۔

اگر ہمیں ماہرین بشریات بتائیں کہ ایک قوم میں بچوں کے سروں پر پیدا ہوتے ہی لوہے کی ٹوپیاں پہنا دی جاتی ہیں تاکہ ان کے سر نہ بڑھ سکیں اور وہ کند ذہن رہ جائیں تو کیا ہم ایسے انسانوں کے جاہل اور کند ذہن ہونے کو انسانی فطرت کا حصہ سمجھیں گے۔ میرے خیال میں انسانوں کا عقل اور شعور کو قبول نہ کرنے کا عمل اس مذہبی تربیت کا حصہ ہے جو انسانوں کو بچپن سے دی جاتی ہے۔ ہم بچوں کو اتنی چھوٹی سی عمر میں خدا، مذہب اور حیات بعد الموت کے بارے میں تصورات سکھاتے ہیں جب ان کی عقل انہیں سمجھنے سے قاصر ہوتی ہے اور وہ انہیں بلا سوچے سمجھے قبول کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

میری نگاہ میں ہم اپنے بچوں کے ساتھ دو طرح کی ناانصافیاں کرتے ہیں۔۔۔ ہم انہیں انسانی زندگی کے جنسی پہلو کی صحیح تعلیم سے محروم رکھتے ہیں اور ہم انہیں مذہب کی غیر ضروری تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ ایسی تربیت سے بچوں کا ذہن اور شخصیت اس حد تک متاثر ہوتے ہیں کہ جوانی کے بعد بھی ان میں سے بہت سے اس تعلیم تربیت کے مضر اثرات سے پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔ وہ ہمیشہ جہنم کی آگ سے ہی ڈرتے رہتے ہیں اور عقل اور شعور استعمال نہیں کرتے۔

اگر ہم اپنی عقل اور فہم و فراست کا پورا استعمال نہ کریں گے تو ہم کیسے امید رکھ سکتے ہیں کہ انسان اپنی بلوغت تک پہنچیں گے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارے معاشرے میں عورتوں پر بچپن سے مردوں سے زیادہ جنسی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اور انہیں جوانی میں ان پابندیوں کے مضر اثرات سے مقابلہ کرنا پڑتا ہے اور اگر کسی انسان کا بچپن جنسی بھی نہیں مذہبی پابندیوں سے داغدار ہو تو اس کے ایک صحتمند زندگی گزارنے کے امکانات اور بھی کم ہو جاتے ہیں۔

عین ممکن ہے کہ میں بھی ایک سراب کا پیچھا کر رہا ہوں۔ عین ممکن ہے کہ مذہبی پابندیاں اتنی نقصان دہ نہ ہوں جتنا کہ میں سمجھ بیٹھا ہوں۔ عین ممکن ہے کہ مذہبی پابندیوں کی غیر موجودگی میں بھی انسان زیادہ عاقل بالغ اور صحتمند نہ ہوں۔

لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں ایک بہتر مستقبل کے خواب دیکھنے چاہئیں اور انہیں شرمندہ تعبیر کرنے کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔ ایسا مستقبل جس میں انسانی بچوں کو مذہب کی غیر ضروری تعلیم نہ دی جائے گی اور وہ اپنی عقل کا پورا پورا استعمال کر سکیں گے۔ اگر ایسا کرنے کے بعد بھی انسانوں نے بہتر زندگی نہ گزاری تو میں مان لوں گا کہ انسان فطری طور پر کمزور عقل رکھتا ہے اور جبلی خواہشات کا غلام ہے۔

میں ایک حوالے سے اپنے معترض سے متفق ہوں۔ میرے خیال میں کسی معاشرے سے مذہب کو طاقت کے زور سے اور ایک ہی جھٹکے سے جدا کرنا کوئی دانشمندانہ قدم نہیں کیونکہ اس

کے نتائج غیر تسلی بخش ہوں گے ۔ اگر ایسا کیا گیا تو وہ ایک ظالمانہ عمل ہو گا ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے ایک شخص جو برسوں سے بے خوابی کا شکار ہو اور رات کو سونے سے پہلے نیند کی گولیاں کھاتا ہو وہ اچانک گولیاں کھانی بند کر دے ۔ مذہبی عقاید بھی بہت سے لوگوں کے لئے نشہ آور ادویہ کی طرح کام کرتے رہے ہیں اور ان کے استعمال پر یکدم پابندی عاید کرنا اپنے علیحدہ مسائل کھڑے کر سکتا ہے ۔

مجھے اپنے معترض کی اس بات سے اختلاف ہے کہ انسان مذہبی سراب کے بغیر زندگی کے مسائل اور حقیقتوں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتے ۔ یہ صرف ان لوگوں کے لئے درست ہو سکتا ہے جو بچپن سے مذہب کے کڑوے میٹھے زہر پی رہے ہوں اور ان کے لئے اس سے نجات پانا ناممکن ہو لیکن وہ لوگ جن کی پرورش صحتمند اور آزاد خیال ماحول میں ہوئی ہو انہیں اس زہر اور اس سراب کی کوئی ضرورت نہیں ۔ وہ زندگی کے حقائق کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکتے ہیں ۔ وہ جانتے ہیں کہ اس بڑے کارخانہ حیات میں ان کی حیثیت کیا ہے ۔ وہ اپنے آپ کو کائنات کا مرکز اور خداؤں کا چہیتا نہیں سمجھتے ۔ وہ جانتے ہیں کہ ایسے خیالات سے بچپنا جھلکتا ہے ۔ انسان بچپن میں اپنے آپ کو والدین کا منظور نظر سمجھتے ہیں لیکن جب وہ بالغ ہو کر زندگی کے تلخ حقائق سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو ان کا رویہ حقیقت پسندانہ ہوتا ہے ۔ وہ جانتے ہیں کہ ایک بالغ اور صحتمند زندگی گزارنے کے لئے اپنے والدین سے آزادی اور خود مختاری حاصل کرنا ان کے لئے بہت اہم ہے ۔

میری اس کتاب کا مقصد انسانوں کی حوصلہ افزائی کرنا ہے تاکہ وہ زندگی میں بلوغت کے زینے پر قدم اٹھا سکیں اور بہتر مستقبل کی طرف سفر جاری رکھ سکیں ۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انسان اس امتحان میں کامیاب نہیں ہو گا لیکن میں ان سے متفق نہیں ۔ کیوں نہ ہم یہ امید رکھیں کہ انسان اس مرحلے کو بھی ماضی کے دیگر مراحل کی طرح خوش اسلوبی سے نبھائے گا ۔ جب انسان کو نئے حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ان کا حل تلاش کر ہی لیتا ہے اور اب تو انسان اکیلا بھی نہیں اب اسے سائنسی علم اور تحقیقات کی مدد بھی حاصل ہے

میری نگاہ میں چاند پر بستیاں آباد کرنے کے خوابوں سے زمین پر ایسا چھوٹا سا باغ لگانا جو ہماری ضروریات کے لئے کافی ہو زیادہ حقیقت پسندانہ عمل ہے ۔ اگر انسانوں نے اگلے جہانوں سے بے جا امیدوں کو چھوڑ کر اسی دنیا میں اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا شروع کیا تو انسانی زندگی میں ایک توازن پیدا ہو گا اور وہ انسانی تہذیب کے ارتقا میں ایک اہم کردار ادا کر سکیں گے ۔

گفتگو کے اس موڑ پر معترض کہہ سکتا ہے

" آپ ایک ایسے معاشرے کی امید لگائے بیٹھے ہیں جس میں لوگ سرابوں سے جی نہ بہلائیں گے اور مذہبی عقاید کو ترک کر کے عقل و دانش سے اپنی زندگی کے فیصلے کریں گے ۔

میری نگاہ میں آپ خود ایک سراب کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اگر آپ خود عقل سے کام لیتے تو ایسی امیدوں سے دستبردار ہو جاتے۔ آپ کی امیدیں آپ کی اپنی خواہشوں کی شدت کی عکاسی کرتی ہیں۔ آپ کو یہ خوش گمانی ہے کہ ہم انسانی معاشرے میں ایسا ماحول پیدا کر سکیں گے جہاں نسل در نسل بچے مذہبی عقاید کے سائے میں پرورش نہ پائیں گے اور جوان ہو کر اپنی جبلتوں اور خواہشات کی بجائے عقل، منطق اور فہم و فراست کو اپنا رہنما بنائیں گے۔ میری نگاہ میں یہ بھی ایک سراب ہے کیوں کہ انسانی فطرت کو بدلنے کی امید رکھنا خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اگر ہم ان قوموں کا مطالعہ کریں جہاں خدا کے تصور کا کوئی وجود نہیں وہاں بھی لوگ عقل سے کام نہیں لیتے۔ اگر آپ یورپی تہذیب سے مذہبی نظام کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں تو آپ کو کسی اور نظام کا سہارا لینا پڑے گا اور آپ حیران ہوں گے کہ وہ نظام بھی مذہبی نظام کی خصوصیات اختیار کرنا شروع کر دے گا کیوں کہ مذہبی نظام کی خصوصیات عوام کی نفسیاتی ضروریات کو پورا کرتی ہیں۔ نیا نظام بھی مذہبی نظام کی طرح لوگوں کی سوچ، جذبات اور زندگیوں پر پابندی لگائے گا تاکہ وہ نظام خوش اسلوبی سے چل سکے۔

آپ اس حقیقت کو تو مانتے ہیں کہ ایک صحتمند معاشرے کے قیام کے لیے انسانوں کی تعلیم و تربیت نہایت ضروری ہے۔ اگر بچوں کی صحیح خطوط پر پرورش نہ کی گئی تو ان میں سے اکثریت گمراہی کا راستہ اختیار کرے گی۔ مذہبی نظام اسی ضرورت کو پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے اور انسانی زندگیوں اور انسانوں کو خاص انداز میں ڈھالتا ہے تاکہ وہ جوان ہو کر ایک ذمہ دار شہری کی ذمہ داریاں قبول کر سکیں۔

انسان بچپن میں اپنا برا بھلا نہیں جانتا۔ وہ اپنی خواہشوں اور جبلتوں پر عمل کرتا ہے اس کا ذہن اتنا تربیت یافتہ نہیں ہوتا کہ وہ زندگی کے مسائل کا معروضی انداز میں جائزہ لے سکے انسان کو بچپن کے چند سالوں میں انسانیت کے ہزاروں سالوں کے اسباق سیکھنے ہوتے ہیں اور اس تعلیم و تربیت اور پرورش میں اس کے بزرگ اس کی رہنمائی کرتے ہیں۔ اس پرورش میں جذباتی محرکات عقلی محرکات کی نسبت زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

میرے خیال میں مذہبی عقائد کے نظام کے دفاع میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اس نظام نے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی تعلیم و تربیت اور ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ چونکہ ہمیں بچوں کی تربیت کے لیے انہیں ایک نظام سے متعارف کرانا ضروری ہے اس لیے میرے خیال میں مذہبی نظام باقی نظاموں سے بہتر ہے اور اگر اس نظام سے انسان کی جذباتی اور نفسیاتی ضروریات بھی پوری ہوتی ہیں تو اس میں خرابی کی کیا بات ہے۔ جس حقیقت کی تلاش کا آپ ذکر کر رہے ہیں وہ نجانے انسان کی بساط میں ہے بھی کہ نہیں چاہے وہ کوئی بھی نظام اختیار کیوں نہ کرے۔

مذہب کا وہ پہلو جو میری نگاہ میں سب سے اہم ہے وہ یہ ہے کہ وہ وحشی انسان کو مہذب انسان بنانے کی کوشش کرتا ہے اور ایسے نظریات بھی پیش کرتا ہے جن کا سائنس سے کوئی تعلق نہیں اگر سائنس ان کی تائید نہیں کرتی تو ان کی تردید بھی نہیں کرتی ایسے نظریات عوام اور خواص کے درمیان ایک پل کا کام کر سکتے ہیں اگر اصحاب فکر و نظر مذہب کے ان حصوں کو قبول کر لیں تو اس سے عوام میں یہ خبر نہیں پھیلے گی کہ خواص نے "خدا پر ایمان لانا چھوڑ دیا ہے"۔

میرے خیال میں آپ کی ایک ایسے نظام کو جو صدیوں سے چلتا چلا آرہا ہے اور لوگوں کو جذباتی تسکین فراہم کرتا ہے ایک ایسے نظام سے بدلنے کی خواہش جس کی نہ تو افادیت ثابت ہو پائی ہے اور نہ ہی وہ جذباتی تسکین فراہم کرتا ہے، بذات خود ایک سراب سے زیادہ کچھ نہیں۔

ان اعتراضات کے جواب میں میں معترض سے کہوں گا کہ مجھے آپ کے اعتراضات پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا کیونکہ عین ممکن ہے کہ میں بھی ایک سراب کا تعاقب کر رہا ہوں لیکن آپ کے رویے اور میرے رویے میں ایک بنیادی فرق ہے۔

میرے سراب کو اگر کوئی نہ مانے تو مذہبی عقائد کے سراب کی طرح اس پر کوئی سزا لازم نہیں آتی۔ دوسرے یہ کہ میرے نظریات میں یہ کوئی دعویٰ نہیں کہ وہ حتمی ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔ میرے نظریات سائنسی نقطۂ نظر پر مبنی ہیں جن کی مبادیات میں یہ شامل ہے کہ جوں جوں حالات بدلتے ہیں اور ہمارا زندگی کے بارے میں علم، تجربہ اور تحقیق بڑھتے ہیں ہمارے نظریات میں ارتقا ہوتا رہتا ہے۔

ایک ماہر نفسیات کے حوالے سے میں نے اپنی عمر کا ایک طویل حصہ انسانی نفسیات کو سمجھنے میں گزار دیا۔ میں نے انسانی شخصیت کو بچپن سے جوانی تک بلوغت کے مختلف مراحل سے گذرتے دیکھا ہے۔ میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جن مراحل سے ہر انسان انفرادی طور پر چند سالوں میں گزرتا ہے، انہی مراحل سے انسانیت اجتماعی طور پر صدیوں میں گزرتی ہے لیکن جس طرح بہت سے بچے بلوغت کے مراحل طے کرتے ہوئے عارضی طور پر نفسیاتی مسائل اور الجھنوں کا شکار ہو جاتے ہیں لیکن پھر وہ ان کا حل تلاش کر لیتے ہیں اسطرح میں بنی نوع انسان سے بھی پر امید ہوں کہ وہ مذہبی عقاید کے نفسیاتی حل کا حل تلاش کر لیں گے اور انہیں پیچھے چھوڑ کر بلوغت کے زینے عبور کرتے ہوئے ایسے معاشرے کو قائم کریں گے جہاں وہ مذہب کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں گے اور سیکولر نظریات کی بنیادوں پر انسانی معاشرے کی عمارت کھڑی کر سکیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ میری خوش فہمی ہو لیکن میں ذاتی طور پر اس سلسلے میں بہت پر امید ہوں۔

اس تبادلہ خیال میں میں مزید دو پہلوؤں پر اظہار خیال کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی بات یہ کہ اگر میرا موقف کمزور ہے تو اس سے آپ کا موقف خود بخود طاقتور نہیں ہو جاتا۔ میری نگاہ میں آپ ایک ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں۔ بات درست بھی ہو سکتی ہے

کہ انسانی عقل کی آواز اس کی جبلتوں اور جذبات کی آوازوں سے کمزور ہوتی ہے لیکن اس کی کمزوری میں بھی ایک قوت پوشیدہ ہے کیونکہ وہ نظرانداز ہونے کے باوجود اپنی جگہ قائم رہتی ہے اور انسان کے جذباتی فیصلوں اور خطاکاریوں کے بعد اپنی بات منوا کر چھوڑتی ہے اور ثابت کرتی ہے کہ انسان کو اپنے مسائل کا حل اپنی جبلتوں اور خواہشات کی بجائے فہم و فراست اور عقل و دانش کی روشنی میں تلاش کرنا چاہیے۔ عقل و دانش کی بات کی کامیابی کے لیے دیر ہے اندھیر نہیں۔ عقل و دانش کا نظام بھی انسانیت کے لیے احترام آدمیت کا تحفہ لے کر آئے گا جس کی مذہبی لوگ خدا سے امید لگائے بیٹھے ہیں۔ ایک حوالے سے ہمارے مقاصد ایک ہی ہیں۔ ہماری منزل ایک ہے لیکن راستے جدا ہیں، ہم اپنی محنتوں کا پھل قیامت کی بجائے اگلی نسلوں میں پانے کے متمنی ہیں۔ مجھے یہ امید ہے کہ جوں جوں ان محنتوں کے پھل ہمارے سامنے آتے جائیں گے مذہبی عقاید کی عوام کے ذہنوں سے گرفت کم ہوتی جائے گی کیونکہ تجربات اور عقل کے سامنے عقاید کی تو جیسی پسپا ہو جائیں گی سائنس کے آگے آہستہ آہستہ مذہب گھٹنے ٹیک دے گا۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اگر مذہبی سراب کی حقیقت واضح ہو جائے اور لوگ اپنے ایمان سے دستبردار ہو جائیں تو ان پر ایک قنوطی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور مذہب کی پوری عمارت دھڑام سے نیچے گر جاتی ہے اور مذہبی لوگ انسانیت کے مستقبل سے مایوس ہو جاتے ہیں۔

لیکن ہم ایسی مایوسی اور ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے ہم نے اپنے بلوغت کے سفر میں بچپن کے مذہبی عقاید کے سراب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ سائنسی علم اور تحقیق ہمیں زندگی کی تفہیم میں مدد کریں گے جن سے ہماری طاقت میں اضافہ ہوگا اور ہم زندگی کے مسائل سے بہتر طور پر نبرد آزما ہو سکیں گے۔ اگر ہمارا ایمان بھی سراب ہے تو ہم دونوں ایک ہی کشتی میں سوار ہیں۔ لیکن سائنس کی تحقیقات اس بات کا ثبوت بھی کہ ہم سراب کا تیچھا نہیں کر رہے۔

سائنس کے کئی دشمن ہیں۔ بعض سامنے سے حملہ کرتے ہیں بعض چھپ کر۔ بعض دشمن سمجھتے ہیں کہ سائنس نے مذہبی عقاید کی بنیادیں ہلادی ہیں۔ سائنس پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس نے زندگی کے صرف چند پہلوؤں میں کامیابیاں حاصل کی ہیں لیکن سائنس کی چھوٹی سی عمر میں اتنی کامیابیاں بھی نہایت حوصلہ افزا ہیں انسانی عقل نے تھوڑے ہی عرصے میں نجانے کتنے کارنامے سرانجام دے دیے ہیں۔ بعض لوگوں کا سائنس پر یہ اعتراض ہے کہ وہ ایک قانون آج پیش کرتی ہے اور کچھ عرصے کے بعد اس کی تردید بھی خود ہی کرتی ہے لیکن یہ اعتراض حقیقت اور سچائی پر مبنی نہیں۔ سائنسی تحقیقات حقائق سے آہستہ آہستہ پردے اٹھاتی ہیں وہ کوئی انقلاب نہیں لاتیں۔ یہ بات درست کہ زندگی کے بعض شعبوں میں سائنس ابھی بچپن کے مراحل سے گزر رہی ہے لیکن بعض شعبے ایسے بھی ہیں جن میں اس نے ٹھوس علم کی عمارت ٹھوس بنیادوں پر

استوار کر دی ہے ایسا علم جیسے دنیا کے کسی کونے میں کوئی شخص درست ثابت کر سکتا ہے۔

بعض لوگوں کا سائنس پر یہ بھی اعتراض ہے کہ اس کے نتائج انسانی ذہن کی اختراع ہیں اور انکا خارجی حقیقت سے کوئی تعلق نہیں لیکن یہ اعتراض بھی حقیقت پر مبنی نہیں۔ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ انسانی ذہن کچھ اس نوعیت کا ہے کہ وہ خارجی حقیقتوں اور زندگی کے مسائل کو تحقیق کی نگاہ سے دیکھ سکتے اور معروضی نتائج اخذ کر سکے۔ ایسے نتائج جن کی بنیاد پر ہم ایک بہتر زندگی کی تشکیل کر سکیں۔

آخر میں میں صرف اتنا کہوں گا کہ میری نگاہ میں سائنس سراب نہیں ہے البتہ یہ امید کہ جو ہم سائنس سے حاصل نہیں کر سکے وہ کسی اور طریقہ کار سے حاصل کر لیں گے ایک سراب ہے

- - - - - - - - -

اوکٹاویا پاز
تلخیص و ترجمہ :۔ خالد سہیل

دہریت کی اقسام

خدا کی "موت" کے بارے میں لکھنا کوئی آسان کام نہیں۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم نصف صدی سے زیادہ عرصے سے اس موت کا جشن منا رہے ہیں اور دہریت آہستہ آہستہ ایک عالمی عمل بن چکی ہے۔ اس کے باوجود یہ کسی مضمون کا پسندیدہ عنوان نہیں ہو سکتا۔ اس سے پہلے کہ ہم خدا کی موت کے موضوع پر سنجیدگی سے گفتگو کریں ہمیں دہریوں کی مختلف قسموں میں تمیز کرنی ہوگی۔

دہریوں کا ایک گروہ وہ ہے جس نے خدا کی موت کا تو یقین کر لیا لیکن دیگر طاقتوں (منطق، ترقی، تاریخ) کو خدا کا جانشین بنا لیا۔

دہریوں کا دوسرا گروہ وہ ہے جو کہتا ہے کہ خدا کی موت کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیوں کہ اس کا وجود ہی نہیں تھا اور جو چیز کبھی زندہ یا موجود ہی نہ ہو اس کی موت کیسے واقع ہو سکتی ہے؟

بعض دہریوں کے لئے دہریت بھی ایمان کا درجہ رکھتی ہے۔ بعض دہریے خدا کی موت کے اعلان کے بعد یوں سبک محسوس کرتے ہیں جیسے ان کے کندھوں سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہو۔ البتہ بعض کا خیال ہے کہ خدا کے بغیر دنیا ہلکی ہو گئی ہے لیکن انسان بھاری۔

عالمی مذاہب کی تاریخ میں خدا کی موت کا باب نہایت دلچسپ ہے۔ یہ باب انسانی شعور کے ارتقا کے ایک مرحلے کی کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ مرحلہ بذات خود ایک مذہبی مرحلہ ہے لیکن خاص قسم کا مذہبی مرحلہ اور اس مرحلے سے گزرنے کے لیے ایک خاص قسم کے ایمان کی بھی ضرورت ہے۔ یہ مرحلہ ارتقا کے باقی مراحل کی طرح عارضی بھی ہے اور ہر مذہبی مرحلے کی طرح اہم اور پر معنی بھی۔ انسان جو ایک ان دیکھے دھاگے کے ساتھ مابعد الطبیعات طاقتوں سے جڑا ہوا تھا جس لمحے وہ دھاگہ ٹوٹا اس لمحے انسان بلندیوں سے پستیوں کی طرف گرنا شروع ہوا۔ وہ لمحہ اس حوالے سے بھی اہم ہے کہ اس لمحے میں دہریہ خدا کے نہ موجود ہونے کو موجود ہونے کی طرح ابدی طور پر قبول کرتا ہے۔

مثبت مذہبی لمحے میں انسان غیر مقدس وقت کی حد سے گزر کر مقدس وقت کی حد میں داخل ہوتا ہے، نئی زندگی پاتا ہے اور اوپر کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔

منفی مذہبی لمحے میں انسان مقدس وقت کی حد سے گزر کر غیر مقدس وقت کی حد میں داخل ہوتا ہے اور نیچے کی طرف سفر شروع کرتا ہے۔ اس سفر میں انسان جہنم کا ہی نہیں حیات نو کا بھی انکار کرتا ہے۔

نیٹشے کے فلسفے کا دیوانہ دہریہ جب یہ چیختا ہے کہ "میں خدا کی تلاش میں ہوں" تو وہ جانتا ہے کہ اس کی محنت رائیگاں جائے گی کیوں کہ اس کا ایمان ہے کہ "ہم سب نے مل کر اس کو قتل کر دیا ہے۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں۔" وہ دیوانہ ایک عجب اذیت میں مبتلا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ خدا مر چکا ہے کیوں کہ ہم نے اسے مار دیا ہے لیکن وہ اپنی بات پر یقین نہیں رکھتا۔ چنانچہ وہ ہنستا بھی ہے اور روتا بھی ہے۔ وہ قہقہے بھی لگاتا ہے اور آنسو بھی بہاتا ہے۔ خدا کی موت نے اسے اپنی ذات سے جدا کر دیا ہے۔ اسے اپنے لیے بیگانہ بنا دیا ہے۔ وہ دیوانہ اب خود، خدا بننا چاہتا ہے کیوں کہ وہ خدا کی تلاش میں ہے۔ دیوانے کے لئے خدا کی موت کا لمحہ ہی اس کی حیات نو کا لمحہ بھی ہے۔

اس دیوانے کے مقابلے میں وہ دہریہ جو خدا کے عدم وجود پر ایمان لے آیا ہے، اس شخص سے مختلف نہیں جو خدا کے وجود پر ایمان لایا ہے۔ لیکن دہریے کا ایمان سطحی، مصنوعی اور کھوکھلا ہے۔ اس کا ایمان ایک منفی ایمان ہے جسے نہ کوئی ثابت کر سکتا ہے اور نہ ہی کوئی اس کی تردید کر سکتا ہے۔ اس کا ایمان ہے کہ وہ ایمان نہیں لاتا۔ یہ عجیب و غریب قسم کا ایمان ہے۔

نیٹشے نے جب خدا کی موت کا اعلان کیا تھا تو وہ ان مسائل سے بخوبی واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ انسان کے لئے خدا کی موت کو قبول کرنے کے لیے سوپر مین (super man) ہونا ضروری ہے۔ صرف ایک سوپر مین ہی صحیح معنوں میں دہریہ ہو سکتا ہے کیوں کہ وہ ہی یہ کھیل کھیل سکتا ہے اور اگر وہ انسان سوپر مین نہیں ہے تو وہ پاگل پن کا شکار ہو جائے گا۔

نیٹشے نے ۱۸۸۲ء میں خدا کی موت کا اعلان کیا تھا اور ابھی تک سوپر مین پیدا نہیں ہوا۔

دیوانہ جانتا ہے کہ اگر خدا مر گیا تو انسانوں کو خداؤں کی طرح رہنا ہوگی۔ اپنی صفات کو چھوڑ کر خدائی صفات اختیار کرنا ہوں گی اور خدائی کھیل کھیلنا ہو گا۔ خدا کی موت کے بعد انسان کو اپنی فطرت اور خدائی فطرت کے درمیان جوا کھیلنا ہو گا۔ اسے اپنی ذات کو ہی نہیں ساری کائنات کو خدا کی طرح ایک کھیل سمجھنا ہو گا۔ نیٹشے کے خیال میں ساری کائنات ایک تخلیقی کھیل سے زیادہ کچھ نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی میں فن اہم ہے سچائی نہیں۔ انسان کام کرتے ہیں اور سیکھتے ہیں۔ خدا کھیلتے ہیں اور تخلیق کرتے ہیں۔

وہ دنیائیں جو خدا کے ہاتھ میں تھیں اب انسان کے ہاتھ میں آ گئی ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انسان جو زمین سے جڑا ہوا ہے کیا آسمانوں پر اڑ سکتا ہے۔ انسان کو آج تک اپنے تنزل کی کہانی یاد ہے۔ جب وہ ناچنا شروع کرتا ہے تو اس کے احساس پر خوف سوار ہونے لگتا ہے۔

نیٹشے کے فلسفے کا موضوع خدا کی موت نہ تھا بلکہ اس کا قتل تھا اور اس جرم کے ہم سب اجتماعی طور پر مرتکب ہوئے ہیں۔ ہم خدا کی موت کو ایک تاریخی حقیقت قرار دے سکتے ہیں اور کہہ سکتے ہیں کہ وہ بڑھاپے یا بیماری یا فطری موت سے مر گیا۔ اس حقیقت کی تفہیم کے لیے ہمیں مغرب میں پنپنے والے خیالات اور نظریات کی طرف نگاہ اٹھانی ہوگی۔ ایک خدا کے تصور Monotheism نے مصر میں جنم لیا تھا اور پھر وہ تصور دنیا کے مختلف حصوں میں پروان چڑھتا رہا اور مختلف لوگوں اور قوموں نے اسے اپنا لیا۔

دلچسپی کی بات یہ ہے کہ اگرچہ یونان اور روم کے اصحاب فکر نے زندگی کے بارے میں مختلف نظریات اور فلسفے پیش کیے تھے لیکن ایک خدا کا تصور، ایک خالق کا تصور ان کے لیے اجنبی تھا۔

یہودیت اور عیسائیت کے خدا اور دوسری قوموں کے مابعد الطبیعات فلسفوں میں کئی بنیادی فرق اور تضادات ہیں۔ دوسری قومیں جن روحانی طاقتوں پر ایمان لاتی ہیں ان میں ایک خدا اور ایک خالق کے تصور کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ ان کا ایمان یا تو دہریت (Atheism) کا اور یا بہت سے خداؤں (Polytheism) کا ایمان ہے۔ ہمارے ایک خدا کے ایمان Monotheism کے فلسفے کو منطق کا وائرس (Virus) اور فلسفے کی بیماری لاحق ہو گئے اور وقت نے اسے مار ڈالا۔ خدا کی موت صرف عیسائی معاشرے میں ہی آسکتی تھی کیوں کہ وہ معاشرہ اپنے ایمان میں کمزور تھا۔ ہم نے اسے فلسفے کے ہتھیاروں سے کچل ڈالا۔ اس قسم کے تنہا خدا کو صرف عیسائیوں کی قوم ہی قتل کر سکتی تھی۔

میرے خیال میں اسلام کے ایک خدا کے تصور کو بھی انہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بھی ایک خدا کے ایمان کی عمارت فلسفے کی بنیادوں پر استوار نہ کر سکے۔ غزالی نے اسی مسئلے پر تفصیل سے لکھا ہے۔ مسلمانوں میں بھی خدا اور فلسفے کی جنگ موت تک لڑی گئی لیکن اس جنگ میں خدا جیت گیا۔ اگر نیٹشے مسلمان ہوتا تو لکھتا "فلسفہ مر گیا ہے۔ ہم سب نے اسے مل کر قتل کر دیا ہے۔"

ہندوؤں میں ایک خدا کا تصور ہی نہیں ہے۔ ان کے ہاں کوئی ایک ہستی، کوئی ایک آسمانی طبیعت نہیں ہے جو ساری کائنات کو پیدا کرنے اور تباہ کرنے کی ذمہ دار ہو۔ مختلف ذمہ داریاں مختلف خداؤں کو سونپی گئی ہیں۔ انہوں نے نہ تو ایک خدا کا تصور اپنایا اور نہ ہی ان کا ان مسائل اور تضادات سے پالا پڑا جن سے ایک خدا پر ایمان رکھنے والوں کو نبرد آزما ہونا پڑتا ہے۔

ہندوؤں کی روحانیت اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنے پر زور دیتی ہے۔ اسے دنیا کے کاروبار سے زیادہ سروکار نہیں۔ ان کی نگاہ میں دنیا ایک سراب ہے اور وقت بھی ایک سراب ہے چنانچہ وہ ایسے خالق پر ایمان نہیں لانا چاہتے جو سراب کا خالق ہو۔

مغرب کی دہریت کے تصور کے مسائل وقت کے تصور سے ملے ہوئے ہیں۔ اگر وقت ایک حقیقت ہے تو خدا کا وجود جس نے وقت کو تخلیق کیا ہے وقت سے پہلے موجود ہونا چاہیئے۔ نیٹشے نے اس تضاد کا حل ابدی واپسی میں تلاش کرنے کی کوشش کی اور وقت کے سفر کو دائروں کا سفر قرار دیا۔ لیکن یہ دائروں کے سفر کا تصور ایک اور تضاد پیدا کرتا ہے کیوں کہ اس حوالے سے خدا کی موت کا لمحہ اس کی حیات نو کا لمحہ بھی قرار پا سکتا ہے۔ نیروال (Nerval) کہتا ہے۔ "وہ خدا جن کی موت کا تم ماتم کر رہے ہو ایک دن دوبارہ لوٹ کر آئیں گے۔"

دائی واپسی اور سفر کا تصور خدا کے تصور کو وقت کا مرہون منت کر دیتا ہے اسے ختم نہیں کرتا۔ ہمیں خدا سے نہیں وقت سے چھٹکارا حاصل کرنا ہے اور اس سلسلے میں صرف بدھ ازم کامیاب ہوا ہے جس نے وقت کے دائروں کے سفر کے عقدے حل کیے اور اس سے نجات حاصل کی۔

ہمارے لئے خدا کے تصور نے اس لیے مسائل پیدا کیے ہیں کیوں کہ ہم نے اسے وقت سے پہلے تصور کر لیا ہے۔ عین ممکن ہے دہریت کا مسئلہ ایک پوزیشن (Position) کا، ایک رشتے کا مسئلہ ہو۔ خدا اور انسان کے رشتے کا مسئلہ نہیں بلکہ خدا اور وقت کے رشتے کا مسئلہ

اس مسئلے کا ایک حل یہ ہو سکتا ہے کہ ہم یہ تصور کریں کہ خدا ازل سے پہلے پیدا ہونے کی بجائے ابد کے بعد پیدا ہوگا اور وقت کا مقصد سوپر مین (Superman) پیدا کرنا نہیں بلکہ خدا پیدا کرنا ہے۔ اس تصور کے مطابق خدا اس وقت اپنی پیدائش کے مراحل سے گزر رہا ہے اور جب اس کی پیدائش کا وقت آئے گا وہ پیدا ہو جائے گا۔ اس حوالے سے خدا کی حیثیت خالق کی نہیں مخلوق ہو جاتی ہے۔ ایسا خدا وقت کی کوکھ میں پرورش پا رہا ہے اور وہ وقت کی موت کے وقت پیدا ہوگا۔

خدا کا یہ تصور ہمارے بہت سے داخلی تضادات کی گتھیاں سلجھا دیتا ہے۔ اس تصور سے یہ واضح ہوتا ہے کہ خدا نہ تو مرا ہے اور نہ ہی اسے کسی نے قتل کیا ہے۔ اس کا وقت سے اٹوٹ رشتہ ہے اور وہ اسی وقت پیدا ہوگا جب وقت مر جائے گا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے خدا کو قتل کیا ہے کیا وہ وقت کو قتل کر سکیں گے یا نہیں؟

(اوکتاویاپاز کی ---------- فلسفیانہ مضامین کی کتاب ALTERNATING CURRENT کے ایک باب کی تلخیص و ترجمہ)

کیرن آر مسٹرانگ
تلخیص و ترجمہ :۔ خالد سہیل

خدا کی موت؟

انیسویں صدی کے آغاز میں خدا کے وجود سے انکار اور دہریت کے فلسفوں نے انسانی ذہن اور زندگی میں بیج بونے شروع کر دیے تھے۔ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی سے متاثر ہو کر چند اصحاب فکر و نظر نے خدا سے اپنی آزادی و خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔ اس صدی میں لڈوگ نیور بیک (Ludwig Fuerbach) کارل مارکس (Karl Marx) ، چارلز ڈارون (Charles Darwin) فریڈرک نیٹشے (Frederich Nietsche) اور سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud) جیسے فلاسفروں نے انسانی زندگی اور کائنات کی ایسی تفسیریں پیش کیں جن میں خدا کے لیے کوئی جگہ نہیں تھی۔ چنانچہ انیسویں صدی کے آخر تک دانشوروں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا تھا جن کا خیال تھا کہ اگر خدا مر نہیں گیا تھا تو سائنسی اور منطقی فکر رکھنے والے لوگوں کو چاہئے کہ وہ اسے قتل کر دیں۔ دنیا کا وہ تصور جو عیسائیت نے صدیوں سے قائم کر رکھا تھا آہستہ آہستہ متروک ہو تا جا رہا تھا اور عقل و دانش پر مبنی فلسفوں نے توہم پرستانہ نظریات پر بالادستی حاصل کرنی شروع کر دی تھی۔ مسیحی دنیا میں یہ تبدیلی اس تیزی اور شدت سے رونما ہو رہی تھی کہ اس کے اثرات یہودی اور مسلم دنیاؤں پر بھی مرتب ہو رہے تھے۔ مسلمان اور یہودی قومیں بھی خدا سے منکر فلسفوں کو قبول کرنے لگی تھیں لیکن خدا سے انکار نے ان کے دلوں میں مسرت و شادمانی کی بجائے شکوک و شبہات، درد اور کرب اور تضادات کا ایک طوفان برپا کر دیا تھا۔ بعض فلاسفروں نے تو ایسے فلسفے بھی پیش کرنے چاہے جن میں خدا بھی موجود رہے اور سائنس، منطق اور فلسفہ بھی لیکن وہ زیادہ کامیاب نہ ہوئے۔ دہریت نے جہاں بیج بوئے تھے وہاں نہ صرف پودے اگ آئے تھے بلکہ ان پودوں میں پھل اور پھول بھی نظر آنے لگے تھے۔ عوام کو اندازہ ہونے لگا تھا کہ دہریت کا تصور عارضی نہ تھا وہ انسانی ذہن اور زندگی میں مستقل قیام کرنے آیا تھا۔

انیسویں صدی میں جہاں ایک طرف سائنسدانوں میں منطق کو کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں وہیں دوسری طرف رومانوی دور کے شاعروں، ادیبوں اور فنکاروں میں اس کے خلاف آواز اٹھ رہی تھی اور یہ تصور پیش کیا جا رہا تھا کہ منطق صرف جسم اور مادی زندگی پر توجہ مرکوز کرتی

ہے جب کہ انسانی زندگی میں روح اور تصوراتی زندگی بھی شامل ہیں جو منطق کے احاطے سے باہر ہیں۔ ان فلاسفروں میں سے بعض عیسائیت کی تاریخ کو سیکولر انداز میں سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہ جنت، جہنم اور حیات بعد الموت کی ایسی تفسیریں پیش کر رہے تھے جو سائنس اور منطق کے لئے قابل قبول ہوں۔ ایک امریکی مفکر ایم آر۔ ایبرمز(M.R.Abrams) نے تو مذہبی مابعد الطبیعات کے مقابلے میں فطری مابعد الطبیعات Natural Supernaturalism تک کا تصور پیش کیا تھا جس کی بنیاد مذہبی عقاید کی بجائے انسانی ذہن کی تخلیقی صلاحیتوں پر تھی۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی ذہن خارجی حقائق سے مل کر ایسے تصورات پیش کرتا ہے جو عقل اور منطق سے نہیں سمجھے جاسکتے۔ ان کی حیثیت انسانی خوابوں کی سی ہے جن میں ایک نئی دنیا آباد ہوتی ہے۔ ان ادیبوں، شاعروں اور فلاسفروں کا خیال تھا کہ انسانی ذہن اور زندگی کے تخلیقی پہلو کو ابھی تک سائنس اور منطق پوری طرح نہیں سمجھ پائے۔ ان کا خیال تھا کہ ایک صوفی کی طرح شاعر بھی ایک ایسی دنیا میں پہنچ جاتا ہے جہاں ابھی تک سائنس کو رسائی حاصل نہیں ہوسکی۔

اگلے زمانے کے صوفیا نے بھی خدا کے تصور کو اسی انداز میں پیش کیا تھا۔ ابن العربی نے کہا تھا کہ جب انسان اپنی ذات کی گہرائیوں میں ڈوب جاتا ہے تو اس کی ملاقات خدا سے ہوتی ہے۔ یہ خدا آسمانوں کی بلندیوں پر نہیں انسانی دل کی گہرائیوں میں رہتا ہے جو انسانیت کی تخلیقی اور روحانی زندگی کا حصہ ہے۔

مغرب میں ورڈز ورتھ (1850 - 1770) Wordsworth ایک صوفی شاعر تھا جس کا فطرت کے ساتھ ایک روحانی رشتہ تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ اس کی شاعری اس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہے اور وہ حتی الامکان کوشش کرتا ہے کہ عقل اس میں دخل اندازی نہ کرے۔ اس کا خیال تھا کہ انسانوں کے لیے سچائی اور دانائی حاصل کرنے کے لیے کتابوں کی کم اور مخلص دل کی زیادہ ضرورت ہے جو زندگی سے براہ راست کسب فیض کر سکے۔ ورڈز ورتھ کی کوشش تھی کہ وہ اپنے روحانی تجربات کو مذہبی رنگ نہ دے کیوں کہ اس دور کے عیسائی مفکرین تصوف کی روایت سے پوری طرح واقف نہ تھے۔ وہ مفکرین عیسائی پادریوں کی دھواں دار تقریریں تو سن چکے تھے لیکن ورڈز ورتھ جیسے صوفی شاعروں کے دل کی سرگوشیوں سے پوری طرح آشنا نہ تھے جو اسے فطرت سے ہم کلام رکھتی تھیں۔ ورڈز ورتھ اپنے روحانی تجربوں کو کوئی نام نہ دیتا تھا کیوں کہ اس کا خیال تھا کہ ایسے تجربے کو نام دینا ناانصافی ہوگی۔

اسی دور میں ایک اور صوفی شاعر ولیم بلیک 1827 - 1755 William Blake نے ورڈز ورتھ کے مقابلے میں بالکل ہی دوسرا راستہ اختیار کیا تھا۔ اس نے اپنی شاعری میں خدا کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ بلیک نے اپنی نظموں میں نہ صرف انسان کے تنزل کا ذکر کیا بلکہ خدا کے

تنزل کا بھی مرثیہ لکھا۔ اس نے عیسائیت کے خدا کے خلاف بغاوت کر دی تھی اسے عیسائی راہبوں سے شکایت تھی کہ انھوں نے خدا کا نام لے کر غیر فطری قوانین بنائے تھے اور انسانوں سے آزادی خوشیاں اور جنسی م لذت چھین لیے تھے۔ بلیک کی نظموں میں آسمانوں میں رہنے والا خدا عیسیٰ کی صورت میں زمین پر اترتا ہے اور اپنی موت کو گلے سے لگاتا ہے۔ وہ نہ صرف مرجاتا ہے بلکہ شیطان کا روپ بھی اختیار کرلیتا ہے اور انسانیت کا دشمن بن جاتا ہے۔ بلیک کی نگاہ میں عیسیٰ کی موت کے بعد آسمانوں میں رہنے والے خدا کا وجود ختم ہو جاتا ہے اور انسانیت ایک نئی آزادی سے روشناس ہوتی ہے۔

بلیک نے عیسائیت کے مروجہ نظام کے خلاف کھل کر بغاوت کی تھی۔ جس دور میں بلیک عیسائیت کے خلاف قلم اٹھا رہا تھا اسی دور میں یورپ میں عیسائیت اور روحانیت کو یکجا کرنے کی کوشش بھی جاری تھی۔ اس تحریک کا ایک اہم نام فریڈرک شالیرمیکر Fredrich Schleiermacher (1783 - 1834) تھا جس نے جرمنی میں اپنے نظریات پیش کرنے شروع کیے تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ مذہبی ایمان کا تعلق آسمانی کتابوں سے کم اور انسانی قلب کی گہرائیوں سے ابھرنے والے جذبات سے زیادہ ہے۔ اس کا خیال تھا کہ چونکہ عقل کا دائرہ محدود ہے اس لیے ہمیں اپنی جذباتی، روحانی اور تخلیقی صلاحیتوں سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا کا تصور معروضی نہیں ہے۔ اس کا تعلق عقیدے سے کم اور روحانی تجربے سے زیادہ ہے۔ اس کا مشورہ تھا کہ ہمیں جسم اور روح، عقل اور تصور، منطق اور وجدان میں ایک توازن قائم کرنا چاہیے۔ اس کا خیال تھا کہ جب انسانی ذات کے مختلف پہلو یکجا ہوتے ہیں تو ایمان جنم لیتا ہے اور تقدس کا جامہ اوڑھتا ہے۔ اپنی زندگی کے آخری دنوں تک شلیرمیکر مصر رہا کہ روحانیت اور عقل میں کوئی تضاد نہیں۔ اس کی نگاہ میں خدا کے تصور اور روحانی تجربے کا گہرا رشتہ تھا وہ دونوں ایک ہی حقیقت کے دو رخ تھے۔

انیسویں صدی میں یکے بعد دیگر کئی فلاسفر آئے جنہوں نے خدا کے روایتی تصور کو چیلنج کیا۔ وہ ایک ایسی ذات کو ماننے کو تیار نہ تھے جو آسمانوں میں رہتی تھی۔ مغرب میں خدا کا معروضی تصور بہت مقبول ہو چکا تھا۔ یہ علحدہ بات کہ عیسائیت، اسلام اور یہودیت کے پیروکاروں میں ہمیشہ ایک گروہ ایسا رہا ہے جس نے خدا کو ایک چیز بنا کر پیش نہیں کیا۔ اس کے عدم Nothing کو اس کے اعلیٰ وجود (Super Being) پر ترجیح دی جسے کسی خاص جگہ تلاش کرنا بیکار ہے وہ مانتے تھے کہ خدا کا وجود ایسا ہے جو ہے بھی اور نہیں ہے لیکن عیسائیت نے اسے بڑا بھائی (Big Brother) بنا کر آسمانوں پر بٹھادیا تھا جہاں سے وہ انسانوں کی زندگی کا محاسبہ کرتا تھا۔ انیسویں صدی کے فلاسفروں کے لیے ایسے خدا کا تصور ناقابل قبول تھا اور انھوں نے ایسے خدا کے خلاف بغاوت کر دی تھی۔

جورج ولھلیم ہیگل (Georg Wilhelm Hegel 1770 - 1831) نے جس فلسفے کو پیش کیا اس میں یہودیت پر سخت تنقید کی گئی تھی۔ ہیگل نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہودیت نے خدا کا جو تصور پیش کیا تھا وہ نہایت جابرانہ اور ظالمانہ تھا۔ یہودیت کے خدا نے انسانوں کو سخت قوانین دیے تھے اور پھر اصرار کیا تھا کہ وہ ان قوانین پر عمل کریں ورنہ انہیں سخت سزا ملے گی۔ ہیگل کا خیال تھا کہ عیسیٰ نے اس تصور میں نرمی اور رحم پیدا کرنے کی کوشش کی تھی لیکن عیسائیوں نے دوبارہ اس جابرانہ خدا کے تصور کو قبول کر لیا تھا۔ ہیگل کا خیال تھا کہ وہ وقت آگیا تھا کہ ہم اس شدت پسند خدا کے تصور کو خیرباد کہیں اور انسانی زندگی کی تفہیم کے لیے نیا فلسفہ دریافت کریں۔ ہیگل کے فلسفے میں یہودیت پر کافی کیچڑ اچھالا گیا تھا۔ ہیگل نے اپنی کتاب (The Phenumenology of Mind 1807) میں مذہب کو رد کر کے ایسی روح (Spirit) کا تصور پیش کیا تھا جو عالمی اور انسانی تاریخ کی روح رواں تھی۔ وہ روح صدیوں سے مشکلات کا سامنا کر رہی تھی تاکہ انسانوں میں نفسیاتی سماجی اور روحانی شعور بیدار ہو۔ ہیگل کی نگاہ میں عالمی روح انسانی زندگی کا حصہ تھی نہ کہ اس سے جدا۔ اس کے فلسفے کے مطابق انسانی زندگی اور روح لازم و ملزوم تھے اور دونوں انسانیت کی نشو و نما اور ترقی کے لیے ضروری تھے۔ ہیگل اگرچہ منطق اور وجدان دونوں کا قائل تھا لیکن اس کی نگاہ میں منطق اور فلسفے کو مذہب پر برتری حاصل تھی۔

ہیگل کے ہی دور کے ایک اور فلاسفر آرتھر شوپنہار Arthur Schopenhauer 1788 - 1860 کی نگاہ میں ہیگل کا فلسفہ غیر ضروری طور پر پُر امید تھا۔ شوپنہار کسی بالائی طاقت، کسی منطق، کسی خدا، کسی روح کا قائل نہ تھا۔ اس کی نگاہ میں عالمی تاریخ زندہ رہنے کی خواہش اور جذبے کی مرہون منت تھی۔ اس کے فلسفے میں انسانی زندگی کا تاریک پہلو نمایاں تھا۔ شوپنہار کے خیال میں عیسائیت کے مقابلے میں ہندوازم اور بدھ ازم کے فلسفے حقیقت کے زیادہ قریب تھے۔ کیونکہ ان کا کہنا تھا کہ زندگی ایک سراب ہے مایا ہے شوپنہار کا خیال تھا کہ انسانوں کو زندگی کے مسائل سے کوئی "خدا" نہیں بچائے گا۔ ان کی نجات فنون لطیفہ میں مضمر ہے۔ شوپنہار کی نگاہ میں یہودیت اور اسلام کے مذاہب نے زندگی کے مسائل کے آسان فارمولے پیش کیے تھے جو بے معنی تھے۔ اس کا کہنا تھا کہ انسانوں کو اپنی زندگی کو بامقصد بنانے کے لیے خود اپنے معانی تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔ شوپنہار آسمانی خدا کے لطف و کرم اور بخشش کے بالکل مخالف تھا۔

اسی دور کے ایک اور فلاسفر سورن کرکیگارڈ Soren Kierkegaard 1813 - 1855 جس کا تعلق ڈنمارک سے تھا، کا خیال تھا کہ مذہبی لوگوں نے خدا کو بھی ایک بت بنا دیا ہے اس کا کہنا تھا کہ سچا ایمان حاصل کرنے کے لیے انسانوں کو دنیاوی معاملات اور

روزمرہ کی زندگی سے ہٹ کر اپنی ذات کی گہرائیوں میں اترنا پڑتا ہے۔

اسی دور کے ایک اور فلاسفر لڈوگ فیور بیک Ludwig Fuerbach 1804 - 1872 کا کہنا تھا کہ انسانوں نے اپنی کمزوریوں اور ناتوانیوں کو دیکھتے ہوئے ایک طاقتور اور توانا خدا اور خالق کا تصور قائم کیا تھا اور اس تصور سے

انسان کمزور خدا طاقتور

انسان محدود خدا لامحدود اور

انسان گنہگار خدا مقدس قرار پایا تھا۔

فیور بیک کا بھی کہنا تھا کہ جونہی مذہبی لوگ خدا کو انسانی زندنی سے خارج کر کے ایک مابعد الطبیعاتی طاقت بنا کر پیش کرتے ہیں وہ اسے ایک بت بنا دیتے ہیں۔ فیور بیک کی نگاہ میں خدا کا یہ تصور جو عیسائیت میں سینٹ آگسٹین (ST. Augustine) کے دور سے در آیا تھا انسانیت کے لئے ایک مثبت تصور نہ تھا کیوں کہ اس تصور نے انسانی خود اعتمادی کو مجروح کیا تھا۔

تاریخ کے ہر دور میں جب بھی کسی نے مروجہ مذہبی اور روحانی فلسفے سے انکار کیا اس پر کفر کا فتویٰ لگا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ خدا کے تصور کے ساتھ ساتھ کفر کا تصور بھی بدلتا رہا۔ جب یہودیوں اور عیسائیوں نے قبائلی خداؤں کا انکار کیا اور ایک خدا کا تصور پیش کیا تو انہیں بھی قبائلی لوگوں نے کافر کہہ کر پکارا اگرچہ وہ اپنی نگاہوں میں خدا کو ماننے والے تھے۔ انیسویں صدی میں بھی جب فلاسفروں نے مغرب کے مروجہ خدا کے تصور سے انکار کیا تو ان پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا ان فلاسفروں میں سے ایک کارل مارکس (Karl Marx 1818 - 1883) تھا۔ جس نے مذہب کو "مظلوم لوگوں کی آہ" اور "عوام کے لیے افیون جو ان کے دکھوں کے درد کو کم کرتی ہے" کہہ کر پکارا تھا۔ اگرچہ وہ تاریخ کے روحانی تصور پر ایمان رکھتا تھا لیکن خدا کے تصور سے منکر تھا۔ اس کی نگاہ میں انسانی تاریخ کے باہر کوئی ایسی طاقت نہیں تھی جو انسانی زندگی کے ارتقا میں ممد ثابت ہو سکتی تھی۔ مارکس کی نگاہ میں انسانوں کو اپنی مدد خود کرنی تھی۔ خدا انسانوں کی مدد نہ کر سکتا تھا۔ مارکس کے نقطہ نظر کے مطابق انسانی معاشرے میں امیر غریبوں کو خدا اور جنت کے خواب دکھا کر ان پر ظلم کرتے رہے تھے۔ مارکس ایک منصف معاشرے کا خواب دیکھ رہا تھا اور اس خواب کی تعبیر کی راہ میں وہ خدا کے مروجہ تصور کو رکاوٹ سمجھتا تھا۔ انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عیسیٰ اور محمد بھی ایک منصف معاشرے کے قیام کے لئے ہی جدوجہد کرتے رہے تھے۔

انیسویں صدی کے عیسائیوں نے خدا کا جو تصور اپنا رکھا تھا اور آسمانی کتابوں کی جو تفسیر کی تھی ان میں جدید سائنسی تحقیقات کے لیے زیادہ جگہ نہ تھی۔ چارلز ڈارون Charles

Darwin نے جب ۱۸۵۹ میں اپنی کتاب The Origin of Species میں انسانی ارتقا کا نظریہ پیش کیا تو عیسائیوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا کیوں کہ وہ ان کی نگاہ میں انجیل مقدس کے انسانی ارتقا کے نظریے کی تردید کرتا تھا۔ عیسائیوں نے انجیل کی کہانی کو استعاراتی معانی کی بجائے لغوی معنی دینے شروع کر دیے تھے۔ اس میں کلیسا اور سائنس میں تضاد پیدا ہو گیا تھا۔ یہی حال مسلمانوں اور یہودیوں کا بھی تھا۔ ان میں بھی جو لوگ آسمانی کتابوں کی کہانیوں کے لغوی معنی لیتے تھے وہ سائنس کی تحقیقات سے خوش نہ تھے۔ لیکن عیسائی، مسلمان اور یہودی قوموں میں ایسے بزرگ اور عالم بھی تھے جن کی نگاہ میں خدا کا تصور لامحدود تھا۔ جس میں مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہ تھا۔ وہ بزرگ فطرت کے کرشموں اور سائنس کی تحقیقات کو بھی خدا کی شان کی ہی عکاسی سمجھتے تھے۔ ان کی نگاہ میں سائنس خدائی صفات اور کرشموں سے ہی پردہ اٹھا رہی تھی اور اس کے معجزوں کو ثابت کر رہی تھی۔

جب ہم انسانی تاریخ اور خدا کے تصور کے رشتے کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ہر دور میں انسان نے خدا کے نئے تصور کو جنم دیا ہے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی فریڈرک نیٹشے (Fredrich Nietsche) کا تصور تھا جس نے ۱۸۸۲ء میں اپنی تخلیقات میں خدا کی موت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کی کتاب (Thus Spoke Zarathustra) میں ایک دیوانہ شہر کی گلیوں اور بازاروں میں بھاگتا ہوا چوراہے میں پہنچ جاتا ہے اور چیختا ہے "میں خدا کی تلاش میں ہوں" جب لوگ اس سے پوچھتے ہیں کہ خدا کہاں چلا گیا ہے تو وہ دیوانہ کہتا ہے کہ "کیا تم نہیں جانتے کہ خدا کہاں چلا گیا ہے میں تمہیں بتانے آیا ہوں کہ ہم نے اسے قتل کر دیا ہے۔ ہم نے مل کر اسے قتل کر دیا ہے۔ ہم سب اس کے قاتل ہیں۔ We are all his murderers." اس واقعہ نے انسانوں کے صدیوں کے خدا کے تصور کو جڑوں سے اکھاڑ کر پھینک دیا اور وہ ایک نئی دنیا میں سانس لینے لگے ایسی دنیا جس میں خدا کا سایہ ان کے سروں پر نہیں تھا۔

نیٹشے کو اندازہ ہو گیا تھا کہ مغربی دنیا کے انسانی ذہن میں اتنا انقلاب آ چکا ہے کہ اس کے لیے "خدا" کے روایتی تصور کو قبول کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ سائنسی تحقیقات نے انسانی زندگی کی ایسی تفسیریں کرنی شروع کر دی ہیں کہ اب اس خدا کی ضرورت نہ رہی تھی جو آسمانوں پر بیٹھا کارخانہ حیات چلا رہا تھا۔ سائنس نے فطرت کے قوانین تلاش کرنے شروع کر دیے تھے۔ وہ قوانین جن کے ذریعہ انسانی زندگی کی تشریح کی جا سکتی تھی اور اس کے مسائل کا حل تلاش کیا جا سکتا تھا۔ نیٹشے کے خیال میں انسان اس مقام پر آ گیا تھا جہاں اسے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرنے کی ضرورت تھی تاکہ وہ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگیوں کی ذمہ داری سنبھال سکے۔ نیٹشے نے اپنی تخلیقات میں سوپر مین (Superman) کا تصور پیش کیا تھا جو عیسائیت کی

روایتوں اور خدا کے تصور کو توڑ کر نئی دنیا کا تصور پیش کرے گا اور وہ تصور عیسائیت کی نسبت بدھ ازم کے زیادہ قریب ہو گا۔ وہ نئی زندگی روحانی اور ابدی ہو گی اور اس زندگی میں خدا کے تصور کے لیے کوئی جگہ نہ ہو گی۔

نیٹشے کی نگاہ میں عیسائیت کا خدا کا تصور زندگی کے خلاف ایک جرم تھا A crime against life اس خدا نے انسانوں پر پابندیاں لگا کر انہیں اپنے جسموں کی خوشیوں اور جنسی لذت سے محروم کر دیا تھا اور انہیں خود اعتمادی دینے کی بجائے کمزور بنا دیا تھا۔ مغرب میں عیسائیت نے جس قسم کے خدا کا تصور پیش کیا تھا وہ نیٹشے جیسے فلاسفروں کے حملوں کا مقابلہ نہ کر سکا۔

سگمنڈ فرائڈ (Sigmund Freud 1856 - 1939) نے خدا پر ایمان کو ایک سراب قرار دیا جس کی بالغ مردوں اور عورتوں کی زندگی میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ فرائڈ نے خدا کے تصور اور ایمان کی نفسیاتی توجیہات پیش کیں۔ فرائڈ کا خیال تھا کہ انسان اور خدا کے رشتے کو سمجھنے کے لیے بچے اور باپ کے رشتے کو سمجھنا ضروری ہے۔ جس طرح ایک بچہ اپنی بے لبسی کی وجہ سے ایک طاقتور باپ کا خواہشمند ہوتا ہے اسی طرح انسان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے ایک توانا خدا کی خواہش کرتا ہے جو انسانی زندگی میں توازن اور انصاف قائم کر سکے۔ انسان خدا سے ڈرتا بھی ہے اور اس کی پرستش بھی کرتا ہے۔ فرائڈ کے خیال میں خدا کے تصور کا تعلق انسانیت کے بچپن سے ہے۔ لیکن جوں جوں انسانیت بلوغت کے مراحل طے کر رہی ہے، خدا کے تصور کی ضرورت کم ہوتی جا رہی ہے اور اس کی جگہ انسانی عقل، شعور اور سائنس سے لے رہے ہیں جو انسانی زندگی کے جدید دور میں انصاف اور اخلاقیات کے لیے بنیادیں فراہم کر سکتے ہیں۔ فرائڈ کا سائنس پر ایمان انتہائی مضبوط تھا جتنا کہ اس کے مخالفین کا خدا اور مذہب پر۔

فرائڈ کے ہم عصر دیگر ماہرین نفسیات اس کی رائے سے پوری طرح متفق نہ تھے۔ الفریڈ ایڈلر (Alfred Adler 1870 - 1937) کا خیال تھا کہ اگرچہ خدا کا تصور انسانی ذہن کی تخلیق ہے لیکن اس نے انسانیت کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ہے اور وہ نیکی اور خیر کی علامت ہے۔

کارل ینگ (Carl Jung 1875 - 1961) کا خدا کا تصور صوفیا کے تصور سے ملتا جلتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ خدا ایک نفسیاتی حقیقت ہے جسے انسان اپنے دل کی گہرائیوں میں پاتا ہے۔ ایک انٹرویو میں جب اس سے پوچھا گیا کہ کیا وہ خدا پر ایمان لاتا ہے تو اس نے کہا تھا "مجھے اس پر ایمان لانے کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ وہ ہے۔

I do not have to believe - I know.

ینگ کا خیال تھا کہ اگر انسان خدا کو اپنی ذات کی گہرائیوں میں تلاش کرے تو اسے سائنس کی

تحقیقات اور منطق کے دلائل سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہو گا۔
اگر چہ فرائڈ خدا کا منکر تھا لیکن وہ عوام کی زندگی سے خدا کے ایمان کو طاقت کے زور سے نیست و نابود کرنے کے حق میں بھی نہ تھا۔ اس کا خیال تھا کہ اس عمل کے خطرناک نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ جوں جوں سائنس کی تعلیم مقبول ہو گی خدا اور مذہب کا توہم پرستانہ ایمان خود بخود ختم ہو جائے گا اور انسانیت کا قافلہ خدا کے تصور کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ جائے گا۔
جن فلاسفروں نے اپنی زندگی سے خدا کے تصور کو زبردستی ہٹانا چاہا وہ ذہنی کرب کا شکار ہوئے۔ شوپنہار نے تنہائی کی زندگی گزاری اور نیٹشے سوپرمین کی بجائے دیوانہ ہو گیا اور اس کا کردار Zarathustra زندگی کے آخری دور میں خدا کی واپسی کی تمنا کرتا ہے۔

" OH COME BACK

MY UNKNOWN GOD ! MY PAIN ! MY LAST -- HAPPINESS"

ہیگل کے فلسفے کی طرح نیٹشے کے نظریات کو بھی جرمنوں نے اپنی نیشنل سوشلزم کی متعصبانہ پالیسیاں بنانے کے لیے استعمال کیا اور اس دہریت پسند فلسفے نے بھی اتنے ہی مظالم ڈھائے جتنے "خدا" کے تصور کو استعمال کرتے ہوئے مذہبی جابر حکمرانوں نے ماضی میں ڈھائے تھے۔

مغرب میں خدا کے تصور نے ہمیشہ انسانی زندگی میں اضطراب پیدا کیا اور خدا کو ماننے اور نہ ماننے کے درمیان انسانی دل کو شکوک، شبہات اور تضادات سے بھر دیا۔
جہاں مغرب کے فلاسفر، مذہب اور ایمان کے بارے میں اپنے تضادات کو رقم کر رہے تھے وہیں مشرق میں فیوڈور دستووسکی بھی اپنے مسائل سے دوچار تھا۔ اس نے اپنے ناول The Brothers Karamazov 1880 میں خدا کی موت کا ذکر کیا تھا۔ دوستووسکی نے اپنے ذاتی تضاد کا ذکر ۱۸۵۴ء میں اپنے ایک دوست کو خط میں ان الفاظ میں کیا تھا۔
"میں اپنے عہد کا بچہ ہوں۔ ایسا بچہ جس کی غیر یقینیوں نے پرورش کی ہو اور میں مرتے دم تک ایسا ہی رہوں گا۔ میری ایک خواہش یہ ہے کہ میری ایمان سے ملاقات ہو جائے لیکن جوں جوں میرے راستے میں عقل اور منطق رکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں میری خواہش میں شدت پیدا ہوتی جاتی ہے۔"
اس کے ناول کے کردار آیون (Ivan) کو باقی لوگ دہریہ سمجھتے ہیں اور اس کی طرف یہ جملہ منسوب کرتے ہیں "اگر خدا موجود نہ ہو تو ہر چیز کی اجازت ہو۔

" If God does not exist , all is permitted."

کہیں وہ خود اقرار کرتا ہے کہ وہ خدا کو مانتا ہے۔ آیون کے لئے انسانی تاریخ کے ارتقا کو قبول کرنے کی نسبت انسانیت کا صدیوں سے مصائب کا سامنا کرنا زیادہ مشکل ہے۔ اس کے لیے ایک بچے کی

موت پوری انسانیت کے مذہبی عقاید پر بھاری ہے ۔ ہم بعد میں دیکھیں گے کہ یہودیوں کے لیے بھی معصوم بچوں کا دکھ درد دیکھنا خدا پر ایمان لانے کی راہ میں مشکلات پیدا کرتا ہے ۔

جس دور میں عیسائی اور یہودی قوموں میں ایک اضطراب کی سی کیفیت پیدا ہو گئی تھی مسلمانوں میں بے حسی کا دور دورہ تھا اور اسلامی حکومتوں Sudam 1888 ، Egypt 1882 ، Algiers 1830 ، Libya ، Morocco 1912) ، Tunisia 1881 ، Aden 1839 پر انگریز اور فرانسیسی حکومتوں نے قبضہ کر لیا تھا ۔ ۱۹۲۰ء میں انگلستان اور فرانس نے مل کر مشرق وسطیٰ کو بانٹ لیا تھا اس طرح اسلامی دنیا کے کئی اہم مراکز پر مغرب کا قبضہ ہو گیا تھا ۔

مغرب نے جب اسلامی حکومتوں پر قبضہ کر لیا تو مسلمانوں میں دو گروہ پیدا ہو گئے ایک گروہ نے مغرب کی بود و باش اختیار کر لی اور مغرب زدہ (Westernized) کہلانے لگے اور دوسرے روایتی گروہ کو مغرب نے ہندوؤں اور چینیوں کی طرح Orientals کہنا شروع کیا ۔ بعض مغربی اور مغرب زدہ لوگ روایتی لوگوں کو تحقیر کی نگاہ سے دیکھنے لگے ۔ مغرب کی بالادستی سے مسلم تہذیب اور ثقافت کو بہت نقصان پہنچا جس کے اثرات آج بھی مسلم دنیا میں نظر آتے ہیں ۔

یورپ کو یہ گھمنڈ ہونے لگا تھا کہ ان کی تہذیب اور ثقافت دنیا کی باقی تہذیبوں اور ثقافتوں سے بہتر ہے اور ہندوستانیوں ، شامیوں اور مصریوں کو ان کے نقش قدم پر چلنا چاہیے تا کہ وہ بھی ترقی کر سکیں ۔ ایسے متعصب نوآبادیاتی رجحان کی نمائندگی کرنے والا Lord Cromer Evelyd Boring تھا جو ۱۸۸۳ سے ۱۹۰۷ء تک مصر کا کونسل جنرل رہا ۔ اس نے ایک قصہ لکھا تھا " سر الفریڈ لائل Sir Alfred Lyall نے ایک دفعہ کہا تھا "مغربی ذہن نہایت مدلل تھا ۔ سائنس کی طرح وہ زندگی کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے ۔ وہ حقائق کو قبول کرنے کے لیے ثبوت مانگتا ہے ۔ مغربی ذہن میکانکی ہے ۔ اس کے مقابلے میں اورینٹیل ذہن دلیلوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتا ۔ اورینٹل ذہن مشرقی شہروں کی گلیوں کی طرح دائروں میں سفر کرتا ہے ۔ اس کا منطق عجیب و غریب ہوتا ہے ۔ پرانے زمانے میں عربوں نے ریاضی میں مہارت حاصل کی تھی لیکن ان کی نسلوں نے وہ خصوصیات کھو دی تھیں ۔ وہ اب سامنے کی چیزوں سے بھی نتائج اخذ کرنے کے قابل نہیں رہے ۔ ان کا اب منطق سے دور کا بھی رشتہ نہیں رہا ۔"

عیسائیوں کے ذہن میں اسلام اور پیغمبر محمد کا نہایت منفی تاثر پیدا کیا گیا تھا ۔ عیسائی سمجھنے لگے تھے کہ اسلام پسماندہ اور تباہ کن مذہب ہے اور اس میں اب ترقی کرنے کے کوئی امکانات نہیں ہیں ۔ عیسائیوں نے انیسویں صدی میں اسلام کے خلاف غلط رجحانات کو ہوا دی تھی اور تعصب پھیلایا تھا ۔

اس دور کے مسلمان ایک عجیب دوراہے پر کھڑے تھے ۔ بعض کو روایت پسند تھی اور

بعض مغرب کے ساتھ ملنے کے متمنی تھے اور ایک سیکولر زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ بعض اسلامی حکومتوں کے حکمرانوں نے اسلام کو پیچھے چھوڑ کر مغرب کو گلے لگالیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ان کی قوم جلد از جلد ترقی کرے گی۔ لیکن یہ ان کی خام خیالی تھی۔ قومیں اپنی جڑوں سے اتنی جلد نہیں کٹا کرتیں۔

ان رہنماؤں میں سے ایک مصطفیٰ کمال تھا (۱۸۸۱۔ ۱۹۳۸ء) جو بعد میں کمال اتاترک کے نام سے مشہور ہوا۔ اس نے ترکی کو ایک مغربی مملکت بنانا چاہا اور مذہب کو حکومت سے نکال کر لوگوں کا ذاتی مسئلہ بنا دیا۔ اس نے صوفیوں کے سلسلے اور مدرسے ختم کرنے چاہے اور علماء کو قتل کردیا۔ اس نے لوگوں کو مجبور کیا کہ وہ روایتی ٹوپی کی بجائے جدید ہیٹ پہنیں جو مغربی تہذیب کی علامت تھی۔ کمال اتاترک ترکی کو جلد از جلد ایک یورپی ملک بنانا چاہتا تھا۔

ایران کا شاہ رضا خاں اپنے ۱۹۲۵ء سے ۱۹۴۱ء کے دورِ حکومت کے دوران کمال اتاترک سے اتنا متاثر تھا کہ وہ بھی اس کے نقشِ قدم پر چلنے لگا۔ اس نے عورتوں کے پردہ کرنے اور مردوں کے پگڑی پہننے پر پابندی لگادی۔ اس نے شیعہ اماموں اور امام حسینؓ کے سلسلے میں مذہبی تقریبات پر بھی پابندیاں عائد کردیں۔

فرائڈ نے سچ ہی کہا تھا کہ مذہب سے زبردستی چھٹکارا حاصل کرنے کی کوشش خطرناک ثابت ہوسکتی ہے۔ جنسی جذبات کی طرح اگر مذہبی جذبات کو بھی دبایا گیا تو وہ سطح کے نیچے تو چلے جاتے ہیں لیکن پھر ایک دن آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹتے ہیں۔ مسلمان عوام نے ترکی اور ایران کی حکومتوں کو شک کی نگاہ سے دیکھنا شروع کردیا۔ بعض علماء نے شاہِ ایران کے خلاف محاذ کھڑا کر دیا اور بعض سیاسی جنگوں میں کامیاب بھی ہوئے۔ جب شاہ نے انگلستان سے تمباکو کا کاروبار شروع کیا تو علماء نے فتویٰ دیا کہ ایرانی سگریٹ پینا بند کردیں۔ جب تہران شاہ کی حکومت کا مرکز بنا تو قم علماء کا مرکز بن گیا۔ مذہب کو دبانے کے خطرناک نتائج ثابت ہوئے۔ ترکی اور ایران میں ذمہ دار مذہبی روایتیں ختم ہوگئیں اور ان کی جگہ زیرِ زمین شدت پسند تحریکوں نے جڑیں پکڑیں۔

مسلم دنیا میں بہت سے علما ایسے تھے جو مسلمان قوم کی فلاح و بہبود چاہتے تھے۔ وہ مذہب کو انسانی زندگی کا اہم جزو سمجھتے تھے۔ انہیں مسلمانوں کے مغربی دنیا سے میل جول سے کوئی خطرہ نہ تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ چاہے وہ اسلام ہو، عیسائیت، یہودیت ہو یا مغربی جمہوریت، سب کا مقصد ایسا معاشرہ قائم کرنا تھا جس میں برابری، انسان دوستی کی روایات قائم کی جاسکیں۔ بعض مسلمان علماء اپنی قوم سے کہتے تھے کہ اسلام کی روح اور اقدار کو عیسائیوں نے اپنی زندگی کا حصہ بنالیا ہے اور وہ ایمانداری اور دیانت داری کی زندگی گزارنے لگے ہیں۔ مسلمانوں کو ان سے سبق سیکھنا چاہیئے۔ بہت سے صاحبِ ثروت مسلمانوں نے مغرب میں تعلیم حاصل کی اور جب وہ واپس اپنے

ملکوں میں گئے تو اپنے ساتھ جمہوریت، انسان دوستی اور روشن خیالی کے تحفے لے کر گئے۔ بیسویں صدی کے آغاز تک مسلمان انٹلکچویل مغرب سے کافی متاثر ہو چکے تھے۔

مسلمانوں میں علماء کا ایک ایسا گروہ بھی پیدا ہو رہا تھا جو مسلمانوں میں ایک داخلی انقلاب لانے کا خواہشمند تھا۔ اس گروہ کا نظریاتی اور روحانی سلسلہ صوفیاء سے جا ملتا ہے۔ وہ مذہب کے ظاہری اصولوں کی نسبت روحانی تجربات پر زیادہ زور دینے لگے تھے۔ وہ مغرب اور مشرق کا ایک صحت مند ملاپ چاہتے تھے۔

ان علماء میں سے ایک جمال الدین افغانی (۱۸۳۸ء - ۱۸۸۷ء) تھے جو سہروردی سلسلے کے عالم تھے۔ وہ تصوف اور جدید طرز زندگی میں کوئی تضاد نہ دیکھتے تھے۔ جب انہوں نے ایران افغانستان، مصر اور ہندوستان کا سفر کیا تو وہ تمام مذہبی گروہوں سے ملے۔ وہ سنیوں سے سنیوں کی طرح اور شیعوں سے شیعوں کی طرح ملتے۔ وہ ایک فلاسفر بھی تھے، ایک سیاستدان بھی اور ایک انقلابی رہنما بھی۔ ان کا خیال تھا کہ ہم مذہبی ہونے کے باوجود ترقی کر سکتے ہیں اور مسلمان قوم میں انقلاب لا سکتے ہیں۔ افغانی نے اسلام کو اس انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی کہ اس کا مغربی دنیا سے تضاد پیدا نہ ہو۔

محمد عبدہ (Mohammed Abduh 1849 - 1905) افغانی کے شاگرد تھے۔ ان کی تعلیم اور تبلیغ کا مرکز مصر تھا۔ ان کی اپنی تعلیم روایتی انداز میں ہوئی تھی۔ وہ بعد میں صوفی شیخ درویش کے زیر سایہ آئے جنہوں نے انہیں سکھایا کہ سائنس اور فلسفہ خدا تک پہنچنے کے معتبر راستے ہیں۔ اسی لیے جب عبدہ نے مصر کی جامعہ ازہر میں تعلیم حاصل کرنی شروع کی تو وہ جامعہ کے روایتی نصاب سے مایوس ہوئے۔ چنانچہ وہ افغانی کے شاگرد بن گئے اور وہیں سے منطق، سائنس اور تصوف کی تعلیم حاصل کی۔ عبدہ مغربی تہذیب اور ثقافت اور کامٹے Comte ٹالسٹائی Tolstoy اور ہربرٹ سپنسر Herbert Spencer جیسے مفکرین سے کافی متاثر تھے۔ انہوں نے مغربی طرز زندگی تو اختیار نہیں کی لیکن وہ یورپ باقاعدگی سے آیا کرتے تھے تاکہ مغربی افکار سے واقف رہیں۔ عبدہ نے کبھی اسلام نہیں چھوڑا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو پیغمبر اسلام اور خلفاء راشدین کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔ وہ اسلام اور جدید سائنس میں کوئی تضاد نہ دیکھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اسلامی شریعت میں تبدیلیاں لائی چاہئیں تا کہ مسلمان جدید تحقیق سے استفادہ کر سکیں اور نئی دنیا میں اپنا مقام بنا سکیں۔ افغانی کی طرح انہوں نے اسلام کو اس انداز میں پیش کیا تھا کہ جدید ذہن اسے قبول کر سکے۔ ان کا خیال تھا کہ انسانی تاریخ میں اسلام نے پہلی دفعہ مذہب، سائنس اور منطق کو یکجا کیا تھا۔

ان کا کہنا تھا کہ وحی اور سائنس کے علم کو جدا کرنے کی کوشش جیسا کہ غزالی اور ان کے شاگردوں نے کی تھی درست نہ تھی اسی لیے انہیں جامعہ ازہر کے نصاب سے شکایت تھی جس پر

غزالی کا بڑا اثر تھا ۔ عبدہ کی عمر بھر یہ کوشش رہی کہ وحی اور منطق کو یکجا کیا جائے اور یہ ثابت کرتے رہے کہ مذہب اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں ۔

ہندوستان میں اسلامی مفکر سر محمد اقبال (۱۸۷۷ - ۱۹۳۸ء) بہت مقبول ہوئے ۔ انہیں مسلمانوں میں وہی اہمیت حاصل تھی جو ہندوؤں میں گاندھی کو تھی ۔ اقبال ایک شاعر بھی تھے اور صوفی بھی اور انہوں نے مغرب سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ بھی حاصل کر رکھا تھا ۔ وہ برگساں، Bergson نیٹشے Nietche اور وائٹ ہیڈ (White Head) سے متاثر تھے ۔ وہ اپنے آپ کو مشرق اور مغرب کے درمیان ایک پل سمجھتے تھے ۔ وہ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تنزل سے بہت متفکر تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ مغلیہ سلطنت کی تباہی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کی حالت ناگفتہ ہو گئی تھی ۔ وہ ہندوستان میں اقلیت تھے اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں جیسی خود اعتمادی نہ رکھتے تھے اسی لیے وہ انگلستان کی حکومت کے آگے عدم اعتماد کا شکار تھے ۔ اقبال کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں نیا جذبہ پیدا کیا جائے تاکہ اسلام ایک نئے جوش کے ساتھ ابھر سکے ۔

مغرب کے نیٹشے جیسے فلاسفروں سے اقبال نے فرد کی اہمیت کا درس سیکھا تھا ۔ ان کا خیال تھا کہ انفرادیت کی اعلیٰ ترین مثال وہ ذات تھی جسے میں نے " خدا " کا نام دے رکھا تھا اور انسانوں کو بھی اپنی انفرادیت اجاگر کرنے کے لیے اپنے اندر خدائی صفات پیدا کرنی پڑیں گی ۔ ایسا کرنے کے لیے انسانوں کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنی پڑے گی ۔

اقبال مسلمانوں میں اجتہاد کے قائل تھے ۔ افغانی اور عبدہ کی طرح اقبال کا بھی یہ خیال تھا کہ اسلام نے غور و فکر اور تحقیق کی حوصلہ افزائی کی تھی جو ترقی کے لیے ضروری تھی ۔ اسی لیے ایک دور میں اسلامی مفکرین نے ریاضی اور سائنس کو بیش بہا تحفے دئے تھے لیکن بعد میں اس روایت کو مغربی مفکرین اور قوموں نے تو اپنا لیا تھا لیکن مسلمان اس روایت سے دست کش ہوگئے تھے ۔ اقبال کا کہنا تھا کہ محمد کے بعد وحی کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا ۔ اب مسلمانوں کو عقل، منطق اور سائنس سے اپنے مسائل کا حل تلاش کرنا تھا ۔

مشرق اور مغرب کے انفرادیت کے فلسفوں میں بڑا فرق تھا ۔ مغرب میں انفرادیت ایک بت بن گئی تھی ۔ نیٹشے کے سوپر مین کے تصور کے تحت وہ بغاوت پر آمادہ ہو گئی تھی اور اپنے آپ کو خدا سمجھنے لگی تھی ۔ اس کے مقابلے میں مشرق کی انفرادیت کے تصور نے انسان کامل کا تصور پیش کیا تھا ۔ صوفیا کا انسان کامل اپنی عظمت کے باوجود اپنے خالق کے آگے سرنگوں تھا ۔ اس میں اپنی قابلیت اور عظمت کردار پر ناز کے ساتھ ساتھ عجز و انکساری بھی تھی ۔

اقبال نے ہندوستان میں اسلامی فکر کو حیات نو بخشنے کی کوشش کی ۔

بیسویں صدی کے آغاز میں مشرق وسطیٰ کے مسلمان ایک بحران کا شکار تھے اور ان کی

خود اعتمادی مغربی طاقتوں کے سامنے گھٹنے ٹیک رہی تھی ۔ ۱۹۲۰ کا سال مشرق وسطیٰ کے لئے بری خبر لے کر آیا۔ اس سال فرانس اور انگلستان کے نمائندوں نے اس خطے کو بانٹ لیا ۔ عربوں کا خیال تھا کہ Ottoman Empire کے زوال کے بعد انہیں آزادی اور خود مختاری ملے گی لیکن ان کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا اور وہ بہت مایوس ہوئے ۔ انہوں نے یہ افواہ بھی سنی کہ انگلستان کی حکومت فلسطین کو فلسطینیوں کی اجازت کے بغیر صیہونی طاقتوں کے حوالے کر دے گی یہ افواہ عربوں کی عزت اور خودداری کے لیے ایک تازیانے سے کم نہ تھی ۔ عربوں کی انا سخت مجروح ہوئی ۔ ان اقدامات کے مذہبی اور سیاسی اثرات مرتب ہوئے ۔ مسلمان قوم جو صدیوں سے فاتح اور حاکم رہی تھی آہستہ آہستہ مغربی طاقتوں کے آگے کمزور ہو رہی تھی ۔ ایک طرف مسلمانوں کو اپنے بزرگوں کی کامیابیاں یاد آ رہی تھیں اور دوسری طرف وہ مغرب میں اپنے خلاف تعصب کی فضا استوار ہوتی دیکھ رہے تھے ۔ ان حالات نے نہ صرف مسلمانوں کی انا اور سیاسی بالادستی کو دھچکہ پہنچایا بلکہ ان کے ایمان اور خدا پر یقین کو بھی کمزور کر دیا ۔

اس دور میں جہاں مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی حالت ابتر ہو رہی تھی وہیں یہودیوں میں بھی نظریاتی اور مذہبی تبدیلیاں آ رہی تھیں ۔ جرمنی کے فلاسفروں نے ایک نیا فلسفہ پیش کیا تھا جس کا نام یہودیت کی سائنس The science of Judaism رکھا گیا ۔ اس فلسفے کے تحت یہودیت کی تاریخ کو اس انداز سے لکھا گیا کہ وہ جدید عہد کے اعتراضات کے جواب دے سکے ۔ اس فلسفے میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ یہودیت اور سائنس میں کوئی تضاد نہیں اور یہودیت کا نظام عہد جدید کے تقاضوں کو بھی پورا کرتا ہے ۔ اس فلسفے کا ایک نمائندہ سولومون فورمسٹکر Solomon Formstecher 1808 - 1889 تھا جس نے آسمانی کتابوں کی استعاراتی تفسیر پر زور دیا اور بتایا کہ یہودی وہ پہلی قوم تھی جس نے ایک خدا کا تصور پیش کیا تھا ۔ اس سے پہلے انسان فطرت کی پرستش کرتے آئے تھے ۔ اس کا خیال تھا کہ ایک خدا کا تصور انسانی شعور کے ارتقا کا مظہر تھا ۔ مسلمان فلاسفروں کی طرح یہودی فلاسفروں نے بھی مذہب اور سائنس کو قریب لانے اور ان کے تضاد کو کم کرنے کی کوشش کی تھی ۔
نیکمین کروکمل Nachman Krochmal 1785 - 1840 ایک اور فلاسفر تھا جس کا خیال تھا کہ یہودی عقاید کسی آسمانی خدا کی دین نہ تھے بلکہ انسانوں کے اجتماعی لاشعور کے مرہون منت تھے ۔ اس کے خیال میں مذہب اور فلسفے میں یہ فرق تھا کہ فلسفہ نظریات پیش کرتا تھا جب کہ مذہب انہی صداقتوں کا استعاراتی انداز میں اظہار کرتا تھا ۔ کروکمل کا خیال تھا کہ عقل کی اہمیت بجا لیکن چونکہ اس کا دائرہ عمل محدود ہے اس لیے وہ خدا کے تصور کا احاطہ نہیں کر سکتی ۔
جہاں یہودی فلاسفر عوام کی خود اعتمادی کو بحال کرنے کی کوشش کر رہے تھے وہیں روس اور

یورپ میں یہودیوں کے خلاف تعصب پھیلایا جا رہا تھا۔

اسی دوران فرانز روزنزوگ Franz Rosenzwug 1886 - 1929 نے یہودیت کے فلسفے میں موجودیت کے تصورات متعارف کرائے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ مذہب اور خدا کا تصور انسانی قد کو کم نہیں کرتا بلکہ بڑھاتا ہے۔ وہ انسان کو اپنی صلاحیتوں کو جلا بخشنے میں مدد کرتا ہے اور آسمانی کتابیں انسانی شخصیت اور خدا کے درمیان فاصلوں کو کم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔

روزنزوگ سیاست اور مذہب کو علیحدہ رکھنا چاہتے تھے لیکن وہ یہودی جو روس اور یورپ میں تعصب کا نشانہ بن رہے تھے ایسے نظریے کے حق میں نہ تھے۔ چنانچہ ۱۸۸۱ء میں روسی اور یورپی حکومتوں کے تعصبات کی وجہ سے یہودیوں نے فلسطین کی طرف ہجرت کرنی شروع کر دی تھی۔ انہیں یہ یقین ہونے لگا تھا کہ جب تک ان کا اپنا ایک ملک نہ ہوگا وہ ظلم و تشدد سے نہ بچ سکیں گے۔ صیہونی تحریک کی ابتدا تو سیکولر اور سوشلسٹ نظریات کے حوالے سے ہوئی تھی لیکن آہستہ آہستہ وہ مذہبی رخ اختیار کرتی گئی۔

تھیوڈر ہرزل Theodor Herzl 1860 - 1904 نے اسی دوران ایک یہودی ریاست کی جدوجہد تیز کر دی اور فلسطین میں یہودیوں کے رہنے کا انتظام کرنے لگا۔ ہرزل اور دیگر یہودی اپنے لیے ایک سیاسی، مذہبی اور روحانی مرکز تلاش کرنے لگے اور جنت کی امید لگانے کی بجائے اسی دنیا میں ایک مقدس مقام کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ صیہونی طاقتوں اور تحریک کا خواب اسرائیل کی صورت میں شرمندہ تعبیر ہوا۔ یہودیوں کا کہنا تھا کہ وہ فلسطین کے اسی علاقے کو آباد کر رہے ہیں جنہیں عربوں نے نظر انداز کر رکھا تھا۔"

سوشلسٹ صیہونی طاقتوں نے اسرائیل میں کبوتزم Kibbutzim کی بنیاد ڈالی اور سوشلزم کے اصولوں پر عمل کرنا شروع کیا۔ انہوں نے تصوف کا راستہ اختیار کیا۔ صیہونی تحریک کے دیگر نمائندوں نے روایتی مذہب کا سہارا لیا اور آئزک کک Isaac Kook 865 - 1935 جیسے راہبوں نے یہودیت کی تبلیغ شروع کر دی۔ وہ دہریت اور سوشلسٹ پسند صیہونی تحریک کے نمائندوں کے خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ یہودی راہ راست سے بھٹک چکے ہیں۔

آہستہ آہستہ اسرائیل یہودیت کا مرکز بن گیا اور اس میں شدت پسند یہودی تحریکوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ انسانی تاریخ نے ہمیں بتایا ہے کہ جب مذہب اور روحانیت انسان دوستی سے کٹ جائیں تو وہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ ایسے رجحانات یہودی قوم میں ہی نہیں مسلمانوں میں بھی دیکھے جا سکتے تھے اور اس صورت حال نے یہودی اور مسلمان قوموں میں شدید تشنج کی صورت پیدا کرنی شروع کر دی تھی۔

بہت سے یہودیوں کے لیے ہولو کوسٹ Holocaust کے اذیت ناک تجربے کے بعد خدا پر ایمان لانا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ ان یہودیوں میں سے ایک نوبل انعام یافتہ ایلی ویزل Elie Wiesel تھا۔ اس نے مذہبی گھرانے میں پرورش پائی تھی۔ جب وہ موت کے کیمپ Death camp میں ڈالا گیا اور اس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنی ماں اور بہن کی لاشوں سے دھواں اٹھتے دیکھا تو اس کا خدا پر ایمان بھی اس دھویں میں تحلیل ہو گیا۔

اس نے برسوں بعد اس لمحے کو یاد کرتے ہوئے لکھا تھا "میں کبھی بھی اس رات کی خاموشی نہ بھولوں گا جس نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھ سے زندہ رہنے کی خواہش کو چھین لیا تھا۔ ان لمحوں نے نہ صرف میرے خدا اور میری روح کو قتل کر دیا تھا بلکہ میرے خوابوں کو بھی خاک میں ملا دیا تھا۔

ایک دن گسٹاپو نے ہزاروں لوگوں کے سامنے ایک بچے کو قتل کر ڈالا۔ ویزل اس منظر کو دیکھ رہا تھا جب اس بچے اس "اداس فرشتے" کی لاش جلنے لگی تو ایک شخص نے پوچھا "خدا کہاں ہے؟ وہ کیا کر رہا ہے؟" اس بچے کو مرنے میں آدھ گھنٹہ لگا اور قیدیوں کو مجبور کیا گیا کہ وہ اس منظر کو دیکھیں۔ اس آدمی نے دوبارہ پوچھا "خدا اب کہاں ہے؟"

ویزل کے دل سے آواز ابھری "وہ یہاں ہے، وہ شعلوں کے اوپر لٹک رہا ہے" دوستوسکی نے جب کہا تھا کہ ایک بچے کی موت خدا کے انکار کے لیے کافی ہے تو اس نے بھی شاید ایک بچے کو ان حالات میں مرتے نہ سوچا ہوگا۔ ہولو کوسٹ کے مناظر نے خدا کے تصور پر سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ فلسفیوں کا خدا جو بے حسی کا شکار تھا بہت سے یہودیوں کے لیے ناقابل قبول ہو گیا تھا۔ ان کے خدا کی موت بہت سے معصوم یہودیوں کے ساتھ موت کے کیمپ میں واقع ہو گئی تھی۔ اگر خدا طاقتور اور توانا تھا اور معجزے دکھانے کے قابل تھا تو اس نے ہولو کوسٹ میں لاکھوں معصوم جانوں کو قتل ہونے سے کیوں نہ روکا۔ یہودی قوم کے ساتھ کئی اور قوموں کے لئے بھی ہولوکوسٹ روایتی مذہب اور خدا کا آخری باب ثابت ہوا۔ ان حادثات کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض یہودیوں نے ان حالات میں بھی تورات پڑھنی اور عبادت کرنی نہ چھوڑی۔ ایک کہاوت کے مطابق ایک کیمپ میں چند یہودیوں نے خدا پر مقدمہ چلا دیا۔ انھوں نے خدا پر ظلم اور غداری کا الزام لگایا اور انسانیت کے مصائب کو ثبوت کے طور پر پیش کیا۔ انھیں خدا کے حق میں کوئی ثبوت نہ ملا۔ آخر ایک راہب نے فیصلہ سنایا کہ خدا مجرم ہے اور اُسے موت کی سزا ملنی چاہئے۔ پھر اُس نے کہا:

"اب جبکہ مقدمہ ختم ہو چکا ہے اور فیصلہ ہو چکا ہے، میں آپ سب کو مطلع کرتا ہوں کہ شام کی نماز کا وقت ہو گیا ہے۔ چلو ہم سب نماز پڑھیں۔"

(کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب A History of God کے آخری باب کا ترجمہ)

کیرن آرمسٹرانگ
تلخیص و ترجمہ: ۔ خالد سہیل

خدا کا مستقبل

اب جبکہ ہم بیسویں صدی کی آخری دہائی میں زندہ ہیں اور ایسے ہتھیار بنا چکے ہیں جو بنی نوع انسان کو صفحہ ہستی سے نیست و نابود کر سکتے ہیں ۔ سرد جنگ ختم ہونے کے باوجود نئی دنیا کا کوئی واضح نقشہ ہمارے ذہنوں میں موجود نہیں ہے ۔ ہمیں ایڈز جیسی بیماریوں کے پھیلنے اور دو تین نسلوں میں دنیا کی آبادی بے قابو ہو جانے کا خطرہ بھی ہے ۔ دنیا میں ہزاروں لوگ دن رات قحط ، بھوک اور بیماری سے مر بھی رہے ہیں ۔ یہ سب قیامت کے آثار لگتے ہیں ۔ ان حالات میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خدا کے تصور کا مستقبل کیا ہو گا؟

بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ خدا ان کی روزمرہ کی زندگیوں کو بالکل متاثر نہیں کرتا اور اس کی حیثیت تاریخی ہو گئی ہے ۔ انیسویں اور بیسویں صدی کے فلاسفروں کے خیال میں سائنسی دور میں خدا کے تصور اور مذہب کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے ۔

یورپ کی قوموں نے مذہب کو چھوڑ کر دہریت اختیار کر لی ہے اور گرجا گھر خالی ہو گئے ہیں ۔ نیٹشے کے دیوانے کے اعلان کے بعد کہ خدا مر چکا ہے عوام کچھ زیادہ متاثر نہیں ہوئے تھے اور اپنے کاموں میں مصروف رہے تھے ۔ بعض کا تو خیال ہے کہ خدا کے نہ ہونے سے ان کے کندھوں سے ایک بھاری بوجھ اتر گیا ہے ۔ وہ لوگ جو بچپن میں خدا ، قیامت اور جہنم کے تصور سے خوف زدہ تھے سکھ کا سانس لیتے ہیں ۔ خدا اور مذہب کے تصور کے بغیر ، چاہے وہ یہودیوں کا ہو ، عیسائیوں کا ہو یا مسلمانوں کا ، انسان ایک نظریاتی آزادی سے متعارف ہوتا ہے اور انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنی زندگی کے فیصلے خود کر سکتا ہے ۔

ژاں پال سارتر (Sartre 1905 - 80) نے انسانی شعور میں خدا کی شکل کے ایک سوراخ کا ذکر کیا تھا God - Shaped Hole in Human Consciousness اس کا خیال تھا کہ اگر خدا تھا بھی تو انسان کو اپنی آزادی کے لیے اس کا انکار ضروری تھا کیوں کہ خدا ہماری آزادی کو کم کرتا ہے ۔ روایتی مذہب اصرار کرتا ہے کہ ہم خدا کی مرضی کے آگے اپنی مرضی قربان کر دیں ۔ بہت سے وجودی فلاسفروں کی نگاہ میں خدا کا انکار انسانی آزادی اور ارتقا کا ایک مثبت قدم ثابت ہوا ۔

البرٹ کیمو (Albert Camus 1913 - 1960) کا خیال تھا کہ خدا کو

پیچھے چھوڑ کر انسان اپنی تمام تر صلاحیتیں انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ اگر خدا ہر مسئلے کا حل ہے تو اس سے انسانی فکر اور تخلیقی جوہر متاثر ہوتے ہیں اور انسانوں کی بلند پروازی میں فرق آتا ہے۔ بعض فلاسفروں کو تو دہریت اتنی بھائی کہ ان کی دہریت نے بھی مذہبی رنگ اختیار کر لیا۔

۱۹۵۰ء کی دہائی میں فلاسفروں کا جو گروہ مقبول ہوا وہ مثبت منطق کا گروہ Logical Positivists کہلاتا ہے۔ ان کا ایک نمائندہ اے جے آئر A.J. Ayer 1910 - 1991 تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ ہمیں یہ دیکھنے کی بجائے کہ خدا ہے یا نہیں یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا خدا کا تصور انسانیت کے لئے سود مند اور پر معنی ہے یا نہیں۔ اس کا خیال تھا کہ صرف وہ خیال، تصور یا نظریہ پر معنی ہو سکتا ہے جسے ہم ثابت کر سکیں۔ اگر کوئی کہے "مریخ پر زندگی موجود ہے" تو یہ جملہ بے معنی نہیں کیوں کہ ایک دن ہم یہ جان لیں گے کہ مریخ پر زندگی ہے یا نہیں۔ اگلے زمانے کے بزرگ جب کہتے تھے کہ "میں خدا پر ایمان رکھتا ہوں" تو ان کا خیال تھا کہ وہ موت کے بعد اس تصور کی تصدیق کر لیں گے۔ لیکن آج کے دور کا انسان جب کہتا ہے کہ "خدا ایسی ہستی نہیں جسے ہم سمجھ سکیں" تو ایسے جملے بے معنی ہوتے ہیں کیوں کہ ہم انہیں صحیح یا غلط ثابت نہیں کر سکتے۔ اس کا کہنا تھا کہ آج کے دور میں جو بھی خدا کے بارے میں گفتگو کرتا ہے وہ اس انداز میں کرتا ہے کہ باقی لوگ اس کے نظریات کو عقل، منطق اور تجربے کی کسوٹی پر نہیں پرکھ سکتے۔ فرائڈ کی طرح مثبت منطقیوں کا بھی خیال ہے کہ خدا کا تصور اس دور کی یاد دلاتا ہے جب انسان نابالغ تھا۔ اب جبکہ انسان بلوغت تک پہنچ چکا ہے اور سائنس سے روشناس ہو چکا ہے خدا کا تصور قصہ پارینہ ہو چکا ہے۔

مثبت منطقیوں کے مقابلے میں لسانیات کے ولفرڈ سمتھ (Wilfred Smith) جیسے فلاسفروں کا خیال ہے کہ مثبت منطقیوں کے اپنے فلسفے کی عمارت کمزور بنیادوں پر کھڑی ہے کیوں کہ ان کے اصول بھی ثابت نہیں کیے جا سکتے۔ ان کا خیال ہے کہ سائنس کے قوانین جو مادی زندگی کے لئے ہیں، موسیقی اور شاعری کی طرح مذہب اور روحانیات پر بھی عاید نہیں کئے جا سکتے

ہمیں تاریخ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ ہر دور میں انسانوں کے ایک گروہ نے "خدا" کو کائنات کا خالق سمجھا ہے اور فطرت کو خدا کی شان کا مظہر جانا ہے لیکن مغرب کے عیسائیوں نے سائنس کو خدا کا حریف جانا اور اسے آسمانی کتابوں کی تردید کرتے دیکھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ انہوں نے آسمانی کتابوں کی استعاراتی انداز میں تفسیر کرنے کی بجائے لغوی تفسیر کرنی شروع کر دی اور پھر اسے سائنس کی تحقیقات سے غلط ثابت کرنا شروع کر دیا۔ سائنسدانوں اور فلاسفروں نے جس خدا کے تصور کی تردید کی وہ آسمانوں پر بیٹھے ایک طاقتور اور معروضی خدا کا تصور تھا جسے یہودی، مسلمان اور عیسائیت کے صوفیا نے عرصہ ہوا رد کر دیا تھا اور اس کی بجائے

خدا کے ایک داخلی تصور کو اپنایا تھا جو آسمانوں کی بلندیوں کی بجائے انسانی قلب کی گہرائیوں میں رہتا تھا اور جس سے ملنے کے لئے انسان کو اپنی ذات کے اندھے کنویں میں اترنا پڑتا تھا۔ خدا کا یہ تصور بدھ ازم کے نروان کے قریب تر تھا۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں عیسائیت کے تھومس الٹیزار (Thomas Altizer) جیسے مذہبی فلاسفروں نے بھی انسانوں کو خدا کی موت کی خوشخبری (Good News) سنائی اور انہیں بتایا کہ خدا کی موت کے بعد انسان ایک نئی آزادی کی زندگی گزارنے کے قابل ہوا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ اس نئی آزادی سے فائدہ اٹھا کر انسان ایک نئے فلسفے اور روحانیت کو جنم دے سکیں گے۔

پول بیورن (Paul Buren) نے اپنی کتاب Secular Meaning of Gospel 1963 میں کہا ہے کہ اب خدا کا کائنات کے نظام چلانے کا تصور فرسودہ ہو چکا ہے سائنس کی وجہ سے ہم نے قوانین فطرت دریافت کرنے شروع کر دیے ہیں جو زندگی کی تفہیم میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔ بیورن کا خیال ہے کہ اب ہمیں خدا کو چھوڑ کر صرف عیسیٰ پر ایمان لانا چاہیئے جو ایک انسان تھا اور انسانوں کو نئی آزادی کا پیغام دینے آیا تھا۔

ولیم ہیملٹن (William Hamilton) نے اپنی کتاب Radical Theology and the Death of God 1966 میں لکھا ہے کہ امریکہ میں مذہب کا تصور ہمیشہ ایک مثالی معاشرے کے قیام کے ساتھ منسلک رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانوں کو خدا سے امیدیں نہیں لگانی چاہئیں بلکہ اپنے مسائل کا حل خود تلاش کرنا چاہیئے۔

۱۹۶۰ء کی دہائی میں مغرب کے فلاسفروں میں ایک خاص قسم کا جوش اور جذبہ نظر آتا ہے وہ خدا کے تصور کو تو پیچھے چھوڑ آئے ہیں لیکن انسانیت کے مستقبل سے پرامید نظر آتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ انسان ارتقا کے اس مقام پر آگیا ہے جہاں وہ انفرادی اور اجتماعی طور پر اپنے مسائل کا حل تلاش کر سکتا ہے لیکن ۱۹۹۰ء تک پہنچتے پہنچتے اس جوش، جذبے اور امید میں کمی آتی جا رہی ہے جیمز کور (James Core) جیسے سیاہ فام فلاسفروں کا کہنا ہے کہ سفید فام لوگ کیسے خدا کی موت اور اپنی آزادی کا اعلان کر سکتے ہیں جبکہ انہوں نے صدیوں سے خدا کا نام لے کر سیاہ فام لوگوں کو غلام بنائے رکھا۔

یہودی فلاسفر رچرڈ ریوبنسٹن (Richard Rubenstein) پوچھتا ہے کہ ہولوکوسٹ کے اتنے کم عرصے کے بعد انسان کیسے لادینی زندگی پر فخر کر سکتا ہے اور جشن منا سکتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ تاریخی خدا تو ہولوکوسٹ میں مر گیا لیکن یہودیوں کو اب بھی مذہب اور روحانیت کی ضرورت ہے۔ ریوبینسٹن کو یہودی صوفیا کا خدا زیادہ پسند تھا جو تصورات کی نسبت انسانی تجربات سے زیادہ قریب تھا۔

تاریخ کے سنگین حادثات کے باوجود بہت سے لوگوں کا ایک طاقتور خدا پر ایمان متزلزل نہیں ہوا ۔ ان کا کہنا ہے کہ ہولوکوسٹ میں ایسے لوگ بھی پائے گئے تھے جنہوں نے آزمائش کی گھڑیوں میں بھی خدا کو یاد رکھا اور اپنے ایمان کو تکالیف اور مصائب سے متاثر نہ ہونے دیا ۔

پول ٹلچ (Paul Tillich 1868 - 1965) کا خیال تھا کہ ایسے روایتی خدا کی، جو انسانوں کی روزمرہ کی زندگی کو متاثر کرتا ہے، رخصتی کا وقت آگیا ہے لیکن وہ انسانیت کی بقا اور ارتقا کے لئے مذہب اور روحانیت کو ضروری سمجھتا تھا ۔ ٹلچ ایسے خدا کا قائل نہ تھا جو انسانی آزادی اور تخلیقی زندگی کو متاثر کرے ۔ اس کا کہنا تھا کہ خدا انسانی ذات اور تجربے کا حصہ ہے باہر کوئی چیز نہیں ۔

جہاں عیسائی فلاسفر خدا، مذہب اور سائنس کو نئے انداز میں دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے وہیں یہودی اور مسلمان فلاسفر بھی ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی جدوجہد کر رہے تھے ۔

مسلمانوں کے مفکر ابوالکلام آزاد نے قرآن کی نئے انداز میں تشریح اور اس کی آیات کی استعاراتی انداز میں تفسیر کرنی چاہی ۔ انہوں نے سائنس اور مذہب میں ایک توازن قائم کرنا چاہا ۔ آزاد کے علاوہ کئی اور فلاسفروں نے بھی صوفیا کے مسلک کو دوبارہ خوش آمدید کہا ۔

ایران میں ڈاکٹر علی شریعتی (Ali Shariati) نے عوام میں نیا جذبہ اور ولولہ پیدا کرنے کی کوشش کی ۔ شریعتی کا کہنا تھا کہ مغربی افکار اور طرز زندگی نے مسلمانوں کو اپنی روایات اور اسلام سے دور کر دیا ہے ۔ مسلمانوں کو دوبارہ اپنے ماضی کی طرف رجوع اور اپنے ایمان کو تازہ کرنا چاہیئے ۔ شریعتی کا فلسفہ شاہ ایران کو پسند نہ آیا اور انہیں شاہ کی خفیہ پولیس کے ہاتھوں بہت سی اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا ۔

مارٹن بیوبر (Martin Buber 1879 - 1965) نے اپنے فلسفے سے یہودیت میں نئی روح پھونکی ۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان جب دنیا کے کسی انسان یا چیز سے مخاطب ہوتا ہے تو یا تو وہ I -- Thou کا روحانی رشتہ قائم کرتا ہے اور یا I -- It کا مادی رشتہ ۔ ان کا خیال تھا کہ خدا ہر شخص اور ہر چیز میں موجود ہے ۔ بیوبر روایتی مذہب، تورات اور خدا کے خلاف تھے ۔ وہ خدا کے قانون نافذ کرنے والے (Law Giver) کے تصور کو نہ مانتے تھے بیوبر کے غیر روایتی نظریات یہودیوں میں کم اور عیسائیوں میں زیادہ مقبول ہوئے ۔ بیوبر کا خیال تھا کہ "خدا" کا لفظ اپنی قدر کھو چکا ہے اس لئے جب ہم وہ لفظ استعمال کرتے ہیں تو ایک صحتمند اور سچا مکالمہ نہیں ہو سکتا کیوں کہ تاریخ میں "خدا" کے نام پر بہت سے ظلم اور زیادتیاں ہو چکی ہیں ۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں روحانیت کے لئے نئی زبان دریافت کرنی ہوگی ۔

ابراہام جوشوا (Abraham Joshua 1907 - 1972) کا خیال تھا کہ

ہمیں تورات کو از سر نو پڑھنا ہو گا اور آسمانی آیات کے نئے معانی تلاش کرنے ہوں گے۔ ایسے معانی جو بدلتی ہوئی اقدار میں ہماری رہنمائی کر سکیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہمیں مذہب کی گہرائیوں (Depth Theology) میں اترنا ہو گا۔

مارکسی فلاسفر ارنٹ بلوچ (Ernt Bloch 1885 - 1977) کی نگاہ میں انسانوں کے لیے ہر دور میں خدا کا تصور رکھنا ایک فطری عمل رہا ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان ہر عہد اور زندگی کے ہر مرحلے میں مستقبل کی طرف دیکھتا ہے اور اپنی کوششوں کے بارآور ہونے کی امید رکھتا ہے۔ بچپن سے لڑکپن اور لڑکپن سے جوانی کا سفر اسی امید پر قائم ہے۔ انسان اپنی زندگی میں بہت سے خواب دیکھتا ہے اور پھر ان خوابوں کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتا ہے۔ اس سفر میں اسے ایمان کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ وہ مصائب اور مسائل کا مقابلہ کر سکے۔ بلوچ کا خیال تھا کہ جہاں امید ہے وہاں مذہب ہے اور خدا انسانوں کے ایک مثالی معاشرے اور زندگی کا نام ہے جو انسانی ارتقا کے لیے نہایت اہم ہے۔

۱۹۷۰ء کی دہائی میں مذہب نے ایک شدت پسند صورت اختیار کر لی اور بین الاقوامی طور پر مذہب کے سیاسی رخ نے زور پکڑا۔

امریکہ میں جیری فالول (Jerry Falwell) اور انگلستان میں موریس سیرولو Maurice Cerullo نے عیسائیت کی تبلیغ زوروں پر شروع کر دی اور وہ ایک دفعہ پھر عوام کو جہنم کی آگ سے ڈرانے لگے۔

مسلم دنیا میں بھی اسلام کے پیروکاروں میں ایک شدت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے کئی حکومتوں کا تختہ الٹنے کی کوشش کی تاکہ مذہبی حکومتیں قائم کی جا سکیں۔ وہ سب مسیح موعود کے آنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔

یہودیت میں بھی مذہب نے شدت اختیار کر لی اور راہبوں کے لہجے میں سختی اور تندی پیدا ہو گئی۔ راہب میر کاہان (Meir Kahane) نے ۱۹۹۰ء کی تقریر میں نیویارک میں کہا تھا "یہودیت کا ایک ہی درس ہے اور وہ درس خدا کی فرمانبرداری کا ہے۔ کبھی خدا جنگ کا حکم دیتا ہے کبھی امن کا۔ خدا کا مقصد یہ ہے کہ ہم اس ملک میں آکر ایک یہودی ریاست قائم کریں۔"

جب خدا اور مذہب کی تبلیغ سننے والے یہ دیکھتے ہیں کہ مذہب کے مبلغ خدا کے نام پر دوسری قوموں سے ان کے انسانی حقوق چھین رہے ہیں تو وہ مذہب سے بدظن ہونے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب کی اس قسم کی تبلیغ جو احترام آدمیت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرے دراصل یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے بنیادی اصولوں کے خلاف ہے۔ ایسے مبلغوں نے خدا کو بھی ایک بت بنا دیا ہے۔

جب جب یہودیوں ، عیسائیوں اور مسلمانوں نے اپنے آپ کو خدا کے چہیتے بندے Chosen people قرار دیا اور اپنی قوم کو دوسری قوموں سے بہتر اور اعلیٰ ظاہر کیا اس سے دوسری قوموں کی انا مجروح ہوئی اور مختلف قوموں کے درمیان رشک، حسد، تلخی اور نفرت کے جذبات ابھرے ۔ مشرق وسطیٰ کے پیغمبر لوگوں کو ملانے آئے تھے نہ کہ جدا کرنے ۔ وہ انسانی معاشرے میں انسان دوستی کی روایت قائم کرنے آئے تھے نہ کہ انسان دشمنی کی ۔ لیکن ان کے پیروکاروں نے ان کے پیغام کی روح فراموش کر دی ۔ وہ مختلف فرقوں میں بٹ گئے انہوں نے انسانوں کو ایک دوسرے سے جدا اور مذہب سے دور کر دیا ۔

چاہے وہ یہودیت ہو، عیسائیت ہو یا اسلام سب مذاہب نے انسانوں کو اپنے ذاتی اور گروہی مفادات اور تعصبات سے بالاتر ہو کر پوری انسانیت کی فلاح کے بارے میں سوچنے کا مشورہ دیا تھا لیکن بدقسمتی سے تینوں مذاہب ان مقاصد میں ناکام رہے ۔ ان کے مبلغوں اور اصحاب اقتدار نے خدا اور مذہب کے نام پر اتنے مظالم ڈھائے کہ دنیا بھر کے انسان ان مذاہب سے ناامید ہو گئے ۔ وہ مذاہب جو دنیا میں امن، انصاف اور انسان دوستی کا پیغام لے کر آئے تھے ان کے پیروکاروں نے ان روایات اور اقدار کا بالکل احترام نہیں کیا ۔

تاریخی حوالے سے ہر مذہب کے پیروکاروں میں ایک سے زیادہ گروہ رہے ہیں ۔ بعض گروہ قوانین اور شریعت پر زور دیتے ہیں اور معاشرے میں ان قوانین کی پابندی کرنے پر لوگوں کو مجبور کرتے ہیں اور بعض گروہ ایک بہتر زندگی گزارنے کے لیے روحانیت اور تصوف کا راستہ اختیار کرتے ہیں ۔ وہ ذات کی طہارت، تقویٰ اور زندگی میں اعلیٰ اقدار پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں ۔ ان کی نگاہ میں مذہبی خیالات اور نظریات کی بجائے روحانی تجربات اور اعمال زیادہ اہم ہیں ۔ وہ خدا کو آسمانوں میں کسی بادشاہ کی طرح تخت پر بیٹھی ذات نہیں سمجھتے جو احکام جاری کرتی ہے بلکہ انسانی قلوب میں چھپی ذات سمجھتے ہیں جو تنہائی میں روحانی تجربات کے دوران سرگوشیاں کرتی ہے ۔

خدا کا بڑے بھائی (Big brother) کا اور قانون دینے والے (Law Giver) کا تصور ماضی کے دھندلکوں میں کھوتا جا رہا ہے اور روحانیت اور تصوف کا تصور مقبول ہوتا جا رہا ہے ۔

خدا کا وہ تصور جو فلاسفروں نے پیش کیا تھا اس تصور کا سائنس، طب اور ریاضی سے تضاد پیدا ہوتا رہا ۔ انسانوں کو خدا کے ایسے تصور کی ضرورت تھی جو سائنس، طب اور ریاضی سے ماورا ہو اور اس کی ذات پر وہ اصول اور قوانین نہ نافذ کیے جائیں جو طبعی دنیا پر لاگو کیے جاتے ہیں سائنسی دور میں ہم خدا کا وہ تصور نہیں رکھ سکتے جو ہمارے بزرگوں نے رکھا تھا ۔ ہمیں خدا کا ایسا تصور پیدا کرنا ہو گا جو سائنسی تحقیقات کے ساتھ قدم ملا کر چل سکے ۔

البرٹ آئن سٹائن (Albert Einstein) کا خدا کا تصور بھی صوفیا والا تھا۔ ۱۹۲۱ء میں اس کے انگلستان کے دورے کے دوران جب اس سے ایک پادری نے سوال کیا کہ کیا اس کے نظریہ اضافت نے مذہب کو متاثر کیا ہے تو اس نے کہا تھا " نہیں ۔ نظریہ اضافت ایک سائنسی تحقیق کا معاملہ ہے اس کا مذہب سے کوئی تعلق نہیں ۔"

ہمارے عہد میں ایک طرف سٹیون ہاکنگ (Stephen Hawking) جیسے سائنسدان ہیں جو اپنی سائنسی کائنات میں خدا کا وجود نہیں پاتے اور دوسری طرف وہ سائنسدان ہیں جو کائنات میں خدا کو تلاش کرنے کے حق میں بھی نہیں ہیں ۔ ان کا کہنا ہے کہ آسمانی کتابوں میں خدا کا ذکر علامت اور استعارے کے حوالے سے آیا ہے نہ کہ ایک مادی شئے کی طرح جسے آسمان کی بلندیوں میں تلاش کیا جاسکے ۔

خدا کا روایتی تصور اخلاقی ، سائنسی ، نظریاتی اور روحانی سب حوالوں سے ناقابل قبول بنتا جا رہا ہے ۔ نسوانی آزادی اور حقوق کی تحریک (Feminist movement) کے نمائندوں نے بھی روایتی خدا کے خلاف احتجاج کیا ہے کیوں کہ وہ مذاہب میں ہمیشہ مرد کی صورت میں پیش کیا گیا ہے جو ہمیں ماضی کے قبائیلی سرداروں (Chiefs) کی یاد دلاتا ہے ۔

جب روایتی مذاہب کا خدا اور ان فلاسفروں کا خدا جو منطق کا غلام ہے سائنسی دور میں مات کھا گیا ہے تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ آج کا دور صوفیاء کے خدا کے تصور کو قبول کر سکتا ہے شاید اسی لیے صوفیاء نے خدا کے لیے " وجود " کے تصور کی بجائے " عدم " (Nothing) کا تصور پیش کیا تھا تا کہ لوگ اسے کائنات میں سائنس کے ذریعہ ڈھونڈنے کے سراب میں گرفتار نہ ہوں اور اسے اپنی ذات کی گہرائیوں میں تلاش کریں ۔ صوفیاء چاہتے تھے کہ لوگ خدا کو ایک خیال ایک تصور یا ایک ذات کی بجائے ایک روحانی تجربے کے طور پر قبول کریں اور اسے موسیقی اور فنون لطیفہ کی طرح محسوس کریں ۔ صوفیاء جانتے تھے کہ عقل کا دائرہ محدود ہے اور انسانوں کے روحانی تجربے کا دائرہ وسیع تر ۔ صوفیاء کے خدا سے نسوانی آزادی کی تحریک کی نمائندوں کو بھی شکایت نہیں ہونی چاہیئے کیوں کہ صوفیاء کے خدا کے تصور میں مردانگی اور نسوانیت کا توازن قائم ہے ۔

صوفیا کے تصوف پر تاریخی طور پر بہت سے اعتراضات ہوئے ہیں ۔ انہیں یہودی ، عیسائی اور مسلمان فلاسفروں اور مذہبی رہنماؤں نے ہمیشہ شک کی نگاہ سے دیکھا ہے لیکن ۱۹۹۰ء کی دہائی کے بعد مغرب میں از سر نو تصوف کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے جو یوگا ، بدھ ازم اور انسانی نفسیات میں دلچسپی کے طور پر ظاہر ہو رہا ہے ۔

صوفیا کے خدا کے تصور اور تجربے کے ادراک کے لیے طویل ریاضت کی ضرورت ہے ۔ صوفیا کا کہنا ہے کہ وہ قومیں جو کاروباری اور مادی ترقی ، جسمانی لذت اور اپنی خواہشات کی فوری

تسکین کو اپنی اقدار بنائیں ان کے لیے صداقت، حق اور معرفت کی تلاش کے لیے قربانیاں دینا مشکل ہو جاتا ہے۔ صوفیا کے خدا تک رسائی کے لیے ہمیں بہت سی قربانیاں دینی پڑتی ہیں جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔

صوفیا کا خدا کا تجربہ ایک روحانی تجربہ ہے جسے کسی نظم، پینٹنگ یا موسیقی کی طرح محسوس تو کیا جا سکتا ہے دوسروں کو عقل اور دلائل کے ذریعہ سمجھایا نہیں جا سکتا۔

انسانی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پیغمبروں نے بھی اپنے روحانی تجربوں کو عوام کے سامنے استعاراتی انداز میں پیش کیا تھا اور امید کی تھی کہ وہ اسے عقل سے سمجھنے کی بجائے اپنے داخل کی آنکھ سے دیکھیں اور اپنے دل کی گہرائیوں میں محسوس کریں۔

تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ خدا کا تصور قوموں کے مزاج کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا ہے جب جب خدا کا ایک تصور لوگوں کے لیے ناقابل قبول ہوتا گیا تو وہ نئی علامتوں اور نئے استعاروں کو جنم دیتے رہے اور خدا کا نیا تصور پیش کرتے رہے۔

انسانوں نے ہمیشہ اپنی انفرادی زندگی کی بے معنویت اور معاشرتی زندگی کی ناانصافیوں کو دور کرنے کے لیے اپنے ایک ایمان، ایک نظریہ اور ایک طرز زندگی اپنایا ہے اور جب بھی وہ اس میں ناکام رہے تو ان کی زندگی ایک خلا اور ایک کرب سے آشنا ہوئی۔

امریکہ میں اگرچہ ۹۹ فی صد لوگ کہتے ہیں کہ وہ خدا پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کی زندگی میں روحانی اقدار کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی۔ ان کی جرائم پیشہ اور نشہ آور ادویہ کے استعمال سے بھرپور زندگی اور مجرموں کو سزائے موت کی درخواست یہ بتاتی ہے کہ اس معاشرے کا روحانی طور پر دیوالیہ نکل چکا ہے اور عوام روحانی طور پر مردہ ہو چکے ہیں۔

انسانی تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی انہیں ناامیدی، مایوسی اور اقدار کے بحران کا سامنا ہوا ہے انہوں نے اپنی زندگی میں نئے معانی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ہم اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ اس مسئلے کا حل ایسی مذہبی شدت پسندی میں تلاش کرنا جس میں احترام آدمیت کی قدر کو پامال کیا جائے خود فریبی سے زیادہ کچھ نہیں۔

اگر ہم نے اکیسویں صدی کے لیے ایک نئے ایمان، نئے مذہب اور نئے خدا کو تخلیق کرنا ہے تو ہمیں خدا اور مذہب کی ہزاروں سالوں کی تاریخ پر کافی دیر تک سنجیدگی سے غور، فکر اور تدبر کرنا ہوگا۔

(کیرن آرمسٹرانگ کی کتاب A History of God کے ایک باب کا ترجمہ)

اونامونو
ترجمہ: مریم زمانی

سینٹ مینوئل بوئنو، شہید

If in this life only we have hope in christ, we are of all men most miserable
I Cornithians xv. 19

علاقہ رینادا کے بشپ نے، جن کے حلقے میں میرا پیارا گاؤں لیو کرنا شامل ہے، ہمارے ڈان مینوئل کو، بلکہ زیادہ صحیح الفاظ میں، سینٹ مینوئل بوئنو کو، کلیسا کے اولیا میں شامل کرنے کی رسومات کا آغاز کر دیا ہے۔ آج، اس وقت میں چاہتی ہوں کہ اس انسان کے بارے میں جو کچھ مجھے معلوم اور یاد ہے اسے یہاں بطور اعتراف پیش کر دوں۔ میں ایسا کیوں کرنا چاہتی ہوں، یہ خدا بہتر جانتا ہے۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں۔ یہ انسان جس کے بارے میں میں یہ سطور لکھ رہی ہوں، میرا سچا روحانی باپ تھا۔ اس نے میرے اندرونی وجود کو زندگی بخشی، وہ میری روح کا۔ انجیلا کر بیلنیو کی روح کا۔۔ باپ تھا۔

میرا دوسرا زمینی باپ، جس کا خون میری رگوں میں دوڑ رہا ہے، اس کے بارے میں مجھے بہت کم معلوم ہے کیوں کہ وہ میرے ہوش سنبھالنے سے قبل ہی اس دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ وہ اس علاقہ میں اجنبی تھا اور میری ماں سے بیاہ کرنے کے بعد یہاں بس گیا تھا۔ میرا باپ اپنے ساتھ کچھ کتابیں لے کر آیا تھا۔ ڈان کوئٹے، کچھ کلاسیکی ڈرامے، چند ایک ناول اور کچھ تاریخ کی کتابیں۔ ایک پلندے میں بندھی ہوئی ان سب کتابوں نے جو اس گاؤں میں نوادر کی حیثیت رکھتی تھیں، میرے بچپن کے خوابوں کی تشکیل کی۔ ماں نے مجھے میرے باپ کے مشاغل یا خیالات کے بارے میں کبھی کچھ نہیں بتایا۔ ڈان مینوئل سے محبت اور عقیدت نے جس میں گاؤں کے تمام لوگ شریک تھے، میری ماں کے ذہن سے اس کے شوہر کی یادوں کے سارے نقوش دھندلا دیئے تھے۔ ڈان مینوئل سے اس کی محبت یقیناً پاک اور غیر آلودہ تھی۔ ہر رات دعا کے وقت وہ اپنے شوہر کی مغفرت کیلئے پورے خشوع و خضوع سے دعا کرتی تھی۔

مجھے ڈان مینوئل اس طرح یاد ہیں جیسے یہ ابھی کل کی بات ہو جب میں ابھی رینادا کے

کانونٹ اسکول میں داخل ہونے سے پہلے دس سال کی بچی تھی۔ اس وقت ڈان ینوئل کی عمر کوئی سینتیس سال کی رہی ہوگی۔ دبلا پتلا بدن، سید ھا طویل القامت۔ سر اٹھا کر چلنے کا انداز ایسا پر شکوہ جیسے ہمارے گاؤں کا پہاڑ اپنی چوٹی کو اوپر اٹھائے ہوئے کھڑا ہے۔ ان کی آنکھوں میں ہمارے گاؤں کی جھیل کی ساری اتھاہ نیلاہٹ سمٹ آئی تھی۔ لوگوں کی نظریں بے اختیارانہ ان کی طرف اٹھ جاتی تھیں اور نظروں کے ساتھ دیکھنے والوں کے قلوب بھی ڈان ینوئل کی طرف کھنچ جاتے تھے۔ (جب وہ کسی کی طرف نگاہ کرتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے ہمارے جسم شیشے کی طرح شفاف ہوگئے ہیں اور ان کی نگاہ ہمارے دلوں کو دیکھ رہی ہے۔) ہم سب ڈان ینوئل سے محبت کرتے تھے۔ خصوصاً چھوٹے بچے تو ان پر دل و جان سے فدا تھے۔ ان کے اردگرد ایک تقدس کی مہک تھی اور سارا گاؤں اس خوشبو کے نشے میں چور تھا۔

انہیں دنوں کی بات ہے کہ میرے بھائی لزارونے، جو امریکہ میں مقیم تھا اور وہاں سے ہماری آرام دہ زندگی کی کفالت کے لیے روپیہ بھیجتا تھا، میری ماں پر زور ڈالا کہ مجھے کانونٹ اسکول میں داخل کرا دیا جائے تاکہ میں گاؤں کی فضا سے نکل کر تعلیم حاصل کر سکوں۔ اس بات کے باوجود کہ وہ کانونٹ کی راہبات سے زیادہ خوش نہیں تھا، اس نے لکھا "جہاں تک میرا خیال کام کرتا ہے اس علاقے میں غیر دینی مدرسے، خصوصاً لڑکیوں کے لیے بالکل عنقا ہیں لہذا جو اسکول موجود ہے اسی کو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ یہ امر بے حد اہم ہے کہ انجیلا کے ذہن کی تراش خراش ہو سکے اور وہ گاؤں کی لڑکیوں سے الگ اور مختلف بن سکے"۔ لہذا میں اسکول جانے لگی۔ پہلے میرا خیال تھا میں ٹیچر بنوں گی لیکن بعد میں پتہ چل گیا کہ یہ میرے بس کا روگ نہ تھا۔

اسکول میں میری جان پہچان شہر کی کئی لڑکیوں سے ہوئی اور چند ایک کے ساتھ دوستی بھی ہو گئی لیکن گاؤں سے میرا جو تعلق تھا وہ ہمیشہ باقی رہا۔ وہاں کا سارا حال بلاناغہ خطوط اور کبھی کبھار وہاں سے آنے والے ملاقاتیوں کے ذریعہ، مجھے معلوم ہوتا رہتا تھا۔ (ہمارے پریسٹ کی شہرت، جواب روم تک کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا چکی تھی، رفتہ رفتہ مدرسے تک بھی پہونچ گئی تھی۔ کانونٹ کی راہبات کرید کرید کر ان کے بارے میں استفسارات کرتیں۔)

بچپن ہی سے میرا ذہن ہمیشہ طرح طرح کے خیالات اور شکوک سے بھرا ہوا تھا۔ ممکن ہے اس کا باعث ان ڈھیر ساری کتابوں کا مطالعہ ہو جو میرے باپ نے رکھ چھوڑی تھیں۔ اسکول پہنچ کر ان خیالات میں اور ترقی ہوئی اس میں میری ایک ہم جماعت لڑکی کی دوستی کا بھی بہت ہاتھ تھا۔ اس لڑکی کو نہ جانے کیوں مجھ سے لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ کبھی وہ کہتی کہ (ہم دونوں اسی کانونٹ کی خانقاہ میں داخل ہو کر تاعمر راہبات بنی رہنے کا عہد کریں اور اس عہد پر اپنے خون سے دستخط کر دیں اور کبھی آنکھیں نیم بند کئے خوابناک انداز میں محبوبوں اور ازدواجی زندگی کے رومانی تجربوں کی باتیں کرتی۔) اسکول سے نکلنے کے بعد پھر مجھے اس کی خبر نہیں ملی۔ پتہ نہیں وہ کہاں ہے

زندہ ہے یا مر گئی ۔ حالانکہ اسکول کے زمانے میں جب کبھی میں ڈان ینوئل کا نام لیتی یا ماں کے خطوط، جو ڈان ینوئل کے ذکر سے بھرے ہوتے تھے، اسے بتاتی تو وہ وارفتہ ہو جاتی تھی اور مجھے قسمیں دیتی تھی کہ جب میں گاؤں واپس جاؤں تو مجھے وہاں سے ڈان ینوئل کے بارے میں لمبے لمبے خط لکھ کر ایک ایک بات بتانی ہو گی ۔

میں نے اسکول میں تقریباً پانچ سال گذارے ۔ اب سوچتی ہوں تو ایسا لگتا ہے جیسے وہ دور ایک مبہم دیکھا ہوا خواب تھا جو یادوں کے دور افتادہ افق میں کھو گیا ۔ میں پندرہ سال کی عمر میں گاؤں لوٹ آئی ۔ گاؤں ۔ جس کا دوسرا نام اب ڈان ینوئل تھا ۔ (ڈان ینوئل ، گہری نیلی جھیل ، فلک بوس پہاڑ ۔ میں ڈان ینوئل کو دیکھنے اور جاننے کی تمنا لیے ہوئے آئی تھی ۔ میں اپنے آپ کو ان کی رہنمائی میں دے دینا چاہتی تھی تاکہ وہ میری زندگی کو اس کی منزل کا راستہ بتا سکیں ۔

لوگوں کا کہنا تھا کہ ڈان ینوئل نے راہبوں کے دارالعلوم میں داخلہ دراصل اس وجہ سے لیا تھا کہ ان کے کندھوں پر اپنی ایک بیوہ بہن کے بچوں کی کفالت کا بوجھ آپڑا تھا ۔ (دارالعلوم میں انھوں نے اپنی صلاحیتوں اور طباعی کی بنا پر بڑا نام پیدا کیا ۔ کلیسا میں ان کے لیے ایک شاندار مستقبل چشم براہ تھا لیکن انھوں نے ہر پیشکش کو صرف اس لیے مسترد کر دیا کہ وہ لیو کرنا کو چھوڑ کر کہیں اور رہنا نہیں چاہتے تھے) ۔ لیو کرنا میں ۔ اس دور افتادہ گاؤں میں جو جھیل اور جھیل کی سطح پر جھلکنے والے پہاڑوں کے درمیان ایک کڑی کی حیثیت سے واقع ہوا تھا ۔ ڈان ینوئل اپنی ساری زندگی گذار دینا چاہتے تھے ۔

(اور اس گلہ بان کو اپنی بھیڑوں سے کتنی محبت تھی! ٹوٹتے تعلقات کو جوڑنا ، اجڑے گھروں کو بسانا ، بغاوت پر کربستہ نوعمر اور ناسمجھ جوانیوں کی فہمائش ، بچوں سے ماں باپ کی اطاعت کرانا اور والدین سے بچوں کے جائز مطالبات پورے کرانا ۔ اور سب سے بڑھکر ، مصیبت زدوں کی تالیف قلب اور مرنے والوں کے نزع کے لمحات کو آسان بنانا اور ان کی روحوں کے لیے دعا کرنا ۔ انہیں کاموں میں ڈان ینوئل کی زندگی بسر ہوئی) ۔

اس قسم کے واقعات کئی تھے ۔ مجھے یہاں بوڑھے رابونا کی بدنصیب بیٹی کا واقعہ یاد آرہا ہے جو شہر کو بھاگ گئی تھی ۔ جب وہ لٹ لٹا کر ایک عدد ناجائز بچے کو گود میں لیے لوٹی تو ڈان ینوئل نے اس وقت تک چین نہیں لیا جب تک کہ انھوں نے اس کے سابق عاشق پیروٹے کو اس سے شادی کرنے اور اس بچے کو اپنانے پر آمادہ نہیں کر لیا ۔ پیروٹے نے پہلے تو کافی احتجاج کیا کہ کسی اور کا بار وہ کیوں اٹھائے جبکہ ناجائز بچے کی اس پر کوئی ذمہ داری نہیں عائد ہوتی ۔ " اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے " پیروٹے نے کہا ۔ (" لیکن یہ کسے معلوم ہے پیروٹے ؟ " ڈان ینوئل نے کہا " اس کی خبر کس کو ہے ؟) پھر یہ بیگناہی ثابت کرنے اور الزام لینے کا معاملہ نہیں ہے یہ تو ان باتوں سے بہت آگے کی چیز ہے " ۔ اور آج روگی اور مفلوج پیروٹے کے بڑھاپے کا سہارا وہی

ہے جو اس کا بیٹا نہیں تھا لیکن جسے اس نے ڈان ینو ئل کی وجہ سے اپنایا تھا۔

گاؤں میں دستور تھا کہ وسط بہار کی شب کو، جو سال کی مختصر ترین رات ہوتی ہے۔ گاؤں کی ساری بڑھیائیں اور کافی تعداد میں بوڑھے مرد، جو زیادہ تر ہسٹیریا اور مرگی کے مریض تھے، لیکن اس توہم میں مبتلا تھے کہ ان پر جادو کا اثر یا بھوت پریت کا سایہ ہے جھیل کے گرد اکٹھا ہوتے۔ ڈان ینو ئل نے ان لوگوں کی تکالیف دور کرنے اور امکانی حد تک انہیں اپنی بیماریوں سے نجات دلانے کے لیے جھیل کے منزہ آب شفا کی جگہ خود لے لی۔ ان کی موجودگی کا اثر لوگوں کی ان سے عقیدت سب سے بڑھ کر ان کے الفاظ کی ناقابل بیان طاقت اور ان کی آواز کا سحر ایسا تھا کہ بے شمار مریض حیرت انگیز طور پر شفایاب ہو کر واپس جاتے تھے۔ اس طرح ڈان ینو ئل کی شہرت بڑھتی گئی اور قریب و دور کے مقامات سے سارے مریض اور روگی جھیل کی طرف کھنچ کر آنے لگے۔ ایک بار ایک عورت اپنے اکلوتے لڑکے کو لیکر آئی، اور مستدعی ہوئی کہ وہ اسے اپنی کرامت سے بچالیں۔ ڈان ینو ئل کے ہونٹوں پر ایک اداس مسکراہٹ پھیل گئی "مجھے بشپ نے کرامتیں دکھانے کی اجازت نہیں دی ہے" انھوں نے اسے جواب دیا۔ انہیں اس بات کا خاص خیال تھا کہ لوگ صاف ستھرے رہا کریں۔ سال نو کے موقعہ پر جب لوگ انہیں تہنیت دینے آتے تو ان کا اصرار ہوتا کہ وہ نئے لباس میں ہوں اور جن لوگوں میں اس کی استطاعت نہیں ہوتی انہیں وہ اپنی طرف سے کپڑے تقسیم کرتے۔

ان کا برتاؤ ہر ایک کے ساتھ یکساں طور پر شفقت آمیز تھا۔ وہ اپنے برتاؤ میں اگر تخصیص برتتے بھی تھے تو انہیں لوگوں کے ساتھ جو زیادہ دکھی یا زیادہ سرکش معلوم ہوتے تھے۔ گاؤں میں ایک پاگل رہتا تھا۔ سارا گاؤں اسے بے وقوف بلاسیلو کے نام سے پکارتا تھا لیکن اس پاگل کے ساتھ وہ بے حد نرمی اور ملائمت سے پیش آتے تھے۔ اسے انھوں نے ایسی باتیں سکھادیں جن کا سیکھنا اس پاگل کے لیے ایک معجزے سے کم نہ تھا۔ پاگل بلاسیلو جب ایک بندر کی طرح ڈان ینو ئل کی نقل کرتا تو ایسا معلوم ہوتا جیسے اس پاگل کے دماغ کے کونے کھدروں میں عقل و شعور کی دبی ہوئی دو چار خاکستر پوش چنگاریاں بھڑک کر شعلہ بن گئی ہیں۔

ڈان ینو ئل کی آواز ان کا سب سے بڑا **اعجاز** تھی۔ ان کی آواز کا سحر آنکھوں کو اشکبار کر دیتا تھا اور سننے والوں کے دلوں میں **ایک تلاطم** برپا ہو جاتا تھا۔ ان کی آواز عبادت گاہ کے سقف و بام کو چیر کر جھیل اور دامن کوہ کی ہواؤں میں شامل ہو جاتی۔ گڈ فرائڈے کے دن وعظ کے دوران میں جب انھوں نے چلا کر کہا "یارب، یارب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" تو مجمع پر اس طرح لرزہ طاری ہو گیا جیسے برفانی باد شمال جھیل کی سطح پر ارتعاش پیدا کر دے۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ فریاد خود ہمارے آقا کی زبان سے نکل رہی ہو۔ جیسے یہ آواز اس قدیم صلیب سے آرہی ہو جس کے قدموں میں پشتہا پشت کی ماؤں نے اپنے اپنے دکھوں کی بھینٹ دی تھی۔ ڈان

مینوئل کی ماں جو اس موقع پر موجود تھیں، اس فریاد کو سن کر اپنے آپ پر قابو نہ رکھ سکیں۔ اور ان کی زبان سے بے اختیار "میرے بیٹے" کی چیخ نکل گئی۔ پورے چرچ میں کوئی آنکھ نہ تھی جو نم نہ ہوئی ہو۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ ماں کی پکار ماں مریم کے نیم وا ہونٹوں سے نکلی ہو۔ اس دن کے بعد پاگل بلاسیلو کا یہ معمول ہو گیا کہ جب بھی سڑک پر سے گذرتا تو ایک جگر خراش آواز میں صدائے بازگشت کی طرح دہراتا "یارب، یارب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟" اس کی آواز سن کر لوگ آبدیدہ ہو جاتے، وہ اپنی کامیاب نقل پر مسرور ہو جاتا۔

ڈان مینوئل کی موجودگی میں کوئی شخص جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ ایک بار پاس کے گاؤں میں چوری کی زبردست واردات ہو گئی تو ایک بر خود غلط آدمی نے جو ڈان مینوئل کے مرتبہ سے ناواقف تھا، انہیں بلا بھیجا اور کہا کہ وہ ملزم کی زبان سے اعتراف جرم کرائیں۔ ڈان مینوئل نے جواب دیا "جناب میں کسی شخص کی زبان سے ایسی بات نہیں نکلواتا جو اسے موت کے منہ میں پہونچا دے۔ یہ خدا اور بندے کا معاملہ ہے۔ انسانی انصاف میرا کام نہیں ہے۔ ہمارے آقا کا حکم ہے دوسروں کا احتساب نہ کرو تاکہ تمہارا احتساب نہ کیا جائے۔"

"لیکن، فادر میرے متعلق ...."

"میں جانتا ہوں" ڈان مینوئل نے کہا۔ "آپ سیزر کا حق سیزر کو دیدیجئے اور میں جو خدا کا حق ہے وہ خدا کو دے دوں گا۔"

جب وہ چلنے لگے تو انھوں نے مشتبہہ شخص پر ایک گہری نظر ڈالی اور کہا "اس کا اطمینان کر لو کہ خدا نے تمہیں معاف کر دیا ہے کیونکہ بالاخر یہی چیز اہم ہٹرتی ہے۔"

سارا گاؤں بڑی پابندی کے ساتھ ماس میں حاضری دیتا، اور کچھ نہیں تو کم از کم اس لیے کہ ڈان مینوئل کو دیکھا اور سنا جا سکے۔ عبادت کراتے وقت ان کی شخصیت اور ہی ہو جاتی اور چہرہ ضیاء بار ہو جاتا۔ انھوں نے عبادت کا الگ ہی طریقہ بنا رکھا تھا۔ سب مرد و زن اور پیرو جوان ایک لے میں، ہم آہنگ ہو کر گاتے۔ "ایمان رکھتا ہوں میں خداوند خدا پر جو آسمانی باپ ہے اور رب ارض و سما ہے۔" یہ کورس نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک واحد اور متحد آواز ہوتی تھی جس میں ساری آوازیں، ہم آہنگ ہو کر ایک ایسے فلک بوس کوہ گراں میں بدل جاتی تھیں جس کی چوٹی کبھی کبھی بادلوں میں گم ہو جاتی ہے۔ اور جب گاتے ہوئے اس حصہ پر پہونچتے "ایمان رکھتا ہوں میں حشر و نشر پر، اس دنیا کے بعد آنے والی زندگی کی ابدیت پر" تو ایسا معلوم ہوتا جیسے ڈان مینوئل کی آواز جھیل میں سارے گاؤں والوں کی آواز میں، کھو گئی ہے اور واقعہ یہ تھا کہ وہ خاموش ہو جاتے تھے اور میرے کانوں میں اس شہر کی گھنٹیاں بجنے لگتیں جس کے بارے میں مشہور تھا کہ جھیل کی تہہ میں مدفون ہے وہ گھنٹیاں جن کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وسط بہار کی شب میں بھی سنائی دیتی ہیں۔ یہ ہمارے گاؤں کی روحانی جھیل میں مدفون شہر کی گھنٹیاں تھیں مجھے اپنے ان

بچھڑے ہوؤں کی آوازیں سنائی دیتیں جو ہمارے درمیان اولیا، کی شکل میں دوبارہ زندہ کئے گئے تھے۔

بہت دنوں کے بعد جب سینٹ مینوئل کا راز مجھ پر آشکار ہوا تو میں نے یوں محسوس کیا جیسے کوئی میر قافلہ صحرا کو عبور کرتے ہوئے منزل کے سامنے پہونچ کر دم توڑ دے اور اہل کارواں اسے اپنے کندھوں پر اٹھالیں تاکہ اس کے بے جان جسم کو ارض موعودہ کے سپرد کردیں۔

گاؤں کے بیشتر لوگ اپنے آخری وقت میں ان کا ہاتھ تھامے ہوئے جان دینا چاہتے تھے گویا یہ ہاتھ ان ڈوبنے والوں کے لیے متلاطم سمندر میں آہنی لنگر تھا۔ ڈان مینوئل نے کبھی بدعتیوں، آزاد خیالوں یا بے عقیدہ لوگوں کی زجر و توبیخ نہیں کی اور اس کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ گاؤں میں ایسے لوگ تھے ہی کہاں؟

ڈان مینوئل کی زندگی فکر و مراقبہ کی نہیں بلکہ عملی سرگرمی کی زندگی تھی۔ وہ ہر ممکن طریقے سے بیکاری سے بچنا چاہتے تھے۔ وہ مجھ سے کہتے "کیا کیا جاسکتا ہے کی بجائے "کیا ہوگیا" پر غور کرنا بیکار ہے۔ جو ہو چکا اس کی تلافی کی کوشش کو چھوڑ کر اس پر افسوس کرتے رہنا غلط بات ہے۔ عمل، عمل ہی سب کچھ ہے"۔ ڈان مینوئل بے کاری اور تنہائی سے ہمیشہ گریزاں رہے اور مجھے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی خیال، کوئی مسئلہ ان کے لیے اذیت کا سبب بنا ہوا ہے، یہی وجہ تھی کہ وہ ہمیشہ خود کو مصروف رکھتے تھے اور اکثر ان کی مصروفیتیں خود ساختہ ہوتی تھیں۔ لکھنے کا شغل وہ بہت کم کرتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کوئی قلمی سرمایہ نہیں چھوڑا۔ ویسے وہ ساری عمر دوسروں کے لیے، خصوصاً ان ماؤں کے لیے جنکے بچے پردیس میں ہوا کرتے تھے، خطوط لکھتے رہے۔ گاؤں کے کاموں میں انہیں جسمانی محنت اور مشقت سے بھی عذر نہ تھا۔ فصل کٹتی تو دھان کوٹنے اور پھٹکنے کے لیے پہونچ جاتے اور کام کے ساتھ ساتھ دوسرے کام کرنے والوں سے مفید اور دل بہلانے کی باتیں کرتے رہتے۔ کبھی کوئی مزدور بیمار ہوجاتا تو اس کی جگہ خود کام کرآتے۔

ایک دن انہیں راستے میں سردی سے ٹھٹھرتا ہوا ایک نو عمر لڑکا ملا جسے اس کے باپ نے دور جنگل میں بھٹکی ہوئی گائے پکڑ کر لانے کے لیے بھیجا تھا۔ "تم گھر جاؤ" انھوں نے لڑکے سے کہا "اور آگ تاپو۔ اپنے باپ سے کہنا ان کی گائے میں ڈھونڈ لاؤں گا"۔ اور جب وہ گائے کو رسی سے پکڑے ہوئے واپس لوٹ رہے تھے تو راستے میں لڑکے کا باپ خجالت میں ڈوبا ہوا ان کی تلاش میں آرہا تھا

جاڑوں میں وہ غریبوں کے لیے لکڑی کاٹ کر لاتے۔ گاؤں کا بوڑھا بلوط، جس کے سائے میں ان کا بچپن گذرا تھا، گر پڑا تو وہ اس کا تنا گھر لے گئے اور اس کے چھ تختے کاٹ کر اپنے پلنگ کی پائنتی میں رکھ چھوڑے اور باقی ماندہ حصہ غریبوں کے لیے خود کاٹا اور بچوں کے لیے اس

کے کھلونے بنائے۔

گاؤں کے ڈاکٹر کے ہمراہ مریضوں کو دیکھنے جانا ان کا معمول تھا۔ وہ اپنا نسخہ دیتا اور یہ اپنا مشورہ بھی اس میں شامل کر دیتے گاؤں میں ایک کہاوت مشہور تھی کہ "بچے جنت میں فرشتے بننے کے لیے مرتے ہیں۔" ڈان مینوئل کسی کو یہ کہتے ہوئے سنتے تو بہت برا مانتے تھے۔ وہ اسے کفر بکنے کا مترادف سمجھتے۔ کوئی بچہ مرجاتا تو انہیں بہت دکھ ہوتا تھا۔ ایک بار انھوں نے مجھ سے کہا تھا "مردہ بچے کی پیدائش یا پیدائش کے دوران بچے کا مرجانا اور خودکشی یہ سب میرے لیے دل دہلا دینے والے اسرار ہیں۔" ایک بار جب ایک آدمی نے خودکشی کر لی تو اس کے باپ نے جو باہر کے گاؤں کا رہنے والا تھا ڈان مینوئل کے چرچ کے وقف شدہ احاطے میں اپنے بیٹے کو دفنانے کی اجازت مانگی۔ انھوں نے اسے فوراً اجازت دے دی اور کہا "تم یقیناً اپنے لڑکے کو یہاں دفنا سکتے ہو۔ مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے اسنے اپنے آخری سانس کے وقت ضرور توبہ کر لی ہے"۔

اکثر وہ مدرسہ کی طرف جانکلتے اور بچوں کو پڑھانے میں خود بھی ٹیچروں کے ساتھ شریک ہوجاتے۔ دراصل وہ خلوت اور بے کاری سے دور بھاگتے تھے۔ کبھی نوجوانوں اور بچوں کے ساتھ وقت گزاری کے لیے وہ کھیل تماشوں میں شریک ہوجاتے۔ کتنی ہی بار انھوں نے ڈھولک بجانے کی ذمہ داری اس لیے قبول کر لی کہ سارے نوجوان اور دوشیزائیں رقص میں شریک ہوسکیں۔ کوئی دوسرا شخص ڈھولک بجاتا ہوا خاصہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا لیکن ان کے ہاتھوں میں یہ کام بھی ایک طرح کے تقدس کا حامل بن جاتا اور ایک مذہبی فریضہ کی ادائیگی معلوم ہونے لگتا۔

"لوگوں کے لیے" وہ کہتے "سب سے ضروری بات یہ ہے کہ وہ خوش و خرم رہیں، زندہ رہنے کی مسرت کو محسوس کریں۔ زندہ رہنے کی مسرت اور امنگ بنیادی چیز ہے۔ کسی کو بھی خدا کے مقرر کردہ وقت سے پہلے موت کی خواہش نہیں کرنی چاہیئے۔" "لیکن میں زندہ رہنا نہیں چاہتی" ایک نو عمر بیوہ نے کہا۔ "میں اپنے شوہر کے پاس پہونچ جانا چاہتی ہوں"۔

"نہیں" ڈان مینوئل نے کہا "تم یہیں رہ کر اپنے شوہر کی روح کے لیے سکون کی دعا مانگو

ایک بار شادی کی ایک محفل میں انھوں نے کہا "میرے بس میں ہوتا تو میں اس جھیل کے سارے پانی کو شراب میں بدل دیتا، ایسی شراب جو صرف اہتزاز و بہجت پیدا کرے مگر نشہ نہ لائے۔

ایک بار گاؤں میں ایک مفلوک الحال بازیگر اپنی ٹولی کے ساتھ آیا ہوا تھا۔ یہ ٹولی اس کی بیمار اور حاملہ بیوی اور تین بچوں پر مشتمل تھی جو تماشہ بنانے میں اس کی مدد کرتے تھے۔ وہ خود مسخرے کا سوانگ بھرتا تھا۔ ایک دن وہ چوپال میں اپنا کھیل بنا رہا تھا اور نہ صرف چھوٹے بچے

بلکہ بڑی عمر کے لوگ بھی ہنسی کے مارے بے حال ہو رہے تھے ۔ عین اسی وقت اس کی بیوی کی طبعیت بگڑ گئی اور اسے اپنے شوہر کو تماشہ بتاتے ہوئے چھوڑ کر اٹھ جانا پڑا ۔ بچوں کے قہقہے اور مسخرے کی مضطرب نگاہیں اس کا تعاقب کر رہی تھیں ۔ تھوڑی دیر کے بعد ڈان مینوئل سرائے کے اصطبل میں پہونچ گئے جہاں مسخرے کی بیوی اپنی آخری سانسیں لے رہی تھی ۔ وہ اس کے آخری لمحات کو آسان بنانے اور اسے سکون دینے کی کوشش کرتے رہے ۔ تماشہ ختم ہونے کے بعد جب مسخرے کو اس سانحہ کی خبر ملی تو اس کے ساتھ تماش بینوں کا سارا مجمع سرائے کی طرف مڑ گیا ۔ اصطبل میں ڈان مینوئل مردہ عورت کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے ۔ مسخرے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اس نے ڈان مینوئل کے ہاتھوں کو چومتے ہوئے گلوگیر آواز میں کہا " باپ تم سچ مچ کے ولی ہو " ڈان مینوئل نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھوں سے چھڑا لیا اور تماش بینوں کی طرف مڑتے ہوئے کہا " نہیں میرے دوست ولی تو تم ہو ، میں نے تمہیں اپنا کھیل بتاتے ہوئے دیکھا ہے اور میں جانتا ہوں تم یہ کھیل صرف اپنے بچوں کی روزی مہیا کرنے کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے بچوں میں مسرت بانٹنے کے لیے کھیلتے ہو ۔ تمہاری بیوی میرے سامنے آخرت کے سفر پر اس وقت روانہ ہوئی جب تم اپنا کام کر رہے تھے اور دوسروں کو خوشی دے رہے تھے ۔ یقین رکھو تمہارے بچوں کی ماں اپنے خالق حقیقی کے سایہ رحمت میں آسودہ ہے اور ایک دن تم اس سے جا ملو گے اور جنت کے فرشتوں کو اپنا کھیل دکھا کر ان سے ہنسی اور قہقہوں کی داد وصول کرو گے " ۔ سارا مجمع رقت زدہ ہو گیا اور ہر ایک کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے ۔ لیکن اس رونے میں دکھ کے ساتھ ساتھ ایک ایسی طمانیت کا عنصر بھی شامل تھا جو غم پر محیط ہو جاتا ہے ۔ بہت دنوں کے بعد اس واقعہ کی یاد نے مجھے یہ احساس دلایا کہ ڈان مینوئل کی مستقل خوش مزاجی اور شگفتگی دراصل ایک ظاہری ، دینوی نقاب تھی جس کے پیچھے ڈان مینوئل نے ایک بیکراں اور ابدی اداسی کو دوسروں کی نظروں سے چھپا رکھا تھا ۔

ہر آن کی مصروفیت ، ہر ایک کے کام میں شرکت ، ایسا معلوم ہوتا تھا ڈان مینوئل اپنے آپ سے تنہائی ذات سے فرار ڈھونڈنا چاہتے تھے ۔ " مجھے تنہائی سے خوف آتا ہے " وہ بار بار کہتے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ کچھ کچھ دنوں کے وقفے سے ، تنہا نکل پڑتے اور جھیل کا چکر کاٹ کر قدیم کلیسا کے ان کھنڈرات کی طرف جاتے جہاں ان دیندار سطرونی راہبوں کے جسم آسودہ خاک ہیں جنہیں تاریخ نے فراموشی کے اندھے غاروں میں دفن کر دیا ہے ایک راہب جو فادر کیپٹن کے نام سے مشہور تھا اس کا حجرہ بھی ان کھنڈرات میں تھا لوگوں کا کہنا تھا ۔ کہ فادر کیپٹن نفس کشی کے لیے اپنے آپ کو کوڑے مارتا تھا اور ایسی اذیتیں اٹھاتا تھا کہ اس کے خون کے چھینٹے اب تک حجرے کی دیواروں پر موجود ہیں ۔ یہاں پہونچکر ڈان مینوئل کا ذہن کیا سوچتا ہوگا ؟ ایک بار میں نے ان سے پوچھا تھا کہ وہ راہب کیوں نہیں بن گئے ۔ " اس لیے نہیں کہ مجھے اپنی بیوہ بہن اور بچوں کا خیال

تھا " انھوں نے کہا " ان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری میری نہیں خدا کی تھی ۔ لیکن جو چیز میرے راہب بننے میں مانع تھی وہ میری طبیعت تھی رہی خانقاہ میں شامل ہونے کی بات تو یہ گاؤں ، لیوکرنا، ہی میری خانقاہ ہے ۔ میں تنہا زندہ رہنے اور تنہا مرنے کے لیے نہیں بنا ہوں ۔ مجھے اپنے گاؤں کے لیے زندہ رہنا اور اپنے گاؤں کے لیے مرنا ہے ۔ اگر میں اپنے لوگوں کی روحوں کو بچا نہ سکوں تو پھر اپنی روح کو کس طرح بچا سکوں گا " ؟

" لیکن ایسے راہب بھی تو گذرے ہیں جنہوں نے عزلت گزینی کے باوجود لوگوں کو راستہ دکھایا ہے "

" یہ سچ ہے " انھوں نے جواب دیا ۔ " خدا نے ان لوگوں کو تنہائی کا بار اٹھانے کی طاقت عنایت کی تھی ۔ میں اس سے محروم ہوں لیکن مجھے اس کی شکایت نہیں ہے ۔ میں اپنی روح کی نجات کی خاطر اپنے ریوڑ کو نہیں چھوڑ سکتا ۔ خدا نے مجھے ایسی سرشت دی ہے کہ میں تنہائی اور بادیہ نشینی کی ترغیبات کا مقابلہ نہیں کر سکتا ۔ وجود کی صلیب کا گراں بار اکیلا دوسروں کی مدد کے بغیر اٹھا نہیں سکتا تھا ۔ "

یہ یادیں ، جن پر میرا ایمان قایم ہے ، ان کے پیش کرنے میں میری کوشش یہی رہی کہ ڈان مینوئل کو بعینہٖ اس طرح پیش کروں جس طرح میں نے انہیں ایک سولہ سالہ لڑکی کی حیثیت سے اس وقت دیکھا تھا جب میں رینادا کے کانونٹ اسکول سے اپنے گاؤں لیوکرنا کو واپس آئی تھی ۔ لیوکرنا جو ڈان مینوئل کی خانقاہ تھا ، اور میں اس خانقاہ کے امیر کے آگے دوزانو بیٹھی ہوئی تھی ۔

جیسے ہی مجھ پر ان کی نظر پڑی انھوں نے گرم جوشی سے کہا " اخاہ ! یہ تو ہمارے سمونا کی لڑکی ہے ۔ اب تو کافی بڑی ہو گئی ہو ۔ سنا ہے اب تم پیانو بجاتی ہو ، فرنچ بولتی ہو اور خدا جانے کیا کیا سیکھ آئی ہو ۔ اچھا ہے اب ہمارے گاؤں میں جلد ہی ایک نیا گھر بسے گا ۔ اور ہاں تمہارا بھائی لزارو کب لوٹ رہا ہے ؟ وہ ابھی نئی دنیا ہی میں ہے نا " ؟

" ہاں مقدس باپ وہ ابھی امریکہ میں ہے " میں نے آہستہ سے جواب دیا ۔

" نئی دنیا ! اور ہم پرانی دنیا کے باسی ! تم اسے خط لکھو تو میری طرف سے پوچھنا وہ نئی دنیا سے اس پرانی دنیا کے لیے چیزیں لے کر کب لوٹے گا ۔ یہ بھی بتانا کہ یہاں کی جھیل اور پہاڑ ابھی ویسے ہی ہیں جیسے وہ انہیں جاتے وقت چھوڑ گیا تھا " ۔

جب میں پہلی بار ان کے پاس کنفیشن کے لیے پہونچی تو اتنی بدحواس تھی کہ منہ سے ایک لفظ نہیں نکل رہا تھا اور میں سسکیاں لیتے ہوئے اعتراف و ندامت سے فارغ ہوئی ۔ انھوں نے مجھے غور سے دیکھتے ہوئے کہا " کیا بات ہے میری چھوٹی سی بھیڑ ؟ تم اتنی ہراساں کیوں ہو ؟ میں جانتا ہوں تمہاری یہ بدحواسی نہ تو گناہ کا بار ہے اور نہ خدا کا خوف بلکہ تم مجھ سے خوفزدہ ہو رہی ہو ہے نا یہی بات " ؟

میں پھوٹ کر رو پڑی۔

"لیکن یہ لوگ تمہیں میرے بارے میں کیا بتاتے رہے ہیں؟ نہ جانے تم کیسی اوٹ پٹانگ کہانیاں سنتی رہی ہو۔ کیا یہ تمہاری ماں کا کارنامہ ہے؟ لو، اب چپ ہو جاؤ اور مجھو تم اپنے بھائی سے بات کر رہی ہو۔"

ان باتوں سے میری ہمت بندھی اور میں نے دل کھول کر انہیں اپنے مشاغل، شکوک اور مایوسیوں کے بارے میں سب کچھ بتادیا۔

"اوہو، یہ سب خرافات تم نے کہاں پڑھی ہے؟ ایسی چیزوں کا زیادہ مطالعہ نہ کرو۔ سینٹ تھریسیا بھی نہیں۔ ہاں اگر خوش وقتی کے لیے پڑھنا ہے تو Bertoldo پڑھاکرو جو تمہارے والد پڑھاکرتے تھے"۔

اس ولی صفت آدمی کے پاس سے میں اپنے پہلے اعتراف کے بعد لوٹی تو میرا دل سکون اور طمانیت سے لبریز تھا۔ اول اول میرے دل میں جو ایک خوف کا جذبہ تھا۔ ہاں وہ احترام سے زیادہ خوف تھا۔ اب ایک ہمدردی کے جذبے میں ڈھل گیا تھا۔ اس وقت میں ایک نو عمر لڑکی تھی جسے بچی کہا جاسکتا تھا لیکن میں عورت بننے کی سرحد پر پہونچ چکی تھی اور میرے اندر مامتا کی لہریں اٹھ رہی تھیں اور اس دن اعتراف کے دوران میں، اس مقدس ہستی کے سامنے بیٹھے ہوئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں ان کی نرم اور حلیم آواز کے زیر و بم میں ان کا ان کہا اعتراف سن رہی ہوں اور مجھے یاد آیا انھوں نے کس طرح یسوع مسیح کے الفاظ دہرائے تھے "یارب، یارب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" اور کس طرح ان کی ماں بے اختیار ہو کر پکار اٹھی تھیں "میرے بیٹے"۔ میں اب بھی وہ دلدوز آواز سن رہی تھی جس نے عبادت گاہ کے سکوت کو شق کر دیا تھا اور میں نے انہیں تسکین دینے کے لیے دوبارہ ان کے ساتھ اعتراف کیا۔

ایک بار جب اعتراف گاہ (Confessional) میں میں ان کے سامنے اپنی تشکیک کا اظہار کر رہی تھی تو انھوں نے کہا "تمہارے سوالات کے جواب دینی سوال و جواب نامے Catechism میں موجود ہیں۔ یہ سوالات مجھ سے مت کرو کیونکہ میں ان سے بے خبر ہوں۔ کلیسا کے علمائے دین سے رجوع کرو وہ تمہارا اطمینان کر دیں گے۔"

"لیکن ڈان مینوئل یہاں کے عالم تو تم ہی ہو" میں نے کہا۔

"میں اور عالم؟ پاگل ہو گئی؟ میری ننھی لڑکی میں تو ایک چھوٹے سے گاؤں کا بے چارہ پریسٹ ہوں۔ اور تم جانتی ہو یہ شکوک تمہارے کان میں کون پھونک جاتا ہے۔ یہ جال کون بچھاتا ہے؟ شیطان، سمجھیں"

میں نے اپنی پوری ہمت مجمع کر کے بے دھڑک پوچھ ڈالا "اور اگر شیطان آپ کے کان میں بھی یہ وسوسے پھونکے تو آپ کیا کریں گے"؟

"میرے کانوں میں ؟ کون، شیطان ؟ نہیں میری بچی میرے اور اس کے درمیان بالکل جان پہچان نہیں ہے ۔ہم ایک دوسرے سے ناواقف ہیں" انھوں نے کہا
"لیکن بفرض محال وہ اگر ایسا کرے تو ؟" میں بضد تھی ۔
"تو میں اس کی بات پر کان نہیں دھروں گا ۔ بس آج کے لیے اتنا کافی ہے ۔ اب ہمیں چلنا چاہیئے کیونکہ کچھ مریض میرا انتظار کر رہے ہوں گے "۔
میں یہ سوچتی ہوئی واپس ہوئی کہ ڈان مینوئل تو شیطان کو بھگانے کے لیے مشہور ہیں پھر یہ کیسی عجب بات ہے کہ وہ خود شیطان کے وجود کے قائل نہیں ۔ راستے میں میری مڈبھیڑ پاگل بلا سیلو سے ہوئی جو عموماً چرچ کے پاس ہی منڈلاتا رہتا تھا ۔ مجھے دیکھتے ہی وہ اپنے کمال کا مظاہرہ کرنے لگا اور بار بار جگر خراش آواز میں پکارنے لگا "یارب ، یارب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا" اس کے ان نعروں نے مجھ پر ایسی کیفیت طاری کردی کہ گھر پہونچ کر میں اپنے کمرے میں بند ہو گئی اور اس وقت تک روتی رہی جب تک ماں نے آکر دروازہ نہیں کھٹکھٹایا ۔ ماں نے میری حالت دیکھ کر کہا "انجیلیٹا تمہارے اعترافات Confessions سے مجھے یوں لگتا ہے تم خانقاہ کی تبلیغی رکن بن کر رہو گی "۔
"فکر نہ کرو ماں " میں نے جواب دیا" اسی گاؤں میں میرے کرنے کے کام بہت ہیں اور یہی گاؤں میری خانقاہ ہے ۔ "
"ہاں اپنی شادی تک تم ان سب کاموں میں لگی رہ سکتی ہو " ماں نے کہا
"میں شادی کے بارے میں نہیں سوچ رہی ہوں" ۔ میں نے جواب دیا ۔
ایک اور موقعہ پر جب میں ڈان مینوئل سے ملی تو میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا "ڈان مینوئل ، کیا جہنم کا واقعی کوئی وجود ہے "؟
پورے سکون کے ساتھ ڈان مینوئل نے جواب دیا" تمہارے لیے میری بچی ؟ نہیں ، تمہارے لیے نہیں ہے ۔ "
"اور دوسروں کے لیے " میں نے پوچھا ۔
تمہیں اس سے کیا جب تم خود وہاں نہیں جاؤ گی " ؟ ڈان مینوئل نے کہا
"لیکن مجھے دوسروں کی پرواہ ہے ۔ آپ جواب دیجئے " میں نے کہا ۔
"جنت پر یقین رکھو ۔ وہ جنت جو ہم دیکھ سکتے ہیں ۔ وہ دیکھو " انھوں نے پہاڑ کی چوٹی کی طرف اوپر اشارہ کیا اور پھر نیچے جھیل کی طرف جس میں پہاڑ کا عکس لہروں پر لرز رہا تھا ۔
"لیکن دوزخ پر یقین رکھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا جنت پر " میں نے کہا
"ہاں رومن کیتھولک چرچ کے تمام احکام و فرامین پر دل سے یقین رکھو اور یہ کافی ہے ۔ " انھوں نے جواب دیا ۔ مجھے ان کی جھیل کی مانند نیلی آنکھوں میں ایک بیکراں اداسی نظر آئی ۔

دن خواب کی طرح گزرتے گئے ۔ ڈان مینوئل کی شخصیت کا نقش آہستہ آہستہ لاشعوری طور پر میرے اندر مرتسم ہوتا گیا ۔ لاشعوری طور پر ، اس لیے کہہ رہی ہوں کہ یہ آدمی عام زندگی میں گھل مل کر اس طرح روزمرہ کے معمولات میں شامل ہو گیا تھا جیسے کھانے سے پہلے دعا مانگی جاتی ہے ۔

میں ہر ایک کام میں ان کا ہاتھ بٹانے لگی ۔ ان کے مریضوں کی خدمت ، مدرسے کا معائنہ ، کلیسا کی دیکھ بھال ۔ یہ سب کام میں نے اپنے ذمے لے لیے ، ایک بار چند دنوں کے لیے میں اپنی ایک دوست کے پاس شہر گئی لیکن وہاں پہنچکر مجھے احساس ہوا میں اپنے گاؤں سے دور نہیں رہ سکتی ۔ شہر کی فضا میں میرا دم گھٹنے لگا ۔ مجھے ایک نامعلوم شے کی کمی محسوس ہو رہی تھی ۔ گاؤں کی جھیل اور پہاڑ مجھے اپنی طرف کھینچ رہے تھے ، سب سے بڑھکر ڈان مینوئل سے دوری کا احساس مجھے کاٹ کھا رہا تھا ۔ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میرے بغیر وہ کسی خطرے کا شکار ہو رہے ہیں اور انہیں میری شدید ضرورت ہے ۔ اپنے روحانی باپ کے لیے میرے اندر مامتا کا احساس جاگ اٹھا تھا ۔ میں ڈان مینوئل کو وجود کی گران بار صلیب اٹھانے میں سہارا دینا چاہتی تھی ۔

میری چوبیس ویں سالگرہ کے قریب میرا بھائی لزار واپنا سارا اثاثہ سمیٹ کر امریکہ سے واپس لوٹ آیا ۔ وہ مجھے اور ماں کو یہاں سے لیکر کسی شہر میں غالباً میڈرڈ میں ، سکونت اختیار کرنا چاہتا تھا ۔ لزارو کا خیال تھا کہ گاؤں میں آدمی کی صلاحیتیں ماؤف ہو جاتی ہیں اور وہ مجہول ہو کر رہ جاتا ہے "قصباتی زندگی متمدن زندگی کی ہر اعتبار سے ضد ہوتی ہے ۔" اس نے مجھ سے کہا" اب یہ دیہاتی زندگی کافی ہو چکی ۔ میں نے تمہیں اسکول کی تعلیم اس لیے نہیں دلوائی ہے کہ تم یہاں ان گنوار لوگوں کے ساتھ اپنی زندگی برباد کرو ۔"

میں خاموشی سے یہ سب باتیں سنتی رہی مگر دل میں میں نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ گاؤں چھوڑنے کی ہر تجویز کی پرزور مخالفت کروں گی ۔ لیکن ماں ، جو اس وقت کوئی ساٹھ کے پیٹے میں تھیں ، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے خیال سے ہی بھڑک اٹھیں اور صاف صاف کہدیا کہ وہ لیوکرنا کی جھیل ، پہاڑ اور سب سے بڑھ کر ، ڈان مینوئل کو چھوڑ کر کہیں اور نہیں جا سکتیں ۔

" تم لوگ بلیوں کی مانند ہو جو کبھی اپنی جگہ بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتیں " ۔ میرا بھائی بار بار کہتا ۔

ڈان مینوئل سے گاؤں کے سارے لوگوں اور خصوصاً ہم ماں بیٹی کی عقیدت دیکھ کر لزارو کو ڈان مینوئل سے اور بھی کد پیدا ہو گئی ۔ اس کی نظروں میں ڈان مینوئل رجعت پسندی اور مذہبی توہمات میں سرتاپا غرق اسپین کے نمائندہ تھے ۔ کلیسا اور مذہب کے خلاف " ترقی پسند " اعتراضات کے جن ہتھیاروں سے لزارو امریکہ سے لیس ہو کر آیا تھا ان سب کا اس نے ڈان مینوئل کے خلاف استعمال شروع کر دیا ۔

"اس نامردوں کے ملک، اسپین، میں" وہ کہا کرتا تھا "عورتوں کی تکمیل مذہبی ملاؤں کے ہاتھ میں ہے اور عورتوں کے ہاتھ میں مردوں کی لگام ہے۔" "یہ ملک" وہ حقارت سے کہتا "جاگیردارانہ نظام کی متعفن بدررو ہے"۔ اس کی زبان پر "جاگیردارانہ نظام" کی اصطلاح سننے والوں کو خائف کرنے کے لیے آتی تھی۔ اس کے نزدیک کسی چیز کی مذمت کے لیے سخت ترین الفاظ "جاگیردارانہ" اور "دقیانوسی" تھے۔

لیکن اس کی شعلہ بیانی کا نہ ہم پر کوئی اثر ہوا اور نہ گاؤں والوں کی طرف سے ایک احترام آمیز بے نیازی کے علاوہ کوئی اور رد عمل ہوا۔ اس رویے سے اس کی جھنجھلاہٹ اور بڑھتی اور وہ بڑے افسوس کے ساتھ کہتا "ان جاہلوں کی اصلاح ناممکن ہے۔" لیکن لزارو اپنی ذکاوت کی وجہ سے ویسے بالطبع نیک دل تھا۔ اسے گاؤں پر ڈان مینوئل کے اقتدار کی نوعیت سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی اور اسے جلد ہی پتہ چل گیا کہ ڈان مینوئل نے گاؤں کے لیے کیا کچھ کیا تھا۔

"نہیں، یہ آدمی دوسروں سے الگ ہے۔ یہ تو ولی صفت ہے۔" وہ کہنے لگا

"لیکن تمہیں یہ کیسے معلوم کہ دوسرے مذہبی رہنما کیسے ہوتے ہیں۔" میں پوچھتی۔

"مجھے معلوم ہے۔ میں سمجھ سکتا ہوں" وہ کہتا۔

لیکن اس کے باوجود اس نے کبھی چرچ میں قدم نہیں رکھا اور نہ کبھی اپنی آزاد خیالی کے مظاہرے کا کوئی موقعہ رائیگاں جانے دیا۔ اگرچہ ڈان مینوئل کے لیے اس کی زبان سے ہمیشہ توصیفی کلمات نکلتے تھے۔ گاؤں والوں کے ذہن میں نہ جانے کس طرح یہ بات ایک طے شدہ حیثیت اختیار کر گئی تھی کہ لزارو اور ڈان مینوئل میں جو غیر محسوس قسم کی رسہ کشی چل رہی تھی وہ بالاخر ایک آخری معرکہ پر منتج ہوگی یا دوسرے الفاظ میں ڈان مینوئل لزارو کو مشرف بہ مذہب کریں گے۔

لزارو، جیسا کہ اس نے مجھے بعد میں بتایا، یہ چاہتا تھا کہ ڈان مینوئل کو قریب سے دیکھے اور مجھے اسے خواہش تھی کہ ان سے ملے، بات چیت کرے، انہیں چرچ میں سنے اور ان کی روحانی قوت کا راز دریافت کرے۔ آخر کار میرے مستقل اصرار اور اکساہٹ پر وہ ڈان مینوئل کو سننے کے لیے چرچ جانے پر آمادہ ہو گیا۔ "محض اپنا تجسس پورا کرنے کی غرض سے جا رہا ہوں" اس نے ہم سے کہا۔

"ہاں یہ آدمی دوسروں سے یقیناً مختلف ہے" لزارو نے ڈان مینوئل کو سننے کے بعد کہا۔

"لیکن یہ بات ناقابل فہم ہے کہ اتنا ذہین آدمی اس خرافات پر یقین رکھتا ہو جس کی وہ لوگوں کو تعلیم دیتا ہے۔"

"یعنی تم سمجھتے ہو وہ منافق ہیں اور ان کے خیالات اور عمل میں تضاد ہے" میں نے پوچھا۔

"نہیں منافق تو نہیں لیکن تبلیغ کا کام بطور پیشہ بھی تو ہو سکتا ہے ۔" لزارو نے کہا ۔
میرے متعلق لزارو کا فیصلہ تھا کہ مجھے وہ ساری کتابیں پڑھنی چاہئیں جو کچھ وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور کچھ جو مجھے اس کے ایما پر خریدنی تھیں ۔
"تو تمہارے بھائی نے تمہیں اپنا مطالعہ بڑھانے کی ہدایت کی ہے ۔" ڈان مینوئل نے مجھ سے کہا ۔ "ٹھیک ہے اپنے بھائی کی خوشنودی کے لیے ضرور پڑھو ۔ مجھے معلوم ہے تم غلط قسم کی کتابیں نہیں پڑھو گی ۔ چاہو تو ناولیں پڑھو ۔ ناول ان تاریخوں سے زیادہ مضر نہیں ہوتے جو سچی کہلائی جاتی ہیں ۔ یوں بھی تم مطالعہ میں مصروف ہو گی تو تمہارا دماغ گاؤں کی خرافات سے محفوظ رہے گا ۔ لیکن کوشش کر کے ایسی کتابیں پڑھو جو تمہیں زندگی کا سکون دے سکیں بہتی ہوئی موجوں کا خاموش اور نرم و سکون" ۔
"کیا یہ سکون ڈان مینوئل کو حاصل تھا ؟؟"
انہیں دنوں میری والدہ سخت علالت کے بعد وفات پا گئیں ۔ آخری ایام میں ان کی واحد خواہش یہی رہ گئی تھی کہ کسی طرح ڈان مینوئل لزارو کو مذہب کی طرف راغب کر دیں ۔ انہیں یقین تھا وہ آسمان پر لزارو سے دوبارہ ملیں گی اور تاروں کی وادی کے کسی ایک گوشہ سے لیوکرنا کے پہاڑ اور جھیل کا نظارہ کرتی رہیں گی ۔ اب وہ اپنی دانست میں خدا کا دیدار کرنے جارہی تھیں ۔
"تم کہیں نہیں جاؤ گی" ڈان مینوئل نے ان سے کہا ۔ "تم یہیں رہو گی ۔ تمہارا جسم اسی خاک میں رہے گا اور تمہاری روح بھی یہیں ، اسی گھر میں رہے گی ۔ تم اپنے بچوں کو اپنے سامنے دیکھتی رہو گی ۔ گو وہ تمہیں دیکھ نہیں سکیں گے ۔"
"لیکن ، مقدس باپ میں خدا کے حضور میں جارہی ہوں ، اس کے دیدار کے لیے" ماں نے کہا
"خدا یہاں بھی موجود ہے ۔ وہ ہر جگہ ہے ۔ تم اسے یہاں سے بھی دیکھ سکتی ہو ۔ ہم سب کو اس میں اور اس میں ہم سب کو دیکھ سکتی ہو ۔"
"جس مسرت سے تمہاری ماں موت کو لبیک کہہ رہی ہے وہی مسرت اس کی ابدی زندگی رہے گی" ڈان مینوئل نے مجھ سے کہا اور پھر میرے بھائی کی طرف مڑ کر کہا "تمہاری ماں کی جنت یہی ہے کہ وہ سدا تمہیں دیکھتی رہے ۔ اسے بچانے کا یہی موقعہ ہے ۔ اس سے وعدہ کرو کہ تم اس کے لیے دعا کرتے رہو گے" ۔
"لیکن ......"

"لیکن کیا؟ اس نے تمہیں جنم دیا ہے، یہ تمہاری ماں ہے۔ اس سے صرف اتنا کہدو کہ تم اس کی مغفرت کی دعا کرو گے۔ مجھے معلوم ہے تم وعدہ کرنے کے بعد اس پر قائم رہو گے اور ایک بار دعا کر لو پھر اس کے بعد ...."

میرے بھائی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ماں کے بستر مرگ کے پاس دو زانو ہو کر اس نے وعدہ کیا۔

"اور میں آسمان پر تمہارے لیے تم سب کے لیے دعا مانگوں گی" ماں نے صلیب کو بوسہ دیتے ہوئے کہا اور ڈان مینوئل کو دیکھتے ہوئے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔

"میں اپنی جان تیرے ہاتھوں میں سونپتا ہوں" ڈان مینوئل نے زیر لب کہا۔

اب گھر میں لزارو اور میں تنہا رہ گئے۔ ماں کی موت نے لزارو اور ڈان مینوئل کے درمیان ایک تعلق پیدا کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا ڈان مینوئل اپنے دوسرے مریضوں اور ضرورت مندوں کو دینے کا وقت بھی لزارو کے لیے صرف کر رہے تھے۔ ساری دوپہریں وہ اکٹھے گزارتے۔ کبھی جھیل کی طرف ٹہلنے نکل جاتے اور کبھی عشق پیچاں کی بیلوں سے ڈھکے ہوئے سسطرونی کلیسا کے کھنڈرات کی طرف چلے جاتے۔

ایک دن لزارو نے مجھ سے کہا "تمہیں معلوم ہے لوگ کہتے ہیں کہ ہمارے گاؤں کی جھیل کی تہہ میں ایک شہر مدفون ہے اور وسط بہار کی رات بارہ بجے اس مدفون شہر کے کلیسا کی گھنٹیاں بجتی ہوئی سنائی دیتی ہیں۔"

"ہاں" میں نے کہا۔ "قرون وسطیٰ کا ایک جاگیردارانہ شہر"!!

"میرا خیال ہے" لزارو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ہمارے ڈان مینوئل کی روح کے پاتال میں بھی ایک ایسا ہی شہر مدفون ہے اور کبھی کبھی اس کی گھنٹیاں بھی سنائی دے جاتی ہیں۔"

"ہاں" میں نے کہا "ڈان مینوئل کی روح کے اندر، اور تمہاری بھی روح کے اندر چھپا ہوا یہ غرقاب شہر ہمارے ان اجداد کی روحوں کا قبرستان ہے جو اس دقیانوسی اور جاگیردارانہ گاؤں لیوکرنا کے قدیم باسی تھے!!"

آخر کار بھائی نے ڈان مینوئل کا وعظ سننے کے لئے بلاناغہ چرچ میں حاضری دینی شروع کر دی۔ آہستہ آہستہ لوگوں میں یہ بات بھی پھیلنے لگی کہ اب لزارو باقاعدہ چرچ میں شامل ہونے والا ہے۔ اور سب کے ساتھ عشائے ربانی میں شرکت کرے گا۔ اس خبر سے گاؤں بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ سب یوں محسوس کر رہے تھے جیسے لزارو کی چرچ میں شمولیت سے گاؤں کو اپنی کوئی کھوئی ہوئی شئے مل گئی ہو۔ یہ خوشی اتنی بے ساختہ اور پر خلوص تھی کہ لزارو کو کسی قسم کی سبکی یا شکست کا احساس نہ ہوا۔

آخر کار سارے لوگوں کی موجودگی میں اور سب کی آنکھوں کے سامنے لزارو کی کمیونین ---- (Communion) کا دن آپہنچا۔ ڈان مینوئل کا چہرہ پہاڑ پر جمی ہوئی آغاز سرما کی برف کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔ وہ اس طرح کانپ رہے تھے جس طرح جھیل کا پانی باد شمال کے جھونکوں سے مرتعش ہو جاتا ہے۔ جب وہ مقدس شبیہہ ہاتھ میں لیے ہوئے آگے بڑھے اور لزارو کے ہونٹوں کے قریب ہاتھ لے گئے تو انہیں چکر سا آگیا اور مقدس شبیہہ ان کے ہاتھ سے چھوٹ کر نیچے گر پڑی اور لزارو نے خود ہی اسے اٹھا کر ہونٹوں سے لگا لیا۔ ڈان مینوئل کی آنکھوں میں جھلملاتے ہوئے آنسو دیکھ کر سب سوچ رہے تھے کہ "لزارو ڈان مینوئل کو کتنا عزیز ہے۔" صبح صادق کا وقت تھا اور کہیں ایک مرغا بانگ دے رہا تھا۔

گھر واپس آنے کے بعد جب میں اور لزارو تنہا ہوئے تو میں اس سے لپٹ گئی اور اس کی پیشانی کو چومتے ہوئے کہا "لزارو میرے بھائی! تم نے آج ہمیں زندگی کی سب سے بڑی خوشی دی ہے۔ تم نے آج اس گاؤں کے ہر فرد کو، انہیں جو زندہ ہیں اور انہیں بھی جو مر چکے ہیں اور سب سے زیادہ اپنی مرحوم ماں کو ایسی مسرت بخشی ہے جس کا کوئی ٹھکانہ نہیں۔"

"میرا مقصد بھی یہی تھا" لزارو نے آہستہ سے کہا

"نہیں، صرف ہم لوگوں کو خوش کرنے کے لیے نہیں بلکہ سب سے پہلے اپنے آپ کی خاطر اپنے قلب و ذہن کی تبدیلی کی وجہ سے تم نے یہ کام کیا ہے لزارو۔"

تب میرے بھائی لزارو نے جس کے چہرے زردی کھنڈی ہوئی تھی اور جو اس طرح کانپ رہا تھا جس طرح ڈان مینوئل کمیونین دیتے وقت کانپ رہے تھے، مجھے آہستہ سے ماں کی مخصوص کرسی پر بٹھا دیا اور دو ایک گہری سانسیں لے کر مجھ سے اس طرح مخاطب ہوا جیسے کسی سربستہ راز کا انکشاف کر رہا ہو۔

"انجیلنا، میں تمہیں ہر بات بتا دینا چاہتا ہوں، پوری حقیقت تمہارے سامنے رکھ دینا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ میں اب تم سے چھپا نہیں سکتا اور اس لئے بھی کہ میں اب چھپانا بھی نہیں چاہتا کیوں کہ جلد یا بدیر تم اس راز کی حقیقت کو جان جاؤ گی اور اگر اس وقت تمہیں پوری بات معلوم نہ ہوئی تو وہ اور زیادہ بری بات ہوگی۔" لزارو مدھم اور پرسکون آواز میں کہتا گیا اور ایک جاں گسل درد میرے وجود میں پھیلنے لگا۔

جھیل اور سسطروئی کلیسا کے کھنڈرات کی طرف گھومتے ہوئے ڈان مینوئل نے لزارو کو سمجھایا "تمہارے شکوک اور تمہارے نظریات تمہارا ذاتی معاملہ ہیں۔ انہیں اپنی ذات تک ہی محدود رکھو۔ ان کا اظہار دوسرے بے شمار معصوم لوگوں کے عقائد کو متزلزل کر سکتا ہے۔ اس طرح تم انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے بلکہ ان سے ان کے سکون اور اطمینان کی جنت بھی چھین لوگے۔ تمہیں مذہب پر دل سے اعتقاد اگر نہیں ہے تو نہ سہی، کم از کم دوسروں کے لئے ایک غلط

مثال بننے سے بچنے کی خاطر، دوسروں کو بچانے کی خاطر، ظاہری طور پر مذہبی شعائر کی حتی الامکان پابندی کرو۔ " یہ سب باتیں ڈان مینوئل نے لزارو کو تبدیل کرنے کی خاطر نہیں بلکہ گاؤں کے دوسرے لوگوں کے عقائد محفوظ رکھنے کی خاطر کہیں۔

"لیکن، لیکن یہ سب کیسے ممکن ہے؟" میں سراسیمگی کے عالم میں چیخ اٹھی۔

"سب کچھ ممکن ہے میری بہن۔ ہر بات ممکن ہے۔" لزارو نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"اور جب میں نے ڈان مینوئل سے کہا آپ ایک دینی مبلغ ہو کر مجھے ظاہرداری کا مشورہ دے رہے ہیں تو انہوں نے کہا" ظاہرداری؟ نہیں یہ ظاہرداری نہیں ہے۔ وہ جو کسی نے کہا ہے مقدس پانی کو ہاتھ لگانے کی دیر ہے تمہارا قلب خود بخود بدل جائے گا۔" میں نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا" اس کے معنی یہ ہوئے کہ آپ نے پہلے وعظ سنانے سے ابتدا کی اور پھر اس کے بعد خود بخود عقیدہ کی دولت آپ کو مل گئی؟" وہ میری نظروں کی تاب نہ لا سکے اور جھیل کے اس پار دیکھنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ اس لمحہ ڈان مینوئل کا راز مجھ پر منکشف ہوا۔"

"لزارو۔۔۔۔!" میں درد سے کراہ اٹھی۔

ٹھیک اسی لمحہ پاگل بلاسیلو گلی سے چیختا ہوا گزرا۔" یارب، یارب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔" لزارو اس طرح لرز اٹھا جیسے وہ آواز بلاسیلو کی نہیں بلکہ ڈان مینوئل کی یا خود یسوع مسیح کی آواز ہو۔

"ڈان مینوئل کے راز کے ساتھ" لزارو نے توقف کے بعد کہا" مجھ پر اس لمحہ ان کے مقاصد اور ان مقاصد کا تقدس بھی منکشف ہو گیا۔ ڈان مینوئل مقدس آدمی ہیں میری بہن، سچے معنوں میں مقدس آدمی۔ اور اس مقدس آدمی نے اپنی فتوحات میں مزید **اضافہ کے لئے نہیں** بلکہ اپنے مقدس مقصد کی خاطر مجھے جیت لیا۔ جن لوگوں نے اپنی روحانی زندگی ان کے سپرد کر رکھی ہے اور ان لوگوں کی معصوم مسرت اور سکون قلب کو جسے تم چاہو تو ایک دھوکا بھی کہہ سکتی ہو۔۔۔ برقرار رکھنے کی خاطر انہوں نے یہ کام کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ان کا اس طرح لوگوں کو دھوکا دینا (اگر یہ دھوکا ہے!) ان کے ذاتی مفاد کے لیے نہیں تھا۔ میں نے ان کے دلائل کو تسلیم کر لیا اور چرچ سے وابستہ ہونے کے لئے تیار ہو گیا۔ میں وہ دن کبھی نہیں بھول سکتا جس دن میں نے ان سے کہا" مگر ڈان مینوئل کیا سچائی کا، صداقت کا مرتبہ سب سے بڑا نہیں ہے؟" اور ڈان مینوئل نے کانپتے ہوئے مجھ سے سرگوشی میں کہا، حالانکہ اس وقت بھرے میدان میں سوائے ہم دونوں کے اور کوئی نہیں تھا۔" سچائی۔۔۔؟ لزارو، سچائی، اتنی ہولناک، اتنی ناقابل برداشت اور اتنی مہلک شئے ہے کہ شاید سیدھے سادھے لوگ اس کا تحمل نہیں کر سکتے۔"

" لیکن یہاں آپ مجھے اس سچائی کی ایک جھلک اس طرح کیوں دکھا رہے ہیں جیسے آپ اعتراف گاہ میں ہوں؟" میں نے پوچھا

"اس لیے کہ اگر میں اس کا اظہار نہ کر دیتا تو شاید مجھے شدت کرب سے دیوانہ وار بھرے بازار میں چیخ چیخ کر اس کا اعلان کرنا پڑتا اور میں کبھی، کسی بھی حالت میں ایسا نہیں کرنا چاہتا کیوں کہ میں یہاں اس لیے ہوں کہ اپنے معتقدین کی روحوں کو زندگی دوں، انہیں مسرت دوں اور انہیں اس خواب میں مگن رکھوں کہ ان کی زندگی ابدی ہے۔ میرا کام انہیں تباہ کرنا نہیں ہے یہاں ان لوگوں کی ضرورت یہ ہے کہ وہ صحت مند طور پر زندہ رہیں، ایک مشترک اور متحد احساس میں سچائی کے ساتھ زندہ رہیں۔ چرچ اسی ضرورت کو پورا کرتا ہے، انہیں جینے کے قابل بناتا ہے۔ رہی سچے مذہب کی بات تو وہ ہر مذہب جو اپنے پیروؤں کو روحانی طور پر جینا سکھاتا ہے، مرنے کے لیے پیدا ہونے کے المناک احساس میں ان کی ڈھارس بندھاتا ہے، اس حد تک سچا مذہب ہے اور ہر قوم کے لیے سب سے سچا مذہب اس کا اپنا مذہب ہوتا ہے، وہ مذہب جس نے اس قوم کو پیدا کیا ہے اور میرا مذہب دوسروں کو ڈھارس بندھا کر ڈھارس حاصل کرنا ہے۔ یہ اور بات کہ میں دوسروں کو جو تسلی دیتا ہوں وہ تسلی میرے لیے نہیں ہے۔" ڈان مینوئل کے یہ الفاظ میں زندگی بھر نہیں بھول سکوں گا۔ لزارو نے کہا۔

"لیکن تمہارا آج کا کمیونین (Communion) تو مذہب اور چرچ کا کھلا مذاق ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار نکل گیا اور ساتھ ہی مجھے ان الفاظ پر پشیمانی محسوس ہونے لگی۔

"یہ اگر بے حرمتی ہے تو پھر جس نے یہ کمیونین دیا اس کے بارے میں کیا کہو گی؟ اس کے وعظ اور خطبوں کے بارے میں کیا کہو گی؟" "یا خدا یہ کیسی شہادت ہے!!"

"اور اب ایک اور شخص لوگوں کو ڈھارس بندھانے کے لیے آگیا ہے۔" میرے بھائی نے کہا

"تمہارا مطلب ہے لوگوں کو فریب دینے کے لیے۔" میں نے پوچھا

"نہیں فریب دینے کے لیے نہیں بلکہ ان کے ایمان کو مضبوط بنانے کے لیے"

"گاؤں کے لوگوں کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کیا وہ لوگ دل سے ایمان رکھتے ہیں؟" میں نے پوچھا

"میں کیسے جان سکتا ہوں! یہ لوگ سوچے بغیر عادتاً اور تقلیداً اعتقاد رکھتے ہیں۔ انہیں اس خواب سے بیدار نہیں کرنا چاہیئے۔ انہیں اپنے احساس کے افلاس میں جینے دو تاکہ وہ احساس کی فراوانی کے عذاب سے محفوظ رہیں۔ مبارک ہیں وہ لوگ جن کے دل غریب ہیں۔"

"تم نے یہ باتیں ڈان مینوئل کی زبان سے سیکھی ہیں، میرے بھائی اب مجھے یہ بتاؤ تم نے ماں سے بسترِ مرگ پر جو وعدہ کیا تھا اس کا کیا ہوا؟"

"یقیناً میں نے اپنا وعدہ پورا کیا ہے۔ تم مجھے کیا سمجھتی ہو۔ کیا تمہارا خیال ہے کہ مرتی ہوئی ماں سے میں نے جو عہد کیا تھا اس سے منحرف ہو جاؤں گا"

کون جانے ہو سکتا ہے تم نے انہیں اس خیال سے دھوکا دیا ہو کہ وہ سکون سے مر سکیں میں نے اپنا عہد پورا کیا ہے ، کوئی دن ایسا نہیں گیا جب میں نے ماں کے لیے دعا نہ مانگی ہو ۔ اگر میں اپنا عہد پورا نہ کرتا تو مجھے اطمینان نصیب نہ ہوتا ۔ "

" " صرف ماں کے لیے دعا کی ؟ "

" اور کس کے لئے کرتا ؟ "

" اپنے لیے اور اب سے ڈان مینوئل کے لیے ۔ "

ہم دونوں جدا ہو کر اپنے اپنے کمروں کو چلے گئے ۔ میں رات بھر روتی رہی اور اپنے بھائی اور ڈان مینوئل کے لیے یقین اور ایمان کی دعا مانگتی رہی اور لزارو پتہ نہیں کس کے لیے دعا کرتا رہا ۔

اس دن کے بعد سے میں ڈان مینوئل سے تنہائی میں ملنے سے خائف رہنے لگی ، گو ان کے کاموں میں بدستور ان کا ہاتھ بٹاتی رہی ، ایسا معلوم ہوتا تھا انہیں میری اندرونی خلش اور اضطراب کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اس کی وجہ جاننے کی کوشش کر رہے تھے ۔ آخر کار میں توبہ گاہ میں ان کے سامنے پہونچی ۔ ۔ ۔ یہاں کون منصف تھا اور کون خطا کار ؟؟ ۔ ۔ ۔ ہم دونوں وہ اور میں سر جھکا کر روتے رہے ۔ ڈان مینوئل نے آخر اس ہولناک سکوت کو توڑا اور دور کسی مقبرے سے آتی ہوئی آواز میں مجھ سے کہا " لیکن انجلینا تم دس سال کی عمر میں جو ایمان رکھتی تھیں اب بھی اسی ایمان پر قائم ہو نا ؟ تمہارا اعتقاد متزلزل تو نہیں ہوا ؟ "

نہیں ، فادر میرا اعتقاد اب بھی قائم ہے ۔ "

تو پھر اس اعتقاد کو برقرار رکھو اور اگر شبہات سر اٹھائیں تو انہیں کچل دو ، ان کی طرف سے خود اپنے کان بند کر لو ، ہمیں زندہ رہنا ہے .... "

" لیکن مقدس باپ کیا آپ اعتقاد رکھتے ہیں ؟ " میں نے ہمت کر کے کانپتے ہوئے پوچھا ۔

ایک ساعت کے لیے وہ رکے اور پھر اپنے آپ پر قابو پا کر کہا " ہاں ، میں اعتقاد رکھتا ہوں ۔ ۔ ۔ !! "

" لیکن کس شئے پر اعتقاد ، فادر ؟ کیا آپ کو دوسری زندگی پر اعتقاد ہے ؟ کیا آپ کو اعتقاد ہے کہ ہم مرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے نہیں مرجاتے ؟ کیا آپ کو یقین ہے کہ دوسری زندگی میں ہم دوبارہ ملیں گے اور محبت کریں گے ؟ کیا آپ کو دوسری زندگی پر یقین ہے ، فادر ؟ "

ضبط گریہ سے ان کا چہرہ تمتما اٹھا اور نظریں اوپر اٹھائے بغیر انہوں نے کہا " ان باتوں کا ذکر نہیں کرنا چاہئے میری بچی "

آج جب میں ان یادوں کو کاغذ پر منتقل کر رہی ہوں میرے اندر یہ سوال ابھرتا ہے ۔ انہوں نے کیوں مجھے دھوکا نہیں دیا ؟ انہوں نے مجھے وہ فریب کیوں نہ دیا جو دوسروں کو دے

رہے تھے ؟ وہ اپنے آپ کو یا مجھے کیوں دھوکا نہ دے سکے ؟ میں سمجھتی ہوں ان کی وہ اذیت اور کرب اس لیے تھا کہ وہ مجھے فریب دینے کے لیے اپنے آپ کو فریب دینے میں کامیاب نہ ہو سکے۔

" اور اب " انہوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا " میرے لیے ، تمہارے بھائی کے لیے خود اپنے لیے اور سب کے لیے دعا مانگو ۔ ہمیں زندہ رہنا ہے ۔ ہمیں دوسروں کو زندگی دینی ہے ۔

اور کچھ دیر کے سکوت کے بعد انہوں نے کہا " انجلینا ، تم شادی کیوں نہیں کر لیتیں ؟ "

" یہ آپ کو معلوم ہے مقدس باپ ۔ "

" نہیں ، نہیں تمہارا بیاہ ہو جانا چاہیے ۔ میں اور لزارو مل کر تمہارے لیے شوہر تلاش کریں گے تمہیں ان بے کار خیالات سے چھٹکارا پانے کے لیے ضرور شادی کر لینی چاہیے ۔ "

" بیکار کے خیالات ، ڈان مینوئل " میں نے پوچھا

" میں جانتا ہوں میں کیا کہہ رہا ہوں ۔ دوسروں کے لیے اپنے آپ کو اذیت میں مت مبتلا کرو ۔ ہم میں سے ہر ایک کے لیے اپنی اپنی جواب دہی کا بوجھ ہی کافی ہے ۔ "

آپ یہ باتیں کہہ رہے ہیں ڈان مینوئل !! آپ مجھے شادی کا ، دوسروں کے مسائل سے بے نیاز بننے کا مشورہ دے رہے ہیں !! مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی ڈان مینوئل !! "

" تم ٹھیک کہہ رہی ہو انجلینا مجھے خبر نہیں ہے میں کیا کہہ رہا ہوں ۔ میں اپنے ہوش میں نہیں ہوں کیوں کہ میں تمہارے سامنے اپنا اعتراف کر رہا ہوں ۔ لیکن یہ سچ ہے آدمی کو زندہ رہنا ہے ، آدمی کو زندہ رہنا پڑتا ہے ۔ "

اور جب میں چرچ سے نکلنے کے لیے کھڑی ہوئی تو انہوں نے کہا " اور اب انجلینا ، اس گاؤں کے نام پر پوچھتا ہوں کیا تم نے میرے گناہ کو معاف کیا ؟ "

مجھے اپنے آپ میں ایک پر اسرار پاکیزگی اور تقدس کا احساس ہوا اور میں نے ان سے کہا :

" باپ ، بیٹے اور روح القدس کے نام پر میں نے تمہیں اپنے گناہ سے پاک کیا ۔ "

ہم چرچ سے باہر نکلے اور میں نے محسوس کیا میرے اندر مامتا کا ایک دریا امنڈ پڑا ہے ۔

لزارو نے اپنے آپ کو مکمل طور پر ڈان مینوئل اور ان کے نصب العین سے وابستہ کر دیا تھا ۔ اب وہ ان کا رفیق اور معاون تھا ۔ ایک مشترک راز نے انہیں ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا ۔ لزارو اب ڈان مینوئل کی شخصیت کی اتھاہ گہرائیوں میں آہستہ آہستہ اتر رہا تھا ۔

" کیا آدمی ہے " لزارو نے ایک بار مجھے بتایا ۔ " کل ہم دونوں جھیل کے کنارے جا رہے تھے ۔ ڈان مینوئل کہنے لگے ۔ یہ جھیل میرے لیے زندگی کی سب سے اذیت ناک ترغیب رہی ہے ۔ میں نے وضاحت طلب نظروں سے انہیں دیکھا اور وہ کہتے گئے ۔ میرے باپ جن کا نوے سال کی عمر میں انتقال ہوا ، مجھے بتایا کرتے تھے کہ زندگی بھر خودکشی کی ترغیب ان پر ایک عذاب کی طرح مسلط رہی ۔ یہ آسیب پتہ نہیں کب سے ان کا تعاقب کر تا رہا اور بچپن سے لے کر اپنی ساری عمر وہ

اس ترغیب کے خلاف جدوجہد کرتے رہے اور یہ جدوجہد ان کی زندگی اور اس کی معنویت کا باعث بنی۔ اس ترغیب سے بچنے کا راستہ انھوں نے یہ نکالا کہ زندہ رہنے اور اپنی زندگی کے تحفظ کی کوششوں کی طرف غیر معمولی تندہی اور توجہ سے مصروف ہوگئے۔ اس ترغیب اور اپنی مزاحمت کی تفصیلات وہ مجھے بتاتے تھے۔ یہ سب مجھے ایک طرح کی دیوانگی معلوم ہوتی تھی اور یہ دیوانگی مجھے ورثہ میں ملی ہے۔ اپنی تہہ میں گرداب اور گود میں آسمان کو لیے ہوئے جھیل کا یہ بظاہر پر سکون پانی مجھے کس طرح آواز دیتا ہے، تم نہیں جان سکتے۔ میری زندگی، لزارو، مسلسل خودکشی کی ایک شکل رہی ہے۔ خودکشی کے خلاف جدوجہد بھی دراصل خودکشی ہے۔ لیکن ہمارے لوگوں کی زندگی بھی یہی ہے وہ بھی اسی طرح جیتے ہیں! کچھ دیر کے توقف کے بعد وہ پھر کہنے لگے: یہ ندی جو یہاں ایک پر سکون جھیل کی شکل میں پھیل گئی ہے۔ یہاں سے نکل کر میدانوں سے گذرتی ہوتی تند و تیز آبشاروں میں ڈھل کر گرتی ہے اور گھاٹیوں اور غاروں میں راستہ بناتی ہوئی، شہر تک پہونچ جاتی ہے۔ اس جھیل کی طرح، یہاں گاؤں میں، ہم لوگوں کی زندگی بھی ایک ٹھہرا ہوا پانی ہے۔ لیکن تند و تیز آبشار کے مقابلے میں، جس کا نظارہ آدمی کو خوفزدہ کر دیتا ہے، یہاں اس خاموش پانی کے قریب جس کی پر سکون سطح پر تاروں کا عکس جھلملاتا ہے، خودکشی کی ترغیب زیادہ شدید ہوتی ہے۔ لزارو، میں نے ان غریب اور جاہل کسانوں کو بستر مرگ پر دیکھا ہے۔ یہ لوگ جنہوں نے کبھی اپنے گاؤں سے باہر قدم نہیں نکالا خود ان کے لبوں سے میں نے سنا ہے یا سمجھا ہے کہ ان کی موت کا اصل مرض کیا ہے۔ بستر مرگ پر پڑے ہوئے ان لوگوں کے سرہانے میں نے زندگی کی اکتاہٹ، تھکن اور درماندگی کا وہ پھیلا ہوا اندھکار دیکھا ہے جو کبھی کم نہیں ہوگا، جو بھوک سے ہزار بار زیادہ بھیانک ہے۔ اسی لیے میں کہتا ہوں لزارو، ہمیں اپنے گاؤں میں اپنے کام میں خودکشی کرتے ہوئے چلنے دو اور جس طرح جھیل آسمان کے خواب میں مگن ہے اسی طرح گاؤں کو اپنے اس خواب میں مگن رہنے دو کہ یہی اس کی زندگی ہے۔۔

"ایک بار" لزارو مجھ سے کہہ رہا تھا" ہم نے ایک نوجوان چرواہی کو دیکھا جو نشیبی پہاڑ کی چوٹی پر کھڑی ہوئی تھی جہاں سے سامنے جھیل نظر آرہی تھی۔ اور وہ چرواہی ایسی آواز میں گارہی تھی جس میں جھیل کے پانی سے زیادہ شادابی اور تازگی تھی۔ ڈان مینوئل نے مجھے روک کر اس لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: دیکھو، ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وقت کی گردش تھم گئی ہے، جیسے وہ لڑکی وہاں ازل سے کھڑی ہوئی گارہی ہے اور ابد تک رہے گی جیسے وہ اس وقت بھی یہاں اسی طرح کھڑی ہوئی تھی جب میرے شعور نے آنکھ کھولی اور اس وقت بھی اسی طرح کھڑی رہے گی جب میرے شعور کی آنکھیں بند ہو جائیں گی۔ یہ لڑکی ان چٹانوں کا ایک حصہ معلوم ہوتی ہے، اور ایک دن، جسے میں کبھی بھول نہیں سکتا، ژالہ باری ہو رہی تھی اور انہوں نے مجھ سے کہا: لزارو کیا تم نے کوئی اس سے زیادہ پُراسرار دیکھا ہے کہ برف جھیل پر گرتی ہے تو فنا ہو جاتی ہے لیکن

پہاڑ پر چادر کی طرح چھا جاتی ہے ؟"

لزارو اپنے نئے جوش اور جذبے میں اتنی مستعدی سے سرگرم ہو گیا کہ کبھی کبھی ڈان مینوئل کو اسے روکنا پڑتا۔ ایک بار وہ گاؤں میں اپنی اصلاح پسندی کی دھن میں توہم پرستی کے خلاف مہم چلا رہا تھا۔ ڈان مینوئل کو پتہ چلا تو انہوں نے اسے روکا۔ "انہیں رہنے دو۔ ان لوگوں کو یہ سمجھانا بہت مشکل ہے کہ عقیدے اور توہم پرستی میں کہاں خط فاصل کھینچا جائے اور سب سے زیادہ خود ہمارے لیے یہ کام مشکل ہے۔ جہاں انہیں سکون اور اطمینان ملتا ہے وہاں ان کے راستے میں مت آؤ۔ ان لوگوں کے لیے ہر چیز حتیٰ کہ ایک دوسرے سے متناقص چیزوں پر بھی اعتقاد رکھنا، کسی بھی چیز پر اعتقاد نہ رکھنے سے بہتر ہے۔"

لزارو نے مجھے بتایا کہ ایک بار وہ دونوں چودھویں کی رات جھیل کے کنارے سے گاؤں واپس ہو رہے تھے۔ جھیل کی سطح پر کوہستانی ہوا کے جھونکے لہریں پیدا کر رہے تھے اور ہر چاند کی سیمیں کرنوں سے جگمگ کر رہی تھی۔ ڈان مینوئل نے اس منظر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "دیکھو پانی Litany پڑھ رہا ہے اور اب کہہ رہا ہے، باب بہشت! ہمارے لیے دعا کر"۔ ان کی پلکوں پر دو پوشیدہ آنسو کانپے اور ایک ثانیہ کے لیے چودھویں کے چاند کی ضیا مستعار لے کر شبنم کی طرح گھاس پر گر گئے۔

وقت گذرتا گیا۔ بھائی کو اور مجھے احساس ہو رہا تھا کہ ڈان مینوئل کی قوت نے جواب دینا شروع کر دیا ہے اور اب، اندر ہی اندر گھن کی طرح کھانے والے گہرے دکھ کو مکمل طور پر چھپائے رکھنا ان کے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ شاید کوئی مہلک روگ ان کے جسم اور روح کو دیمک کی طرح کھائے جا رہا تھا۔ لزارو نے شاید ان کا دھیان بٹائے رکھنے کے خیال سے ایک نئی تجویز پیش کی کہ چرچ کی طرف سے کسانوں کی ایک زراعتی یونین قائم کی جائے۔

"یونین؟" ڈان مینوئل نے اداس لہجے میں جواب دیا "یونین کیا ہوتی ہے؟ میں صرف ایک یونین سے واقف ہوں اور وہ ہے چرچ اور تم جانتے ہو یہ یونین کیا کہتی ہے۔ "میری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے۔" لہٰذا لزارو ہماری بادشاہت اس دنیا کی نہیں ہے۔"

"تو کیا، دوسری دنیا کی ہے؟" لزارو نے پوچھا

ڈان مینوئل نے سر جھکا لیا "دوسری دنیا بھی نہیں ہے لزارو کیوں کہ اس دنیا میں دو بادشاہتیں ہیں یا شاید دوسری دنیا ---- پتہ نہیں میں کیا کہہ رہا ہوں۔ رہی یونین کی بات تو دراصل تمہارے ترقی پسندی کے دنوں کی پرانی خواہش ہے۔ لیکن نہیں لزارو یہ مذہب کا کام نہیں ہے کہ وہ اس دنیا کے اقتصادی اور سیاسی جھگڑوں کو چکاتا پھرے۔ خدا نے یہ کام لوگوں پر اپنی عقل و فہم کے مطابق طے کرنے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ انہیں اپنے طور پر سوچنے اور عمل کرنے دو، انہیں اس دنیا میں اپنی پیدائش کے المیہ پر ڈھارس حاصل کرنے دو انہیں اس فریب

میں حتی الامکان خوش رہنے دو کہ ان کی زندگی بے کار اور بے مصرف نہیں ہے ۔ میں غریبوں کو امیروں کی یا امیروں کو غریبوں کی اطاعت کی تلقین کرنے نہیں آیا ہوں ۔ ہر ایک کے لیے ہر ایک میں عفو و درگذر اور استغنا پیدا کرنا میرا کام ہے ۔ رہا سماجی مسئلہ تو اسے بھول جاؤ ۔ یہ ہمارا کام نہیں ۔ فرض کرو ایسا نیا معاشرہ پیدا بھی ہو جائے جس میں امیر و غریب کی تفریق نہ ہو ، جس میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو ، جس میں سب ایک دوسرے کے لیے ہوں تو پھر اس کے بعد کیا ہو گا ؟ کیا اس کا امکان نہیں کہ یہ عام خوش حالی زندگی میں اور زیادہ اکتاہٹ اور بیزارگی پیدا کر دے ؟ میں جانتا ہوں ایک انقلابی رہنما نے کہا ہے کہ مذہب آدمیوں کے لیے افیون ہے ۔ افیون ۔۔۔ ہاں ۔ افیون ۔ انہیں افیون ہی دو ، انہیں سونے اور خواب دیکھنے دو ۔ میری یہ ساری دیوانہ وار جدوجہد کیا ہے ؟ یہ بھی تو افیون ہی ہے ۔ اس کے باوجود میں نہ اچھی طرح سو سکتا ہوں اور نہ سہانے خواب دیکھ سکتا ہوں ۔ میری زندگی ایسا دہشت ناک خواب ہے کہ میں بھی ہمارے روحانی آقا کے ساتھ کہہ سکتا ہوں "میری روح موت کے مرض میں گرفتار ہے " ۔ نہیں ، لزارو ہم کوئی یونین نہیں قائم کریں گے ۔ اگر یہ لوگ قائم کرنا چاہیں تو ان کی مرضی ۔ اس طرح انہیں اپنے ذہنوں کو کام میں لانے کا موقعہ ملے گا ۔ اگر وہ یونین کے کھیل سے خوش ہو سکتے ہوں تو انہیں خوش ہونے دو " ۔

رفتہ رفتہ سارے گاؤں کو یہ بات معلوم ہو گئی کہ ڈان مینوئل کی طاقت جواب دے رہی تھی ۔ وہ اب جلد تھک جاتے تھے ۔ ان کی آواز میں ، اس معجزانہ آواز میں اب ایک اندرونی کپکپاہٹ آگئی تھی ۔ اب وہ خطبہ کے دوران میں لوگوں کو دوسری دنیا کی باتیں بتاتے ہوئے ہر چند لمحوں کے بعد رک جاتے اور آنکھیں بند کر لیتے ۔ لوگ کہتے " وہ اس دنیا کو اپنے سامنے دیکھ رہے ہیں " ۔ ایسے موقعوں پر پاگل بلاسیلو اس طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا جیسے ابھی اس کا کلیجہ پھٹ جائے گا ۔ یوں بھی ان دنوں پاگل بلاسیلو کی ہنسی بہت کم ہو گئی تھی اور اس کی جگہ آنسوؤں نے لے لی تھی اور اب وہ کبھی ہنستا بھی تو اس کے قہقہوں میں فریاد کی بازگشت ہوتی تھی ۔

عید فصح کے آخری ہفتہ میں ڈان مینوئل نے ہماری دنیا میں ، ہمارے گاؤں میں ہم لوگوں کو نمازیں پڑھائیں اور اس وقت پورے اجتماع نے نامعلوم طور پر تیزی سے قریب آتے ہوئے المیے کا احساس کر لیا ۔ ڈان مینوئل نے آخری بار عام اجتماع میں " یارب ، یارب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا " کو دہرایا تو ان الفاظ نے ایک عجیب رنگ لے لیا تھا ۔ یہ ڈان مینوئل کا آخری کمیونین تھا ۔ جب لزارو کی باری آئی تو اس بار انھوں نے ایک مستحکم ہاتھ سے اسے کمیونین دیا اور دعا کے بعد جھک کر سرگوشی میں کہا " اس زندگی کے علاوہ اور کوئی ابدی زندگی نہیں ہے ۔

لوگوں کو خواب دیکھنے دو کہ یہ زندگی ابدی ہے۔ اپنی چند روزہ حیات میں انہیں ابدی زندگی کے خواب دیکھنے دو "اور جب میری باری آئی تو انھوں نے کہا: "دعا کرو، میری بچی، ہمارے لیے دعا کرو۔" اس کے بعد ان کی زبان سے جو الفاظ نکلے وہ آج بھی میرے لیے ایک ناقابل فہم اسرار بن کر ذہن میں جاگزیں ہیں۔ ایک ایسی آواز میں جو کسی دوسری دنیا سے آتی ہوئی معلوم ہو رہی تھی۔ انھوں نے مجھ سے کہا "اور ہمارے آقا یسوع مسیح کے لیے بھی دعا کرو!!"

میں ابھی تو ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے جسم کی ساری طاقت جواب دے گئی ہو۔ میں نیند کے عالم میں چل رہی تھی۔ ہر چیز ایک خواب معلوم ہو رہی تھی مجھے خیال آیا" مجھے اس پہاڑ اور جھیل کے لیے بھی دعا کرنی ہوگی" پھر میں نے سوچا مجھ پر آسیب کا سایہ ہو گیا ہے۔ جب میں گھر پہونچی تو میں نے وہ صلیب اٹھائی جسے میری ماں نے اپنے ہاتھوں میں تھامے ہوئے جان دی تھی اور بہتے ہوئے آنسوؤں میں اسے تکتی رہی۔ میرے ذہن میں یہ فریاد گونج رہی تھی" یارب، یارب تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا"۔ یہ فریاد دو مسیحوں نے کی تھی۔ ایک جو اس کائنات ارضی کا مسیح تھا، دوسرا جو اس گاؤں، لیوکرنا کا مسیح تھا۔ میں نے دعا کی "آسمانوں پر، اور زمین پر تیری مرضی پوری ہو کر رہے گی"۔ اور پھر "ہمیں ترغیب کے راستے سے بچا۔ آمین"۔ پھر میں مقدس ماں کے مجسمے کی طرف مڑی جو اپنے دل میں سات پیوستہ تیر لیے ہوئے کھڑی تھی اور میں نے دعا کی "مقدس ماں کنواری مریم، اب اور موت کے وقت ہم گناہ گاروں کیلئے دعا کر"۔ دعا کے یہ الفاظ زبان سے پوری طرح نکلے بھی نہ تھے کہ میں نے اپنے آپ سے پوچھا" کون گناہ گار ہے؟ اگر ہم گناہ گار ہیں تو ہمارا گناہ کیا ہے؟؟" اس سوال نے مجھے دن بھر مضطرب رکھا۔

دوسرے دن میں ڈان مینوئل سے ملنے گئی۔ ان کے چہرے پر ڈوبتے سورج کی کیفیت تھی۔ میں نے ان سے پوچھا:

"آپ کو یاد ہے مقدس باپ۔ کئی سال پہلے میں نے آپ سے ایک سوال پوچھا تھا اور آپ نے کہا تھا" مجھ سے یہ سوال مت کرو اس کا جواب تمہیں مادر کلیسا کے علمائے دین دے سکیں گے

"یقیناً یاد ہے"۔ ڈان مینوئل نے کہا۔ "اور میں نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ شیطان تمہارے دل میں ایسے سوالات ڈالتا ہے"۔

"تو پھر آج مقدس باپ میں، جو شیطان کے زیر اثر ہوں، آپ کے پاس ایک اور سوال لائی ہوں جو میرا نگہبان شیطان میرے دل میں ڈال گیا ہے"۔

"پوچھو"

"کل جب آپ مجھے کمیونین دے رہے تھے تو مجھ سے کہا تھا" ہم سب کے لیے دعا کرو اور ....."

"اسے مت دہراؤ اور آگے بڑھو"

"میں گھر پہونچی اور دعا کا آغاز کیا۔ جب میں اس آیت پر پہونچی "اب اور موت کے وقت ہم گناہ گاروں کے لیے دعا کر" تو میرے اندر سے ایک سوال ابھرا "کون گناہ گار ہے؟ اگر ہم گناہ گار ہیں تو ہمارا گناہ کیا ہے؟" ہمارا گناہ کیا ہے، مقدس باپ؟"

"ہمارا گناہ؟" انہوں نے جواب دیا "اسپین کی تبلیغی کلیسا کے ایک بہت بڑے عالم نے ایک بار اس کا جواب دیا تھا۔" "زندگی ایک خواب ہے" کے مصنف کالڈرن نے کہا تھا آدمی کا سب سے بڑا گناہ اس کی پیدائش ہے۔ ہمارا گناہ یہ ہے کہ ہم پیدا ہوگئے ہیں۔"

"اس گناہ کا کفارہ کیا ہے۔" میں نے پوچھا

"جاؤ اور دوبارہ دعا کرو۔ ایک بار پھر کہو "اب اور موت کے وقت ہم گناہ گاروں کے لیے دعا کرو" ہاں، انجام کار اس خواب کا، اس زندگی کا کفارہ ممکن ہے۔ انجام کار وہ وقت آئے گا جب پیدائش کا یہ چکر اختتام کو پہونچ جائے گا۔ اور جیسا کہ کالڈرن نے کہا ہے نیکی کرنا ۔۔۔۔ یا نیکی کا بہروپ بھرنا ۔۔۔ خواہ وہ عالم خواب ہی میں کیوں نہ ہو، کبھی رائیگاں نہیں ہوتا۔

آخر کار ان کی رخصت کی گھڑی آپہونچی۔ سارے گاؤں نے اس ساعت کو آتے ہوئے دیکھا۔ یہ ڈان مینوئل کا آخری اور بہترین سبق تھا جو انہوں نے گاؤں والوں کو دیا۔ وہ بیکاری یا تنہائی میں جان دینا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اپنے لوگوں کو تعلیم دیتے ہوئے چرچ میں جان دی گھر سے انہیں کرسی پر اٹھا کر چرچ لے جایا گیا کیوں کہ فالج کی وجہ سے وہ چلنے پھرنے سے معذور ہوگئے تھے۔ چرچ جانے سے پہلے انہوں نے مجھے اور لزارو کو اپنے گھر بلایا اور جب تینوں تنہا ہوئے تو انہوں نے کہا:

"اب ان غریب بھیڑوں کی رکھوالی تمہارے ذمے ہے۔ انہیں جیسے جانے کی تہمت پر ڈھارس حاصل کرنے دو۔ انہیں ان باتوں پر یقین رکھنے دو جن پر میں یقین نہ رکھ سکا اور لزارو جب تمہارا آخری وقت آپہونچے تو میری طرح، اور جس طرح انجلینا کرے گی، مقدس رومن کیتھولک چرچ کی آغوش میں یعنی لیوکرنا کی مقدس مادر کلیسا کی آغوش میں اپنی جان دو۔ اور اب الوداع، اس وقت تک کے لیے جب ہم پھر نہیں مل سکیں گے کیوں کہ زندگی کا یہ خواب اب ختم ہونے والا ہے۔"

"مقدس باپ، مقدس باپ" میں شدت غم سے کراہ اٹھی۔

"پریشان نہ ہو انجلینا، سارے گناہ گاروں کے لیے دعا کرتی رہو، ان سب کے لیے جو پیدا ہوئے ہیں اور انہیں خواب دیکھنے دو، انہیں خواب دیکھنے دو۔ مجھے سونے کی کیسی حسرتیں ہیں! نیند! نیند! ایسی نیند جو ابد تک نہ ختم ہو، جس میں کوئی خواب بار نہ پائے، جس میں خواب کا احساس بھی فراموش ہو جائے!!"

" مجھے دفن کرنے کے لیے تابوت ان چھ تختوں کا بنانا جو میں نے گاؤں کے بوڑھے شاہ بلوط کی لکڑی سے کاٹے تھے ۔ اس شاہ بلوط کے سائے میں میں اپنے بچپن میں کھیلا کرتا تھا ۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں نے خواب دیکھنا شروع کیا تھا تب مجھے ابدی زندگی پر یقین تھا ۔ یا شاید مجھے اب یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان دنوں مجھے یقین تھا کیوں کہ ایک بچے کے لیے ، اور ایک قوم کے لیے بھی یقین رکھنا خواب دیکھنے کے ہی مترادف ہوتا ہے ۔ " کچھ دیر کے لیے ان پر غنودگی طاری ہو گئی آنکھ کھلی تو پھر کہنا شروع کیا:

" تمہیں یاد ہے جب ہم سب ، پورا گاؤں مل کر ایک ساتھ چرچ میں تلاوت کرتے تھے تو اختتام پر میں خاموش ہو جایا کرتا تھا ؟ جب بنی اسرائیل کی دشت و صحرا میں درماندگی اور افتادگی کا زمانہ ختم ہونے آیا تو پروردگار نے ہارون اور موسیٰ سے کہا کہ چونکہ انہوں نے اپنے پروردگار کے حکم سے سرتابی کی اس لیے جب ان کی قوم ارض موعودہ میں داخل ہوگی تو وہ اس کی قیادت نہیں کر رہے ہوں گے اور پروردگار نے ہارون و موسیٰ کو کوہ حر پر جانے کا حکم دیا جہاں پہونچکر موسیٰ نے ہارون کے کپڑے اتار دئے اور ہارون کی موت ہوئی اور تب وہاں سے موسیٰ موابی کے میدانوں سے کوہ نیبو کی چوٹی پر پہونچے اور وہاں سے پروردگار نے انہیں اس سرزمین کا نظارہ کرایا جس کا بنی اسرائیل سے وعدہ کیا گیا تھا اور موسیٰ سے فرمایا اب تم ادھر نہیں جا سکو گے اور موسیٰ کا انتقال وہاں پر ہوا اور کسی انسان کو ان کی قبر کا نشان تک نہ ملا اور انہوں نے یوشع کو اپنا جانشین چھوڑا ۔ تم لزارو میرے یوشع ہو اور اگر تم سورج کی رفتار کو روک سکو تو روک دو اور ترقی کی پرواہ مت کرو ۔ موسیٰ کی طرح میں نے اللہ کا چہرہ ، ہماری زندگیوں کا سب سے عظیم خواب ، دیکھا ہے اور تم جانتے ہو بائبل میں لکھا ہے کہ جس نے خدا کا چہرہ دیکھا ، جس نے خواب کے چہرے کی وہ آنکھیں دیکھیں جن سے خدا دیکھتا ہے ، اس کی موت یقینی اور ابدی ہے ۔ لہذا ہمارے لوگوں کو کم از کم ان کی زندگی میں خدا کا چہرہ نہ دیکھنے دو کیوں کہ جب وہ مرجائیں تو پھر کوئی فرق نہیں پڑتا ، کیوں کہ اس کے بعد وہ کچھ بھی نہیں دیکھ سکیں گے ...."

"مقدس باپ ، مقدس باپ " میں نے گلوگیر لہجے میں کہا ۔

" تم انجلینا دعا کرو ۔ دعا کرتی رہو کہ سارے گناہ گار اپنی موت تک یہ خواب دیکھتے رہیں کہ انہیں موت کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور پھر انہیں ابدی زندگی عطا ہوگی ۔ " میں انتظار میں تھی وہ اختتاماً کہیں گے اور کسے معلوم ؟ " لیکن ان پر دوبارہ غنودگی کا دورہ پڑا اور جب پھر ہوش آیا تو انہوں نے کہا ... " میری آخری ساعت آپہونچی ہے مجھے کرسی پر اٹھا کر چرچ لے چلو تاکہ میں اپنے لوگوں سے جو میری راہ دیکھ رہے ہیں رخصت لے لوں ۔ ہم نے کاندھوں پر ان کی آرام کرسی اٹھالی اور قربان گاہ کے عین نیچے لے جا کر رکھدی ۔ ان کے ایک ہاتھ میں صلیب تھی ۔ بھائی اور میں ان کے پاس کھڑے ہو گئے لیکن پاگل بلاسیلو ان سے ، ہم سب سے زیادہ قریب کھڑا تھا

بلاسیلو نے ان کا ہاتھ اٹھا کر بوسہ دینا چاہا اور جب پاس کھڑے ہوئے لوگوں نے جلدی سے اسے روکنے کی کوشش کی تو ڈان مینوئل بگڑ گئے "اسے میرے پاس آنے دو۔ "انہوں نے کہا" آؤ بلاسیلو مجھے اپنا ہاتھ دو" دیوانے کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے۔

اور تب ڈان مینوئل نے کہا" مجھے صرف چند ایک باتیں کہنی ہیں کیوں کہ میری طاقت جواب دے رہی ہے اور کہنے کے لیے میرے پاس کچھ باقی بھی نہیں رہا ہے۔ امن اور سکون کے ساتھ جئیو اور امید رکھو کہ ہم سب دوبارہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے۔ لیوکرنامیں، وہاں اوپر ان تاروں کے درمیان جو رات کے وقت کوہسار کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے خوابیدہ جھیل کی سطح پر جھلکتے ہیں۔ مقدس مریم سے، ہمارے آقا سے دعا کرتے رہو، نیک بنو بس یہی تمہارے لیے کافی ہے۔ میری ان تمام غلطیوں کو معاف کر دو جو مجھ سے غیر ارادی طور پر یا نادانستہ سرزد ہوئی ہیں۔"

عورتیں، بچے اور مرد نم دیدہ ان کے قریب آ گئے اور وہ ہر ایک کو اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی صلیب سے چھوتے رہے۔ پھر مناجات شروع کی گئی۔ ڈان مینوئل بلاسیلو کا ہاتھ تھامے ہوئے خاموشی سے سنتے رہے۔ دعا کی آواز لوری کا کام کر رہی تھی۔ "آسمانوں کی طرح زمین پر بھی تیری مرضی پوری ہوگی" پھر "مقدس مریم اب اور مرنے کے وقت، ہم گناہ گاروں کے لیے دعا کر۔" پھر "آنسوؤں کی وادی میں روتے اور فریاد کرتے ہوئے" سب سے آخر میں جب اس آیت پر پہونچے" جسموں کو دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور ابدی زندگی بخشی جائے گی" تو لوگوں نے جان لیا کہ ان کے سینٹ نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کر دی تھی۔ ان کی آنکھیں بند کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ مرنے سے پیشتر انہوں نے خود ہی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ جب ہم نے پاگل بلاسیلو کو جگانے کی کوشش کی تو پتہ چلا کہ وہ بھی ابدی نیند سو چکا ہے۔ اس دن گاؤں میں دو جنازے اٹھے۔

سارا گاؤں سینٹ کے مکان پر ٹوٹ پڑا۔ ہر ایک کی خواہش تھی کہ مکان سے کوئی نہ کوئی چیز اس مقدس شہید کی یادگار کے طور پر تبرکاً لے جائے۔ ان کی پوشاک کے ٹکڑے آپس میں بانٹ لیے گئے۔ میرے بھائی نے ان کی دعاؤں کی کتاب اٹھالی۔ کتاب میں صفحات کے درمیان ایک مرجھایا ہوا پھول تھا جو ایک کاغذ کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ کاغذ پر صلیب بنی ہوئی تھی اور کوئی تاریخ درج تھی۔

گاؤں میں کسی کو اس بات کا یقین نہیں آرہا تھا۔ لوگ اب بھی انہیں جھیل کے کنارے سے چہل قدمی کے بعد آتے ہوئے دیکھنے کے منتظر رہتے تھے۔ ہر ایک کے کانوں میں ان کی آواز تازہ تھی۔ ان کی قبر مرجع خلائق بنتی جارہی تھی۔ مریضوں کا ہجوم ان کی قبر پر استادہ صلیب کو

چھونے کے لیے آتا جو ڈان مینوئل نے بلوط کی لکڑی سے خود بنائی تھی۔ ان کی موت کا یقین کرنا میرے اور لزارو کے لیے سب سے زیادہ دشوار ہو گیا تھا۔

لزارو نے ڈان مینوئل کی ساری باتوں کو جمع کرنا اور انہیں صفحہ قرطاس پر منتقل کرنا شروع کر دیا۔ لزارو کی انہیں تحریرات کی مدد سے میں نے اپنی یہ دستاویز مرتب کی ہے۔

"انہوں نے مجھے نیا جنم دیا ہے" لزارو مجھ سے کہتا۔ "میں اصلی لزارو ہوں جسے موت کے بعد جلایا گیا تھا۔ انھوں نے مجھے یقین کی دولت دی ہے۔"

"یقین؟" میں نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا

"ہاں۔ زندگی کی ڈھارس میں، زندگی کی مسرت میں یقین۔ انہوں نے مجھے ترقی کے جنون سے نجات دلائی۔ انجلینا، دو قسم کے لوگ خطرناک ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو دوسری زندگی اور حیات بعد الممات پر یقین رکھتے ہیں اور اس یقین کی بدولت اپنے پیرووں کو عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ وہ دوسری دنیا کی ابدی زندگی کی خاطر اس دنیا کی زندگی کو عارضی اور حقیر سمجھ کر ٹھکرا دیں اور اس کی مسرتوں سے محروم رہیں۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جو صرف اسی دنیا کو حقیقت اصلی سمجھ کر ....."

"شاید تمہاری طرح کے لوگ!" میں نے بیچ میں لقمہ دیا۔

"ہاں میری اور ڈان مینوئل کی طرح کے لوگ لیکن اس فرق کے ساتھ کہ یہ لوگ ایسی دنیا کے قائل ہوتے ہوئے بھی کسی مستقبل کے معاشرے کی طرف لو لگائے رہتے ہیں اور ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ ابدی زندگی اور حیات بعد الممات پر اعتقاد اپنے معتقدین کو جو سکون اور طمانیت دیتا ہے اس سے لوگوں کو محروم رکھیں۔"

"لہذا؟"

"لہذا ان لوگوں کو جینے کے لئے ایک فریب کا سہارا دینا چاہئے۔" لزارو نے کہا

ڈان مینوئل کی جگہ جو دوسرا پریسٹ روحوں کا معالج بن کر آیا تھا وہ اپنے پیشرو کی مقبولیت اور اثرات سے اتنا مرعوب ہوا کہ اس نے اپنے آپ کو میرے اور لزارو کے سپرد کر دیا کہ ہم اس کی رہنمائی کریں۔ وہ ہر بات میں ڈان مینوئل کا اتباع کرنا چاہتا تھا۔ لزارو اس سے کہتا "دینی علوم کے نظریاتی پیچ و خم میں مت پھنسو۔ بس مذہب سے کام رکھو۔" مجھے یہ سن کر ہنسی آئی۔ کیا یہ بھی ایک طرح کا نظریاتی پیچ و خم نہیں تھا؟

اس کے بعد سے مجھے لزارو کے بارے میں فکر ہونے لگی۔ ڈان مینوئل کی موت کے بعد سے اس کا بمشکل زندوں میں شمار ہو سکتا تھا۔ وہ بلاناغہ ان کی قبر پر جاتا۔ گھنٹوں بیٹھا جھیل کو تکتے رہتا۔ دائمی سکون کا تصور اس کے لیے ایک گم گشتہ وطن کی افسردہ یادوں میں ڈھل گیا تھا۔

"جھیل کو اتنا زیادہ مت تکتے رہو۔" میں نے ایک بار اسے سمجھایا "ڈرو مت بہن یہ کوئی اور جھیل، کوئی اور پہاڑ ہے جو مجھے بلا رہا ہے۔ میں اس کے بغیر جی نہیں سکتا۔"

"اور تم جینے کا سکون، جینے کی طمانیت کی جو باتیں کرتے تھے وہ کیا ہوئیں؟"

وہ دوسرے گناہ گاروں کے لیے ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے نہیں، جنہوں نے خدا کا چہرہ دیکھا ہے، جنہوں نے اس کی آنکھوں سے زندگی کو دیکھا ہے۔"

"تو کیا تم ڈان مینوئل کو دیکھنے کے لیے جانے کی تیاری کر رہے ہو؟" میں نے پوچھا

"نہیں، نہیں۔ دیکھو انجلینا یہاں اس مکان میں ہمارے علاوہ کوئی تیسرا آدمی نہیں ہے۔ میں تمہیں سچی بات بتا رہا ہوں۔ یہ صداقت تلخ ہے، سمندر کی طرح تلخ جس میں اس جھیل کا میٹھا پانی جا ملتا ہے۔ میں اسے تمہارے سامنے آشکار کر رہا ہوں لیکن تم اس صداقت کے خلاف اپنے آپ کو مدافعتی ساز و سامان سے مسلح رکھتی ہو ...."

"نہیں لزارو یہ سچی بات نہیں ہے!!"

"میرے لیے یہی سچائی ہے" لزارو نے کہا

"تمہارے لیے اور ..."

"ہاں ان کے لیے بھی، ڈان مینوئل کے لیے بھی یہی سچائی تھی۔"

"لیکن اب نہیں لزارو، اب نہیں۔ اب کسی اور چیز پر یقین رکھو، کسی اور ..."

"دیکھو انجیلا، ڈان مینوئل مجھ سے ہمیشہ کہا کرتے تھے کئی ایک باتیں ایسی ہوتی ہیں جنہیں دل میں تسلیم کرتے ہوئے بھی انسان کو دوسروں سے چھپانا چاہئے۔ ایک بار وہ یہ کہہ رہے تھے تو میں نے ان سے کہا وہ یہ بات مجھ سے نہیں بلکہ دراصل اپنے آپ سے کہتے ہیں۔ آخر کار انہوں نے اس کا اعتراف کر لیا۔ انہیں یقین واثق تھا کہ کئی ایک اولیا کو اپنی موت کے وقت دوسری دنیا کی زندگی پر ایمان نہیں تھا۔"

"کیا یہ ممکن ہے؟" میں نے پوچھا

یقیناً ممکن ہے میری بہن لیکن تم اس کا خیال رکھو کہ یہ بات اس گاؤں کے کسی فرد کے کانوں تک نہ پہونچے۔"

"تم کسی کے کانوں تک پہونچنے کی بات کرتے ہو اور میں سمجھتی ہوں اگر کبھی کسی دیوانگی کے عالم میں میں ان لوگوں کو یہ بات سمجھانے کی بھی کوشش کروں تو یہ لوگ سمجھ نہیں سکیں گے۔ لوگ الفاظ کو نہیں سمجھتے۔ ان لوگوں نے جو کچھ سمجھا ہے وہ تمہارے عمل کے ذریعے سمجھا ہے۔ ایسی باتیں ان کو سمجھانا ایک آٹھ سالہ بچے کو لاطینی زبان میں اکیوناس کی کتاب پڑھانا ہے۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو" لزارو نے کہا"۔ اور انجیلا میری موت کے بعد تم میرے لیے، ان کے

لیے اور سب کے لیے دعا کرو"۔

بالآخر لزارو کی رخصت کا وقت بھی آپہونچا۔ کوئی بیماری جو اس کے مضبوط جسم کو اندر ہی اندر سے کھوکھلا کر رہی تھی، ڈان مینوئل کی موت کے ساتھ اس کی شدت اور رفتار میں دفعتاً اضافہ ہو گیا۔

"مجھے موت کی اتنی پروا نہیں جتنا اس بات کا افسوس ہے کہ میرے ساتھ ڈان مینوئل کی روح کا ایک اور حصہ بھی ختم ہو جائے گا۔ لیکن وہ تم میں زندہ رہے گا۔ اس دن تک جب ہم سب جو مر چکے ہیں مکمل طور پر مر جائیں گے"۔

لزارو عالم نزع میں تھا۔ گاؤں کے لوگ حسب دستور اسے دیکھنے آئے۔ لزارو نے ان سے کچھ نہیں کہا۔ کہنے کے لیے باقی بھی کیا رہ گیا تھا۔ جو کہنا تھا وہ سب کچھ کہا جا چکا تھا۔ لزارو کے ساتھ ایک اور کڑی جو دولیو کر ناؤں کو منسلک کرتی تھی گم ہو گئی۔ ایک لیو کرنا جو جھیل کی تہہ میں مدفون تھا اور دوسرا جو جھیل کی سطح پر منعکس تھا۔ لزارو ہم میں سے ایک اور آدمی تھا جسے زندگی کے مرض نے مارا۔ وہ ہمارے ولیوں میں سے ایک اور ولی تھا۔۔۔ اپنے طور پر۔

اب میں اکیلی اور تنہا رہ گئی تھی لیکن اپنے گاؤں میں اور اپنے لوگوں میں تھی۔ اور جب میں سینٹ مینوئل کو، جو میرے روحانی باپ تھے اور لزارو کو جو نہ صرف خون کے رشتے سے بلکہ روحانی اعتبار سے بھی میرا بھائی تھا کھو چکی ہوں تو اس وقت مجھے احساس ہوتا ہے کہ میں بوڑھی ہو رہی ہوں اور کتنی سرعت سے!! لیکن کیا میں نے انہیں کھو دیا ہے "کیا میں بوڑھی ہو رہی ہوں" کیا میں موت کی طرف بڑھ رہی ہوں"؟

آدمی کو زندہ رہنا ہے اور انھوں نے مجھے جینا سکھایا۔ انھوں نے ہم سب کو جینا سکھایا۔ زندگی کو محسوس کرنا، زندگی کی معنویت کو محسوس کرنا، گاؤں کے پہاڑ، جھیل اور گاؤں کے لوگوں کی روح میں اپنے آپ کو ضم کر کے، اپنے آپ کو ان میں کھو کر ان میں زندہ رہنا سکھایا۔ انھوں نے اپنی زندگی سے مجھے گاؤں کے دوسرے لوگوں کی زندگی میں اپنی زندگی کو گم کرنا سکھایا اور میرے لیے گھنٹے، دن، مہینے اور سال جھیل کے بہتے ہوئے پانی کی طرح سبک دو بن گئے اور میں نے محسوس کیا میری زندگی ہمیشہ یونہی رہے گی۔ زوال عمر کا دیو سبک پا میرے سامنے نہیں تھا۔ اب میں اپنی ذات کی تنگنائے میں محصور نہیں تھی۔ میں اپنے لوگوں میں زندہ تھی اور وہ مجھ میں زندہ تھے۔ میں وہی بات کہنے کی کوشش کرتی جو وہ لوگ بغیر کوشش کے کہہ دیتے تھے۔ ان لوگوں سے میرا قرب مجھے ان کا جزو بنا دیتا تھا اور میں اپنے آپ کو بھول جاتی تھی۔ اس کے برعکس میڈرڈ میں، جہاں میں لزارو کے ساتھ بعض اوقات جایا کرتی تھی، میرا کوئی جاننے والا نہیں تھا اور

اتنے سارے لوگوں کی موجودگی جن سے میں ناآشنا تھی، مجھ میں ایک اجاڑ اور بھیانک تنہائی کا احساس پیدا کر دیتی تھی۔

آج ان یادوں کو، اپنے تجربات کے ذاتی اعتراف کو سپرد قلم کرتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ ڈان مینوئل بر ئنو شہید، میرے سینٹ مینوئل اور میرے بھائی لزارو کو جان دیتے وقت دوسری زندگی پر یقین نہیں تھا۔ یہ عقیدہ جو ہماری زندگی کی سب سے زیادہ متاثر کن طاقت ہے اس پر اعتقاد رکھے بغیر انھوں نے اپنی مایوسی میں جس صبر و استقامت کے ساتھ جو باعمل زندگی گذاری وہ بھی ایک طرح سے اعتقاد ہی تھا۔ انھوں نے اپنی بے یقینی میں بھی بڑی پر یقین زندگی گذاری تھی

مجھے بار بار ایک سوال پریشان کرتا رہتا ہے کہ ڈان مینوئل نے میرے بھائی کو چرچ میں شامل کرنے کے لیے آخر کیوں فریب سے کام نہیں لیا؟ اگر وہ عقیدے سے محروم رہ کر گاؤں والوں کے سامنے اپنے آپ کو باعقیدہ ظاہر کر سکتے تھے تو پھر انھوں نے لزارو کے سامنے ایسا کیوں نہیں کیا؟

میرے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے تھے لزارو کو وہ یہ دھوکہ نہیں دے سکتے تھے۔ انہیں معلوم تھا لزارو کے ساتھ یہ فریب چل نہیں سکے گا۔ وہ اسے صرف سچائی کے ذریعے --- اپنی سچائی کے ذریعہ --- قائل کر سکتے تھے۔ ان کی کوشش لاحاصل ہوتی اگر وہ لزارو کے سامنے بھی وہی مزاحیہ، یاالمیہ کھیل دہراتے جو انھوں نے گاؤں والوں کی نجات کے لیے کھیلا تھا۔ اس طرح انھوں نے لزارو کو اپنے مقدس دھوکے کے لیے جیت لیا تھا۔ موت کی سچائی کے ذریعہ انھوں نے لزارو کو زندگی کی معنویت کا قائل بنایا۔ اسی طرح انھوں نے مجھے بھی جیتا۔ ، انجیلینا کر بیلینو کو، جس نے کسی ذی نفس کو ان کے اس مقدس کھیل کے راز سے واقف ہونے نہیں دیا) ذاتی طور پر میں نے ہمیشہ یہی یقین رکھا ہے کہ خداوند خدا نے اپنی کسی ناقابل فہم اور مقدس مصلحت کی بنا پر ڈان مینوئل کے دل میں یہ یقین پیدا کر دیا تھا کہ انہیں دوسری زندگی پر اعتقاد نہیں تھا اور ممکن ہے آخری سانس کے وقت ان کی آنکھوں سے پردہ ہٹا دیا گیا ہو۔ اور میں، کیا میں یقین رکھتی ہوں کہ اس زندگی کے بعد ایک اور زندگی بھی ہے؟؟

آج جب میں اپنی ماں کے قدیم مکان میں بیٹھی ہوئی یہ سطور لکھ رہی ہوں، میں اپنے پچھلے پورے پچاس برس چھوڑ آئی ہوں۔ ان گذرے ہوئے برسوں کی روپہلی گرد اڑاڑ کر میری یادوں پر، میرے بالوں پر جو سفید ہو رہے ہیں، جم گئی ہے۔ باہر برف باری ہو رہی ہے۔ برف جھیل پر اور پہاڑ پر گر رہی ہے۔ میری یادوں پر گر رہی ہے۔ میرا باپ، جو میرے لیے اجنبی ہے، میری ماں، میرا بھائی، لزارو۔ میرا گاؤں، میرے سینٹ مینوئل اور بچارا بلاسیلو، میرا سینٹ بلاسیلو۔ ان

سب کی یادوں پر برف گر رہی ہے۔ اس برف سے ناہمواری دور ہوتی ہے اور سائے مٹتے ہیں کیونکہ برف رات میں بھی اجالا دیتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا مجھے نہیں معلوم میں نے جو کچھ حقیقت میں دیکھا وہ خواب تھا یا جو کچھ خواب کی طرح دیکھا اور سوچا وہ حقیقت تھی۔ مجھے نہیں معلوم سچائی کہاں تھی، اس میں جو میں جانتی تھی یا اس میں جو میرا اعتقاد تھا۔ مجھے یہ بھی نہیں معلوم میں کیوں اس برف کی طرح سفید کاغذ پر اپنے ضمیر کو حروف و الفاظ میں پیش کر رہی ہوں جو اس کاغذ پر منتقل ہو کر مجھے خالی چھوڑ جائے گا۔ اور اب مجھے اس ضمیر کو اپنے پاس رکھ کر کرنا بھی کیا ہے؟ کیا میں کچھ جانتی ہوں؟ کیا میں کسی شئے پر ایمان رکھتی ہوں؟ کیا میں جو کچھ قلم بند کر رہی ہوں وہ واقعی وقوع پذیر ہوا تھا؟ اور کیا اسی طرح وقوع پذیر ہوا تھا جس طرح میں نے بیان کیا ہے؟ کیا اس کی حقیقت ایک خواب میں دیکھے ہوئے خواب سے زیادہ ہے؟ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اس بھرے گاؤں میں، میں انجیلیٹا کر بیلینو ہی ایک واحد ہستی ہوں جس پر ایسے خیالات کی یلغار ہوئی ہو جو کسی دوسرے کو چھو کر بھی نہیں گذرے؟ اور یہ لوگ جو میرے آس پاس رہتے ہیں کیا یہ ایمان رکھتے ہیں؟ ایمان کیا ہے؟ کم از کم یہ جی تو رہے ہیں۔ اب ان کا ایمان سینٹ مینوئل بوئنو شہید پر ہے جو خود ابدی زندگی کی امید کے بغیر جی کر ان لوگوں کو ابدی زندگی کی امید میں چھوڑ گئے۔

سنا جارہا ہے کہ لاٹ پادری، جنہوں نے ڈان مینوئل کو کلیسا کے اولیا میں شامل کرنے کی مہم کا آغاز کیا تھا، اب سینٹ مینوئل کی سوانح حیات لکھنا چاہتے ہیں جو ایک مکمل ولی کی مثالی زندگی کا نمونہ پیش کرنے والی کتاب ہوگی۔ اس سلسلے میں انھوں نے مجھ سے کئی باتیں پوچھیں۔ میں نے انہیں تمام معلومات بہم پہونچائیں سوائے اس المناک راز کے جو ڈان مینوئل اور میرے بھائی کی امانت ہے اور عجیب بات ہے انہیں اس بات کا کوئی گمان تک نہیں گذرا۔ خدا کرے جو کچھ میں اس یادداشت میں لکھ رہی ہوں وہ کبھی ان کے علم میں نہ آئے۔ مجھے اس زمین کے حاکموں سے، تمام دنیوی حاکموں سے خواہ وہ چرچ کے ہی کیوں نہ ہوں ڈر لگتا ہے۔ لیکن بہر حال میں اس نوشت کو یہاں چھوڑے جارہی ہوں۔ اب اس کا جو مقدر ہونا ہے ہو تا رہے۔

انجیلیٹا کر بیلینو کی یہ یادداشت میرے ہاتھ کس طرح لگی اسے میں پردہ راز میں رکھنا چاہتا ہوں۔ میں نے اسے اسی شکل میں پیش کر دیا ہے جس شکل میں یہ مجھے ملی تھی۔ زیادہ سے زیادہ میں نے دو ایک جگہ کچھ لفظی ترمیم و تبدل کیا ہے۔ آپ کو شاید محسوس ہو کہ اس داستان کی کئی ایک باتیں میری تصانیف کے مواد سے مماثلت رکھتی ہیں۔ لیکن اس سے اس داستان کے اصلی اور طبع زاد ہونے پر شک نہیں کرنا چاہئے۔

انجیلیٹا کر بیلینو نے اپنے روحانی باپ اور مرشد کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر مجھے

شمہ بھر شک نہیں ہے۔ اس کی واقعیت اور سچائی کا مجھے جتنا یقین ہے اتنا سینٹ کو اپنی بے یقینی پر بھی نہیں رہا ہوگا۔ میرے لیے سینٹ مینوئل کی یہ داستان میرے اپنے وجود سے کہیں زیادہ حقیقی ہے۔

اس اختتامیہ کی آخری سطور لکھنے سے پہلے میں مسیح کے ایک فراموش کردہ حواری، سینٹ جوڈاس --- نام پر مت جائیے --- کے مکتوب کی نویں آیت کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ سینٹ میکائیل نے (جو فرشتہ اعلیٰ اور پیغام بر خدا ہیں) ابلیس (یہاں جسکے معنی ہیں احتساب کرنے اور الزام دینے والا) کو موسیٰ کا جسد دوزخ میں لے جانے سے روکا اور کہا "خداوند خدا تمہیں پھٹکارتا ہے"۔ یہ آیت میں نے نقل کر دی ہے اور جو سمجھنے والے ہیں وہ اس کا مطلب سمجھ لیں گے۔

انجیلینا کر بیلینو نے اس نوشتہ میں اپنی طرف سے بھی کچھ کہا ہے، جو ناگزیر تھا۔ میں چاہتا ہوں اس کے بارے میں دو ایک باتیں کہوں۔ انجیلینا نے سوال کیا ہے کہ اگر سینٹ مینوئل اور لزارو اپنے اعتقاد کی نوعیت ظاہر کر دیتے تو کیا گاؤں والے انہیں سمجھ پاتے؟ میرا اپنا خیال ہے گاؤں والے پہلے تو ان کی بات کا یقین نہ کرتے۔ وہ ان کے اعمال و افعال میں یقین رکھتے ان کی باتوں میں نہیں، کیونکہ عمل کو ثابت کرنے کے لیے الفاظ کی احتیاج نہیں ہوتی گی۔ عمل اپنی جگہ خود ظاہر و ثابت ہوتا ہے اور لیو کرنا جیسے ایک گاؤں میں آدمی کا عمل ہی اس کا واحد اعتراف ہوتا ہے۔ لوگوں کو زیادہ خبر نہیں ہوتی کہ اعتقاد اور ایمان کیا چیزیں ہیں اور انہیں اس کی زیادہ پروا بھی نہیں ہوتی۔

مجھے پورا احساس ہے کہ اس داستان میں، جو ایک ناول کی طرز پر کہی گئی ہے (اگر آپ کو لفظ ناول پر اعتراض نہ ہو تو، میں ناول کو صحیح معنوں میں سچی اور معتبر ترین تاریخ سمجھتا ہوں، یہی وجہ ہے جب بائبل کو ناول کہنے پر لوگ خفا ہوتے ہیں تو میں ان کی خفگی کا راز سمجھ نہیں سکتا حالانکہ بائبل کو ناول کہنا درحقیقت بائبل کو محض واقعات کی تاریخ وار رپورٹ سے بلند اور ممتاز کرنا ہے) تبدیلی اور رفتار کا گذر نہیں ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ جھیلوں اور پہاڑوں کی طرح، امید اور مایوسی کی حدود سے آگے ثابت قدمی سے قائم رہنے والی سادہ اور برگزیدہ روحوں کی طرح ہر چیز قائم و دائم رہتی ہے۔ اور یہ روحیں پہاڑوں اور جھیلوں کا حصہ کر تاریخ سے باہر ایک سماوی ناول میں پناہ گزین ہو جاتی ہیں۔

(سوغات شمارہ (۱۱) اپریل ۶۲.)

اونامونو

نومبر ۱۹۳۰ء۔ سلامانکا

محمود ایاز

اونامونو کا انسان اور آدمی

اس شمارے میں مشہور فلسفی اور شاعر اونامونو کی ایک ایسی کہانی کا ترجمہ شائع کیا جارہا ہے جو اس کیتھولک مفکر کے فکر و احساس کے کئی ایک پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہے۔ اونامونو کا شمار اورتیگاری گاسیت کے ساتھ، اسپین کے ان دو عظیم مفکروں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنے ملک کی جغرافیائی حدود سے آگے نکل کر جدید یوروپی فکر کو متاثر کیا ہے۔

حیات مابعد الموت کا تصور ہر مذہبی عقیدے کا لازمی جزو ہے لیکن اونامونو نے اس تصور کو ایک منفرد زاویے سے دیکھنے کی کوشش کی ہے اور اسے "شخصی ابدیت" کا مسئلہ بنا کر ایک زندہ حیاتیاتی اور جذباتی ضرورت کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اونامونو بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھا لیکن بعض اوقات اس کی فکر ایسی "خطرناک" وادیوں سے گزری کہ اسپینی کلیسا کو ایک سے زیادہ بار اس کی سرزنش کرنی پڑی۔

اونامونو نے اپنے فلسفے کی بنیاد عام آدمی پر رکھی ہے۔ گوشت پوست کا بنا ہوا آدمی جو اپنی ذات میں متضاد و متناقض رجحانات کا حامل ہے، جو فکر اور جذبے میں کسی ایک سے بھی مکمل چھٹکارا نہیں حاصل کر پاتا، جس کے لئے زندگی جینے کے عمل کا نام ہے اور جو اس عمل کو اس کی ساری المناکیوں کے باوجود عزیز رکھتا ہے اور موت سے ڈرتا ہے۔ یہ عام آدمی جو دراصل پورا آدمی ہے اپنی زندگی کو نظریات پر قربان نہیں کرتا اور نہ فطرت سے آنکھیں چراتا ہے۔ اس کے لیے زندگی کی سب سے بڑی حقیقت خود زندگی ہے۔ زندہ رہنے کا ایک والہانہ اور شدید جذبہ ہے۔ جیسا کہ سلوادور دی میدار یاگا نے اپنے تعارفی مضمون میں لکھا ہے، زندہ رہنے کی اسی شدید لگن کی وجہ سے اونامونو نے اپنے طور پر، اپنے ذہن میں ان تمام مباحث کا پوری ایمانداری سے جائزہ لیا ہے جو موت کے بعد دوسری زندگی کی نفی کرتے ہیں اور ان مباحث کی قطعیت کے باوجود جینے کی اسی شدید لگن کی وجہ سے اونامونو یہ محسوس کرتا ہے کہ زندگی کے لیے اس کا شدید جذبہ ہنوز برقرار ہے اور اس بنا پر وہ اپنی فکر کو یہ حق دینے سے انکار کرتا ہے کہ وہ اس کے عقیدے کو ہلاک کردے۔

اونامونو کی ایک کہانی کا عنوان ہے "پورا آدمی۔۔۔ نہ بیش نہ کم" یہ عنوان اونامونو کی فکری سمت کا واضح اظہار کرتا ہے۔ "یہ پورا آدمی" جس کے اندر سارے منفی اور مثبت رجحانات

ایک ساتھ موجود ہوتے ہیں، اس کا ذہن ایک طرف اپنی پوری سفاک قطعیت کے ساتھ موت کے بعد دوسری زندگی کی نفی کرتا ہے تو دوسری طرف اس کی روح اپنی شدید آرزو میں ابدی زندگی کے وجود پر اصرار کرتی ہے اور ان دو دشمن سچائیوں --- سوچی ہوئی سچائی اور محسوس کی ہوئی سچائی --- کا تصادم اس احساس کو جنم دیتا ہے جسے اونامونو زندگی کا المیہ احساس کہتا ہے۔ یہی المیہ احساس اونامونو کے "پورے آدمی" کو لارنس کے "دھرتی اور خون کی اقدار" کو ماننے والے آدمی سے الگ اور ممیز کرتا ہے کیونکہ یہ المیہ احساس اونامونو کے آدمی کے لیے وہ اخلاقیات مہیا کرتا ہے جس کے بغیر "پورا آدمی" "ایسا" "فطری آدمی" بن جاتا ہے جو اپنی منطقی نشو و نما میں ایک طرف ہٹلر اور مسولینی بنتا ہے تو دوسری طرف ایک خطاونسیاں سے منزہ استبدادی سیاسی جماعت میں ڈھل جاتا ہے (۱)

اس المیہ احساس کے اینٹ گارے سے اونامونو نے اپنے پورے فلسفے کی عمارت کھڑی کی ہے اور اس عمارت کی بنیاد "پورے آدمی" پر ہے۔ اونامونو نے اپنی معرکہ آرا کتاب The Tragic Sense of Life کے پہلے باب کا عنوان ہی رکھا ہے۔ "گوشت اور ہڈی کا آدمی" اس باب میں اونامونو نے "پورے آدمی" کی وضاحت کی ہے:

"گوشت اور پوست کا آدمی جو پیدا ہوتا ہے، مصائب سہتا ہے اور مرجاتا ہے۔ ہاں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ مرجاتا ہے۔ آدمی، جو کھاتا اور پیتا ہے، تفریح کرتا ہے، سوتا ہے، سوچتا ہے، ارادہ و اختیار رکھتا ہے، جسے دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ آدمی کی یہ وضاحت اس لیے ضروری معلوم ہوئی کہ اس کے علاوہ ایک اور "شے" بھی ہے جسے "آدمی" کہا جاتا ہے اور جو کافی سے زیادہ علمی اور سائنسی مباحث کا موضوع ہے (جیسے ارسطو کا بے پروں والا دو پایہ، روسو کا معاشری عہد نامے والا آدمی، مانچسٹر اسکول کا معاشی آدمی، لینوس کا عقل رکھنے والا آدمی۔) یہ آدمی جو نہ یہاں کا ہے نہ وہاں کا اس زمانے کا ہے نہ پچھلے زمانے کا، جس کی نہ کوئی جنس ہے اور نہ کوئی ملک، بلکہ جو محض ایک نظریہ ہے یا دوسرے الفاظ میں "غیر آدمی" ہے۔

لیکن میں جس آدمی کی بات کر رہا ہوں وہ گوشت اور پوست کا بنا ہوا ہے جیسے میں اور آپ۔ جیسے وہ تمام آدمی جن کے قدم زمین پر مضبوطی سے قائم ہیں۔ اور یہی ٹھوس آدمی، گوشت اور ہڈی سے بنا ہوا آدمی، ہر فلسفہ کا موضوع اور مقصود عظیم رہا ہے۔"

آدمی کے اس تصور کو اونامونو کے ہاں بنیادی اہمیت حاصل ہے اور اسی تصور کی وجہ سے اس کے لیے حیات مابعد الموت کا تصور صرف شخصی ابدیت کے مفہوم میں بامعنی بنتا ہے۔ شخصی ابدیت سے ہٹ کر کوئی اور تصور اس کے لیے قابل قبول نہیں۔ اونامونو کا "پورا آدمی" جس زندگی سے محبت کرتا ہے وہ اس کی "اپنی" اور "شخصی" زندگی ہے اور اگر موت کے بعد اسے اس "شخصی" زندگی کی امید نہ ہو تو پھر کسی اور قسم کی زندگی اس کے لیے کوئی کشش تو کیا کوئی معنی

تک نہیں رکھتی ۔ شخصی ابدیت پر یہ اصرار بظاہر فکری اور عقلی اعتبار سے غلط اور بے معنی سہی لیکن جینے کی لگن اور زندہ رہنے کا جذبہ اپنی شدت میں فکر، منطق اور عقل کے خلاف احتجاج کرتا ہے ۔ اونا مونو کے " پورے آدمی " کو اس بات سے بھی تسکین نہیں ہوتی کہ وہ مرنے کے بعد حقیقت اصلی یا حقیقت اعلیٰ کی طرف (خواہ یہ " حقیقت " مادہ ہو، توانائی ہو یا خدا) مراجعت کر جائے گا اور " کل " میں شامل ہو کر ابدی زندگی حاصل کر لے گا کیونکہ اس ابدی زندگی میں وہ " میں " قائم نہیں رہتا جو یہاں اس دنیا میں موجود تھا اور " پورا آدمی " اس " میں " کے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ لہٰذا اس کے لیے شخصی ابدیت ایک مسئلہ نہیں بلکہ ایک زندہ حیاتیاتی اور جذباتی ضرورت ہے ۔ پورا آدمی خدا پر یقین رکھتا ہے تو اس لیے کہ اسے شخصی ابدیت پر یقین ہے ۔ وہ اس یقین کے ذریعہ خدا کے وجود کا یقین حاصل کرتا ہے جبکہ عام مذہبی عقیدے میں حیات بعد الممات پر یقین کا سوال خدا کے وجود پر ایمان لانے کے بعد پیدا ہوتا ہے ۔ تقدیم و تاخیر کا یہ فرق عام آدمی یا پورے آدمی کے منشور کی اساس ہے ۔ شخصی ابدیت پر یقین کا عقلی اور فکری دلائل سے جواز تلاش کرنا بے سود ہے کیونکہ " پورے آدمی " کا سارا وجود اس عقلیت پرستی اور نظریہ سازی کے خلاف ایک احتجاج ہے جو آدمی کو خانوں میں بانٹ کر نظریاتی سانچوں میں ڈھال کر ادھورا آدمی زندگی سے عاری مشین کا پرزہ ، بے جان بت اور ایک صفر بنا دیتی ہے ۔ یہ پورا آدمی وہ Irrational man ہے جو اس صدی میں دوبارہ زندہ ہو رہا ہے ۔ اس آدمی کے بارے میں جو بات کہی جائے گی اس میں کسی استدلال، منطقیت اور عقلیت پرستی کا مروجہ معنوں میں استعمال ممکن نہیں رہتا ۔ اونامونو کو اس بات کا شدید احساس تھا اور اس نے کھلے الفاظ میں اس کا اعتراف کر لیا ۔

" میں نے کوشش کی ہے کہ نہ صرف اپنی روح کو بلکہ انسانی روح کو اس کی اصلی شکل میں عریاں کرکے پیش کروں ۔ اس سے قطع نظر کہ اس روح کی ماہیت کیا ہے اور آیا اسے دوام ہے یا فنا ۔ اور یہ کوشش مجھے اس کربناک منزل میں لے آئی ہے جہاں زندہ احساس اور عقلیت پسند فکر ایک دوسرے سے اس طرح متصادم ہیں کہ ان کے درمیان مفاہمت کی کوئی صورت نظر نہیں آتی اور اس منزل میں پہونچنے کے بعد یہ ضروری ہے کہ اس تصادم اور تضاد کو بعینہٖ قبول کیا جائے اور ان کے ساتھ زندگی بسر کی جائے ۔ جذبے اور عقل کا یہ تضاد مایوسی اور کرب کو جنم دیتا ہے اور میں بتانا چاہتا ہوں کہ یہ مایوسی اور کرب کس طرح ایک صحتمند اور توانا زندگی، ایک موثر عمل، ایک اخلاقیات، ایک جمالیات، ایک مذہب اور حتیٰ اینکہ ایک منطق تک کی بنیاد بن سکتے ہیں ۔ اور یہ بات میں جس طریقے سے ثابت کرنا چاہتا ہوں اس میں استدلال کے ساتھ تخیل کا بھی دخل ہوگا بلکہ شاید تخیل کا عنصر کچھ زیادہ ہی ہوگا ۔ میں اپنے ان خیالات کو جو ممکن ہیں میرے واہمے کی پیداوار ہوں یا محض شاعری ہوں یا بہر حال ایک طرح کی اسطور ہوں کسی فلسفے کے نام سے پیش

کر کے کسی کو دھوکہ نہیں دینا چاہتا۔ وہ پڑھنے والے جو خالص سائنٹیفک دلائل اور مخصوص منطقی فکر کے متوقع ہوں شاید میری تحریر کا ساتھ نہیں دے سکیں گے۔

یہ مقدس کرب اور مایوسی جو فکر اور احساس کے تصادم سے پیدا ہوتی ہے، دراصل وہی زندگی کا المیہ احساس ہے جو کم و بیش پوشیدہ طور پر آج کے متمدن افراد اور اقوام کے شعور کا بنیادی پتھر ہے۔ میری مراد ان افراد اور اقوام سے ہے جو فکر کی حماقت یا احساس کی حماقت کے مرض میں مبتلا نہیں ہیں۔ اور یہ المیہ احساس زندگی کی اولوالعزمانہ کامرانیوں کا سرچشمہ ہے۔ اس بحث کے دوران میں اگر استدلال کی کمی، دلائل کا غلط اور بیجا استعمال اور فکری تسلسل کا فقدان نظر آئے تو یہ مت کہئے کہ میں نے آپ سے کوئی فریب کیا ہے۔ کیونکہ میں پہلے بتا چکا ہوں مجھے اپنے محسوسات کو علمی دلائل بنا کر نہیں پیش کرنا ہے (۲)"

زندگی کے المیہ احساس اور شخصی ابدیت کا یہ تصور اونامونو کی تمام تحریروں کا مرکز ثقل ہے۔ "سینٹ مینوئل بوئنو شہید" کی کہانی بھی اسی نقطے کے گرد گھومتی ہے۔ یہ کہانی ایک ایسے آدمی کی داستان پیش کرتی ہے جو زندگی بھر عقیدے سے محرومی کی آگ میں جلتے رہنے کے باوجود اپنے قصبے کے سادہ معصوم لوگوں کو عقیدے کی طمانیت اور مسرت دیتا رہا۔ اس دنیا کی زندگی میں ایک اچھے آدمی کا جو بھی بلند ترین معیار ہو سکتا ہے اس پر ڈان مینوئل پورا اترتا ہے۔ زندگی بھر کبھی کسی کو اس سے کوئی گزند نہیں پہونچا بلکہ پورے گاؤں کیلئے اس کی ذات تقویت، راحت اور مسرت کا منبع تھی۔ کردار کی پاکیزگی، طبعیت کی بے نفسی اور عالی ظرفی، بے لوث عمل اور بے غرض خدمت، غرض وہ تمام صفات جو ایک آدمی کو کسی بھی مذہب کی تعلیمات کا مثالی نمونہ بنا سکتی ہیں، ڈان مینوئل میں موجود تھیں۔ مذہبی شعائر کی پابندی اور احترام میں اس کی طرف سے کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہوئی بلکہ اپنے پیشے کے اعتبار سے بھی وہ اس معاملے میں اپنے گاؤں کا روحانی پیشوا تھا۔ لوگوں کو سکون اور اطمینان بخشنے والا۔ لیکن اس کی اپنی روح میں تخمین وظن کا جہنم دہک رہا تھا۔ اقبال نے اپنے ضمیر میں "معرکہ کہن" کے تازہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن ان کے ہاں اس "معرکہ" کی تفصیل کم ہی ملتی ہے۔ ان کی توجہ زیادہ تر اس "معرکہ" میں "عشق" کی فتح کے اظہار پر ہی مرکوز رہی اور وہ ہمیں بالعموم "اک جہاں اور بھی ہے جس میں نہ فردا ہے نہ دوش" کی منزل میں ملتے ہیں (کم از کم شاعری میں!) لیکن ڈان مینوئل کا پورا کردار اس معرکے سے عبارت ہے۔ ایک طرف موت کے بعد دوسری زندگی کا مذہبی تصور عقل کے لیے ناقابل قبول تھا اور دوسری طرف موت کو زندگی کا مکمل اور آخری خاتمہ مان لے تو پھر ساری زندگی ہیچ اور بے معنی ٹھہرتی تھی۔ اس تضاد کو کیسے حل کیا جائے؟ کیا آدمی سی سی فس کی طرح اپنی قسمت کو قبول کرلے اور اپنے عمل کے لایعنی ہونے کے احساس کے باوجود مصروف عمل رہ کر اپنے وجود کا جواز تلاش کرے یا زندگی اور کائنات کی لایعنیت کے خلاف بطور احتجاج خود کشی کرے؟ کامیو کے

ناول " طاعون " میں ڈاکٹر کا کردار اس سوال کا ایک ممکن جواب دیتا ہے ۔ ڈاکٹر کو یقین ہے کہ قصبے کی پوری آبادی کو جس میں وہ خود بھی شامل ہے ، طاعون کا شکار ہونا ہے اور اس سے بچنے کی ہر کوشش رائیگاں ہے لیکن اس یقین کی وجہ سے وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھ جاتا بلکہ اس یقین کے باوجود پوری تندہی اور جاں فشانی سے مقدور بھر بیماری کا مقابلہ کرتا ہے اور مریضوں کا علاج کرتا ہے ۔ (یہ عمل ، اپنی قسمت کو جاننے کے باوجود آدمی کی یہ جدوجہد ، اس زمین پر اس کے وجود کو بامعنی بناتی ہے) ۔ عمل کی بات اقبال بھی کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں عمل کی بنیاد ایک مفروضاتی یقین پر ہے جبکہ ڈاکٹر کا عمل حقیقت کے ادراک اور مایوسی کی کوکھ سے پیدا ہوتا ہے ۔ ڈان مینوئل نے اپنے لیے وہی راستہ اختیار کیا جو ڈاکٹر نے منتخب کیا تھا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ اگر ڈاکٹر کا عمل قطعی تھا تو ڈان مینوئل کا عمل ایک عارضی اور وقتی سمجھوتہ تھا ۔ ڈاکٹر کی جدوجہد کسی مقصد کی خاطر نہیں تھی اور نہ ہو سکتی تھی کیونکہ اس نے صورت حال کی بے حاصلی کو ایک طے شدہ حقیقت کے طور پر قبول کر لیا تھا ۔ اس کے برعکس ڈان مینوئل کا عمل ان معنوں میں مقصدی تھا کہ وہ اپنے گاؤں کے لوگوں کو ان کی معصوم لاعلمی میں زندہ رکھنا چاہتا تھا ۔ اس کی زندگی کے ہر عمل کی غائت یہ تھی کہ گاؤں کے لوگ اس سکون اور طمانیت کے ساتھ زندہ رہ سکیں جس سے خود اس کی زندگی محروم تھی ۔ بظاہر ڈان مینوئل کا عمل ریاکاری پر بھی محمول کیا جاسکتا ہے کیونکہ اس نے زندگی بھر ان باتوں کی تعلیم دی جن پر اسے خود یقین نہیں تھا ۔ لیکن نطشے کے الفاظ میں ڈان مینوئل ہمارے احترام کا مستحق ہے کیونکہ اس کا عمل اپنی تعلیمات کا نمونہ تھا ۔ (گو اصولی طور پر فکر و عمل کے اس تضاد کا کوئی جواز نہیں لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ تضاد ناگزیر ہے ؟؟) اس کا جواب اثبات میں بھی ممکن ہے اور نفی میں بھی ۔ اثبات میں یوں کہ اجتماعی سالمیت ، سماجی تنظیم اور معاشرے کی ہم آہنگی بہر حال انفرادی فکر و عمل سے بلند تر چیزیں ہیں اور ان کے تحفظ کی خاطر " بہ منبر نہ تواں گفت " کی قید ضروری بھی ہے اور لازمی بھی اس نظریہ سے جو خطرناک امکانات پیدا ہوتے ہیں اور شخصی آمریت سے لے کر جماعتی استبدادیت تک کے جواز کے جو پہلو نکل سکتے ہیں ان سے یا ان کے انسداد کے طریقوں سے میں بے خبر نہیں ہوں لیکن یہاں اس بحث کا موقعہ نہیں ہے ۔ اور نفی میں یوں کہ اولاً مقصد ، ذریعہ کا جواز کسی حال میں نہیں بن سکتا اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ سچائی اور حقیقت کی تلاش اور دریافت (یا بازیافت ؟) ہمیشہ ذاتی اور انفرادی سطح پر ہی ہوتی ہے ۔ اگر اجتماعی سالمیت اور سماجی نظم و ضبط کے نام پر اس تلاش اور دریافت کے اظہار کو ممنوع قرار دیا جائے یا پوشیدہ رکھا جائے تو پھر انسانی فکر و تہذیب کا وجود اور ارتقاء خطرے میں پڑ جائے گا ۔ پیغمبر ہوں یا مفکر دونوں نے ہمیشہ ایک اجتماعیت اور ایک معاشرے سے انحراف کیا ہے ۔ یہ اور بات کہ آگے چل کر وہ خود ایک اجتماعیت اور ایک معاشرے کی تشکیل کا باعث بن گئے ہوں ۔ لیکن جہاں تک اونامونو

کا تعلق ہے اس کے لیے ان مباحث کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ ڈان مینوئل میں اس نے اس پورے آدمی کی جھلک دکھائی ہے جو ابھی ارتقائی مرحلے میں ہے۔ ڈان مینوئل عقل اور جذبے کی آویزش سے پیدا ہونے والی مایوسی اور کرب کا شکار تو ہے لیکن اس کے ہاں عقل کی مزاحمت ابھی اتنی شدید ہے کہ جذبہ جست لے کر (اسے اقبال کے الفاظ میں Vital act کہہ لیجئے۔) مایوسی اور کرب سے یقین کی روشنی تک نہیں پہونچ پا رہا ہے۔ یہی اس کے فکر و عمل کے تضاد کا راز ہے جو کہانی میں جابجا نمایاں ہے۔ روح کی آرزو اس سے کہتی ہے کہ وقت کے حصار سے باہر شخصی ابدیت ممکن ہے یا ممکن ہونی چاہئے۔ لیکن اس کی عقل اس آواز کو آرزو مندی کا خواب بتاتی ہے اس کشمکش میں وہ کبھی ایک طرف جھکتا ہے اور کبھی دوسری طرف۔ ایک طرف عقل کی بات مان لے تو یہ زندگی اور اس کی ساری جد و جہد بے معنی ٹھہرتی ہے اور پھر جھیل اسے اپنی طرف بلاتی ہے۔ خود کشی۔ زندگی میں کسی معنویت کے فقدان کا احساس خود کشی میں اظہار چاہتا ہے۔ (دوسری طرف پہاڑ کی چوٹی پر گیت گاتی ہوئی چرواہی تاریخ سے باہر، زمان و مکاں کی قید سے آزاد زندگی کی علامت بن جاتی ہے اور اس کی روح پکار اٹھتی ہے۔ "زندگی انجمن آرا و نگہبان خود است!

ڈان مینوئل کو اونامونو نے اپنے فلسفہ کا نمائندہ بنا کر نہیں پیش کیا ہے بلکہ اس کے ذریعہ سے اپنے فلسفہ کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کہانی کے آغاز میں سینٹ پال کا یہ اقتباس بہت معنی خیز ہے کہ "اگر مسیح پر ہمارا اعتقاد صرف اس زندگی کی حد تک ہے تو پھر زمین پر ہم سے زیادہ بد نصیب انسان نہ ہوں گے"۔ ڈان مینوئل کے کردار میں اونامونو نے بتایا ہے کہ یہ بد نصیبی کیا معنی رکھتی ہے۔ اس کے ساتھ کہانی میں موسیٰ کی موت کا واقعہ اور اختتام پر جوڈاس کے مکتوب کا حوالہ بھی سامنے رکھئے۔ (نقش اول۔ سوغات شمارہ (۱۱) اپریل ۶۲ء)

حوالے (۱) اس مسئلہ پر ایڈون میور نے ایک بہت فکر انگیز مضمون لکھا تھا The Political man and the natural man. اس کا ترجمہ "سوغات" کے پہلے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ لیکن شاید ایسی چیزیں "نئی نسل" کی مرغوب غذا نہیں ہیں!!

(۲) اردو ادب کے جو دو چار باخبر اور بافہم قاری ہیں انہیں ان سطروں تک پہنچتے پہنچتے کئی بار "انسان اور آدمی" (حسن عسکری) کی یاد آئی ہوگی۔ اس مضمون میں جس طریقے سے اونامونو کا ذکر کیا گیا ہے اس کی داد نہ دینا ظلم ہوگا۔ جس سے بات "مستعار" لیں اسی کو "اپنی بات" پر شاید بنا کرنے آئیں!! خدا کے واسطے، ایسے کی پھر قسم کیا ہے!! عسکری کے مضمون کی تمہیدی سطور خاص طور پر پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں جیسے: "اپنے ادبی تجربات کی مدد سے مجھے پتہ چلا ہے کہ انسان اور آدمی میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی ذریعہ سے مجھے یہ بھی اندازہ ہوا ہے کہ اگر لوگوں نے اس فرق کو واضح طور پر محسوس نہیں کیا تو انسانی تہذیب کا مستقبل صدیوں کے مبہم ہے۔ یہ میرے محسوسات ہیں، علمی دلائل نہیں ہیں اور نہ میں انھیں یہ شکل دے سکتا ہوں۔ لہٰذا اگر میرے مضمون میں جابجا استدلال کی جگہ ادعا، توازن کی جگہ تعصب بلکہ ضد اور ہٹ دھرمی نظر آئے تو مجھے معذور سمجھئے۔" (یہ جملے حرف بہ حرف اونامونو کے ہیں۔ م۔ا)

بازگشت

آل احمد سرور

ڈاکٹر آفتاب احمد

مغنی تبسم

اجمل کمال

شفیق فاطمہ شعریٰ

انور خان

عارف ایوبی

شاہد کلیم

شفیق فاطمہ شعریٰ

ساجد رشید

نعمان شوق

(۱)

۱۶/ اگست

"آپ سے پہلی بات تو یہ کہنی ہے کہ بے تکلف سوغات کے صفحے کچھ کم کر دیں۔ شمارہ ۶ ۵۷۸ صفحات کا ہے۔ میرے خیال میں ہر کتاب ساڑھے چار سو تا پانچ سو صفحات کی ہو۔ دوسرے اعزازی کاپیاں صرف مضمون نگاروں یا قلمی معاونین کو دی جائیں ہاں مضمون نگاروں کو تھوڑا سا معاوضہ ، یا جا سکتا ہے

سوغات ہر شمارے میں کوئی گوشہ یا سلسلہ مضامین شائع کر کے بڑی خدمت انجام دے رہا ہے۔ مثلاً شمارہ ۶ میں خالد اختر کا بھرپور تعارف ہے مجھے یہ حضرت پسند آئے۔ خصوصاً ان کا چاندنی رات میں اونٹ پر سندھ کے صحراؤں میں سفر۔ حمید نسیم کا مفصل جائزہ۔ عزیز حامد مدنی کے کلام پر میرے نزدیک ایک خاصے کی چیز ہے۔ کاش وہ اس جاندار اور طرح دار تبصرے میں یہ کہنے کی ضرورت نہ سمجھتے کہ "مدنی اپنی غزل میں حالی کے بعد سب سے برتر شاعر ہیں۔ کوئی اسکے جمال صوت اس کی ندرت فکر اور وسعت خیال کے قریب تک نہیں۔" تعجب ہے کہ اقبال کی "بال جبریل" کی غزل کی موجودگی میں وہ ایسی بات لکھ جاتے ہیں انہوں نے مدنی کی غزل گوئی کے محاسن بڑی خوبی سے واضح کئے۔ اپنی بات کہوں "مجھے مدنی کی غزل اس تبصرے کے بعد اچھی لگی۔ نظم کی خوبیاں بھی واضح ہوں گی مگر نظم آورد ہے اور غزل آمد۔ اسلم فرخی خاکے اچھے لگتے ہیں مگر حمید نسیم کا خاکہ واقعی دھندلا رہا۔ انہوں نے خود اسکا اعتراف کیا ہے۔ حمید نسیم کی غزلیں آپ نے پچھلے شمارے میں شائع کر کے اور اب ان کا یہ یادگار تبصرہ شائع کر کے ایک اچھی دریافت کی ہے (بازیافت کے بجائے دریافت ہی یہاں صحیح ہے)۔

رشید صاحب نے مولانا ماجد کے متعلق جو کچھ (اپنے خط میں) لکھا ہے اس سے ایک حلقے میں میرے خلاف ایک جذبہ ابھرا ہے۔ اردو والے ابھی تک اپنے اپنے حلقے سے آگے نہیں دیکھتے وہ سخن فہموں کے نہیں طرف داروں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ مجھے تو نظر آتا ہے کہ ہمارے یہاں دانشوروں کی جو بہر تھی یا معنی خیز تنقید کے ذریعہ سے ماضی و حال کے سمجھنے کی اسکا اثر کم ہو گیا ہے اور یا تو بنیاد پرستی بڑھی ہے یا گروہ بندی۔ پھر یہ حال کے آشوب سے بچنے کے لیے ماضی کی یادوں میں پناہ لینا کچھ بھی ہو مردانگی تو نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں غزل کی صنف سے بھی خوف ہوتا ہے۔ آپ جانتے ہیں میں غزل کے خلاف نہیں لیکن صرف غزل کو سب کچھ کہنے کے خلاف ہوں۔ اردو شاعری صرف اس وقت آگے بڑھے گی جب نظم پر توجہ ہوگی۔ ہاں فکشن، افسانہ اور ناول کی ترقی خوش آیند ہے۔

(۲)

۲۹/ اکتوبر ۹۴ء

عرصے سے نہ آپ نے خط لکھا اور نہ میں نے۔ اس پر یاد آیا کہ جوش صاحب "عرصہ" بمعنی "مدت" کو غلط سمجھتے تھے۔ میں تو ٹھیک سمجھتا ہوں۔ میں جوش صاحب کو نہیں انشا کو سند مانتا ہوں جنہوں نے شروع انیسویں صدی میں کہدیا تھا کہ جو لفظ جس طرح اردو میں رائج ہو چکا وہی صحیح ہے۔ میری صحت اب اچھی نہیں رہتی پھر بھی کچھ نا کچھ کرتا رہتا ہوں کچھ خطوط آپ کو بھیجنا چاہتا تھا لیکن نقل کرنے کے لیے کوئی صاحب نہیں مل رہے تھے۔ ایک دو ریسرچ اسکالرس شاید آمادہ ہو جائیں۔

"فکر روشن" کے نام سے ایک مجموعہ اور کچھ خطبے کچھ مقالے کے نام سے دوسرا مجموعہ، دونوں کتابت طباعت کی صحت کے بعد پریس چھپنے کے لیے گئے ہیں۔ ایک نومبر میں اور دوسرا دسمبر میں آئے گا۔ رشید صاحب کے دو سو گیارہ خطوط کی کتابت ہو گئی ہے۔ اب حواشی اور مقدمے کے بعد پریس کو جائیں گے۔ اس کام میں بھی چار مہینے اور لگ جائیں گے۔

"خواب باقی ہیں" کا ایک ایڈیشن ختم ہو گیا۔ اس میں کچھ باتیں شامل کرنی ہیں۔ آخر میں ایک باب بڑھا دوں جہاں اضافے ضروری معلوم ہوں کر دوں؟ یہ کام اب اگلے سال کے لیے اٹھا رکھا ہے۔ اگر اس وقت تک زندگی نے وفا کی۔ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

۲۴/ نومبر ۹۴ء:

پرسوں کی ڈاک سے سوغات ملا۔ یہ نمبر تو خاصے کی چیز ہو گیا ہے۔ احمد علی کے خصوصی مسالے کے علاوہ منیب الرحمن پر گوشہ پھر عزیز احمد کی کتاب بر صغیر میں اسلامی جدیدیت پر نثار احمد کا مضمون اور حمید نسیم کا راشد مضمون پڑھنا شروع کیا ہے۔ پڑھ لوں تو آپ کو اپنے تاثرات ضرور لکھوں گا۔ حمید نسیم کا پچھلا مضمون (عزیز حامد مدنی پر) بھی پسند آیا تھا۔ یہ راشد پر بہت ہی خوب ہے۔

آپ رجسٹری سے سوغات نہ بھیجا کیجیے۔ میں نے یہاں ان صاحب سے جو کاپیاں منگواتے ہیں طے کر لیا ہے کہ وہ میرے لیے ایک کاپی مخصوص کر دیں جو میں خرید لیا کروں گا سوغات کی اس طرح کی مفت خوری پر جو شرمندگی ہوتی ہے۔ اس سے بچ جاؤں گا

احمد علی کے انٹرویو سے ان کے متعلق کچھ اچھا تاثر قائم نہیں ہوتا۔ اس میں وہ "سرکہ جبیں" لگتے ہیں۔ میں دو دفعہ کراچی میں ان سے ملا میرا تاثر بھی یہی ہے۔ ان کے کام کی اہمیت تو مسلم ہے"

آل احمد سرور۔ علی گڑھ

۱۶ نومبر

پرچہ بالاقساط کو پڑھ رہا ہوں ۔ آپ کا اداریہ بہت پسند آیا ۔ ویسے تو آپ نثر بھی بہت اچھی لکھتے ہیں اس بار خاص کیفیت محسوس ہوئی ۔ اخترالایمان کی خود نوشت آہستہ چل رہی ہے ۔ اس بار انہوں نے اختصار سے کام لیا ہے ۔ اسے پڑھ کر خاص طور پر میراجی کے بارے میں کچھ اور جاننے کی خواہش ہوتی ہے ۔ عرفان صدیقی کی منقبتوں نے بے حد متاثر کیا "کہاں سے لائے" ردیف والی منقبت نے تو دل کو دہلا کے رکھ دیا ۔ سوغات کا مطالعہ جاری ہے مشمولات کے بارے میں اپنے تاثرات آیندہ بھی لکھتا رہوں گا ۔ مغنی تبسم ۔ حیدر آباد

اس بار اداریے میں احمد علی کے گوشے کا تعارف کرتے ہوئے آپ نے انھیں یوں خراج تحسین پیش کیا ہے: "احمد علی کی افتاد طبع ایسی نہیں تھی کہ وہ اپنی ادبی زندگی توہم پرستی، غلامی، جہالت، اور افلاس کے خلاف لڑنے میں صرف کر دیتے ۔ "تین صفحے بعد آپ اردو کے شاعروں ادیبوں کو اکساتے ہیں کہ " خالص شعر و ادب سے ہٹ کر کبھی کبھار اپنی ذہنی سرگرمی کا رخ کسی اور طرف بھی موڑیں تو تخلیقی عمل پر کوئی تباہی نہیں آجائے گی" ۔ یہاں ذکر " برصغیر میں اسلامی جدیدیت پر نثار احمد فاروقی کے تبصرے کا ہے ۔ آپ نے اردو کے ادیبوں کو بہت بڑا چیلنج دے دیا ہے کہ اپنی ذہنی سرگرمی کا رخ اسلام اور جدیدیت کے موضوع کی طرف اس طرح موڑیں کہ توہم پرستی، غلامی، جہالت، افلاس وغیرہ کی طرف ہرگز دھیان نہ جائے ۔ دیکھیے ہمارے ادیب اس دلچسپ مگر دشوار کام کا کس طرح سامنا کرتے ہیں ۔

ڈاکٹر شمیم حنفی کے مضمون " نیا ادبی منظر نامہ (تبدیلی کی بنیادیں) " کا اختتام ان سوالوں پر ہوتا ہے: ہمارے ذہن میں " اپنا آپ " کیا ہے؟ اس کی معنویت کیا ہے؟ باہر کی دنیا سے اس کا رشتہ کیا ہے؟ اس کی تخلیقی جہات کیا ہیں؟ اور وہ کیسی اور کتنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کا متحمل ہو سکتا ہے؟

اس سلسلے کا پہلا سوال میرے پیش نظر ہے اور اسی سے تحریک پاکر میں نے اس مضمون کو دوبارہ پڑھا تو کئی جزوی تعریفیں سامنے آئیں جنھیں مختلف مصنفوں کے حوالے سے درج کیا گیا ہے: اختر احسن " تیسری دنیا " کی جغرافیائی / اور تہذیبی اکائی کو تسلیم کرتے ہیں مگر اس نام " تیسری دنیا " سے مطمئن نہیں ۔ وہ اس روایت کو " عظیم مشرقی روایت " کا، گویا اس اکائی کو " مشرق " کا نام دینا پسند کرتے ہیں ۔ ڈاکٹر نامور سنگھ بھی کم و بیش یہی بات کہتے معلوم ہوتے ہیں نرمل ورما، ہندوستان کو تہذیبی اکائی ۔ یا کسی زیادہ وسیع تہذیبی اکائی کا ایک حصہ ۔ قرار دے کر اس کے اندرون یوروپ سفر کی بات کہتے ہیں ۔ بھال چندر نیماڑے کی تعریف (شاید ڈاکٹر حنفی

کے لفظوں میں " بے جڑ اور بے چہرہ شہری طبقے کی بوگس بین الاقوامیت کے خلاف " رد عمل کے طور پر) " اینٹی کولونیل اور نیشنل کلچر " کی مرکب اصطلاح میں سامنے آتی ہے جس کو انھوں نے ہندوستانی ادب کی اپنی اصلیت کی تقسیم کی کوششوں کا مقصود ٹھہرایا ہے ۔ (" بے جڑ "، " بے چہرہ اور " بوگس " کے اسمائے صفت کا مجموعی مفہوم شاید " غرب زدہ " کی اصطلاح کے مفہوم کے قریب قریب ہو جو ایرانی ادیب جلال آل احمد نے استعمال کی ہے ۔) نیماڑے کے جملے کے سیاق و سباق سے لاعلمی کے باعث اس کی تعبیر کرنے میں غلطی کا امکان زیادہ ہے لیکن شاید ان کی تعریف میں تاکید کولونیل " مغرب " اور مقامی " شہری " فکر میں اس کے اثر و نفوذ کی مزاحمت پر ہے ۔

ڈاکٹر حنفی ان سب تعریفوں سے مختصراً بحث کرتے ہوئے غالباً ایک composite تعریف متعین کرنا چاہتے ہیں ۔ اگر ایسا ہے تو یہ تعریف اتنی واضح نہیں ہو سکی کہ میری سمجھ میں آسکے ۔ جو مفروضہ آسانی سے قائم کیا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ انکی مراد ہندوستان (یا ہندوستان اور پاکستان) کے اردو ادیبوں اور ادب کے قارئین سے ہے ۔ اس مفروضے کی بنیاد ان امتیازات پر ہے جو انھوں نے ایک طرف " افریقا، ایشیا [غالباً برصغیر کو خارج کر کے] اور لاطینی امریکا کے ادیبوں " اور دوسری طرف " اپنی ہی علاقائی زبانوں میں لکھنے والوں " سے واضح کی ہیں ۔ جس سوال کا جواب اس مفروضہ تعریف سے نہیں ملتا وہ یہ ہے کہ اگر " افریقا، [باقی] ایشیا اور لاطینی امریکا " کے ادیب اردو ادیبوں سے تہذیبی معاملوں میں بہت آگے اور اردو ادیب " اپنی ہی علاقائی زبانوں میں لکھنے والوں " سے بہت پیچھے ہیں تو اردو ادیبوں کی اس پس ماندگی کو آیا اس وسیع تر تہذیبی اکائی کی پس ماندگی قرار دیا جاسکتا ہے جس کا ایک جز اردو ادیب (یا ان سے وابستہ تہذیب) ہے !

کم و بیش ایسا ہی ابہام اردو تنقید میں " تیسری دنیا " " مشرق " اور " روایت " کے موضوعات پر بحثیں پڑھ کر بعض پڑھنے والوں کے ذہن میں پیدا ہوتا ہے ۔ مثلاً ایک عام استدلال یہ ہے کہ " مشرق " کی بعض خصوصیات کے باعث اردو میں ڈراما (یا ناول) اتنا نہیں پنپ سکا جتنا " مغرب " کی زبانوں میں ۔ اس استدلال کے بنیادی مفروضے کے درست یا غلط ہونے سے یہاں بحث نہیں ۔ سوال یہ ہے کہ کہیں اس میں اردو ادب کی بعض منفرد خصوصیات کو تو پورے " مشرق " سے منسوب نہیں کر دیا گیا اگر اردو ادب یہ خصوصیات پورے " مشرق " سے مشترک رکھتا ہے تو مثلاً چینی، جاپانی اور (اردو کے سوا) باقی ہندوستانی زبانوں کے " روایتی " اور " جدید " تھیٹر کا کیا مطلب ہوا ؟ اگر مشرق سے مراد وہ اکائی ہے جسے " تیسری دنیا " کہا جاتا ہے تو مثلاً عربی، افریقی، اور لاطینی امریکی ناول کا کیا کیا جائے ؟

محمد حسن عسکری اور سلیم احمد کی تحریروں میں یہ الجھاؤ خاصی شدت سے محسوس ہوتا ہے کہ وہ شمالی ہندوستان کے (اردو سے وابستہ) مسلمانوں کے عروج و زوال کو "مشرق" کی روایت کے پھلنے پھولنے یا مرجھانے کے مترادف قرار دیتے معلوم ہوتے ہیں۔

اپنے لیے نام منتخب کرنے (یا اپنی تعریف متعین کرنے) کا یہ عمل خاصا پر اسرار ہے۔ یہی عمل دوسروں کو نام دینے (یا دوسروں کے دیے ہوئے ناموں کو رد کرنے) میں بھی کار فرما دکھائی دیتا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر حنفی ہندوستان اور پاکستان کی "احیاء پرست" جماعتوں کا ذکر کرتے ہیں اور انھیں ناپسندیدہ ٹھہراتے ہیں لیکن "مشرق کی بازیافت" اور "روایت کی بحالی" جیسے رجحانات سے ان کا امتیاز واضح نہیں کرتے۔ ("احیاء پرست" سے ان کی مراد غالباً وہی ہے جسے "مغرب" والے "بنیاد پرست" کا نام دیتے ہیں)

اختر احسن کو "تیسری دنیا" کا نام پسند نہیں، لیکن وہ اسے تہذیبی اکائی ضرور سمجھتے ہیں اور اس کے لیے "مشرق" کا نام تجویز کرتے ہیں۔ "تیسری دنیا" کی اصطلاح انھیں لوگوں کی وضع کی ہوئی تھی جنھوں نے بعد میں مثلاً "بنیاد پرستی" کی اصطلاح بنائی۔ لیکن میرا سوال یہ ہے کہ کیا "مشرق" والوں نے اپنا نام "مشرق" خود رکھا تھا؟

ایک زمانہ تھا کہ خود کو "عرب" کہنے والے باقی تمام دنیا کو "عجم" کہتے تھے۔ کیا اس سلبی تعریف کی بنا پر عرب کے سوا باقی پوری دنیا کو ایک تہذیبی اکائی قرار دیا جا سکتا ہے؟

دوسرے لفظوں میں: کیا "مشرق" (یا "تیسری دنیا") کی حدیں متعین ہیں؟ اگر ہیں تو آیا یہ تہذیبی حدیں ہیں یا جغرافیائی یا محض سیاسی؟ اگر یہ حدیں جغرافیائی ہیں تو جاپان، جنوبی کوریا اور ملیشیا "مشرق" کا حصہ ہیں یا مغرب کا؟ اور چین، کمبوڈیا، ویت نام، ترکی اور سعودی عرب؟ کیا سرد جنگ کے زمانے کا روس (سوویت یونین) "مشرق" کا حصہ تھا؟ ("مغرب" کا حصہ تو غالباً نہیں تھا) اور سرد جنگ شروع ہونے سے پہلے؟ اور سرد جنگ ختم ہونے کے بعد وسطی ایشیا کو جوں کا توں "مشرق" کی رکنیت مل جائے گی یا کسی قسم کے تطہیر کے عمل سے گزرنا ہوگا؟

اگر "مشرق" کی مفروضہ حدیں تہذیبی ہیں تو ان حدوں کے اندر جو کچھ موجود ہے وہ اس مفروضہ وحدت کے تمام حصوں میں کلی طور پر مشترک ہے یا جزوی طور پر؟ اگر انتخاب درپیش ہو تو اس کے اصول کیا ہوں؟ اگر "سب کچھ" "مشرق" ہے تو کیا "خالص مشرقی" ہے یا ان طویل صدیوں کے تاریخی تفاعل کا نتیجہ ہے جب ممکن ہے "مشرق" اور "مغرب" کی اصطلاحوں میں نہ سوچا جاتا ہو؟ اگر "سب کچھ" "مشرق" ہے تو پھر مقامی "شہری" ("ناخالص") فکر کو کیوں کر باہر نکالا جائے گا؟

کیا "مشرق" کی تہذیبی وحدت کو قبول کرنے کا مطلب "مغرب" کی وضع کردہ تقسیم کو قبول کرنا اور مضبوط بنانا ہے؟

پروفیسر عزیز احمد کی کتاب کے اردو ترجمے " برصغیر میں اسلامی جدیدیت " پر نثار احمد فاروقی کے طویل تبصرے میں بھی بعض نکات ایسے ہیں جن میں اسی قسم کا ابہام موجود محسوس ہوتا ہے۔

اس میں کہا گیا ہے کہ اسلام کی آمد کے بعد کے ہزار گیارہ سو سال " میں پیدا ہونیوالے فرقوں اور مکاتب فکر وغیرہ کا مصدر "قدیم و جدید " کا جھگڑا نہیں تھا۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں ؟ اگر "قدیم " اور " جدید " کے تصورات زمانی ہیں تو کیا وقت نے صرف اس وقت حرکت کرنا شروع کیا جب مغربی استعمار ہندوستان میں داخل ہوا؟

بعض لوگ مسلمانوں کی مجموعی فکر میں مفروضہ " زوال " کا آغاز غزالی کے افکار کی مقبولیت کو قرار دیتے ہیں۔ "جدید " اور "قدیم " کی طرح "عروج " اور " زوال " کے تصورات بھی ناگزیز طور پر وقت کے گزران سے وابستہ ہیں۔ اس لیے یہ طے کرنا ضروری ہے کہ جب ہندوستان پر انگریزی حکومت قائم ہوئی تو مسلمانوں کی "فکر " میں " زوال " آچکا تھا یا نہیں۔

اگر " قدیم و جدید " کے جھگڑے کا تعلق وقت سے نہیں بلکہ استعمار (COLONIZATION) سے ہے تو جس وقت " مسلمانوں کی حکومت حجاز سے نکل کر پورے جزیرہ نمائے عرب میں، پھر ایران، وسطی ایشیا، ترکی اور ہندوستان میں، ادھر مصر، تیونس، الجزائر اور اسپین تک پھیلی " تو یہ استعمار تھا یا نہیں تھا؟ اگر یہ بھی استعمار تھا تو کیا یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ مسلمانوں میں "قدیم و جدید " کا جھگڑا صرف تب پیدا ہوتا ہے جب وہ استعمار کا ہدف ہوں، اور اس وقت نہیں ہوتا جب وہ خود استعمار کا ہدف دوسروں کو بنارہے ہوں؟

اگر اس بات کو درست مان لیا جائے کہ " پرتگیزی اور فرنگی مستعمرین کی آمد " ہی " جدید و قدیم کی بحث کا آغاز " ہے تو اس بحث کو ۱۹۴۷ میں انجام پذیر ہو جانا چاہیے تھا۔ اگر یہ بحث ختم نہیں ہوئی تو کیا " مستعمرین " کی آمد سے پہلے اور رخصت کے بعد زمانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلے حکومت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی اور اب نہیں ہے؟ اگر ایسا ہے تو اس بحث کو کم از کم پاکستان (اور بنگلہ دیش) میں ختم ہو جانا چاہیے تھا جہاں حکومت پر مسلمانوں کا خاصا تسلی بخش تصرف ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بحث ان ملکوں میں بھی کیوں جاری ہے جن کے سابقہ تجربات اور موجودہ معروضی حالت ہندوستان کی مسلمان اقلیت سے بالکل مختلف ہیں مثلاً ایران، ترکی، لیبیا، انڈونیشیا، ملیشیا وغیرہ؟

ہندوستانی مسلمانوں کا بنیادی مسئلہ "مغرب" کی یلغار ہے یا" برادران وطن" سے پیکار ؟ اگر اس قسم کی تفریق ناروا ہے تو کیا آپ ہندوؤں کو "مغرب" کا مترادف سمجھتے ہیں اور مسلمانوں کو "مشرق" کا ؟ یا یہ کہ دونوں گروہوں کے درمیان فرق " غرب زدگی" کے درجے کا ہے اور دونوں ایک ہی درجے پر آجائیں تو ان کی باہمی چپقلش ختم ہو جائے گی ؟ اگر "جدید" سے مراد "مغرب" اور "قدیم" سے مراد "مشرق" ہے تو کیا ہندوستان کے ہندوؤں اور پاکستان کے مسلمانوں کی "مغرب" سے آویزش ایک ہی نوعیت کی ہے ؟

ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل کی نوعیت روحانی (مابعد الطبعیاتی) ہے یا مادی ؟ اگر یہ مادی مسائل ہیں تو " برادران وطن " کو بھی یہ مسائل درپیش ہیں یا نہیں ؟ اگر ہیں تو دونوں گروہوں کے مادی مسائل ایک سے ہیں یا مختلف ؟ اس اختلاف کی نوعیت کیا ہے ؟ اگر روحانی مسئلہ ہے تو شاہ بانو کیس میں شریعت جیت گئی ، قانون ہار گیا ۔ خدا مسلم پرسنل لا کو سلامت رکھے ، فکر کس بات کی ہے ؟

"شعر شور انگیز" (جلد چہارم) میں شمس الرحمن فاروقی نے کلاسیکل مشرقی شعریات کے "تصور حقیقت" کو واضح کرتے ہوئے ایک قول نقل کیا ہے جو کچھ یوں ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر اپنے بندوں پر نرمی کرے تو یہ اس کا فضل ہے اور سختی کرے تو عدل ہے ۔ "تصور حقیقت" کی مزید وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مطلوب سے اگر طالب کو "مہر و وفا و لطف و عنایت" کے بجائے اس کے برعکس سلوک کا سامنا ہو تو اسے اول الذکر صورت کے مقابلے میں خوش ہونا چاہیے ۔

اگر ہندوستانی مسلمانوں کو کسی قسم کی سختیوں کا سامنا ہے تو مدیر "سوغات" کو تو خوش ہونا چاہیے ۔ وہ کیوں اردو کے شاعروں اور ادیبوں کو "خالص شعر و ادب" سے توجہ ہٹا کر اپنی سرگرمی کا رخ "اسلام اور جدیدیت" کی بحث کی طرف موڑنے کی ترغیب دے رہے ہیں ، خاص طور پر جب کہ اس بحث میں خدشہ ہے کہ ان کی توجہ کہیں "توہم پرستی ، غلامی ، جہالت اور افلاس جیسے ممنوعہ موضوعات کی طرف نہ ہو جائے ؟

احمل کمال ۔ کراچی

۱۶/ نومبر ۱۹۹۴ء

سوغات کے تیسرے دور کا آغاز جس نقطہ نظر سے ہوا تھا وہ نقطہ "چراغ لیکے کہاں سامنے ہوا کے چلے" کا چراغ تھا ۔ اب کتاب ۷ میں گراف اونچا ہوتا ہوا جس نقطہ کو چھو رہا ہے وہ "راز ہے راز ہے تقدیر جہان تگ و تاز" کی تفسیر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ہم سب اس خوشی میں آپکے ساتھ شریک ہیں ۔
اخترالایمان کی نظمیں ایک عرصہ کے بعد سوغات کے صفحات کی زینت بنیں ۔ یہ جاندار

شاعری بظاہر جتنی سادہ سہج ہے، رچنا کاری کے مرحلوں کے اعتبار سے اتنی ہی تہہ در تہہ بھی ہے۔ جتنی حقیقت نفس الامر جیسی سنگلاخ، اتنی ہی بے ساختگی کے ہنر میں پار ہے جب قاری سے اس شاعری کی اطمینان بخش تعریف نہیں بن پاتی تو وہ خاموش رہ کر محسوس کرتا ہے کہ ایسی شاعری کے تعلق سے خاموشی بھی ایک خوشگوار ذہنی سرگرمی ہے

ایک طرف ان ینناؤں نے شور مچا رکھا ہے۔ میرے ذہن کے ایجادی قفس میں تو نہ صرف ایک، بلکہ انتالیس بھی، بس یہی جل ترنگ بجائے جا رہی ہیں کہ۔۔۔ فلک آرا شہزادی ہے

بہت اچھا افسانہ لکھا ہے نیر مسعود نے۔۔۔ وارث علوی نے بیدی کے افسانے "جو گیا" کا جس طرح جائزہ لیا ہے، وہ انکے قلم کے شایان شان ہے۔۔۔ اپنے دوسرے مضمون کے آخر میں لوقا کی انجیل کی ایک حکایت بیان کرنے کے بعد وہ رقم طراز ہیں:

"بعد میں آنے والے مفکرین نے اس حکایت کی تفسیر کی اساس پر عیسائی تھیولوجی کے چند کلیدی تصورات کی تعمیر کی۔ دراصل تعبیر اور تفسیر ہی مذاہب کی شریعتوں اور فلسفوں کی اساس رہی ہیں۔ اسی سبب سے مذہبی تعبیر کا جدید ادبی تعبیر پر گہرا اثر پڑا ہے۔"

اس طرح یہ بیان رحمت خداوندی کے آفاق گیر تصور تک پہنچتا ہے

۔۔۔۔۔۔ ہمارے لئے کتب سماوی کی حکایات کسی بھی قسم کے حرف گیری سے بالاتر ہیں۔ کہ ان صحائف میں اصل متن اور تحریف کی علیحدہ علیحدہ نشاندہی ممکن نہیں رہی ہے۔ تو اس مقام احترام سے آگے بڑھ کر حرف تعبیر سے سروکار رکھا جا سکتا ہے۔۔

اس ہیکل تعبیر کے سامنے جو ہجوم اپنے آپ کو گم کر دو راہ کہہ کہہ کر سینہ پیٹ رہا ہے اس میں استعماری اور صرافہ بازاری طاقتوں کے چہرے بھی پہچانے جا سکتے ہیں۔ جب معافی کا محصول وصول کرنے میں دیر ہوتی ہے تو ادبی تاویلات اور شاعرانہ سکوت دور کھڑے۔ نظروں نظروں میں سفارش کرتے ہیں کہ ہیکل جو معافی دینے کی خود کار مشین ہے۔ اپنا کام مستعدی سے انجام دے۔

ایک دوسری مثال کی ہیکل کے سامنے۔ محصول وصول کرنے والے کی جگہ اگر کوئی ایسا شخص کھڑا کر دیا جائے جس کا نام ہرشد مہتا ہو، تو یہ ہیکل، معافی دینے سے پہلے اس شخص سے مطالبہ کرے گی کہ وہ اپنا حساب بے باق کر کے آئے۔ تاکہ معافی ان لوگوں کے حق میں ظلم نہ بن جائے جنکی حق تلفی ہوتی ہے۔

اسکے برخلاف ہمارے یہاں عدل مطلق کے تصور کو بھی رحمت خداوندی کے آفاق گیر تصور کا ایک مظہر تسلیم کیا گیا ہے۔ اس طرح جو تصور حیات ابھرتا ہے اس پر قائم فلسفیانہ، مذہبی

اور ادبی روایات اپنے اندر زیادہ توازن رکھتی ہیں ۔ خاص طور پر ہم نے تمدن سیاست اور معیشت کے دائروں میں ان دونوں تصورات کو لازم و ملزوم مانا ہے ۔

ابھی سوغات بہت کچھ پڑھنا باقی ہے ۔

نئے باب "اسلام اور عصر حاضر" کے لئے نیک تمناؤں کے ساتھ

شفیق فاطمہ شعری ۔ حیدرآباد

اس بار نیر مسعود کی کہانی نے دل موہ لیا ۔اس کہانی کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے ۔ او جھل" اور مار گیر" کی طرح یہ کہانی بھی ان کی لازوال کہانیوں میں سے ہے ۔اس کی نزاکتوں اور خوبیوں سے کوئی پارکھ ہی پوری طرح انصاف کر سکتا ہے ۔

ن ۔ م ۔ راشد کی شاعری پر حمید نسیم کا مضمون بہت خوب ہے ۔ راشد کی شاعری پر اس سے اچھا مضمون نظر سے نہیں گزرا ۔ احمد علی کے افسانوں کی ایک تاریخی اہمیت ہے ۔ کئی افسانے پہلی بار پڑھنے میں آئے ۔

اس بار اختر الایمان کی سوانح کی قسط بہت مختصر لگی ۔ اگلے شمارے میں اس کی تلافی ہونی چاہیئے ۔

"سوغات" کا یہ دور غالباً اس کا سب سے شاندار دور ہے اور ایک بے حد اہم ادبی ضرورت کی تکمیل کرتا ہے ۔

انور خان ۔ بمبئی

سوغات کا شمارہ آج پورا پڑھ کر ختم ہو گیا حسب سابق اس شمارہ کے بھی جملہ مشمولات اچھے لگے ۔ خاص طور سے ن ۔ م ۔ راشد پر حمید نسیم کا مضمون بہت ہی خوبصورت ہے ۔ اسکے علاوہ جناب قمر احسن کے افسانے پر سید اشرف صاحب کا تجزیہ بھی بہت متوازن اور غیر جانبدارانہ ہے ، اور ظاہر ہے کہ یہ ہونا بھی چاہیئے کہ سید اشرف صاحب افسانے کی اچھی پرکھ رکھتے ہیں لیکن اس تجزیہ کے کچھ حصے ان سے متفق نہیں ہو پا رہا ہوں ۔ کیوں کہ جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ افسانے میں بنیادی یا کلیدی حیثیت ، نہ تو ناظم نقوی کو حاصل ہے ، نہ خوابوں کو اور نہ ہی مسہری کے اس پائے کو جو کہانی بیان کر رہا ہے بلکہ اس کہانی میں کلیدی اہمیت اس مسہری کی ہے جس پر ناظم نقوی سویا ہوا ہے ۔ کیونکہ آدم کے جسم میں انسانی اور شیطانی طاقتیں ، یا یوں کہہ لیں کہ قوت ملکیہ اور قوت بہیمیہ دونوں ہی بیک وقت موجود رہتی ہیں ۔ جن پر اگرچہ جاگتی ہوئی حالت میں تو انسان کا اختیار ہوتا ہے ، لیکن سونے کے دوران یہ طاقتیں اس کے اختیار میں نہیں رہ جاتیں ، بلکہ آزاد ہو جاتی ہیں ۔

اس لئے اگر مسہری کو قوت بہیمیہ کی علامت مان لیا جائے، تو افسانے کی معنویت تبدیل ہو جائے گی ۔ نیز یہ کہ مسہری کا وہ پایہ جو کہانی بیان کر رہا ہے، قوت بہیمیہ کے جسم کا ایک حصہ قرار پائے گا اور یہی حال بقیہ تین پایوں کا ہو جائے گا، یعنی اس جسم کے مختلف حصے ۔ اسلئے مسہری کا پایہ جو بے حس و بے جان ہے، اس کی زبانی نفرت انگیز شہوانی خوابوں کے بیان کا منطقی استدلال بھی یہی ہو گا ۔ اب جہاں تک سوال موذن کے اذاں دینے کا ہے، کہ مصنف نے اس سے کیا تخلیقی فائدہ اٹھایا، تو اس سلسلہ میں عرض ہے، کہ اسلامی عقائد کے مطابق اذاں کی آواز سے شیطانی طاقتیں بھاگ جاتی ہیں، اس لئے افسانے کا کوئی دوسرا اختتام ممکن ہی نہ تھا ۔ ہاں اگر اس افسانے کا کوئی دوسرا اختتام ہوتا تو یہ افسانہ "خوابگاہ" کے بجائے "مباشرت گاہ" ہو سکتا تھا ۔ جسکی قمر حسن صاحب سے قطعی امید نہیں کی جا سکتی کیوں کہ وہ خود بھی بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک اچھا افسانہ کن کن چیزوں کا متقاضی ہوتا ہے ۔

عارف ایوبی ۔ لکھنؤ

سوغات کے شمارہ ۷ میں حمید نسیم صاحب کا مضمون "ن ۔ م ۔ راشد ۔ ایک عالمی سطح کا شاعر" میں نے پڑھا ۔ پورے مضمون میں انہوں نے راشد کی شاعری کو فیض کی شاعری پر ترجیح دی ہے ۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فیض کی شاعری میں امیجری اور پیکر کا نظام ہے وہ راشد کی شاعری میں موجود نہیں ۔

مضمون کا عنوان ہے ۔ "راشد عالمی سطح کا شاعر" مگر انہوں نے اپنے مضمون میں راشد کی نظموں کے حسن و قبح کو ہی پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس مضمون میں راشد کے اقبال سے بھی استفادہ حاصل کرنے کی بات ہے (دیکھئے "تین سو سال" کا استعمال نظم "دریچے کے قریب" میں ۔ "سباویراں" کے لئے ایلیٹ کی نظم GERON TION اور "حسن کوزہ گر" کے لئے اینڈریا ڈیل سارتر پر براؤننگ کی نظم سے خیال مستعار لینے کی بھی بات ہے ۔ اس صورت میں راشد کے یہاں فکر و خیال کی سطح پر اور یجنسیلٹی کی کمی محسوس ہوتی ہے ۔ مگر نسیم صاحب انہیں نظموں (سباویراں اور حسن کوزہ گر) کو عالمی برتر ادب میں شامل کرتے ہیں اور کہتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔

"میں راشد صاحب کو ان کی ارفع ترین تخلیقی سطح پر
عالمی سطح کا شاعر مانتا ہوں" ۔

کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب "اقبال ایک مطالعہ" میں اقبال کا موازنہ بیرونی شعرا۔ کے ساتھ کیا ہے ۔ اور ان کے کلام کے تقابلی مطالعے کی روشنی میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال خود عالمی سطح کے شاعر نہیں ہیں ۔ راشد کا مقام بھی عالمی سطح پر متعین کرنے کے لئے

ضروری تھا کہ ان کی نظموں کے ساتھ بیرونی شعرا کی نظموں کا بھی تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتا اور ان نظموں کی نشاندہی کی جاتی جو تھیم کے اعتبار سے اوریجنل ہیں۔
بہرحال یہ مضمون ان کے وسیع مطالعہ اور محنت شاقہ کا نتیجہ ہے۔
شمیم حنفی کا مضمون "نئی تنقید کا المیہ" بھی غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ نظریاتی ادب کے تعلق سے انہوں نے بڑے پتہ کی بات کہی ہے۔۔۔۔
" ایسی تنقید جو انسانی تجربوں سے زیادہ دلچسپی تصورات اور نظریات سے رکھتی ہو نظام احساس میں نہ تو کوئی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے نہ ہی زیادہ دنوں تک اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتی ہے

بزرگ فنکاروں کی ادبی حیثیت کا تعین بہت ضروری ہے۔ اس لحاظ سے منیب الرحمن اور احمد علی پر گوشہ کی اشاعت قابل تحسین ہے۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے۔۔ اسے جاری رکھیئے۔
شمارہ ۶ میں بھی آپ نے بہت کم غزلیں شائع کی ہیں۔ شمارہ ۷ میں بھی صرف چار غزلیں ہیں۔ آپ اتنی کم غزلیں شائع کر رہے ہیں کہ تشنگی سی محسوس ہو رہی ہے۔
نظموں کی تعداد اچھی خاصی ہے۔ شاہین، خالد جاوید، عذرا نقوی اور نعمان شوق کی نظمیں اچھی لگیں اور نثری نظم کے مطالعے سے "نمکین حلوے" کا ذائقہ ملا۔
نیر مسعود کا افسانہ "طاؤس چمن کی مینا" اختتام پر مرتکز اور شدید نہ ہو سکا۔ البتہ افسانے کی زبان میں ایسی شیرینی ہے کہ قاری آغاز سے انجام تک اس کے سحر میں ڈوبا رہتا ہے۔ قمر حسن ایک مدت کے بعد نظر آئے مگر کمزور کہانی کے ساتھ۔ انکی کہانی "خوابگاہ" پر سید محمد اشرف کا تجزیہ اچھا لگا یہ انکی ژرف نگاہی ہے کہ انہیں مبہم افسانے کی کلید بھی آسانی سے مل جاتی ہے۔
بازگشت کے تحت بیشتر ایسے خطوط شائع ہوئے ہیں جن میں سید محمد اشرف کے افسانے پر وارث علوی صاحب کے تبصرے کو نہ پسند کرنے کی بات ہے۔ وارث صاحب نے اپنے ایک خط مطبوعہ "سطور۔ اگست ۱۹۸۰" میں لکھا تھا۔
" مجھے جدید افسانہ پسند نہیں ہے۔ نہایت اوسط درجہ کے لکھنے والے پیدا ہوئے ہیں۔ اکثر تو بالکل فراڈ ہیں یعنی اگر وہ رسمیہ افسانہ لکھتے تو بیسوی صدی میں بھی مشکل سے جگہ پاتے۔ تجرباتی اسلوب انکے لئے اپنی میڈیو کریسی چھپانے کی نقاب بن گیا ہے۔ ان لوگوں کے وجود کو میں اپنے ادبی تخلیہ میں ناگوار مداخلت سمجھتا ہوں"۔
اب افسانے کا روپ بدل گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ وارث صاحب اپنے نقطہ نظر میں تبدیلی لائیں۔ تعصب اور تنگ نظری کے زیر اثر ادب کے ساتھ انصاف نہیں ہو سکتا۔

شاہد کلیم۔ آرہ

"محمد حسن عسکری کا مضمون تاریخی شعور، آج بھی اتنا ہی توجہ طلب ہے جتنا کہ ۱۹۴۹ء میں تھا جبکہ وہ لکھا گیا۔

عسکری صاحب اس مضمون میں روایتی تاریخ ہی کو تاریخ مان کر چلے ہیں جو شاہی خاندانوں کے عروج و زوال کی روداد سے عبارت ہے۔ مگر ہماری تاریخ میں اس روایتی تاریخ کے متوازی، وقت کی رفتار کو صحیح سمت عطا کرتی ہوئی ایک رو برابر چلتی آئی ہے۔ اس میں محکوم طبقہ رعایا کے مقام سے اوپر اٹھ کر آزاد شہریوں کے درجہ کا طلب گار نظر آتا ہے شاید اس مقصد کے حصول کی تڑپ ہی اس تاریخ کی روح ہے۔ یہ تاریخ ابھی تک غیر مرتب سہی مگر غیر مسطور نہیں ہے۔

اس تاریخ کا حوالہ بچپن کی کہانیوں میں بھی ملتا ہے:۔

" ایک تھا بادشاہ ۔۔۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ ۔۔۔۔۔۔ یہ جملہ معترضہ " ہمارا تمہارا خدا بادشاہ " کہانی کہنے والے اور سننے والے کے لئے ایک یاد دہانی ہے کہ بادشاہت اگر برقرار ہے تو بھی ایک از کار رفتہ اور فرسودہ چیز ہے جس سے صرف قصے کہانیوں کی دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے ۔۔۔ خلافت راشدہ کا دور مختصر سہی مگر اس کی جھلک ہماری اجتماعی یاد داشت میں اس طرح محفوظ ہو گئی کہ کہانیاں سنتے سناتے وقت بھی اسکو بھلایا نہ جاسکا۔

بیعت کی بنیاد پر قائم، اس طرز حکومت میں بیعت کرنے والے آزاد شہریوں کے مقام پر فائز تھے ہمارے زمانے کے محاورہ میں اس بیعت کو معاہدہ عمرانی بھی کہا جاسکتا ہے۔ ان شہریوں کو دولت شام اور دولت عراق نے رعایا بنانے کی ناکام کوشش کی تب ان حکومتوں کو ایک ایسی مزاحمتی تحریک کا سامنا کرنا پڑا جس کے علمبردار، ائمہ اہل بیت اور ائمہ اربعہ تھے۔

بیعت سے انکار حکومت وقت پر کھلی تنقید اور سرکاری عہدے قبول کرنے سے اجتناب اس تاریخ آزادی کے منشر ابواب ہیں۔

چونکہ اعلیٰ اقدار میں امن و امان کو ایک اہم قدر ماننے کی تلقین کی گئی تھی، اس لئے اس تحریک نے مقصد کے حصول کے لئے پرامن کوشش کو خونریز انقلاب پر ترجیح دی۔ جسکے نتیجہ میں شاہی ادارہ بالکلیہ نیست نابود نہیں ہوا مگر اس کے اختیارات محدود کر دیے گئے۔

اکثر ہم ایسی حکایتیں پڑھتے ہیں کہ علمائے سلف کے ایک حلقہ کو جو ا۔ب۔ج۔ اور د پر مشتمل تھا، عہدہ قضاء پیش کیا گیا تو الف روپوش ہو گیا۔

ب نے دیوانگی کا مظاہرہ کیا اور نجات پائی۔

ج نے دانشوروں کا لباس ترک کر کے فقیری جامہ زیب تن کیا۔

د۔ نے صاف انکار کیا اور انکار کی سزا پائی۔

بنیادی طور پر یہ چاروں ہماری سیاسی تاریخ کے کردار ہیں۔ مگر ستم ظریفی کی حد ہے کہ

انکے نام اخلاقیات کے اسباق کے حوالے کر دیے گئے. جہاں ان کا ذکر. استغناء اور خاکساری جیسے عنوانات کے تحت کیا جاتا ہے۔ اور تصوف سے تو کوئی پوچھنے والا ہی نہیں کہ ان فقہاء کو صوفیاء کا لقب عطا کر کے اس نے انکے لئے باقاعدہ قناعت پسندی اور توکل کا باب کیسے قائم کر دیا۔

دولت شام و عراق کے حکمران عرب نژاد تھے۔ خلافت راشدہ کے زمانے سے قربت کی بنا پر انھیں راشدین کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے کا بہت شوق تھا۔ مگر وائے قسمت کہ اسی دور میں ایک متوازی خود مختار ادارہ کی حیثیت سے مکتبی نظام کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں، جس نے ایک طویل آویزش کے بعد ملوکیت کو فتوئ اور ہدایت کے منصب سے بے دخل کر دیا۔ اور تقسیم اختیارات کا ایک غیر مسطور دستور مدون کیا۔

ہمارے عہد کے محاورہ میں فتوئ کے حق سے بے دخلی کا مطلب یہ ہو گا کہ اب دربار قانون سازی کا مجاز نہیں رہا۔ اب شاہی فیصلہ، بطور قانونی نظیر ناقابل قبول ہو گا اور نظام عدل فقہاء کے مدون کردہ قانون پر قائم ہو گا۔ فریقین کے مابین ان امور پر اتفاق کے بعد ہی بعد میں آنے والے فقیہوں کے لئے عہدہ قضا قبول کرنا ممکن ہو سکا۔

دربار کی ہدایت کے منصب سے معزولی کے نتیجہ میں ایک خود مختار نظام تعلیم کا سلسلہ شروع ہوا اور مکتب کو شاہی اثرات سے آزاد علمی دینیاتی اور نظریاتی مرکز کی حیثیت عطا کی گئی۔

جس دور میں یہ کشمکش جاری تھی، عام مسلمان ذہنی خلفشار کا شکار رہا۔ تاہم وہ اپنی غیر اہم انتظامی۔ اور قابل فخر عسکری خدمات انجام دیتا رہا۔ اس طرح اس نے سیاسی زندگی کو تعطل کا شکار بننے سے بچالیا۔ اسکے اس رویہ پر علماء کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا گیا۔

خدمات کی انجام دہی کا صلہ صرف روزی کا تیقن ہی نہیں بلکہ قومی استحکام اور سربلندی بھی ہے، اس تصور سے اس کا ذہن آشنا ہو چکا تھا۔ چونکہ اقتدار اعلیٰ مطلقاً ملوکیت کو تفویض نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے عام شہری نے خود کو اس قانون کا وفادار سمجھا جس کی پابندی کا لزوم شاہی خاندان کے افراد پر بھی عائد ہوتا تھا۔ تاریخ اسلام کے اس روشن پہلو کو اگر تاریخ عالم کے تناظر میں دیکھا جائے تو اسکی اہمیت اور قدر و قیمت دستور انگلستان کے ارتقاء اور امریکی دستور کی تکمیل سے کم نہیں۔

اپنی تاریخ کے ایسے تجزیے سے جس مغرب زدہ نسل کو الجھن ہوتی ہے اس نے اپنے بچپن میں وہ کہانی نہیں سنی کہ ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔

ویسے بادشاہوں کے عروج و زوال کی روئداد اور پر مشتمل یہ تاریخ دوسری قوموں کی تاریخ کے مقابل کچھ ایسی بری بھی نہیں!۔

بیرونی حملوں سے سرحدوں کی حفاظت اندرون ملک امن و امان ارزانی خوش حالی خوش وقتی جامہ زیبی وغیرہ وغیرہ کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بادشاہ اچھے خاصے شکیل و وجیہ تھے۔ سب

سے بڑھ کر قابل رشک بات یہ کہ کشادہ دل دنیا کی کھلی ہوئی فضا کو انھوں نے اپنی حدود مملکت میں حق شہریت دے رکھا تھا۔ (ایران کے صفوی دور کو مستثنیٰ کرتے ہوئے) تجارت سیاحت زیارات کے راستوں پر کاروانوں کی بے روک ٹوک آمد و رفت جاری تھی۔ تہذیبی لین دین کے بازار سجے ہوئے تھے۔

ایسے میں الف لیلہ کی کہانیاں یاد آتی ہیں۔ اور خیال آتا ہے کہ ان کہانیوں میں بغداد کی خوبصورتی جس طرح محفوظ ہے اس طرح وہ نہ منگولوں کے دور عروج میں [illegible]ت تھی نہ جارج بش کے دور صدارت میں۔

جس طرح شاخ پر رینگتا کیڑا پر پھوٹنے کے بعد تتلی بن جاتا ہے، اسی طرح مخصوص حالات میں بادشاہوں کی قلب ماہیت ہو جاتی ہے۔ صلیبی جنگوں میں یا منگولوں اور فرنگیوں کے مد مقابل، وہ کچھ اور دکھائی دینے لگتے ہیں۔ تب ہم انکے نام یاد رکھتے ہیں اور انہیں بادشاہ نہ سمجھتے ہوئے قومی ہیرو کا درجہ دیتے ہیں۔

امیر خسرو ایسے ہی سلاطین کے مقرب تھے۔ منگولوں سے نبردآزما ایک سپاہی کی حیثیت سے سرحد پر انکی موجودگی کی شہادت بھی ملتی ہے۔ اسی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ خانقاہ نے بھی درباری امراء کے تعلق سے لچکدار رویہ اپنایا۔ جبکہ اس سے پہل مکتب کی طرح خانقاہ نے بھی دربار سے فاصلہ برقرار رکھا تھا۔

سب سے پہلا مسلمان شاعر جس کا نام ہشام بن عبدالملک سے سابقہ پڑا فرزدق تھا اس نے اپنے پرجوش قصیدہ میں آنے والے شعراء کے لئے جو روایت قائم کی اسکی تان انیسویں صدی میں موزوں کئے گئے اس مصرعہ پر ٹوٹی۔

بنا ہے شہہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا اس روایت کے باوجود ہم حافظ و سعدی کے کلام میں بھی سلاطین کے نام محفوظ دیکھتے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں شاعر روزی روٹی کے اعتبار سے خود کفیل تھے۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ دربار ایک ذریعہ ابلاغ بھی تھا اور اس لحاظ سے فنکاروں کا مقدر اس سے وابستہ تھا۔ دراصل عسکری صاحب اپنے مضمون میں ان مصلحین سے نالاں ہیں جو چودہ صدیوں کے دوران میں ظہور پذیر ہر معروف کو جس کے معروف ہونے پر امت کا اجماع ہے منکر قرار دیتے ہیں جبکہ اس منکر کو شریعت منکر نہیں قرار دیتی۔

تو اس طرح ہم روایتی تاریخ سے روایتی معروف و منکر تک پہنچتے ہیں۔

اس مختصر بیان میں برگزیدہ شخصیتوں کے نام درج نہیں کئے گئے کیوں کہ اس طرح بیان بہت طویل ہو جاتا۔ ناموں کے اندراج کے ساتھ اس موضوع کو سمیٹنے کے لئے دفتر کے دفتر درکار ہوں گے۔ ویسے وہ قابل احترام ہستیاں اپنے کارناموں کی بناء پر شہرہ آفاق ہیں

جیسا کہ فرزدق نے ہشام بن عبدالملک کو مخاطب کر کے کہا تھا

یہ وہ ہیں کہ صحرا کی ریت کے ذرے انکے قدموں کی چاپ کو پہچانتے ہیں میرے دانستہ نہ پہچاننے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ (زین العابدین)
وہ ہیں کہ ضمیر حجر اسود و حرم اور عرب و عجم سب انھیں پہچانتے ہیں۔"
نوٹ۔ بہت ہی ادب کے ساتھ مندرجہ ذیل اصطلاحات شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کے خزانۂ عامرہ سے مستعار لی گئی ہیں۔ فتویٰ۔ ہدایت، دولت شام (اموی سلطنت) دولت عراق (سلطنت عباسیہ)
شفیق فاطمہ شعریٰ۔ حیدرآباد

سوغات › اپنی روایت کے مطابق دستاویزی اہمیت کا حامل ہے۔ راجندر سنگھ بیدی کے افسانے "جو گیا" پر وارث علوی کا تجزیہ ہمارے ان افسانہ نگاروں کے لئے کافی مفید ثابت ہوگا جو علامتی اور تجریدی افسانے کے نام پر پر انشائیہ نگاری کرتے رہے ہیں اور دعوی افسانے کے مبینہ پیچیدہ نظام کے پیچھے اوجھل گہرے فکر اور تہہ داری کی تفہیم کا کرتے ہیں۔ بیدی کے افسانے علامتی تو نہیں ہیں البتہ بیشتر میں ایک مرکزی استعارہ ضرور ہوتا ہے جو افسانے میں معنیاتی تہداری پیدا کرتا ہے۔ بیدی کے Direct افسانوں میں معنی کا ایک جہاں آباد ہے۔ وارث علوی نے جو گیا جیسے Direct افسانے کے حوالے سے یہ بات ثابت کردی ہے۔ افسانے کی تشریح کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے وارث علوی نے کیا خوب کہا ہے کہ میری نظر میں تعبیر وہی اچھی ہے جو شعر کی مشکلات دور کرے ابہام کے پردے اٹھائے۔ معنیاتی گتھیوں کو سلجھائے اور یہ کام کرنے کے بعد قاری اور شعر کے بیچ سے ہٹ جائے تاکہ قاری شعر کو پڑھے تو اسی معنی سے لطف اندوز ہو جو شعر میں ہیں۔ یہ معنی پہلے بھی تھے مگر واضح نہیں تھے، شرح کے بعد اب زیادہ واضح ہوگئے۔

وارث علوی افسانے کو بھی اس کے خالق کی حقیقی فکر ہی کی روشنی میں پڑھنے اور سمجھنے کے قائل ہیں لیکن شمس الرحمان فاروقی کے قبیل کے ناقدوں نے افسانے کی بیک وقت کئی تشریحیں کرنے کی روایت ڈالی اور اس پر بھی اصرار کیا کہ افسانہ زماں و مکان سے آزاد ہو تاکہ قاری اپنی پسند کے مطابق اس کی تشریح کر سکے تشریح کی لاٹھی تھام کر افسانے کی زمین پر قدم رکھنے والے ہمارے عصر کے بیشتر افسانہ نگاروں نے گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں جو افسانے ناقدوں کی خوشنودی کے لئے تحریر کئے وہ تھوک کے تھوک شائع تو ہوئے لیکن انسان سے عاری ہیولوں اور پرچھائیوں پر لکھے جانے والے یہ افسانے مجموعوں کے مدفن میں پڑے اپنی کسی نئی تشریح کے منتظر ہیں۔

اجتبیٰ رضوی پر مختصر مگر جامع گوشہ ایک اچھے شاعر کی بازیافت ہے جو ادب کے تئیں آپ کے ایماندارانہ اپروچ کا بھی مظہر ہے۔ حسن منظر کا افسانہ "بوڑھا مگر مچھ" بیانیہ ہوتے ہوئے بھی بڑی گہرائی رکھتا ہے۔ آدم عیسی کا کردار عرصے تک قاری کے ذہن پر چھایا رہے گا۔ "طاؤس

چمن کی مینا" کے بارے میں آپ نے "نقش اول" میں ٹھیک ہی لکھا ہے یہ جیتے جاگتے حقیقی آدمیوں کی کہانی ہے۔ نیر مسعود کی یہ کہانی ان کی پر اسرار اور رومانیت والی نا ستجیائی کہانیوں سے بہتر اور بہت عمدہ کہانی ہے۔ ان کی کہانیوں کی یکساں فضا اور کردار اس وقت بہت گراں گذرتے ہیں جب انہیں ایک ساتھ یعنی مجموعے میں پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے۔ تب کہانیوں کے واقعات اور کردار ایک جیسی فضا آفرینی کی وجہ سے اس طرح گڈمڈ ہوجاتے ہیں کہ ان کی علاحدہ علاحدہ شناخت مشکل ہوجاتی ہے۔ قمر احسن کی کہانی "خواب گاہ" کو پڑھتے ہوئے ایک سوال ذہن میں ضرور اٹھتا ہے کہ ناظم نقوی کی کہانی کو مسہری کے پایوں کی زبان سے بیان کروانے کی ضرورت کہانی کار کو کیوں آپڑی؟ مسہری اور اس کے پایے شروع تاآخر کہانی میں کہیں بھی علامتی یا استعاراتی کردار نہیں بنتے ہیں۔ یہ کہانی تھرڈ پرسن میں بھی ہوسکتی تھی۔ کہانی پر سید محمد اشرف کا تجزیہ خوب ہے۔

ساجد رشید (بمبئی)

سچ پوچھئے تو سوغات ۳ کے بعد نظر اسی شمارے پر آکر ٹھہری ہے۔ وارث نے بیدی کے جوگیا پر مضمون اور افسانے کی تشریح چند مسائل میں افسانے کی تشریح سے جڑے مسائل کا نہایت چابکدستی سے احاطہ کیا ہے۔

شمیم حنفی کے مضامین نے جھنجوڑ کر رکھدیا۔ نئی تنقید کا المیہ اور نیا ادبی منظر نامہ دونوں ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ شمیم حنفی صاحب نے جس بوگس بین الاقوامیت کی بات کی ہے ہمارے جدید ادب کا بیشتر کچرا اسی کے بطن سے پیدا ہوا ہے نقالی کی لعنت ہمارے رگ وپے میں اس طرح شامل ہوگئی کہ ہم بلا سوچے سمجھے مغربی ادیبوں کی اترن زیب تن کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔ اگر انگلینڈ، امریکہ اور فرانس کے ادیب بے چہرگی، زندگی کی بے معنویت، تشکیک تنہائی مایوسی وغیرہ کی باتیں کرتے ہیں تو ہم بھی ادب تخلیق کرتے وقت ہندوستان کی شہریت سے دستبردار ہوجانا ضروری تصور کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شاعری کی فضا میں مصنوعیت بھری پڑی ہے اس میں جس بے چہرگی زندگی کی بے معنویت تشکیک تنہائی اور مایوسی وغیرہ کا ذکر بار بار کیا گیا وہ برصغیر کے دوچار بڑے شہروں کو چھوڑ کر کہیں نہیں تھی۔ ترقی پسند ادیبوں نے تو خیر اقرار ہی کیا ہے کہ وہ "ہندوستان میں روس جیسے حالات" پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس طرح ترقی پسندوں اور جدیدیوں نے اپنے گرد ایک لکشمن ریکھا کھینچ رکھی تھی کہ ان کو یہ لکھنا ہے اور یہ نہیں لکھنا۔ خدا کا شکر ہے کہ ۸۰ء کے بعد یہ طلسم ٹوٹا ہے اور جدیدیوں کے بعد والی نسل اس قسم کے تعصبات سے پاک ہوکر حقیقی ادب تخلیق کررہی ہے جس کا تعلق اس کی مٹی

اس کے حالات ، اس کی ذات اور اس کے احساسات سے ہے ۔ اس کی بنیاد میں روس ، امریکہ ، فرانس اور انگلینڈ سے لائی ہوئی اینٹیں نہیں اس لئے یہ ادب ترقی پسند اور جدید ادب دونوں سے مختلف ہے یہ اور بات کہ ہمارے بزرگ ناقدین مختلف نظریوں سے اپنی وابستگی کی وجہ سے اس حقیقت کا اعتراف نہیں کرتے کیونکہ اس سے ان کی مسند چھین جانے کا خطرہ ہے ۔ لیکن یہ رویہ نئی نسل کے لئے بہت چونکانے والا نہیں بس تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے ۔ یہی روایت پرستوں نے ترقی پسندوں کے ساتھ اور ترقی پسندوں نے جدیدیوں کے ساتھ کیا ۔ تعجب کیا کہ جدیدیے بھی اسی سنت کی پیروی کر رہے ہیں ۔

اختر الایمان کی خودنوشت خدا کرے کبھی ختم نہ ہو ۔ ایک ایک لفظ متشکل ہو کر ایک پورے دور کی تاریخ اور تہذیب کو ہماری نظروں کے سامنے متحرک کر دیتا ہے ۔

عرفان صدیقی کی شاعری اب صرف استادی بن کر رہ گئی ہے ان کی غزلوں میں اب وہ چیز باقی نہیں رہی جس نے مجھے ان کا دیوانہ بنا رکھا تھا ۔ اب ان کی شاعری محض "رفتگان اور کشتگاں" کے قیمے پر گھسٹ رہی ہے ۔

مجموعی طور پر اس دفعہ آپ نے نظمیں بڑی جاندار شائع کی ہیں ۔ ہاں ! اختر الایمان اور محمد علوی متاثر نہیں کر سکے ۔ صلاح الدین محمود اور خالد جاوید کے یہاں اظہار کی پرکاری ہے ۔

منیب الرحمن پر گوشہ اور احمد علی پر خصوصی مطالعہ پیش کر کے سوغات نے بڑا کام کیا ہے ۔

حمید نسیم کا مضمون یقیناً راشدیات میں ایک اہم اضافہ ہے ۔ میں نے راشد کی شاعری پر اس سے اچھا مضمون آج تک نہیں پڑھا ۔ بھائی حمید نسیم نے راشد کی شاعری کی کئی جہتیں روشن کر دی ہیں ۔

افسانوں کے حصے میں نیر مسعود نے اس بار بھی مایوس کیا کبھی کبھی تو ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس زبان کے سوا اردو کے قاری کو دینے کے لئے اور کچھ بھی نہیں شاید یہی وجہ ہے کہ طاؤس چمن کی مینا ایک بہترین کہانی بنتے بنتے رہ گئی ۔ اختتام پر قاری کو صرف ایک جھٹکا ہی نہیں لگتا بلکہ جھنجھلاہٹ بھی طاری ہو جاتی ہے کہ اس نے اس قدر طویل افسانہ پڑھ کر خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کیا ۔ خواب گاہ کے متعلق میں جو کچھ لکھنا چاہتا تھا ۔ اسے سید محمد اشرف نے اپنے تجزیے میں لکھ دیا ہے اور میرے خیال میں قمر احسن کی کہانی کا اس سے زیادہ جامع اور ایماندارانہ تجزیہ نہیں کیا جا سکتا

نعمان شوق

"سوغات" (۷) میں راشد پر حمید نسیم صاحب کا طویل مضمون دیکھا جس کے بارے میں آپ نے اپنے اداریے میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ اس میں "راشد سے حمید نسیم کے LOVE-HATE کی جھلکیاں معنی خیز

بھی ہیں اور پُر لطف بھی۔"

اس مضمون میں حمیدہ نسیم صاحب نے ایک سے زیادہ بار یہ بات دہرائی ہے کہ راشد کی نظم "میرے بھی ہیں کچھ خواب" سیاہ فام امریکیوں کے مشہور لیڈر مارٹن لوتھر کنگ کی شہرہ آفاق تقریر سے، جس میں I HAVE A DREAM کے جملے کی تکرار ہے، متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ یہ نظم دراصل راشد کے قیامِ کراچی کے دوران ۱۹۶۱ء کے آخری حصّے کی تخلیق ہے۔ کم سے کم اس کی ابتدا اسی زمانے میں ہوئی تھی۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد راشد کا تبادلہ ہو گیا اور وہ نیویارک چلے گئے۔ فروری ۱۹۶۲ء میں ایک سرکاری پروگرام کے مطابق "پبلک ایڈمنسٹریشن" میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے لئے میں بھی لاس انجلیز پہنچا۔ راشد سے فون پر بات ہوئی اور پھر خط وکتابت شروع ہو گئی۔ چنانچہ راشد کے ۲۵ جون ۱۹۶۲ء کے ایک خط میں اس نظم کا ذکر موجود ہے۔ انھوں نے مجھ سے گلہ کیا ہے کہ میں نے اس نظم کی تکمیل شدہ صورت کی، جس کی نقل وہ مجھے بھیج چکے تھے، اب تک رسید کیوں نہیں دی، حالانکہ اس کی اٹھان مجھے محبوب تھی۔ یہ حوالہ ہے اس نظم کی ابتدائی شکل کی طرف جو مجھے راشد نے کراچی میں سنائی تھی۔ میرے نام راشد کا یہ خط راشد پر میرے دوسرے مضامین کے ساتھ ۱۹۸۸ء میں "نیا دور" کراچی، شمارہ نمبر ۸۳-۸۴ میں شائع ہوا تھا۔ اور پھر کوئی ایک سال کے بعد میری تالیف "راشد ـــ شخص اور شاعر" میں شامل کیا گیا۔

اب آیئے مارٹن لوتھر کنگ کی تقریر کی طرف جس کو حمیدہ نسیم صاحب نے اس نظم کا ماخذ قرار دیا ہے۔ یہ تقریر کنگ نے ۲۸ اگست ۱۹۶۳ء کو "مارچ اون واشنگٹن" کے موقع پر "لنکن میموریل" میں لنکن کے مجسّمے کے سائے تلے کھڑے ہو کر کی تھی۔ میں خود سننے والوں کے جمّ غفیر میں موجود تھا۔ چونکہ اس وقت تک میں لاس انجلیز سے واشنگٹن کی یونیورسٹی میں آچکا تھا۔ لہٰذا یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ راشد نے کنگ کی تقریر سے متاثر ہو کر یہ نظم کہی۔ اور یہ کہنے کا مجھے یارا نہیں کہ کنگ نے راشد کا مصرع "میرے بھی ہیں کچھ خواب" کہیں سے سن لیا تھا!

ممکن ہے حمیدہ نسیم صاحب کو یہ سہو اس لئے ہوا ہو کہ ۱۹۶۳ء کے اخیر یا ۱۹۶۴ء ہی میں حمیدہ نسیم صاحب امریکہ کے دورے پر آئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ واشنگٹن میں ایک شام وہ ہمارے یہاں بھی تشریف لائے تھے۔ اس زمانے میں امریکہ میں کنگ کی اس تقریر کا بڑا چرچا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ راشد کی یہ نظم بھی حمیدہ نسیم صاحب نے راشد سے نیویارک میں اُسی زمانے میں سنی ہو اور ان کے دماغ میں کنگ کی تقریر کے پس منظر میں یہ تاثر قائم ہو گیا ہو۔ بہرحال یہ فقط میرا قیاس ہے۔ حقیقت حال میں نے بیان کر دی ہے۔" (ڈاکٹر) آفتاب احمد۔ اسلام آباد

SOUGHAT Issue - 8 Tel : 5581986
A Miscellany of Urdu Literature
Editor : **MAHMOOD AYAZ**
84, 3rd Main, 2nd Cross, Defence Colony, Indiranagar, Bangalore-560 038